مسجد نواب آصف الدولہ جس میں ۱۳۰۰ھ سے نماز جمعہ ہو رہی ہے

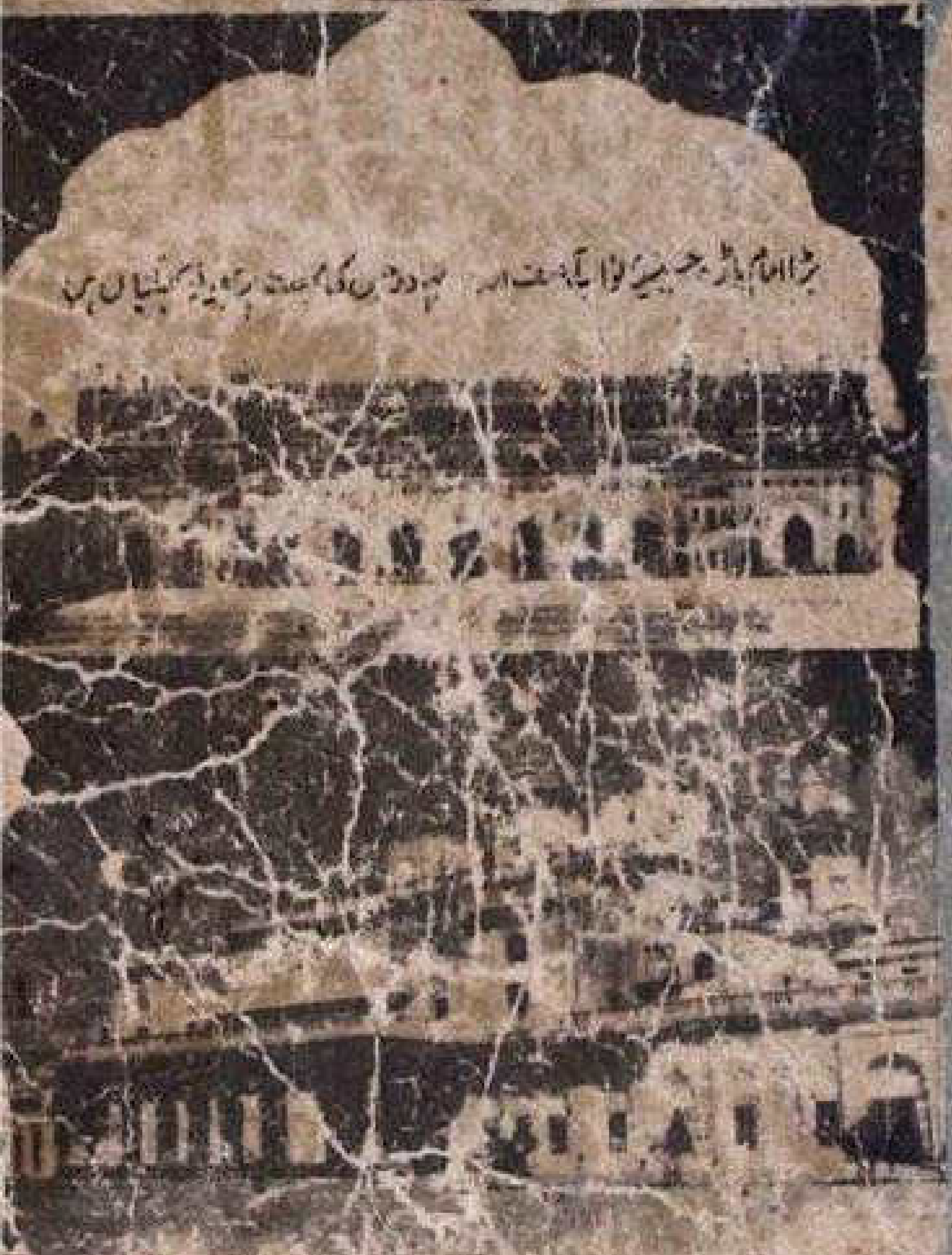

بڑا امام باڑہ جسے نواب آصف الدولہ نے [illegible]

چھتر منزل، بادشاہ نصیر الدین حیدر بہادر کی مرغوب عمارت دریا کے کنارے

تاریخ لکھنؤ

(باتصویر)

اِنَّا نَحْنُ نُحْیِ الْمَوْتٰی وَنَکْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ

۴۳ ویں کتاب جمعیت خدام عزا، کی جس نے مرکز سے بارہ ہزار کتابیں بلا قیمت نشر کیں۔

- جنگِ آزادی کی تباہ کاریاں حب وطن میں تن من دھن کی بازی لگانے والوں کی دست بدست جنگ
- وطن دشمن عناصر کے کرتوت، عروسِ ادب کے رنگین نظارے، تحقیقات کی حشر سامانی
- شعرا کے تبسم، عوام کے قہقہے "تیرھویں صدی" کے لکھنؤ نے جو نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے یعنی

تاریخ لکھنؤ

(مع تصاویر)

*

مصنّف

زبدۃ العلماء سید آغا مہدی مد ظلہٗ العالی

(سابق مدیر "الواعظ" مجلہ فکریہ اسلامیہ لکھنؤ)

*

ناشر

جمعیّت خدّام عزا،

"النجف" اے ۱۷/۱۴۲ فیڈرل 'بی' ایریا کراچی ۳۸

قیمت : صرف ۲۰ روپے

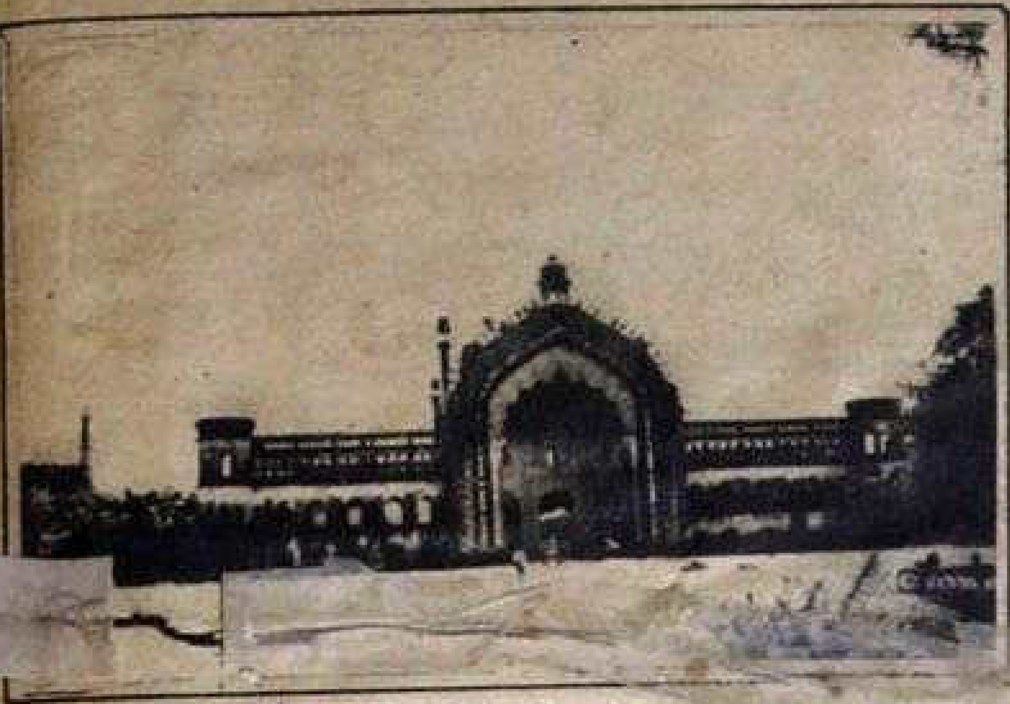

رومی دروازہ (امامباڑہ آصفی کا پھاٹک)

عہد آصفی کی [illegible]
عظیم الشان عمارت

کربلا حاجی میتا

سید احمد نقوی (سکریٹری ادارہ)

جملہ حقوق محفوظ

مصنف ـــــ زبدۃ العلماء سید آغا مہدی لکھنوی

ناشر ـــــ سید احمد نقوی (سکریٹری ادارہ)

تعداد ـــــ ایک ہزار

سن طبع ـــــ ستمبر ۱۹۷۶ء

ضخامت ـــــ ۴۰۰ صفحات

مطبوعہ ـــــ کتب پرنٹرز اینڈ پبلشرز لمیٹڈ کراچی

کتابت ـــــ مرکز کتابت ۲۰/۸۳۸ فیڈرل بی ایریا کراچی

طباعت ـــــ پہلی بار

قیمت ـــــ [illegible] روپے علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

جمعیت خدام عزا

النجف اے ۱۷/۲۴۲ فیڈرل بی ایریا کراچی ۳۸

(پاکستان)

تاریخ لکھنؤ

فہرست مضامین

پہلا باب کمپنی باغ سے اکبری دروازہ تک	۴۷	چھٹا باب بنجاری ٹولہ سے چار باغ تک	۲۴۴
دوسرا باب محمود نگر سے چھاؤنی حسین الدین خاں تک	۹۲	ساتواں باب پنجابی ٹولہ سے دلکشا تک	۲۷۹
تیسرا باب چاولوں والی گلی سے عالم نگر تک	۱۲۶	آٹھواں باب شاہ پیر محمد کے ٹیلہ اور گرد و نواح سے قیصر باغ تک	۳۱۶
چوتھا باب جوہری محلہ سے تال کٹورہ تک	۱۴۸		
پانچواں باب مرزا منڈی سے موہنی کے پروا تک	۱۸۹	* * * * * *	

محاورات زبان یا محلہ کے ناموں میں جن شعراء کے ابیات شاہد میں پیش کئے ہیں اُن کے اسماء

نمبر شمار	عنوان	نمبر شمار	عنوان	نمبر شمار	عنوان	نمبر شمار	عنوان	نمبر شمار	عنوان
۱	احمد	۱۴	اُنس	۲۷	ثاقب	۴۰	دبیر	۵۳	شاد
۲	آتش	۱۵	انشا	۲۸	جان	۴۱	دلگیر	۵۴	شاداں
۳	آزاد	۱۶	انیس	۲۹	جرار	۴۲	رسا	۵۵	شرف
۴	احسن	۱۷	اوج	۳۰	جاوید	۴۳	رسوا	۵۶	شمشیر
۵	اسد	۱۸	بارق	۳۱	جعفر	۴۴	رشک	۵۷	شہرت
۶	اسیر	۱۹	بحر	۳۲	جلیس	۴۵	رشید	۵۸	شہید
۷	اشرف	۲۰	بشر	۳۳	چکبست	۴۶	رضا	۵۹	شبیر
۸	آشفتہ	۲۱	بقا	۳۴	حاتم علی مہر	۴۷	رنگین	۶۰	شوق
۹	آصف	۲۲	بیگم	۳۵	میر حسن	۴۸	سحر	۶۱	صادق
۱۰	افضل	۲۳	تسلیم	۳۶	حکیم	۴۹	سرور	۶۲	صفدر
۱۱	امانت	۲۴	تشفی	۳۷	خرد	۵۰	سودا	۶۳	صفی
۱۲	امید	۲۵	تعشق	۳۸	خلیق	۵۱	سروش	۶۴	صغیر
۱۳	امیر مینائی	۲۶	تمنا	۳۹	خورشید	۵۲	سریر	۶۵	ضبط

۶۶	ضمیر	۹۳	کلیم
۶۷	ضیغم	۹۴	کیوان
۶۸	طور	۹۵	گویا
۶۹	طریقت	۹۶	لطافت
۷۰	ظہور	۹۷	ماہر
۷۱	عارف	۹۸	مانوس
۷۲	عاشق	۹۹	محشر
۷۳	عالم	۱۰۰	[illegible]
۷۴	عرش	۱۰۱	مصحفی
۷۵	عروج	۱۰۲	مفتی میر عباس
۷۶	عشرت	۱۰۳	منیر
۷۷	عزیز	۱۰۴	مہر
۷۸	عشق	۱۰۵	مونس
۷۹	علی حسن	۱۰۶	میر
۸۰	عیش	۱۰۷	ناسخ
۸۱	غالب	۱۰۸	ناصری
۸۲	غافل	۱۰۹	نصرت
۸۳	فاخر	۱۱۰	نفیس
۸۴	فصاحت	۱۱۱	وحید
۸۵	فصیح	۱۱۲	وزیر
۸۶	فہم	۱۱۳	لیاقت
۸۷	قبول	۱۱۴	واثق
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۸۹	قدیر	۱۱۶	ہدایت
۹۰	قدیم		
۹۱	قلق		
۹۲	کامل		

پیرانِ طریقت اور عہد رفتہ کے درویش و فقراء

۱	ابراہیم چشتیؒ	۱۴	ڈنکا شاہؒ	۲۵	شاہ عبداللطیفؒ
۲	احمد کبیرؒ	۱۵	رکن الدینؒ	۲۶	قطب عظیمؒ
۳	احمد اللہ شاہؒ	۱۶	شیخ سارنگؒ	۲۷	میاں قطب الدینؒ
۴	بودل شاہؒ	۱۷	سعد اللہ	۲۸	قیام الدینؒ
۵	بساک شاہؒ		[illegible]ؒ		[illegible]
[illegible]	[illegible]	۱۸	شیر خاں	۳۰	کوکا پیرؒ
۷	نارن شاہؒ	۱۹	شاہ صحراؒ	۳۱	کلیم اللہ شاہؒ
۸	جھنڈولے شاہؒ	۲۰	شاہ صفاؒ	۳۲	شاہ پیر محمد
۹	پیر جلیلؒ	۲۱	شاہ مینیؒ	۳۳	سید محمود کمال الجمال شہیدؒ
۱۰	حاج الحرمینؒ	۲۲	طاہر پیرؒ	۳۴	شاہ میناؒ
۱۱	احمد اللہ شاہؒ	۲۳	شاہ عبدالجلیلؒ	۳۵	شاہ وحدتؒ
۱۲	خادم علی شاہؒ	۲۴	شاہ عبدالرحمنؒ		
۱۳	دوست محمد				

مطابع

۱	اثنا عشری پریس	۹	حسینی مطبع	۱۸	محمدی
		۱۰	حیدری	۱۹	مرتضوی
۲	آئینہ حق نما پریس	۱۱	مطبع سبحانی	۲۰	مصطفائی
		۱۲	سلطانی	۲۱	[illegible]
۳	[illegible]	۱۳	[illegible]	۲۲	[illegible]
۴	[illegible]		گلزار اودھ	۲۳	نولکشور
۵	تصویر عالم	۱۴	علوی	۲۴	ولی محمد
۶	تمنائی پریس	۱۵	قاسمی		
۷	جعفری	۱۶	کارنامہ		
۸	چشمہ فیض	۱۷	کنز العلوم		

اخبارات

۱	اخبار الاخیار	۶	اختر اودھ	۱۱	اودھ گزٹ	۱۶	تفریح	۲۱	طلسم
۲	تاریخ ہند	۷	امیر الاخبار	۱۲	اودھ پنچ	۱۷	ریاض الاخبار	۲۲	مخبر صادق
۳	آثار الاعظم	۸	امامیہ گزٹ	۱۳	بوستان ہند	۱۸	سحر سامری	۲۳	مہر ظرافت
۴	اخبار طلبی	۹	امامیہ	۱۴	بوستان العاشقین	۱۹	شمس الاخبار	۲۴	ہند
[illegible]	[illegible]	۱۰	اودھ اخبار	۱۵	تیار الاخبار	۲۰	صحیفہ	۲۵	ہندوستانی

لکھنؤ کی نامور خواتین

۱	آتو جی	۱۳	اپیا زرد	۲۴	خدیجہ بیگم	۳۵	شہزادہ بیگم	۴۵	لاڈو خانم
۲	اجاگر	۱۴	پنڈتائن	۲۵	خواص	۳۶	عالم آرا بیگم	۴۶	لطف النساء
۳	اختر محل	۱۵	تاج آرا بیگم	۲۶	خورشید	۳۷	عسکری بیگم	۴۷	مبارک محل
۴	اشرف النساء	۱۶	جعفری بیگم		زمانی بیگم		شیدا	۴۸	مجلسی بیگم
۵	افسر بہو	۱۷	چھوٹی شاہزادی	۲۷	دھنیا مہری	۳۸	فرخندہ محل	۴۹	مرشد زادی
۶	امۃ الزہراء	۱۸	چودھرائن	۲۸	رکھی	۳۹	قدسیہ بیگم	۵۰	معشوق محل
۷	امیر محل	۱۹	حاجی بیگم	۲۹	راحت السلطان	۴۰	قطبن	۵۱	مصری
۸	بادشاہ محل	۲۰	حسین باندی	۳۰	رشیدہ خانم	۴۱	کبیرن	۵۲	ملکہ جہاں
۹	بی بنی	۲۱	حضرت محل	۳۱	رنگ محل	۴۲	کوڑے	۵۳	ملکہ زمانی
۱۰	بی مصری	۲۲	حیدر جان	۳۲	سلطان دلہن		دالی بیگم	۵۴	ملکہ کشور
۱۱	بھولا بھٹیاری	۲۳	حمیدہ خانم	۳۳	سہانی بی بی	۴۳	گلبدن بیگم	۵۵	ملکہ عہد
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	۴۴	گوہر بیگم	۵۶	مغل صاحب
								۵۷	[illegible]
								۵۸	نادان محل
								۵۹	نوری بیگم

ادارہ کی جملہ کتابیں ملنے کا پتہ

رحمت اللہ بک ایجنسی ۱۳۵۔ موتن مارکیٹ

بمقابل نیو میمن مسجد۔ ایم اے جناح روڈ کراچی ۲

ادارے کی عظیم پیش کش

۳۴ ویں کتاب

للہ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر میخواست آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

ادارہ بھارت میں جو نشریات چھوڑ کر پردیس کی کٹھن منزل میں پہونچا اور مہاجرت نے زمین ہموار کی۔ ایک تحفے کے بعد دوسرا حاضر کیا اور نوبت تاریخ لکھنؤ پیش کرنے کی آئی جس کو دار الآثار کا درجہ حاصل اور وطن کا میوزیم کہنا صحیح ہے کراچی ایسے عظیم شہر میں جو نوجوانوں کے لیے حوادث کا مرکز ہے چہ جائیکہ بڑھاپے کی اعلیٰ حدوں پر پہونچکر خانہ نشین مصنف کا تن من دھن گردو پیش کے ناسازگار حالات میں کام کرتا رہا فضل رب ہے یہ فعال ہستی وہ ہے جس نے ادارہ کی آخری پیش کش لکھنؤ سے مقبولِ عالم جنتری ۱۹۶۰ء میں شائع کرکے کراچی میں بھی دم نہ لیا۔ دنیا گواہ ہے کہ صحت و مرض میں قلم چلتا رہا اور تصانیف مطبوعہ وغیر مطبوعہ کی تعداد لانبی ہے تاریخ لکھنؤ ماضی بعید کی صحیح عکاسی ہے۔ عروس ادب کے رنگین نکارے، تحقیقات کی حشر سامانی، شعراء کے تبسم خیز رشحۂ افکار، عوام کے قہقہے مطالعے کا نتیجہ ہوں تو یہی۔ جنگ آزادی کی تباہ کاری، حب وطن میں جان کی بازی لگانے والوں کی دست بدست لڑائی، وطن دشمن عناصر کے کرتوت، اسلاف کے فوٹو وہ خصوصیات ہیں جس کی وجہ سے ہر مذہب و ملت کے لوگ چشم براہ ہیں۔

مصنف کے اصل نسخے میں انڈکس اسی تقطیع پر ۲۰ صفحات میں ہے اور بجائے خود ایک کتاب ہے۔ ۳۰ علماء اسلام، ۸۰۳ علماء شیعہ اثنا عشریہ، ۱۲ مشاہیر، ۷۰ شخصیات، ۶۰ ہندو مسلم بلند پایہ خواتین کا ذکر ہے مندر اور گرجا کو بھی نہ چھوڑا۔ عہد نوابی و شاہی کے تمام آثار قدیمہ کے تصاویر، مسجدیں، کربلائیں، امامباڑے کوئی مقدس عمارت نہیں رہی جس پر قلم نہ اٹھایا ہو۔ صرف اہم ترین عنوانات کی فہرست درج ہو سکی ہے۔ مشیت ایزدی پر ہر مہاجر راضی ہے مگر کچھ ایسے ہیں جن کی زبان پر یہ شعر ہے ؎

مرغِ جاں کو قفسِ تن سے رہائی ہوتی
لیکن اس جانِ جہاں سے نہ جدائی ہوتی

الحاج سید منظور امام زیدی (صدر شعبۂ نشر و اشاعت)

۲؍ شوال المکرم ۱۳۹۶ھ

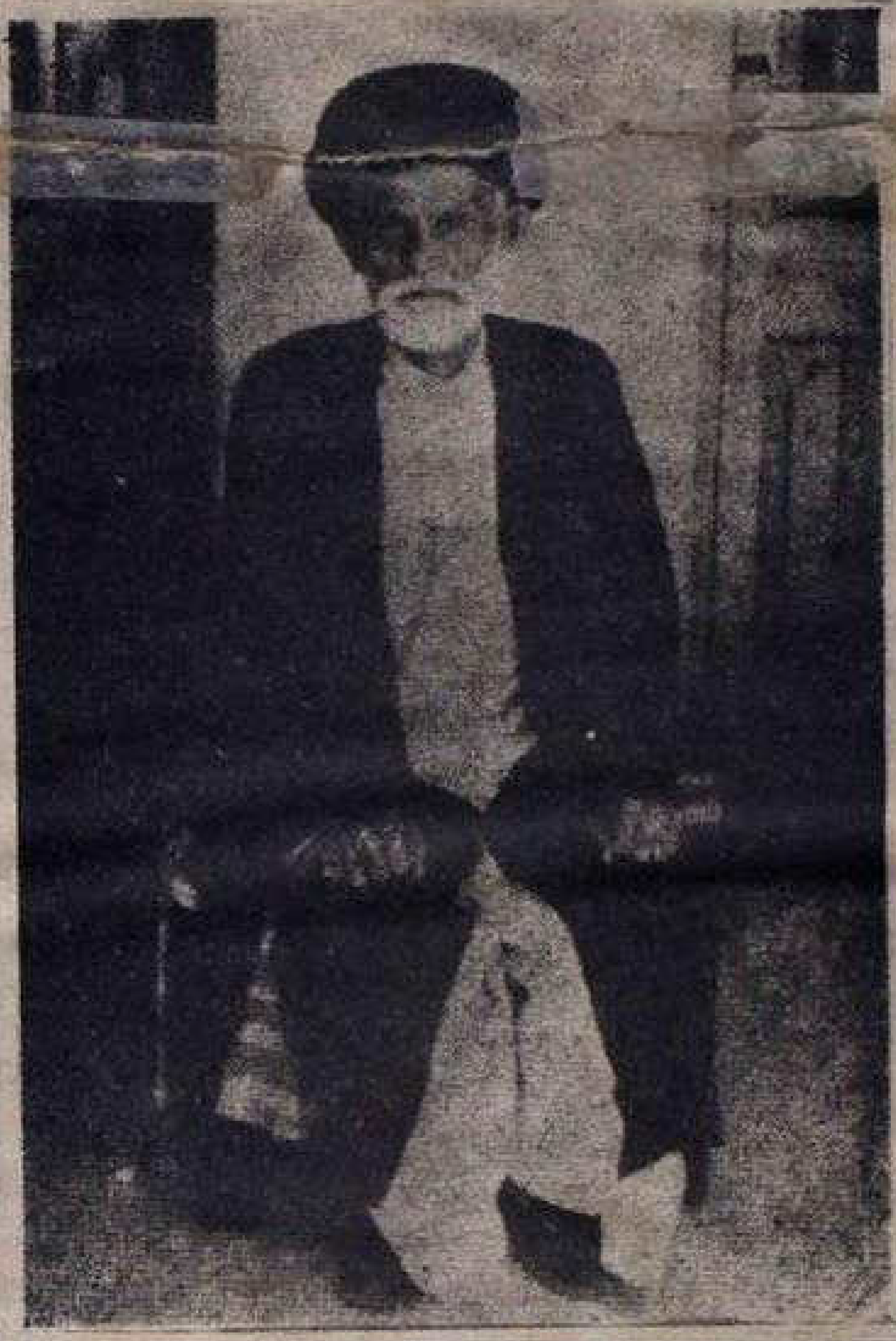

مصنّف

زبدۃ العلماء

جناب سید آغا مہدی صاحب قبلہ لکھنوی

مغفرت خود جس پہ نازاں ہو وہ ہے غفراں مآب
۱۳۹۶ھ
(حضرت رئیس امروہوی)

روضۂ حضرت زینبؑ (زینبیہ)

آیۃ اللہ حضرت مولانا
سید دلدار علی صاحب قبلہ غفراں مآب مجتہد اول برصغیر

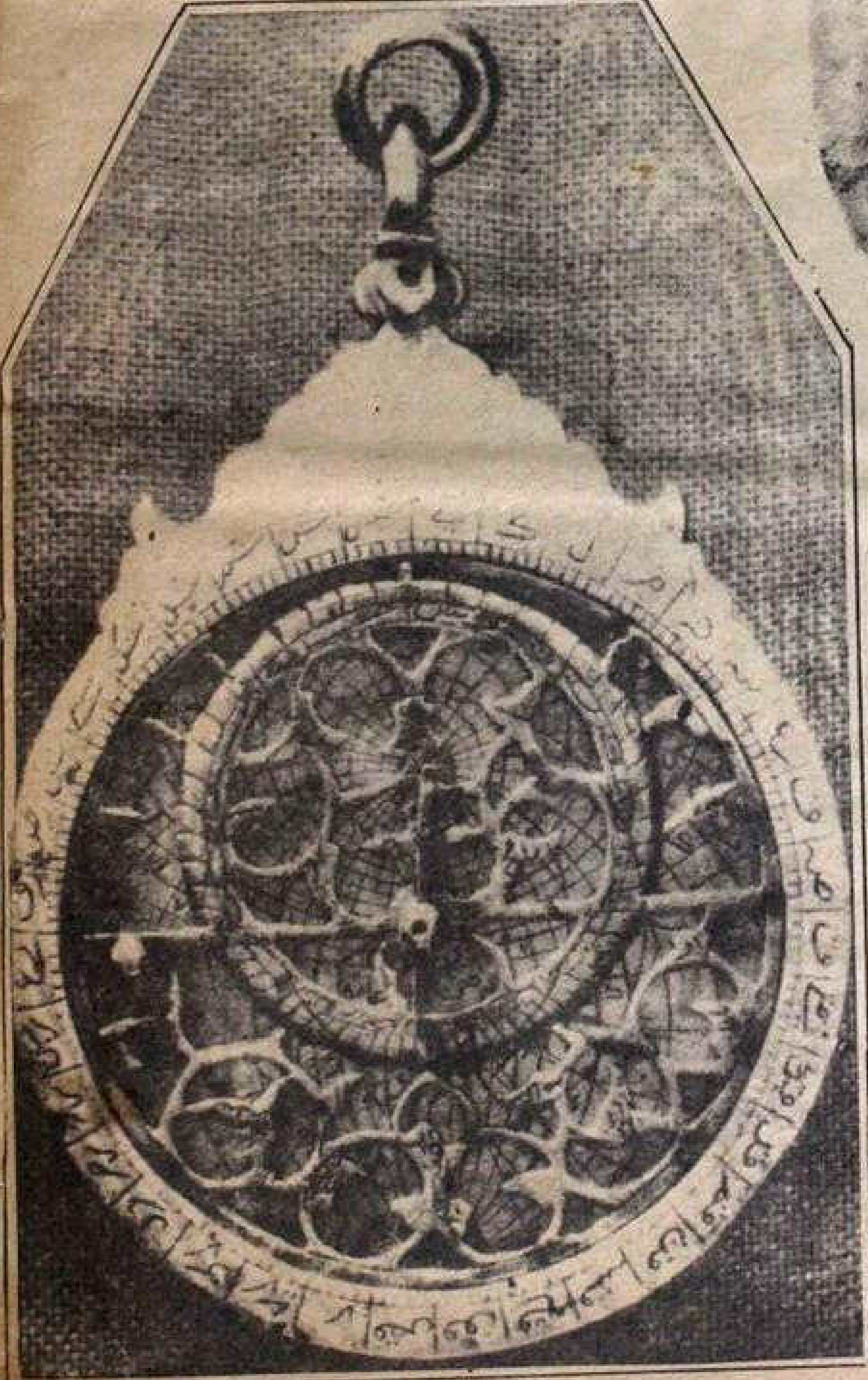

علم ریاضی کا آلہ اسطرلاب

سید غلام قنبر صاحب نقوی امروہوی ۱۸ سال سے
ادارہ سے وابستہ ہیں اور قابل فخر خدمات دیانت سے
انجام دے رہے ہیں آپ کے پُرخلوص تعاون پر مسرت کے
ساتھ رکن جمعیت قرار دیا ہے۔ (ادارہ)

پاکستان اور لکھنؤ

مجھے تو ہے منظور مجنوں کو لیلیٰ ‏ ‏ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

تاریخ لکھنؤ بھارت میں سپرد قلم ہوئی اور اشاعت کا ارادہ لکھنؤ ہی میں تھا اس لئے عنوان بالا پر قلم اٹھانے کی اس وقت مصلحت نہ تھی ؎

ہوا اپنی نہ آب اپنا ‏ ‏ کھِلے کیسے گلاب اپنا

اس خدا کا لاکھ لاکھ شکر جس نے ہجرت کے سولھویں برس پہنچنے کا دن دکھایا اور اظہار حقیقت میں قلم آزاد ہے۔ کتاب پڑھنے سے پہلے اس کو دلنشیں کیجئے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا وہ پہلا جلسہ جس میں قائداعظم محمد علی جناح کی زیر صدارت تقسیم ملک کا سمجھوتہ ہوا وہ لکھنؤ کی قرارداد تھی اور تحریک آزادی کا ہر سپاہی راجہ محمود آباد کی ہمت افزائی پر آگے بڑھا چودھری خلیق الزماں مولوی عبدالباری قدس سرہٗ جو میرے مدرس معقولات کے استاد تھے اور مولوی سید ابن حسن جارچوی کے اقدام ریاست محمود آباد کے سایہ میں ہوئے بٹلر پیلس اور محمود آباد ہاؤس جدید اور قدیم عمارتوں میں آزادی کے جو خواب دیکھے گئے تھے اس کی تعبیر ملی، چمن حریت کی اسٹیٹ سے آبیاری ہوئی ریاست محمود آباد اور بلہرہ کا خزانہ کھلا اول الذکر اسٹیٹ کے مورث اعلیٰ انگریزوں میں باغی قرار پاچکے تھے ان کی عظیم جدوجہد نے اپنی نسل میں جو بیج بویا تھا وہ نہ کمہلانے والے پودے کی شکل میں نمودار ہوا اور شہر کی دیوار و در پر اشتہار نظر آئے۔

> آل انڈیا مسلم لیگ کے میر مجلس کا استقبال
>
> مسٹر محمد علی جناح
>
> جو امسال آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کے پریسیڈنٹ ہیں ۲۴ دسمبر ۱۹۱۶ء بوقت ۹ بجے صبح کانپور کی سمت سے چارباغ اسٹیشن لکھنؤ پہونچیں گے تمام باشندگان شہر بالخصوص مسلمانان لکھنؤ سے استدعا ہے کہ پریسیڈنٹ موصوف کے استقبال میں وقت اور مقام معینہ میں شرکت فرمائیں۔
>
> سید نبی اللہ چیرمین کمیٹی استقبالیہ - سید وزیر حسن آنریری سکریٹری

سید احمد شہید کے دیس رائے بریلی کے میر واجد علی وکیل سکریٹری آل انڈیا شیعہ کانفرنس خاندان اجتہاد سے علامہ ہندی حکیم سید علی آشفتہ وفات ۱۳۶۵ھ جیل گئے کھدرپوشی نے ولایتی کپڑوں کو آگ لگادی خطابات واپس ہوئے اور وہ وقت آیا کہ لکھنؤ سے ہفت روزہ پاکستان جاری ہوا جس کے سرورق کا عکس روزنامہ جنگ کراچی آزادی نمبر ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا جو

مطالبات کا نقیب تھا بٹوارہ ہو جانے پر ۱۹۴۷ء میں جابجا کشت و خون ہوئے مگر لکھنؤ خونریزی سے بچا رہا یہ باشندگان شہر کی صلح پسندی اور ہندو مسلم اتحاد کا وہ اعلیٰ نمونہ تھا جس کی نظیر ملک بھر میں نہ تھی۔

ڈاکٹر جعفر حسین اور یوسف حسین خاں بیرسٹر نے کھدر پہنا تو تعجب نہ تھا۔ عراق کی پہلی زیارت میں میں نے وہاں کے بزازوں پر "منسوجات وطنیہ" کے بورڈ دیکھے "دیس کا کپڑا" اور یہ معلوم کر کے میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی کہ سرکار آغا سید ابوالحسن اصفہانی اعلیٰ اللہ مقامہ ان بزرگانِ ملت میں نہ تھے جن کا رویہ مخلصین سے یہ ہو کہ ہم تمہارے یہاں آئیں تو کیا کھلاؤ گے اور تم آؤ تو ہمارے لئے کیا لاؤ گے۔ وہ فرمائش کو جرم سمجھتے مگر بھارت کے کسی رئیس کے اصرار پر کہ حضور مجھ سے کچھ فرمائش کریں جناب نے کھدر کی فرمائش کی۔

قاسم رضوی جس نے ۱۹۴۷ء کے ہندو مظالم دیکھ کر دکھن میں رضاکار تیار کئے اور مملکت نظام میں بیداری[1] کی لہر دوڑا دی وہ فرنگی محل لکھنؤ کا تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔

وہ لکھنؤ جہاں اگلے لوگوں کو کم از کم سات پارچے[2] کا خلعت ملتا تھا نئی روشنی میں وہاں کے لیڈر فقط کرتہ پہنے نظر آئے اور پرانی تہذیب کا مجھ سے جب کوئی پوچھتا تھا کہ ٹھیک ہے تو میں اُس تہذیب کا دلدادہ ہوتے ہوئے کہتا کہ مہاجن سے روپیہ قرض لے کر شیروانی بنانے یا کلاتھ مرچنٹ کو ادھار کا تقاضہ سہنے سے بے خوف ہو کر ٹھاٹھ سے بہتر یہ ہے کہ اپنی گاڑھی مشقت کا صرف کرتہ جسم میں ہو رزمگاہ صفین میں مولا کرتہ پہنے ہوئے تھے اور کربلا میں قاسم نوشہ کے جسم پر قمیص ہے۔

دنیائے تشیع کی جس شہر پر دور دور سے نگاہ پڑتی اس کی تاریخ مرتب کر چکا شکراً للمنعم سرزمین وطن پر آباد کن سورج کی پہلی کرن سے لے کر غروب آفتاب تک کے کوائف آپ کو ملیں گے اور ماضی بعید کے جن اسلاف پر قلم اٹھایا ہے ان کی شخصیت پرکشش تھی ارباب ادب کے لطیفے اگر آپ نے پڑھ لئے تو مسرت و انبساط کا زعفران زار سامنے آئے گا۔ طبیعت میں زندہ دلی پیدا نہ ہو تو ہم اپنا نام بدل دیں۔ برصغیر کے سرخیل صوفیائے کرام کے حالات بھی ہیں شام اودھ کے شبستانِ عیش و عشرت کی تصویرکشی بھی کی ہے اور چنگ و رباب کی صداؤں میں وہ کیف نہ ہوگا جو دربار کے جملوں میں بیگمات کی حاضر جوابی سن کر حاصل ہوگا۔ آپ یہ بھی معلوم کریں گے کہ معاشرے میں خواتین کا مقام اب نہیں جب بلند تھا جب وہ مسندنشین تھی فافہم و تدبر۔

حریت کے دلدادہ اور آزادی کے علمبردار برطانوی استعماریت کے پول کھولنے پر یقیناً خوش ہوں گے اور تو سبھی کر کتاب کے مطالعے سے ناظر شعلہ بیان مقرر بن جائے۔ یاد رکھئے کتاب کا موضوع سلاطین اودھ کی لائف نہیں ہے۔ ان کے بسائے ہوئے شہر کا تعارف مقصود ہے ادبی محفلیں شعر و سخن کی صحبتیں مظاہرہ کمالات کے موقف مٹی ہوئی تصویریں اُبھر نہ آئیں تو ہمارا ذمہ۔ مذہبی اقدار کا تحفظ کسی باب میں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے اور پرانے اقدار کو اجاگر کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے اسلاف جو شاعر نہ تھے ان کی نثر اپنے رنگ میں البیلی پائیں گے۔

میرے ۲۴ مطبوعات میں جو موٹی موٹی کتابیں ہیں ان کے تصنیف کی مدت اگر بتاؤں تو ممکن ہے کچھ لوگ باور نہ کریں مگر تیرہویں صدی کا لکھنؤ جو تاریخ لکھنؤ ہے برسہا برس کی ریاضت بے پایاں کوشش کا شاہکار ہے اور بغیر کسی سرمائے

---

[1] اخبار جنگ کراچی، ۳ اگست ۱۹۷۶ء [2] دستار، رومال کاندھے پر، چکن جسم میں، کرتہ، زیرجامہ، موزہ، دستہ پاک

کے چھپوانے میں جو عرق ریزی ہوئی اس کو نہ پوچھو دانتوں پسینہ آگیا اور یہ کہنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں کہ جن حضرات نے طباعت میں تعاون کیا وہ رسمی شکریہ سے برتر ہیں۔

میری محنت ہائے عرق لشان کا صلہ تو وہی دے گا جس کے بندوں کو پیش کیا اور ان کی چھپی ہوئی صلاحیتوں اور خوبیوں کو ضبط تحریر میں لایا ہوں مخلوق سے خالق پہچانا جاتا ہے۔ اثر سے مؤثر کا پتہ چلتا ہے تو یہ نقوش قدرت خدا ہیں طول کے ڈر سے کہیں کہیں کمی کی ہے۔ تصحیح کے وقت جو اضافے ذہن میں آئے اس پر کوئی توجہ نہیں کی۔ تصاویر سب جگہ نہیں پا سکیں قیصر باغ میں انگریزوں کا دور شروع ہوتے ہوتا حال جو تغیرات ہوئے اس کو نظر انداز کیا ہے۔

صوفیائے کرام میں آپ کو ۵۰ نام اپنے اپنے علاقے میں نظر آئیں گے جن میں کچھ تو یقیناً روحانی پیکر تھے مگر علمائے فرنگی محل اور خاندان اجتہاد کے مرجع خلق ہادیان دین نے تہذیب لکھنؤ یہ بھی کہ ان کو باستثنا بعض مرکزیت نہ دی اور بدعت کی وبا بھی پھیلنے نہ دی حتی کہ ایک طبقہ وہ ہے جس کی قبر کا بھی پتہ نہیں صرف نام باقی ہے اور بہت کم وہ مزار ہیں جہاں شاذ و نادر قوالی ہوتی ہے۔ دھمال کا تو ہم نے نام بھی نہ سنا تھا میں صحیح معنوں میں بزرگان دین کے خدمات کا تشہر اپنا اسلامی فرض سمجھتا ہوں اور روحانی افراد کے نام مٹنے پر رنجیدہ ہوں ہمارا اور ہر مسلم کا مسلک صراط مستقیم سیدھا راستہ ہے اور شفاعت کا حق صرف مطلبی خاندان کو حاصل ہے۔

معزز ہمعصر کوثر نیازی سے

حشر میں ساقی کوثر کی سواری پہونچی ہر طرف شور اٹھا شافع عصیاں آیا

مشاہیر ملت اور جانے پہچانے ہوئے اہل قلم کا تاثر

میں خوش نصیبی سمجھتا ہوں اپنی کہ قوم میرے گوشہ نشین ہو جانے پر فقیر خانہ پر قدم رنجہ کرتی ہے اور اشاعت سے پہلے لکھے ہوئے صفحات سنانے والے مسلسل مل رہے ہیں اور بیرون ملک سے بھی صدائے تحسین و آفریں بلند ہے دامن قرطاس تنگ ہونے سے میں صرف پرانے دوست مولوی محمد ایوب صاحب قادری بدایونی ایم اے اسسٹنٹ پروفیسر اردو کالج کراچی جن کو ادارت الواعظ کے وقت سے جانتا ہوں ان کا گراں قدر عطیہ بصد مسرت پیش کرتا ہوں جو اس تاریخ اور ادارہ کے خدمات سے بھی زبردست تعاون ہے

آغا مہدی خلف مولانا سید محمد تقی آل غفران مآب

۳ مئی ۱۹۷۶ء

ل روزنامہ جنگ کراچی یکم ستمبر ۱۹۷۶ء

باسمِ اللہ الرحمٰن الرحیم الکبیر القدیر

۱۳ ھ ۹۶

۱- کامیاب تاریخ لکھنؤ ۱۳۹۶ھ
۲- تاریخ ناحیۂ لکھنؤ ۱۳۹۶ھ
۳- جمال تاریخ لکھنؤ ۱۳۹۶ھ
۴- تاریخ پاکان لکھنؤ ۱۳۹۶ھ
۵- تاریخ جمال لکھنؤ ۱۳۹۶ھ
۶- تاریخ باب مسعود ۱۳۹۶ھ
۷- تاریخ اقبال دوام ۱۳۹۶ھ
۸- تاریخ احباب صفا ۱۳۹۶ھ
۹- تاریخ القدیم ۱۳۹۶ھ
۱۰- تاریخ وادی قدس ۱۳۹۶ھ
۱۱- تاریخ قدوسیہ ۱۳۹۶ھ

* * * * * *

۱- تاریخ ندرت لکھنؤ ۱۹۷۶ء
۲- تاریخ صحبت قدیم لکھنؤ ۱۹۷۶ء
۳- تاریخ مشہور زمانہ لکھنؤ ۱۹۷۶ء
۴- تاریخ گلشن مطہر لکھنؤ ۱۹۷۶ء
۵- تاریخ مطلع شہر لکھنؤ ۱۹۷۶ء
۶- تاریخ شمع دانش ۱۹۷۶ء
۷- تاریخ جاہ و رفعت ۱۹۷۶ء
۸- تاریخ شہر بزم طرب ۱۹۷۶ء
۹- تاریخ شہر نادرہ ۱۹۷۶ء
۱۰- تاریخ شہر باب مدینہ علم ۱۹۷۶ء
۱۱- تاریخ شہر زیب ارم ۱۹۷۶ء
۱۲- تاریخ شہر جامع علوم ۱۹۷۶ء

* * * * * *

۱- مؤلف حکیم زمن آغا مہدی ۱۳۹۶ھ
۲- مؤلف فرید عصر آغا مہدی لکھنوی ۱۳۹۶ھ
۳- مؤلف یگانۂ دہر مولانا سید آغا مہدی صاحب لکھنوی ۱۹۷۶ء
۴- زبدۃ العلماء علامہ سید آغا مہدی صاحب لکھنوی ۱۹۷۶ء
۵- مورخ اہل دل آغا مہدی ۱۹۷۶ء

* * * * * *

۱- قیم جمعیت خدام عزا ۱۳۹۶ھ
۲- منادی جمعیت خدام عزا منصورہ کراچی ۱۹۷۶ء
۳- احزان جمعیت خدام عزا کراچی نمبر ۳ ۱۹۷۶ء

* * * * *

۱- منشی دل افگار محمد ایوب قادری کراچی ۱۳۹۶ھ
۲- پیش کردہ فکر لطیف. محمد ایوب قادری ۱۳۹۶ھ
۳- راقم آثم ملازادہ محمد ایوب قادری ۱۳۹۶ھ
۴- ہدیۂ نو، از راقم آثم محمد ایوب قادری ۱۳۹۶ھ

* * * * * * *

---

[1] یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ آیۂ کریمہ کے ۷۸۶ عدد ہیں یا ۷۸۷، اس موضوع پر تحقیق باسم اللہ مرزا محمد شاہ عالم مرحوم لکھنوی کی کتاب کئی مرتبہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی نامی پریس لکھنؤ ۱۹۳۲ء کا ایڈیشن میرے کتب خانے میں موجود ہے حجۃ الاسلام صاحب قبلہ رحمہ اللہ نے اپنے خط میں اس خدمت دین کو استحسان سے دیکھا ہے۔

وزیر اعظم اسلامی جمہوریہ پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو کا گرامی نامہ

۲۸۶

70. Clifton
Karachi.

5-2-71

مکرمی جناب آغا صاحب

السلام علیکم۔

آپ کی ارسال کردہ کتاب موصول ہوئی۔ اس نوازش کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ انشاء اللہ وقت ملنے پر مستفید ہونے کی کوشش کروں گا۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ [illegible]

Yours sincerely

ذوالفقار علی بھٹو

قطعہ تاریخ

سنہ طبع

عمدۃ الحکما واحد یادگار خانوادہ کامل حکیم سید حیدر نواب یدی لکھنؤ

ہے سرگذشتِ علم و کمالاتِ آگہی — ماضی کی داستان ہے تاریخ لکھنؤ
اہلِ نظر کا قول ہے حیدرکا ہے خیال — اک مستند بیان ہے تاریخ لکھنؤ

۱۹۷۶ء

مصنف کے خدمات پر ہمبرگ سے ہدیۂ تبریک

صمیمانه ترین تبریکات بمناسبت آغاز سال نو تقدیم وامیدواریم عمر یرا با خوشبختی وسعادت بسر بریم.

ساعت تحویل سال ۱۳۴۲ بوقت اروپای مرکزی:

نه و بیست دقیقه صبح روز پنجشنبه ۲۱ مارس ۱۹۶۳.

روزهای پنجشنبه اول وجمعه دوم فروردین درمحل جمعیت برای زیارت دوستان مفتخر خواهیم بود.

جمعیت اسلامی ایرانیان در هامبورگ

محمد محققی

Herzliche Glückwünsche

Zum Neuen Jahr 1342

Frühlingsanfang:

Am Donnerstag, den 21. März 1963

um 9[20] Uhr MEZ

ISLAMISCH- IRANISCHE GEMEINDE IN HAMBURG E.V.

Hamburg 13, Isestr. 13

M. MOHAGHEGHI

*

مولوی محمد رضا فرنگی محلی مدیر قومی آواز لکھنؤ کے کلمات استحسان

فرنگی محل لکھنؤ

۲۰ جمادی الثانیہ ۸۲ھ

مکرمی تسلیم ۔ گرامی نامہ مورخہ ۲۰ جمادی الاول ۸۲ھ [illegible]

علمی کتبخانہ نے بھیجی ہے [illegible] وقت [illegible] کی کوشش کر رہے ہیں [illegible]

آپ مرتب کر رہے ہیں ۔ بڑی مسرت کی بات ہے [illegible] شدید ضرورت تھی

[illegible] بارے میں بہت سی معلومات [illegible] ہیں [illegible]

[illegible] مطلع کر رہا ہوں ۔ [illegible] کوئی خدمت ہو تو [illegible]

[illegible]

[illegible] میں [illegible] ہو سکی ۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] کرتا ۔ مخلص محمد رضا انصاری فرنگی محلی

لا مارٹینیر کالج

قطعہ تاریخ کتاب تاریخ لکھنؤ

خطیبِ اہلِ بیتؑ سیّد سعید جاوید جعفری (ایم ایس سی)

نگاہ بین یہ ہوا کون بہ منظرِ لکھنؤ
شہید و شاہد و مشہود و مصدرِ لکھنؤ

نقیش و خازن و زین اور زبدۃ العلماء
سعید و سعد و مسعود و صفدرِ لکھنؤ

ہوا + کون + بہ + منظر + لکھنؤ = ۱۳۹۶ھ
نقیش + خازن + وزین + اور زبدۃ العلماء = ۱۹۷۶ء
و + زین + او = ۸۰ سال عمر شریف مؤلف مدظلہ العالی حضرت مولانا آغا مہدی لکھنوی

شاہ نجف:۔ غازی الدین حیدر بہادر مرحوم شاہ اودھ
کی عظیم الشان یادگار

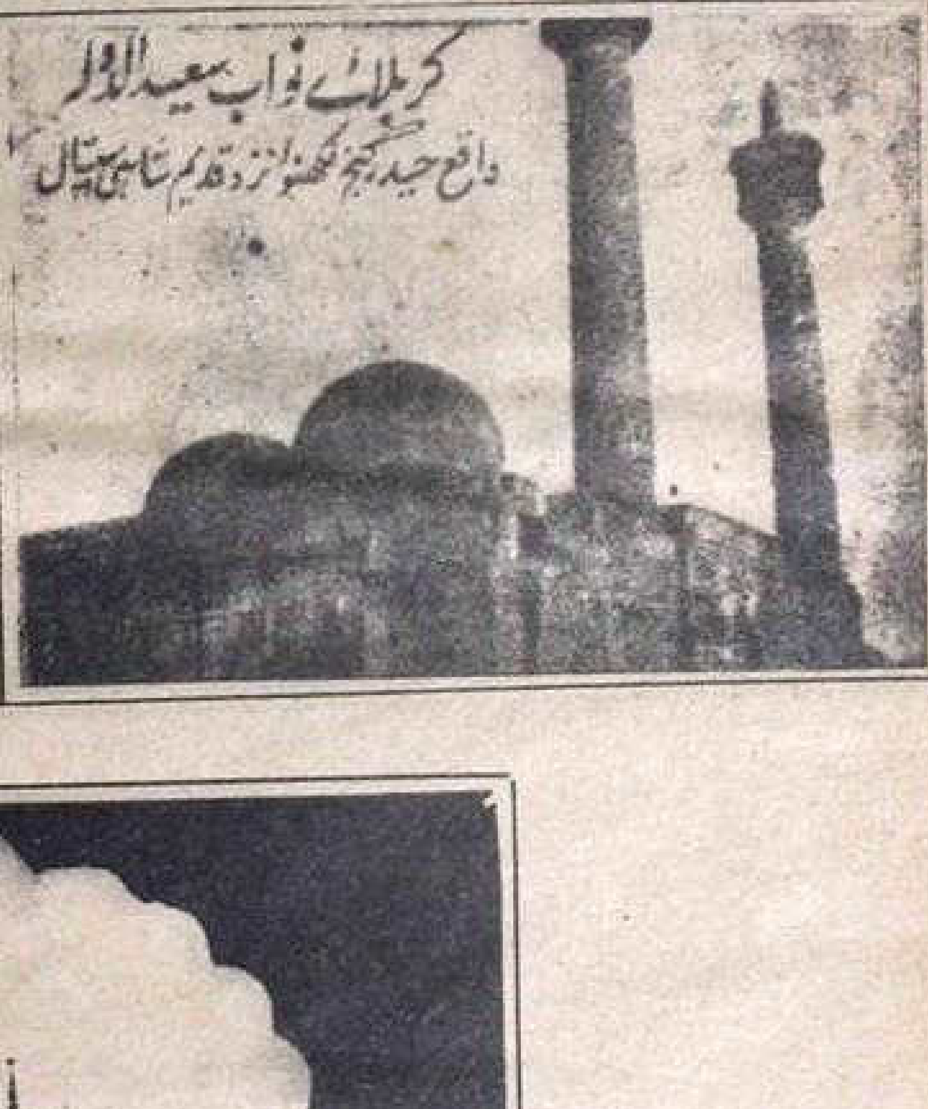

کربلائے نواب سعید الدولہ
واقع حیدر گنج لکھنؤ نزد قدیم شاہی اسپتال

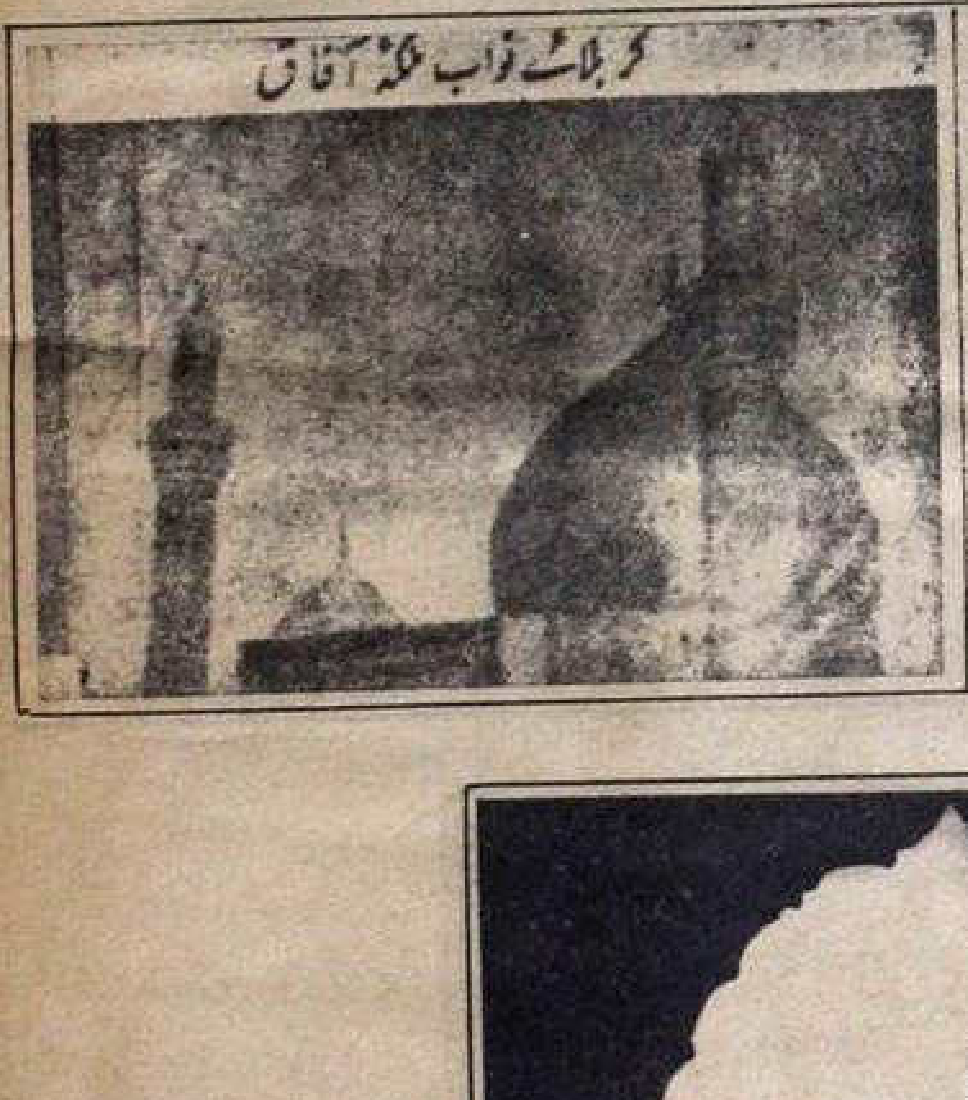

کربلائے نواب ملکہ آفاق

امام باڑہ حسین آباد لکھنؤ کا ایک منظر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برات میں دولہا، چمن میں گل، پھول میں خوشبو، چراغ میں لو، جسم میں روح، آنکھ میں نور، دل میں سرور، سیپی میں موتی، ناؤ میں لنگر کی جو شان ہوتی ہے وہی حیثیت شہر بن کر صوبہ میں زمین لکھنؤ کی تھی۔ کس کو علم تھا کہ جنگل میں منگل ہوگا

؎ ہر تنزل کو ہے اک رنگ ترقی دہر میں ۔۔۔۔ اب جہاں گلشن نظر آتا ہے آگے بیشہ تھا

عہد نوابی اور شاہی میں شہر کی کیا شان تھی یہاں کی گلیوں میں کتنی رونق اور بازاروں میں چہل پہل ہوگی آزادی کے متوالے اور دیسی حکومت کے خواہاں کہاں کہاں رہتے تھے۔ صاحبانِ کمال کی لاتعداد ڈیوڑھیاں تھیں اس سچی کہانی کے سننے والے تو بہت ہوں گے مگر ذمہ دارانہ بیان دینے والا شہر کے طول و عرض میں مجھے ایک بھی نظر نہیں آتا ——————

TAMES HENERY HEXLAY[1] اپنی جوانی کے زمانے میں کہا کرتا تھا کہ علماء سائنس کو ساٹھ برس کے سن میں دنیا سے علیحدہ ہو جانا چاہیئے تاکہ وہ اپنی قدامت پسندی سے رفتار ترقی میں حائل نہ ہوں لیکن جب ہکسلے خود ساٹھ سال کا ہو گیا تو اس کو خود اپنی بات کی جانچ پرتال کا موقع ملا ہم اپنی موجودہ حالت تنزل میں اپنی بے مائیگی اور زبوں حالی کے اسباب کی تلاش جب کرتے ہیں تو ہماری نظر دور نہیں جاتی اور ہم کو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی گزشتہ تاریخ کا کافی مطالعہ نہیں کیا اور عمیق غور و خوض سے کام نہ لیا یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ ایسے مرکز کمال شہر کی ہمارے پاس کوئی مکمل تاریخ نہیں۔

جب نوجوان اپنی عزیز ترین زندگی کے توجہات کو علمی مشاغل کی طرف مشغول نہ کریں تو میں بڑھاپے میں کمر ہمت مستحکم نہ کروں تو کون ہے جو اس میدان میں آگے بڑھے۔ جس علم افروز دور میں یہ کام ہونا چاہیئے تھا وہ گزر گیا اب تو کمالات کا سورج ڈوب چکا ہے شفق باقی ہے اگر اندھیرا ہو گیا تو پھر چراغ لے کر بھی ڈھونڈنے سے حقائق نہ ملیں گے اور ناکامی کا روز سیاہ سامنے آئے گا۔

فن تاریخ میں سچائی کام کی جان و روح ہے مگر یہ آتمہ आतमा ڈھونڈنے سے بھی بمشکل ملتی ہے اصلیت کا نہ جاننا ملک کی بڑی بدنصیبی ہے۔ آثار قدیمہ سے دلچسپی ذوق سلیم کا وہ حق ہے جو فطرت نے اس کو دیا اور مبارک ہیں وہ لوگ جو زمانے کے مٹتے ہوئے نقوش کی تصویر کھینچتے ہیں۔ شیخ محی الدین ابی محمد عبدالواحد بن علی تمیمی نے تاریخ اندلس نذر قرطاس کی صالح بن یحییٰ نے تاریخ بیروت لکھی شیخ محمد بن شحنہ نے تاریخ حلب مدوّن کی اسی طرح تاریخ شام تاریخ بغداد وغیرہ دنیا کے مشہور شہروں کی تاریخیں سامنے ہیں مگر لکھنؤ پر جس نے لکھا وہ یا تو افسانوی حدود میں رہ کر نقد و نظر کی کسوٹی پر ٹھیک نہ اترا یا عصبیت کے رنگ میں قلم فرسائی ہوئی اور مطالعہ کرنے والے اسلوب نگارش پر کف افسوس مل کر رہ گئے خواجہ عبدالرؤف عشرت کی جد و جہد مقالات کی صورت میں عبدالحلیم شرر کی کاوش ناولانہ رنگ اور تجارت کو کامیاب بنانے کی دھن میں بے شک موجود ہے مگر تاریخ کہے جانے کے لائق ایک کتاب بھی نہیں ہے ہر واقعہ نگار محدود پہلوؤں کے اجاگر کرنے میں سیرت نگاری کے تمام گوشوں کو طے نہیں کر سکا۔

---

[1] ٹامس ہنری ہکسلے ۴ مئی ۱۸۲۵ء کو اطراف لندن میں پیدا ہوا یہ مشہور سائنسداں ہے۔

تاریخ اودھ کے مطالعے میں میرا دل و دماغ بار بار اس بات کو سوچتا رہا کہ کاش سیر حاصل بحث ہوتی یہاں تک کہ میرے دادا صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک طومار[1] پرانے کاغذات میں ملا جو بیچ کا ایک ٹکڑا تھا شروع اور آخر سے ضائع ہو چکا تھا اس نوشتہ میں لکھنؤ کے سربرآوردہ لوگوں کی محلہ وار فہرست تھی اس متبرک اور مقدس تحریر کو برسوں حرزِ جاں بنا کر محفوظ رکھا اس انتظار میں کہ جب وقت آئے گا قلم اٹھاؤں گا ممکن ہے کہ طبعی ذوق توارث کے ذریعے سے اس تخم کی بارآوری کا موقع دے اور میری یادداشتوں کی بہتات اور فراوانی جو کشکول[2] کی مختلف جلدوں میں جا بجا آسمان کے تاروں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں یکجا ہو جائیں۔

میرے ارادوں کا اساس اگر طومار تھا تو یہ جذبہ بھی عزائم کی بنیاد ہوا کہ زمانہ گزرنے سے پرانے نقوش مٹتے جا رہے ہیں شہر کی کتنی عمارتیں اور سربلند قصر گر گئے اور جو باقی ہیں ان کے خصوصیات پردۂ اخفا میں ہیں ڈر ہے کہ ماضی بعید جس طرح سے مٹا ماضی قریب بھی مٹ نہ جائے لکھنؤ کے ہمہ گیر خصوصیات کو زندہ رکھنا پرانے کھنڈر دیکھ کر ان کی بنیاد دریافت کرنا۔ پچھلے تمدن سے اگلے روایات کا موازنہ وہ خدمات اور انسانیت کے اہم فرائض ہیں جن کو متمدن اقوام لگاتار کوششیں کر کے انجام دے رہے ہیں سرمایہ پانی کی طرح بہہ رہا ہے ایسا ہی تھا جبھی شعراء عرب نقش قدم محبوب کے گرد پروانہ کی طرح پھرتے تھے وہ منزل محبوب کے اکھڑے ہوئے خیموں کی افتادہ زمین کو اکسیر سمجھ کر سرمۂ چشم اور طناب خیمہ کی یاد میں غلطاں پیچاں رہنے کو مقصد حیات سمجھتے تھے۔ شامیانۂ حبیب کی میخوں کے نشان ان کے دلوں میں گھر کر جاتے تھے اور راستے سے گزر جانے والے ناقۂ لیلیٰ کی بیٹ کو میوۂ دل سمجھتے تھے۔ بغداد میں کوچۂ متبنّیٰ، کوفہ میں مالک اشتر لین (شارع مالک اشتر) موجود ہے مگر ہمیں نہیں معلوم کہ مرزا پناہ علی مرثیہ خواں المتخلص[3] بہ افسردہ کہاں رہتے تھے منشی غلام مرتضیٰ[4] خلف ملا محمد روضہ خواں کا مکان کہاں تھا۔ تاریخ اودھ پر قلم اٹھانے والوں سے شکوہ ہے کہ انھوں نے صاحبانِ کمال کے ناموں کو باقی رکھنے کا کوئی خیال نہ کیا اور وہ ملیا میٹ ہو گئے ؎

نام نیک رفتگاں ضائع مکن + تا بماند نام نیکت پائدار" عہد سعادت علی خاں کے داستان گو میر انور[5] لکھنؤ کے کس محلے میں تھے ان کے بیٹے سید[6] قاسم علی کا مکان کدھر تھا۔ عہد آصفی کی طوائف سندر (رکھنی) ان پر عاشق تھی دنیادار طبقے کے ساتھ دیندار لوگوں کے گھروں کا بھی پتہ نہیں امام علی خاں[7] اور نوازش علی خاں جمعدار کے صرف نام باقی ہیں یہ سب ذرات وطن کے جگمگاتے ہوئے تارے تھے جن کا نہ کوئی تذکرہ ہے نہ کوئی تعارف ہے اس ادھیڑبن میں میں نے طے کر لیا کہ ارض وطن کے چپے چپے پر بحث ہو اور تہذیب رفتہ کی مٹی ہوئی تصویر کا ایک صحیح عکس میں اپنے ہاتھ سے پیش کروں مجہول مقامات کی حقیقت اور اولیت کا پتہ چلایا جائے اور زمانۂ ناہنجار نے جو پردۂ خفا ڈال دیا ہے وہ کسی طرح اٹھ جائے مشرقی علوم کی یاد تازہ کرتے ہوئے ہر محلہ کے نام قرار پانے کی وجہ وہاں کے تاریخی خصوصیات

---

[1] طومار اس کاغذ کو کہتے ہیں جس کے ختم ہونے پر دوسرا کاغذ جوڑ کر اس کو اتنا طولانی بنا دیا جائے کہ وہ دستاویز یا تحریر بغیر ورق الٹے ہوئے ایک ہی سلسلے پر ختم ہو اور اس کو لپیٹ کر ٹین کے چونگے میں یا کسی دوسری طرح محفوظ رکھیں [2] مؤلف کی کتاب ذواجب کی طرف اشارہ ہے جو تین جلدوں میں علمی اور تاریخی اور ادبی یادداشت کی کشکول ہے [3] تاریخ اودھ مؤلفہ نجم الغنی ص ۱۲۶ ج ۱ [4] ایضاً جلد ۴ ص ۲۳۸ [5] تاریخ اودھ ج ۱ ص ۱۰۲ [6] تاریخ اودھ مؤلفہ نجم الغنی طبع مطبع نولکشور ۱۹۱۹ء یہ تاریخ نواب صاحب رامپور کے ایما سے لکھی گئی ہے [7] تاریخ قیصری ص ۱۴۳

ادبی صحبتیں، قدیم جغرافیہ، تیرھویں صدی کے قومی رہنما اور خاص خاص پیدا شدہ لوگوں کے حالات اور زندگی کے کارنامے کسی طرح ضبط تدوین میں آجائیں۔

کام کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے سب سے پہلے ماحول تیار کرنا پڑا میرے عزیز دوست شیخ تصدق حسین صاحب بی اے، ایل، ایل، بی رانی کرہ سے طائر ملک سبابن کر آئے یہ کوئی پندرہ برس پہلے کی بات ہے اور وہ وقت ہے کہ میرے ہاتھ میں دوسری مرتبہ مدرسۃ الواعظین کے علمی، تاریخی آرگن الواعظ (ماہنامہ) کی ادارت آئی اور بلا تکلف ممدوح کے مقالات جریدہ مذکور میں دینا شروع کئے اور آٹھ سات برس تک کبھی بجنسہ اور کبھی حذف واسقاط کے بعد اور کبھی میرے اختلافی نوٹ کے ساتھ مضامین چھپتے رہے اور فاضل مضمون نگار نے اپنے مقالات[1] میں میرے تعاون کا ذکر بھی کیا بلکہ تاریخ اودھ کے سلسلے میں اپنے حسن خدمات پر مجھ سے سند بھی حاصل کی۔

اس علمی اقدام کے بعد ایک مرتبہ اندھیری رات میں تاریخ اودھ کے دوسرے دالہ وشیفتہ نوجوان راجہ بخشی ایڈوکیٹ ان خدمات کا شہرہ سنکر فقیر خانہ پر آئے یہ ملک کے ان نوجوانوں میں ہیں جن کے مستقبل سے خوش آیند ترین امیدیں وابستہ ہیں میرے عزائم کی قدر کرتے ہوئے تاریخ اودھ کے موضوع پر کتابیں بہم پہنچانے کا وعدہ کیا اور اپنی کار پر بعض آثار قدیمہ دکھانے میں زحمت بھی کی یہ اس وقت کی بات ہے جب میں اپنے سینے میں معلومات کا دریا بند کر چکا تھا، حسین الدین خاں کی چھاؤنی، مینڈو خاں کی سراء، موہنی کا پروا، پیر جلیل پیدل جاکر دیکھ چکا تھا اور سواری نہ ہونے کا عذر بارد، بڑھاپے کی ناطاقتی سے میرے کام میں سستی کی جھلک نہ تھی سرسید تاریخی مقامات[2] لکھتے وقت قطب مینار کی تحریریں پڑھنے کے لئے چھینکے میں لٹک کر اتارے اور چڑھائے جاتے تھے۔ مجھے افسوس رہ گیا کہ بعض تحریریں بہت اونچے پر تھیں میں پڑھنے سے محروم رہا اور ایک آدھ عمارت تک خود نہ پہونچ سکا چنانچہ امام باڑہ آصفی کی بھول بھلیاں اگر اپنی آنکھ سے دیکھتا تو اس انوکھی راہ پر اس سے زیادہ لکھتا جتنا کہ لکھ سکا ہوں مگر ماحول ناسازگار ہونے اور عربی نژاد ہونے کی وجہ سے کبھی واقلۃ ناصراہ OH WHAT A DIRTH FRIENDS AND HELPENS اور کبھی آہ من قلۃ الزاد —— OH WHAT A DIRTH OF NESSISARIES FOR JOURNEY کہتا ہوں پھر بھی جو آثار قدیمہ اس کتاب میں لکھ رہا ہوں ان میں شاذ و نادر خال خال میرے بے دیکھے ہیں ورنہ رپورٹر کے بیان پر اکتفا نہیں کی۔ سب پر خود جا جاکر نظر کی یہاں تک کہ پرانے تکیوں پر جاکر اپنے رفقاء سے قبر کے پتھر تک پڑھوائے اور اس دوڑ دھوپ میں مجھے ایسے اتفاقات ہوئے کہ اگر ان کو بھی قلمبند کردوں تو عمر حاضر کی عقلیں باور نہ کریں حافظ شیرازی کی آواز آرہی ہے ؎ ایکہ بر ما بگذری دامن کشاں + از سر اخلاص الحمدے بخواں

آج سے پہلے لکھنؤ کے آثار قدیمہ کے تحفظ کا خیال خود اس ظالم طبقے کی فردوں کو ہوا تھا جو قدیم لکھنؤ کے مٹانے میں کامیاب ہی نہیں ہوا بلکہ زوال سلطنت کے بعد جس کی نظر میں ملکی حکومت کے خواہاں باغی قرار دیئے گئے اس کتاب کے مطالعے سے آپ کو معلوم ہو گا کہ انگریزوں نے انقلاب غدر میں ½ لکھنؤ باقی رکھا اور پورے شہر کو کھود کر پھینک دیا مجھے یاد ہے کہ جنگ عظیم کے اضطراب آفریں اور المناک موقع پر PARIS کی گولہ باری کا تصور کرکے بین الاقوامی شخصیتیں لرزہ براندام تھیں مگر لکھنؤ میں آنے والے چنگیز خاں نے شہر کے بچانے کا تصور بھی نہ کیا اور جذبہ انتقام میں کامیاب ہوئے ½ صدی تک انگریز آزادی کے حامیوں کو قہر آلود

---

[1] سفینۂ حیات جلد پنجم ص۱۳۴ پر نقل سند بخط موصوف موجود ہے [2] وفات ۱۸۹۶ء

نظرسے دیکھتے رہے بات پرانی ہوتی اور نسلیں گذرتے پر شہر کے رہتے سہتے در و دیوار کے نظارے نے جب مشرقی کمالات کو عدیم المثال قرار دیا اور غفلت کی آگ بجھی تو وہی انگریز آثار قدیمہ قائم کرکے حفاظت پر تیار ہوئے ع چہ کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی۔ یکم اکتوبر ۱۹۲۰ء کو L.M. JAPLING DEPUTY COMMISSIONER نے شمس العلماء[1] مولانا سید ناصر حسین صاحب کو PRESEDNT قرار دے کر ایک کمیٹی بنائی اور نائب صدر شاہزادہ مرزا ثریا قدر بہادر[2] کو مقرر کیا شیعہ آثار قدیمہ کے تحفظ کا اس سے بہتر انتظام اور نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر پھر کیا ہوا جس طرح سیکڑوں انجمنیں قائم ہوتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں اداروں کی تشکیل ہوتی ہے اور شیرازہ بکھر جاتا ہے اسی طرح انگریزوں کا یہ منصوبہ بھی پورا نہ ہوا۔

ہاں خوب یاد آیا اس سلسلے میں مجھ سے بھی ایک غلطی ہو گئی جس کا افسوس عمر بھر کرتا رہوں گا ماہ صفر ۱۳۵۶ھ میں میرا قیام حیدرآباد دکن میں تھا اور نواب محمد ہمت علی خاں گھٹالہ جاگیردار بارہ دری تاڑ شاہ راہ کوہ شریف ملنے آئے لکھنؤ کا ذکر آیا تو فرمایا کہ اگر تم نگراں ہو جاؤ تو میں کم از کم لکھنؤ کی تمام کربلاؤں اور امام باڑوں کی مرمت اور بقاء کی اسکیم بناؤں میری پالیسی ہمیشہ مالیات سے دور رہنے کی ہے اس لئے انکار کیا اور ان کو جواب دیا کہ آپ شیعہ لیڈران سے جو کچھ کہنا ہے کہیں یہ جواب اصول شکنی کے ڈر میں اس وقت صحیح تھا مگر اب دست تاسف ملتا ہوں مواقع گذر کر انحطاط قومی و ملکی کا دور آ گیا۔ ذوق سلیم بھی رخصت نہیں ہوا۔ محسوسات اور غیر محسوسات دونوں میں انقلاب آیا کبیرداس کو اپنے زمانہ کا شکوہ تھا ؎

رنگی کو نارنگی کہیں نقد مال کو کھویا + چلتی کو گاڑی کہیں دیکھ کبیرا رویا" آج وہ ہوتے تو کیا حال ہوتا وقار رفتہ ختم ہوا زبان پر پانی پھرا اب تو ہم خالی ہاتھ ہیں پھر بھی ؎ یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ + سن رکھیو تم فسانہ ہیں ہم لوگ

کن لوگوں نے مدد دی اور کون کون زندہ ہوتا تو کتنی مدد ملتی

یہ تاریخ اگر میں بیس برس پہلے لکھنا شروع کرتا تو لکھنؤ میں ایسے لوگ تھے جو معلومات کا سمندر تھے نواب سید صادق حسین عرف امیر صاحب رؤسا خاقان منزل کے آخری چراغ انگریز حکام ان کے شاگرد تھے کوئی گھرانا لکھنؤ کا ایسا نہ تھا جس سے وہ باخبر نہ ہوں یہ نہ تھے تو کاش داروغہ سید محمد صاحب جو گول دروازہ کے عالیشان مکان میں رہتے تھے زندہ ہوتے وہ مجسّم تاریخ تھے یہ بھی نہ رہے۔

پھر بھی اس وقت میرے پاس علم سینہ اور ذاتی مشاہدات حاصل کرنے کے کچھ ذریعے تھے جن کو غنیمت سمجھا۔

(۱) نواب مرزا محمد شاہ عالم صاحب، خاندان شاہی میں سب سے بوڑھے چوکھی کے معزز باشندہ اور تحقیق بسم اللہ کے کامیاب مؤلف' ایک وقت وہ تھا کہ موصوف میرے پاس دن میں دو مرتبہ آتے تھے اور کتاب مذکور کے تینوں ایڈیشن میرے دیکھتے دیکھتے تیار ہوئے اب چوراسی برس کی عمر ہونے پر ناتوانی ان کو آنے سے روکتی ہے سامعہ باصرہ جواب دے رہے ہیں۔

(۲) نواب طاہر علی خاں صاحب۔ خاندان شجاع الدولہ کے بڑے نامور اور سن رسیدہ شخص تھے ان کے خیالات کا عمق اور طرز بیان کی صفائی لکھنؤ بھر پر روشن ہے[3] اگلے سال انتقال ہوا ہے میں ان کے معلومات سے دامن بھر چکا۔

(۳) نواب حسین علی خاں اور ان کے دونوں فاضل بھائی اس کتاب سے خاص شغف رکھتے ہیں اور ہر سہ برادران روایتی

---

[1] وفات یکم رجب ۱۳۶۱ھ [2] ملاحظہ ہو ماہنامہ رسالہ شیعہ کھجوہ ضلع سارن بابت اکتوبر ۱۹۰۸ء [3] وفات ۱۹۳۱ء

اور خاندانی وقار کے حامل ہوتے ہوئے نکتہ سنج نکتہ رس ادیب اور شاعر ہیں۔ میں نے سعدی کے اشعار پر ان کی تضمین دیکھی وہ میرے اوقات مدرسہ کے قیام کے لحاظ سے پڑوسی ہیں میرے دل میں ان کی عزت ہے وہ گھر والے ہیں لکھنؤ ان کا گھر ہے شہر کی پہلی خشت انھیں کے گھرانے سے نصیب ہوئی ان کے علم سینہ سے فائدے اٹھائے اور کتاب کے بعض مقامات ان کو بھی سنائے اور کہیں کہیں کے ورق مطالعے کے لئے دئے اختلافات میں ان کی رائے کو صحیح سمجھا اور بھروسا کیا ان ذرائع کی موجودگی میں مجھے ان منڈیوں تک جانے کی نوبت نہیں آئی جو سلطنت اودھ کے نام پر پیٹ بھر رہے ہیں جن کی ترجمانی افسانوی حیثیت سے زیادہ وزن نہیں رکھتی اسٹیج اور حقیقت میں زمین آسمان کا فرق ہے تصدق حسین وکیل اور نئے دور لکھنؤ کے بعض اہل قلم انگریزدل کے اقوال کو قرآن وحدیث سمجھ کر بڑی وقیع نظروں سے دیکھتے ہیں مگر میری نظر میں حقائق دانی کے لئے جذباتی مزاج سہم قاتل ہے ان کی غاصب سے زیادہ حیثیت نہیں ہے انگریز وہی ہیں جو بجلی بن کر لکھنؤ پر گرے طوفان ہو کر خوبصورتیوں کو بہالے گئے قہر و غضب کی گھٹا ہو کر خطرناک بھیس میں دل کھول کر برسے صاعقہ بن کر چمکے بادل کی طرح گرجے۔ جب مطلع صاف ہو گیا تو دلوں میں ٹھنڈک پڑی انگریزوں ہی کے زمانے میں آزادی کے حامی باغی کی گھنونی لفظ سے پکارے گئے یہ وہی آزادی تھی جو آئرلینڈ کے سامنے ہے۔ جنوبی افریقہ میں لہر بن کر دوڑ چکی تھی اسے حکومت برماتے سامنے رکھا اور آخر میں مسلم لیگ اور کانگرس کی پونجی ہوئی سلسلۂ تحریر میں دوسری کتابوں کی عبارتیں نقل کرتے ہوئے میرے احتیاط نواز قلم سے بھی بغاوت کی لفظیں نکل گئی ہیں ان کو دیکھ کر ناظرین یہ نہ سمجھیں کہ میں بھی انگریزوں کا پارٹ لے رہا ہوں وہ صرف نقل قول ہے اور بس۔

میری نظر میں تاریخ اودھ کا وہ قلم ایک حیثیت رکھتا ہے جو برٹش راج میں ہندوؤں کے ہاتھ سے ترتیب پا گیا۔ اس میں نہ غاصبانہ شکوہ ہے نہ فرقہ وارانہ دبدبہ، بلکہ وہ اودھ کا غمگوار ہوتے سے جو کہتے تھے سچ تھا اور جو لکھتے تھے وہ اثر میں ڈوبا ہوا ان کے ذہن بھی تعصب پروری کے زنگ سے آلودہ نہیں ہوئے۔

لکھنؤ کے کتب خانوں میں ۳۰ ہزار سے زیادہ وہ کتابیں ہیں جن کو میں گھر بیٹھے دیکھ سکتا ہوں اور نظر تعمق سے دیکھتا رہتا ہوں اور مجھے آج تک کے علمی تجربے نے بتایا ہے کہ چیز ہمیشہ مارکیٹ ہی میں نہیں ملتی بلکہ کبھی نظر باز کو اس دوکان پر بھی سودا مل جاتا ہے جو اس کے فروخت ہونے کا ٹھکانہ نہ ہو چنانچہ میں نے مذہب امامیہ کی فقہی کتابوں شرائع الاسلام مطبوعہ سلطانی تک سے فائدہ اٹھایا ہے اور عہد شاہی کے "پریس مین" اور چھاپہ خانوں میں کام کرنے والوں کے نام اس کتاب سے حاصل کئے۔ پرانے زمانے میں یہ دستور تھا کہ "پریس مین" کاپی پتھر پر پہونچانے سے پہلے کگر پر اپنا نام لکھ دیتا اور کاغذ موڑنے پر وہ نام لپیٹ میں آجاتا مگر پتہ چلانے والے سمجھ جاتے کہ یہ کاپی کس ورکر کی خدمت کا پھل ہے۔

اب رہا یہ امر کہ میں نے اس کتاب کو کن کتابوں سے مدد لے کر تالیف کیا ہے اس سوال کے جواب میں آپ کو دو فہرستیں اور نقشے ملیں گے پہلی وہ فہرست ہے جو دیباچہ ہذا سے پہلے جگہ دی گئی ہے اور دوسری لسٹ وہ ہے جو دیباچے کے بعد ہدیۂ ناظرین ہے اس فہرست میں صرف ان کتابوں کا نام اور تعارف ہے جو اودھ کی خاص ہسٹری ہیں اگرچہ فٹ نوٹ میں ہر کتاب کا حوالہ اپنی جگہ آتا رہے گا لیکن اس کتاب کے مصادر اور ماخذ دریافت کرنے کے لئے ایک نقشے کا ہونا ضروری ہے وہ آئندہ صفحات میں آپ پڑھیں۔

آخر میں کچھ اور ضروری باتوں کا اظہار بھی بہتر معلوم ہوتا ہے کتاب کے اختتام تک شباب لکھنؤ اور اس موضوع کی اس سے

زیادہ کتابیں مجھے دستیاب نہیں ہوئیں جن کی فہرست پیش کی جا رہی ہے جو کتابیں نہیں مل سکیں اس کی کوئی بسیط اور تحقیقی حیثیت نہیں ہے ایسی ہی کچھ وہ بھی ہوں گی جو کہ میں دیکھ چکا ہوں اس کتاب کی ترتیب اور تیاری کی اطلاع اخبارات میں آنے پر بھی کسی شخص نے کوئی قلمی مدد نہیں کی اور میں نے یہ تمام صفحات بلا شرکت غیرے لکھے اور کتاب کی بین الاقوامی حیثیت قرار دی ہے جس کو لکھنؤ سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص پڑھے اور جذبات برانگیختہ نہ ہوں۔

لکھے ہوئے حالات میں تہذیب لکھنؤ اور معاشرت پر بھی ضمنی بحث ہے اور ان عنوانات پر تیز روشنی ڈالی ہے۔ جن پر اب تک واقعہ نگار سیر حاصل بحث نہیں کر سکے یا جن موضوعات پر قلم فرسائی میں ان کو توجہ نہیں ہوئی اور ان کا حقیقت کی گہرائی تک ذہن نہیں پہونچا ان کو میں نے طے کیا ہے اور پیش پا افتادہ موضوعات پر اشارہ کر کے چھوڑ دیا ہے۔ کتاب کا نام سیر لکھنؤ یا پرانا دور تفریح لکھنؤ وغیرہ ہو سکتا تھا مگر میں نے اس ذخیرہ کا نام رکھا ہے تیرہویں صدی کا لکھنؤ مجھے ہرگز امید نہ تھی کہ میرے گوناگوں علمی مشاغل میں یہ کام اس قدر جلد انجام کو پہونچے گا اور سوا دو برس کے اوقات فرصت میں عمر بھر کی محنت سمٹ آئے گی جو ارادہ تھا وہ پورا ہوا لوگسی اور طرف بھی سے اے کارساز قبلہ حاجات کارہا + آغاز کردہ ام تو رسانی بانتہا" نظر ثانی اور طباعت پر میری محنت ٹھکانے لگے گی اس کتاب میں تیرہویں صدی کے پیدا شدہ لوگوں کے کچھ حالات بھی میں نے لکھے ہیں اور بعض ناموں کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا ہے اس لئے کہ دوسرے ذرائع سے ان کے حالات دریافت ہو سکتے ہیں اور بعض غیر نمایاں شخصیتوں کے حالات پر جم کر بحث کر دی ہے صرف اس لئے کہ ان کے واقعات زندگی دریافت کرنے کا دوسرا ذریعہ نہیں ہے اور کتاب کے موضوع سے ہٹتے ہوئے عصر حاضر کے بعض لوگوں کے بھی نام لے دئے ہیں۔ چونکہ وہ نمونہ ہیں تیرہویں صدی کا اس لئے خارج از بحث گفتگو کا مجھ پر الزام نہیں ہے اور یہ خامہ فرسائی ضمنی ہے نہ مستقل پھر بھی مجھے یہ ڈر ہے کہ کتاب کا مطالعہ کرنے والے تمام صفحات پڑھ کر الزام دیں گے کہ فلاں شخص کا نام نہیں ہے اور فلاں انسان چھوٹ گیا یہ شکوہ اس وقت صحیح ہوتا جب میں دعویٰ کرتا کہ کتاب تمام باب ماضی پر حاوی ہے اور یہ سب ارباب کمال کی لائف ہے۔

اب میں اس قدر عرض کر کے تمہید ختم کرتا ہوں اور رخصت ہوتا ہوں کہ یہ نہ دیکھئے کہ مجھ سے کیا کیا چھوٹ گیا یہ دیکھئے کہ میں نے تاریخ اودھ کے صرف ایک جز لکھنؤ پر اتنا لکھا جتنا آپ کو پورے صوبہ پر نہ ملے گا امید ہے کہ نقل میں کوئی لغزش ہوئی ہو تو ناظر کے دامن عفو میں اس کی جگہ ہے اختلافی مقامات پر اگر میری رائے ظاہر ہو گئی ہے تو اس لئے کہ اہل البیت ابصر بما فی البیت گھر کی باتیں گھر والے ہی جانتے ہیں دوسرے شہر کے لوگ یہاں کے اختلافات کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ والسلام

آغا مہدی الرضوی
مسجد تحسین چوک لکھنو (بھارت)

اس کتاب کے مصادر اور جن کتابوں سے خصوصی مدد لی ہے ان کے نام مع تعارف

نمبر شمار	نام کتاب	نام مؤلف	سنہ طباعت یا تحریر	زبان	کیفیت
۱	آئین اختر	شیخ غلام حیدر صغیر	مخطوطات	مثنوی اردو	مصاحب خاص جان عالم کی تالیف
۲	آثار اکبری تاریخ فتحپور سیکری	محمد سعید احمد مارہروی	طبع آگرہ ۱۳۲۴ھ	اردو	
۳	آثار یادگار	راجہ محمد امام علیخاں آف بھٹواموٗ	تصویر عالم پریس ۱۳۰۲ھ	″	
۴	احیاء الآثار سوانح حیات ممتاز العلماء جد مؤلف	آغا مہدی	مخطوطات	″	
۵	احسن التواریخ	منشی رام سہائے تمنا	مطبع تمنائی ۱۲۹۳ھ	″	
۶	اکبری نورتن	فیروز سنز	طبع لاہور ۱۹۵۶ء	″	
۷	اودھ اینڈ آگرہ رپورٹر جلد پنجم	مشیر قانونی	چھاپہ	انگریزی	خلاصہ مقدمات دیوانی
۸	بوستان اودھ	درگا پرشاد	″	فارسی	
۹	پاونیر تواریخ ہندوستان	پاونیر پبلشر	طبع چاوڑی بازار دہلی ۱۹۵۵ء	اردو	عصر حاضر کی تاریخ
۱۰	تاریخ بغاوت ہند	پنڈت کنھیالال منصرم ریاست مہاراجہ گڑھ امیٹھی	نولکشور ۱۸۶۱ء	″	اس کتاب کا دوسرا نام محاربہ عظیم ہے
۱۱	تاریخ اودھ کامل	نجم الغنی رامپوری	نولکشور ۱۹۱۹ء	″	
۱۲	تاریخ جدولیہ	شیخ خادم علی سندیلوی	طبع ۱۲۷۲ھ	″	
۱۳	تاریخ قیصری معروف بہ بوستان اودھ	ضیغم الدولہ سید زین العابدین	اثنا عشری پریس ۱۳۰۸ھ	″	یہ کتاب وزیر اودھ نواب علی نقی خاں کے بیٹے کی ہے
۱۴	تجلیات	مرزا محمد ہادی عزیز	نور المطابع لکھنؤ	″	بزم جان عالم کے ایک عالم کی لائف
۱۵	تنقیح الاخبار	راجہ کندن لال	مطبع کلاں کوٹھی حاجی ولی محمد ۱۲۶۶ھ	فارسی	
۱۶	جنٹلمین ڈائری	سید محمد عسکری صفی پوری	مخطوطات	اردو	
۱۷	جان عالم	عبد الحلیم شرر	ادارۂ فروغ اردو لاہور طبع اول ۱۳۵۱ھ	″	
۱۸	مثنوی حزن اختر	حضرت محمد واجد علی شاہ بادشاہ		″	
۱۹	ذات یقیں	محمد تحسین علیخاں ابن دلیل خاں افغانی	مخطوطات	″	عہد نصیر الدین حیدر کے خواجہ سرا کی سرگزشت
۲۰	رقعات مرزا قتیل معروف بہ معدن الفوائد	خواجہ امام الدین سمرقندی	عہد شاہی اور نولکشور پریس میں کئی بار طبع ہوئی	فارسی	عہد آصفی کے شاعر اور ادیب کے خطوط
۲۱	روح ادب	گھانسی رام ایم اے	میرٹھ	اردو	کورس کی کتاب
۲۲	سرور سلطانی	مرزا رجب علی بیگ سرور	مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۳ھ		بحکم شاہ اودھ بطور تاریخ تالیف ہوئی

۲۳	بیکتۃ الذہب معیار الادب	حکیم علی اکبر شاہ	طبع ۱۳۰۹ھ	عربی	مقبرہ جناب عالیہ کے ایک عربی داں کے قلم سے مشاہیر قوم کے حالات
۲۴	سفیر اودھ	مولوی مسیح الدین علوی	الناظر پریس ۱۹۲۹ء	اردو	آپ وکیل کی حیثیت میں لندن والدہ شاہ کے ساتھ گئے
۲۵	سوانح لکھنؤ	نجابت حسین خاں نجیب آبادی	مخطوطات پٹنہ یونیورسٹی	فارسی	عہد امجد علی شاہ کا سیاح
۲۶	طومار	شمس العلماء سید محمد ابراہیم	مخطوطات	اردو	عہد جان عالم کے آخری عالم جن کو سید العلما الثانی کا خطاب حاصل تھا۔
۲۷	طلسم اخبار	فرنگی محل	طبع ۱۸۵۶ء	"	زمانہ غدر کا آرگن
۲۸	عہد نامجات جلد دوم	نولکشور	نولکشور ۱۸۶۶ء	"	قوانین اودھ اور انگریزوں کے عہدنامے
۲۹	عماد السعادت سوانح نواب سعادت علیخاں	غلام علی ابن محمد اکمل خاں	نولکشور ۱۸۶۶ء	فارسی	
۳۰	قدیم ہنر و ہنرمندان اودھ و لکھنو	شہزادہ اسرار حسین	طبع ۱۹۳۶ء	اردو	
۳۱	گذشتہ لکھنؤ	مولوی عبدالحلیم شرر	چھاپہ	"	
۳۲	محامد حیدریہ	قاضی محمد صادق خاں اختر	مخطوطات قلمی پرشادی لال تحریر ۱۲۴۲ھ	فارسی	مکتبہ ریاست مرشد آباد کا خطی نسخہ ہے بعض تحریرات سے واضح ہوتا ہے کہ طبع ہو چکی ہے
۳۳	مراۃ البلاد	ہاشم علی رضوی	مخطوطات کتبخانہ ممتاز العلما کا قلمی شاہکار	فارسی	
۳۴	نیا دور لکھنؤ	ماہوار رسالہ اڈیٹر صباح الدین عمر لکھنؤ		اردو	
۳۵	ہسٹریکل البم آف اودھ	داروغہ حاجی عباس علی میونسپل انجینیر	نولکشور ۱۸۹۰ء	"	
۳۶	وضعداران لکھنؤ	محمد ہادی ابن محمد عباس لکھنوی	تصویر عالم پریس ۱۹۰۹ء	"	
۳۷	بہار ہند حصہ اول	مرزا محمد مرتضیٰ عرف مچھو بیگ	مطبع شوکت جعفری ۱۸۸۹ء	"	

(نوٹ) شباب لکھنؤ اور مرقع اودھ دو کتابیں مجھے دستیاب نہیں ہوئیں اول الذکر کتاب منشی محمد احد علی بی اے کی تالیف ہے اور شفاعت مینجر مسلم بکڈپو پرنٹنگ ہاؤس امین آباد لکھنؤ نے اپنی فہرست اور تعارف میں لکھا ہے ـــــ نصیر الدین حیدر کے دربار اور سلطنت کے چشم دید واقعات، شاہی محلات کے اسرار شاہی رمنہ و شکار کے سامان امراء دربار کے جوڑ توڑ اشیائے معاشرت عیش کے حالات الگی نرالی دُھنیں قطعیں قیمت عہ

کتب فروش نے کتاب مذکور کو ترجمہ ظاہر کیا ہے ممکن ہے کہ محامد حیدریہ کا ترجمہ ہو۔ مؤخر الذکر کتاب کے مختصر حال فہرست مذکور میں ہے ملک اودھ کی تاریخ فلسفہ تاریخی کے اصول پر قیمت عمر ممکن ہے یہ بھی منشی صاحب موصوف الصدر کی تالیف ہو لکھنے والے کا نام فہرست میں درج نہیں ہے۔

تاریخِ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صوبہ اودھ

لکھنؤ اودھ کی راجدھانی ہے اور اس شہر کے حالات پر قلم اٹھانے سے پہلے میرے لئے اچھا ہے کہ پرانتھ پر بھی کچھ لکھتا چلوں اودھ میں کوئی نقطہ دار حرف نہیں ہے اور ابجد کی رو سے اس کے عدد بھی دس اور چھ۔ سولہ ہوتے ہیں۔ اردو ادب میں صبح بنارس اور شام اودھ کی لفظ تاریکی میں نہیں ہے اور روز روشن کی طرح چمکتی ہے اس کی بناوٹ میں کون کارفرما ہے؟ صوبہ کا نام اودھ یوں رکھا گیا کہ اودھیش[1] شری رام چندرجی کا نام ہے اور وہ مالک اودھ تھے اس نکتہ کا پتہ سوائے رام سہائے کے قلم سے مجھے کہیں اور تو نہیں ملا۔ یہ صوبہ اس وقت ایک طرف گورکھپور سے قنوج تک لمبان میں ایک سو پینتیس ۱۳۵ کوس اور چوڑان[2] میں کوہ شمال سے الہ آباد تک ایک سو پندرہ ۱۱۵ کوس تھا اس کا دوسرا نام اکھتر پرگنہ ہے اور صوبہ بھر میں (۷۱) پرگنے ہیں۔ عہد اکبر میں راجہ ٹوڈرمل نے "اکھتر نگر" نام رکھا اب رہا "اختر نگر" تو جس طرح ہندی میں ہڑ بہیڑا آنولہ کو ترپھلا کہتے ہیں اور پڑھے لکھے لوگوں نے اس کا نام اطریفل رکھا۔ یہی حال اکھتر نگر کو اختر نگر کا لباس پہنانے میں ہے۔ پہلی تبدیلی کے بعد وہ وقت آیا کہ پندرہ ذیقعدہ سنہ ۱۱۳۰ھ کو جب ساداتِ بارہہ کی کوشش سے روشن اختر محمد شاہ پسر جہاندار شاہ ولد بہادر شاہ نظربندی[3] سے چھٹکارا پاکر سولہ برس کے سن میں فتحپوری تخت پر بیٹھے اس وقت اختر نگر کی لفظ میں روشنی بڑھی۔ آخر میں سلطان عالم حضرت محمد واجد علی شاہ مرحوم کے اختر تخلص نے فقط لکھنؤ کو اختر نگر بنا دیا شاہی محلات اور سلطانی بزم سخن میں کہیں کہیں اس کا پتہ ہے یہ شاہ مرحوم کی انصاف پسندی تھی کہ اپنے نام کو باقی رکھنے کی دھن میں پہلا نام مٹنے نہ دیا۔ شیخ محمد بخش شہید ناسخ کے شاگرد تھے اور مرزا حیدر صاحب رئیس کے مصاحبوں میں ان کا شعر ہے ؎

حق ہے شہید اپنا مقدر اگر پھرے　　اختر شتاب جانب اختر نگر پھرے

لکھنؤ

ہندو کہتے ہیں لکھنؤ میں پہلی بستی رام چندرجی کے بھائی نے بسائی جن کا نام لچھمن جی تھا یا راجہ یدھسٹر کے پوتے راجہ جنم جی نے یہ زمین رشیوں اور منیوں کو آشرم بنانے کے لئے دی تھی مگر اس وقت کے حالات کا کوئی سچا خاکہ سامنے نہیں ہے اس بستی کا نام لکھنؤ کیوں ہوا؟ تاریخ اودھ میں مجھ کو جو کچھ بھی نظر آیا وہ یہ ہے اب آپ کی سمجھ میں جو کچھ آجائے وہی ٹھیک ہے۔

(۱) شہرت تو یہ ہے کہ لکھنا پاسی یہاں کا مشہور آدمی تھا اس کی یاد میں لکھنو نام رکھا گیا۔

(۲) کوئی شخص تھا لکھن سنگھ[4] جس کا نام بعد میں لاکھو خاں ہوا سرزمین وطن میں وہ نظر انداز نہ ہوا۔

(۳) لچھمی پور نام ہونیکا بھی کہیں کہیں پتہ ہے اسے کہا جاتا ہے کہ لفظ بگڑ کر لکھنؤ ہو گئی منشی رام سہائے اس رائے کو درج کرکے

---

[1] احسن التواریخ منشی رام سہائے　[2] منہ　[3] رام سہائے نے اس بیان کی تائید میں دو عددوں کے تفاوت سے اس محل پر یہ تاریخ نقل کی ہے ؎ روشن اختر بود اکنوں ماہ شد + یوسف از زنداں برآمد شاہ شد　[4] ہسٹریکل البم آف اودھ ص۴ طبع منشی نولکشور ۱۸۸۵ء

کہتے ہیں کہ مردم ہندی لکھنؤ کو منسوب لکھن برادر سری رام چندر کے کرتے ہیں کیونکہ کتب زبان بھاشائے اردوئے اہل ہند میں لچھمن پوری اور لکھن پوری ایک معنی رکھتا ہے اور تحریر شیخان لکھنؤ سے پایا جاتا ہے کہ جو مقام ٹیلہ شاہ پیر محمد مشہور ہے اس کا نام لچھمن پور تھا۔ کتاب مراۃ البلاد[1] میں بھی اس شہرت کو چھپایا نہیں گیا ہے۔

(۴) ایک رائے یہ بھی ہے کہ جس تھوئی[2] نے یہاں کی پہلی عمارت "مچھی بھون" کی تعمیر میں کام کیا تھا اس کا نام لکھنا اہیر تھا۔

(۵) لکھنؤ نام ہونے کا یہ راز تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ندی کے کنارے گوماجی میں گئو گھاٹ یا کلیا گھاٹ پر ایک لاکھ ناویں (کشتیاں) چلتی تھیں یا یہاں پورے ایک لاکھ[3] نائی رہتے تھے دیہاتی باربر کو "ناؤ" کہتے ہیں بنابریں ناؤ اور نائی کے نام نے لفظ کی بناوٹ میں سہارا دے کر لکھنؤ نام رکھا یہ سب یہاں کی آبادی کے زیادہ سے زیادہ ثبوت ہیں۔

(۶) نواب ضیغم الدولہ زین العابدین خاں جو آخری حکومت اودھ کے ذمہ دار شخص ہیں لکھنؤ کی اصل "لکھنوع" قرار دیتے ہیں مورخانہ دیانت کے خلاف ہے اگر میں ان کی رائے کو نظر انداز کردوں۔ اصل فارسی عبارت فٹ نوٹ میں ملاحظہ ہو اردو ترجمہ ان کی رائے کا یہ ہے۔

جب آصف[4] الدولہ اور ان کی ماں میں رنجش ہو گئی تو ان کے لکھنؤ چلے آنے پر شہر کی آبادی بڑھنے لگی لکھنؤ کے نام میں اصلی حروف یہ ہیں ل ک ھ ن و ع اس قرارداد سے لکھنؤ نام ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہاں سو ہزار آدمی بستے تھے آخر کا حرف ع گر گیا واؤ پر ہمزہ نے جگہ لی لکھنؤ ہوا۔ یہ قیاس آرائی نہیں ہے بلکہ اہل تحقیق کا اس پر اتفاق ہے۔ اس صورت میں لکھنؤ کا اشتقاق "لک نوع" ہے نوع کی جمع ہے انواع بمعنی اقسام۔

(۷) جس وقت ہرناچھ[5] راچھس جس مقام پر گرا ہے وہ مقام "نکھ لو" کہا جاتا تھا جس کے معنی ہیں ریزۂ ناخن، اس لئے ذرا سی تبدیلی میں لکھنؤ ہوا۔ اس صورت سے نام میں نائی کی شرکت پر روشنی پڑتی ہے۔

(۸) اس جگہ سید رکن الدین اور شہاب الدین وزیر شاہ مسعود کی اولاد سید ہمت علی اور شوکت علی بس گئے تھے جن کے بیٹے کا نام "رحم رحمٰن" اور بیٹی کا نام امۃ الزہرا[6] تھا وہ بن بیاہی تھی ملیح آباد کا راجہ گھومتا پھرتا لکھنا پوری (یہاں) پہونچا اور اس باعصمت پر نگاہ بد گئی شادی کا پیام دیا رحم رحمٰن اس رشتے کو ناموزوں بے جوڑ سمجھتے تھے چپ ہو گئے۔ آس پاس کے رہنے والے لوٹ مار، لڑنے بھڑنے، خون بہانے والے رعایا تھے راجہ مہاراجہ ایسے پرجوں سے عاجز آگئے تھے ایسے غنڈوں کے ظلم وستم سے بچانے کے لئے ۳ لاکھ روپے سالانہ کی پیش کش سے سادات بسائے گئے تھے۔ رحم رحمٰن نے لکھنا اہیر سے دل کا بھید بتایا اس نے سیاست سے رائے دی کہ راجہ کی منگنی منظور کرلو اور تین مہینے کی مہلت مانگو اس عرصے میں کوئی بچاؤ ہو جائے گا۔ راجہ خوشی خوشی شادی کا سامان فراہم کرنے لگا اور سادات نے عبدالرحیم سردار فوج کی مدد سے دشمن کی ٹڈی دل فوج کا مقابلہ کیا اور رحم رحمٰن ۲۰ ہزار سواروں دو ہزار شترنال اور لڑائی کا سامان لے کر بیالیس ہزار آدمیوں پر اچانک ٹوٹ پڑے اور راجہ کی اکثریت اگر شراب کے نشے میں نہ ہوتی تو شکست کا روز سیاہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ رام سہلے

---

[1] مولفہ [illegible] ہاشم علی رضوی مخطوطات [2] گزشتہ لکھنؤ شرر [3] ہفت قلزم و احسن التواریخ منشی رام سہائے طبع ۱۲۹۳ء

[4] چو ملال از آصف و مادر شدہ + لکھنؤ آباد افزوں تر شدہ، اصل نام لکھنؤ بازیب و زین + لام و کاف و ہا و واؤ نون و عین، وجہ تسمیہ شدہ ازیں قرار + نوع انسانیت درو ئے صد ہزار، عین حذف و ہمزہ بر واؤ ماند + ایں قیاسے نیست بل اجماع خواند، تاریخ قیصری [5] احسن التواریخ منشی رام سہائے تمنا چھاپ لکھنؤ

[6] امۃ عربی زبان میں لونڈی کو کہتے ہیں معنی ہوئے فاطمہ زہرا کی کنیز۔ مسلمانوں میں امۃ الفاطمہ، امۃ الحسین نام عورتوں کے ہوتے ہیں۔

اس واقعے کو پورا لکھ کر فرماتے ہیں۔

جو مدہوش و مخمور تھے نہ تیغ ہوئے اور بہت سے آدمی تاب آتش ضحاک خون آشام کی نہ لا کر دریائے گومتی میں غرق ہوئے۔ تین ہزار آدمی گرفتار بھی ہوئے۔ رحم رحمٰن نے اس کامیابی پر لکھنا اہیر کو جس کی رائے سے راجہ کی زد سے بچے تھے عبدالرحیم سے خلعت دلوایا اور اس سیاست پر مفتوحہ علاقے کا نام اسی کے نام پر لکھنؤ رکھا اور روشن زمان خان اور عبدالحکیم خاں کی حکومت شروع ہوئی۔ سچ ہے لڑائیاں ہمیشہ زن۔ زمین۔ زر کے لئے ہوتی ہیں اور ظلم امن کو رخصت کر دیتا ہے۔

(۹) لکھنؤ نام شاہ قیام الدین نے رکھا اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ عراق کی تحریروں میں جو عصر حاضر میں وہاں سے آتی ہیں لکھنا ہوٗ لکھا ہوتا ہے۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ عہد اکبر میں یہاں شہریت کہیں بھی نہ تھی۔ مولوی عبدالحلیم شررؔ جو ۱۹۲۶ء میں مر گئے۔ لکھنؤ پر تاریخی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

لکھنؤ نام اکبر[۵] سے پہلے نہیں ثابت ہوتا ہمایوں نے لکھنؤ میں چار گھنٹے قیام کیا اور یہاں کے زمینداروں نے ۱۰ ہزار روپے اور پچاس گھوڑے دے کر نمایاں مدد کی۔ اکبر کو لکھنؤ کی طرف خاص توجہ تھی۔ یہاں کے برہمنوں کو باج پیٹی چڑھا دے کے لئے ایک لاکھ روپے دئے اور اسی وقت سے لکھنؤ کے باج پیٹی برہمن مشہور ہو کر۔ اس آبادی نے یہ نام شیخ عبدالرحیم کے آنے سے پہلے پایا۔

شررؔ کی رائے میں نہیں مان سکتا تیمور کی واپسی کے بعد جب ملک میں طوائف الملوکی پھیلی تو بلوا اقبال خاں نے دوآبہ میں اپنی ریاست قائم کرنا چاہی لیکن اس کے ہمعصر مبارک شاہ نے اس کے پاؤں جمنے نہیں دئے اس سلسلے میں لکھنؤ کا نام تاریخ میں نظر آتا ہے اور ابن بطوطہ جو عہد تغلق ۷۳۴ھ میں ہندوستان آیا اس کے سفرنامہ میں بھی لکھنؤ کا نام موجود ہے ۹۳۷ھ میں ہمایوں تخت نشین ہوا اور سلطان نے اپنی بہن گلبدن بیگم سے جو اپنی سرگزشت لکھوائی اور بزبان فارسی ہمایوں نامہ گلبدن بیگم کے نام سے مشہور ہے اس تاریخ میں تین مقام پر لکھنؤ کا نام موجود ہے (الف) غرض بعد از چند روز خبر رسید کہ شیر خاں نزدیک لکھنؤ رسیدہ (ب) تا آنکہ خبر رسید کہ شیر خاں از لکھنؤ گزشت حضرت کوچ کردند ص۴۸ (ج) چوں بادشاہ بدولت و سعادت جانب لکھنؤ دو سہ منزل رفتند میرزا فرمان بادشاہی را نمودند و محصل شدند کہ البتہ شما ہمراہ من بیائید ص۴۹ طبع انوار المطابع امین آباد لکھنؤ

یہ تینوں عبارتیں ہمایوں کے دور حیات میں اس کے فاضل خواہر کی نذر قرطاس کی ہوئی لفظیں قدامت پر گواہ ہیں بیگم موصوف نے اسی سال کی عمر ۱۶۰۳ء عہد اکبر میں وفات پائی۔

دور اکبری کی ابتدا میں لکھنؤ کا علاقہ حسین خان ٹکریہ افغانی کی جاگیر میں تھا اور ۹۷۷ھ میں جب مہدی قاسم خان حج[۶] سے واپس ہوئے تو یہ بستی ان کو دیدی گئی۔

نور باڑی کا سربلند مقبرہ اور کھڑے کی بازار کی مسجد اور دو چھوٹے مقبرے آمنے سامنے ممکن ہے کہ اسی دور رفتہ کی یادگار ہوں قدیم طرز تعمیر کے یہ عبرت زا نمونے ہیں۔ القصہ یہ اک مکان ہو تھا + ویرانہ و دشت چار سو تھا

لکھنؤ اس وقت ایک جنگل تھا جس میں شیر بھیڑیئے، چیتے، لومڑیاں، گیدڑ اور حشرات الارض کے سوا کچھ نہ تھا کہیں کہیں نیچ قوم آباد تھی ان کو ہرگز یہ خبر نہ تھی کہ ایک وقت میں جنگل میں منگل ہوگا۔ سرمایہ داران فیض آباد کے قدم کھنچ کر پہلے پہل لکھنؤ آئے۔ نواب آصف الدولہ کا

---

۵ گزشتہ لکھنؤ شررؔ

۶ اکبری نورتن ص۴۹ طبع چہارم ۱۹۵۶ء پاکستان

ادھر شکار کے لئے آنا اور جذب کمال میں زمین کا ان کے قدم چومنا مقناطیسی طاقت تھی جس نے سونا چاندی زمرد پکھراج کو سمیٹا اور ۱۱۸۸ھ میں نواب نے اپنی راجدھانی بنایا آب و ہوا پسند آئی اور جس زمین پر دن کو فقط سورج کی کرنیں پڑتی تھیں اور رات کو اکیلا چاند ٹھنڈک پہونچاتا تھا وہاں ہر طرف علم و کمال کے آفتاب روشن ہو گئے جہاں ہو کا مقام تھا وہاں تکبیر کی صدا سنائی دی جہاں بستی نہ تھی وہاں تھالی پھینکو تو سر ہی سر، قدم قدم پر عمارتیں نو آبادیاں جگہ جگہ دیسی مصنوعات کا جلوہ، زبان کا فروغ، ادب کی چمن بندی علم و حکمت کے چشمے، فلک نما قصر، خوبصورت باغ، اونچے اونچے مندر، عظیم الشان مسجدیں اور لمبے لمبے منارے، جابجا پل اور مسافروں کی راحت رساں سرائیں، ٹھنڈے پانی کے اندارے، کنویں، بولیاں، چوڑے چکلے تالاب، راستے میں گھنیرے درخت، مریضوں کو بلا قیمت دی جانے والی دوائیں، دار الشفاء، مکتب، تعلیم گاہ، رصد خانے دکھائی دئے۔

آصف الدولہ نے دنیائے لکھنؤ کا باوا آدم بن کر ویران زمین کو بسایا اور علم و حلم و شجاعت تہور دولت و صناعت ان کی اولاد بن کر پھیلی اور تہذیب لکھنؤ کا آوازہ چار دانگ عالم میں بلند ہوا۔ اور یہاں کے تمدن میں وہ صلاحیت پیدا کر دی کہ دنیا تقلید پر فخر کرتی ہے۔

نوابی کے بعد لکھنؤ شاہی کے سایۂ عاطفت میں آیا اور اس بلند زینے تک پہونچا جس کے بعد رفعت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا پرانے زمانے سے جنت نظیر کی لفظیں، خلعت کشمیر قرار پا چکی تھیں اور یہ اوترن لکھنؤ کے قد و قامت کے لئے اچھی نہ تھی۔ دار السلطنت میں ہر فن کا کامل ہر حقیقت کا اعلیٰ نمونہ موجود تھا کوئی شہر ایسا نہیں جس کا منظر یہاں نہ ہو۔ نینی تال کی سینری، دیرہ دون کی آبشار، کشمیر کی نہریں، پنجاب کی فضا اور آب و ہوا صاحبان کمال کو وطن میں ملتی تھی اور پر سکون فضا میں جوہر ذاتی نمو پا رہے تھے۔

شہر کی چوحدی

نیک نیت سرمایہ داران اودھ کے مبارک ہاتھوں سے جب ایک سو باون [152] گاؤں شہر کی صورت میں آ گئے تو اب حدود اربعہ کا دریافت کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے عہد نواب سعادت علی خاں مرحوم میں لکھنؤ شہر تکیہ بودلی سے بی بی پور تک پانچ کوس میں اور چار باغ سے علی گنج تک پھیلا ہوا تھا۔ لکھنؤ کے گرد و نواح میں جو گاؤں تھے ان کے نام اس قطعہ سے واضح ہیں سے ساری کسمی اوڑھ کے میں جھلیا بھلیان جاؤں + سکرا دونا، گانٹھ کے گھر بیٹھے ریوڑی کھاؤں۔ رشک نے مضافات لکھنؤ کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے بہتر نمونہ نہیں ہے۔ نوابی کا خاتمہ اور شاہی کے آغاز میں یہ حدیں دھنیامہری کے پل اور بدھے سروں سے گزرتی ہوئی غرباً شہدرہ اور شرقاً چنہٹ پر ختم ہوتی تھیں تکیہ بودلی شہدرہ میں تھا اور بی بی پور دلکشا[1] میں۔ لاہور اور دہلی کے مسافروں کو شہر میں آتے وقت پہلے شہدرہ پڑتا ہے۔ اسی مناسبت سے یہاں کی پچھم حد کا نام شہدرہ ہوا۔ نوابی کے ناکے تو اب باقی نہیں ہیں مگر چھوٹی لائن کے اسٹیشنوں سے پرانے شہر کا ایک خاکہ نظروں کے سامنے آ سکتا ہے۔ سب سے پرانی حد اسٹیشن بادشاہ نگر جہاں کاغذ کا کارخانہ بیپر مل ہے پھر ڈالی گنج اسٹیشن شیعہ کالج کی بلڈنگ کے سامنے اس کے بعد شہر کا درمیانی حصہ سٹی اسٹیشن واقع ڈیوڑھی آغا میر ہے۔ پھر عیش باغ اور چار باغ کا بڑا اسٹیشن آخر میں عالم نگر۔ B.N.W.R. کی پٹری بچھنے سے پہلے مسلسل بستی تھی جن کی گواہی ٹوٹی ہوئی مسجدیں، رہے سہے منارے دے رہے ہیں۔ انگریزوں کی عملداری میں دریا پار کی کوٹھیاں اور دل فریب مناظر فنا ہو گئے۔ پار کا دیہات میں شمار ہوا۔ عیش باغ ویران ہو گیا میدان میں بندر اور سور اور درختوں پر چمگادڑیں رہ گئیں

---

[1] نیا دور بابتہ مئی ۱۹۵۵ء ص ۱۹ لکھنؤ

اور سو برس پورے ہونے سے پہلے جمہوری حکومت میں پھر یہ مقامات آباد ہوئے اور اب نشاط گنج، چاند گنج، ڈالی گنج میں ایک طرف اور عالم نگر میں دوسری سمت شہریت بڑھتی جاتی ہے ع ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے + غیرت حور مہ جبیں نہ رہے - ہر جگہ نئی بستی ہے

عہد شاہی کا شہر اور گومتی

اگلی تمام عمارتیں جو پیرس کا نمونہ تھیں دریا کے اس طرف تھیں گومتی بیچ کا ایک خط تھا اور درمیانی دونوں کناروں پر فلک نما بلڈنگوں کا ایک حسین سلسلہ تھا راے سلطانی کی تبدیلی سے قلعہ مچھی بھون سے جب پایۂ تخت چھتر منزل پہونچا تو عہد آصفی کی کچھ عمارتیں تو ویران ہو گئیں کچھ باقی رہیں لیکن نئی عمارتوں کا سلسلہ دریا کے پہلو ہی میں جاری رہا اور آب رسانی کی سہولت نے ہر بلڈنگ کو دریا کنارے بنانے پر مجبور کیا موسیٰ بوروہ سے کاٹھ والے پل تک دورویہ سرکاری عمارتیں زیادہ تر جگہ گھیرتی رہیں دریائے گومتی سار دا نہر سے شروع ہو کر جونپور پر ختم ہوتا ہے اور گومتی نام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دریا کا پاٹ مستطیل نہیں ہے اور ندی گھومتی ہے کثرت استعمال نے گومتی نام قرار دیا ہندؤوں کی آبادی یہاں کی پرانی بستی تھی اور ان کے عقائد میں تڑکے دریا جانا، نہانا شیوۂ زندگی تھا اس لئے گئو گھاٹ، کلیا گھاٹ، راج گھاٹ، موتی محل کا پل یہ مقامات تیرتھ تھے جہاں روزانہ مرد، عورت، بچے خاص کر چندر گرہن اور سورج گرہن اور گنگا کے نہان والے دن مرد و عورت کی بھیڑ ہوتی اور پیتل کی تھالیوں میں پھول گیندے کے لے کر اور پھول کی لوٹیا میں پانی لیکر پلٹنا عام چلن تھا۔ برسات کے علاوہ سارے دنوں میں گومتی سے کبھی کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا گھڑیال۔ مگر یہاں کبھی نہیں دیکھے گئے ہم کچھوے اس کثرت سے تھے کہ جس وقت کوئی عامل دریا کنارے آٹے کی گولیاں پیرانے آجاتا اس وقت مچھلیاں دب دب کر سپر انداختہ ہو کر جگہ چھوڑ دیتیں اور آگے بڑھتے ہوئے فقط کچھوے نظر آتے۔

قلعہ

نوابی سے عہد شاہی تک لکھنؤ میں ایک بھی قلعہ نہ تھا اس وقت کے لڑنیتے قلعہ میں بند ہو کر دشمن کے مقابلے کو بہادری نہیں سمجھتے تھے کھلے میدان میں لڑنے والے دلیر کہے جاتے تھے اور اس مورچے کا نام گڑھی ہوتا تھا۔ زبان اردو کے محاورے میں کسی بڑے کام کو انجام دینا "گڑھی فتح کرنا" آج بھی کہتے ہیں۔ "پیر خاں کی گڑھی" بجھم لکھنؤ[1] میں اب تک ہے جو ایک مضبوط مورچہ تھا۔

آبادی میں وسعت اور محلوں کے نام

محلوں کے نام قرار دینے میں ہر محلے کے آباد کرنے والے نے اپنے نام کو اُبھارا مصاحب الدولہ کا آباد کردہ مصاحب گنج، وزیر علی خاں کا وزیر گنج اسی طرح تمام محلے "گنج اور نگر" اور سرائے، باغ اور کٹرہ کی اضافتوں کے ساتھ آباد ہوئے اور وہ ہجوم خلائق ہوا کہ نیا گھر بنوانے کی پبلک کو جگہ نہ ملتی تھی اس لئے بعض چالاک لوگ مسجد یا امام باڑہ کے نام سے زمین مانگتے اور لپیٹ میں اپنے رہنے کی جگہ بھی نکل آتی شہر بھر میں اس وقت ۵۲ گنج تھے جہاں غلہ بکتا تھا ۵۲ ترکاری منڈیاں تھیں جہاں ساگ پات (سبزی) بکتا تھا اور مہاجنوں کی ۶۰ کوٹھیاں

---

[1] گڑھی کی لفظ کو گڑھیا سمجھنا صحیح نہیں ہے پیر خاں کی گڑھی اور اعظم بیگ کی گڑھیا دونوں ایک دوسرے سے جداگانہ نام ہیں مکانات بنوانے کے سلسلے میں کسی ایک مکان کی مٹی کام میں لانے سے جو گڑھا پیدا ہو جاتا ہے اس میں برساتی پانی جمع ہو کر اس نشیب کو گڑھیا کہتے ہیں گڑھیا اعظم بیگ، گڑھیا گھنڈ بیگ انھیں معانی میں نام رکھے گئے ہیں اوحدالدین بلگرامی نے اپنی لغت میں گڑھی کے ذیل میں لکھا ہے۔ مکان محفوظ کہ از انجا نشستہ با دشمن جنگ کنند او گڑھی یعنی قلعہ کوچک دلفائس اللغات ثابت ہوا کہ گڑھی مورچہ بندی کی جگہ کو کہتے ہیں اور گڑھیا وہ جگہ ہے جہاں ایک چھوٹے تالاب کی طرح فی الحال پانی بھر یا کبھی بھرا تھا۔

تھیں وہ بڑی خوش معاملگی سے لین دین کرتے تھے اور دولت کھنچ کھنچ کر ان کے ہاتھ میں جا رہی تھی زہی سے نواز گنج تک ۱۸۴ ڈیوڑھیاں امیروں کی تھیں جہاں دروازے پر ہاتھی اور وقت بتانے کے لئے گھنٹہ بجتا تھا۔

قبرستان

کسی گھرانے میں خدانخواستہ غمی ہو جائے تو قانون یہ نہ تھا کہ قبرستان کے سوا مردہ کہیں دفن نہ ہو بعض مردے گھروں میں اور بعض دروازے کے سامنے دفن ہو جاتے تھے کربلائیں اور امام باڑے طبقہ شیعہ کے عام قبرستان تھے یا کچھ قبرستان خاص گھرانوں کے تھے جہاں دوسرا دفن نہیں ہوتا تھا گورستان کو ہر واڑ اور تکیہ بھی کہتے تھے تکیہ پیر جلیل، تکیہ حاجی نصرت، چہلب داروں کا تکیہ مشہور محلہ ہیں۔ کچھ کچھ ہندو گھرانے ایسے تھے جہاں میت دفن بھی ہوتی تھی پرانے حیدر گنج میں بعض قبریں غیر مسلموں کی پائی گئی ہیں۔ گرگنت، پھکنت، دریا میں بہا دینا یہی تین طریقے ہیں جو اہل ہنود میں تھے اور اب بھی ہیں۔ آصف الدولہ کے لکھنؤ میں پہونچنے کے بعد ان کے گھرانے میں جب کوئی سانحہ ہوا تو تابوت میں لاش اٹھی۔ راج گھاٹ کا غسلخانہ اسی مقصد سے بنا۔ پاٹا نالہ کا غسلخانہ پرانی یادگار ہے۔ غسل کون دیتا تھا اس پر آگے چل کر مقبرہ جناب عالیہ کے ذیل میں روشنی ڈالی جائے گی بچوں کی میت عموماً فینس میں رکھ کر اٹھتی تھی اور یہ نہ تھا کہ غسال ہاتھوں پر لے کر قبرستان تک آئے فاتحہ خوانی کی مجلسوں میں غریبوں میں الائچی دانہ اور امیروں میں حسب حیثیت خرمے، شیرمالیں، روٹی سالن تورہ بندی ہوتی تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کسی خوشی کی تقریب میں مٹھائی بٹتے وقت خرمے تقسیم ہوں یا فاتحہ خوانی میں لڈو، پیڑے، گلاب جامن کا حصہ ہو۔ شادی میں پچ میل مٹھائی، دودھ بڑھائی میں کھجوریں، ختنہ اور بسم اللہ میں لڈو، نکاح میں نُقل، قرص قند کا کوزہ۔ میوہ تقسیم ہوتا تھا۔

پخت کے موقع پر شادی اور غم میں یہ امتیاز رکھا گیا تھا کہ اگر ولیمہ وضیافت ہے تو شیرمال اور کباب اور فاتحہ خوانی ہے تو شیرمال اور حلوہ۔ تورہ بندی میں بڑے امراء کے یہاں سوئم کے بعد چالیسویں کا حصہ اس شان کا ہوتا تھا (۱) کشتی میں کمخواب یا زربفت کا تھان (۲) سچا ہار (۳) ایک جوڑا باقرخوانی جس پر ڈھائی تین پاؤ کا میٹھا تھیلیوں میں چکنی ڈلی۔ الائچی اور ایک مینڈھا یا بکرا یا دنبہ

فرد پر حصہ پانے والوں کے نام مع القاب و آداب لکھے ہوئے محلہ دار بھنگیوں[2] پر کھانا تقسیم کرتے پھرتے حصہ کے ساتھ مزدوری دینا اور انعام بھی ضروری۔ فاتحہ خوانی کا حصہ کبھی محلسرا کے اندر نہ جاتا لوگ فکر میں لگے رہتے اور دیوان خانے سے مستحقین آکر لے جاتے۔

عدل گستر بادشاہ کے دور میں اقلیت کو پوری آزادی تھی اور لکھنؤ میں پرانے زمانے کے جو گرجا تھے ان میں خدا بخش کا گرجا مشہور عیسائی عبادت گاہ ہے جس کے بارے میں کسی مذہبی شاعر کا مصرعہ ہے ؏ الٰہی معبد نصاری گرجا

آلات حرب پر قبضہ:- جنگ آزادی میں انگریزوں کو آلات حرب سے جو نقصانات پہونچے ان کی تلافی اس طرح ہوئی کہ امن و امان ہونے پر رعایا سے ہتھیار چھین لئے گئے اور بندوق کے لئے لیسنس حاصل کرنا ضروری ہوا حیدر بیگ کی باؤلی میں جس کا اپنے مقام پر ذکر آئے گا۔ تلواریں، نیمچہ، نیزے، قرولی، پیش قبضیں ڈال دی گئیں اور شمشیر زنی تو یک قلم موقوف ہوگئی نشانہ بازی کے خوگر خالی ہاتھ رہنے کے بجائے غلیل سے کبھی چھوٹی چڑیوں کو شکار کرنے لگے اور مسجدوں کے طلائی کلس کی حفاظت کرتے ہوئے بندروں کو ہنکاتے تھے غلیل درحقیقت

---

[1] میر انیس نے اسی محاورے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بستر سے مرد کار نہ بالیں سے غرض + اپنا کسی تکیہ میں بچھونا ہوگا

[2] بھنگی دو خانوں کو ایک بانس میں رسیوں سے باندھ کر کس کر کہار کاندھے پر اٹھاتے ہیں اور تقسیم حصص کی فرد ملازم کے پاس رہتی ہے۔

تیر و کمان کے مقام پر خونریزی سے بچانے اور شکار کو در رسیدہ کرنے کا ہتھیار ہے جو عام طور پر تو کمان کی شکل کی اور دوسری صورت میں اس کا خلاصہ جو چند ڈوریوں کی مدد سے غلّہ پھینکتا ہے۔ دربار رام پور میں ایک شاعر کمان کاندھے پر رکھے ہوئے غلیل ہاتھ میں عجیب ہیئت سے وارد ہوئے بیگم نے نواب سے کہا غلیل پر کسی شاعر نے کچھ نہیں کہا تمام حاضرین دعویٰ سنکر غور کرتے رہے کوئی شعر جب یاد نہ آیا تو ایک شاعر نے برجستہ کہا ۔ غلّے ہمارے خاک ہیں ان کے ہاتھ میں اس وصل مختصر کی بھی دشمن غلیل ہے

تحسین و آفریں کی صدائیں ہر طرف سے بلند ہوئیں۔ بیگم کے ماتھے پر شرم سے پسینہ آگیا غلّہ عمدہ لیسدار مٹی میں ردی کوٹ کر بنائے جاتے ہیں اور خشک ہونے پر کام میں آتے بدقطع انسان کی تصویر کشی میں یا ہجو کہنے پر محاورہ ہے غلّہ سے دیدے۔

مہینہ، دن، تاریخ

شہر میں آباد ہونے والے زیادہ تر دہلی اور فیض آباد کے لوگ تھے وہ کیسے ہی علم دوست اور علم نواز سہی اکثریت عوام کی تھی۔ اور وہ چاند کے مہینوں کے نام آسانی سے زبان پر جاری نہیں کر سکتے تھے نہ وہ انگریزی داں تھے جو جنوری فروری رٹ لیتے اس وقت کے سال کے بارہ مہینوں کے نام یہ تھے محرم، تیرہ تیزی، بارہ وفات، میراں مدار، ہمسایہ، خواجمندین، شبرات، رمضان، عید، خالی بکرید۔ یہ نام کیوں رکھے گئے۔ اس کا بھید دریافت کرنے کے لئے ملک کی تاریخ پر ایک نظر ضروری ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ملک میں تعزیہ داری کا دور دورہ تھا۔ محرم نام تو نہیں بدلا صفر کے اگلے تیرہ دن بہت منحوس سمجھے جاتے تھے اور ان دنوں میں اپنے کاروبار کو پبلک روک دیتی تھی اور انتظار ہوتا تھا کہ کسی طرح سے جلد یہ دن گذریں اس لئے سال کے دوسرے مہینے کا نام تیرہ تیزی رکھا۔ ربیع الاوّل کو پیغمبر اسلامؐ کی پیدائش اور روز وصال کے سبب سے بارہ وفات رکھا اور ربیع الثانی کو میراجی اس لئے کہا کہ اسؔ مہینے کی چھٹی کو میراں شاہ داتا کا عرس پٹھن کوٹ میں ہوتا ہے۔ جان عالم واجد علی شاہ مرحوم نے اپنی محرومی سلطنت کا ذکر اس مہینے کا حوالہ دیتے ہوئے یوں کیا ہے ———

کہ اب میراجی کا مہینہ رقم ۔ کہ جس میں ہوا یہ حکم تھا عم۔ ولابست و ہفتم تھی اس ماہ کی + چھٹی سلطنت جس میں مجھ شاہ کی[۲]۔ اسی طرح جمادی الاولیٰ کی سترہ کو شاہ بدیع الدین قطب المدار کا عرس مکھن پور میں ہونے سے یہ مہینہ مدار کا مشہور ہوا اور جمادی الثانی کو ہمسایہ کہا اور رجب کی چھٹی کو خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی تاریخ وصال ہونے سے خواجمندین ہوا جو مخفف ہے خواجہ معین الدین کا۔ خواجہ صاحب ہندوستان کے بہت بڑے بزرگ ہیں ان کے عرس میں اجمیر شریف میں ہر سال بڑی بھیڑ ہوتی ہے رمضان شریف، محرم کی طرح اپنی حالت پر باقی رہا عید کی عربی لفظ کو اردو نے اپنایا اور ترجمے سے غنی کر دیا اور چونکہ عید و بکرید میں ایک مہینے کا فاصلہ تھا اس لئے سال کے گیارہویں مہینے کو خالی کہنے لگے اور بکرید پر بارہواں مہینہ پہونچ کر برس دن پورے ہوگئے۔

ناموں کا معیار:- دیش کے رہنے والوں میں یادگار کا جذبہ فطرتاً موجود تھا اور نئے پیدا ہونے والے بچوں میں نام رکھتے وقت ماں باپ نے سال کے چھ مہینوں کو یاد رکھا اور مردوں کے نام محرم علی، رجب علی، شعبان علی، رمضان علی اور نیچ ذات میں شبراتی، رمضانی، عیدو اور بکریدی رکھے گئے اور عورتوں کے ناموں میں اس طرح تانیث کی جھلک پیدا کی شبراتن، رمضانو، ادیا، بکرن، بکریدن اسی طرح نام رکھنے میں یہ لوگ مہینے کے ساتھ دن کو بھی نہ بھولے جمعہ کو پیدا ہونے والے بچے کا نام مرزا جمعہ یا آدینہ بیگ[۳] یا جمن منگل کو پیدا ہونے والے کا

---

[۱] ملاحظہ ہو علی جنتری ۱۹۲۳ء ص۱۲ طبع کانپور   [۲] مثنوی حزن اختر از شاہ اودھ اردو

[۳] دیکھو عمادالسعادت تاریخ اودھ FRIDAY کو اہل علم آدینہ بھی کہتے ہیں (مؤلف)

نام عورت ہے تو منگو، مرد ہے تو منگل خاں۔ چہار شنبہ کے دن پیدا ہونے والے کا نام مرد ہے تو بدھو، عورت ہے تو بدھیا دوسری قوموں میں شاید ہی یہ جذبہ ہو۔

زبان

سلطنت میں داخل ہونے والے کچھ تو فتحمند فرمانروا کی اولاد تھے جن کی مادری زبان فارسی تھی اور ایک بڑے آنے والے جتھے کی بول چال اس زمانے کی اردو تھی جو دکھن سے پیدا ہو کر دہلی میں پرورش پا رہی تھی اور انقلاب زمانہ سے بھرپور جوانی میں قبل از وقت اس کو وطن چھوڑنا پڑا سرزمین لکھنؤ نے پناہ دی یہاں کی تراش خراش آب و ہوا گرد و پیش نے خاص اثر ڈالا اور لب و لہجہ میں نرمی کے ساتھ ساتھ وہ لفظیں جو زبان پر ذرا بھی گراں تھیں یک قلم چھوڑ دیں اور آئینہ ادب میں اب اپنے جمال کو دیکھ کر بکھرے ہوئے بالوں کو اس طرح سنوارا کہ نو وارد میرؔ نے محبت کا دم بھرا۔ انیسؔ تا حیات عقیدت کے پھول نچھاور کرتے رہے دبیرؔ نے کلمہ پڑھا اور نہ جانے کتنے ادیب اپنے زمانے میں زبان پر پروانہ وار تصدق اور نثار ہوتے رہے۔ چکبستؔ[1] نے اس چمن کی گلچینی کی اور آخر میں مولانا سبط حسن[2] نے نثر میں وہ کیف پیدا کیا جو ابھی تک نظم کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ غرض یہ کہ عدالتی کاغذات شاہی فرامین اگلے زمانے میں فارسی میں لکھے جاتے تھے اور لکھنؤ کے پرانے اور عام باشندگان کی وہی زبان تھی جو ابھی تک رستوگی ٹولہ اشرف آباد سوندھی ٹولہ راجہ کے بازار میں ہے اور جدید آنے والے اردو میں چار چاند لگاتے رہے۔ سمجھے تھے کہ حکومت بدلی ملک بدلا وہ نقشہ نہ رہا نیا سکہ چلا مگر زبان بدل نہیں سکتی لیکن افسوس ہے کہ جان زبان کے مرتے سے لطف زبان بھی فنا ہو گیا شہروں کے رہنے والے اقطار و اکناف عالم سے سمٹ کر آباد ہوئے اور پردیسیوں کی معاشرت نے زبان کو مسخ کر دیا اور وہ وقت آ گیا کہ

ع وطن میں بیٹھ کے روئیں گے ہم زباں کے لئے

چوکیدار اور پہرہ

عہد شاہی کا پہرا جس کی ہم عنقریب نقشہ کشی کرتے ہیں انگریزی ہونے پر رفتہ رفتہ موقوف ہو گیا اور اب راتوں کو چوکیدار گلی گلی ڈرونی آواز سے کھنکھارتے پھرنے لگے اگر کوئی بچہ جاگتا ہو تو ماں باپ کے پہلو میں سہم جائے اور "جاگتے رہو" کی صدا برداشت نہ کر سکے اس حکم نادری کا مطلب یہ ہے کہ پیسہ والے جاگتے رہیں اور مفلس سوئیں یا سب جاگتے رہیں ادھر تو حفظ صحت میں روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے اُدھر جاگتے رہو کی آواز، اگر اس حکم پر رعایا عمل کرے تو صبح کو نہ دفتر میں کوئی اہل کار پہونچے نہ کوئی دوکان وقت پر کھلے سب سوتے رہیں گے اور نہ سوئیں گے تو بے شمار بیماریاں پیدا ہوں گی عہد شاہی میں انگریزوں کے زمانے کا ایسا مضر صحت پہرا نہ تھا بلکہ یا علیؓ حیدر "حکم حیدر[3]" کہہ کر پہرا ہوتا تھا جرائم پیشہ کے سامنے کسی انصاف ور بہادر کا نام آئے تو وہ ڈر جاتا ہے اور ارادے اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ عہد نصیر الدین حیدر بہادر میں "حکم حیدر" کی لفظ نے اور لطف پیدا کیا تھا۔ حکومت کی طرف سے چوکیداروں کے علاوہ امیروں رئیسوں کی ڈیوڑھی پر بھی پہرہ دار نوکر تھے جو تمام رات اپنے مالک کی محلسرا کے گرد اسی طرح پہرہ دیتے تھے۔ آغائی صاحب کی ڈیوڑھی پر برابر میں اور چوک میں چودھرائن طوائف کے یہاں اسی طرح پہرہ ہوتا تھا۔

---

[1] ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو رائے بریلی میں آپ کا جام عمر لبریز ہوا قیصر باغ میں چکبست روڈ انگریزوں کے وقت سے اب تک ہے [2] ۲۸ محرم ۱۳۵۲ھ کو یہ شہنشاہ مملکت ادب موت کی نیند سو گیا۔ [3] منادی دہلی جلد ۱۴ شمارہ ۵ صفحہ ۴ میں گوپی ناتھ امن کے مضمون میں بھی یہ ذکر ہے۔

لکھنؤ کی بنی ہوئی خاص چیزیں

جو اشیاء اپنے خصوصیات کے لحاظ سے کہیں نہ ملیں ان میں پنج گوشہ ٹوپی لحاف اور رضائی کی فردیں مٹی کے کھلونے اور تصویریں، عطر، چکنی ڈلی، چکنی مٹی، چکنی کا چورہ، چکن، کامدانی، شمارداںہ، نہاری، شیرمال، گاؤزبان، گھیتلا جوتہ، زیرپائی، کفش، انگوٹھیاں، سادہ کاری، مدریہ حقہ، صراحی، جھجھری، کاغذی آبخورہ، کاغذی ہانڈی، جھانواں، عمارتی جالیاں، اونی چھینٹیں چوڑیدار پاجامہ، انگرکھے، تانبے کے برتن، کھٹیاں یہاں کی خاص چیزیں ہیں ان میں ہر چیز ہندوستان کے کسی بازار میں نہیں ملتی اور اگر ڈھونڈنے سے مل بھی جاتی تو لکھنؤ کی بنی ہوئی یا یہاں کے نمونے پر تیار کردہ ہوں گی عقیق اور دھات پر نام کندہ کرنے والے بھی ایسے باکمال اور خوشنویس تھے جو اپنا جواب نہ رکھتے تھے جو اشیاء اب رواج نہ ہونے سے بنائی نہیں جاتیں ان کا آگے اپنی جگہ پر ذکر آئے گا بعض مصنوعات کا اس مقام پر ذکر کیا جاتا ہے جو اب بازار میں نہیں ملتے اور کچھ دن کے بعد ان کا نام بھی باقی نہ رہے گا ملاحظہ ہو۔

گھیتلا جوتہ :- ایک زمانہ وہ تھا کہ شریفوں کی عام وضع یہی تھی جسم میں اچکن سر پر کلاہ اور کرتے کے نیچے کلیدار پاجامہ پاؤں میں یہی گھیتلا جوتہ پچھتر برس پہلے کے فوٹو دیکھو۔ مشکور الدولہ اور اصغر جان فوٹوگرافر کی بنائی ہوئی تصویروں میں مخملی جوتہ ضرور ملے گا یہ ایک قسم کی سلیپر تھی جس میں ایک لپٹی ہوئی سونڈ کا اضافہ تھا یعنی ٹو کی جگہ گھوما ہوا حصہ شیطان کی آنت کی

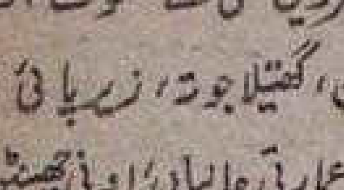

طرح عہد شاہی ختم ہوتے ہوتے اس کا رواج ختم ہوا اور صرف شادی بیاہ میں مبارک سمجھ کر دولہا دلہن کو پہنایا جاتا تھا رفتہ رفتہ نوجوانوں نے جز بز ہو کر اس وقت بھی پہننا چھوڑ دیا اور کاریگر جن کا کوئی دوسرا روزگار نہ تھا فاقوں سے مرنے لگے۔ یہ جوتے عام طور پر زرد مخمل کے ہوتے تھے اور شادی میں بھاری اور کامدار پہنائے جاتے تھے۔

کفش :- عالم اور بوڑھے عبادت گذار ہمیشہ کفش پہنتے تھے جس کی صورت گھیتلے جوتے اور سلیپر کی درمیانی تھی۔ پنجے کی طرف سے چوڑی کناروں پر چمڑہ کی گوٹ اوپر مخمل یا کیمخت جو ایک دندانہ دار کھرا چمڑا ہوتا تھا ٹو میں خرطومی انداز نہ تھا مگر ایڑی میں لوہے کا ایک خاص طرح کا نعل ہونا ضروری تھا اس کو پہن کر چلنے میں ایک قسم کی تکلیف ہوتی تھی جس کو تارک دنیا راحت سمجھتا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ اگر قبلہ کو غصہ آجائے اور کسی گنہگار کے سر پر کفش رسید کردیں تو اس کے سر پھٹنے میں ذرا بھی دیر نہ لگے۔ کفش بنانے والا "اللہ رکھو" پہلا کاریگر تھا پھر رمضان خان، ذاکر حسین بیچ کی سرا میں بنا کر بیچتے تھے اس وقت ارزانی میں دو ڈھائی روپیہ قیمت تھی۔ آخر میں آغا حسن جنت فروش فرمائش آنے پر تیار کرتے تھے۔ پہننے والے نہ رہے تو یہ کام بھی بند ہو گیا عرب میں اس سے ملتی جلتی نعلین اب بھی ہوتی ہے مگر وہ بات کہاں جو کفش میں تھی عراق و حجاز کے سفرناموں میں کفش کنی یا کفش داری اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں جوتے اتارے جائیں اردو انشاپردازی میں آپ کا "کفش بردار" برابر لکھا جاتا ہے اور یہ اشارہ اسی کی طرف ہے۔ آتش کے شعر میں کفش کا ذکر اس طرح ہے ؎

اس قدر ناگوار ہے کڑا پن خلق کو
کفش سے رکھتے ہیں مردم نعلِ آہن زیرپا

زیرپائی :- تربوز کے بیج جو لوگ شوقیہ کھاتے ہیں ان کے بیج دانت سے کھٹکنے پر بیج کے دو رخوں میں سے ایک رخ کا آدھا حصہ اگر کتر لیں اور جو باقی رہے وہی زیرپائی ہے رمضان خان، ذاکر حسین اس کے آخری کاریگر تھے اور بیچ کی سرا میں چھ سات آنے کو بکتی تھی۔ بچکانہ کی صرف دو ڈھائی آنے قیمت تھی کسی لڑکے کو جوتا پہنانا ہو تو سب سے سستا جوتہ زیرپائی تھی برون چمڑے اور کبھی کبھی زرد مخمل کی ہوتی تھی۔ پچاس

برس پہلے اس کا رواج تھا مرقومہ بالا دونوں کاریگروں کے بعد یہ کام بند ہو گیا۔

مدریہ حقّہ :۔ مشرقی تہذیب کی بزم میں حقّہ ہمیشہ زینت محفل سمجھا گیا اور صاحبان ذوق نے اس کی مختلف صورتیں کئی کئی طرح کے اقسام قرار دے، بڑے بڑے طبقے میں پیچ وان، گڑگڑی، ڈیڑھ خما، سٹک، قفلی دار مدریہ تھے جس کو ہندو مسلم امیر برابر سے پیتے تھے اور پنچ ذات میں ناریل نے یہ جگہ لی تھی، جو کمہار، کھٹک اور ہندو مزدور پیتے تھے سلسلۂ شعر و سخن میں بھی حقّہ کا ذکر ہے۔ حکایت شیخ امام بخش ناسخ نصیرالدین حیدر بہادر کے دربار میں حاضر تھے سرکار کے سامنے حقّہ تھا حکم ہوا شیخ صاحب حقّہ پر کچھ کہئے۔ ناسخ نے بادب عرض کیا ؎

حقّہ جو ہے حضور معلّی کے ہاتھ میں گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں

ناسخ یہ سب بجا ہے ولیکن تو عرض کر بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

حکیم بیٹ کے بیماروں کو حقّہ تجویز کرتے ہیں اس پر لنگس پر تمبا کو یا دھوئیں کا مضر اثر نہیں پڑتا حقّہ کی ہر چیز دکھ درد کی دوا ہے گل پسا ہوا دانتوں کی صفائی میں ٹوتھ پاؤڈر کا کام دیتا ہے۔ کیٹ مرہم کی جگہ بعض بیماریوں میں لگائی جاتی ہے "آب قلیان کہنہ" بہت دن کے بھرے ہوئے حقّہ کا پانی جو بدلا نہ جاتا ہو سانپ کے کاٹنے پر مار گزیدہ کو پلایا جاتا ہے اور بار بار قے آنے کے بعد اثر جاتا رہتا ہے حقّہ کا ساز و سامان یہ ہے مہنال، نیچہ، قفلی، گٹہ، پیندا، چلم، توا، گُنج، جنبر، دست پناہ، نفاست پسند لوگ حقّہ کو پیتل کے ایک تھال میں رکھتے ہیں تاکہ فرش پر انگارہ یا چنگاری نہ گرنے پائے۔ باہر کے لوگ پیندے کو فرشی کہتے ہیں جو لکھنؤ کا محاورہ نہیں ہے چوک میں حقّہ پلانے والے بھی سیر کرنے والوں کو آرام کے لئے اپنی خاص وضع قطع میں پھرتے تھے اور گھریلو زندگی میں حقّہ مرد و عورت برابر سے پیتے تھے۔ میر حسن کہتے ہیں ؎

کھڑے ہو کے دو گھونٹ حقّہ کے لے چبا پان اور رنگ ہونٹوں پہ دے

اگلے زمانے میں ساری محفل میں دو ایک پیچوان یا بڑے حقّے ہوتے تھے اور وہی مشاعرہ کی شمع کی طرح صاحبان ذوق کے سامنے گشت کرتے تھے عظیم اللہ خاں نے مدریہ حقّہ ایجاد کیا اور اس کم خرچ بالانشین نے وہ فروغ حاصل کیا کہ محفل میں جتنے حاضرین ہوں اتنے ہی حقّے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ قد و قامت میں چھوٹا، بڑے مجمع میں جگہ کم گھیرنے والا فقط دو نرکل سیدھے جوڑ دیتے ہیں حقّہ تیار ہونے میں نگالی لگانے موڑنے قفلی کی زحمت اور ایک طول عمل تھا قیمت کے لحاظ سے سستا بھی مع چلم اور تمباکو بھرا بھرایا اکبری دروازے میں دو موتی پیسے کو بکتا تھا منشی ہرگوبند سہائے کو غالب نے جو خط لکھا ہے وہ یہ ہے۔

"ہم تو آپ کو سکندر آباد[1] قانون گویوں کے محلہ میں سمجھے ہوئے ہیں اور آپ لکھنؤ راجہ مان سنگھ کی حویلی مطبع اودھ اخبار میں بیٹھے ہوئے مداریہ حقّہ لکھنؤ کا پی رہے ہیں اور منشی نولکشور صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔"

یہ تمام مصنوعات دیسی نہ تھے بلکہ دور دور سے اہل ہنر آئے اور قدر افزائی دیکھ کر بس گئے نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے صاحبان کمال اس زمین میں جذب ہو گئے اور ہر شے لکھنؤ کی بنی ہوئی شمار ہونے لگی۔

حقّہ پر علماء اسلام کے تالیفات ہیں ملاحظہ ہو۔

---

[1] دہلی کی عمارت

(۱) اقامۃ البرہان علی حلۃ القلیان از تصنیف مولانا سید ابوالحسن صاحب مرحوم لکھنوی

(۲) فصل الخطاب در حلۃ قلیان از تاج العلماء سید علی محمد مجتہد لکھنؤ

(۳) قول فیصل در مناظرہ تاج العلماء متعلق حقہ

(۴) تبیان در حکم قلیان ملا معین الدین نولکشوری فہرست میں اس رسالہ کی قیمت تین پیسہ ہے۔

(نوٹ) اخباری حضرات حقہ پینا جائز نہیں سمجھتے یہ ان کے جوابات ہیں۔

باہر کے آدمیوں کی پہلے پہل آمد

چھ سو برس پہلے دیس کا کیا حال ہوگا دیہاتیت کی چارسو ہوا، کنوئیں سے دور بسنے والوں میں پانی کی نایابی، قحط آب شہریت کا پتہ نہیں گاؤں کی سادی زندگی آبادی ہوئی تو کھیتی باڑی کرنے والے مرد و عورت کے ساتھ گائے بیل، ہل، رتھ چھپروں میں زندگی اور کہیں کہیں کھپریل اوپلوں کے جابجا ڈھیر، کھلیان، اس کے بعد سناٹا ویرانہ ہوا گیدڑوں کی آواز، لومڑیاں، سور، بنڈیلے کی بھیانک صورتیں دو دو کوس پر کچی سرائیں، آدمیوں کا کہیں کہیں پڑاؤ مگر چوروں کا ڈر، ساہی کے کانٹے زیرپا، سارے دن درندوں کی آمد و شد، رات بھر کتے بھونکنے کی آوازیں، سورج ڈوبتے وقت اور صبح کے سہانے لمحات میں پرندوں کے چہچہے چڑیوں کا بسیرا دلفریب تھا ورنہ ہر گھڑی جان و مال کا ڈر، لیکن کچھ ایسے نڈر تھے کہ نہ ان کو اونچی چھتوں کے زیر سایہ آرام کی عادت تھی نہ فکر آب و دانہ ان کے ارادہ کو پس و پیش میں کچلتا تھا ماحول کی تلاش میں سرگرداں تھے صحرانوردی عادت تھی جہاں من میں آیا اتر پڑتے اور رزاق پر بھروسا ہوتا وہی زمین ان کی جاگیر تھی وہی مٹی ان کی آخری خواب گاہ ہوتی اور خود نہ رہتے مگر یاد دلوں میں چھوڑ جاتے سب سے پہلے لکھنؤ میں صوفیائے کرام کے قدم آئے اور میں سمجھتا ہوں کہ بھارت کی ہر بستی میں اولاً اولیاء اللہ مہمان ہوئے وہ بھکاری کی صورت میں تھے مگر ان کی جھولی میں بہت سے گوہر آبدار تھے چہروں پر رعب، سچائی میں جذب، زبانوں میں اثر، ارادوں میں استقلال، دشمن سے ہمیشہ بے خوف ہوتا۔ سارا جہاں اگر ان کو ولی نہ مانے تو کم از کم یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ سچ بولتے تھے مکر و فریب کا نام نہ جانتے تھے۔ فرقہ وارانہ جذبے سے ان کے دل خالی تھے یہی وجہ ہے کہ ملک کی اکثریت میزبان بن کر ان کی عزت کرتی تھی اور ان کے پڑاؤ میں رکاوٹ پیدا نہ کی وہ نڈر ہو کر ایسا بسے کہ مرتے دم تک اس زمین کو نہ چھوڑا آج ان کی بود و باش کے رہے سہے نشانات باقی ہیں۔ حالات صوفیائے کرام پر جو کتابیں لکھی گئیں کچھ تو صرف عقیدت ہی عقیدت ہیں فکر و نظر کی گنجائش نہیں اور جو تاریخ کی روشنی میں نذر قرطاس ہوئیں ان کے فرد فرید ہونے سے جانچ پڑتال کا کوئی ذریعہ نہیں رہا۔

اس مجمع میں کچھ تو ایسے ہیں جن کے فقط نام نظر آتے ہیں نہ سکونت کا پتہ ہے نہ یہ معلوم کہ کس سال انہوں نے جام وصال نوش کیا اور کہاں سپرد خاک ہوئے کچھ وہ ہیں جن کے نام اور سالہائے وفات تو ہیں مگر کہاں رہتے تھے اور کہاں لحد نصیب ہوئی اس کا حال نہیں کھلا۔ ہاں کسی کسی کی فرودگاہ اور مزار کا سنہ وفات کے ساتھ ذکر ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فیروز شاہ تغلق کے پہلے اس سرزمین پر حاجی الحرمین آئے اور ۸۲۵ھ سے قبل وہ اپنا حلقۂ اثر وسیع کر چکے تھے۔ مخدوم شاہ مینا اور ان کے گدی نشین شیخ سارنگ[1]

---

[1] مرد سیاہ رنگ تھے جن کو عوام نے بجائے سیاہ رنگ سارنگ کہنا شروع کیا۔

انھیں کے نام لیوا تھے ان کے بعد شیخ الاسلام شیخ سعد اللہ کنتوری فراز آئے اور ۲۲ ربیع الاول ۸۲۲ھ کو ان کے پاس بھی پیام موت آیا اور دنیا سے گزر گئے یہی زمین ان کا بھی مدفن ہوئی پھر شاہ پیر محمد نے اس ویرانہ میں قدم رکھا اور ۸۵۰ھ میں خدمت خلق کے بعد وہ بھی پیوند خاک ہو گئے ان کا پرشکوہ مقبرہ ٹیلے کی مسجد کے سامنے اب تک موجود ہے یہ پانچ شخص لکھنؤ میں باری باری پہلے آنے والوں میں تھے جو اپنی موت سے مرے اور ان کے کردار نے عقیدتمندوں کو یاد رکھنے کا ذریعہ بخشا۔ وہ ملک جس میں گاؤکشی جرم عظیم تھا وہاں کے رہنے والے بھلا یہ ممکن تھوڑی تھا کہ آدمی کا خون بہاتے مگر اچھے اور برے اس دنیا میں ہمیشہ رہے اور کوئی زمانہ ایسا نہ تھا جو پاپ سے خالی رہا ہو۔ گیارہویں صدی ختم ہو کر بارہواں قرن شروع ہو رہا تھا کہ ایک مرد بزرگ ایرانی جنگ بانسواڑہ میں شہید ہو گئے کتابوں میں ان کا نام اور سنہ وفات تو میں نے دیکھا مگر کیفیت شہادت معلوم نہ تھی یہاں تک کہ کھنڈرات میں ان کی قبر برآمد ہوئی اور سنگ مزار یوں پڑھا گیا۔ "دوست محمد ولد عوض علی اصفہانی در جنگ بانسواڑہ در سنہ یک ہزار و یک صد و یک ہجری شہید شد"

مؤلف کے گھر سے قریب یہ سینیٹری روڈ کا واقعہ ہے جو تفصیل سے آئندہ صفحات میں آپ دیکھیں گے یہ کس دار و گیر کا واقعہ ہے کون قاتل تھا؟ کچھ خبر نہیں۔ اس قدر مشاہدہ ہے کہ مرقومہ افراد کی قبروں پر جن کے نشانات باقی ہیں قوالی ہوتی ہے اور یہ قبر قوالی سے بھی محروم ہے شاید اس مرنے والے کے ذوق کے خلاف عقیدتمندوں کا یہ اقدام تھا جو رواج نہ پا سکا۔ محراب قبر پر مظلومیت برستی ہے۔

پھر محمد شاہ وحدت کے قدم آئے اور رجب ۱۱۲۳ھ کی چوتھی کو خاک ہستی ذرات ارضیہ میں مل گئی۔ ان کے بعد شیخ غلام نقشبندی نے اس سرزمین پر ۱۱۲۶ھ میں قدم رکھا اور آخر میں مولوی نظام الدین کا دور دورہ ہوا اور یہ محترم ذات ۱۲۱۶ھ تک بقید حیات تھی۔ اول الذکر دو شیوخ کی آمد میں قریب سو برس کے فاصلہ بطور تخمینہ ہوتا ہے اور ثانی الذکر کے تیسرے دور تک ۲۶۵ برس کا خلا رہ کر پھر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مہاجرین کی آمد میں فقراء کا نام ملا مگر تاریخ اس بات کے بتانے سے قاصر ہے نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ اب بھی زمین بیاباں رہی اور شہر کہے جانے کے قابل نہ تھا۔ بستی بسانے کا سہرا آصف الدولہ کے سر رہتا ہے پہلی عمارت کہاں بنی اور کیا نام قرار پایا لفظ نے بگڑ کر کیا صورت اختیار کی تفصیل ان شاء اللہ آئندہ صفحات میں ملے گی انتظار فرمایئے۔

عالم اور فاضل

عہد عالمگیر میں مسلمانان لکھنؤ کے قاضی حافظ امان اللہ بنارسی تھے جنھوں نے ۱۱۳۳ھ میں چاشنی موت سے دنیا چھوڑی۔ نوابی کا زمانہ شروع ہوتے پر عہد نواب سعادت علی خاں میں محکمہ قضا چار شخصوں کے سپرد تھا مفتی محمد نعمت اللہ، مفتی غلام حسین خاں مفتی سعد اللہ خاں، مفتی گھسیٹے خاں اور مفتی اعظم کا عہدہ مفتی جلال کے سپرد تھا ان کی خطابی مہریں جو محکمہ قضا کے وکیل میر اسد علی بن میر دلیل خاں تھے جو ان عالموں کے سامنے بحث کرتے تھے ۱۰ ذیقعدہ ۱۲۱۱ھ تک ان کا فیصلہ اور تجویز میں نے دیکھی

ان آنے والوں کے حالات محلہ وار اپنے مقام پر آئیں گے ۔ یہ حالات زیادہ تر گلشن فقیری اور وفیات الاخیار مؤلفہ عبدالرحمٰن رکن الدین حاجی محمد احسن وحشی صابری بلگرامی ابن مولوی محمد عبدالحلیم سے ماخوذ ہیں ۔ تاریخ حدیقہ از خادم علی سندیلوی ص ۱۱۱ ۔ مقدمہ زیارت گاہ قدم رسول توپ لکھنؤ کے راضی ناموں میں یہ مہریں موجود ہیں یہ علماء لکھنؤ کے پہلے شیعہ عالم غفران مآب کے ہمعصر ہیں اس دستاویز پر ان کی بھی دستخط ہے۔

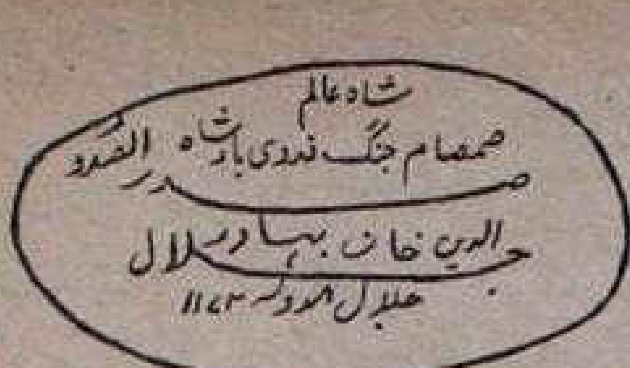

ان کے بعد صدر الصدور کا عہدہ مولوی مدن کو ملا جن کا اصل نام مولوی مجید الدین تھا اور شاہجہانپور محلہ شرقی کے رہنے والے تھے۔ امیر مینائی کا یہ شعر ان کے بارے میں بہت مشہور ہے ؎

بڑھا لی شیخ نے ڈاڑھی سن کی سی + مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

مولوی مدن کے بھائی مولوی سدن تھے ہر دو برادران کی کوٹھیاں وطن میں موجود ہیں۔ ان کے بعد دیوانی مولوی ظہور اللہ انصاری کو سپرد ہوئی۔ تاریخ میں ہے کہ وہ اس قدر جلد بولتے تھے[1] کہ بات مشکل سے سمجھ میں آتی تھی۔ خادم علی سندیلوی ان کے شاگرد تھے معقولات میں بلند درجہ تھا درسیات کی کتابوں پر ان کے حواشی ہیں منطق کی کتاب میرزاہد رسالہ پر زمانہ غازی الدین حیدر کا لکھا ہوا خطی نسخہ اور حاشیہ مکتبۂ ممتاز العلما میں موجود ہے اور خاتمے پر جو نوٹ ہے اس سے واضح ہوتا ہے آپ ۱۲۳۲ھ تک زندہ تھے یہ حال تو علمار اہلسنت کا تھا مذہب امامیہ کے مقدمات دیوانی منصف الدولہ سید محمد باقر اور فوجداری خلاصۃ العلمار سید مرتضیٰ مجتہد العصر والزماں کے دونوں بیٹوں کے سپرد تھے نئے بادشاہ کے برسر حکومت ہونے پر تاج کسی عالم کے ہاتھ سے شاہ کو پہنایا جاتا۔

اخبار:- نجم الغنی کا بیان ہے کہ عہد شجاع الدولہ میں تبیان[2] الاخبار لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا اس وقت لکھنؤ آباد کہاں تھا۔ پریس کس کا تھا یہ بیان سمجھ سے باہر ہے پھر زمانہ معتمد الدولہ میں اخبار صحیفہ[3] جاری ہوا جو کلکتہ سے چھپ کر لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔ پرانے کتب خانوں میں اخبار طلسم کے نمبر بھی ملتے ہیں ان اخباروں کے سوا کوئی مشہور ادبی اور تاریخی جریدہ نہ تھا۔

پریس:- عہد نصیر الدین حیدر تک شاہی پریس ٹائپ کے حرفوں میں چھپتا تھا شاہ موصوف نے مسٹر آرچر کو ۱۸۳۰ء کے قریب کانپور سے بلا کر لکھنؤ میں پتھر کی طباعت کو رواج دیا ڈاکٹر اسپرنگر کے قول کے مطابق ۱۸۴۸ء میں شاہی مطبع کے علاوہ بارہ غیر سرکاری مطبع تھے حسن خط، شان طباعت، صفائی، پختگی کا نمونہ برقی پریس اور پلیٹ کی طباعت آج تک پیش نہ کر سکی۔ شاہی پریس سے ہر علم و فن کی کتابیں چھاپی گئیں ادبیات، مذہبیات، اخلاقیات، درسیات، فقہ، حدیث، تفسیر، لغت جو کتاب سلطانی مطبع میں چھپی اس پر برقی مشین سے چلنے والی تاج کمپنی بھی برتری حاصل نہیں کر سکی۔ اردو زبان میں مذہب امامیہ کی پہلی تفسیر اس پریس میں طبع ہوئی۔ شاہنامہ فردوسی چھپا ہفت قلزم معرکہ آمار لغت زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ یہ وہ علمی اور ادبی کارنامے ہیں جو سلطنت دہلی پیش نہیں کر سکی۔

عوامی ذوق:- آج جبکہ ہر طرف عربیت کو فروغ کی کوشش اور نائٹ اسکول عربی تعلیم کے لئے کھل رہے ہیں پچاس سال پہلے کا ذکر ہے کہ کریم بخش خط تراش جو زیادہ تر علمار مجتہدین کے بال کاٹتا تھا اس نے آموں کی فصل میں دسہری آم لینا چاہے آم والا سمجھتا تھا کہ یہ نائی ہے زیادہ قیمت نہیں دے سکتا جواب میں کہا کہ یہ عام گاہکوں کے لئے نہیں۔ خاص خریدار لیں گے۔ کریم بخش نے عام و خاص کی لفظ سنکر بے ساختہ کہا مجھے مطلق ضرورت نہیں۔

عام، خاص، مطلق تینوں اصطلاحیں اصول فقہ کی ہیں کریم بخش علمار کو قوانین الاصول پڑھاتے سنکر تینوں لفظیں دل نشین کر چکا تھا سننے والوں کو حیرت ہوئی۔ لطف یہ تھا کہ اس موقع پر بھی سنجیدہ طبقہ تھا جس نے لطف حاصل کیا (۲) گنگر کے کنوئیں سے ایک مرتبہ

---

[1] تاریخ جدولیہ و تاریخ اودھ ص ۵۸ ج ۴ نجم الغنی [2] تاریخ اودھ جلد دوئم ص ۱۵ نجم الغنی [3] ایضاً جلد چہارم ص ۱۵۶

گزر رہا تھا کہ ایک کریہ منظر سیہ فام عورت خاموش راستے سے گزر رہی تھی دوسری عورت سے ملاقات ہوئی صاحب سلامت کے بعد اس نے کہا جب اتوار منگل چھوڑی جاتی ہو تو سامنا ہوتا ہے۔

ان جملوں کو سنکر اس نے جواب میں کوئی گالی اٹھا نہیں رکھی جو دی نہ ہو۔ سننے والے اس چھیڑ پر پھڑک گئے دوسرا شخص بنار مخاصمت کچھ نہیں سکتا تھا عام طور پر منگل اور اتوار کو لوگ بھجنگا صدقہ کرکے چھوڑتے ہیں اور وہ لاسہ لگے ہوئے پروں سے پوری طاقت سے اڑ بھی نہیں سکتا مارا مارا پھرتا ہے۔ چھیڑنے والی عورت نے اس کی بدصورتی کو صدقہ کا بھجنگا کہا۔

شعراء

اگر شاعر ترجمان ملت اور صحیح معنوں میں خدمت گزار ادب ہو سکتا ہے تو سلطنت اودھ میں اردو فارسی عربی داں شعراء نے اپنے نتائج افکار اور گردش قلم سے وہ کوس لمن الملک بجایا جس نے دنیا کو عرفی انوری خاقانی امراء القیس کا عہد یاد دلا دیا ارض وطن میں وہ تاثیر تھی کہ عورتیں بچے، یکہ والے کنجڑے موزوں طبع تھے۔

عربی داں شاعر:- اردو فارسی اشعار کے ساتھ ساتھ عربی کلام بھی شعراء کا اس قدر ٹھوس اور پختہ تھا کہ عراق و حجاز کے اہل زبان بے ساختہ داد دیتے تھے اور قادر الکلامی کو مانتے تھے چنانچہ غیر ملکی زبان میں طبع آزمائی کرنے والوں کی فہرست بھی بسیط ہے اور مشہور شعراء میں شمس العلماء مفتی میر عباس صاحب اور ان کے ہمعصر صاحبان ذوق کا کلام جن کے تذکرے چھپے ہوئے موجود ہیں نظر انداز کرکے غیر معروف شعراء کا تعارف کرتے ہیں۔ سلطنت اودھ نے ہر خانوادہ ہر نسل میں عربیت کا وہ ذوق پیدا کر دیا تھا جو عالمانہ لباس میں نہ تھے وہ عربی ادب میں نمایاں اور ممتاز تھے۔

(۱) نواب باقر علی خاں تشنگی رئیس شہر ہونے کے ساتھ بلند پایہ شاعر اور اوّل درجے کے متکلم تھے مناظرانہ چاشنی نے ان کے اشعار میں اور زیادہ سامعہ نوازی پیدا کر دی تھی اور یہ مثنوی[1] پڑھ لینے والا آسانی سے مناظر بن سکتا تھا۔ اس مثنوی کے افتتاحیہ شعر ملاحظہ ہوں۔

حمدت الذی وجدہ بالیقین + شکرت الذی ارحم الراحمین

علیمٌ حکیمٌ سمیعٌ بصیر   خبیر علیٰ کل شئٍ قدیر

(۲) مرزا وزیر علی قدیم اساتذہ میں تھے سلطان العلماء مجتہد العصر والزماں (جن کا ذکر خطوط غالب میں بار بار آیا ہے) کی تاریخ وفات میں ان کا یہ مصرعہ تاریخ روح ادب ہے ع انکسفت شمس سماء العلم (۱۲۸۴) قدیم کے اور اشعار بھی مخطوطات مکتبہ ممتاز العلماء میں موجود ہیں۔

(۳) مرزا علی حسن کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں کہ کس کے بیٹے اور پوتے تھے تاریخ گوئی میں اپنے ہمعصروں کے پہلو میں ان کے اشعار بھی ملتے ہیں وہ ایک لڑکے محمد اصغر کی تاریخ پیدائش میں فرماتے ہیں وھو من ذریۃ ابراھیم ۱۲۸۱ھ کا یہ پورا قطعہ عربی میں میری خاندانی بیاض پر لکھا ہے پیدا ہونے والے بچے کے باپ کا نام ابراہیم تھا۔

(۴) کیوان خاندان علم سے نہ تھے لکھنؤ کے علمی ماحول نے ان کی ظرف علم میں وہ صلاحیت پیدا کی کہ عربی میں باتیں کرتے تھے

---

[1] یہ مثنوی ۲۲ ذیقعدہ ۱۲۵۳ھ کو اردو میں چھپی ہے جو میرے پاس موجود ہے مگر دیباچہ عربی میں ہے۔

کتنی تاریخیں عربی مخطوطات میں موجود ہیں۔ نواب امین الدولہ کی کربلا میں لوح تعمیر پر انھیں کا قطعہ تاریخ ہے اِنَّ ھذا مرقد العباس سلاطین اودھ کے زمانے میں عربی لٹریچر جو ضبط و تدوین میں آیا اس میں اوراق الذہب، ظل ممدود، سبیکۃ الذہب وہ بلند پایہ کتابیں ہیں جو حریری سے کم نہیں ہیں۔

فارسی شعراء :۔ ملک میں داخل ہونے والے فتحمند فرمانروا کی اولاً فارسی بول چال تھی اور اردو کو ان کی بزم میں ثانوی حیثیت حاصل تھی اس لئے شعر و سخن میں کمال حاصل کرنے والے زیادہ تر فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ لکھنؤ کی تاریخ مرتب کرنے والوں نے علمی حقائق پر کوئی توجہ نہیں کی اور فکر رسا نے کوئی ٹھوس کام نہیں کیا۔ سلطنت اودھ کے فارسی شعراء میں ہم کو تین طبقے قرار دینا پڑتے ہیں (۱) وہ حضرات جن کا کلام ۱۲۶۶ھ کی یادداشتوں، روزنامچوں، علمی تذکروں میں ملتا ہے (۲) ۱۲۷۳ھ تک ادبی خدمات میں عمر بسر کرنے والے یہ عروس سخن کے سنگار کا خوشنما دور تھا اور دوررس نگاہوں کو کمال کے بعد زوال کا خطرہ محسوس ہوتا تھا (۳) وہ فردیں جنھوں نے عہد شاہی ختم ہونے کے بعد لٹی ہوئی بستی میں گھٹ گھٹ کر زندگی بسر کی اور اپنے آغاز کی ریاضت کو کسی نہ کسی طرح مرکز انجام تک پہونچایا۔

پہلے طبقے میں مشاہیر کے علاوہ عزیز سہیل کے اشعار ہیں وہ علمی موشگافی اور بلندی پائی جاتی ہے جو ان کے شایان شان تھی۔ مگر افسوس ہے کہ نہ پورا نام معلوم ہے نہ جائے قیام۔ اشعار صفحۂ قرطاس پر موتیوں کی طرح چمکتے ہیں۔ دوسرے طبقے میں عابد علی تمنا، خیرات علی نجم، راجہ نواب علی خاں سحر، میر غلام رضا خرد ابن میر بلاقی، حکیم سید محمد علی خاں قدیر شاگرد دبیر، قبول، عیش، ضبط، فردوس نظم کے آٹھ دروازے ہیں جن کے نمونہ کلام پیش کرنے میں خوف طول ہے۔ تیسرے طبقے میں جو ۱۲۹۶ھ کا آخری دور ہے اس وقت عہد ماضی کی روشن شمعیں بجھ رہی تھیں اور دور انقلاب میں ادب کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ گل ہو رہے تھے حکیم رضا حیدر شہیر بلگرامی، تفضل حسین ابر، نثار، مرزا وزیر علی، سید محمد وزیر، شیخ محمد جان شاد، منشی اشرف علی اشرف، وارث علی فہم، میر علی جان سروش، حاتم علی مہر، نواب مہدی علی خاں جلیس، شاد ماں وغیرہ فلک ادب کے تابندہ ستارے تھے جن کا کلام عام طور پر سحاب غفلت میں نگاہ سے پوشیدہ ہے اور نہ ان کے امثال کا شمار ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان خدام ادب کے نام بھی قعر گمنامی میں ہیں اور اشعار زبان زد نہیں ہیں۔ عزیز کی ایک تاریخ ملاحظہ ہو ؎ مہ برج امید سید تقی، با وجہ آفتاب و بطلعت قمر :: چوں مختون شد از فضل حق آں سعید سر طرب زہرہ نمود سر :: زروئے ادب گفت سالش عزیز" ہلالے ز ابر تنگ شد بدر"
۱۲۶۷ھ

اس قطعہ میں عالم زادہ ہونے سے ادب کی لفظ اور تخرجہ کس قدر لطیف ہے اور مادۂ تاریخ کا کیا کہنا۔

اردو داں طبقہ :۔ اس دور میں علاوہ خرد، قدیر، فہم، جلیس، نثار کے جن کا کلام تیرھویں صدی کی ابتدائی بیاضوں میں ہے ایک بزرگ تہوّر گذرے ہیں جو زبان کی سلاست، الفاظ کے نہیب، بندش کی خوبصورتی، معنویت، تغزل ہر عنوان میں یگانہ روزگار تھے یورپ میں ایک SHAKESPEAR جو بین الاقوامی شہرت کا حامل ہوا۔ لکھنؤ میں مصحفی، آتش، ناسخ، انیس، دبیر، مشیر، قلق، اثر، میر وزیر علی، صبا، وحید، امانت، شوق، رشک، امید، سودا، میر، قتیل اور انشا کے علاوہ کتنے صاحبان کمال گزرے جن کی نظیر زمانہ پیدا نہیں کر سکا۔ شاہان اودھ نے چپہ چپہ میں علم و فضل کی آبیاری کی کمالات کی نہریں بہائیں زمین وطن میں صلاحیت پا کر فنون مشرقیہ کی تخم ریزی کی لاتعداد ہنرمند پیدا کئے جن کی طرف محلہ وار اشارہ ہوگا۔

طب یونانی :۔ اس فن کو سلطنت اودھ نے وہ فروغ دیا کہ پہلے عنبر گنج اطبار کا مرکز قرار پایا پھر جھوائی ٹولہ اور آخر میں جوہری محلہ خطہ یونان معلوم ہوتا تھا ایسے ایسے صاحبان کمال پیدا کئے جن کے نام رہتی دنیا تک باقی رہیں گے ہندوستان کے طول و عرض میں جو طبیب پھیلے وہ انھیں باکمال ہستیوں کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے والے تھے حکیم یعقوب صحت الدولہ مسیح الدولہ حکیم نبا من، حکیم کوچک اور آخر میں شفاء الدولہ نے انگریزی ادویہ کو یونانی مفردات کے ساتھ مدغم کرکے غیر معمولی کمال حاصل کیا۔ غرض ہر فن کا صاحبِ کمال اس عہد میں موجود تھا ڈاکٹر ناصر علی، ڈاکٹر احسان حسین، ڈاکٹر اعجاز حسین شروع انگریزی کے پہلے ڈاکٹروں میں تھے اور کامیاب معالج سمجھے جاتے تھے استخارے دیکھ دیکھ کر مریضوں کو نسخہ دیتے تھے۔

پردہ :۔ ہندوستان کے باکمال مصوروں نے شاہان دہلی کی بیگمات کے تصاویر تو مختلف سائز پر چھاپے رضیہ سلطانہ، نورجہاں جودا بائی، ممتاز محل کے عکسی فوٹو تہذیب اور چھالیٹن کے تھان پر، ادبی جرائد، جنتریوں، کلنڈروں پر برابر چھپے مگر ناظرین کو کسی بکچر میں ملکہ کشور، ملکہ جہاں، حضرت محل، امبر محل کے فوٹو اس طرح عام طور پر نہ ملیں گے یہ اس کنبہ کی تہذیب قدیم تھی۔ جمہوری حکومت کے دور آزادی میں اب حضرت محل کی تصویر نئے دور لکھنؤ کے صفحات میں اور معشوق محل کا بلاک کتاب نگر کے پبلشر نے چھاپا ۱۸۵۸ء[1] برٹش حکومت کے آغاز پر جو تصاویر تعلقہ داران اودھ کے نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئے اس میں جابجا خالی باڈر نظر آتے ہیں اور پردہ نشین لکھ کر جگہ چھوڑ دی ہے۔

دنیا بھر کے مشہور شہروں سے لکھنؤ کا موازنہ

مقابلہ کا جذبہ مزاج انسانیت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ جب دو ہنرمند ایک جگہ ہوں تو فیصلہ کرنے بیٹھ جاتے ہیں کہ کون اچھا ہے لکھنؤ اور فیض آباد سے ٹاکرا ہوا تو مرزا قتیل مشہور ادیب المتوفی ۱۲۳۳ھ نے بے دھڑک کہہ دیا "بیت الخلا لکھنؤ بہتر است[2] از فیض آباد" منشی علاء الدین احمد اکبرآبادی نے عہد واجدی میں لکھنؤ کو ہندوستان کی آنکھوں کا تارا کہا۔ ایک ایرانی شاعر ناطق جب لکھنؤ پہونچا تو کہا "گدائے لکھنؤ بر سلطنت[3] ربع مسکون فوقے دارد"۔ لکھنؤ کی بھیک دوسری جگہ کی سلطنت سے بہتر ہے۔ غرض کسی نے ربع مسکون سے بہتر اور کسی نے کلکتہ سے اچھا اور کسی نے راجہ اندر کے اکھاڑے سے عمدہ کہا۔ شعرار کے ذہنی تخیلات ملاحظہ ہوں۔

(مرزا فصیح)

لکھنؤ اب سبز دارِ ہند ہے
دمبدم افزوں بہار ہند ہے

(مفتی صاحب)

ہست در کلکتہ گو سیم و زری
کیمیا باشد تراب لکھنؤ
ہر کہ رفت از لکھنؤ خوابش نہ برد
در خیال خورد خواب لکھنؤ

(انشاء اللہ خاں انشاءؔ)

ہزاروں دیووں کو یہاں کی پریوں نے پچھاڑا ہے
یہ لکھنؤ راجہ اندر کا اکھاڑا ہے

---

[1] دیکھو ہسٹریکل البم آف اودھ
[2] رقعات مرزا قتیل
[3] لسان الواعظین مطبع سلطانی لکھنؤ

عارف علی شاہ عارفؔ

ہندوستاں ندیدیم موضع دلچسپ چو لکھنؤ
اگرچہ در طریق سرتا بہ چنیاں رفتم

ضیغم

شہر طہراں این زمان اے نیک خو
شد چو دہلی یا دکن یا لکھنؤ

مصحفی

کیوں نہ دل نظارگی کا جائے لوٹ
لکھنؤ میں حسن کی بندھتی ہے پوٹ

لا اعلم

کوئی قصہ مجھ کو خوش آتا نہیں
ہاں مگر اک داستانِ لکھنؤ

تمنا

لکھنؤ کی کوئی دم دل سے نکلتی نہیں یاد
اے تمنا کہیں پردیس میں کیا ہم ٹھہرا

خاور نگرامی

میسر ہو نہیں سکتیں وہ علمی مجلسیں خاور
رلا دیتا ہے یاد آتا ہے جس دم لکھنؤ اب بھی

ناسخ

آسماں کی کیا ہے طاقت جو چھڑائے لکھنؤ
لکھنؤ مجھ پہ فدا ہے میں فدائے لکھنؤ

تو نے دیکھے ہیں کہاں رنگیں ادائے لکھنؤ
لالہ و گل کے چمن ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ

پھر رہے ہیں گل عذار لکھنؤ
ہے چمن ہر رہ گذار لکھنؤ

گل سے رنگین تر ہیں خار لکھنؤ
نشہ سے بہتر خمار لکھنؤ

یاد ہیں سب گل عذار لکھنؤ
ہے تصور میں بہار لکھنؤ

رجب علی بیگ سرورؔ

بلبل شیراز کو ہے رشک ناسخ کا سرور
اصفہاں اس نے کئے ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ

ناصری

نہیں جب لکھنؤ تو ناصری کیا لطف جینے کا
وطن سے ہم بسانِ رہرو ملک عدم نکلے

نقشہ سلاطینِ اودھ تاسنِ جلوس وسنِ وفات اور مقام سلطنت بآسانی معلوم کرو

نمبر شمار	نام فرمانروا	سنہ جلوس	مقامِ حکومت	سنِ وفات	کیفیت
۱	محمد امین سعادت خاں برہان الملک	۱۱۴۴ھ	فیض آباد	۱۱۵۱ھ	
۲	نواب منصور علی خاں صفدر جنگ	۱۱۵۱ھ	″	۱۱۷۰ھ	
۳	جلال الدین نواب شجاع الدولہ بہادر	۱۱۷۰ھ	″	۱۱۸۸ھ	
۴	نواب آصف الدولہ بہادر	۱۱۸۸ھ	لکھنؤ	۱۲۱۲ھ	
۵	مرزا وزیر علی خاں بہادر	۱۲۱۲ھ	″	۱۲۱۳ھ	بنارس روانہ ہوئے۔
۶	نواب سعادت علی خاں بہادر	۱۲۱۲ھ	″	۱۲۲۹ھ	
۷	غازی الدین حیدر بادشاہ	۱۲۲۹ھ	″	۱۲۴۳ھ	
۸	نصیر الدین حیدر بادشاہ	۱۲۴۳ھ	″	۱۲۵۳ھ	
۹	منا جان	۱۲۵۳ھ	″	۱۲۵۳ھ	چند گھنٹہ حکومت کے بعد چنار گڑھ روانہ کر دئے گئے
۱۰	محمد علی شاہ ابو الفتح معین الدین	۱۲۵۳ھ	″	۱۲۵۸ھ	
۱۱	امجد علی شاہ ابو الظفر مصلح الدین ثریا جاہ	۱۲۵۸ھ	″	۱۲۶۳ھ	
۱۲	واجد علی شاہ سلطان عالم	۱۲۶۳ھ	″	۱۲۷۲ھ	کلکتہ روانہ ہوئے
۱۳	مرزا برجیس قدر۔ گیارہ برس کے سن میں تخت نشین ہوئے ۹ ماہ ۱۱ دن سلطنت کی	۱۲ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۵ جولائی ۱۸۵۷ء	″		۱۶ مارچ ۱۸۵۸ء کو نیپال روانہ ہوئے

(نوٹ) اودھ پر قلم اٹھانے والوں نے برجیس قدر کو سلاطین کی فہرست میں نہیں رکھا ہے اگر کم دنوں تک بادشاہ رہنا اس کا سبب تھا تو منا جان کی حکومت چند گھنٹہ تھی اور ان کے ذکر سے تاریخیں معمور ہیں ہم برجیس قدر کو اس فہرست میں اس لئے برخلاف دیگر مورخین کے کوشش کر کے جگہ دے رہے ہیں کہ وہ صحیح وارثِ تخت و تاج تھے اور پبلک نے ان کو حکومت کے لئے چنا تھا۔ جنگ آزادی کے حامی احمد اللہ شاہ (جن کو انگریزوں نے باغیوں کے لفظ سے یاد کیا تھا) بھی برجیس قدر کی سلطنت کو تسلیم کر چکے تھے اس لئے تیرھویں صدی کے لکھنؤ میں ان کا نام روحِ رواں ہے برجیس قدر کی تصویر قیصر باغ کے میوزیم میں موجود ہے۔

انقلاب سلطنت

غدر ۱۸۵۷ء میں یہ خوبصورت شہر جس کے آباد کرنے میں آٹھ بادشاہ ایک کے بعد دوسرا کوشش کرتا رہا۔ تلنگوں، گوروں، بلوائیوں کے ہاتھ سے لٹا اور دریا کے کنارے کی زیادہ سے زیادہ عمارتیں گرا دی گئیں بلوے عام میں جو گورے ہندوستانیوں کے ہاتھ سے مارے گئے تھے ان کے جوشِ انتقام میں شاہی عمارتوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی خیریت ہوئی کہ امام باڑہ انگریزوں

نے قلعہ بنایا تھا ورنہ یہ بھی نہ بچتا۔ سرکاری عمارتیں شاذونادر باقی رہیں۔ متمول رعایا کے سربلند قصر، غربا کے بیشمار مکانات بھی جو کشت و خون کی زد میں تھے نہ رہے ان رؤسا کی ڈیوڑھیاں باقی رہیں جنھوں نے اپنی رحم دلی اور سیاست سے انگریزوں کو چھپایا تھا اور وہی انگریزی راج میں خطابات اور شرکت دربار کی عزت سے سرفراز ہوئے غدر کے بعد شہر کی آبادی ایک طرف عنبر گنج سے حیدر گنج تک اور دوسری طرف گومتی کے کناروں کو چھوڑ کر پورب پچھم مصاحب گنج سے نرہئی تک اور اتر دکھن امام باڑہ آصفی سے شروع ہو کر دوگا نوے کے پل تک رہ گئی چار باغ میں دن کو سور چرتے تھے۔ عیش باغ میں بندروں کی کھان تھی۔

ادبی دنیا میں تلاطم

لکھنؤ کی ویرانی نے شعرا کو خون کے آنسو رلایا اور بزم علم و ادب میں وہ ہلچل تھی جو یادگار رہے۔

(ناسخ المتوفی ۱۲۵۴ھ)

سارے نقشے سامنے آنکھوں کے ہیں — نقش ہیں نقش و نگار لکھنؤ

(محمد رضا خاں عاشق)

کہاں ہیں وہ سلطاں کہاں ہے وہ فوج — نہیں لکھنؤ کا وہ باقی اب اوج

(منشی امیر المتوفی ۱۲۹۹ھ)

چوں ویراں سبزہ زار لکھنؤ شد — خزاں تا زہ بہار لکھنؤ شد
مکاں ویراں مکیں آوارہ دشت — الٰہی ایں چہ دور آسماں گشت

(مرزا دبیر المتوفی ۱۲۹۲ھ)

کس عہد میں تبدیل نہیں دور ہوا — گر عدل گیے ظلم گیے جور ہوا
اللہ وہی ہے تو نہ مضطر ہو دبیر — کیا غم جو زمیں اور فلک اور ہوا

(میر انیس المتوفی ۱۲۹۲ھ)

کیونکر کوئی غمزدہ نہ فریاد کرے — جب ملک کو یوں غنیم برباد کرے
مانگو یہ دعا کہ پھر خداوند کریم — دل اجڑے ہوئے لکھنؤ کو آباد کرے
کیوں سرخرو نہ ہو یہ چمن سبزوار ہے — دیکھو کہ اس خزاں پہ بھی ایسی بہار ہے

(مونس المتوفی ۱۲۹۴ھ)

کہنے میں نہ اب دل ہے نہ قابو میں ہے زباں — حضرت سے کریہ عرض کہ اے سرورِ زماں
غمگین ہیں مومنیں انھیں شاد کیجئے — گلزار لکھنؤ کو پھر آباد کیجئے

(مفتی میر عباس صاحب)

سلطنت رفت از اسلام بنا دانیہا — مرز بوم است ہمایوں و چوں عنقا است ہما

(ولہ)

گرچہ زائل شد شباب لکھنؤ — عشوہا دارد حباب لکھنؤ
غیرت معمور ہائے عالمست — شہر ویران خراب لکھنؤ

(سلطان عالم واجد علی شاہ)

انگریز بہادر نے ظلم کیا — مری چھین لی لکھنؤ نگری

(ایک وفادار عورت رعایا شہر میں)

واجد علی پیارا کلکتہ کو سدھارا — سڑکیں نکل رہی ہیں سونی گلی گلی ہے

(آغا[1] ججو شرف)

مدد کیجئے لکھنؤ لٹ گیا — خبر لیجئے لکھنؤ لٹ گیا

(ضیغم پسر وزیر اودھ)

لکھنؤ بے افسر و بے شاہ شد — ہر یکے زیں کوہ غم چوں کاہ شد

(ایک عراقی شاعر[2] از کاظمین)

اینجا اندر لکھنؤ بر مرد و زن بیداد شد — بے سخن آں شد کہ در یک دم بقوم عاد شد
سال تاریخ بلا را شیخ واعظ زد رقم — لکھنؤ برباد شد دنیا و دیں برباد شد
۱۲۷۲ھ

(ولہ)

سالہا شد کہ بخت مسکینم — وعدہ داد و کرد تسکینم
چونکہ بگذاشت باغبان قضا — گلی از باغ آرزو چینم
بعد ازیں ما و دفتر و خامہ — ہم مداد زاشک رنگینم
اولیں مد نوشتم ایں تاریخ — لکھنؤ را خراب می بینم
۱۲۷۲ھ

(ولہ)

الکفر جاء و اعلی الاسلام لیتھم — قد اعدموا حسبنا لا شاع لھم خبر
فی لکھنؤ ما جری ارختہ اسفا — فاصبحوا لا یری من اھلھا اثر
۱۲۷۲ھ

(میر انیس)

الٹ گیا نہ فقط لکھنؤ کا اک طبقہ — انیس ملک سخن میں بھی انقلاب آیا

پہلی مسجد اور پہلا مندر

کسی شہر کا ماحول نذر قرطاس کرنے کے ساتھ واقعہ نگار کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اہالیان شہر کی مذہبی، تمدنی، معاشرتی زندگی

[1] سیادت حسن جلال الدین حیدر نام تھا [2] سرور المومنین فارسی طبع بمبئی

پر بحث کرے لکھنؤ میں پہلی آبادی اس غیر مسلم طبقے کی تھی جس کی جاگیر صدیوں سے یہ زمین تھی اور جس پر وہ بلا شرکت غیرے قابض تھے مسلمان اپنی سفری زندگی میں ادھر سے گذرتے رہے اور دورِ مغلیہ میں یہاں مسلم صوبیدار کا انتظام ہوا برہمن اور ماہیر اور دوسری ذات کے آدمی پوجا پاٹ کرتے تھے دریائے گومتی ان کو سیراب کرنے کے لئے بہت تھا تاریخ سے صاف صاف ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ اس وقت کے مندروں میں کون سب سے پرانا ہے بڑی کالی جی کا مندر عہد آصفی کے پہلے یا بعد کی عمارت ہے مگر تاریخ میں کہیں صراحت نہیں ہے کہ کس سنہ میں اس کی بنیاد قائم ہوئی "بدھ ہے سر" گوتم بدھ سے نامزد پرانا مندر سعادت گنج سے آگے واقع ہے مگر صراحت سے کہیں نہ ملا کہ کب کے یہ آثار ہیں ۔ اسی طرح مسجدوں میں سمجھا جاتا ہے کہ ٹیلے کی مسجد سب سے پرانی عمارت ہے مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے ۔ پہلی مسجد ٹھیری ٹولہ میں ہے جو زمانہ شاہ عالم ۱۱۲۵ھ کی بنیاد ہے ۔ شاہ عبد الرحمٰن جنہوں نے اپنی روحانیت سے نوابی میں کوس لمن الملک بجایا اسی مسجد کے پڑوس میں سپردِ خاک ہوئے اور ان کا مزار آج تک وہاں موجود ہے اس مسجد کے پچھواڑے CONNING STREET ہے اور مسجد کا حال آئندہ اپنے محل پر آئے گا۔

پیسہ اور کوڑی

انگریزی راج سے پہلے موٹے پیسے شہر میں چلتے تھے جو نئے پیسے کے دوگنے تھے ان پر کوئی ٹھپہ نہ تھا اور تین موٹے پیسے دے کر دو انگریزی پیسے ملتے تھے ۔ انگریزی سکہ کا روپیہ سولہ آنے یا سولہ گنڈہ کا اور انگریزی روپے کے چوبیس گنڈے یا چوبیس آنے قدیم یعنی ۹۶ موٹے پیسے ہوا کرتے تھے اسی طرح ایک انگریزی پیسے کے دو دھیلے ہوا کرتے تھے لیکن دھیلا کئی کوڑیوں کا تھا ۔ اس میں اختلاف تھا اگلا حساب موٹے دھیلے اور موٹی دمڑی اور موٹی آدھی تھا جس کی تفصیل طولِ تحریر کا باعث ہے ۔ انگریزی پیسے کی ۶۴ کوڑیاں ہوتی تھیں اس حساب سے چار کوڑی کا ایک گنڈا ، ۲ گنڈی کی ایک آدھی ۔ ۲ آدھی کی ایک دمڑی ۔ دو دمڑیوں کا ایک دھیلا ۔ دو دھیلوں کا ایک پیسہ ۔ دھیلا ½ پیسہ اور دمڑی ¼ اور آدھی ⅛ تھی ۔ دو پیسوں کو ٹکہ یا دھنا کہتے تھے ۔

پیسہ خالص تانبے کا تھا اور کوڑی سیپ کی طرح پانی کا وہ جانور ہے جو زرد اور سفید مختلف رنگوں کی دریا سے نکلتے تھے ۔ اور حکیم نسخۂ منجن میں "خرمہرہ" کے نام سے یاد کرتے تھے ۔ بہی کھاتہ میں ایک پیسہ کا حساب اس طرح لکھتے تھے ۔ ہرا دھنیا (۶ دام) ۔ لہسن (۱۲ دام) ۔ پیاز (۳ دام) ۔ ہری مرچ (۳ دام) میزان ایک پیسہ (۲۵ دام)

کاملوں کی رہائش عموماً دریا کے قریب یا کسی مسجد کے حجرہ میں ہوتی تھی لکھنؤ کے صاحبان فن میں نوازش علی خاں وہ باکمال تھے جنہوں نے شیشے میں جن کو اتارنے پر قابو پایا تھا وہ بڑے ہر دلعزیز تھے ۔

لکھنؤ کے بانکے

یہ طولانی مضمون ہے جس پر عصرِ حاضر کے ادیب ماہوار میگزینوں میں سیر حاصل بحث کر چکے ہیں اس میں کوئی افادیت نہیں ہے اس لئے مختصراً اس قدر لکھنا ضروری ہے کہ یہ سخن پرور لوگوں کا ایک گروہ تھا جن کا قول پابندِ عمل تھا جو کہتے تھے وہی کرتے تھے ۔ ذرا میں مزاج کا پارا چڑھ جاتا تھا تلوار کھینچنا ان کے لئے معمولی بات تھی سر پر پٹے رکھتے تھے یا زلفیں ، اور اس کا راز یہ بتاتے تھے کہ اگر قتل ہو جائیں تو قاتل کان پکڑ کر سر نہ اٹھائے اور بال ہاتھ میں لے کر سر اٹھائے گھیتلا جوتا اس لئے پہنتے تھے کہ بھاگ نہ سکیں اور دشمن کو پیٹھ نہ دکھائیں کلی دار پائجامے کا پہناوا بھی اس لئے تھا کہ لڑتے وقت پائجامہ گرا دیتے تھے کہ اب راہ فرار نہیں اختیار کرنا ہے شدت کی سردی

اور ٹھنڈ میں ململ کا کرتا پہنتے تھے اور روئی دار دگلا یا مرزائی خلاف شان تھا غیرت دار ایسے تھے کہ سپر پہ ہاتھ رکھ کر جگر سے اٹھے رگڑے سے صدا پیدا ہوئی پہلو نشین نے آواز پر کچھ اور خیال کیا انھیں اپنی کمزوری خود محسوس ہوئی ۔ تپنچہ مار لیا اب صحبت احباب میں منہ دکھانے کے قابل نہیں عہد شاہی ختم ہونے کے ½ قرن تک یہ لوگ رہے برست میں بھی بانکوں کا وجود تھا وہاں کی تاریخ پر عبور رکھنے والے جانتے ہیں ۔

فتّو چوٹّا

اس زمانے کا مشہور ڈاکو تھا جو سنا ہے کہ فقط کفار اور مشرکین میں چوریاں کرتا تھا اس کی تدبیر سے انگریز حیران رہ جاتے تھے ۔ حکام کو چیلنج دے کر وقت مقرر کر کے میم صاحب کا سایہ بنگلے سے لے گیا اور مسلح پہرہ دار کچھ نہ کر سکے ۔ یہ پیسہ اور دولت یتیموں بیواؤں کا پیٹ بھرنے میں صرف کرتا تھا کنیا کی شادی اس کی توجہ سے ہوتی تھی اپاہج پرورش پاتے تھے جس سے جو وعدہ کیا وہ ضرور پورا ہوتا تھا آئندہ صفحات میں اس کا تفصیلی ذکر آئے گا ۔

جناب مرزا محسن صاحب خاتم ہمعصر انیس
وفات ۲۷ ربیع الاول سنہ ۱۳۴۳ھ

(مصنف مجالس علویہ)
استاد مولوی میر سید علی صاحب سید المحدثین
وفات سنہ ۱۳۰۸ھ

پہلا باب

کمپنی باغ سے اکبری دروازہ تک

اس ہیڈنگ میں ہم کو EASTINDIAN COMPANY کے نام پر پہلی بنیاد کمپنی باغ سے اکبری گیٹ اور درمیانی محلوں کے حالات لکھنا ہیں اور جو محلہ درج نہ ہو تو سمجھنا چاہئے کہ اس جگہ کی تاریخ میں کوئی حیثیت نہیں ہے نئے آباد شدہ مقامات یا عمارات کا بجز اشارہ کے شرح وبسط کے ساتھ کوئی ذکر نہ ہوگا۔

کمپنی باغ

ایسٹ انڈین کمپنی سنہ ۱۶۰۰ء میں قائم ہوئی کرنیل سیکن اس کے آخری چیرمین تھے غدر کے بعد انگریزوں کا اقتدار بڑھنے پر کمپنی کو ختم کر دیا گیا اس کا ٹریڈ مارک یہ تھا اور جو سکہ کمپنی مذکور کا ہندوستان میں چل رہا تھا اس کی صورت یہ تھی کہ بیچ میں یہی مارکہ اور دونوں طرف دو پیروں سے کھڑے ہوئے شیر ببر ان کے ہاتھوں میں جھنڈیاں اوپر کے حصہ میں ایک بہت چھوٹا شیر وہ بھی بر پرچم بکف نیچے دو پٹریوں میں باریک قلم سے کچھ لکھا ہوا۔ اوپر سن عیسوی۔ پیسے کی تصویر ملاحظہ ہو۔ یہ پیسہ وزن میں ساڑھے چھ ماشہ تانبے کا تھا ۱۲۳۶ھ کے بعد پیسہ کے دوسرے رخ پرسے ترازو ہٹا دی گئی پہلا رخ بدستور رہا اور آخر تک جو پیسہ جاری رہا اس پر ایک خوبصورت بیل تھی۔ برطانیہ عظمیٰ کا لقب حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے اپنے مارکہ میں ذرا سی تبدیلی کی اور اوپر کے چھوٹے شیر کی جگہ کوہ نور والا تاج اور داہنے پہلو میں جو شیر تھا اس کو ایک ایسے گھوڑے سے بدل دیا جس کے سر پر ایک شاخ۔ سرکاری کاغذات اور دربار کے ٹکٹ میں یہی نشان آخر تک بنتا رہا لیکن وہ میز جس کے سہارے شیر کھڑے ہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کا مارکہ ہے۔

اس باغ کا قوم پرور انگریزوں نے دعصہ فتہ کی یاد میں کمپنی باغ ہی نام رکھا اور ہزاروں گھروں کو کھدوا کر ہندوستانی اور ولایتی درخت اور طرح طرح کے پودے لگائے اور ساری زمین پر سبزے کا فرش بچھایا عہد شاہی کے بوڑھے جن کی نگاہوں کے سامنے یہاں کی اگلی گنجان بستی تھی۔ بتاتے تھے کہ یہاں کی گلیاں اس قدر تنگ تھیں کہ کہار پالکی موڑ نہ سکتے تھے اور پیدل چلنے والوں کے سوا سواری کا گذر نہ تھا۔

کمپنی باغ کی حدود کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ شاہ جی کی ڈیوڑھی سے گذرتے ہوئے امام باڑہ حسین آباد کی برجیوں کے سامنے سے گھوم کر رومی دروازے کی طرف چلو اور اس گیٹ کو داہنے ہاتھ کی طرف چھوڑ کر گول دروازہ تک جتنی

له پایونیر تواریخ ہند

زمین تمہارے دورہ میں پڑے وہ کمپنی باغ ہے اس باغ کے ایک حصہ میں انگریزوں کی کچھ قبریں بھی ہیں جو غدر میں کام آئے ہوں گے کھن کھن جی کی نئی کوٹھی کے سامنے باغ کا وہ حصہ ہے جو وکٹوریہ پارک کہا جاتا ہے یہاں ملکہ وکٹوریہ کا کالا اسٹیچو پتھر کا نصب تھا جس کو جمہوری حکومت نے ہٹا دیا ہے۔ کمپنی باغ میں دو سڑکیں ایک بلند اور دوسری پست اوّل و آخر میں تھیں اونچی سڑک سرخی کی تھی۔ فوارہ اب تک ہے جس کے سامنے بنچ پر لوگ بیٹھ کر تفریح کرتے ہیں۔ باغ کے مصارف حسین آباد ٹرسٹ ادا کرتا ہے ان دلفریب مناظر اور مغربی سینریوں کو دیکھ کر بھی پبلک خوش نہ تھی بے خوشبو کے ولایتی پھول اور بے پھل کے وہ بیکار درخت نگاہوں میں بھوت پریت معلوم ہوتے تھے اور آزادی کے حامی اگر مہر سکوت توڑتے تھے تو جلے ہوئے دل سے آواز آتی تھی ؎

تخانۂ اودھ میں زنانہ ہے کب تلک؛ کیوں اے فلک یہ دل کا جلانا ہے کب تلک؛

اس دورِ کمپنی میں زنانہ ہے کب تلک؛ یہ تیر کب تلک ہے نشانہ ہے کب تلک؛

یہ پورا مسدس کتنے لوگوں کو زبانی یاد تھا آزاد خیال شاعر کسی اور موقع پر اپنی حق گوئی کے سلسلے میں قانونی شکنجے میں آ رہا تھا۔ عزت بچانے کے لئے دیس چھوڑ دیا اور گومتی کا ڈوبا ہوا بھاگارتی میں نکلا۔

قلعہ مٹیا برج میں اگر کوئی مجرم بادشاہ کے زیر سایہ پناہ لے تو کلکتہ کے انگریز چشم پوشی کرتے تھے تاریخ اور ادب تو اس مفقود الخبر مسافر کا پتہ چلانے سے خاموش ہے مگر عبدالحلیم شرر نے احسان کیا جو بتایا کہ اس آزاد منش کی موت کلکتہ میں واقع ہوئی اور گارڈن ریچ ہی کے ایک مکان میں وہ[1] دفن ہوئے مرنے والے شاعر کی روح سے جواباً گزارش ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۸۵۶ء کے بعد[2] ختم ہوگئی اور ملکہ وکٹوریہ بھی ۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء کو آنجہانی ہوگئیں رہے نام اللہ کا۔ آپ سمجھے یہ شاعر کون تھا؟ میاں مشیر لکھنوی

کمپنی باغ میں پورے سو برس تک بھی نباتات کی عملداری رہنے نہیں پائی تھی کہ حدود ۱۹۳۵ء میں وکٹوریہ اسٹریٹ کا 1935 پرانا بزازہ اٹھ کر یہاں لایا گیا اور میڈیکل کالج کی سڑک کے سامنے کمپنی باغ کے ایک حصے کو شامل کرکے نئی بلڈنگیں بننا شروع ہوئیں اور چوک کا شمار یہاں سے ہونے لگا پھر تقسیم ہند ہوئی اور کمپنی باغ کے دوسرے حصے میں جو حسین آباد سے نزدیک تھا۔ ہجرت کرنے والوں کے کوارٹر بنے اور کچھ کم سو برس کے بعد پھر ویران زمین پر انسانوں کی بستی دکھائی دی اور اب رفیوجی کالونی کی سہولت کے لئے پرائمری اسکول، بن چکی، بازار، دوکانیں، پانی کے نل، بجلی کی روشنی نیا محلہ سا نظر آرہا ہے یہ وہی زمین ہے جس پر سبزہ مدتوں تنہائی میں کروٹیں لیتا رہا۔

۱۹۵۵ء میں اس کتاب کی تالیف اور ترتیب کے وقت سو سال کے بعد گول دروازہ سے امام باڑہ حسین آباد جانے والی سڑک کو جمہوری حکومت نے نیپیئر اسٹریٹ تک زیادہ سے زیادہ چوڑا کر دیا اور گومتی جانے والوں کو سہولت اور سنڈیلہ، کاکوری، ملیح آباد کی راہ کو استادہ سینہ کر دیا کہ لکھنؤ میں اس سے چوڑی سڑک اب دوسری نہیں ہے دنیا اسی الٹ پھیر کا نام ہے ۱۹۲۲ء سے کمپنی باغ میں کانگریس کی تحریک آزادی پر جلسے ہوئے۔ گول دروازے کے سامنے سے گرفتاریاں ہوئیں۔ امین الدولہ پارک بن جانے سے پہلے سیاسی اجتماعات اسی سرزمین پر ہوتے تھے اور جب مولانا سبط حسن

---

[1] جانِ عالم صفحہ ۵ مطبوعہ ادارہ فروغ ادب لاہور طبع اوّل ۱۹۵۱ء

[2] پایونیر تواریخ ہند صفحہ ۵۳۳

صاحب نے انتقال کیا تو ان کی لاش کے ساتھ اتنے لوگ تھے کہ کہیں نماز جنازہ نہیں ہو سکتی تھی کمپنی باغ میں نماز ہوئی۔ ۵؍ دسمبر ۱۹۳۶ء کو وکٹوریہ پارک میں مختلف صنعتوں کی نمائش ہوئی۔

مسجد و امام باڑہ نواب حسن رضا خاں

نواب کا سرفراز الدولہ خطاب تھا۔ عہد آصفی میں نیابت کے معزز عہدے پر فائز تھے اور بڑی ایمانداری سے فرائض منصبی انجام دئے وہ بہت موٹے تازے اور دوہرے بدن کے تھے اور پیشی میں نواب کی نظر سے کاغذات گزارنے میں اتنی دیر تک کھڑے رہنے میں اپنا بوجھ آپ سنبھال نہ سکتے تھے پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے ۱۲۱۶ھ میں پیام موت آیا مرقومہ بالا امام باڑہ اور مسجد جس کی ایک اینٹ بھی اب باقی نہیں، ان کی یادگار تھا۔ لسان الہند مرزا محمد ہادی عزیزؔ المتوفی ۱۹۳۵ء اپنے حسب ذیل الفاظ میں اس عمارت کا پتہ دیتے ہیں اور آخری تاجدار اودھ کے عالم معتمد مفتی میر عباس صاحب کا روزمرہ ان کی لائف میں لکھتے ہیں۔

نماز شب[1] کے بعد چند کش حقہ پیتے تھے اتنے میں حسین علی جمعدار ملازم فانوس جلا کر تیار کرتا تھا اور آپ خراماں خراماں باچشم گریاں نواب سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں کی مسجد کی طرف کوچہ سلطان العلماء سے ہوتے ہوئے داخل مسجد متبرکہ ہو کر صحن امام باڑہ مقدسہ میں ٹہلا کرتے تھے اور آنکھوں سے آنسو مسلسل جاری رہتے تھے کبھی کبھی اکثر احباب یا اہل محلہ جو خالص الولا تھے ہمراہ ہوتے تھے۔ اس طرف جناب سید العلماء فینس میں سوار ہو کر ادھر ادھر دو مشعلچی اپنے مکان سے مسجد میں نماز جماعت کے لئے تشریف لاتے تھے۔ یہ مسجد اب وکٹوریہ پارک میں مشتمل ہو گئی ہے کھجور کا درخت اس کی شہادت کے لئے باقی ہے کبھی وہ پہلے تشریف لاتے یہ صحن میں چہل قدمی کر کے ان کا انتظار کرتے۔ اچھی طرح تاروں کی چھاؤں اور آثار شب نمایاں رہتے ہی طلوع صبح کاذب اور صبح صادق کی دید اور اس مسئلہ کی استاد شاگرد میں گفت و شنید و بحث شدید رہا کرتی تھی شاہی توپ خانہ سے صبح کاذب کی توپ بہت ہی سویرے چلتی تھی اور چھاؤنی کی توپ طلوع صبح صادق بلکہ طلوع آفتاب پر سر ہوتی تھی لیکن حضرت سید العلماء نماز صبح اول طلوع فجر بغیر انتظار ان علامات کے ادا کر چکتے تھے اور بعد اوراد و وظائف سائلین و محتاجین کا اجرا کر کے بفراغت تمام مسجد سے دولت سرا تشریف لاتے تھے۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب تک گھڑیوں کا عام رواج نہیں ہوا تھا اور اوقات نماز کا فیصلہ علامات سے ہوتا تھا۔

اس امام باڑہ کی عہد شاہی ۱۲۵۵ھ میں مرمت ہوئی تھی جو اس قطعہ تاریخ سے واضح ہے۔

امام باڑہ پاک حسنؔ رضا خاں را ۔۔۔ درست از سر نو کرد شاہ عدل را
عمارتش بخدا گشت بہتر از اول ۔۔۔ دروغ را نبود در کلام حق مدخل
خدا بایں کرم و لطف و ساماں دارد ۔۔۔ بحکم شہ ز سر نو شد ایں بنا ر لطیف
صحیح و سالم و سرور در جہاں دارد ۔۔۔ رضاؔ بگفت برائے سنین جار لطیف

عہد شاہی کے ترسٹھ امام باڑوں کی جو فہرست قومی جریدہ[2] میں چھپی ہے اس میں اس امام باڑہ کا نام نہیں ہے پہلی نماز جماعت مذہب امامیہ کی اسی مسجد میں باقتدار سید دلدار علی مجتہد (غفران مآب) ہوئی۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں جب بڑے امام باڑہ

---

[1] تجلیات معروف بتاریخ عباس باب دوم ص۲۰ یہ کتاب ان ہستیوں کی لفظ بلفظ سنی ہوئی ہے جو شاہ اودھ کی محبت سے کلکتہ میں سرفراز ہوئے [2] اخبار سرفراز مورخہ یکم محرم ۱۳۵۶ھ لکھنؤ

کو قلعہ بنایا اور چاروں طرف پانچ سو گز تک سارے مکانات کھود دیے گئے۔ اس وقت یہ مسجد و امام باڑہ بھی شہید ہوا۔ کھجور کا درخت آج سے پہلے میں نے خود دیکھا اور ۱۳۶۵ھ میں گول دروازہ کا نیا بزازہ تعمیر ہونے کے سلسلے میں کاٹ دیا گیا۔

محلہ چکلہ

یہ محلہ گول دروازے سے قریب تھا ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی زنان بازاری اور پیشہ ور عورتوں کے پڑاؤ کو چکلہ کہتے ہیں اس محلے سے کچھ بڑھ کر نصیر الدین حیدر کی ملکہ پھول محل کی دولت سرا تھی یہ خاتون رام دیال چودھری کی بہن تھیں۔ اس گھرانے میں عہد آصفی کے راجہ مہرا کی دولت چھ سات لاکھ روپے آ گئی تھی کاروبار چمکا اور خوش جمال بہن ملکۂ اودھ ہوئیں خود راجہ کا خطاب پایا۔ وزارت کی آرزو بھی دل میں تھی جو پوری نہیں ہوئی پھر بھی روز وزیروں کی طرح دربار لگتا تھا جوڑی والی گلی میں ان کی محلسرا اب تک ہے جو ۱۹۵۲ء کی بارش میں گر گئی۔ جوڑی والی گلی کے آگے ایک محلہ فرش راجہ رام دیال کے نام سے اب بھی ہے رام دیال کے باپ بینی رام نواز گنج کے رہنے والے تھے چکلہ کا صرف نام رہ گیا ہے۔

ڈیوڑھی محسن الدولہ

شہر کے بہت بڑے رئیس تھے ان کے بیٹے کا مشہور نام مرزا عالی قدر اور خطاب افسر الدولہ سرفراز علی خاں افراسیاب جنگ تھا۔ چوک کی کوتوالی انھیں کی محلسرا کے ایک حصے پر بنائی گئی ہے اور ایک قطعہ مکان پولیس اسٹیشن سے متصل اب بھی باقی ہے جو داروغہ سید محمد صاحب کے قبضے میں تھا یہ سب سے بڑا مکان ہے اس میں پرنالے تک آہنی نہیں ہیں اور کانپ چونے مصالحے بنائے گئے ہیں۔ لق و دق صحن، لانبے دالان امام باڑہ نما صحنچیاں، اونچا پھاٹک وسیع ڈیوڑھی، کشادہ زینے۔ جھٹ پٹے وقت نواب صاحب محلسرا سے برآمد ہوتے تھے اور پالکی نالکی جھالردار، بوچہ، ہوادار فینس، ہاتھی۔ ران سواری کا گھوڑا جتنی سواریاں تھیں وہ تیار رہتی تھیں جس پر جی چاہتا سوار ہوتے اور ہوا خوری کو نکلتے سوار ہوتے وقت محتاجوں کو زیادہ سے زیادہ روپیہ پیسہ دیا جاتا یہ امرائے لکھنؤ کی وہ رسم تھی جو کسی حالت میں بند نہیں ہوتی تھی۔ یہ جائداد آخر میں "پھلکی قدر" کی ملکیت عدالت سے قرار پائی تھی اس نام کی وجہ یہ ہے کہ وزارت علی قدر میں ایک لڑکا یتیم ہونے سے اپنی وراثت ثابت نہ کر سکا۔ ماں نے بسر اوقات کے لئے پکوان پکا کر بیٹے کو دیا اور وہ خوانچہ والوں کی طرح پھلکیاں، سہال، شاخیں بیچ کر پیٹ پاتا رہا چونکہ خاندانی تھا ظریف مزاج لوگوں نے "پھلکی قدر" نام رکھ دیا یہاں تک کہ سید صاحب موصوف نے اس کی طرف سے مقدمہ لڑ کر حق دلوا دیا اب وہ لڑکا صاحب جائداد ہو گیا۔ پبلک کی دوسری ستم ظریفی یہ ہوئی کہ سید صاحب کو داروغہ سید محمد کہنا شروع کیا جس پر وہ بہت بگڑتے تھے پرانے اخلاق کا اعلیٰ نمونہ لکھنؤ کی زندہ تاریخ اور رؤسا و امراء کے حسب نسب پر اچھی طرح واقف تھے۔ رستوگی ٹولہ کے اہل ہنود میں وہ اس قدر ہر دلعزیز تھے کہ شادی بیاہ کے موقع پر دلہن کی مانگ میں سیندور وہی بھرتے اور ان کی ضیافت کا مکمل سامان مسلمان باورچی کی زیر نگرانی تیار ہوتا جس میں کئی طرح کے کباب ہوتے۔ محسن الدولہ کے یہاں ۱۴ ہاتھی تھے۔ اور علی قدر کے زمانے تک ۵ ہاتھی باقی تھے دو فیلخانوں کے آثار اب تک موجود ہیں گول دروازہ کے سامنے نواب محسن الدولہ کی کوٹھی کے بعض حصوں میں شیر اور ریچھ کٹہروں میں بند تھے جن کو دیکھنے کے لئے خلائق کا ہجوم ہوتا تھا نواب عالی قدر کے وقت تک یہ جانور رہے۔

گول دروازہ

چوک میں پہونچنے کا بڑا پھاٹک جو سادگی وضع میں کوئی خاص بات نہیں رکھتا جس پر ناظرین کو توجہ دلائی جائے۔ مگر شہرت میں اس قدر زبان زد کہ بچہ بوڑھا، مرد، عورت تمام راہگیر واقف ہیں۔ یہ عہد آصفی کی بنیاد ہے اور جمہوری حکومت نے کمپنی باغ سے آنے والوں کے لئے سامنے کی زمین کو دائرہ بنا کر ایسا نظر افروز بنا دیا ہے جو گول دروازہ کے لئے ہونا بھی چاہئے تھا۔

باہر کے رخ پر عہد شاہی سے FRUIT پھلوں کی بکری ہوتی ہے جو میوہ کہیں نہ ملے وہ اب بھی گول دروازہ میں مل جاتا ہے۔ یہاں کے کبڑیے دولت مند اور بات کے پابند، منہ مانگے دام لینے کے عادی ہیں۔ رنگترا، نارنج، لیموں، نارنگی، کولہ، چکوترا، تربوز، پیٹھہ، آملہ، شفتالو، چکیا آڑو، انار بہدانہ، قندھاری سیب، بہی، ترنج، ناشپاتی، پٹاری کے انگور، سنگھاڑے، ببیتہ، پھیالہ، پھوٹ، اناس، گوندنی، کیلا، پیوندی، بیر، کسیرو، ککڑی، کمرکھ، شکرقند، شریفہ، کٹھل، بڑھل، بکھریا خربوزے، آم، املی، جامن، پھلیندے، امرود، شہتوت، لکھوٹ، فالسہ، کھرنی، کروندے، لیچو، بیل، کیتھہ، رس بھری، کنول گٹہ، بھٹے، آلوچہ، رطب، زمین قند، پن کھجور، گنڈیریاں، پونڈے، امرس، اسٹابری جو چاہے فصل پر خرید یاد رہے کہ موسم پھلی اور مسمبی، ناگرا تیزی نئی پیداوار ہیں ترکاری کی دوکانیں بھی ہیں۔ سونے کے زیورات، چاندی کے برتن، گنگا جمنی چیزیں، جڑاؤ سامان۔ لچکا، چنکی بڑے بڑے مہاجن بیچتے ہیں اور گول دروازہ کے پہلوؤں میں بڑی بڑی دوکانیں ہیں چوک میں گول دروازہ کی مرکزیت اس لئے بھی ہے کہ جو جلوس بازار سے نکلتا ہے اس پھاٹک سے گذر کر جو برات چوک میں آتی ہے وہ گول دروازہ سے ہوکر سوراج حاصل کرنے کے تمام ایجی ٹیشن اور دور کانگریس کی گرفتاریاں گول دروازہ کے سامنے ہوئیں۔

تاریخی مناظر :۔ حالات اودھ کے سچے ترجمان خواجہ عبدالرؤف عشرت نے تیس برس پہلے جو حالات اخبارات اور ادبی جرائد میں طبع کئے اور مقبول ہوئے۔ اب وہ ملاحظہ ہوں۔

نواب آصف الدولہ گول دروازہ کی چھت پر تکل اڑا رہے تھے جب دل بہلا چکے تو دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت چیرالاکہ کی ہری تسبیح لئے ہوئے دکھا رہی ہے حاجتمند سمجھ کر اس کو اپنے سامنے بلایا۔

نواب :۔ یہ کیا ہے؟

بوڑھیا :۔ قربان جاؤں تسبیح ہے۔

نواب :۔ کیا قیمت لوگی؟

بوڑھیا :۔ قیمت کیا لاکھ کی تو ہی یوں ہی حاضر ہے۔

نواب :۔ لاکھ تو بہت ہوئے واجبی کہو اچھا تم کو دس ہزار روپے دئے جائیں گے۔

بوڑھیا دس ہزار کی لفظ سن کر مارے خوشی کے آنسو بھر لائی دل میں کہنے لگی کیسا بھولا نواب ہے۔ ٹکے کی چیز کے دس ہزار روپے دیتا ہے۔ شاید ہنسی سے نہ کہا ہو سوچکر بولی۔

بوڑھیا :۔ حضور تسبیح حاضر ہے میں ایک بے حقیقت چیز کی قیمت کیا کہوں لاکھ کی تو بتائی ہے۔

نواب :۔ لاکھ تو بہت ہوئے اچھا پندرہ ہزار لے لو اس سے زیادہ نہیں ملیں گے۔

بوڑھیا نے مارے شرم کے سر جھکا لیا اور کہا خدا ایسے نواب کو رہتی دنیا تک قائم رکھے پندرہ ہزار روپیہ اس کے ساتھ کر دیا گیا۔ لاکھوں دعائیں دیتی ہوئی چلی۔ عشرت کہتے ہیں کہ یہ عطا اس لئے نہ تھی کہ دولت لٹا رہے تھے یا نا سمجھ تھے لکھنؤ کو آباد کرنا تھا رعایا کو مرفہ الحال بنانا تھا اگر وہ فاقہ کرتی تو کسی دوسری طرف نکل جاتی۔ اس کا پھل یہ ملا کہ وہ خوش ہوئی۔ اس کا گھر بھرا۔ اس کے رشتہ ناتے کے لوگ سن سن کر چل پڑے (لکھنؤ بسنا شروع ہوا) اس روپیہ سے سچ پوچھو تو ملک کا کتنا فائدہ ہوا۔ کسی جزیرہ کو جرائم پیشہ لوگوں سے آباد کرنا اور حبس دوام عبور دریائے شور والی آبادی اور بستی اور ہے اور شوق کمال رکھنے والی پبلک اور ہے۔

ایک اور دن کا واقعہ ہے کہ بغلی صحنچیوں میں گول دروازہ کی نواب جلوہ افروز تھے عورت ردّی کاغذ لئے ہوئے گذری پنساری کی دوکان کی طرف جا رہی تھی اس خیال میں کہ دو چار پیسے کو بک جائے گی آپ کی نظر پڑ گئی ایک ہزار روپیہ دے کر خرید لی اور بڑی بی سے اس شفقت سے گفتگو کی کہ وہ سمجھی بھی نہیں کہ یہ رقم زیادہ ہے قیمت سے۔ فرمایا لو ہم دیکھیں شاید اس میں ہمارے کام کا کوئی کاغذ نکل آئے۔ توا دکھانے کا واقعہ بھی چوک ہی کا ہے جو اشرفیوں سے بھر دیا تھا اور ظاہر نظر میں جو فعل سفیہانہ تھا اس کو یہ کہہ کر سنبھال دیا کہ یہ مجھے پارس سمجھتی ہے جو لوہا دکھانے سے سونا ہو جاتا ہے۔

گھڑیالی

گھڑیالی گول دروازہ سے نکل کر بائیں ہاتھ پر ایک محلہ ہے گھڑیالی اور جوہری محلہ پاس پاس ہیں چوک کی حد ملی ہونے سے اس پر اسی جگہ سے روشنی ڈالی جاتی ہے گھڑیالی اس مقام کو کہتے ہیں جہاں گھنٹہ بجتا ہو اور لوگوں کو گھر بیٹھے وقت معلوم ہو جائے۔ کسی شاعر کا شعر ہے ؎

صدا ہے گھڑیال کی یہ ٹھن ٹھن   گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں کچھ ہے

چار بجے، آٹھ بجے اور بارہ بجے گجر بجتا ہے موگری سے دوگنی ضرب اور دوہری آواز۔ جب بارہ بجیں تو ۲۴ دفعہ صدا آئے۔ فرق صرف اس قدر کہ پہلے بارہ ٹھہر ٹھہر کر اور دوسرے بارہ جلدی جلدی یہ شعر شاہد ہے ؎

آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے وہ مرے پہلو سے   دل پہ گھونسا سا شبِ وصل گجر نے مارا

اس محلہ میں شرف الدولہ غلام رضا خاں کا ایک امام باڑہ تھا اور ۸ محرم کو حضرت عباسؑ کی حاضری بڑی دھوم سے ہوتی تھی انگریزوں کی عملداری میں شرف الدولہ نے اس امام باڑہ میں افسران فوج اور اعلیٰ عہدیداران نظامت کی پر تکلف دعوت کی تھی۔ یہ امام باڑہ بھی باقی نہیں ہے۔

مچھلی والی بارہ دری

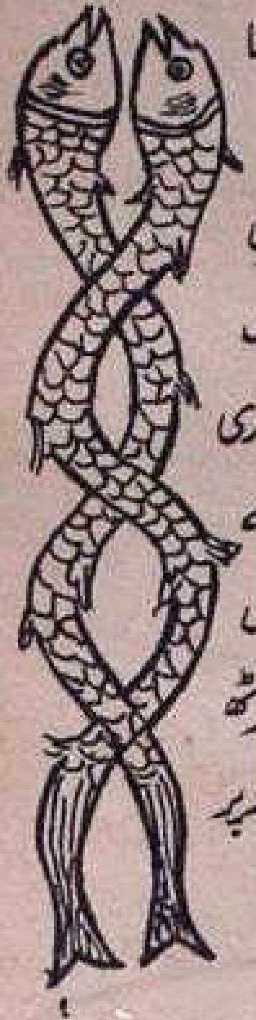

لکھنؤ کی تہذیب میں مسافر کے ساتھ مچھلی ہونا یا دروازہ پر مچھلی کی تصویر یا گھر سے نکلتے وقت دہی مچھلی کہنا نیک شگون سمجھا جاتا ہے اور سلطنت اودھ میں مچھلی کا خصوصی تذکرہ آئندہ صفحات میں اپنے محل پر آئے گا یہ بارہ دری سلطان عالم محمد واجد علی شاہ مرحوم نے گول دروازہ سے گذر کر بنوائی اور کھمبوں پر سرتا سر دوہری مچھلیاں تھیں اس لئے مچھلی والی بارہ دری مشہور ہوئی۔ انگریزی دور ہونے پر چوک کا پولیس اسٹیشن اب عمارت میں مدت تک رہا اور پولیس کا تھانہ ہونے سے نام میں وہ دہشت اور ڈر سما گیا تھا کہ جس کو کہا مچھلی والی بارہ دری لے جاؤ وہ دہل گیا اور کوتوالی نظروں میں پھرنے لگی۔ کوتوالی کی موجودہ عمارت تیار ہونے پر تھانہ چوک کے اندر سے باہر آگیا اور عمارت مذکور گرتی پڑتی نئی تعمیر کے بعد بھولا ناتھ کی دھرم شالہ کی صورت میں تبدیل ہوگئی ہے اس عمارت کے نیچے اور دوسرے رخ پر سامنے دورویہ سونے چاندی کے زیورات، چکن کے کرتے، دوپلّی ٹوپیاں، میرٹھ کی گول ٹوپی، امروہہ کی کشتی نما ٹوپی، ترکش کیپ، چکن کی ٹوپیاں، مری پھندے کے پلنے بیلدار تھوک مال کے طور پر بکتے تھے دھرم سالہ کی موجودہ عمارت میں قدیم نمونے کی ایک ستون پر مچھلی اب بھی موجود ہے۔

کوچہ آفرین علی خاں

میاں آفرین علی آصف الدولہ کے غلام تھے اور نمایاں ترقی کر کے صاحب اثر ہوگئے تھے میر خدا بخش جن کی تالکٹورہ میں کربلا ہے آپ ہی کے نائب تھے آپ نے چوک میں ایک محلہ آباد کیا تھا جواب باگر ٹولہ کہا جاتا ہے۔

کٹاری ٹولہ

یہ محلہ بھی اس بستی میں ہے جو گول دروازہ سے نکل کر چوک کی سڑک پر داہنے اور بائیں بدلاپنج کی طرح واقع ہیں یہ عہد اکبر کا آباد محلہ ہے یہاں اونچے اونچے انگنائی دار مکانات گنجان گلیاں اور پرانے مندر ہیں اور اس قدر محفوظ آبادی ہے کہ گلی شروع ہوتے پر دروازہ اور ختم ہونے پر دوسرا پھاٹک، رہنے والے قلعہ بند یہاں راجپوت آباد ہوئے نام میں رہنے والوں کے جنگجو ہونے کی جھلک ہے کٹاری پرانے زمانے کا ایک خنجر تھا۔ آتش کہتے ہیں ؎

اس زمانے میں یہ سپاہی نہیں بیگاری ہیں　　نہ تو تلوار سجی ہے نہ کٹاری تیار

میر انیس تلوار کی تعریف میں فرماتے ہیں ؎

دوزخ کی زبانوں سے بھی آنچ اس کی بڑی تھی　　برچھی تھی سروہی تھی کٹاری تھی چھری تھی[1]

بہرائچ کا کٹاری گھاٹ انھیں لوگوں کی تیر تھ ہے بعض پرانے اہل محلہ کہتے ہیں کہ کٹاری ٹولہ بختیار خلجی کے وقت سے آباد اور پرانا محلہ ہے

چوڑی والی گلی

گول دروازہ کے قریب ہے اور یہاں بھینسوں والی گلی میں شیر والی نیم کے قریب ایک امام باڑہ کا بھی قدیم یادداشتوں میں پتہ

---

[1] مرثیہ میر انیس جلد ۵ ص ۲۲۵ طبع نولکشور جس کا مطلع یہ ہے ع اے خضر بیان سخن راہبری کر

سوندھی ٹولہ

عہد اکبر کی پرانی آبادی اور مضافات چوک میں غیر مسلم بستی یہاں دوار کا دھیش کا ٹھاکر دوارہ ہے جو ۱۲۹۲ھ کی بنیاد ہے اور مسمی گنو مل نے اپنی عورت سہانی بی بی اور اس کے سگے بھائی جوگی مل کے بزرگوں کے پیسے سے ۱۸۷۵ء میں بنوایا گنو مل غدر کے ۲۳ برس بعد ۱۸۸۰ء میں مرگئے بہنوئی کے مرنے کے بعد ۲۵ برس بعد ٹرسٹیوں کی عدالت سے تبدیلی[1] ہوئی یہ ٹھاکر دوارہ اب بھی موجود ہے تحسین علی اسی محلہ کے رہنے والے تھے وہ مکان جو اپنے بھائی چتر امل کو سہ منزلہ بنوا دیا تھا اب تک موجود ہے۔

ہرن کی سرار

چوک میں مسافروں کے ٹھہرنے کی جو جگہیں تھیں ان میں یہ محلہ بھی اب تک موجود ہے ہرن کو عربی میں ظبی انگریزی میں DEER ہندی میں ہرگ کہتے ہیں یہ نام کیوں رکھا گیا جنگل کو کاٹ کر لینے والے اگر ایسے ناموں پر شہرت پائیں تو کچھ تعجب نہیں ہے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ تاریخ اودھ میں اسی سرار کا ایک مقام پر ذکر ہے غلام علی مورخ نے وزیر علی خاں کی معزولی میں جو رائیں نذر قرطاس کی ہیں۔ وہاں لکھا ہے۔ جمعے[2] روایت کنند کہ شبے در سرا ہرن والی کہ سرائیست مشہور در لکھنؤ گذرانیدہ۔

زیورات

گول دروازہ کے حصے میں سونے چاندی کے زیورات بنے بنائے اور فرمائش پر گاہک کے کہنے سے مطابق ان خصوصیات کے ساتھ ہوتے تھے جو لکھنؤ کا حصہ تھا اس سلسلہ میں ممتاز علی لطیفی کی دوکان قابل ذکر ہے وہ دراز قد و چہرہ رامپوری اونچی ٹوپی پہنے ہوئے مہندی سے رنگین مدور داڑھی آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا شان سے بیٹھے ہوئے موٹے حرفوں کا قرآن شریف پڑھ رہے ہیں بڑے تجربہ کار پہلی نگاہ میں جواہر کو پرکھ لینے والے، دلال کی گھاتوں سے واقف، کاریگروں کے نشیب و فراز سے باخبر، ان کی دوکان پر بالیاں، بندے، جھمکے، پچلڑی، ست لڑی، دھکدکی، جگنو، کرن پھول، چمپا کلی، چندن ہار، موتی مالا، موہن مالا، نو رتن، نونگے، جوشن، شیر دہان کے کڑے، ببزے، پتہ، ست لڑی پری بند، پہونچی، گھنگھرو، ہیکل، جھالے، بدھی، چھپکا پری، چھپک، ناک کی کیل، پیروں کے چھلے، چھڑے، پازیب، جھانجھ، مٹھے، ٹیکہ، سرگان، جوشن، چوہے دتی، جہانگیری، چندن ہار، گلوبند، بالے، زنجیر، گلے کے طوق، کنگن، آرسی، لونگ، ہیکل بازو بند، شوق بند، بہترین مال تھا اگر ان زیورات کی تشریح کی جاتی ہے تو بہت طول ہو جائے گا ناظرین کو لونگ کی لفظ بہت اجنبی معلوم ہوتی ہوگی اگر اس کو پہچاننا ہے تو انشا کا یہ شعر پڑھئے ؎

میں نے دیکھی اس کے کان میں لونگ کیوں نہ خوش آئے مجھ کو پان میں لونگ

غدر ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں میاں مشیر کہتے ہیں ؎

مٹی کے مول موتیوں کے جوڑے بکے گر بیس کے بنے تھے تو دس کے چھڑے بکے
ایسی کڑی اٹھائی کہ آخر کڑے بکے چھوٹے عدد جو آج بکے کل بڑے بکے
گردن میں ڈھولنا ہو تو قرآن کی قسم انگشتری بھی ہو تو سلیمان کی قسم

---

[1] ماخوذ ہو ودھ اینڈ آگرہ رپورٹ جلدہ ۵ منفصلہ ۱۶ مارچ ۱۹۱۵ء صفحہ ۲۳۳۔ اپیلانٹ ہرگوبند داس رسپانڈنٹ مسٹر گوکرن ناتھ مصرا

[2] عماد السعادت صفحہ ۱۷۱

کچھ زیور نئی دلہن سے خاص ہیں اور کچھ فقط بچے کو پہنائے جاتے ہیں میر عشق[1] کے چار مصرعے ملاحظہ ہوں ؎

طوقِ اجل کی شکل تھیں منت کی ہنسلیاں   معصوم کا کفن ہے یہ کرتے سے ہے عیاں
ہیکل کی تھی صدا کہ الجھتا ہے دم یہاں   گھنگرو تھے پاؤں کے سرِ میدانِ امتحاں

نتھ دلہن کے لئے اسباب شادی میں بہت ضروری زیور ہے اس کو سہاگ کی نشانی کہتے ہیں اور یہی زیور طوائف کی نوچی کے ناک میں ہو تو اس کو نتھنی کہیں گے جو اس کی آوارہ زندگی شروع ہونے پر اترتی ہے ناسخ مرحوم نے غالباً کسی کی ہجو میں کہا ہے ؎

ناک رگڑے ہر گھڑی کیونکر نہ اس کے سامنے   بد ز نتھنی کے سلیمان کی ہے خاتم ناک میں

بلاق قدیم زیور ہے جو عورتیں ناک میں پہنتی ہیں کسی شاعر کے کلام میں ہے ؎

اجی یہ عرشِ معلیٰ کا گوشوارہ   گھر کہاں سے تمہارے بلاق میں آیا

(نوٹ) اجی بہت کم زبانوں پر آتا ہے قلق نے انتیوں کا تعارف کیا ہے ؎

کان میں دو دو انتیاں سادی   جو کریں دل کی مفت بربادی

انتیوں میں دو دو موتی اور بیچ میں سبزہ یا قوت کا ہوتا ہے اگر کان کی لو میں پہنے تو انتیاں اور اوپر پہنے تو بالیاں کہیں گے۔

میر اولاد حسین دفتری :۔ جلد سازی کا فن شہر میں اس بلند درجے پر پہونچا تھا کہ چمڑے کی جلد میں ایرانی وضع کے گل بوٹے اور کہیں خوشنما گلدستہ چاروں طرف بیل پشتہ پر پھول۔ صحافت کو اعلیٰ درجہ ملا تھا مکتبۂ ممتاز العلماء لکھنؤ میں حدیقۂ سلطانیہ کی ایک جلد ہے جس پر سنہری کام اول سے آخر تک ہے جو آج بے نظیر ہے ان کمالات کی آخری فرد میر اولاد حسین رہ گئے ہیں۔ جو انیسویں صدی شروع ہوتے ہی دنیا سے گئے۔ دفتری کے کام پر آئندہ بحث ہوگی۔

انگوٹھی والے

میر عابد حسین عاشق حسین دو سگے بھائی مگر صورتیں ایک دوسرے سے جداگانہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ دو بھائی ہیں۔ ایک کی دوکان کپتان کے کنوئیں سے مسجد حیدر بخش کی طرف جاتے ہوئے داہنے ہاتھ پر۔ دونوں سبزی منڈی میں رہتے تھے اور روٹی سالن کی مجلس ان کی اس وقت شہرۂ آفاق تھی دوسرے بھائی مسجد تحسین کے پھاٹک میں گداز بدن گورے چٹے کم سخن موٹے تال کی عینک لگاتے تھے۔ ملک میں انگشتری سازی کا فن انھیں دونوں بھائیوں کی وجہ سے پھیلا اور سب کا سلسلہ ان دو تک پہونچتا ہے۔ پہلے عابد حسین دنیا سے گئے پھر عاشق حسین نے سفر آخرت کیا ان دوکانوں پر عقیق سرخ و زرد و سفید نارنجی، تیلیہ آسمانی، در نجف، جزع، شجری، بلال، حدید چینی، بلور دھان فرنگ، فیروزہ، گلینہ بھونگا، فیروزہ، یاقوت، نیلم، پکھراج، کانسلہ، ترشادہ، جمنیا، تابڑا، زبرجد ملتا تھا کندہ نگینہ اور فرمائش پر اپنے نام سے مناسب الفاظ نگینہ یا پتھر پر بنائے جا سکتے تھے اور یہ فن عروج پر تھا سواری کی انگوٹھی عاشق حسین سے بہتر کوئی نہیں بنا سکتا تھا۔

شعراء کے دل و دماغ میں بھی یہ جواہر ہیں ؎

انگشتری کا حلقہ ہے وہ نافِ حلقہ دار   خالِ سیاہ اس میں نگینِ حدید ہے   آتش

---

[1] گلزار غم جلد ۲ ص ۸۹

اور دوسرا شعر ہے ؎

اک بوٹے سے قد کا ہے زبس نقش جو بیٹھا — دل رنگ دکھاتا ہے عقیق شجری کا — آتش

چندو مل کاغذی

مسجد تحسین کے دوکانداروں میں ۱۳۱۳ھ کا زمانہ ہے اور بانس کا کاغذ بھی بکتا ہے جو اسقاط حمل کے موقع پر حاملہ کو دیا جاتا تھا ادھر ایک سفید کاغذ اردلی کے نام سے بکتا تھا انگریزوں کے دور میں سب سے پہلے ہاتھی مارکہ کاغذ رائج ہوا۔ فلسکیپ سائز باریک اور رف کاغذ کا ایسا ہوا، عہد شاہی میں کاغذ بنانا بھی گھریلو صنعت تھا اور بازار میں بھی یہ کاغذ آجاتا تھا۔ مخطوطات میں اس کے نمونے اب بھی ملتے ہیں۔ کاغذ سازی پہ جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں کاغذ کے مختلف رنگ ہیں۔ جن میں رنگ عروسک، رنگ پیازی، رنگ نخودی، رنگ عنابی، رنگ سبز و زرد، رنگ چنپئی، زعفرانی، حنائی، بستان، افروزی، بنفشی، طاؤسی رنگ برگ نے رنگ گلگوں رنگ لیموئی، نارنجی، بازنجانی، پستئی، طوطئی، عودی، لاجوردی، فیروزئی، گلناری، سب چھبیس قسمیں قرار دی تھیں جس میں دو رنگ کا کاغذ بھی شامل تھا آدھا سفید آدھا سرخ اور زرد و سرخ بھی تھا۔ خوشنویسی[1] کی کتابوں میں اس کی ترکیبیں موجود ہیں۔ کاغذ پر چمک پیدا کرنے کے لئے بڑی کوڑی سے جہرا کیا جاتا تھا اس زمانے کا کاغذ آج کے کاغذ سے یقیناً پائدار اور اچھا ہوتا تھا

پارچہ والی گلی :- چوک میں گول دروازہ سے گذرتے ہوئے بائیں ہاتھ پر جو موڑ ہے اس کو پارچہ والی گلی اس لئے کہتے ہیں کہ ٹوپیوں کے بے سلے پلّے، کڑھی ہوئی ٹوپیاں، کڑھے ہوئے کرتے، چکن کے پارچے فروخت ہوتے ہیں۔ یہی گلی فرنگی محل کو جاتی ہے اور دو تین پرانی مسجدیں اس کوچہ میں بھی ہیں جن کے بارے میں کوئی شہرت نہیں عہد شاہی میں یہاں تمباکو کشیدنی دو سیر ملتا تھا اخبار مراۃ الہند میں سوال ہے کہ —— پارچہ[2] والی گلی کا دو سیرا تمباکو کسی نے اور کہیں پیا ہے؟ اگر یورپ کے شاہزادہ ایک دفعہ بھی اس کو پی لیں تو پھر "ہوانا سگار" اور منلا چرٹ کا مزہ بالکل دل سے بھول جائیں۔ اطلس پر اوتو کی صرف یہی ایک دوکان تھی اوتو ریشمی کپڑے پر ٹھپہ سے لکیروں کے نشان بنانے کو کہتے ہیں جیسے کاغذ پر مسطر یا رول کیپ پیپر۔ حضرت ناسخ کے شاگرد میر علی اوسط رشک کسی کی ہجو میں کہتے ہیں

مار کر تلوار اپنے تیرہ بخت — زار پر — پھبتی کہتے ہیں سیہ اطلس پہ اوتو ہو گیا

لباطیوں کی مسجد

شاہی دارالشفا سے قریب مسلمانوں کی چھوٹی بڑی دو مسجدیں ہیں جس میں فریقین نماز پڑھتے ہیں نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں کون پرانی ہے۔ قدیم زمانے کے آثار تو رہے نہیں اگلی نیو پر دونوں کی جدید عمارت ہے اور تاریخ میں اس کا ذکر ابھرے ہوئے الفاظ میں ہے منشی رام سہائے کہتے ہیں۔

جس وقت محمود غزنوی نے قصد ہندوستان کیا اور پہلی مرتبہ ۳۹۶ھ میں نگرکوٹ کو فتح کیا اور دوسری مرتبہ ۴۰۲ھ میں تھانیسر کو گھیر کر اہل ہند کو برباد کیا اور مدت سوم جنگ معبد اہل ہند کو مقام غزنین میں لے گیا۔ ایک درویش مسمی شاہ قیام الدین کہ ہمراہ لشکر تھا جدا ہو کر اس سرزمین لکھنؤ میں پہونچا اور لباطیوں کی مسجد کے قریب زیر درخت برگد قیام پذیر ہوا۔ مسمی لکھنا قوم اہیر

---

[1] اندر نگ چمن مؤلفہ منشی ربی پرشاد طبع چہارم نولکشور سنہ ۱۹۳۱ء

[2] مراۃ الہند لکھنؤ بابت جنوری ۱۸۸۳ء ص ۳ بحوالہ نیا دور بابت دسمبر ۱۹۵۹ء

ساکن موضع متصل کاکوری جو کہ اسی سرزمین میں ہے اپنے مویشی چراتا تھا ایک روز ایک گاؤمیش اس کی گم ہوئی۔ اہیر مذکور نے ہر چہار طرف جستجو کی لیکن پتہ نہ پایا از روئے اعتقاد شاہ صاحب کی خدمت میں پہونچا۔ شاہ صاحب نے مراقبہ سے سر اٹھایا۔ اہیر نے اپنی حاجت کو بیان کیا۔ درویش نے بزبان فارسی اس اہیر بے تمیز کو مطمئن کر کے ہٹا دیا۔ اہیر نے آگے بڑھ کر گاؤمیش گمشدہ کو پانی سے بھیگی ہوئی پایا اس دن سے اہیر مذکور ہر روز شیر تازہ شاہ صاحب کے پاس لانے لگا اور خدمت بنیت دل سے کرنے لگا۔ اہیر مذکور بہ برکت خدمت درویش اہل کمال سے روز بروز دولت وکثرت اولاد سے بہرہ ور ہونے لگا اور پس از حصول حکم حاکم ایک گاؤں اسی مقام پر آباد کیا جس کا نام درویش صاحب نے بمناسبت نام لکھنا اہیر کے لکھنور رکھ دیا جبکہ فقیر صاحب نے قالب عنصری چھوڑا قبران کی نیچے اسی درخت کے تیار ہو کر زیارت گاہ ہوئی۔ عہد غازی الدین حیدر بادشاہ خلد مکان میں مسمی میر نظیر علی نے قبر کو کھدوا کر خاک میں ملا دیا۔

بساطیوں کی دوسری مسجد جو فرقہ امامیہ کے قبضہ میں ہے یہ بھی چوک کے شاہی شفاخانہ سے پہلے کی تعمیر ہے۔ بانی کا نام شہرت نہیں پاسکا دارالشفا کی دیوار اسی مسجد کے پہلے سے موجود ہونے کی وجہ سے کج واقع ہے اس وقت دونوں مسجدیں چوک کے دوکانداروں کی توجہ سے نئی بن کر اگلے آثار کو یاد دلا رہی ہیں۔

دونوں مسجدوں کے نیچے سرمہ، مسّی، جستہ کی سلائی، کاٹھ کی سرمہ دانی، مسواک، کنگھیاں اور پیتل کے تار، کچا سوت شیشے کی تسبیحیں ہمیشہ سے بکتی ہیں۔ دوکانات بساطخانہ طول وعرض میں بڑھی نہیں ہیں اور ان کو بساط خانہ پرانے زمانے سے کہا جاتا ہے اور دوکاندار سب مسلمان ہیں۔

کپتان کا کنواں

تاریخ اودھ میں ظفرالدولہ کپتان فتح علی کا نام محتاج تعارف نہیں ہے خزانہ شاہی کی نگرانی اور اہتمام ان کے کنبہ میں تھا مسجد، تالاب، مقبرہ لکھنؤ میں ان کے آثار قدیمہ ہیں کنواں سب سے مشہور ہے اور جس سے کپتان کا کنواں کہو وہ چوک میں دارالشفا شاہی کے سامنے پہونچ کر رک جائے گا۔ اس حصہ بازار کی دو منزلہ دوکانیں گول دروازہ کے جدید گذرگاہ کی طرح گول ہیں اور جائداد رہن اور بیع ہوتے ہوتے اس وقت حاجی کلو منہار کی ملکیت ہے دوکانوں میں سادہ کار، انگوٹھی والے، زیور بنانے کے کاریگر، نگینہ پر جلا اور نگینہ کو تراشنا اور ظروف برنجی ومسی میں مناسب مرمت اسی جگہ ہوتی ہے ساٹھ برس پہلے یہاں کندہ کرنے والے کاریگر بھی کام کرتے تھے جن کے نسخ ونستعلیق کے نمونے چاندی کے تعویذ، عقیق اور درنجف یا فیروزہ پر اب بھی نظر باز کو دستیاب ہو جاتے ہیں یہ فن ۱۳۱۲ھ تک زندہ تھا اور مہر کن اس وقت یہاں اپنے حسن خط اور طغرا نویسی کے جوہر دکھلاتے تھے۔ عقیق یمنی کے ایک پر آیۃ الکرسی شریف، بازو بند پر سورۂ توحید یا دیگر مناسب آیات قرآن جیسا یہ طبقہ کندہ کر گیا وہ اب مفقود ہے سفید عقیق پر حروف نورانی یا مقطعات قرآن اگر دستیاب ہوتے ہیں تو یہ اسی سلف صالحین کی یادگار ہے ان کے حسن خط سے اگر کوئی تحریر نوک پلک سے اچھی ہوتی تو اس کو خط ولایت کہتے یعنی ایران وعراق وحجاز کا کندہ ہے لکھنؤ کے خطاط کمال میں عرب وعجم کا مقابلہ کرتے تھے اب ان دوکانات میں کوئی مہر کن نہیں ہے اور عصر حاضر میں دستاویزات، عہد نامہ جات، رسیدوں، قبالوں پر سے مہر کا

---

۵ احسن التواریخ ص۳۳

رواج ختم ہو کر دستخط کافی سمجھی جاتی ہے خطابی مہریں جو عطیہ شاہ ہوا کرتی تھیں سب اسی زمین کا کرشمۂ صنعت ہے۔

کندہ کرنے والے کو حکاک کہتے ہیں آتش کہتے ہیں ؎

دل صد پارہ کے ہر پارہ پر نقش محبت ہے ۔۔۔ کہاں ہو سکتے ہیں ایسے نگین حکاک سے پیدا

۱۸۷۷ء میں جب لکھنؤ کی چیف کمشنری توڑی گئی اور اخبارات میں یہ سوال اٹھا کر یوپی کا دارالحکومت الہ آباد قرار پائے۔ اس وقت اخبارات نے لکھنؤ کی برتری پر نوٹ لکھے اس میں استفسار[1] لب و لہجہ میں پوچھا ہے۔ کپتان کے کنوئیں کی برفی کے مقابل میں ہندوستان بھر میں کہیں ایسی برفی نصیب ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہاں برفی کی نمایاں دکان بھی تھی جس کے اخبارات[2] میں آج تک تذکرے موجود ہیں۔

کنواں :۔ اوسط درجے کا ہے چاروں طرف موٹی لوہے کی سلاخوں کا کٹہرا اور پورب کی طرف مزید چند آہنی ستون ہیں جو پانی بھرنے کی قدیم مشین کا باقی ماندہ جز ہیں اندرونی حصہ میں جگت سے تہ آب تک لوہے کے ٹکڑے پاؤں رکھ کر چڑھنے اور اترنے کے لئے اور اسی کے پہلو میں جو لوہا سرتا سر لگا ہے وہ بظاہر آب کشی کے آلات کا بچا ہوا سامان ہے کنوئیں میں نیچے سے اوپر تک پتھر کی چٹائیں دیواروں میں آویزاں ہیں اور ابتدائی دور (کلائی) میں جو پتھر ہیں ان پر جلی خط میں اشعار کندہ ہیں اور مصرعوں کی ترتیب اس طرح ہے جیسے اپنی بیاض پر کاتب اشعار لکھتا ہے رنگ نہ ہونے سے شعر پڑھنے میں مدد نہیں ملتی۔ درمیانی چوکھٹے میں جلی قلم سے لکھا ہے ۷۸۶ چاہ ظفرالدولہ ۱۲۴۹ھ ایک عبارت اوپر کی منڈیر سے قریب ہے۔ جو صاف پڑھی جاتی ہے۔ کوٹھی سنگین دفرو رفتن پنجاہ ذرعہ منشعب آہنی درتہ زمین کہ ہمگی از سطح زمین ہشاد و پنج درجہ کردید آب ۔۔۔ اشعار بظاہر "صاحب رائے" شاعر کے نتیجہ فکر ہیں اور سطح آب پر کوڑا کرکٹ پڑا ہونے کے باوجود اہل محلہ کہتے ہیں کہ پانی بہت گہرا ہے۔

کنوئیں کی منڈیر سے پچھم کی طرف ایک بیٹھا ہوا ہاتھی ہے جو بھاری لوہے کا ہے اور اس کے مستک پر سوراخ ہے جس سے پانی کسی وقت میں مشین نکالتی تھی۔ اس ہاتھی کے سامنے انگریزوں کے ابتدائی دور حکومت کا بمبا لگا ہے جس سے لوگ پانی بھرتے ہیں کنواں انقلاب سے پہلے قابل دید ہوگا اور پانی نکالنے کی ہندوستانی مشین، افسوس ہے کہ باقی نہیں ہے حیات مرزا سادہ کار یہاں کے مشہور اور نظر باز سادہ کار تھے۔

دارالشفا شاہی

نصیرالدین حیدر بادشاہ نے طب یونانی سے ہر مذہب و ملت کے مریضوں کو فائدہ پہونچانے کے لئے عارضی طور پر حضرت گنج میں کونسل چیمبر کے سامنے دارالشفا قائم کی تھی اب تک وہ محلہ دارالشفا کہا جاتا ہے چونکہ مرکزیت چوک کو حاصل تھی اس لئے اسپتال اٹھ کر چوک آیا اور ۱۲۴۷ھ میں شاہ موصوف اور محمد علی شاہ بادشاہ کے تین لاکھ روپے سرمائے سے خدمت خلق شروع ہوئی ہر سال لاکھوں مریض اچھے ہوتے ہیں پہلے یہاں مریضوں کو ٹھہرایا بھی جاتا تھا شفاخانہ کے پہلے ملازم حکیم مرزا علی اکبر فرزند حاجی عوغائی تھے اور انگریزی دور حکومت کے آخری حکیم خان بہادر مرزا نظیر حسن خاں مرحوم رئیس محلہ کٹرہ ابو تراب خاں

---

[1] مرآۃ الہند جنوری ۱۸۷۷ء
[2] نیا دور دسمبر ۱۹۵۹ء

تھے جو پہلی دسمبر ۱۹۲۹ء کو رحلت کر گئے ان کے آخری زمانہ اور ان کے بعد تک دارالشفا کسی دن بند نہ ہوتا تھا اور دو مشہور حکیم ہر دن مطب کرتے تھے۔ دارالشفا کے قبضے میں دو کانات طویل مدت سے نہیں ہیں اور نزول کی عملداری ہے جس سے واقف کو صدمہ پہونچتا ہے۔

سوانح لکھنؤ میں مسجد دارالشفا کا ذکر اس طرح ہے ——— نجابت حسین خاں عظیم آبادی نے یہاں سے ۲۰ صفر ۱۲۵۹ھ کو بعد ظہر شیخ خدا بخش کے تعزیہ کی زیارت کی تھی۔

یہ تعزیہ عہد امجد علی شاہ میں بڑی شان سے نکلتا تھا شیخ خدا بخش شاہی آتشباز تھے اور بعضوں نے کہا ہے کہ ان کا اصلی نام خدایار خاں تھا نجابت حسین اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مسجد دارالشفا کے نزدیک پہونچکر اس کی چھت کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ اس اثنا میں تعزیہ کا جلوس قریب آگیا سب سے پہلے سات سانڈنیاں نمودار ہوئیں جن پر سیاہ جھول پڑی ہوئی تھی ان پر جو لوگ سوار تھے وہ بھی سیاہ کپڑوں میں ملبوس تھے سانڈنیوں کے پیچھے سترہ ہاتھی تھے۔ سیاہ بانات کی جھول تھی ہاتھیوں پر سر بفلک علم و پرچم تھے جن پر سرخ و سیاہ اطلس کے خوبصورت غلاف تھے ان غلافوں پر طلائی و نقرئی حروف میں اللہ اور پنجتن کے اسمار گرامی منقش تھے۔ ہاتھیوں کے بعد عہدہ داروں کی آمد ہوئی ان لوگوں کے ہاتھوں میں چاندی سونے اور گنگا جمنی برچھیاں، بلم اور عصا تھے۔ جن کی تعداد احاطہ و شمار سے باہر تھی ان کے پیچھے پیچھے پیادہ تھے جو شمشیر و سپر سے مسلح تھے جلوس کے اس حصّے کی لمبائی آدھ کوس سے زیادہ ہوگی اس کے بعد باجوں کے طائفہ آئے۔ روشن چوکی جھانجھ تریہی دف اور نئے نئے قسم کے نقارے اور باجے جن سے واحسینا کی جگر گداز آواز نکل رہی تھی جس کو سن کر سنگدل سے سنگدل انسان بھی مثل موم کے پگھل جاتا تھا یہاں تک کہ شہنائی کی آواز سے بھی جو بہت ہی مکروہ ہوتی ہے طبیعت میں افسردگی پیدا ہوتی تھی جلوس کے ساتھ آبدار خانے بھی تخت پر رواں تھے۔ تخت پر برف لگے ہوئے قند کے شربت سبوچوں اور کوزوں میں رکھے تھے اور جلوس کو پلاتے جاتے تھے جو لوگ زیارت کے لئے راستے کے دونوں طرف کوٹھوں پر مجتمع ہیں ان تک بھی شربت کے پیالے لمبے لمبے بانسوں میں باندھ کر پہونچائے جاتے تھے آبدار خانوں کے بعد نقرئی اور طلائی مرصع کار پنجہ اور علم نمودار ہوئے اور ان کے پیچھے دو تین دلدل اور تابوت تھے جن میں تیر چبھے ہوئے تھے دلدل کی چادریں سرخ شہابی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ علم کے پیچھے اور خدایار خاں کے تعزیہ کے آگے غربا کے سیکڑوں تعزیہ تھے اور ان سب کے ارد گرد بے شمار و بے حساب آدمی تھے۔ سر و پا برہنہ، اشک ریزاں، آنکھیں جوش گریہ سے سرخ، سینہ زنی کی کثرت سے رشک گلنار یہ لوگ تعزیہ کے آگے رقت انگیز اور حزن آمیز لہجوں میں مرثیے اور نوحے پڑھتے جاتے تھے چند قدم چل کر رک جاتے اور حلقہ باندھ کر شیون و ماتم کرنے لگتے۔ ماتم کرنے والوں کے بھی کئی کئی حلقے تھے کوئی حلقہ تو اہل شہر کا تھا اور کوئی حلقہ حبشیوں کا، کسی حلقے میں ولایتی مغل تھے۔ ان سب حلقوں میں اس دردناک آواز میں ماتم ہوتا تھا کہ عزاداروں کے دل سیخ غم پر کباب ہو جاتے تھے اگر شمر بھی اس ماتم کو دیکھتا تو شہیدان معصوم کے غم میں آنسو بہانے لگتا۔

عزاداروں کی کثرت تخمینہ و اندازہ سے زیادہ تھی سامان جلوس میں بعض امور خلاف شرع بھی تھے لیکن چونکہ ان تمام تکلفات کا مقصد گریہ ہے لہذا قبیح نہیں ہے جلوس کو دیکھنے کے لئے ہزاروں آدمی اکٹھا ہو گئے تھے۔ امیروں، وزیروں، نوابوں اور شاہزادوں کی سواریاں کثرت سے موجود تھیں ہجوم کی وجہ سے راستہ چلنا دشوار تھا خاں صاحب بمشکل تمام جلوس سے نکل کر بعد از غروب آفتاب

صحیح وسلامت گھر واپس آئے اور سجدہ شکر بجا لائے کیونکہ انھیں خوف تھا کہ ہجوم و ریلہ کی وجہ سے ان کا دم گھٹ جائے گا۔ یہ بخشو کے کھڑیہ کا منظر ہے جو میرے علم میں ۱۲ر صفر کو اٹھتا تھا ۲۰ر صفر مجھے تسلیم نہیں۔

چوک

چوک گول دروازہ سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے اور جو عنوانات اب تک سپرد قلم ہوئے ہیں وہ چوک کے ابتدائی محلہ ہیں بازار کی اہمیت کے لحاظ سے خصوصی زاویہ نگاہ سے روشنی ڈالی جاتی ہے اور خاص مقامات چوک کو ہم علیحدہ علیحدہ بیان کرینگے ہندوستان کے اکثر شہروں میں آباد ترین حصہ کو جس میں دلچسپیوں کے تمام سامان پائے جائیں چوک کہتے ہیں دہلی میں چاندنی چوک مشہور مقام ہے لکھنؤ مشرقی تہذیب کا گہوارہ تھا وہاں خصوصیات دہلی کے نمونہ ہونا لازم و ملزوم تھا۔ بازار کو وہ حیثیت حاصل ہوئی کہ چوک کے بانکے، چوک کے گنڈے، چوک کے دلاّل، چوک کے تماشائی، چوک کے پان والے تمام لفظیں معنی رکھتی ہیں۔ صرافے اور چاندی بازار میں دلاّلوں کی وہ بھیڑ کہ آنے والوں کی صورت یہ دیکھتے ہی تاڑ گئے اس کو فلاں شے کی ضرورت ہے گھیر لیا ایک اپنے سمجھے بوجھے دوکاندار کے پاس لے جانا چاہتا ہے دوسرا اپنی طرف کھینچتا ہے چاندی بازار میں اس مٹے حال پر اب تک طلاء و نقرہ کا یہ حال ہے کہ مہترانیوں کو صاف کرتے وقت نیچے کی مٹی تسلے میں رہنے دیتے ہیں اور اس کو صاف پانی سے دھو دھو کر چاندی جمع کرتے ہیں اور یہ چاندی نالی سے نکل کر پھر زینتِ گلو ہوتی تھی دلالوں کے محاورے ہماری اردو سے بالکل علیحدہ ہیں۔ وہ اشاروں اشاروں میں اپنی دستوری (کمیشن) مال دھنی سے طے کر لیتے ہیں ؎

چوک کا بازار تیرے دانتوں کا چوکا ۔۔۔ دلال زباں ہے جو ادھر بھی ہے اُدھر بھی

پان والے گلے میں تواڑ ڈالے ہوئے پیتل کی کھلی ہوئی پٹاریاں لئے ہوئے گلوریاں، بیڑے ادب سے پان کھانے والوں تک پہونچاتے ہیں اور ایک ایک پان پر انعام پاتے ہیں پان والوں کی دوکانیں الگ ہیں جن پر پان کے شوقینوں کا ٹھٹ لگا ہے۔ پیتل اور تانبے کی اچاری نما کتھے چونے کی کلھیاں، پستئی پان، خوشبو دار مصالحہ، تنبول اودھ، تنبول بہار، شیشیوں میں قوام اور زردہ پتی جو پسند آئے وہ حاضر ہے چاندی کے ورق کے پان علیحدہ بالائی کی گلوریاں گاہک کبھی یہ نہ کہے گا۔ پان لگا دو۔ ذم کا پہلو ہے ہمیشہ پان بنا دو کی آواز آئے گی اور اس سے زیادہ نفاست پسند لوگوں کا صرف دوکان کے سامنے آکر کھڑا ہو جانا کافی ہے مزاج داں دوکاندار عادت جانتا ہے۔ آئینے میں صورت دیکھتے دیکھتے پان تیار۔ حقہ والوں کی شان اور زیادہ نرالی ہے۔ سر پر صافہ یا ٹوپی، گلے میں نین سکھ کا دوپٹہ پشت پر جھولا۔ ہاتھ میں گڑگڑی گول دروازہ سے اکبری دروازہ تک گزرتے ہوئے جس نے دو کش پئے، کچھ پیسے اپنی شان کے مطابق دئے اور کبھی کبھی حقہ میں نگالی لگا کر کوٹھوں تک پہونچائیں اور دھواں آسمان کی خبر لے۔ بڑے حقہ کو اردو میں لگڑ بھی کہتے ہیں۔ آتش کا قول ہے ؎

سبک سمجھو نہ آہ عاشق شیدا کو بیدردو ۔۔۔ اگر کی بو دھواں دیتا ہے لگڑ کا

چوک میں سہ پہر سے گھوڑا گاڑی۔ یکہ چلنے کی روک تھام ہو جاتے اور راہگیروں کا وہ اژدہام کہ اگر اتفاقیہ کوئی فینس یا پالکی گذرے تو ہٹو بچو کہتے ہوئے کہاروں کا تھنوں میں دم ہو جائے اور کسی شریف کے دھکا لگ ہی جائے۔

چوک میں انسانی ضرورت کی تمام چیزیں فراہم ہو سکتی ہیں۔ آتش کہتے ہیں ؎

دل کو بغل میں مار کے لے تو چلے ہیں چوک — کہتی ہے کیا نگاہِ خریدار دیکھئے

لحاف کی فردیں اور سوانگ بننے کا سامان، مصنوعی داڑھی مونچھیں، لکڑی کے کھڑاویں اور صندوقچہ، قلمدان، زیورات گوندھنے والے، بٹوے، جو اس وقت ہیکل، نونگے، جوشن ریشمی اور سوتی ڈوروں میں تیار کردیں۔ صندوقچہ کا کاروبار بھی اب بند ہے مرقومہ بالا سوداگو لدروازہ کا ہے۔

(۱) ایک طوائف نے توبہ کی بڑھاپے میں خدایاد آیا نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ خمس کی فکر ہوئی ڈہر کی کربلا گئی گنبدِ مبارک نظر آیا۔ آپے سے باہر ہوگئی جو غزل زبان پر چڑھی ہوئی تھی شروع کی "اللہ بانڈے بھاگ جاگے پیا رانجھا آیا" کفش کنی میں پہونچتے پہونچتے یہی راگ الاپتی رہی۔ خادموں نے روکا واپس گئی رات کو بشارت ہوئی کلید بردار نے آنے دیا داخلے کا اذن پڑھا جاں بحق تسلیم ہوئی محبت کا آخری درجہ ہے دیوانگی یعنی عقل رخصت ہوجائے اور جب عقل پر بن جائے تو داد ہے نہ فریاد

(۲) میاں وحید الہ آبادی شاعری میں عاشق مزاج اور حسن پرست مشہور تھے الہ آباد سے لکھنؤ آئے شام کو چوک سے نکلے۔ گرمی کا زمانہ تھا مسرت آگیں فضا نے نظریں اٹھانے پر مجبور کیا بے ساختہ یہ تماشہ دیکھا کہ ایک مجسمۂ حسن خربوزے کی قاشیں چاقو سے تراشنے میں مصروف ہے۔ راستہ چلتے چلتے رک گئے اور بلند آواز سے یہ شعر پڑھا ؎

مصروف ہیں جو آپ بنانے میں قاش کے — رکھ لیجئے گا دل بھی ہمارا تراش کے[1]

دل سے نکلی ہوئی صدا بڑی عزت کے کانوں سے سنی گئی اور گذرگاہ کا ادبی جذبہ قدر افزا دماغ میں ساکن ہوگیا۔

(۳) لکھنؤ کے نامی چوروں میں محمدو گلباز تھا عہد واجدی میں اس کے دونوں رخساروں پر چوری کرنے کی سزا میں گل دئے گئے تھے اس وجہ سے گل باز کہتے تھے۔ ایک دن محمدو اپنے لڑکے کو گود میں لئے چوک سے گزر رہا تھا ایک مہاجن کی دوکان پر جڑاؤ پنکھا دیکھا لڑکا مچل گیا میں لوں گا۔ محمدو نے مہاجن سے کہا کہ بھائی پنکھا دیدو، بچہ رو رہا ہے[2] بہلا کر دیدوں گا۔ مہاجن نے انکار کیا محمدو یہ کہہ کر چلے کہ اچھا ہوشیاری سے رکھنا اس نے حفاظت کی مگر پنکھے غائب ہوگئے۔ چوری میں کامیابی کے بعد صبح کو محمدو حسب وعدہ پنکھا دے گئے مہاجن کو حیرت ہوگئی۔

(۴) پروفیسر مسعود حسن ادیب مشہور اہل قلم لکھتے ہیں کہ ایک طوائف کسی مشہور طبیب کے مطب میں گئی اور حکیم صاحب سے عرض کیا کئی دن سے مجھے وہ شکایت ہے کہ نماز نہیں پڑھ سکتی حکیم صاحب نے دافع ادرار نسخہ لکھ دیا اور ایام کی خرابی سمجھ گئے۔

(۵) حکیم سید علی آشفتہ اجمل خاں کے شاگرد تھے مطب سے اٹھ کر بالاخانہ جا رہے تھے ایک مسخرا ساتھ ہوگیا۔ طوائف کو وہی شکایت تھی جس کا اوپر ذکر ہوا مسخرہ نے راستے میں کہا کہ گمہ رکھوا دیجئے اچھی ہوجائے گی حکیم صاحب جو پہونچے تو اس کی حالت غیر تھی نسخہ تجویز کرنے کے ساتھ ہدایت کی کہ مسہری کے پائیں پائینچا نہ رہے دونوں پایہ گمہ پر رہیں اور سرہانہ پست رہے۔

(۶) آغا سرخوش مرحوم و مغفور ناقل تھے کہ چوک میں ایک طوائف کے حسن صورت و سیرت کا ہمہ گیر شہرہ تھا۔ شیریں زبانی اور حاضر جوابی میں اس کا جواب نہ تھا مذاق میں اس سے کوئی کامیاب نہ ہوتا۔ بڑے بڑے ادبا اس کی بزم سے شرمندہ ہوکر واپس ہوتے ایک نامور ادیب اور حسن پرست مقابلے کے لئے پہونچے اور نام پوچھا اس نے کہا اماں جان عموماً بازاری

---

[1] بزم خیال ص ۱۳۸ [2] قدیم ہنر ص ۲۱۷

عورتوں کا اسی طرح نام ہوتا ہے الہی جان، بسنتی جان، خورشید جان۔ اماں جان سننے پر اس نے بلا تکلف پوچھا اور آپ کا اسم گرامی کیا ہے۔ نواب نے برجستہ جو جواب دیا اس کو نہ پوچھیں مادر کی لفظ تو سنی اس کے بعد وہ قہقہہ ہوا کہ دور کے بیٹھنے والے بھی سمجھے یہ کہا۔ قلم صراحت کی جرأت نہیں کر سکتا۔

(نوٹ، ربیع الاول ۱۳۷۰ھ اس کتاب کے دوران تالیف میں حکومت کی طرف سے چوک سے طوائفیں ہٹائی گئیں۔

چوک کا سین نجابت حسین خاں کی زبانی عہد امجد علی شاہ کی چہل پہل

نجابت حسین خاں:۔ جن کا نام آپ سن چکے پٹنہ کے معزز رئیس تھے ۲۳ محرم ۱۲۵۹ھ مطابق ۲۴ فروری ۱۸۴۳ء خشکی کے راستہ گھوڑے پر عظیم آباد سے روانہ ہوئے اور ۱۸ صفر مطابق ۲۰ مارچ کو لکھنؤ پہونچے ان کے شہر میں ٹھہرنے اور لکھنؤ کی سیر کا مکمل بیان کچھ یہاں کچھ آیندہ صفحات میں اپنے مقام پر ٹکڑے کر کے آئے گا مناسب مقام ان کی سیاحت کا یہ جزو ہے جو سوانح لکھنؤ ایک قلمی روزنامچے کی شکل میں پٹنہ یونیورسٹی کے مخطوطات سے ماخوذ ہے بازار چوک کے حال میں دیکھ سکتے ہیں۔

دوکانوں سے بالائی طرف دونوں جانب پختہ عمارتیں ہیں جو بارہ دری آصف الدولہ کے نام سے مشہور ہیں اس کو پرانا چوک بھی کہتے ہیں یہاں ظہر کے وقت اکثر دست فروش مختلف رنگ کے نیچے چوگوشیہ بوٹے دار بیلدار چکن کی ٹوپیاں نفیس اور خوش قماش دریاں، شطرنجیاں اور کھیسیں، گلاب، موتیا، بیلہ، چمپا اور دوسرے پھولوں کے ہار ہاتھوں میں لئے دلکش آوازیں لگاتے ہیں ہار بیچنے والوں کی صدائیں کچھ اس طرح کی ہوتی ہیں۔ کیا معطر پھول ہیں، حسینوں محبوبوں کے گلوں کے ہار ہیں۔ جوہری بازار ایک دروازہ سے گذر کر پہونچا قدم رکھتے ہی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں بے اختیار زبان سے سبحان اللہ چہ شہر یست دلپذیر وچہ مقامیست بے مثل و بے نظیر جائیست دلفریب و مکانیست مطبوع منزہ از عیب بلند یست بس دلچسپ و خوش سواد دوکانہا بس مملو و آباد معمورہ ایست از اقسام و انواع چیزہا۔

دوکانوں کے بارے میں خاں صاحب لکھتے ہیں یہاں ہر جنس و قماش کی چیزیں موجود ہیں لکھنؤ کے کاریگر موجدانہ طبیعت رکھتے ہیں اور نئی نئی چیزیں ایجاد کرتے رہتے ہیں یا پرانی چیزوں کو نئی تراش خراش کے ذریعے دلکش بنا دیتے ہیں ان کی صنعت گری دیکھ کر صناعان چین کی عقل بھی دنگ ہے۔ بازار میں اہل حرفہ، بزازوں، صرافوں، جوہریوں، زردوزیوں کی دوکانیں ہیں بزازوں کی دوکانوں میں دیسی اور ولایتی کپڑے بھرے ہیں یہاں ململ، جامدانی، ڈوریا، چارخانہ، کامدانی انواع و اقسام کے پارچہ جات موجود ہیں ڈھاکہ سے آیا ہوا مال بھی بکتا ہے جالی لیٹ، کامدار، تین سکھ، کھمٹی سمٹی، انگریزی اور فرانسیسی کپڑوں میں سوتی اور ریشمی، چھینٹ، مشروع، دانہ دار گلبدن اور ساٹن بھی ہیں۔

بنارس کے دوپٹہ تمامی اور زری کے تھان بھی رکھے ہیں خاص لکھنؤ کے بنے ہوئے کپڑے ——— بیلدار اور گل کار زرتار و زرنگار وزنی کمخواب بھی فروخت ہوتے ہیں ان دوکانوں میں جو بزاز بیٹھے ہوئے ہیں ان کا لباس یہ ہے ——— سر پر دستار محمد شاہی بدن میں نیمہ و جامہ اور پاؤں میں اورنگ کا زیر جامہ، صرافوں کی دوکانوں میں ایک طرف پیسوں اور روپیہ کے ڈھیریاں اور دوسری طرف سیم و طلا کے ظروف کے انبار ہیں جوہریوں کی دوکانیں نقرئی ڈبیں مرصع کار زیورات سے آراستہ ہیں زردوزوں کی دوکانوں

---

[1] نیا دور لکھنؤ بابت مئی ۱۹۶۰ء ص ۱

میں تو ایک طرف ہر قسم کے گوٹے پٹھے اور بنت رکھے ہیں اور دوسری جانب زردوزی ٹوپیاں اور پاپوش سجی ہوئی ہیں خاص پز نان پز، کبابی، حلوائی، تمبولی اور نیچہ فروش کی دوکانوں سے وہی تکلف اور ہنر اور سلیقہ نمایاں ہے۔ گگڑ والوں اور بھنگ فروشوں کی دوکان پر تخت بچھا ہوا اس پر خوشنما رنگ کہاروے کا فرش اس فرش پر پچیس تیس قلیاں گگڑ اور اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ پیالیاں سجی ہوئیں ایک جوان شوخ و شنگ عورت خوش وضع پوشاک پہنے نہایت ناز و انداز سے بیٹھی ہے اور گگڑ اور بھنگ کے شائقین کو قلیاں اور تازہ بھنگ کی پیالیاں بڑے دلفریب ادا کے ساتھ پیش کرتی ہے جام پینے والے اس شعر کے مضمون کے مطابق ؎

دل مرا پی کے محبت کی شراب   نشہ میں بھنگ رہا کرتا ہے

مدہوش اور خود فراموش ہو جاتے ہیں اور حالت سرور و غایتِ بیخودی میں آتش کے دو شعر پڑھا کرتے ہیں ؎

عار سے عار ہے مجھ مجنوں کو   ننگ سے ننگ رہا کرتا ہے

گفتنی حال نہیں ہے اپنا   کچھ عجب ڈھنگ رہا کرتا ہے

دوکانوں کے آگے باتیں بولنے والے فقیر آزادان طریقت اور لطیفہ گو اشعار ظریفانہ گاتے اور صدا لگاتے پھرتے ہیں ؎

کہیں تو نقلیں کرتے ہیں کھڑے بھانڈ   کہیں آزاد پھرتے ہیں بنے سانڈ

کہیں قوال گاتے ہیں ترانے   کہیں لڑتے ہیں پھکڑ کچھ ننانے

فرنی اور فالودہ فروشوں کے یہاں بھی اسی قسم کا تکلف ہے کہاروا بچھے تخت پر کئی سینیاں لگی ہیں جن میں چینی کی تشتریوں میں فرنی رکھی ہے چینی اور تانبے کی چمچیاں بھی پاس ہی دھری ہیں فالودے کے پیالے ہیں جو عرق کیوڑہ، عرق گلاب سے بسے ہوئے خریداروں کے انتظار میں قرینے سے رکھے ہوئے ہیں۔ سبزی اور میوہ فروشوں کی دوکانوں میں شریفہ، شہتوت، شربتی، لیمو، کمرک، ناشپاتی اور دیگر پھلوں کے علاوہ مختلف قسم کی ہری ترکاریاں مثلاً کدو جسے لوکی کہتے ہیں کھنڈا جسے کدوئی شیریں بولتے ہیں شلجم، چولائی اور میتھی کا ساگ نظر فریب طریقے پر لگے ہوئے ہیں اکثر دوکانوں میں آبدار خانہ ہیں تاکہ جو لوگ گرمیٔ بازار سے تشنہ ہو جائیں وہ پانی پی کر سیراب ہوں۔ اس کے علاوہ بہت سے سقہ پُر آب مشکیزے اور کٹورے ہاتھوں میں لئے ہوئے صدائیں لگا رہے ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ تشنہ کام چند خرمہروں کے عوض ٹھنڈا پانی خریدیں اسی طرح جا بجا پنسلے بھی بٹھائے ہوئے ہیں اور کئی کئی ہندو ہاتھ میں ڈول اور کٹورے لئے ہوئے پیاسوں کو پانی پلانے کے لئے تیار ہیں راستوں میں شریفوں اور سفید پوش خریداروں کی آمد و شد سے بھیڑ لگی ہے ان میں سے اکثر چوگوشیاں ٹوپیاں، بدن میں چھ کلیوں والے انگرکھے کے مقابلے میں بالابر دار کلیدار پاجامے پہننے والے کم ملتے ہیں رؤسائے شہر کی سواری میں ہاتھی اور گھوڑے ہیں جو زین ساز و یراق سے آراستہ ہیں بعض رئیس اور امیر پالکی میں ہیں سوار جا رہے ہیں اور اس طرح اپنی حشمت و جاہ کو نمایاں کرتے ہیں ان کی سواری بڑے تجمل اور کر و فر سے جا رہی ہے شاہی کہار کارچوبی بانات وردیاں پہنے ہیں پالکی کے پہلو میں سوار پیادہ بھی ہیں جو زرق برق لباس پہنے ہیں عورتوں کی ڈولیاں بھی گذر رہی ہیں نازک اور خوش قطع ڈولیاں ہیں جن کے منقش پایہ نقرئی و چوبی ہیں پردے رنگین ایک رنگ کے ہیں جن کے کنارے پٹھے اور بنت ٹکے ہوئے ہیں ان ڈولیوں کے اندر خورشید رو حسین سواریاں اس طرح بیٹھی ہیں جیسے آفتاب ہالہ میں ہو ان ماہ رویوں کا ایک ہی جلوہ دیکھ کر انسان ہوش و حواس کھو دیتا ہے

ہوشِ من از سر برنگ بوزگل   از نگاہ ساقی سرشار رفت

بادشاہ کی سواری بہ امیر الدولہ کے دورِ اقتدار میں جب ایک فرقہ وارانہ فساد رونما ہوا اور میرن نامی ایک شخص نظر بند کئے گئے اور نواب علی نقی خاں کو خلعت وزارت عطا ہوا اسی زمانے میں سلطان عالم نے درگاہ حضرت عباسؑ جانے کا ارادہ کیا اور شرف الدولہ غلام رضا خاں کو چوک کی آراستگی کا حکم ملا۔ اس دن تمام دوکانیں بند تھیں اور حکم کے باوجود بازار نہ کھلا۔ غلام رضا خاں نے لاچار ہوکر بڑی بڑی کوٹھیوں اور سرکاری توشہ خانے سے زربفت مشجر کمخواب، اطلس، بانات کے تھانوں سے چوک کو جو تھی کی دولہن کی طرح سنوار دیا۔ آئینہ بندی نے آراستگی اور سجاوٹ کو اور بھی چار چاند لگا دئے۔ منشی رام سہائے تمنّا جنھوں نے یہ جلوس اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ تاریخ میں لکھتے ہیں کہ دو گھڑی دن چڑھے سلطان عالم ہودج مرصع و زریں پر بالائے پشت فیل جلوہ فرما ہوئے کوس دولت پیش سواری علم زر کار ڈھل کی کڑک قرنا کا شور اطراف کی آواز دور باش کی صدا غلغلہ انداز قصر مینا تھی سواران حلقہ زن پیادگان پیش رو شتر سواران و علمبرداران کا ہجوم ہر طرف تہنیت اور مبارکباد کی دھوم، جب سواری باد بہاری گلستان دو سرا سے روانہ ہوئی طشت جواہر نثار ہوئے سواری خراماں خراماں چوک پہنچی۔ تماشائیوں کا در دولت سے تا درگاہ انبوہ تھا فقرا و مساکین کو گھر آگئیں بنا یا روپیہ و اشرفی کی بوچھار تھی۔ اس کار گذاری کے صلہ میں سلطان عالم نے شرف الدولہ کو خلعت بے بہا و علاقہ حضور تحصیل عنایت کر دیا۔

حضرت محل کی آخری سواری

یا تو وہ تزک و احتشام تھا کہ سلطان عالم کی سواری کے وقت کوئی نظر بھر کے نہیں دیکھ سکتا تھا نقاروں کی صدا، تہنیت کی آوازیں، ہر طرف تماشائیوں کے ٹھٹ لگے رہتے تھے اور دوکانیں بند ہونے پر چوک میں وہ رونق تھی کہ چشم فلک نے ایسا منظر نہ دیکھا تھا یا ۱۶ مارچ ۱۸۵۸ء کا دن وہ روز شوم تھا کہ لکھنؤ لٹ چکا تھا اور قدم قدم پر خطرۂ جان خوبصورت عمارتوں کے شکستہ ڈھیر خلائق کے چہروں پر ہوائیاں اڑتی ہوئی در و دیوار پر اداسی چھائی ہوئی ملکہ اودھ اس بازار سے بے سرو سامانی کے عالم میں گذرتی ہیں نہ کوئی بچو بچو کہنے والا نہ نقیب زر و جواہر کے عوض سواری پر حسرت برس رہی ہے اور جان سے زیادہ عزت کا خطرہ ہے کوئی دیکھنے والا نہیں ہے کہ کون گذرتا ہے اور پالکی میں کون سا چاند چھپا ہوا ہے جو ابھی کمال کی صورت میں تھا کہ گہن لگا۔

ایک تابندہ ستارہ بھی اس برج غم میں ہے جس کی گیارہویں سالگرہ تو بڑی دھوم سے ہوئی تھی اور چاہنے والی ماں کو خبر نہ تھی کہ بارہویں سالگرہ نیپال کی گھاٹیوں میں پھونچکر دی جانے والی ہے۔ حضرت محل عورت زاد نے پھر بھی خاندانی وقار بچانے میں وہ بے پناہ کوشش کی وہ آج ان کی عقل اور دماغ اور محبت وطن کا سارا ملک قائل ہے۔

سلطنت جانے کے بعد جب عزت پر بن گئی تو اس شیر دل خاتون نے خودکشی کر کے اپنی جان نہیں دی اور حرام موت مرنا پسند نہ کیا۔ اور صبر و شکیب کے شیریں جام پی کر قیصر باغ کو بڑے اطمینان کے ساتھ چھوڑا صاحبات محل اور خادماؤں کے جھرمٹ میں قصر شاہی سے نکل کر گھسیاری منڈی کے پھاٹک سے نکلیں عورتوں کا غول صفیں باندھے ہوئے پیچھے پیچھے تھا برجیس قدر کو ایک سیدا ولاد رسولؐ کی گود میں دے کر ساتھ لیا وہ نونہال کندھے سے چمٹا ہوا رنج شک کے لئے غالیچہ اور چاندنی کی آڑ میں لے چلے جو شہزادی کبھی چند قدم نہ چلی تھی وہ گرتی پڑتی ٹھوکریں کھاتی ہر گام پر الجھتی ہوئی ٹیلہ شاہ پیر جلیل سے گذر کر مولوی گنج کے پل پر آئیں جواہر علی خاں نے اپنی مینس اور کہار بیشتر سے وہاں بھیج دئے تھے قریب زوال آفتاب جناب عالیہ اور برجیس قدر پالکی میں سوار ہوئے پھونچانے والی عورتوں نے اپنی اپنی راہ لی کچھ سوار

اور تلنگے اور شاگرد پیشہ ہر طرف سے جمع ہو کر ساتھ ہو گئے۔ یحییٰ گنج نخاس چوک ہو کر نال دروازہ میں ہو کر غلام رضا کے یہاں قیام کیا۔

اس سواری کے گذرنے میں وفادار رعایا کا کیا حال تھا پبلک کے جذبات کس حد تک ابھر آئے ہوں گے اس کا فیصلہ وہی کر سکتا ہے جس کو ذوق سلیم ہے۔

اس حلقہ کے مشہور لوگ

"محلہ چوک گھڑیالی و سڑک متصل آں" اس ہیڈنگ کے تحت میں طومار سے جو نام میں نقل کر سکا ہوں وہ یہ ہیں میر عسکری صاحب نواب آغا جان خاں صاحب، مرزا محمد تقی صاحب، مرزا زین العابدین صاحب، میاں علّن صاحب، میر انعام حسین صاحب، نواب صارم الدولہ[1] بہادر، داروغہ میر صادق صاحب، میر علی بہادر صاحب، میر مغل[2] صاحب، میر عباس حسین صاحب، ممّن خاں صاحب، حکیم مرزا محمد جعفر صاحب، حکیم میر علی ضامن صاحب، نواب محمد تقی خاں صاحب، میاں محبوب علی خاں صاحب، سید حسن صاحب طویل[3]، احمد علی جمعدار، احمد علی زید پوری۔

<u>پہلا چار خانہ اور دوکاندار کی ناکامی</u>:۔ عبد الحلیم شرر کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے عہد سے تیس پینتیس برس پہلے خاص چوک میں میر محمد حسین صاحب مرحوم ڈائرکٹر زراعت و تجارت نے گورنمنٹ کی اعانت سے ایک چار خانہ کھلوایا تھا جس میں فرنیچر بھی اچھا تھا اور سوا ناجائز چیزوں کے تمام قسم کے مشروبات رہتے تھے مگر کسی نے توجہ نہ کی اور آخر میر صاحب کو نقصان اٹھا کے بند کر دینا پڑا اور حیدرآباد دکھن[4] چلے گئے بازار میں چا پینا اور ہوٹل میں کھانا اس وقت بداخلاقی تھا۔

ٹکسال COINAGE

جہاں سکہ تیار کیا جائے اس کو عربی میں دار الضرب کہتے ہیں اس محلہ میں سکہ تیار ہوتا تھا روپیہ پیسہ اشرفی ڈھالنے میں خالص تانبہ، چاندی اور سونا صرف ہوتا تھا اور سکہ کی عبارت ایک فاضل مجمع مقرر کرتا تھا جس کا بادشاہ کی منظوری اور مجتہد العصر کی نظر ثانی کے بعد نفاذ ہوتا تھا۔ چنانچہ غازی الدین حیدر کے ایک سکہ پر یہ عبارت تھی:۔ "سکہ زد بر سیم و زر از فضل رب ذو المنن غازی الدین حیدر عالی نسب شاہ زمن"۔ ۱۸۵۷ء کے انقلابی دور میں آزادی کے حامی احمد اللہ شاہ تھے جو محمدی گاؤں میں فوج کی کمان کر رہے تھے انہوں نے بھی نیا سکہ جاری کیا تھا جس کی عبارت یہ تھی:۔ "سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ، حامی دین محمد احمد اللہ شاہ" جب صوبہ بھر کے لڑاک سمٹ سمٹ کر لکھنؤ پہونچ گئے تو ایک پردہ دار خاتون نواب شیدا بیگم کے کان تک بات پہونچی تو آپ نے بھی اپنے خطوط میں احمد شاہ کا ذکر کیا تھا ــــ سنا ہے کہ ایک صوفی احمد اللہ شاہ آئے ہوئے ہیں نواب چیلا ئن کے صاحبزادہ کہلاتے ہیں"

اس سے پہلے ہم لکھ چکے ہیں کہ ایسٹ انڈین کمپنی کے پیسہ میں دو شیروں کی تصویر تھی اور یہ پیسہ ملک میں ہر دلعزیز تھا۔ مسافروں کے امام ضامن میں عورتیں یہی پیسہ باندھ کر باندھتی تھیں۔ ہندوستان پر اقتدار حاصل ہونے کے بعد انگریزوں نے سکہ بدلا جس کو مسلمان انگریز کی تصویر سمجھ کر نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے اس روپیہ پر بے تاج اور کلاہ کا صرف ایک سر تھا اور شعرا کو کہنے کا موقع ملا "ع سر کٹ کے کمپنی کا بکا سولہ آنے کو"۔

<u>نیاز فتحپوری اپنے مقالہ لکھنؤ کی پھبتیاں مندرجہ اخبار جنگ کراچی میں لکھتے ہیں ایک بار نواب غازی الدین حیدر نے مشاعرہ کیا: جس</u>

---

[1] آخر میں شیر جنگ کے باغ میں رہتے تھے [2] سجاد حسین صاحب سوز خواں موصوف کے نواسے تھے [3] کوئی دراز قامت شخص ہوں گے۔
[4] گذشتہ لکھنؤ ص ۲۸۲

میں لکھنؤ کے تمام شعراء مدعو تھے ناسخ بھی آئے اور آتش بھی۔ جس وقت مرزا تقی علی خاں نے ناسخ کو دیکھا تو بے ساختہ کہا یہ دم کٹا بھینسا کہاں سے آگیا یہ پھبتی ایسی مشہور ہوئی کہ اس دن سے تمام لوگ ناسخ کو دم کٹا بھینسا کہنے لگے۔

ناسخ کا گھر:۔ ٹکسال کو شیخ امام بخش ناسخ کی سکونت کا بھی فخر حاصل ہے اس مجسمہ کمال کا محلہ میں رہنا، شاگردوں کا ہجوم اصلاح تاریخی حقائق ہیں اور شمس العلماء آزاد لکھتے ہیں "(ناسخ) لکھنؤ کے دارالخلافہ ہونے سے یہاں آئے اور وہیں عمر بسر کی ٹکسال اب تک محلہ مشہور ہے اس میں بیٹھ کر شعر کے چاندی سونے پر سکّہ لگاتے تھے[1]۔ نمونہ سخن ملاحظہ ہو ؎

دل لیتی ہے وہ زلف سیہ فام ہمارا بجھتا ہے چراغ آج سرِ شام ہمارا

معرفت الٰہی میں ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

آرام سے نہیں ہے جو پھیرے خدا سے منہ دیکھو ہے مرغ قبلہ نما اضطراب میں

ناسخ دنیا کو دکھ درد کا مرکز سمجھتے تھے فیروزہ کی انگوٹھی پر نام کندہ کرایا اور بدنصیبی سے وہ انگوٹھی کھو گئی اس وقت کہا ؎

ہم سا کوئی گمنام زمانے میں نہ ہوگا گم ہو وہ نگینہ جس پر کھدے نام ہمارا

۱۲۵۴ھ میں اردو ادب کا یہ سورج ٹکسال ہی میں ڈوب گیا اور جس مکان میں رہتے تھے وہیں سپرد خاک کردیئے گئے۔ اس وقت بیسک پرائمری اسکول جس مکان میں ہے اس سے ملے ہوئے مکان کی کوٹھری میں ان کی قبر ہے جو عام لوگ نہیں جانتے یہ مکان پچاس سال پہلے حکیم مرزا محمد باقر صاحب اور ان کے والد مرزا زین العابدین کی جا قیام اور امام باڑہ تھا حکیم صاحب ڈاکٹر عبدالرحیم کے دوست خاص تھے ٹکسال کے رہنے والوں میں شمس العلماء مولوی عبدالحمید صاحب ایک صلح پسند عالم تھے طالب علموں کو پڑھاتے تھے۔ ۱۹۲۵ء ان کا سن وصال ہے۔

بیچ کی سرار

بانس کی سرار اور رہرن کی سرار کے بیچ میں ہونے سے اس سرار کا یہ نام ہوا دوسرا نام میوہ والی سرار ہے۔ ۱۹۱۵ء تک یہاں انار، انگور، ناشپاتی، سیب تر و تازہ میوے بکتے تھے اب پھلوں کی ایک دوکان بھی نہیں ہے اس کوچہ کا اچار چٹنی، مربہ بھی شہرۂ آفاق تھا اور جہانگیر خاں اچار والے بڑے مشہور تھے ان کا مکان سرکٹے نالے پر تھا اب یہ دوکانیں بھی اجاڑ ہیں سرار کا ایک پھاٹک چوک میں تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کبھی یہ جگہ محفوظ تھی آگے بڑھ کر زیرپائی والوں کی دوکان تھی جو بہت پرانا کاروبار تھا۔ آثار قدیمہ میں محلہ ختم ہونے کی جگہ صرف ایک مسجد باقی ہے سرار کے دروازہ کا ایک پٹ باقی تھا۔ میلہ میں قوت دار لوگ اس کو اکیلے کھولنے بند کرنے کے کرتب دکھاتے تھے سال بھر سے وہ پٹ بھی گر گیا ؎

ہیں مکاں صورت شکستہ دلاں در کھلے مثل دیدۂ حیراں

بی بنّی کا امام باڑہ:۔ بی بنّی عہد نصیرالدین حیدر کی طوائف تھی اس کی نوچی کا نام تو پردۂ خفا میں ہے۔ پاگل ہونے سے لوگ خبطن کہتے تھے جب کبھی طبیعت ٹھیک ہوتی تھی اور رہر آجاتی اور کسی محفل میں تھوڑی دیر کے لئے چلی جاتی تو لوگ اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتے ناچ گانے میں اس کا جواب نہ تھا۔ بی بنّی نے میوہ والی سرار میں امام باڑہ بنوایا اور آخری دور سلطنت کے بعد عمارت گرنے لگی

[1] آب حیات ص۳۴۳

اس پر چودھرائن طوائف نے خاطرخواہ دولت صرف کرکے اسے نئے سرے سے بنوا دیا اس وقت سے چودھرائن کا امام باڑہ مشہور ہو گیا کسی منچلے نے چودھرائن کے امام باڑہ میں مجلس کی۔ ظریف نے رقعہ لکھ دیا جس کے سب اشعار تو میں پیش نہیں کرسکتا۔ بیچ کی سرار کا محل استعمال دیکھنے کے لئے دو شعر اور تیسرے شعر کی ایک بیت ملاحظہ ہو[1]

تیرہ تاریخ کو محرم کی + پہلے جو آئے اس کی ہے باری :: چوک میں بیچ کی سرا ہے جہاں + ورنہ جس جا پہ آپ آئیں وہاں شام کے وقت لائیں سب تشریف

حکایت:۔ غدر کے بعد میر مصطفٰے[2] حسین خاں سے جو مفتی گنج کے رہنے والے تھے ایک شخص سے بیچ کی سرار میں تلوار چلی خبر مشہور ہونے پر میر صاحب کی مدد کو پلٹن آئی مگر آپ نے گوارا نہ کیا کہ فوج مدد کرے ایک سے ایک کا مقابلہ بہتر ہے میر صاحب زخمی ہوئے اور گرے اور پلٹن کو لڑنے کی پھر بھی اجازت نہ دی یہ کہہ کر خون میں نہائے ہوئے گھر لائے گئے کہ اچھا ہوا تو خود مقابلہ کروں گا ایک ہفتے میں تلوار کے گھاؤ اچھے ہو گئے۔ انتقام کا ارادہ تھا کہ دشمن مزاج پرسی کو خود سے آگیا اور گردن جھکا دی میر صاحب کا دل صاف ہو گیا اور تاحیات دوستی رہی۔

میوہ والی سرار کے اچار اور مربہ

مربہ انبہ سبز مسلم	(آم)	اچار انبہ ترش	اچار انجیر
مربہ انبہ سبز	مربہ شلجم	اچار رنڈ خربوزہ	اچار مولسری
مربہ انبہ سادہ	مربہ اترج	اچار مولی	اچار انبہ زعفرانی
مربہ انبہ زعفرانی	مربہ کروندا	اچار ادرک	اچار ککڑی
مربہ انگور مصنوعی	مربہ املی سرخ	اچار گلوری	اچار چھوارہ
مربہ گزر (گاجر)	مربہ ناشپاتی	اچار کشمش	اچار پیاز
مربہ سیب	مربہ ثعلب مصری	اچار لیمو	
مربہ بہی	مربہ شقاقل	اچار کروندا	چٹنی نورتن
مربہ اناس	مربہ موصلی	اچار گوبھی	چٹنی برق دم
مربہ آملہ	مربہ ہلیلہ	اچار آڑو	چٹنی سادہ
مربہ نارنگی سرخ	مربہ پیٹھے	اچار شلجم	چٹنی زعفرانی

۱۹۴۷ء تک یہ خوش ذائقہ سامان فروخت ہوتا تھا

ہاتھی دانت کا سامان

چوک میں ہاتھی دانت کے سامان کی بھی دوکان تھی کاغذ کاٹنے کی چھری، قطزن، قلمدان اڈریس پیش کرنے کی کشتیاں اور بڑی کے کھلونے انتہائی لفاست سے بنتے تھے۔

---

[1] دیوان ظریف   [2] وضعداران لکھنؤ صفحہ ۲۴

چکنی ڈلی

چھالیہ ڈلی کو دودھ میں جوش دے کر مناسب ترکیب سے چکنی ڈلی بنائی جاتی تھی اور چونی کے برابر چکنی ڈلیاں پان کھانے والے شوقین مزاج لوگ بغیر پان کے بھی کھاتے تھے دوکاندار بڑے بڑے آہنی سروتے لئے ہوئے کھٹا کھٹ کام کرتے خوبصورت ڈلیاں تیار ہوتی تھیں اور جو چورا نکلتا وہ علیحدہ بوڑھے لوگ استعمال کرتے یا بٹوہ میں رکھنے والے دیہاتی کھاتے یہ وہی دہلی اور لکھنؤ کا تحفہ ہے جس کو غالب نے کئی کئی تشبیہوں سے یاد کیا ہے

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی — زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہیے — ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے
مہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی کہیے — حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے
مسی آلودہ سر انگشتِ حسیناں کہیے — داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ کہیے — سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے — خالِ مشکینِ رخِ دلکشِ لیلیٰ کہیے
حجر الاسود و نورِ حرم کیجے فرض — نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے
وضع میں اس کو اگر سمجھئے قافِ تریاق — رنگ میں سبزۂ نوخیز مسیحا کہیے
صومعہ میں اسے ٹھہرائیے گر مہرِ نماز — میکدہ میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیے
کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھئے — کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے
کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجے — کیوں اسے نقشِ پا ناقہ سلمیٰ کہیے
بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض — اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

مسجد حیدر بخش

میوہ والی سرار کے سامنے اونچی کرسی کی یہ خوشنما مسجد کشادہ اور ہوا دار ہے پچاس برس پہلے لوگ اس کو ملا مسجد کہتے تھے بانی مسجد عہد نواب سعادت علی خاں مرحوم میں الماس علی خاں کا کارندہ تھا اس کو ملکی سیاست کی بیپٹ میں کئی کئی دفعہ مصیبتوں کا سامنا ہوا تاریخ اودھ میں کشمکش حیات کی یاد تازہ ہے۔

چوک سے مسجد پر پہونچنے میں بارہ زینہ کے بعد صحن مسجد ہے رو کار پر تلے اوپر کئی پتھر لگے۔ ان تحریروں کو پڑھنے سے مسجد بنوانے والے اور مسجد کا تعارف ہوتا ہے خانۂ خدا میں دوہرے دالان ہیں جن پر لٹھے دئے ہوئے ہیں اور دھنیوں کی چھتیں ہیں — نمازیوں کے لئے مسجد میں پہونچنے کے لئے پانچ در ہیں چھٹا در شمالی رخ پر صحنچی میں جانے کا راستہ ہے گنبد بجائے پہلے یا دوسرے درجے کے پہلو کی صحنچی پر ہے پہلے درجے میں زیر گنبد صحنچی کے رخ پر جو سنگ مرمر ہے اس پر باب جبرئیل اور اس کے سامنے جو صحنچی ہے اس پر باب الرحمہ بخط نسخ لکھا ہے محراب مسجد پر جہاں امام جماعت کا سجادہ ہوا کرتا ہے پتھر پر دو سطریں بخط عرب موجود ہیں پہلی سطر میں بسم اللہ اور اس کے نیچے لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً لکھا ہے اس مسجد میں سب ملا کے پانچ منارہ ہیں

تین داہنی طرف اور دو بائیں طرف پانچواں منارہ کمزور ہو جانے سے ایک ستون سے کمر بستہ کے طور پر روک دیا گیا ہے دونوں طرف پہلوؤں سے چھت کا راستہ ہے اور مؤذن اور امام کے قیام کی جگہ ہے اور ٹھنڈے پانی کا کنواں موسم گرما میں پیاسوں کو بڑی راحت پہونچاتا ہے اوپر کی لوح پر یہ قطعہ لکھا ہے ؎

شافع من بود رسول اللہ — بالیقیں لاالہ الا اللہ
وضع کردم بہند بہر ثواب — صورتِ مسجد رسول اللہ

درمیانی پتھر پر یہ عبارت ہے۔

الٰہی از کرم در دین و دنیا ذات باری را — بنام پاک حیدر بخش حل کن جملہ مشکلہا
فروغ از عرش اعلیٰ نداداو شان این مسجد — تعالےٰ شانہ اللہ اکبر کعبہ دلہا

تیسرے پتھر پر حیدر بخش کا وصیت نامہ ہے دو سطروں میں بقلم خفی جو بلندی اور نگاہ نہ پہونچنے سے حرف بحرف پڑھا نہیں جا سکا۔ زبان اردو میں بانی نے وصیت کی ہے کہ کرایہ دوکانات مصارف مسجد کے لئے ہے اور امامت تاحیات مولوی برہان الحق صاحب کرتے رہیں قطب شاہی سلاطین نے اپنے وصیت نامہ اپنے لوح قبر پر نصب کئے ہیں۔ حیدر بخش نے بھی کاغذات تلف ہو جانے کے ڈر میں ایسا کیا ہے قطعہ تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ کہ مسجد نہ کہو تو یہ مدینہ شریف کی نقل ضرور ہے لکھنؤ بازار راجہ میں مسجد نبوی کی ہو بہو نقل نواب رضا حسین خاں کی بنوائی ہوئی موجود ہے مگر یہ قدیم عمارت نہیں ہے اس لئے اس کا ذکر نہ ہوگا مسجد میں پیش امام با تنخواہ نماز پڑھاتے ہیں زیر مسجد ہمیشہ سے جفت فروش (جوتہ والے) بسے ہوئے ہیں۔

زیر پائی[1] کا ذکر پہلے کے صفحات میں گذرا اس وقت آرام پائی ایک نئے قسم کا جوتہ ایجاد ہوا تھا جس کا محشر بہت پرانے شاعر کے کلام میں ذکر ہے ؎

دوگانہ تیسری کے چاند پر پھبتی کہی میں نے — کسی محبوب کی اتری ہوئی آرام پائی ہے

نواب اسرار حسین خاں لکھتے ہیں کہ عہد شاہی میں ایک نئی قطعہ کا جوتا ایجاد ہوا جس کو یہاں کے وضعداروں نے بہت پسند کیا اس جوتہ کو خوردنوکا کہتے تھے یہ جوتے لال نری کے نہایت سبک اور صاف بنائے جاتے تھے یہاں تک کہ بعض موچیوں کے ہاتھ کا جوڑا چار پانچ بیسوں سے زیادہ نہ ہوتا تھا۔ گرمیوں کے خشک موسم کے لئے کاشانی مخمل کے، برسات کے لئے کیمخت کے بننا شروع ہوگئے۔ کیمخت بنانے کے بہت سے کارخانے جاری ہوگئے۔ چند دن کے بعد جوتوں کی آرائش میں اور ترقی ہوگئی اور سلمی ستارہ کے کارچوبی کام کے جوتے بننے شروع ہوئے جس میں مقیش کے پھندنے لگا کے عجیب چمک دمک اور آب و تاب پیدا کر دی جاتی تھی۔ اس کے بعد جب چھوٹا سلمی اور کلابتو آیا تو چھوٹے کام کے چڑھویں جوتے بننے لگے جو بہت سستے داموں کے آتے تھے گھیتلا جوتا اور ادگھیاں یہاں کی ایسی کہیں نہ بن سکیں ان کی مانگ اس قدر بڑھی کہ آبادی کا ایک معتد بہ حصہ انھیں کی تیاری میں زندگی بسر کر رہا تھا چوک میں ہر قسم کے کاریگروں کا مال فروخت ہوتا تھا ڈلی چمار[2] کا ایک یورپین کے لئے اس کے ایک پیر کا گمشدہ جوتا بنا کر دینا اور انعام تاریخ میں محفوظ ہے یہ عہد واجدی کا باکمال تھا۔

---

[1] بہار ہند لغت میرے ہمعصر مرزا کاظم حسین محشر سے پہلے جو محشر تھے یہ شعر ان کا ہے

[2] قدیم ہنر و ہنرمندان لکھنؤ صفحہ ۱۹۲

یوسف خاں کا انتظام چوک میں :۔ انقلاب سلطنت کے بعد جب برجیس قدر بہادر کا وقت آیا تو یوسف خاں کو چوک کی حفاظت سپرد ہوئی انہوں نے گول دروازہ کی بارہ دری میں کچہری کھولی اور کلکٹر کے لقب سے شہرت حاصل کی۔ مخبری سے رعایا کے گھروں کا روپیہ لینا شروع کیا افسوس جدید حکومت کو دیانتدار نہ مل سکے۔

بشیر بیگ کنکوے والے :۔ مسجد کے روبرو بشیر بیگ کنکوے والے کی دوکان قابل ذکر ہے۔ ڈور سادی، تلچوری، مانجھ، تیرہ تارکی، گولہ، تکلا، چرخیاں، چرخا، پتنگ، تکل، ایکتادا، سواکے تین، سواکے دو، سوا کے چار، پون تائی، ڈیڑھ کنا، ڈھیلچی، دمڑچی، پاپچی کے علاوہ رنگینوں میں چپ، پٹی دار، دوانکھا، ایک انکھا، چاندتارہ، مانگدار، الفیہ، گرونديا، نعل دار، طوقیہ نعل دار طوقیہ، دوپٹی طوقیہ، دوپٹی، دوپٹی متھے دار، تہ پٹی، بہرو بیہ، دوباز، کٹ مانگیا، ابابیلیہ، جمدھر، جمدھر طوقیہ، بھیڑیا، شطرنجی، پیپنے دار، ہلال، گرپیندیا، منقیشی ہر طرح کے تیار کنکوے بِکتے تھے بڑے میدان بدنے کے لئے اور پون تائی وغیرہ چھتم پا تا اڑانے میں اس کثرت سے بکری تھی کہ ان لوگوں نے دولت حاصل کر کے دوسرا کاروبار شروع کر دیا۔ کنکوے کا موجد کون ہے۔ میدان کہاں لڑتے تھے بیٹا توڑنا کیسا سنگین جرم تھا کنکوے باز اور نوشیرواں اتارنے والے کہاں تھے ان عنوانات پر مکمل واروشنی ڈالی گئی ہے

جمگھٹ کے دن یہ تو نہ کہوں گا کہ کنکووں سے آسمان مشکل سے نظر آتا تھا مگر فضائی چہل پہل کا سب سے بڑا دن گرمی اور برسات میں بازار سرد رہتا مگر بے فکرے اس وقت بھی شوق کرتے کنکوے سازی کا اچھا روزگار تھا اور کنکیاں کوڑی کے حساب سے بکتی تھیں ایک شاعر نے کنکوے بازی کی کچھ چیزیں اس شعر میں صرف کی ہیں ؎

لنگڑیاں دل کے ٹکڑوں کی زلفِ دوتا کی ڈور الفت میں پینچ پڑ گیا اب مانگدار سے

بیرون لکھنو کے لوگ کنکوے کو عموماً بیک زبان پتنگ کہتے ہیں اور ہمارے نزدیک یہ خلاف محاورہ ہے کنکوا یہی ہے جو اڑایا جاتا ہے پتنگ بہت بڑے کنکوے کا نام تھا جو کبھی اڑتا ہے ملحوظ خاطر رہے کہ واو پر تشدید ہے اور زیادہ تر صاحب زبان لڑکے "کن کیا" کہتے ہیں۔

ہاں خوب یاد آیا کنکوے کے آخری حصہ میں بعض اوقات کاغذ کی لانبی چٹ تیرہ چودہ انچ کی تفریحاً لگاتے ہیں اور لڑکے اس مصنوعی سانپ کی لہر فضا میں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کنکوے بازی اصطلاح میں کنکوے کو پچھّا بھی کہتے ہیں ایک پریشان خاطر شاعر کا دوسرا مصرعہ مجھے یاد ہے جو اپنی کوچہ گردی کا پہلے مصرعہ میں ذکر کر کے کہتا ہے ع بجانے پچھّا[1] ہوں کہ پچھّے کا پچھلا ہوں پچھلا وہی کاغذ کا سانپ ہے جو بیقرار ہے شیخ محمد جان شادؔ نے کسی کی ہجو میں کہا ہے ؎

مونچھوں کو دم سگ سا چڑھائے ہے وہ دیشمی کنکوے کی جھلجھل کی طرح وہ لگی ہے داڑھی

غالبؔ نے کنکوے پر ایک مثنوی نظم کی ہے جو پیسہ اخبار لاہور میں چھپی تھی اس کے بعض شعر یہ ہیں ؎

کچے تاگے پر عبث کرتا ہے زور کیوں بڑھا رکھی ہے تو نے اپنی ڈور

آسماں پر گو کہ میرا دور ہے پر مرا دوار کوئی اور ہے

اور ایک شعر یہ ہے ؎

---

[1] پچھا غیر معروف استعمال ہے اور بظاہر تصرف ذاتی ہے جیسے صاحبان ذوق کسی کے بات نہ سمجھنے پر کہتے ہیں آپ آدمی ہیں یا غرنیچ

رشتہ در گردنم افگندہ دوست　　　میکشد ہر جا کہ خاطر خواہ دوست

حیدر حسین خاں کا پھاٹک

سید حسین خاں عہد برہان الملک کے افسر فوج تھے ان کے کٹرہ میں حیدر حسین خاں نے چوک میں آنے والوں کے لئے ایک پھاٹک بنوایا جو بجائے محراب دار ہونے کے صرف ایک چھت ہے اور سقف پر رہائشی کمرے نیچے دوکانیں ہیں دھوپ اور برسات میں پانی سے بچانے کے لئے راہ چلنے والوں کو چھتری کا کام دیتا ہے چوک سے پرانا بزازہ جانے کا قدیم راستہ یہی ہے پچاس برس پہلے کے لوگ اس کو سید حسین خاں کا پھاٹک کہتے تھے[۱] معمولی پتھر پر دو تاریخیں بھی کندہ ہیں جو پڑھی نہیں جاتیں اس پتھر پر مرمت کا سنہ ہے نہ کہ بنیاد قائم ہونے کا۔ حیدر حسین خاں کو محمد علی شاہ بادشاہ نے اہتمام الدولہ کا خطاب دیا تھا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب امین الدولہ امداد حسین خاں مہتمم دیوان خانہ تھے اور آپ ان کی پیشی میں تھے۔

حیدر حسین کا پرانے کاغذات میں جا بجا ذکر ہے دوکانات مسجد تحسین علی خاں پر جب نزول کا قبضہ ہوا تو ۹ ذیلقعدہ ۱۲۶۰ھ کو ممتاز العلماء فخر المدرسین سید محمد تقی مجتہد العصر نے دو ہزار روپے اپنی جیب سے دے کر آپ ہی کے ذریعے بھگوان داس تحویلدار کو بھیجے تھے اور داروغہ صاحب ۴ ستمبر ۱۸۷۹ء تک زندہ تھے جارج کوپر لفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی و چیف کمشنر اودھ کے نام محلے کے ایک فرقہ وارانہ تحریک کے خلاف جو میموریل بھیجا گیا اس پر داروغہ حیدر حسین کی بھی دستخط ہے ان کے ہمعصر داروغہ وزیر خاں تھے جیسا کہ میاں مشیر کہتے ہیں ؎

داروغہ دونوں شیعہ عالی ہیں الاماں　　　حیدر حسین خاں ہیں وہاں یہاں وزیر خاں

شیخ عبدالرحیم کلیم :۔ اس محلہ میں ایک بڑے شاعر کلیم رہتے تھے جو جاوید اور رشید کے ہمعصر سید حسن لطافت کے شاگرد تھے اردو فارسی ہر صنف میں اصناف سخن سے ان کا کلام پایا جاتا ہے۔ صاحب دیوان تھے ایک بہت چھوٹے مکان میں تمام عمر رہے میانہ قد سیہ فام کریہہ منظر تھے صادق پر شدپوری نے مجسم شب ہجر کی پھبتی ان پر کہی تھی۔

مدرسہ فرقانیہ :۔ اس محلہ کا بہت اچھا مدرسہ ہے جس میں علم تجوید اور قرآن شریف کی مسلمان بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے مدرسہ مولوی شاہ عین القضاۃ صاحب نے قائم کیا اور ۲ رجب ۱۳۴۳ھ ان کے وصال کے بعد سے تیرہ ہزار روپے[۲] سالانہ کے مصارف کارخانہ عطر اصغر علی محمد علی برداشت کرتا ہے عمارت جدید ہے آثار قدیمہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

کارخانہ عطر اصغر علی محمد علی :۔ یہ کارخانہ ۱۲۵۴ھ سے عطر اور خوشبویات کی تیاری میں شہرۂ آفاق ہے۔ حنا پوسٹ آفس اسی کارخانے کے کاروبار کا ڈاکخانہ ہے اس فرم کے نوکروں نے یہاں سے علیحدہ ہو کر دوسرے ناموں سے بڑے بڑے فرم تمباکو اور عطر کے کھولے اور مرکز سے پورا فائدہ اٹھایا حال میں اس مشہور دوکان نے عظیم الشان کوٹھی کی صورت اختیار کی۔ یکم اکتوبر ۱۸۷۵ء کو کارخانہ کی طرف سے مزاح نویس مرزا محمد تقی عرف مچھو بیگ عاشق نے مزاحیہ[۳] ماہنامہ بہار ہند جاری کیا۔

حافظ مبین :۔ پھاٹک حیدر حسین سے نکل کر چوک میں حافظ مبین کی دوکان تھی جہاں شوز پمپ وغیرہ فروخت ہوتے تھے اور موصوف

۱؎ ملاحظہ ہو فہرست کتب سید سجاد علی تاجر کتب چوک لکھنؤ مطبوعہ ۱۳۱۰ھ　　۲؎ روزنامہ قومی آواز لکھنؤ مورخہ ۲۳ر جنوری ۱۹۵۸ء

۳؎ نیا دور لکھنؤ ۱۹۵۹ء

مرض کے مریضوں کو لال مرہم مجرب دیتے تھے ۱۹۰۵ء کے روزنامچہ[1] میں بعض روٴسا کے علاج میں ڈاکٹر عہدہ دار کے ساتھ وہ علاج کرتے تھے بعض اہل تحقیق کہتے ہیں کہ اس نسخہ میں استخواں سرمیت کا خاکستر شامل ہے۔

سرائے تحسین

حیدر حسین کے پھاٹک سے گزر کر پچھم چوک میں سرائے نواب ناظر میاں تحسین علی خاں ہے جو عہد آصفی میں تحسین نے رفاہ عام کے لئے اپنے پیسے سے بنوائی تھی سرکاری کاغذات اور پرانے دستاویزوں میں یہ محلہ کٹرہ تحسین کی لفظ سے بھی ملتا ہے تحسین عہد شجاع الدولہ کے خواجہ سراؤں میں قوم کے کھتری تھے مسلمان ہونے سے پہلے ان کا نام بھولا ناتھ تھا راجہ بخشی ایڈوکیٹ ساکن قیصر باغ لکھنؤ کے پاس ان کے مکان اور قریبی عزیزوں اور اس پردہ کا فوٹو موجود ہے جس کے سامنے وہ پوجا پاٹ کرتے تھے یہ عکس موصوف نے بڑی کاوش سے حاصل کئے ہیں نواب کی وفات کے بعد وہ صاحبزادیوں پر ناظر[2] مقرر ہو گئے اور ۱۷۷۵ء عہد آصفی میں لکھنؤ آئے پہلے نظارت خانسامانی کا کام سپرد ہوا پھر توشہ خانہ کے داروغہ ہوئے مسلمان ہونے پر بھی ان کو اپنے رشتہ داروں کا خیال تھا اور ان پر روپیہ صرف کرتے رہے۔ وزیر علی خاں کی معزولی میں ان کا ہاتھ تھا اور یہ کوشش نمک حرامی نہ تھی بلکہ وزیر علی کو وہ نااہل سمجھتے تھے اس کو جب اس بھید پر اطلاع ہوئی تو چاہا کہ تحسین علی خاں کو قتل کر دے مگر وہ اپنی سیاست سے کبھی زد پر نہ آئے آخر کار وزیر علی خاں کے چہیتے نتاتیوں نے مخالف پارٹی کی ہجو شروع کی جس کا ایک شعر یہ ہے

سات حرفوں نے کیا خانہ خراب   تین تے اور دو الف اک حے دبے

تین تے سے مراد اس وقت کے ارکان سلطنت تفضل حسین خاں، تحسین علی خاں، راجہ ٹکیت رائے اور دو الف سے اشارہ الماس علی خاں اور اشرف علی خاں کی طرف تھا جو نواب کے خسر تھے اور ح نام ہے نواب حسن رضا خاں کا اور ب بہو بیگم صاحبہ مادر نواب سے کے تنگ بندی کی تھی وزیر علی اس سیلاب مخالف کو بھلا کہاں روک سکتے تھے نہ تحسین علی کے قتل میں کامیاب ہوئے نہ وقار رفتہ واپس لاسکے تحسین ان کے دست ظلم سے بچنے کے لئے ریزیڈنٹ کی کوٹھی پر آئے۔ انگریز ان کی وفاداری اور کردار کو خوب جانتے تھے اس لئے اس ہلاکت آفریں موقع پر بال بال بچ گئے اور وزیر علی کو جو ان کی گود کا[3] پالا تھا سلطنت سے محروم ہونا پڑا۔

تحسین علی[4] خاں اور ان کے حاشیہ نشین جو ۹۱ نفر تھے سب کی تنخواہ لمعہ ماہوار سلطنت سے ملتی تھی اور چین کرتے تھے وہ آدمی وجیہہ اور شکیل تھے چہرہ سڈول اور کتابی رنگت گوری تصویر میں سر پر لٹودار پگڑی اور کاندھے پر دوشالہ اوڑھے ہوئے گلے میں سبز چکن جس کے نیچے ڈھیلے پائچوں کا پاجامہ۔ یہ تصویر کلکتہ کے وکٹوریہ میموریل میں موجود ہے اور عبدالغنی کا بیان ہے کہ نواب ناظر کے منہ[5] پر داڑھی تھی۔ مزاج میں غریب پروری، دل میں خدمت خلق کا جذبہ ہمیشہ دولت کو محل پر صرف کرنے کا سوچ، چوک کی روز افزوں آبادی اور بازار کو ہر چیز کی منڈی ہوتے دیکھ کر سرا بنوائی ایک لمبی چوڑی زمین لیکر مسافروں کے ٹھہرنے کی جگہ نکالی بھٹیاریوں کو بسایا۔ بہت بڑا اندارا بنوایا سایہ دار درخت لگوائے ملکہ وکٹوریہ کے آخری زمانہ تک بھٹیاریاں باقی تھیں بھٹیاریوں میں خوش اخلاقی اور مروت نام کو نہیں ہوتی آپس میں خوب لڑتی ہیں سراؤں کا دنگا فساد ضرب المثل

---

[1] جنتین ڈائری ص۱۸۱ مخلوطات   [2] تاریخ اودھ ص۱۳۱ ج ۲ نجم الغنی   [3] تاریخ اودھ ج ۲ ص۱۳۱ و ص۹ و ۳۶۳ ج ۳

[4] عہد نامہ ص۱۵۹ طبع نولکشور پریس لکھنؤ   [5] تاریخ اودھ

ہے ایک قومی آرگن نکلنے پر ظریف نے کیا خوب کہا ہے ؂

متانت سے کرے گا بحث یہ قومی مسائل پر — لڑے گا یا کہ پنجے جھاڑ کے جس طرح بھٹیاری

تحسین علی خاں کا بنوایا ہوا اندارا اب بھی موجود ہے مرزا جھو بیگ کی تحقیق ہے کہ بڑے کنوؤں میں عموماً تو اوہے کا دیا جاتا ہے۔ شعراء کے کلام میں بھی لفظ موجود ہے ؂

کیا کمی ہے برکت چاہیئے ساقی ترے — جام سب حوض ہیں خم جتنے ہیں اندارے ہیں

ریل نکلنے پر سرائیں اجاڑ ہونا شروع ہوئیں اور یہ جگہ ڈاک بنگلہ، ویٹنگ روم، ہوٹل نے لی۔ عہد تحسین علی خاں کا پکھریا کا درخت اور کنواں اب بھی موجود ہے تحسین علی خاں نے اپنی خرید کردہ زمین میں ملکیت باقی رہنے کے لئے کوئلہ دفن کرادیا تھا جو ستّر برس تک مکانات کی نیو اور گڑھے کھودنے میں نکلتا رہا تحسین علی خاں کی صحبت کے لوگوں میں منشی آفتاب رائے، سیتل پرشاد، بالکشن، سیدی بلال، میاں[1] خرم دخان میاں، قاسم علی سیدی مبارک، ہدایت اللہ شیخ رمضان تھے

چوک کی مرکزیت کو دیکھتے ہوئے یہاں ایک عظیم الشان مسجد کی ضرورت تھی میاں تحسین کے حساس دماغ نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اکبری دروازہ سے جانب شمال بہت بڑی مسجد چوڑی چکلی بنوائی۔ آصف الدولہ کی تخت نشینی کے سترہ برس کے بعد اس کی بنیاد پڑی۔ لکّو خاں ڈھاڑی نے جو چوک کے پرانے رہنے والے تھے اپنے باپ دادا کی زبانی سنا ہے کہ مسجد میں وہ مصالحہ صرف ہوا ہے جو بڑے امام باڑہ کی تعمیر میں سادات اور شرفاء اپنے ہاتھوں سے رات بھر صرف کرتے تھے اور صبح کو وہ بدلوا کر تازہ مصالحہ کاٹ جونا لگتا تھا تحسین نے نواب سے اجازت لے کر عرض کیا کہ اگر مجھے یہ مصالحہ مل جائے تو چوک میں ایک مسجد بنوا دوں۔ نواب نے خوشی سے منظور کیا اور زمانہ قحط کا استعمال شدہ سامان روز اٹھوانے لگے اور دور اندیش بانی نے سرا سے قریب زیادہ سے زیادہ بھراؤ دے کر سنگ بنیاد رکھا اور مسجد کے نمایاں کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ بیچ میں مسجد اردگرد دوکانیں اور دوہری کوٹھریاں اوپر صرف پچھم کی طرف دو منزلہ ہوادار دالان اور حجرے، کونوں پر دو خوبصورت برج جن کی کھڑکیاں سرا کی طرف چھت پر جانے کا پہلوؤں سے راستہ پشت مسجد کی پہلے تو یہ حیثیت تھی کہ سیاح ایک رخ سے گذر کر دوسری طرف سے دیکھتا ہوا نکل آئے۔ مگر ٹرسٹی مسجد نے آنا جانا روک کر تین قطعہ مکان پیش امام اور موذن وغیرہ کے لئے بنوائے جو قریب رہ کر مسجد کی نگرانی کریں۔

چاروں طرف کی دوکانوں کی تعداد باون ہے دو اوپر پچاس کی تعداد اس زمانہ میں مبارک سمجھی جاتی تھی دیکھو مچھی بھون میں ۵۲ مچھلیاں ہیں آئندہ اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔

مسجد کا پھاٹک رومی دروازہ سے ملتی جلتی صورت کا زیر محراب اسی طرح تین در آنے جانے کے لئے جس میں لکڑی کے پٹ اور موٹی زنجیر اور اوپر مختصر جگہ میں بھول بھلیوں کا ایسا راستہ باہر کی سمت روشن دان اور جس قدر گنجائش اسی قدر غلام گردش۔

چھت کے قریب پہونچ کر ردکار کی محراب کا اختتام ہوتا ہے اور مسجد میں آنے والوں کے لئے بارہ زینوں کے بعد فلک نما

---

[1] میاں کی لفظ زیادہ تر خواجہ سرا کے لئے استعمال ہوتی ہے یا بچوں کو بڑے بوڑھے پیارے میاں کہتے ہیں اور کبھی کبھی کوئی سجادہ نشین یا عالم دین کو بھی میاں کی لفظ سے یاد کیا جاتا ہے۔

عمارت نظر آتی ہے۔ پھاٹک کی چھت پر جانے کے لیے پہلوؤں میں دو دروازے بغیر پٹ کے اس کے روبرو پانی سے چھلکتے ہوئے دو حوض، قد آدم گہرائی، شمالی سمت کا حوض پانی بہہ جانے کی ضرورت سے گہرائی میں کچھ کم حوضوں کے بیچ میں سرنگ تاکہ نہانے والے ایک طرف سے پیر کر دوسری طرف نکلیں۔ اگلے زمانے میں کسی شخص کی جان پر بن گئی تھی اس لئے یہ راہ بند کردی روکار اور مسجد کے اندرونی حصہ کی پھول پتیاں، محراب کے کٹاؤ، دروں کے بیل بوٹے اسی نقش ونگار کا نمونہ ہیں جو مسجد آصفی میں بن رہے تھے یہاں کی گل کاری میں وہاں کا عکس ہے اور بال برابر فرق نہیں بلکہ دونوں مسجدوں کا کتبہ بھی جس سے سن تعمیر واضح ہوتا ہے ایک ہی کاتب کا خط ہے۔ حافظ نور اللہ سے بہتر اس زمانہ میں کوئی نستعلیق نہیں لکھ سکتا تھا۔ اوپر کا سفید پتھر ان کے ہاتھ کا اور نیچے کا زردی مائل پتھر ان کے بیٹے حافظ ابراہیم کا نور قلم ہے اور محراب کے اوپر سنگ مرمر کی چھپڑیوں پر لکھا ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

این خانہ کہ جلوہ گاہ انوار جلیست — تعمیر مقدس سعید ازلیست
آصف ز خرد سال بنائش پرسید — گفتا کہ بگو مسجد تحسین علیست

در ۱۲۰۵ھ ہجری النبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ آصف تاریخ کہنے والے شاعر کا تخلص ہے اور اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ آصف الدولہ نے سن تعمیر جب کسی ہوشمند سے پوچھا تو جواب ملا کہ کہو "مسجد تحسین علیست" اس کتاب کی تالیف کے وقت ۱۷۳ سال مسجد مذکور کو بنے ہوئے ہیں۔ محراب سے ملا ہوا دوسرا پتھر اس مضمون کا ہے ؎

از حکم شاہ شاہاں چوں جلوہ سفیدی — آمد بجملہ مسجد بسیار نیک و زیبا
تاریخ فرخ از کلک بلوح سیمیں — کردہ رقم سفیدی با نور ید بیضا
۱۲۵۰ھ

یہ تحریر مسجد کی تعمیر کے ۴۵ سال بعد زیب مسجد ہوئی اس وقت تحسین علی خاں مر چکے تھے۔ اس پتھر کے نصب کرنے کا سبب یہ ہے کہ نصیر الدین حیدر بہادر نے ۱۲۵۰ھ میں شہر بھر کی مسجدوں کی مرمت کرادی تھی چنانچہ مسجد تحسین[۵۱] اور مسجد آصفی کی بھی مرمت ہوئی۔ مسجد آصفی میں بھی دوسرا پتھر اسی مضمون کا آویزاں ہے۔

روکار کی ساخت میں خوشنمائی کے لیے نیچے سے اوپر تک تلے اوپر جو جو کھٹے کاریگر نے بنائے ہیں ان میں ایک باڈر کی پیمائش سے دیوار کے آخری کنگرہ تک عمارت کی بلندی معلوم کی جا سکتی ہے منارے اپنی لمبان میں بہت زیادہ نمایاں ہیں ہر منارہ تین کھنڈ کا ہے اور تینوں طبقہ گلائی اور لمبان میں برابر ہیں چوتھا کھنڈ چھوٹا ہے جس میں خوبصورت محرابیں اور اندر پرندوں کو بسیرا لینے کا موقع دیا گیا ہے ٹیلہ کی مسجد میں یہ بات نہیں ہے وہاں کوئی چڑیا مینار کے اوپر گھونسلا نہیں بنا سکتی پہنگی پر گنبد ہے جو پانچواں رکن ہے کلس کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ تانبے کا ہے یا پیتل کا۔ دونوں منار شہر کے پورب اور پچھم دور دور سے نظر آتے ہیں ادھر چوپٹیوں کی موڑ سے تحسین کی مسجد دیکھو اور پہچانو ادھر بہرہ سے نکلتے ہوئے سڑک پر آکر مناروں کو دیکھو تو بھکاری کی طرح دونوں ہاتھوں کو اٹھائے ہوئے بے نیاز سے طالب رحمت ہیں۔

---

۵۱ مسجد تحسین پر مؤلف نے الواعظ بابتہ ماہ مئی ۱۹۴۲ء کے دو قسطوں میں روشنی ڈالی ہے اور ۱۹۵۰ء کے جریدہ مذکور میں شیخ تصدق حسین صاحب بی اے وکیل کا دوسرا مقالہ شائع ہوا ہے۔

مسجد میں دو درجے ہیں آگے کا دالان پتلا اور بعد میں چوڑا چکلا، دوسرے درجے کی چھت پر تین کمرخی گنبد ہیں بیچ کا بہت بڑا قبہ ہے کلس سونے کے پتروں سے منڈھے ہوئے ہیں اور طلائی آب وتاب باقی ہے ہر کلس چودہ ٹکڑوں پر فٹ کیا گیا ہے نیچے کا حصہ قد میں ایک مٹکے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ آخر میں مخروطی کھنی پر ایک بڑا لٹو نصب ہے جو معمولی دیگچی کے برابر ہے۔ پہلوؤں کے کلس درمیانی کلس سے چھوٹے ہیں اور درمیانی بہت بڑا ہے جولائی ۱۹۵۵ء میں جنوبی پہلو کا کلس بندروں کے ہلانے سے گر گیا تھا اس کو گاؤدم شیشم کی لکڑی پر چڑھایا گیا تھا۔ موجودہ ٹرسٹیان نے آہنی سلاخ پر فٹ کر کے دوبارہ نصب کیا ہے۔

پہلے دالان میں قالب دار چھت بہت خوشنما گل کاری اتر دکھن ہوا دار دروازہ دوسرا دالان گنبدوں کے سبب سے بہت اونچی چھت اور بیچ کا قبہ بہت وسیع اور بلند جس کی تحت میں پیش امام کی محراب اور خطبہ پڑھنے کا منبر اور طاق ہے یہ ہال مسجد آصفی کے درمیانی درجے کا نقش ثانی ہے۔

کوٹھی پر جانے کا راستہ پہلو کے جدید دکانات سے ہے اور بالائے بام سے چار باغ اسٹیشن چھتر منزل گھنٹہ گھر پورے شہر کا دکھائی دیتا ہے۔ پہلو کے دو گنبدوں میں جانے کا راستہ اور قالب پر قالب ہے یہ گول کمرے ہیں جن میں اچھی خاصی جگہ ہے بڑے درمیانی گنبد میں یہ بات نہیں ہے وہ اکہری چھت ہے۔ محترم بانی مسجد کے زمانہ میں صحن حوض کی سطح سے برابر تھا اور عمارت کی کرسی نا نا نو تھی۔ ممتاز العلما فخر المدرسین نے نمازیوں کی کثرت دیکھ کر زمین کو بلند کر کے چبوترہ بنوایا جوان کی یادگار ہے۔

دکانات:۔ اس عمارت میں ۵۲ دکانیں ہیں جن کا کرایہ غریب پروربانی نے مسجد کے رہنے والوں، مسافروں اور محتاجوں کے لئے صرف کیا جانا وصیت کیا تھا اور چوک کی دوکانیں ٹرسٹی نمبر ۲ کی تعمیر کردہ ہیں جس کو انہوں نے اپنی جیب سے بنوایا امور خیر میں اس کا بھی صرفہ ہوتا رہا جدید عمارت بازار چوک کے رخ پر اراضی مسجد پر چوبی چھت کی صورت میں ہے ورنہ مسجد تحسین میں کہیں بھی لوہے اور لکڑی کا استعمال نہیں ہوا ہے۔

متولیان:۔ ٹرسٹی نمبر ا ممتاز العلماء فخر المدرسین سید محمد تقی مجتہد العصر والزماں تھے ان کی وفات کے بعد ۱۲۸۹ھ میں ان کے بیٹے شمس العلماء سید محمد ابراہیم نے مسجد کو غیر معمولی فروغ دیا پھران کے بعد ۱۳۰۷ھ میں ان کے خلف اکبر مولانا سید محمد تقی مجتہد نے ۱۹۱۹ء تک شاندار خدمات انجام دیے اس کے بعد مسجد زیر انتظام عدالتی بورڈ آ گئی۔

پیش امام:۔ لکھنؤ میں فرقہ امامیہ کے مجتہد اول مولانا دلدار علی صاحب عفرانمآب کے بیٹے مولانا سید علی صاحب قبلہ جنھوں نے سب سے پہلے اردو تفسیر قرآن لکھی، مسجد میں تحسین علی خاں کے وقت سے نماز پڑھاتے تھے ان کے سفر زیارات ۱۲۵۶ھ میں امام جماعت کے بھتیجے ممتاز العلماء کی اقتدار میں نماز ہوتی رہی غدر ۱۸۵۷ء میں چند شورش پسند مسلمانوں نے مسجد پر قبضہ کیا اور ۲۷ نومبر ۱۸۶۷ء سے پھر نواب محسن الدولہ کے حکم سے ممتاز العلماء نے نماز پڑھائی اور یہ عہدہ ان کی اولاد میں بلا تنخواہ اب تک ہے۔

مسجد کی تاریخی حیثیت

رمضان شریف میں اس مسجد کی رونق اس حد تک پہونچی کہ ظہر کا وقت آنے سے پہلے رئیسوں کے مصلے بچھا دئے جاتے تھے۔ اور مصاحب جگہ روکے ہوئے بیٹھے رہتے تھے اور جو امیر جس وقت آیا اس کو جگہ نہ ملنے کی شکایت نہ ہوئی۔ انیسؔ و دبیرؔ بیک وقت اسی مسجد میں جمع ہوتے تھے اور قدر دانان سخن اشتیاق بھری نظروں سے دیکھتے تھے کہ یہ دونوں صاحبان کمال آپس میں کس طرح ملتے ہیں۔ چوک کی

جانب چبوترے کے نیچے دو کانیں لگتی تھیں اور تبرکات کے بازار میں انگوٹھیاں، تسبیحیں، سمرن کنٹھے، شمار دانہ، قرآن شریف، حمائل تعویذی، قطب نما حرز جواد بچھورے اور تعویذات مناسب قیمت پر فروخت ہوتے تھے روزانہ سہ پہر کو مختلف صاحبان کمال اپنے شاگردوں اور دوستوں کو لئے ہوئے کوئی قرأت سکھا رہا ہے کوئی ادبی گفتگو اور اشعار پر اصلاح میں مصروف ہے بعض اہل علم مسجد میں درس بھی دیتے تھے۔

شیخ تصدق حسین ایڈوکیٹ لکھنوی نے اپنے آرٹیکل میں لکھا ہے گرمیوں میں اس مسجد کی منڈیر پر کچھ سفید پوش بیٹھا کرتے تھے ان میں کچھ پاکیزہ مزاج ہوتے جو چوک بازار میں گذرنے والوں کی سیر سے دل بہلایا کرتے اور کچھ شوقین مزاج ہوتے جو سامنے کے نظارے کیا کرتے انھیں واقعات سے متاثر ہو کر ایک دل جلے شاعر نے کہا تھا "مفلس تماش بینوں کا مسجد میں ہے قیام" حسین آباد کی ضریح اور بخشو اور فقیر کا تعزیہ اور جلوس چپ تعزیہ نکلتے وقت مسجد کے کوٹھوں کا ہجوم دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

نوچندی کو درگاہ حضرت عباس کی طرف شاہی سواری مسجد کے سامنے ہی سے نکلتی تھی اور بادشاہ حاضری چڑھا کر واپس ہوتے تھے۔ میر تقی میر کی خودداری نے آصف الدولہ کے بعد نواب سعادت علی خاں کے دربار میں جانا چھوڑ دیا۔ ایک دن نواب کی سواری چوک سے نکل رہی تھی یہ تحسین کی مسجد[1] پر سر راہ بیٹھے تھے سواری سامنے آئی تو سب اٹھ کھڑے ہوئے میر صاحب اسی طرح بیٹھے رہے سید انشا خواص میں تھے۔ نواب نے پوچھا۔ انشا یہ کون شخص ہے جس کی تمکنت نے اسے اٹھنے نہ دیا۔ عرض کیا یہ وہی متکبر ہے۔ جس کا ذکر حضور میں اکثر آیا ہے۔ مزاج کا یہ عالم ہے آج بھی فاقہ سے ہوگا۔ سعادت علی خاں نے پلٹ کر خلعت بحالی اور ایک ہزار روپیہ دعوت کا بھجوایا۔ جب چوبدار لے کر گیا میر صاحب نے واپس کر دیا۔ مسجد میں بھجوایئے یہ گنہگار اتنا محتاج نہیں ہے۔ سعادت علی خاں کو تعجب ہوا اور پھر انشا کے ہاتھ یہ خلعت بھیجا۔ انشا نے سمجھایا کہ اپنے حال بلکہ عیال پر رحم کیجئے بادشاہ وقت کا یہ ہدیہ ہے۔ میر صاحب نے کہا وہ اپنے ملک کے بادشاہ ہیں میں اپنے ملک کا بادشاہ ہوں کوئی ناواقف اس طرح پیش آتا تو مجھے شکایت نہ تھی اتنے دنوں کے بعد ایک دس روپیہ ماہوار کے نوکر کے ہاتھ خلعت بھیجا۔

امان علی سحر کا مشہور قطعہ بھی مناظر مسجد کی تصویر کشی کرتا ہے ظاہر میں تو نغمہ افروزی کا اعلان ہے مگر گہری نظر سے دیکھنے والے اس کو ناصح کی نظر غضب سمجھتے ہیں ؎

احباب کی صحبت سے دل اپنا نہ اٹھے گا	ٹکڑی کا کبوتر ہے یہ تنہا نہ اٹھے گا
اللہ کے گھر میں بھی میں گھوروں گا بتوں کو	تحسین کی مسجد سے مصلّٰی نہ اٹھے گا

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے جولائی ۱۸۸۴ء تک یہ مسجد، مسجد جامع بھی رہی اور جمعہ و عیدین بڑے طمطراق سے ہوتا رہا حمام اور پھاٹک کی چھت پر نمازیوں کی صفیں ہوتی تھیں۔

چھوٹی مسجد اور حمام:۔ مسجد تحسین اپنی وسعت کے باوجود جب نمازیوں سے بھر جانے لگی تو ٹرسٹی نمبر ۲ نے مسجد کے بائیں طرف اپنے پیسے سے چھوٹی مسجد بنوائی اور غریبوں کے نہانے کے لئے حمام داہنی جانب بنوایا احمد علی حمامی اس غسلخانہ کا ہوشیار کام کرنے والا تھا ۱۹۱۵ء کی برسات میں مسجد گر گئی اور حمام شکستہ حال میں اب بھی موجود ہے۔

---

[1] آب حیات صفحہ ۲۲

امام باڑہ تحسین

بازار چوک سے مسجد کے پچھواڑے جانے پر سرار تحسین شروع ہوجاتی ہے اور داہنے ہاتھ پر جو محراب دار پھاٹک ہے وہی امام باڑہ ہے یہ پہلے ایک احاطہ کی صورت میں تھا پھر اصطبل ہوا اور بتاریخ ۲۹ ر شعبان ۱۲۲۸ھ م اگست ۱۸۱۳ء کو تحسین کے مرجانے کے بعد ان کا مقبرہ قرار پایا۔ نواب ناظر نے عہد سعادت علی خاں مرحوم میں دنیا چھوڑی اور یہ پہلا امام باڑہ ہے جو جان بیلی رزیڈنٹ اودھ کے زیر نگرانی بنا میاں موصوف کے مصالح نے ان کو مجبور کیا تھا کہ وہ انگریز کو اپنا وصی قرار دیں اور ۲۴ ر اگست ۱۸۱۳ء کو بسفیر اودھ سے وصیت کی کہ وہ ان کی تمام جائداد منقولہ یا غیر منقولہ اور سواری کے ہاتھی، اونٹ، گھوڑوں کا ان کے بعد انتظام کریں اور شرائط وصیت نامہ کا سختی سے لحاظ رکھیں وصیت نامہ کے ضروری الفاظ یہ ہیں۔

عرصہ ہوا کہ میں نے اکبری دروازہ کے قریب چوک میں ایک قطعہ آراضی اپنے مدفن کے لئے خرید کر ایک مسجد اور اصطبل اور پکا بازار اپنے باقی روپے سے تعمیر کرایا تھا اور اس کی کل آمدنی مسجد کے فقراء اور مساکین کو تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ میری تمنا ہے کہ آپ اس بارے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے جب میری روح جسم سے پرواز کر جائے تو میرا جنازہ شان و شوکت سے اٹھا کر لاش چوک بازار کے احاطے میں دفن کرادیں اور ایک پختہ مقبرہ بھی میرے مرقد پر اس روپیہ سے بنوادیں جو کمپنی کے خزانے میں جمع کیا جائے گا مسجد اور بازار کی دوکانوں کا کرایہ جس کو اب تک چرتال سیٹھ کے ملازمین وصول کر کے فقراء کو تقسیم کیا کرتے ہیں میرے بعد بھی اسی طرح سے وصول کر کے مسجد اور مقبرہ کے فقراء و مساکین کو تقسیم کیا جائے۔

<u>پکا بازار</u>:۔ کچھ نہیں معلوم کہ یہ بازار عقب مسجد تحسین تھا یا کسی اور جگہ چوک کے اس حصہ کو جو مسجد کے سامنے ہے تحسین علی خاں کا پکا بازار کہنا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ وہ خود اسی عبارت میں چوک بازار کی لفظیں سپرد قلم کر رہے ہیں۔ نواب ناظر کے مرنے کے بعد ہی امام باڑہ کی بنیا د پڑی اور جان بیلی نے ان کی وصیت اور آرزو کے مطابق مقبرہ امام باڑہ کی وضع پر بنوایا۔ جس کو امام باڑہ کہو یا ______

<u>مقبرہ تحسین</u>:۔ پھاٹک مذکور سے اندر آؤ تو ڈیوڑھی کی چھت ہے جس پر لکڑی کی دھنیاں اور چھانپ لگائی گئی ہے۔ دونوں پہلوؤں میں دو چھوٹے دالان اور داہنے ہاتھ کی طرف کوٹھری صحن بہت چوڑا اور چکلا، پچھم کی طرف اصل عمارت ہے جو برآمدہ کے بعد وسیع ہال کی صورت میں ہے۔ پرانے طرز کی قالب دار چھت بیچ میں نواب ناظر کی قبر جس پر کوئی کتبہ اور پتھر نہیں ہے بغل میں ان کی رفیقۂ حیات کی دوسری قبر ہے جو صرف دلبستگی کے لئے زندگی بھر ساتھ رہیں ورنہ خواجہ سرا کے لئے بی بی بے جوڑ رشتہ ہے۔ اس درجے میں لکڑی کا منبر اور ہر ستون پر علم نصب کرنے کے علامات ہیں تیسرا درجہ شہ نشین ہے جس میں بہت ہی قدیم لکڑی کی ضریحیں رکھی ہیں اور پشت پر علم کھڑے ہوتے ہیں کسی وقت میں یہ تعزیہ خانہ شیشہ آلات سے آراستہ اور آرائشی سامان سے بھرا ہوا تھا۔ حسب دستور ضریح کے دالان کی کرسی اونچی ہے اور بغلی صحنچیں سامان خانہ رکھنے کی زیادہ گنجائش ہے جنوبی رخ پر بھی کچھ عمارت تھی۔ جس کے صرف آثار باقی ہیں تحسین علی خاں نے وصیت نامہ میں یہ بھی خواہش کی تھی۔

"اس رقم کے علاوہ میری وصیت ہے کہ میرے زر امانت کے سود میں سے چھ سو روپے سال محرم کے مراسم عزا اور میرے دہیہ میں صرف کئے جائیں۔"

تحسین علی خاں کا دیسہ آخری ٹرسٹی شہاب الدین جھبو کے وقت تک ۹ ر شعبان کو ہوتا تھا ۴ ر جنوری ۱۹۲۰ء سے یہ مقبرہ وقف ممتاز العلما کی کمیٹی کے تحت میں آگیا اور بورڈ آف ٹرشیز کی طرف سے عزاداری ہوتی ہے اور دیسہ کی مجلیس تاریخ وفات سے ایک دن پہلے ۸ ر شعبان کو ہوتی ہے انتقال تحسین علی خاں کا مادۂ تاریخ ع آج اختہ بندھا طویلے میں" نہیں ہے شاعر کا یہ طنزیہ مصرعہ کسی دوسرے خواجہ سرار کی موت پر ہے جو تحسین کے مرنے کے نو برس بعد فوت ہوا۔ افسوس ہے کہ تاریخ اودھ پر خامہ فرسائی میں زیادہ تر تعصب اور قیاس آرائی سے کام لیا گیا اور لٹریچر میں افسانہ نویسی کے فرض کو ادا کرکے عوام کی جیب سے صرف تجارت کو فروغ دیا تحسین کے عاقبتی جوڑے میں دیسہ کے دن پانی کے گھڑے اور طورہ طعام کے ساتھ انگرکھا چوڑی مہری کا بیجا مہیا بابل نوٹ کا اوڑھنے والا رومال پاؤ گز کا دست پاک پنجگوشیہ ٹوپی گھیلا جوتا ہوتا تھا۔

ایک خوشنویس کی یادگار :- دروازہ مقبرہ سے نکلتے ہی برآمدہ کے قریب ایک زمین دوز قبر ہے جو حکیم علی حسین[1] ایک طبیب وقت کی آخری آرام گاہ ہے اور سنگ مزار سے واضح ہوتا ہے کہ اس مرد فاضل نے ۱۲۸۶ھ میں انتقال کیا پتھر پر امیر اللہ تسلیم کا قطعہ تاریخ ہے جو نولکشور پریس کے پہلے دور میں ہوشیار کاتبوں میں شمار کئے جاتے تھے شاعری میں بھی کمال تھا۔ کلیات تسلیم دو جلدوں میں چھپی ہوئی شائع ہو چکی ہے لکھنؤ میں ان کی خطاطی کے نمونے جا بجا موجود ہیں مٹی وطن میں نہ تھی دکن میں جا کر رحلت کی۔ امیر مینائی کے سامنے جب اس خطاط کے سفر دکن کا ذکر آتا تھا تو کہتے تھے ؎

میرے دل سے تمنائے دکن کچھ اور کہتی ہے — مگر مرگ غریب بے وطن کچھ اور کہتی ہے

مقبرہ تحسین علی خاں نواب ناظر کی اعلیٰ یادگار ہونے کے ساتھ امیر اللہ تسلیم کو بھی فراموش نہ ہونے دیگا جب تک یہ سنگِ مزار باقی ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ ٹرسٹیان انگنائی کی کچی زمین کو پختہ فرش سے آراستہ کرکے اس پتھر کو مٹنے سے بچائیں ؎

ڈر ہے کہ کہیں نام بھی مٹ جائے نہ آخر — مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

قبر ایک تاریخی انسان کا مزار اور تعویذ قبر ایک خطاط کی یادگار ہے۔

باغ ممتاز العلمار :- مسجد کے پچھواڑے مجتہد العصر کا باغ تھا جس کے تین دروازے تھے نکاس کا پھاٹک عقب مسجد سرار تحسین کے پچھم میں جواب تک ہے۔ اس دروازے پر تقطیع میں لکھا تھا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ربنا ولا یحمنا واحفظنا، بلا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین نہ یہ تختی باقی ہے نہ دروازے کے پٹ، بے چھت کی ڈیوڑھی کے بعد دوسرا دروازہ تھا جس میں لکڑی کی جوڑی تھی۔ اس کے بعد باغ میں پہونچنے کا زینہ اور چمن بندی تھی لیمو کاغذی، جامن، شریفہ، مولسری، کاغذی بیل، کروندا، کامنی، گولر، کھجور، بیری اور املی وغیرہ کے درخت تھے نہیں کہا جا سکتا کہ درخت کھجور اور املی ممتاز العلماء کی ملکیت سے پہلے پیڑ تھے یا انھوں نے تمام پودے خود لگائے۔ باغ میں اب کوئی درخت نہیں ہے املی کا درخت چار پانچ برس پہلے تک تھا صحن امام باڑہ پر اس کا سایہ شامیانہ کی طرح فائدہ بخش تھا۔ درختوں کو سیراب کرنے کے لئے کھاری پانی کا ایک گہرا کنواں بھی تھا جو اب بند ہے۔ باغ کا جنوبی دروازہ سبز منڈی کوچہ میر انیس کی طرف اور شمالی دروازہ حمام کی گلی عقب امام باڑہ تھا یہ راستے بھی اب بند

---

[1] مولوی شاہ عبد الحق کانپوری اور قاضی رامپور مفتی محمد سعد اللہ کے معاصر تھے ناشر کی طرف سے جس قرآن مجید کی صحت پر علمار کی دستخطیں ہیں وہاں حکیم علی حسین کی بھی مہر ہے۔

ہیں پچھم کی طرف باغ کی تحتانی دیوار تھی جس کا قدیم حصہ ابھی باقی ہے اس دیوار کی سمت اوسط درجے کی ——————

مسجد باغ :۔ بغیر مینار اور گنبد کے صرف ایک درجہ اور چبوترہ جنوبی رخ پر حوض ہے مسجد میں صبح کی نماز عماد العلماء میر آغا صاحب مجتہد باجماعت پڑھاتے تھے اس مسجد کو یہ تاریخی خصوصیت حاصل ہے کہ مؤذن کا نام تو کسی کو یاد نہیں "شیخ" کی لفظ سے اذان کہنے والے مشہور تھے ۔ جو توبہ سے پہلے ڈاکو تھے ممتاز العلماء نے ان کو راہ راست دکھائی ۔ بڑھاپے یا کسی بیماری کی وجہ سے بیروں نے جواب دے دیا تھا ۔ آواز اس قدر بڑی تھی کہ جب اذان دیتے تھے تو صبح کی صدائے اذان مجدیوان کے رہنے والے سنتے اور آواز پہچانتے تھے مؤلف نے ان لوگوں کو دیکھا ہے جو شیخ کی آواز اپنے گھروں میں سنا کرتے تھے اور ان کی صدا کی رسائی پر متحیر تھے ۔

مکان ممتاز العلماء اور آزادی کے حامی شاہ کی آمد
سلاطین اودھ کے قصر میں باریابی کا آئین

یہ مکان باغ کے جنوبی رخ پر سبزی منڈی سے متصل تھا جس کا اب نشان بھی نہیں ہے ممتاز العلماء کا سرا تحسین میں مکان بنوا کر سکونت اختیار کرنا ۱۲۵۶ھ کے پہلے کا ذکر ہے اس مکان کی خصوصیت دہ عشرۂ محرم کی مجلسیں ہیں جواب تک بیادگار ممتاز العلماء ہر سال ہوتی ہیں پہلے دور میں ذاکری کا عہدہ مولوی امداد علی صاحب کیراتوی کو ملا تھا وہ ملتان سے مجلسیں پڑھنے لکھنؤ آتے تھے ۔ مخلصین ممتاز العلماء کے اجتماع سے جب یہ مکان بھر جانے لگا تو امام باڑہ کی تعمیر ہوئی ۔ اس زمین کو میں نے کھنڈر کی صورت میں دیکھا ۔ آخر میں حکیم منے آغا فاضل مشہور حکیم شہر کے جوہری محلے سے اٹھ کر آئے اور اسی جگہ بہت دنوں تک کوٹھی بنوا کر پبلک خدمات انجام دیتے رہے ان کی موت کے بعد ورثا نے ہجرت کی اور یہ عمارت نئے انتظامات کے تحت میں آئی ۔ اس مکان پر شاہان اودھ کی سواری آتی تھی اور خود ممتاز العلما اپنی ڈیوڑھی سے قیصر باغ جاتے تھے ۔

مجتہد صاحب کی پالکی :۔ فینس میں امیر رئیس اور اہل علم دونوں طبقہ سوار ہوتے تھے اور علماء کی نشست کا یہ انداز تھا کہ وہ امراء کی طرح فینس کے بیچ میں اپنے تئیں نمایاں کر کے نہیں بیٹھتے تھے وہ گوشہ میں ہمیشہ تکیہ کر کے بیٹھتے سامنے خاصدان اور گھڑی کی چوبی فیض آبادی صندوقچی مراد آبادی لٹیا کا ساتھ ہونا ضروری تھا اور بعض عالموں کے ساتھ صندوقچہ رہتا تھا ۔ نماز عید کا موقع ہوا تو تلوار پہلو میں ورنہ کٹڑے بادام کا عصا نوکر فانوس لئے ہوئے ساتھ ساتھ' پالکی عام طور پر چار کہار اٹھاتے تھے چھ یا آٹھ کہاروں کا ہونا خاص اوقات میں ضروری تھا اور کبھی سولہ اور کبھی ۳۲ کہاروں کی نوبت آجاتی تھی جب چار شخص تھک جاتے تھے تو دوسرے شریک ہوتے تھے اور کاندھا بدلنے کے وقت تک یہ سواری کے ساتھ دوڑتے تھے ایک کہار سب کا افسر ہوتا اس کو مہرا کہتے جس کی وردی میں امتیازی شان اور قیصر باغ میں داخلے کے وقت اس تختی کا ہونا ضروری ہے ہشت پہل تقطیع پیتل کی ہے اور جو جگہ سادی چھوڑ دی ہے اس پر گل کاری ہے نقش و نگار معمولی ہیں سرکار کی لفظ لکھنے کا حق صرف مجتہد کو تھا دیگر لوگوں کے پاس داخلہ میں یہ لفظ ممنوع تھی اس کے علاوہ پگڑی میں دوسرا تمغہ تھا جو نمبر داخلہ اور باریاب ہونے والے کے نام پر مشتمل تھا اس کی صورت درج ذیل ہے ۔

(پچھلی) ←

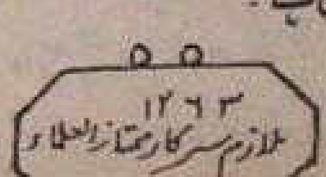

تقطیع

سواری اتارتے وقت سب کہاروں کا چیخ کر بسم اللہ الرحمن الرحیم کہنا وہ رواج تھا جو آخر تک ترک نہیں ہوا قبلہ وکعبہ کے لئے وقت اور اجازت کی ضرورت نہ تھی مگر علماء خود سلطنت کے احترام میں اطلاع دے کر تشریف لے جاتے تھے اور حفظ مراتب کا بے حد خیال تھا۔

(نوٹ) مچھلی کے پیٹ میں جو کچھ لکھا ہے وہ خط شکستہ ہے اور صاحبان ذوق میں اس تحریر کے پڑھنے میں بڑا اختلاف ہوا۔ آخری نتیجہ یہ تھا کہ "فقط برای بستن شمشیر حکم است" ممکن ہے کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ تلوار حمائل کر کے آنے والے لڑنے کے لئے تلوار نہیں باندھے ہیں بلکہ آداب داخلہ ہیں کہ تلوار سمیت آؤ اس وقت کے بانکے اور بہادر چونکہ بغیر شمشیر گھر سے قدم نکلتے ہی نہ تھے اس لئے حکومت نے ان کے جذبات میں ٹھیس نہیں لگائی۔

نئے بادشاہ کی سواری ممتاز العلماء کے شریعت کدہ پر

سیّد العلماء سیّد حسین مجتہد جن کا لقب بعد وفات "علیین مکان" قرار پایا تھا غفرانمآب سیّد دلدار علی کے چھوٹے بیٹے تھے اور مذہب امامیہ میں بڑے واجب التعظیم سمجھے جاتے تھے۔ ان کے تصانیف ہندوستان سے عرب تک مشہور ہیں آپ کو جس وقت ضبطی اودھ کی خبر ہوئی تو گاؤ تکیہ پر سر رکھ دیا اور کھانسی آنے سے اکالدان میں خون کی قے کی۔ انگریزوں کی عملداری وطنی حکومت کا چھن جانا پھر جانبر نہ ہوئے ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۶ء کو ہمیشہ کے لئے دنیا چھوڑ دی۔ اس حادثے کا پوری دنیائے شیعیت پر اثر تھا تو کیا کلکتہ خبر نہ پہونچی ہوگی سلطان عالم کا مٹیا برج سے ماتم پرسہ کا خط[1] آیا اور اپنے چشم وچراغ کو حکم دیا کہ سلاطین اودھ کے روایتی خلوص وعقیدت کی بنا پر شریعت کدہ ممتاز العلماء پر جا کر تعزیت کی رسم ادا کرو۔ برجیس قدر دن دیکھ کر در علم پر آئے اور رستمابؔ[2] کے اندر دیرینہ خلوص کو تازہ کیا۔ اس منظر کے جاننے والے سب زیر زمین ہیں مگر عربی کا شعر ؎

یلوح الخط فی القرطاس دھرا　　　وکاتبہ رمیم فی التراب

صحیح ہے نہ آنے والا رہا نہ جس کے پاس آئے تھے وہ باقی ہے مگر یادر ہتی دنیا تک رہے گی اس وقت کے اخبار کی ایک کٹنگ ملاحظہ ہو۔

۱۲ ربیع الآخر جمعہ کے دن صبح دم صاحب عالم مرزا برجیس قدر بہادر حسب الحکم حضرت سلطان عالم خلد اللہ ملکہ جناب مجتہد العصر کے مکان پر تشریف لائے رسم تعزیت بآئین شائستہ ادا کی ورثہ جناب میرن[3] صاحب قبلہ کی دلجوئی فرمائی خلعت عطا ہوئے۔ دریا فیض عمیم اور مزاج مبارک حلیم ہے کہ باوجود ایسے مکروہات اور پریشانی کے اور آفات آسمانی کے کہ نصیب دشمن ہوں جس وقت شاہزادہ کی سواری نکلی تھی شہر کی بیچاری خلقت دیکھنے نکلی تھی جو گھر سے باہر آیا جس کو سواری کا اہتمام نظر آیا بے ساختہ ہر لب سے یہ مذکور رہا ؎

تجھے فضل کرتے نہیں لگتی بار　　　نہ ہو تجھ سے مایوس امیدوار

ہر چند کہ اس روز کچھ سامان سواری کا نہ تھا جلوس دھوم دھڑکے کی تیاری کا نہ تھا وہ معدودے چند جو در دولت پر مقیم ہیں وہی ہمراہ تھے اور خیف ظل اللہ تھے لیکن عجب شان وشوکت تھی دیکھنے والوں کو حیرت[4] تھی۔

---

[1] ملاحظہ ہو اخبار الآثار مخطوطات　[2] ۱۸ صفر کو یہ حادثہ ہوا اور ۱۷ ربیع الآخر کو آپ کا فاتحہ سہ ماہی تھا مرزا غالب نے اس موقع پر مرثیہ نظم کیا وہ آپ کے حالات میں موجود ہے　[3] سید العلماء کا عرفہ میرن صاحب تھا　[4] اخبار طلسم جلد ۱ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۹ دسمبر ۱۸۵۶ء

کتب خانہ LIBRARY

ممتاز العلمار نے کرۂ تحسین میں سکونت اختیار کرتے ہی ایک دو منزلہ پختہ عمارت مکتبہ علوم مشرقیہ کے لئے بنوائی اور دو ہزار سے زیادہ مخطوطات جمع کرکے قیامت تک کے لئے فضل و کمال کے چراغ روشن کردئے اس ذخیرۂ کتب میں وہ نوادر اور عجائبات ہیں جو عرب اور مصر اور یورپ میں بھی نہیں ہیں کتب خانہ کی عمارت اب بھی بجنسہ موجود ہے مگر ورثہ کا قبضہ نہیں ہے۔ ہاں کتابیں اس وقت تک اسی محلہ میں موجود ہیں اور کتب خانہ ممتاز العلمار اب ان کے وقف کے شعبہ امامباڑہ تحسین علی خاں مذکور میں محفوظ ہے اور بورڈ کے زیر انتظامات تمام اوقاف ہیں اس لائبریری کے خصوصیات میں حسب ذیل اقسام کی کتابیں بہترین شمار کی جاتی ہیں۔

(۱) مصنفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں اور اصل نسخہ (۲) عہد مصنف کے مکتوبات (۳) علمار کی تصحیح کردہ اور ان کے قلمی افادات سے مزین کتابیں (۴) سلاطین کے کتب خانے کے نسخے (۵) خرمہ کی روشنائی سے لکھی ہوئی کتابیں (۶) مشہور افراد قوم کے دست مبارک کی تحریریں (۷) غیر مطبوعہ نوادر اور شواذ (۸) آلات ریاضی اور کرے (۹) خارجی اسباب میں تلف نہ ہونے والی کتابیں۔

کتب خانہ کا غدر میں انجام :- یہ کتب خانہ ایک اتفاقیہ صورت درپیش آنے سے بچا ڈیوڑھی میں بڑی بطخیں پلی ہوئی تھیں اور سماکی کا چھتہ ایک بلندی پر تھا گورے سنگینیں لئے ہوئے آئے شہد کی مکھیاں چھتہ پھوٹ جانے سے اڑیں بطخیں چیخیں وہ بطخوں کو پکڑ کے لے گئے اور مکھیوں نے اندر آنے نہ دیا۔ اس طرح علمی خزانہ تلف ہونے سے بال بال بچ گیا۔

خاص کتابیں :- مرقومہ بالا خصوصیات کے علاوہ چھٹی صدی ہجری کی پرانی کتابیں جن کی لکھائی کو آٹھ سو برس سے زیادہ ہوئے اور وہ مخطوطات جن پر طلائی لوح اور سنہری بیلیں اور طلاکار پیشانی اور طرز قدیم کے گل بوٹے اور مختلف دیدہ زیب رنگ یا کوئی صنعت ہے مثلاً ہر سطر قرآن شریف کی الف سے شروع اور ہر ورق پر پارہ ختم یعنی ۳۰ ورقوں میں پورا قرآن پاک۔ ان تمام کتابوں کا اگر ہم نام بنام ذکر نہ کریں تو وہ کتاب نظر انداز نہیں ہوسکتی جو بصرہ کے سمندر میں گری۔ اور مسقط سے برآمد ہوئی کتاب پر پانی کا کوئی اثر نہ تھا۔ سمندری راستہ مچھلی کے پیٹ میں طے کیا۔ ایک ساحل پر شکم ماہی میں گئی اور دوسرے ساحل پر مچھلی نے حضرت یونس علیہ السلام کی طرح اوگل دیا۔ اس کتاب کا نام ہے دلائل الاحکام علم فقہ میں کتاب الطہارۃ عراق سے کاپی سائز کاغذ پر لکھ کر مکتبہ ممتاز العلمار کے لئے روانہ ہوئی۔ اس کو یہ شرف حاصل تھا کہ اصل مؤلف کی کتاب کے مطابق صحیح ترین نسخہ تھا اس کتاب کے معجزانہ طور پر ہندوستان پہونچنے کا ذکر تیرہویں[1] صدی کی عربی تاریخوں میں ہے۔ کتب خانہ میں

---

[1] بابر شاہ اور امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے کتبخانہ کے بلند پایہ مخطوطات ملاحظہ ہو احیار الآثار صفحہ ۳۶۹ عہد عالمگیر شاہی کتب خانہ کا لٹریچر صفحہ ۳۷۰ - اور عہد محمد شاہ کی کتاب صفحہ ۳۷۱ احیار الآثار اور قطب شاہ کے لائبریری کے نسخہ صفحہ ۳۹۶ [2] اوراق الذہب (مخطوطات) مفتی سید محمد عباس صاحب شوستری عربی و احیار الآثار و تاریخ شیعہ کا خونچکاں ورق مطبوعہ اردو۔

ریاضی علم ہندسہ، فلکیات پر بھی زیادہ سے زیادہ لٹریچر موجود ہے اور مسائل ریاضی طلبہ کو سمجھانے کے لئے کرہ بھی موجود ہے۔ کئی کرے ہیں ایک بہت ممتاز ہے جس کی تصویر یہ ہے

GLOBE اس کرہ پر شکلیں اور دائرہ اور خطوط بنے ہیں جو عکس میں ظاہر نہیں ہو سکتے اسطرلاب مکتبہ ممتاز العلماء کا مایہ ناز آلہ ہے۔ کتب خانہ کے داروغہ اور لائبریرین میر یاد علی تھے جو بڑے گاؤں ضلع فیض آباد کے رہنے والے تھے بہت غریب صورت سے دو روپیہ ماہوار پر ملازم ہوئے تھے ان کے بیٹے داروغہ سید سخاوت حسین مطبوعات مصر و استنبول کے تاجر باغ مکہ میں کتابیں فروخت کرکے زندگی بسر کرتے تھے مدرسہ سلطان المدارس کے بھی نگراں تھے سرکار ممتاز العلماء سے علیحدہ کئے جانے کے بعد داروغہ سید حسن اور ان کی وفات کے بعد میر عباس اور آخر دور میں مولوی سید علی گوہر موضع پٹلا غوث ضلع اعظم گڈھ کے ایک فاضل بزرگ تھے میر یاد علی کی نسل کراچی، نواب شاہ اور بڑے گاؤں ضلع فیض آباد میں اب بھی موجود ہے۔ اور داروغہ سید حسن کے کنبہ میں یوپی کے بعض ذی عزت افراد کانپور میں موجود ہیں۔ کتب خانے کے دو دروازے تھے پہلا باغ کے پھاٹک سے ملا ہوا اور دوسرا اندرون باغ اور ایک راہ سرا تحسین علی خاں یعنی پشت مسجد ختم ہونے والے گوشہ کے سامنے تھی یہ دروازہ ہمیشہ بند رہتا اور کوٹھی کا راستہ اس طرف سے بھی تھا۔

کتب خانہ اور برج بالائے مسجد ایک چھتہ کے ذریعے ملا دیا تھا اور ممتاز العلما اور ان کی اولاد اسی راستے مسجد میں امامت کے لئے جاتے تھے ۱۹۱۵ء میں یہ چھتہ گر گیا۔ باغ کے رہنے والوں میں طومار سے جہاں تک واضح ہوتا ہے مولوی میر محمد حسین صاحب میر حیدر حسین صاحب، میر احمد حسین صاحب کے نام درج ہیں۔

امامباڑہ ممتاز العلماء

باغ مذکور کے آثار قدیمہ میں امام باڑہ ہے جس کا سنگ بنیاد ۸ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ کو بعد نذر ممتاز العلماء کے ہاتھ سے نصب ہوا تمام عمارتی سامان غوطہ کرکے مسلمان مزدوروں کے ہاتھ سے صرف ہوا اور ذیقعدہ ۱۲۸۷ھ میں تیسرے برس دو عالیشان درجے اور دالانوں کے طول سے مطابق سرتاسر چبوترہ بن کر تیار ہوا پہلوؤں میں تلے اوپر صحنچیاں تاکہ اوپر کے حصے میں عورتیں شریک مجلس ہوں شہ نشین بلند اور مسجدی محراب کی صورت میں جس میں کربلا معلیٰ کی مٹی کی ضریح روکار پر پتھر نصب ہے جس میں عربی قطعہ تاریخ لکھا ہے جو بلندی کی وجہ سے پڑھا نہیں گیا لکھنؤ کے نامور شاعر لطافت نے اس امام باڑہ کا قطعہ تاریخ حسب ذیل نظم کیا ہے ؎

قبلہ و کعبہ اعلم و اکمل — عادل و متقی و رہنما
مجتہد جامع الشرائط ہیں — زاہد و عابد و مطیع خدا
علماء میں بہت ہیں یہ ممتاز — جگر و جان سید العلماء
ہے جو ان کا امام باڑہ رفیع — خوب و مرغوب و تحفہ و زیبا
اس مکان شریف و اقدس کی — جب ہوئی اس جگہ شروع بناء
کہہ دیا تعزیت سرا حسین — بس لطافت نے سال ہجری کا

سلہ پہلے شخص بہت بڑے عالم تھے دوسرے نامور طبیب تھے مقبرہ گول ٹولی کانپور کی عمارت سے متصل زیر آسمان ان کی قبر ہے اور اولاد ہند و پاک میں موجود ہے۔
تیسرے شخص حج کرآئے تھے اور مقدمہ مسجد تحسین میں کلکتہ جاکر شاہ اودھ کا فرمان لائے اور احمد اللہ شاہ کا دعوی ڈسمس ہوا۔

بن چکا جب تمام و کمال　　ہوگئی مجلسِ عزا برپا
کی رقم دل نے دوسری تاریخ　　تعزیہ خانہ حسینؑ ہوا
۱۲۸۷

ممتاز العلماء کے بعد ان کے بیٹے شمس العلماء سید محمد ابراہیم نے تیسرا دالان پشت عزا خانہ کی طرف بڑھایا اور دوسرا چبوترہ اضافہ کیا، شہ نشین درجہ دوم سے منتقل ہو کے تیسرے درجے میں آئی۔ اس وقت حجرہ ضریح مبارک کی شان یہ ہے کہ تا کمر بلندی رو کار میں پیتل کا کٹہرا اوپر گنبد کا اژدہا بصورت سقف اندر ضریح خاک شفا پہلوؤں میں بڑے اور سادے فولاد کے علم جن پر نیلے رنگ کا پٹکا اور اس پر پنجتن کے چھپے ہوئے روپہلی نام، اس کے سوا کوئی ظاہری ساز و سامان نہیں۔ چھت قدیم طرز کے لٹھے دیواروں پر نصب کر کے دھنیاں دی ہوئی۔ امام باڑہ میں مکان ممتاز العلماء کی مجلسیں جب اٹھ کر آئیں تو خلوص اور گریہ کے لحاظ سے اور زیادہ شہرۂ آفاق ہوئیں نویں محرم کی مجلس میں کئی گھنٹے پہلے ذکر شروع ہونے کے شمع کی روشنی میں اندھیرے منہ سے آ کر لوگ اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے تھے اودھ اخبار اور دوسرے جرائد میں اس مجلس کے تذکرے ہیں حکام ضلع بھی شرکت کرتے تھے۔ اس زمین کو بھی یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں کتنے مجسمۂ کمال زیر خاک محو خواب ہیں: پچھم کی طرف بیچ کے درجے میں ممتاز العلماء اور شمس العلماء کی قبریں ہیں جن پر کاٹھ کی روغنی ضریحیں نصب ہیں اور سنگ مرمر کے بڑے پتھروں پر ہر بزرگان دین کی تاریخ وفات پر مشتمل علی میاں کامل کے اشعار لکھے ہوئے ہیں جو بجائے خود ایک خط نستعلیق کا اعلیٰ نمونہ ہیں ۱۳۰۹ھ میں علامہ کنتوری نے امام باڑہ میں ایک مدرسہ کھولا اور مدت تک دینی درس طلبہ کو دیتے رہے۔

قبر لطافت :- امام باڑہ میں اولاد ممتاز العلماء کی قبریں ہیں اور اب کہیں جگہ باقی نہیں ہے۔ باغ کی آراضی کو بھی دور اندیش واقف نے قبور کے لئے تجویز کیا تھا اور اپنی ایک تحریر میں ظاہر کیا ہے کہ درخت بحیثیت باغ نہیں لگائے گئے ہیں بلکہ قبروں پر سایہ کے لئے پیڑ ہیں چنانچہ مخلصین کو ان کی استدعا پر یہاں قبر کی جگہ دی گئی اور سید حسن لطافت سپرد خاک ہوئے لطافت ایک مشہور گھرانے کے شخص تھے آغا حسن امانت کا نام تو تاریخ اودھ سے دلچسپی رکھنے والوں کو معلوم ہی ہے امانت لطافت کے باپ تھے۔ لطافت کی قبر غربی دیوار گوشۂ شمال میں ہے جس پر اب مکان تعمیر ہو گیا ہے اور اس کی بغل میں حاجی میر احمد حسین کی قبر ہے جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے لطافت، شیخ محمد جان شاد کے ہمعصر تھے ان کے شاگردوں میں مومن علی محبت، مرزا شبیر علی رسا، نواب مجید الدولہ محمد تقی خاں سطوت سید محمد تقی فرحت خوشنویس، میر ملک علی نجابت، منشی محمد سجاد ہنر وغیرہ تھے۔ لطافت کے زمانے کے اساتذہ نے ان کو جان نظم، مرد میدان سخنوری، شاعر رنگین بیاں، افتخار الشعراء مانا ہے مفتی میر عباس صاحب نے اپنی عربی تاریخ میں "فرد وحید" کہا ہے لطافت ماہ ربیع الاول کی تیئیسویں شب کو دنیا سے گزرے وجع مفاصل مرض الموت ثابت ہوا ۔

ہو گیا ویران باغ شاعری　　گل ہوا لا بد چراغ شاعری
۱۸۹۴ء

پسماندگان میں سید عباس حسن فصاحت بھائی اور باقر حسن عرف اچھے صاحب شہرت بیٹا چھوڑا۔ مرقع ماتم بیس نوحوں کا مجموعہ ان کے کلام کا وہ نمونہ ہے جس کا تجارتی فہرست کتب میں نام پایا جاتا ہے۔

ادب اردو کا ایک اور تابندہ ستارہ :- اسی حصہ باغ میں جواب شامل مکان ہے مولوی میر حسن علی صاحب کی قبر ہے جو محلہ حسین آباد میں رہتے تھے اور خاندان اجتہاد کے معلم تھے لڑکوں کو صرف و نحو کی تعلیم دیتے تھے اپنے فن میں کامل تھے۔ اردو ادب میں

گوشۂ گمنامی میں رہ کران کو ید طولیٰ تھا چنانچہ یورپ اور ایشیا ہر جگہ پہیلی کو اہمیت حاصل ہے سنسکرت کی کتاب کا ویدارشن پہیلیوں کا مجموعہ ہے اور سولہ قسمیں پہیلیوں کی قرار دی ہیں ۔ امیر خسرو کو اس فن میں کمال حاصل تھا آپ خوشنویس بھی تھے میں نے موصوف کے سامنے تقطیع پر الف ب کی مشق کی تھی لاتعداد پہیلیوں میں سے دو یاد ہیں

زن پردہ نشیں واقف نہیں گھر کے نکلنے سے — اک لحظ فرصت نہیں اسے دن رات چلنے سے

قاضی بباغ رفت ولے روزہ دار بود — شہتوت خورد روزہ او بحال ماند

نبض اور شہتوت پر طلبا کی ذہن آزمائی کے لئے یہ دو شعر مرحوم کے پیش کئے گئے ایسے ایسے کتنے صاحبِ کمال زیر زمین دفن ہیں ۔ ایک باغ ممتاز العلماء کا سطح ظاہری زمین پر تھا دوسرا باغ تہ زمین ہے جو حشر کے دن ان کے ساتھ اٹھے گا۔

(نوٹ) امامباڑہ کی جگہ دور رفتہ میں نرکل کا جنگل تھا یہ ۲ امام باڑہ، امام باڑہ آصفی، امام باڑہ جہا ولال، امام باڑہ ملکہ زمانی کے بعد چوتھے نمبر پر ہے اور اس سے بڑا کوئی عزاخانہ نہیں ہے ۔

سبزی منڈی

بہت پرانا محلہ بازار چوک کی پشت سے سرکٹے نالے تک ہے ممکن ہے کہ عہد نوابی میں ترکاری بکتی ہو لکھنؤ پر جو کتابیں آج موجود ہیں ان سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ یہاں سبزی کا بازار کبھی تھا یہ محلہ ہندو مسلم مشترکہ آبادی ہے مہاجنوں کی کوٹھیاں پرانے مندر، آتشباز، کنکوے والے اور ڈھاڑی رہتے تھے ۔ غدر کے بعد میر انیس نے اس محلہ میں سکونت اختیار کی ۔ ان کے قدیم مکان کا ذکر شاہی بستی کے سلسلے میں آگے آئے گا ۔ میر صاحب کے گھرانے نے اس محلہ کو شہرت دی اور اب یہ جگہ کوچہ میر انیس کے نام سے مشہور ہے محلہ کے پرانے باشندوں میں محمد ابراہیم عینک ساز جن کی فرم چشمہ لکھنؤ کی بہت پرانی دوکان ہے جو آج تک باقی ہے ۔

اور سوداگر کی مسجد عہد قدیم کی یادگار آگے بڑھ کر ہے اس مسجد میں بزمانہ ماہ مبارک تراویح ہوتی ہے منشی اسیر عینک پر کہتے ہیں ؎

مرتبہ عینک کو ہوا دل کی صفائے حال — اپنی آنکھوں پہ اسے اہل صفا رکھتے ہیں

طاہر غنی کا شعر بھی بڑا معنی خیز ہے ؎

نیست عینک کہ نہادیم زپیری بر چشم — نگہ از شوق جمال تو زند سر بر سنگ

<u>مقبرہ میر انیس</u> :- یہ بلند زمین کوچہ نا فذہ سے بائیں ہاتھ کی طرف ہے جو افتادہ صورت میں ہے میر انیس کی بقیہ سے بھی اس کو شہرت تھی اور قبرستان صرف ایک لانبے دالان کی صورت میں تھا ۔ چالیس برس پہلے ۱۲ ذیقعدہ کو میر نفیس کی مجلس دیسہ میں مجھے شرکت کی نوبت آئی ۔ نواب حامد علی خاں بیرسٹر، نواب مرزا شمس الدین حیدر چھوٹے صاحب عالم بہادر مرحوم اس مجلس میں شریک تھے۔ عارف نے یہ مجلس پڑھی جو اپنے دور میں جانشین اسلاف تھے ۔ اب نہ ایسی صحبت کہیں نظر آتی ہے نہ ایسے پڑھنے والے اس جگہ خاندان انیس کے تمام صاحبانِ کمال سپردِ خاک ہیں جن کے نام اور کلام دنیائے ادب میں آسمان کے درخشندہ ستاروں کی طرح روشن ہیں ۔ خاندان انیس میں ابو صاحب جلیس ایک نامور شاعر تھے جنھوں نے جمادی الاول ۱۳۲۶ھ میں ذائقہ موت چکھا شب عاشور پر ان کے تاثرات ملاحظہ ہوں ؎

شب کی تاریکی تھی ایسی کہ عیاذ آباللہ — شمع کے اشک بھی روتے میں نکلتے تھے سیاہ

شمع نے آنسوؤں سے گو کہ وہ دھو ڈالے تھے — دستِ گلگیر میں جتنے تھے وہ گل کالے تھے

پانی بند ہونے پر کہتے ہیں ؎

دمبدم بادِ صبا خاک بسر آتی ہے — مٹی خیمے میں تیمم کے لئے جاتی ہے

ساقی نامہ فرمایا ہے ؎

نکلی پڑتی ہے مرے نام کی شیشی سے شراب — خم ابلنے کو ہے لے اس کی خبر آ کے شتاب

دلِ رنجور کے مانند ہے ساغرِ بیتاب — خود بخود شیشے سے پیمانے میں مے جا نکلی

لبِ ساغر سے ھنیاً کی صدا آنے لگی

میر و آتشباز:۔ فنون مشرقیہ میں آتشبازی بہت پرانا فن ہے جس کو آج کل کے متمدن ممالک نے بھی اپنی تجارت کا ذریعہ قرار دیا ہے گزشتہ لکھنؤ کی آتشبازی ہیں انار، پھلجھڑی، مہتاب، ہاگنجک، ہوائی، چھچھوندر، پڑاقے، قلعہ گولہ چرخی کون نہیں جانتا تارے چھٹکنے والی ہوائی اور انار چھٹتے وقت ایک پھولا پھلا درخت سامنے آجائے۔ آخر میں موتیوں کا گرنا۔ چرخ کا زمین پر چرخ کھا کر سورج مکھی بن جانا، آسمان پر مور ناچنا، مہتاب سے چاند کا شرمانا، قلعہ چھوٹنے سے طرح طرح کے مناظر اور دیدہ زیب سین گدی کے پڑاقے گلوری نما پڑاقے ست آوازے تانت سے بندھے ہوئے، سن کا پڑاقہ "دو آوازہ" پٹاس کا پڑاقہ۔

چوبداری محلہ:۔ سلاطین اودھ کے ساتھ جو خدمت گذار نوکر رہتے تھے ان کے ہاتھ میں چاندی کے خول چڑھی ہوئی لاٹھیاں جن کو شان و شوکت کے لئے انھیں دے رکھا تھا کسی کو بلانے کے لئے عموماً چوبدار آتا تھا میر انیس ؎

محتاجِ عصا ہوئے تو پیری نے کہا — چلئے اب چوبدار مرگ آیا ہے

اس محلہ میں جو سبزی منڈی کے حدود میں ہے شاہی نوکروں کے مکانات تھے اس لئے چوبداری محلہ مشہور ہوا۔

سامان جنگ:۔ چوبداری محلہ میں عہد واجدی کے مرزا عبدالعزیز رہتے تھے جو ۱۹۲۶ء میں مرے ہیں نظیر آباد میں ان کی دوکان بندوق بنانے کی تھی ایک مرتبہ اس نے دونالی بندوق بنائی۔ کل پرزے، کندہ، نال اپنے ہاتھ سے تیار کئے اور نواب مرزا جعفر علیخاں صاحب رئیس شیش محل کے رد برو پیش کی نواب خود بڑے شوقین اور مبصر تھے یہ بندوق بالکل ولایتی اور مشین میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ نواب نے مرزا مذکور کو کافی انعام دیا اس کا لڑکا بھی آبائی کام سے واقف ہے عہد واجدی میں ایسی توپیں بنتی تھیں جن کا گولہ بارہ کوس جاتا تھا (قدیم ہنر ص ۱۶۸)

میر آغا صاحب مجتہد:۔ مذہب امامیہ کے زبردست اور نامور عالم بڑی رعب دار صورت نورانی چہرہ آصفی مسجد میں نماز جمعہ و عیدین پڑھانے جاتے تھے۔ پورا ہندوستان ان کی عقیدت سے چھلک رہا تھا مسئلہ مسائل اس کثرت سے آتے تھے کہ ڈاک ان کی یکہ پر بار کر کے سبزی منڈی سے گول دروازہ جاتی تھی بڑے خوش خوراک تھے پلاؤ زردہ خانہ ساز دسترخوان پر ہوتا تھا۔ پنجا کرتا کنٹھے دار گلا اور کلیوں دار پہنتے تھے مسلوں کے جوابات صاف دیتے تھے بے علم سمجھنے والوں کو ذرا بھی تکلف نہ ہوتا تھا ایک شخص نے نمازیوں کی صف سے نکل کر جبکہ اقامت ہو چکی تھی پوچھا حضور ڈور لوٹ کر تسبیح گوندھی ہے فرمایا جس کا لنگوا تھا اس نے یہ تو نہیں کہا کر اب چھوڑ دے اگر ایسا ہے تو نہیں ورنہ کیا مضائقہ ہے ۱۱ رمضان ۱۳۲۳ھ آپ کے سفر آخرت کی غمناک تاریخ ہے۔ عزیز لکھنوی

نے "چراغ ہند گل" تاریخ کہی۔

(نوٹ) مضافات چوک کا حال لکھنے کے بعد ہم پھر بازار چوک کی باقی کیفیت لکھتے ہیں اور ملحوظ خاطر رہے کہ چوک کا آباد ترین حصہ وہی ہے جو حیدر حسین کے پھاٹک سے شروع ہو کر مسجد تحسین تک پہونچتا ہے شب برات میں آتشبازی عریضے نوروز میں پنکھے، ستو، رنگین انڈے، گلاب کا پھول، طرح طرح کی مٹھائیاں، نئے پھل، لکھوٹ، کسیرو، لکڑی نذر کے واسطے اسی جگہ بکتے تھے۔

خیراتی حلوائی

تحسین کی مسجد کے سامنے مشہور دوکان تھی جو عہد نصیر الدین حیدر سے کئی پشت تک برقرار رہی اس دوکان کی میدہ والی پوریاں اور کٹے ہوئے آلو دور دور مشہور تھے دو پیسہ کی پوریوں میں اس وقت پیٹ بھر جاتا تھا۔ خیراتی کے بعد اس کا بیٹا مصاحب حلوائی اور آخر میں قدرت حلوائی کے زمانے میں دوکان سات پشت کے بعد ختم ہوئی۔ مصاحب کے زمانے میں شکر ڈھائی آنہ سیر اور حلوہ سوہن بارہ آنے سیر بکتا تھا۔ سہال، شاخیں، برفی، امرتی، جلیبی، گلاب جامن، خرما، نمک پارے، شکرپارہ، کھٹیاں، ریوڑیاں، پاپڑ، حبشی حلوہ سوہن اندرسے کی گولیاں بھچے بالوشاہی، تکتی، سموسے، دال موٹ، کچوریاں، لڈو، بیڑے، رس گلے، نکتیاں، گوجے کھجور کھاجا تیار رہتا تھا کلکتہ، دہلی، بمبئی کے شیرینی فروش سب کے سب مصاحب کے شاگرد ہیں۔

کشوری حلوائی

مسجد تحسین کی دوکانات میں ہندو حلوائی کی بہت بڑی دوکان جس میں دو گھنٹہ رواج کے مطابق نصب تھے اور آدھی رات تک بھٹی گرم رہتی تھی۔ حلوہ پوری اس دوکان کا شہرۂ آفاق تھا اور ۲۴ گھنٹہ بکری رہتی تھی کشوری کا بیٹا جگن ناتھ مدت تک یہ کاروبار انجام دیتا رہا اس وقت چودہ روپیہ ماہوار پر یہ دوکان کرایہ پر اٹھتی تھی۔ اس دوکان کو ختم ہوئے چالیس سال ہوئے ہیں جگن ناتھ کی اولاد ڈالی گنج میں موجود ہے۔

یہی دو دوکانیں وہ ہیں جو ہولی اور نوروز کے دن مٹھائی کی کوٹھی بنانے کے موجد ہیں نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں پہل کس نے کی۔ اور قدیم واقعات میں جنات کی خرید و فروخت بھی ان دوکانوں کا قصہ پارینہ ہے مصاحب حلوائی کے یہاں سیاہ لکڑی کا ایک حیرتناک مصنوعی سانپ تھا جس کے زمین پر رکھ دینے سے چڑیاں ڈر ڈر کے اڑ جاتی تھیں اور صانع نے لکڑی ایسے سخت عنصر میں ایسے مناسب جوڑ قرار دئے تھے جس میں لہر پیدا ہوتی تھی۔

خیراتی کی دوکان پر ایک مرتبہ نوروز کے دن مٹھائی بنی اس پر اشرفی کی تصویر ایک طرف ملکہ وکٹوریہ سر پر چادر اوڑھے ہوئے اوپر تاج، اور دوسرے رخ کا ڈیزائن دوڑتا ہوا شہسوار ہاتھ میں کوڑا، حکومت نے اعتراض کیا اور الزام عائد کیا کہ تم گنی بنانے کا ساز و سامان رکھتے ہو۔ اس وقت سے یہ نو یجاد شیرینی بند ہوئی۔

(نوٹ) کھیلیں اور بتاسے کی چوک میں بکری نہیں تھی۔

نان بائی

عبداللہ مسجد تحسین کے دوکانداروں میں اور رمضانی اکبری دروازہ کی سائڈ میں دو مشہور نان بائی تھے جن کی دوکانیں دو وجہوں سے بہت چلتی تھیں باہر آنے والے سیاح کے لئے چوک کا اختتام اور اس کے خرید و فروخت کا خاتمہ دوسری بانس کی سرار گڈھے والی

سرار اور خود سرائے تحسین کا قریب ہونا مسافر اپنی قیامگاہ سے نکلیں اور کھانا کھا سکیں یا جائے قیام پر پہونچتے پہونچتے کھا پی لیں۔ مسافروں کا ہجوم ہوتا تھا اور نان بائی کو دم لینے کی مہلت نہ تھی۔ مسافروں اور بازاری لوگوں کے ساتھ امیروں کے نوکر جو اپنے مالک کے لئے پسند کی چیزیں لینے آئے ہیں یا وہ گاہک جو کھانا گھر لے جاکر نوش کریں گے۔ نہاری کا پیالہ لئے جارہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دوکان پر ہمہ نعمت موجود ہے کتنی چیزیں فرمائش کے بعد تیار ہوتی ہیں اور تنور دن رات ٹھنڈا نہیں ہوتا شیرمال باقرخانی گاؤزبان، گاؤدیدہ، نانِ خمیری، نان فطیری، نانِ تنک، پھلکا، چپاتی، تنوری، براٹھے، قورے کے پراٹھے، شامی کباب، خطائی کباب، گولر کباب، نرگسی کباب، کوفتے، پسندے، مرغ مسلم، قلیہ قورمہ شش رنگہ، دو پیازہ، تلی ہوئی اروی، یخنی پلاؤ دم عنبر متنجن، دست پیچ، شیربرنج یاقوتی سموسے، شب دیگ، نان جلیبی، سیخ کے کباب، گولر کے کباب، سفیدہ بریانی، نانِ افلاطونی فرمائش پر تیار ملتا تھا۔ نان افلاطونی اس روٹی کو کہتے ہیں۔ جو پھول جانے کے بعد صرف چھلکا مریضوں کو ہلکا سمجھکر دیں پلاؤ کی چالیس قسم باورچیوں نے قرار دی ہیں۔ چوک کے نان بائی کا قاعدہ تھا کہ تنور سے پہلی روٹی اترنے پر ایک آدمی کی خوراک مسجد بھیج دیتا عبداللہ نان پز نے جس کی پیرانہ سالی مجھے یاد ہے ٹرسٹ مسجد تحسین کے کامیابی مقدمہ پر جوڑھویا دیا تھا اس میں ایک پراٹھا تھا جس پر بادام اور پستہ جڑے ہوئے تھے۔ میں نے آج تک اس کی نظیر کسی دسترخوان پر نہیں دیکھی۔ میاں مشیرؔ نے اس زمانہ کے کھانوں کو یاد کیا ہے سہ

اب وہ محل رہے نہ وہ شہزادیاں رہیں　　وہ پیش خدمتیں نہ وہ مغلانیاں رہیں

وہ بوری قند کی نہ وہ اب ماکیاں رہیں　　نہ شیرمالیں خستہ نہ وہ آبیاں رہیں

ٹکڑے ہیں سوکھے ساکھے فقط نان پاؤ کے　　وہ تر بتر طباق کہاں ہیں پلاؤ کے

آزادی کے حامیوں نے کارتوسوں کی طرح ڈبل روٹی کا بھی بائیکاٹ کرنا چاہا تھا کہ اس میں شراب ملی ہوتی ہے مجتہد العصر نے فتویٰ دیا کہ جب تک آمیزش ثابت نہ ہو پاک ہے۔

<u>یونس عطار</u>:- عطار کے معنی در اصل تو عطر اور خوشبو بیچنے والے کے ہیں مگر بازار کی اصطلاح میں دوا فروش کو عطار کہتے ہیں جو طب یونانی کے نسخے اور پڑیا باندھے خطمی، بنفشہ، عرق بادیان، شربت عناب، شربت دینار، معجون کمونی، سکنجبین، زہر مہرہ خطائی غرض تمام یونانی دوائیں جہاں ملیں وہ عطار کی دوکان ہے بوتلیں قرابے مرتبان اچاریوں میں مرکبات تیار ملتے ہوں۔ قرع انبیق سے عرق کھینچتا ہو پتال جنتر اور دوسری ترکیبوں سے طلاء اور لیپ تیار کئے جاتے ہوں چوک کا نامور عطار یونس تھا پھر منجھو صاحب نے فروغ حاصل کیا۔ ان کے کہنے سے لوگ کوئی تھانیدار، کوئی ٹی ٹی کوئی قانون گو اب بھی ہیں پھر شیخ امید علی نے اس پیشہ میں بہت کچھ پیدا کیا اور رفتہ رفتہ ڈاکٹری دواؤں کے فروغ نے اس تجارت کو گویا ختم کردیا۔ میر تقی میرؔ کو عطار کی دوکان پر جاکر بجائے فائدہ کے سعدی والا روگ ستاتا تھا سہ

میرؔ کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب　　اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

آتشؔ کہتے ہیں سہ

وہ تنگ مشرب ہیں ہم میخانہ افلاک میں　　نشہ زر ہو پئیں گر شربت دینار کو

سہ گزشتہ لکھنؤ

(نوٹ) اکبری دروازہ میں پنجہ بند اور تصویروں کا فریم بنانے والے کچھ جنرل مرچنٹ اور دوسرے قسم کی دوکانیں تھیں جو قابل ذکر نہیں ہیں شیشے کے چوکھٹوں میں طغرے اور نسخ و نستعلیق کے قطعات راہگیروں کے لئے نظر افروز تھے اور میر خادم حسین جواد حسین کی دکان پر ایرانی ٹرکی اور کشتی دار ٹوپیاں فروخت ہوتی تھیں۔ کلاہ گول چکن کلاہ سوزنی، کلاہ چکن، دوپلڑی کلاہ کشتی دار ریشم اور کلابتو کی چوک کی دوسری دوکانوں پر دستیاب ہوتی تھی۔

اکبری دروازہ

یہ تو نہ کہوں گا کہ چوک کی پہلی بنیاد ہے اس لئے کہ چوک کا تصور تو نوابی میں ہوا اور یہ نوابی سے کچھ اوپر دو سو برس کی بنیاد ہے۔ جلال الدین اکبر ربیع الآخر ۹۶۳ھ لاہور میں تخت حکومت پر آیا اور ۱۰۱۴ھ میں موت کی نیند سوگیا۔ دوران سلطنت میں یہاں کا صوبیدار جواہر خاں دہلی میں رہتا تھا نگران کا نائب قاضی محمود بلگرامی یہاں کا باشندہ تھا اور اکبری دروازہ اسی نے بادشاہ کے نام پر بنوایا اب اس دروازہ کو چوک کی آبادی کے لحاظ سے چوک کی آخری حد کہو۔ یہ دروازہ زمین کے نشیب و فراز کے لحاظ سے پست زمین پر واقع ہے مگر گول دروازہ سے رفعت میں اونچا ہے وجہ تعمیر میں جو واقعات زبان زد ہیں ان کا تاریخ میں کہیں ذکر نہیں ہے لیکن یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ سزائے موت کے جرم میں جب گردن زدنی کی نوبت آتی تو مقتول کا سر اکبری دروازہ ہی میں لٹکایا جاتا غلام علی ابن محمد اکمل خاں اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔

در وقت نواب جنت مکان راجہ جب بدر شورشہا برانگیخت ہر چند عمال و دیگر رسالداران زنگ سعی نمایاں ریختند بدست نہ آید ۱۱۹۵ھ از ترک سواران آں سر راجہ دار آویزاں ماندن او چند روز برائے تہدید و عبرت در اکبری دروازہ است[1]۔

یہ واقعہ عہد نواب سعادت علی خاں بہادر کا ہے اور جو نالہ اکبری دروازہ کے نیچے بہہ رہا ہے اس کو سر کٹا نالہ آج تک کہتے ہیں یہ تاریخی نوٹ تو بے شک بتاتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس جگہ مجرم کا سر کٹ کر دور اکبری میں آویزاں ہوا ہو اور امرائے اودھ نے اپنی حکومت میں اس روایتی حکایت کو باقی رکھا۔

نجابت حسین خاں عظیم آبادی نے عہد امجد علی شاہ میں اکبری دروازہ کے بارے میں لکھا ہے یہ دروازہ بہت بلند اور کشادہ ہے اس کے دکھن جانب نالہ واقع ہے جن شاہی مجرموں کو خونریزی یا فتنہ انگیزی کے جرم میں قتل یا پھانسی کی سزا ملتی ہے وہ اسی نالہ میں کیفر کردار کو پہونچائے جاتے ہیں اور ان کے جسم کو دروازہ کی محراب میں لٹکا دیا جاتا ہے مملکت کے دیگر حصوں سے متمردوں اور مجرموں کے سر آتے ہیں انھیں بھی اسی دروازہ میں لٹکایا جاتا ہے تاکہ شہر کے لوگوں کے لئے باعث عبرت ہو چند قدم اور آگے بڑھ کر اسی بلندی اور شان کا دوسرا دروازہ ہے ان دونوں دروازوں پر چھت پاٹ دی گئی ہے جس سے راستہ مسقف ہوگیا ہے۔ (نیا دور مئی ۱۹۶۰ء)

اکبری دروازہ میں دونوں طرف بلند کرسی کی دوکانیں جس میں سلف سے آج تک مٹی کے کھلونے اور تصویریں فروخت ہوتی ہیں دوکان کا روکار بر دو سمت بلند زینہ ہے جس پر خوبصورتی سے مجسمے چنے ہوئے ہیں آدمی، جانور، پھل، ترکاری سبزی دوکانات کی سینری، کوئی کاروبار باقی نہیں رہ جس کی تصویر یہاں نہ ہو۔ لوہار کی دوکان، طوائف کا ناچ سارنگی طبلہ، سقہ مشک پیٹھ پر رکھے ہوئے خربوزے، تربوز، سنگھاڑے، بیاہ کی گھٹی، بادام پھٹے بنائے۔ یہ صنعت لکھنؤ کے سوا کسی شہر میں نہ ملے گی یہاں سے پیکٹ میں رکھ کر دور دور

---

[1] گزشتہ لکھنؤ ص ۔ [2] عماد السعادت ص ۱۲۳ طبع نولکشور۔

تحفہ میں لے جاتے ہیں ؎

نہ طفل بن، نہ دلا محو حسنِ صورت ہو　　کھلونے مٹی کے کرتے ہیں بے شعور پسند　(آتش)

مٹی کا دوسرا سامان بھی ان دونوں دوکانوں پر ملتا ہے سفالی کے پیالے اور روغنی چلم بڑے حقہ کے قابل یہاں سے خریدو یہ کام اس قدر نازک، باریک اور خوبصورت ہوتا ہے کہ اگر چلم ٹوٹ جاتی ہے تو مالک کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ تمنّا مرحوم کسی دوست کے حقہ کی چلم ٹوٹنے پر کامل تاثر سے کہتے ہیں ع ٹوٹی ہے مثل دل یہ چلم آہ آہ (۱۳۳۳ھ) نجم الغنی مورخ اودھ کی وہ خامہ فرسائی جس سے نہ عوام خوش ہیں نہ خواص۔ اس فہرست الزامات میں یہ بھی ہے کہ سعادت خاں برہان الملک نے جب لکھنؤ پر حملے کا ارادہ کیا تو کئی مہینہ اپنی فوج کو لئے ہوئے اکبری دروازہ کے سامنے جانب جنوب ٹھہرے رہے اور دعوت کے حیلہ سے تمام شیوخ کو جمع کرکے دسترخوان سے اٹھتے وقت حملہ کردیا لوگ قتل ہوئے اور سرغنہ گرفتار ہوا لکھنؤ پر پہلے حملے کی سرگزشت پنج محلہ کے ذیل میں آئندہ آئے گی۔ ناظرین انتظار کریں۔

بانس کی سرائے

دوکانات مسجد تحسین کے سامنے اس سرا کا پھاٹک تھا۔ ایک مسجد دروازہ سے قریب تھی جو اب بھی نئے لباس میں اچھی حالت سے موجود ہے اور دوسری مسجد سرا کے آخری حصہ میں اگلی ساخت میں اب بھی موجود ہے۔ اس سرا میں داخل ہوکر مغرب پچھم کی طرف ایک دروازہ تھا جس سے ٹھہرنے والے واپس ہوتے تھے اور یہ کوچہ غیر نافذہ سمجھا جاتا تھا اس سرا میں زیادہ تر کابلی لوگ اترتے تھے جو ہینگ زعفران، مومیائی، فیروزہ، ممیرہ وغیرہ بیچتے تھے اور سودی روپیہ چلاتے تھے دس کے بارہ قرضداروں سے لینا ان کا کاروبار تھا۔ سینٹرل روڈ نکلنے پر یہ سرا کھد گئی اور چوک کو وکٹوریہ اسٹریٹ سے ملحق کردیا اس سڑک کے بعد مسجد تحسین کا دکھاؤ بازار سے بڑھ گیا۔

بانس کی سرا نام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں بیچ کی سرا کا ایسا چوبی پھاٹک نہ تھا صرف بلیوں اور بانس سے دروازہ بنایا تھا اور ضعیف امکان یہ ہے کہ بانس کی سرا نام قرار پانے کی وجہ یہ ہو کہ بانسواڑہ جس کا تاریخ اودھ اور آثار قدیمہ میں بار بار ذکر ہے یہی آراضی ہو۔

مطبع ولی محمد:- عہد شاہی کے چھاپہ خانوں میں مطبع حاجی ولی محمد مشہور پریس تھا جس کے مطبوعات دیدہ زیب اور صحت وطباعت کے لحاظ سے ممتاز تھے ایک وقت یہ مطبع بانس کی سرا میں تھا چنانچہ تحریر الشہادتین ایک کتاب اس پریس کی چھپی ہوئی میرے کتب خانہ میں ہے جس پر عبارت لکھی ہوئی ہے "مطبع ولی محمد چوک قدیم لکھنؤ متصل دروازہ سرائے بانس قدیم آثار میں ایک مکان باقی ہے جس کے درجے امام باڑہ کی طرح ہیں اور اس میں تمباکو خوردنی کا کارخانہ ہے۔

مزار اصفہانی

اکبری دروازہ سے بڑھ کر سینٹرل روڈ کے بائیں گوشہ میں بلندی پر ایک چھوٹی سی مسجد اور صحن مسجد کے پچھم کی طرف وہ محراب ہے جس کے بالائی حصہ خانۂ خدا کی انگنائی میں شہید مرد کی قبر ہے۔ سڑک نکلنے سے پہلے زمین تعویذ قبر کے برابر بلند تھی۔ سینٹرل روڈ نے قبر کو بلندی پر پہونچایا اور لوح مزار کو بجائے سطح قبر کے حصہ زیریں میں نصب کیا غربی محراب پر ہار چڑھانے کا طاقچہ اور ایک پتھر نصب ہے جس پر یہ لکھا ہے۔

" دوست محمد ولد عوض علی اصفہانی در جنگ بانسواڑہ شہید شد در سنہ یک ہزار و یک صد و یک " ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک چھوٹا سا قبرستان تھا چنانچہ اس قبر کے جواب میں دوسرے گوشہ زمین پر بھی کچھ پرانی قبریں موجود ہیں جن کو سڑک نے چپ و راست چھوڑ دیا ہے۔ سڑک مذکور کی تعمیر میں جو قبر کھل گئی تھی اور بے شمار آدمیوں نے دیکھا کہ میت کفن پوشش موجود ہے اور خوشبو تیز پھیل رہی ہے جنگ بانسواڑہ کی لفظ تو یہ بتاتی ہے کہ یہ قتل دو شخصوں کے دست و گریباں ہونے سے واقع نہیں ہوا بلکہ رزمگاہ کا تصور کرنا پڑتا ہے کتاب وفیات الاخیار میں بھی مرنے والے کا بغیر سنہ وفات ذکر ہے اور یہ واقعہ آخر عہد اورنگ زیب کا ہو سکتا ہے۔ پونے تین سو برس پہلے میت کو ایک دور کی جگہ سے بڑی دور دفن کرنے کے ذرائع نہ تھے اس لئے یہ رجحان ہوتا ہے کہ بانسواڑہ شاید یہی جگہ تھی کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ عہد جلال الدین اکبر میں کاکوری سے اکبری گیٹ تک بانس کا جنگل تھا آخری چشم و چراغ سلطنت مرزا برجیس قدر کی تاجپوشی کے سلسلے میں بھی تاریخ میں لفظ بیسواڑہ آتا ہے۔ لکھنؤ کے قریب باغی لوگ تین طرف آ گئے تھے عامل و ناظم بدستور رہے مگر علاقہ بیسواڑہ کا رانا بینی مادھو سنگھ تعلقہ دار کے نام بندوبست[1] کر دیا۔ ان کے بعد اس علاقے کا ناظم مادھو[2] بخش کو لکھا ہے اور پھر صفدر[3] علی خاں اور راجہ ہیرالال کو منتظم بنایا ہے۔ کئی بار عہدہ دار کی تبدیلی شورش عام کا ثبوت ہے تاریخ میں چوتھی جگہ جن الفاظ میں ذکر ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بسواڑہ محمود آباد سے قریب ہے اور وہاں سے سیدھا راستہ بونڈی[4] کی طرف جاتا ہے اور صاف طور پر واضح نہیں ہوتا کہ بانسواڑہ کہاں تھا۔

حمام کی گلی :- اکبری دروازہ کے نیچے پہونچتے ہی داہنے ہاتھ کی طرف جو کوچہ ہے وہ حمام کی گلی مشہور ہے اور کہیں نہ تو تاریخ سے حمام کا پتہ ہے نہ آثار قدیمہ سے، بظاہر اس عہد میں حمام تھا جس کے آثار بالکل فنا ہو گئے یہ گلی امام باڑہ ممتاز العلماء تک پہونچکر باغ میں راہگیر کو پہونچاتی تھی اب یہ راستہ بند ہے اور آثار قدیمہ میں نواب جھوا کی مسجد جو ایک چھوٹی عمارت ہے باقی ہے جس شخص کی اولاد زندہ نہیں رہتی اس کے پیدا شدہ بچے کو مہترانی کے جھوے میں رکھ کر اس کا بیٹا جینے کے لئے قرار دیتے تھے اور یہ ٹوٹکا عورتوں میں تیزی سے مقبول ہو رہا تھا۔ نواب جھوا ایک وثیقہ دار باعزت چھوٹے رئیس تھے ان کی مسجد میں شہزادہ منجھلے مرزا صاحب جو بڑے منطقی مگر شکی مزاج آدمی تھے غوطہ طہارت میں مصروف رہتے تھے ۱۹۱۵ء کے بعد یہ مسجد محلہ کے مسلمانوں کے قبضے میں آئی۔ اس علاقہ میں کچھ ڈھاڑی اور ایک جوہری رہتے تھے جن کا مکان مسجد سے ملا ہوا تھا جواہرات پرکھنے میں آخری شخص تھے اور نواب بندگا کا بھی یہی محل سکونت تھا۔

نواب بندگا :- رؤسا کے مزاج میں عموماً ہٹ اور مردانگی ہوتی تھی ان کو عام طور پر سلام کے جواب میں اگر کوئی بندگی کہتا تھا تو لفظ میں تانیث کی جھلک معلوم ہوتی تھی اس لئے ان کے زمانے میں بندگی کو بندگا کہا گیا اور اس وقت کی ذہنیت کے مطابق ان کا نام ہو گیا۔ لکھنؤ میں سلام کی جگہ آداب تسلیمات اور کبھی تسلیم، کورنش، مجرا، آداب عرض ہے یا فقط تسلیمات لفظیں استعمال ہوتی تھیں۔ سلام علیکم کا رواج فقط علماء میں تھا۔

لکھنؤ میں کتنے مقامات ایسے آئیں گے جہاں حمام کا اب بھی کچھ اثر باقی ہے مگر یہ گلی مرقومہ بالا خصوصیات پر حاوی ہونے کے حمام کا نشان بھی نہیں بتاتی۔

حمّام :- حمام کے لئے حوض ٹھنڈے اور گرم پانی کے علیحدہ علیحدہ تیز گرم پانی کا چھوٹا حوض جس میں شدت حرارت سے اترنا ناممکن ہو اس کے

---

[1] احسن التواریخ ص۱۰۱ [2] ص۱۰۱ منہ [3] احسن التواریخ ص۹ منہ [4] ص۱۰۱ منہ

نیچے آہنی توا اور آگ کی بھٹی جس کا منہ بیرون دیوار۔ اندرونی حصے کے سامان میں کھڑاویں، لنگیاں، تولیے، جھانواں، کھیا، بیسن، صابن حسب ضرورت اور اس گرم حجرے سے جہاں ہوا کا کہیں گذر نہ ہو نکل کر جامہ خانہ آنا وہاں شیشوں سے روشنی اور معتدل فضا، چٹائی پر لنگی اتارنے کی جگہ اور سوکھی لنگی پہن کر فرش پر قدم رکھنے کی چوکی نما بلندی جس میں آئینہ الگنی اور کھونٹیوں کا ہونا ضروری، حمامی جو مشت مال بھی کرتا جاتا ہے یہاں پہونچ کر صاف کپڑے پہن کر نہلوائی لے گا اور حمام اگر گرم نہ ہو تو حمام نہیں الٹا کہتے ہیں ؎

گرم ایسا بھی نگوڑا کوئی حمام ہو نوج — آگیا تیری رضائی میں پسینہ مجھ کو

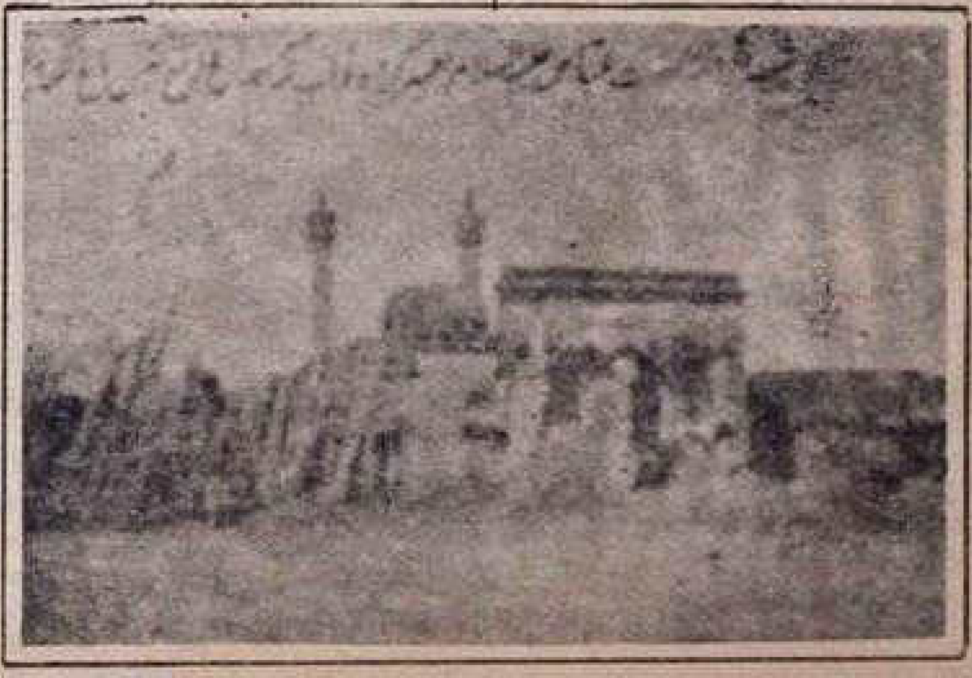

دوسرا باب

از محمود نگر تا چھاؤنی حسین الدین خاں

گزشتہ صفحات سے معلوم ہوا کہ قاضی محمود خاں کو جواہر خاں نے نائب صوبہ دار قرار دیا تھا اور وہ بحیثیت حاکم لکھنؤ میں افسر تھے محمود نگر انھیں کا بسایا ہوا محلہ ہے اس محلے میں غازی الدین حیدر بادشاہ کی بیگم حسینی خانم سرفراز محل رہتی تھیں۔ غدر سے پہلے بیگم کا قیام پنج محلہ مچھی بھون میں تھا۔ جب عمارت مذکور پر انگریزوں نے قبضہ کیا تو سرفراز محل نے محمود نگر میں ایک عالیشان عمارت بنوائی اور ۲۰ اکتوبر ۱۸۴۹ء کو ستر برس کی عمر میں ذائقہ موت چکھا شاہ نجف میں دفن ہوئیں میر مونس نے ان کے چالیسویں کی مجلس پڑھی۔ انقلاب زمانہ دیکھو مرنے والی کے تمام جواہر خوانوں پر رکھ کر نوکر چاکر لے گئے۔ یہ محل سرا اب باقی نہیں ہے مگر سرفراز محل کا وہ روپیہ باقی ہے جو انھوں نے کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف میں بانٹنے (تقسیم) کے لئے وقف کیا تھا عراق میں "خیریہ اودھ" اس فنڈ کا نام ہے اور مرد و عورت طالب علم اور مسافر اس رقم سے پرورش پاتے ہیں یہاں علی مد کے ایک کامل پٹہ باز میر فضل علیؒ رہتے تھے جن کا نام تاریخ میں موجود ہے۔

مطبع مصطفائی :۔ عہد شاہی کے بہترین چھاپہ خانوں میں مصطفائی پریس تھا جو محمد مصطفیٰ خاں ولد حاجی روشن خاں کے اہتمام سے جاری تھا اس پریس کے مطبوعات زیادہ تر درسی کتابیں ہیں جو لکھائی چھپائی کے لحاظ سے کیا کہنا۔ لٹریچر پر مطبع کا ذکر ان الفاظ میں ہے "در بیت السلطنت لکھنؤ محلہ محمود نگر زیر اکبری دروازہ طبع شد" راجدھانی لکھنؤ محلہ محمود نگر میں اکبری دروازہ کے نیچے چھپکر تیار ہوا

مصطفیٰ خاں شیشے کے بڑے تاجر تھے پتھر پر معکوس لکھنا انھیں کی ایجاد ہے اصلاح سنگی کو فروغ بھی مصطفیٰ خاں نے دیا۔ مصطفیٰ خاں کی حاج الحرمین سے ملاقات میرے نزدیک صحیح نہیں۔

مصطفائی مطبع پر محمد زکریا نامی کسی عالم کے حاشیے بھی ہیں جو مرد فاضل تھے بڑے سلیقہ اور انتہائی خوبصورتی سے یہ مطبع اپنے فرائض انجام دیتا تھا ۱۲۵۹ھ میں اس مطبع کے فروغ کا زمانہ تھا عبدالعزیز روڈ پر جاتے ہوئے ترنجن کی ٹھیکی کے پاس جو لکھوری اینٹوں کی دیواریں باقی ہیں اس بلند حصہ زمین پر پریس تھا۔

مطبع مرتضوی :۔ عہد شاہی کے علم افروز زمانہ میں جا بجا مطابع تھے اور لاتعداد عالم فاضل عربی فارسی کے فروغ میں مصروف تھے مطبع مرتضوی کو محمد نصیر الدین دہلوی نے اس محلہ میں جاری کیا تھا لٹریچر پر پتہ یہ ہے "محمود نگر متصل چاہ سرخ" اب لال کنوئیں کا تو کہیں پتہ نہیں ہے

۱؎ گزشتہ لکھنؤ صفحہ ۱۲۹ مؤلفہ عبدالحلیم شرر و قدیم ہنر و ہنرمندان اودھ

پریس کے کاتب مولوی الٰہی بخش تھے جن کا نسخ و نستعلیق دیکھنے کے قابل تھا مولوی محمد صالح شوق کاپی کی صحت کرتے تھے ان کا نمونہ کلام اس قطعہ تاریخ میں واضح ہے ؎

گشت چو میر قطبی ز نصیر الدین طبع — شوق پر سید چو سالش زخرد گفت شوق
عرض احسنت شد از کلی و جزی مسموع — فن منطق شد از میر بہر دل مطبوع
۱۲۶۱ھ

اس پریس کا وجود ۱۳۱۱ھ تک تھا چنانچہ سلم الافلاک سنہ مذکور کی طبع شدہ جو میرے سامنے ہے اس میں یہ عبارت درج ہے۔

فی البلدۃ المشہورۃ بالکھنؤ محمود نگر حفظ اللہ عن الفساد والشر

تکیہ:۔ اس محلہ کے آثار قدیمہ میں مذکورہ بالا دیوار اور ایک چھوٹا سا قبرستان باقی ہے جو ۱۲۱۵ھ عہد نواب سعادت علی خاں میں مرزا انور بیگ خاں خلف مرزا مغل بیگ خاں نے اپنے کنبے کے دفن کے لئے محدود کیا تھا دو پرانی مسجدیں ہیں ایک قبرستان سے متصل دوسری بلند دیوار کے آغاز میں۔

امام باڑہ حیدری:۔ یہ وہ امام باڑہ ہے جس کو حیدر جان طوائف نے آخر عہد واجد علی شاہ میں بنوایا تھا چپ تعزیہ کے بعد کسی دن اتوار کو یہاں ایک محفل سرور بڑی دھوم سے ہوتی تھی اس وقت امام باڑہ ذاتی استعمال میں اور محفل بند ہے۔

کلن خاں:۔ محمود نگر کے رہنے[1] والوں میں عہد واجدی کے کلن خاں غدر کے بعد مرے وہ معمولی پتھر کے دانہ کو صاف کرکے ایک سوا ایک دانہ کا کنٹھا بناتے تھے جو ان کے ہاتھ میں رہتا تھا جس نے دیکھا وہ یہی سمجھا کہ سلیمانی پتھر ہے بڑے بڑے جوہری پہچان نہ سکتے تھے وہ دو پلکا ایسا بناتے تھے کہ ماجان نقد دھوکا کھاجاتے تھے سیکڑوں دو پلکے بیچ بہ کر بیچے بمبئی والوں کو منہ پٹوا دیا بے مثل کاریگر تھے دو رتی کے نگینہ کو کئی رتی کا بنا کر بیچ لیتے تھے۔

قائم علی بھانڈ:۔ عہد واجد علی شاہ کا باکمال نقال تھا جو اسی محلہ کا رہنے والا تھا نواب علی نقی خاں مع اپنی زوجہ کے قائم کی سبیل دیکھنے آئے۔ ان معززین کو دیکھتے ہی قائم سامنے آیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا کہ خدا نواب صاحب کو سلامت اور بیگم صاحب کو قائم رکھے۔ اتنا سخت فقرہ تھا مگر انعام دینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ قائم کا کمال یہ تھا کہ ایک مرتبہ ساڑھے تین گھنٹہ تک منہ بناتا رہا۔ ہر دفعہ[2] کا موشن دوسرے سے جداگانہ تھا۔

نواب حیدر خاں بنگش:۔ پہاڑی ملکوں کے رہنے والوں کو بنگش کہتے ہیں دہلی میں پل بنگش ایک مقام اب تک ہے آپ فرخ آباد کے پیدا شدہ عہد سعادت علی خاں میں لکھنؤ آئے شہسواری میں کمال رکھتے تھے کیسا ہی گھوڑا کیوں نہ ہو بغیر رکابوں کے فوراً سوار ہو جاتے تھے ان کی قوت کا یہ عالم تھا کہ دو زبردست جوانوں کے سر ٹکرا کر دونوں کو مار ڈالتے تھے کانسہ سر چور ہو جاتا تھا آپ کا معمول تھا کہ روز ورزش کے بعد لوٹا بھر دودھ ایک سانس میں پی جاتے تھے وہ تانبہ کا لوٹا مؤلف قدیم ہنر نے خود دیکھا اس پر لکھا ہے

"حیدر خاں ۱۲۶۱ھ یہ زمانہ عہد امجد علی شاہ کا ہے لوٹے کا وزن ڈھائی سیر اور چھ سیر تین پاؤ آدھی چھٹانک پانی اس میں آتا ہے"

حیدر خاں غدر ۱۸۵۷ء میں مع اپنے اکلوتے نوجوان فرزند کے جن کا نام محمد غضنفر خاں تھا کاکوری روڈ[3] پر قتل ہوئے۔

مطبع چشمہ فیض اس محلہ کا آخری پریس تھا ۱۲۹۶ھ میں نادر حسین خاں نے یہ چھاپہ خانہ جاری کیا۔ عطائی نامہ اس پریس کا

---

[1] قدیم ہنر ص۱۹۰ [2] قدیم ہنر ص۸۲ [3] قدیم ہنر ص۱۴۷

مطبوعہ میرے سامنے ہے۔

سر کٹا نالہ

اس نام سے اکبری دروازہ کے بعد ایک محلہ آباد ہے اور آدھے شہر کا گندا پانی نالیوں سے ہو کر یہاں گرتا ہے حکیم عبدالعزیز روڈ نے اس شہر کو رونق بخشی ورنہ دن کو سیار بولتے تھے محلہ کی آبادی کی پہلی بنیاد یہ سڑک ہے اور شہریت کا لباس پہنانے والے خان بہادر احمد حسین تھے جن کے مکانات، کوٹھیاں، کارخانہ تمباکو عہد شاہی کے مکانات اور ایک قبرستان کہنہ کی جگہ بنے اور گندگی بڑی حد تک دور ہوئی۔ کارخانہ تمباکو کی پشت پر اس نالہ کی جو شاخیں یہاں سے کالی جی کے مندر تک گئی ہیں وہ دونوں طرف سے خام زمین ہونے کی وجہ سے فقط پست طبقہ کے کچے مکانات' چھپر' کھپریل میں رہنے والوں کے خاص ہو کر رہ گئیں۔

سر کٹا نالہ اس وقت ایک چوراہہ ہے ایک راستہ کوچہ میر آنیس کی طرف اور دوسری راہ محمود نگر کی طرف اور پورب کے رخ پر سینٹرل روڈ اور جنوبی پہلو میں چوپٹیوں کی سڑک ہے یہاں پہونچکر شہر کی پستی اور بلندی کا کامل فیصلہ ہوتا ہے کیننگ اسٹریٹ سے وکٹوریہ اسٹریٹ پست واقع ہے اور وکٹوریہ اسٹریٹ سے چوک نیچے پر ہے اور چوک نسبتاً چوپٹیوں سے بلندی پر ہے برسات میں نالہ کا زور اور پانی برسنے وقت خطرناک بہاؤ ہوتا ہے۔

نوابی سے چوک شہر کا سینٹر تھا اور سزائے موت پانے والے مجرموں کا سر قلم کرکے عبرت کے لئے اسی علاقے میں لٹکایا جاتا تھا۔ اسی لئے سر کٹا نالہ مشہور ہوا مشہور ہے کہ پہلا سر لکھنا پاسی کا جو ایک قول کی بنا پر ڈاکو تھا عہد اکبر میں اکبری دروازہ میں لٹکا تھا اور بادشاہوں میں یہ قانون ہو گیا کہ سر اسی دروازہ میں آویزاں ہو۔ ظریف کہتے ہیں ؎

تمنا ہے کسی کی تیغ ہو اور اپنی گردن ہو پھر اس کے بعد یارب سر کٹے نالے میں مدفن ہو

<u>سید کا اکھاڑہ</u>:۔ لکھنؤ کے نامی پہلوانوں میں دو بھائی چھوٹے سید اور بڑے سید گذرے ہیں نالہ پر پچھم کی سمت ان کا اکھاڑہ تھا جس سے سیکڑوں ہندو مسلم ورزش کرکے پہلوان بن کر نکلے۔ اس اکھاڑے کے نزدیک مسجد کے اب بھی کچھ کچھ نشان باقی ہیں یہ دونوں کشتی کے فن میں اپنے زمانے کے چاند سورج تھے۔

بڑے سید چھریرا بدن میانہ قد بلا کے پھرتیلے اور کھیر لگانے میں طاق، ان کی پہلی کوشش میں دیو پیکر پہلوان زمین پر جم نہیں سکتا تھا نواب اصغر حسین فاخر مرحوم رئیس نرہی اور شہر کے دوسرے روسا ان کے قدردان تھے۔ بڑے سید ادھیڑ عمر سے پہلے مر گئے چھوٹے سید دراز قامت تومند اور صورت سے پہلوان معلوم ہوتے تھے ان کے داؤں پیچ میں بھی چھوٹے بڑے کا فرق تھا بڑھاپے تک زندہ رہے آخر میں اونچا سننے لگے تھے اور یکم جنوری ۱۹۳۳ء کو وہ بھی ملک عدم کی طرف چلے گئے اخبارات نے ان کی موت پر نوٹ لکھے ؎

کہیں اکھاڑے ہیں کرتے ہیں پیچ کشتی گیر کہ ٹھوک ٹھوک کے خم لڑتے ہیں جواں سے جواں

<u>احمد حسین تمباکو والے</u>:۔ یہ کارخانہ اپنی دیانت و مال کی عمدگی اور نفاست سے ملک بھر میں مشہور اور لمیٹیڈ ہے تمباکو سازی کا فن اصغر علی محمد علی کی فرم کا ایک جز تھا خان بہادر موصوف نے جب اس فن کو اپنایا اور تجارت میں انفرادی صورت اختیار کی تو چپہ چپہ میں یہ تمباکو مشہور ہو گئی بانی کارخانہ نے چار برس ہوئے انتقال کیا۔ ان کی تاریخ وفات اس مصرعہ سے ظاہر ہے ع

سوئے سعدی رفت تمباکو فروش ۱۹۵۵ء

<u>میر نیولا</u>:۔ مرکٹے تلے پر ایک دبلے پتلے لانبے غریب شخص رہتے تھے جن کو ان کے لاغر اندام ہونے سے لوگ میر نیولا کہتے تھے یہ پیرنے میں لکھنؤ کی آخری فرد تھے جہلم کے پہلے یا بعد ایک مجلس کرتے تھے جس میں ان کے احباب کا ہجوم ہوتا تھا لکھنؤ میں انسان کی شہرت کا مدار مجلسی زندگی پر تھا لوگوں کو مدعو کیا اور کوئی پھبتی ہو گئی نام لوگ بھول گئے۔

<u>خاندان برچھیت</u>:۔ نیزہ باز کو لکھنؤ میں برچھیت کہا جاتا تھا اور برچھا عموماً پیادہ اور سوار دونوں چلاتے تھے بعض صاحبانِ فن نے اس لڑائی کے لئے اونٹ کی سواری قرار دی تھی۔ چنانچہ بیکانیر کے شتر سواروں کی نیزہ بازی کا جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں اخبارات میں تذکرہ آچکا ہے۔ سلطنت اودھ کے ابتدائی دور میں میر محمد علی عرف میر کلو زبردست برچھیت تھے ان کے چھوٹے بھائی میر احمد علی بھی استادِ فن تھے یہ لوگ نواح لکھنؤ میں موضع خیر لیسہ کے رہنے والے تھے اور خراسانی سید تھے جار تیام کی وجہ تسمیہ خیر لیسہ اسی لئے تھی کہ وہ مہاجر خراسان سے آکر بسے تھے اور آصف الدولہ بہادر کی سلطنت میں ان کے قدم پہلے پہل آئے۔ عہد نواب سعادت علی خاں میں کمالات نے معراج کمال پر پہونچایا اور مصاحبت کی عزت حاصل ہوئی فن شالوطری و شہسواری اور نیزہ بازی میں ان کا جواب نہ تھا نواب سعادت علی خاں فرمایا کرتے تھے کہ ہندوستان میں صرف ۲½ سوار ہیں پہلے وہ خود دوسرے میر کلو اور آدھے آغا ابو نعیم جو نواب کے بھانجے تھے۔

دہلی سے ملک نیدا شہسوار جب مقابلے کو لکھنؤ آئے تو کمالات کے مظاہرے میں میر کلو ان سے برتر ثابت ہوئے اور شکست دے کر لکھنؤ کی دہلی پر فضیلت ثابت ہوئی اور خلعت فاخرہ اور خصوصی انعام واکرام سے وہ سرفراز ہوئے۔

دوسرے مقابلے میں ان کے بھتیجے میر برکت علی نے یاسین خاں دکھنی کو نیزہ بازی میں شکست دے کر نام کیا۔

میر کلو لاولد تھے ان کے بھائی میر احمد علی کے تین بیٹے تھے میر کاظم علی برچھیت اور میر ہدایت علی و میر برکت علی یہ سب نوابین و سلاطین اودھ کے مقرب اور پہلو نشین تھے میر کاظم علی مرکٹے تلے پر رہتے تھے اور لکھنؤ کے ہر طبقے میں ان کے شاگرد پھیلے ہوئے تھے۔ میر ببر علی انیس پھیکتی میں میر کاظم علی کے شاگرد رشید تھے ع "اک طول عمل ہے نیزہ خطی کا ہلانا" انیس کے تاثرات کا آئینہ ہے۔

میر کلو صاحب کے سلسلے میر احمد صاحب برچھیت ریاست امہوڑا ضلع فیض آباد میں نوکر تھے اور ذاتی کمالات و نسلی خصوصیات میں قابل فخر تھے۔ امہوڑا، فیض آباد اور گورکھپور کی سرحد پر پانچ لاکھ کی ریاست تھی میر احمد صاحب کی اولاد کا ذکر لوہے کے پل پر پہونچ کر ملے گا۔

مشرقی فنون میں ورزش کے بھی اچھے اچھے طریقے تھے اور کثرت کرنے والا نوجوان کبھی مغلوب نہیں ہو سکتا تھا مگر استاد کی نصیحت تھی کہ دشمن سے پہل نہ کرنا۔ ایک کامیاب طریقہ لڑنے کا "باندرا" تھا جس میں تین لٹھ اوپر اور ایک نیچے لگا رہتا ہے۔ اس سے بڑے بڑے جتھے دشمن کے شکست کھا جاتے ہیں لکھنؤ میں اس فن کے ماہر تھے اور سادات گوپال پور ضلع سارن نے اس فن میں خاص کمال پیدا کیا تھا۔

ایک اور طریقہ لڑنے کا یہ تھا کہ جب چاقو لے کر نکلنا ممنوع ہو لاٹھی ناجائز ہو، ہتھیار ساتھ نہ ہوں اس وقت مخروطی شکل کی دو لکڑیاں شیشم کی اپنے ہاتھ کی مٹھی کے برابر کھرادی سے تیار کراؤ اور وہ بالکل اوسط شکل کی گاجر کے برابر ہوں اس کی نوک سے ماہر فن صفوں کو چیرتا ہوا خیریت سے نرغے سے نکل جاتا ہے اس فن کے آخری جاننے والے مرزا مظفر حسین مرحوم جونپوری تھے موصوف نے پاٹہ نالہ

کی کھرادیوں سے نقش امن کے زمانے میں اپنی حفاظت کے لئے جوڑی تیار کرائی تھی۔

ناظم علی رفوگر :۔ رفوگری کا فن لکھنؤ میں کشمیری شال کے ساتھ ساتھ پہونچا اور یہاں ایک سے ایک بہتر رفوگر تھا جو کپڑا لگے ہوئے کپڑوں پر داغ دوزی بہترین طریقے سے کرتے تھے چوک میں کئی رفوگر تھے مگر سر کٹے نالے کے ناظم علی پستہ قد لاغر نازک اندام کم سخن بہت بوڑھے شخص تھے جو صرف رفو ہی نہیں کرتے تھے بلکہ پھول اور پتیاں پھٹے ہوئے دوشالہ پر بناتے تھے اور رنگ میں رنگ ملا دیتے تھے شوال ۱۳۳۲ھ تک زندہ تھے۔

اس حلقہ کے مشہور لوگ

طومار میں "محلہ محمود نگر و نخاس و سرٹک" کا عنوان قائم کرکے حسب ذیل لوگوں کے نام ملتے ہیں حکیم محمد علی صاحب، حکیم میر عابد علی صاحب، حکیم سید محمد جان صاحب، میر کرامت حسین صاحب، میر محمد شاہ صاحب، میر ابوالحسن صاحب، سید مرتضیٰ صاحب خادم حسین خاں صاحب، مرزا عنایت علی صاحب، میر محمد رضا صاحب، میر نواب صاحب، مرزا ہادی حسین صاحب، میر باقر علی صاحب رسالدار مہدی علی خاں صاحب پہلوان۔

چوپٹیاں

کئی نالوں کے بیچ میں ہونے سے اس محلہ کو چوپٹیاں کہتے ہیں ادھر سرکٹا نالہ ادھر گاماں کا پل یہ نالہ عقب چوک گذرتا ہوا مغربی لکھنؤ سے دریا میں گرتا ہے اس محلہ میں مختلف آثار قدیمہ تھے جن میں کچھ باقی نہیں۔

کنکوے کا ایک میدان :۔ ۱۸۹۱ء میں چوپٹیوں پر کلیا نامی ایک شخص رہتا تھا کنکوے کا شوق ہوا اور دوستوں سے میدان بدا کنکوے بڑھے آدھ آدھ پاؤ ڈور ایک ایک بینچ میں صرف ہوئی تماشائیوں کا دونوں طرف ہجوم تھا جس کی کنکیا کٹ گئی اس کا چہرہ فق ہوگیا جس نے کاٹا وہ فتحمندانہ مسکراہٹ سے آپے سے باہر حاضرین کا شور اگر کسی نے پٹیا توڑ لیا غضب ہی ہوگیا چند لفنگے دوڑ پڑے دو سو گالیاں دیں۔ دروازہ پر ہجوم ہوا فوجداری کی نوبت آئی۔ لال پگڑی والے مچھلی والی بارہ دری لے گئے۔ آس پاس کے رہنے والوں کی زندگی تلخ، شرفا کے لڑکے ڈور لوٹنے کے پیچھے مکتب کو بھولے ہوئے ایک مرتبہ جو کنکوا کٹا اور چوپٹیوں سے صدا آئی تمنا کا چھٹپنا تھا سبزی منڈی اپنے دادا کے مکان میں کھیل رہے تھے۔ آسمان کی طرف نگاہیں تھیں آوازیں سنکر پہلی مرتبہ بے ساختہ یہ شعر موزوں کیا ؎

بینچ آیا ہے کالوں کالوں میں　　غل مچا ہے کلیا والوں میں

لڑکے کے ماموں زاد بھائی محمد ناصح نے اپنی پھوپھی سے کہا خوش ہوجیے صاحبزادہ پکے شاعر ہوں گے ابھی سے طبیعت موزوں ہے وہی ہوا مجا در حسین تمنا جوان ہوتے ہوتے آسمان کے ستارہ مانے گئے۔

دل آرام کی بارہ دری :۔ یہ چوپٹیوں کی وہ تاریخی اور مشہور عمارت ہے جہاں میر اعظم علی عہد شاہی کے ایک مرثیہ میر انیس کے پڑھنے کی سالانہ مجلس ۲۵ رجب کو کرتے تھے۔

عہد شاہی میں بارہ امام چہاردہ معصومین کی پیدائش اور شہادت کی تاریخوں میں جو مجلسیں اور محفلیں ہوتی تھیں وہ تو درگاہ دوازدہ امام منہدم ہوجانے پر درہم برہم ہوگئیں میر اعظم علی نے اپنی ذات سے ساتویں امام کی تاریخ شہادت کو مٹنے نہ دیا اور

سلہ ذوآب دکشکول، جلد اول مخطوطات

دل آرام کی بارہ دری میں اس تاریخ مذہبی اجتماع ہوتا رہا عمارت غیر مسلم ہاتھوں اور ملکیت کی تعمیر مگر ہندو مسلم وہ شیر و شکر تھے کہ یہاں مدت دراز تک مجلس ہوتی رہی اور اس مجلس میں میر انیس کے پروتے تک پڑھی۔ بیچ میں یہ مجلس ۱۹۲۱ء سے ہتیا کی بارش میں عمارت مخدوش ہو جانے سے امام باڑہ ممتاز العلماء میں آئی اور میر انیس کے پوتے سید خورشید حسن عرف دولہ صاحب کا تمام فروغ کلام اس منبر سے ہوا۔

دل آرام کی بارہ دری میں صحن کا ایک حصہ سیکڑوں کی تعداد میں کایستھ اور دیگر غیر مسلم علم دوست اور ادب نواز مجمع کا ہوتا تھا جو بڑی خوشی سے مجلس میں آتے تھے میں نے لکھنؤ کا جو ٹھاٹھ دور اس بارہ دری کی مجلس میں دیکھا اس وقت تک میر مصحف حسین تعلقہ دار مصطفےٰ آباد ضلع رائے بریلی، سید آغا حسن بیرسٹر زید پوری، میر عابد علی صاحب رائے بریلی اور اللہ جانے کہاں کہاں کے شائقین مرثیہ گوئی پہلے سے آتے تھے اور محویت میں داد سخن دیتے تھے۔ یوں تو لکھنؤ میں ہر شاعر کے زیر منبر اس کے شاگرد بالخصوص اور حلقہ اثر تعریفیں کرتا تھا مگر ۲۰ رجب کی مجلس میں دولہ صاحب کی شان میں پورا شہر اجتماعی حیثیت سے داد دیتا تھا۔ گرد نواح کے دیہاتوں سے لوگ سمٹ آتے تھے اور سال بھر کے بعد دل آرام کی بارہ دری قلوب کو راحت پہونچاتی تھی مجھ سے کئی مستند اور معتبر بیانات میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے۔

میر نفیس :۔ مرثیہ پڑھ رہے ہیں صاحبزادگان زینبؑ کا حال ہے میر اولاد حسین صاحب تعلقہ دار کنتور جو انیس و مونس کو دیکھے ہوئے تھے بزرگانہ انداز سے شہ نشین میں بیٹھے ہیں یہ ملحوظ خاطر رہے کہ بارہ دری بالکل امام باڑہ کی ایسی ساخت اور پہلا دالان شہ نشین کا ایسا ہے۔ منبر پر میر نفیس نے جب یہ بیت پڑھی ؎ ستم شعاروں کو گھیر گھیر کے مارا

تعلقہ دار صاحب نے کہا مصرعہ نہیں کھپا ان کو اتنے بڑے شخص پر تنقید میں تکلف نہ ہوا اور آواز اس قدر بلند تھی کہ مجمع نے بھی سنا اور میر صاحب کے کان تک بھی صدا گئی۔ اس نقد و نظر کے بعد زیر منبر کے لاتعداد حاضرین کی نگاہیں میر اولاد حسین تک اٹھیں اور میر اولاد حسین نے کہا کہ دیکھو میں اس مصرعہ کو پڑھتا ہوں اس ولولہ اور شان سے مصرعہ پڑھا کہ پوری مجلس قابو میں آگئی اور سامعین کو زیر و زبر کر دیا۔ میر صاحب مجمع کی اس بے وفائی کو دم بخود دیکھتے رہے جو مجمع ان کے قابو میں تھا وہ اب غیر کی طرف ہے۔ جب میر اولاد حسین مصرعہ ادا کر چکے تو میر صاحب نے فرمایا۔ اچھا اب مجھے دیکھئے پھر اس مصرعہ کو اس ٹھاٹھ سے ادا کیا کہ مجمع کا جو حال تھا وہ نہ پوچھئے میر اولاد حسین نے اپنی جگہ سے کہا ـــــ "آج تو آپ نے بڑے میر صاحب کو یاد دلا دیا"

میر نفیس نے جواب الجواب میں صرف نگاہیں نیچی کر کے کہا ـــــ "ادنیٰ کو اعلیٰ سے کیا نسبت" سامعین کو اس معمہ کے حل میں رہنے دیا کہ ادنیٰ کون ہے اور اعلیٰ کہاں ہے۔ یہ بیت نفیس کے اس مرثیہ کی ہے جس کا مطلع ہے ع بیاض صبح کا جب چرخ پر ظہور ہوا پورا بند یہ ہے۔

عون و محمد کی جنگ

ادھر تو اُس نے دبا کر پرے کئے مسمار / ادھر سے ریل لیا اس نے فوج کو یکبار
وہ سوئے میمنہ پہونچا علم کئے تلوار / یہ میسرہ پہ اڑاتا ہوا گیا رہوار
عنانیں تازیوں کی پھیر پھیر کے مارا / ستم شعاروں کو یوں گھیر گھیر کے مارا

اس مجلس میں خانِ بہادر نواب سید محمد مہدی حسن صاحب رضوی اور مولانا سید ناصر حسین مجتہد، سید محمد الیاس بیرسٹر کنتوری موجود تھے افسوس ہے کہ اول الذکر ہر دو ناقل بھی جو روایت و درایت کی جان تھے نہ رہے۔

میر نفیس نے ۱۳ ذیقعدہ ۱۳۱۸ھ ہولی کے دن انتقال کیا۔

چوپٹیوں کا بڈھا :۔ محاورات اہل لکھنؤ میں اگر کسی سر پلتے ہوئے بوڑھے کو دیکھیں تو کہتے ہیں کہ چوپٹیوں کا بڈھا ہے اگر کسی دبلے پتلے پر نظر پڑی جس کی ہڈی پسلی دکھائی دے تو کہا جاتا ہے کہ چوپٹیوں کا بڈھا ہے۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ اگلے زمانے میں یہاں ایک بڈھا جس کی سن ایسی داڑھی اور بڑھاپے سے ایسا نڈھال کہ ہڈی ہڈی چمڑا رہ گیا تھا۔ محرم میں بڑے شوق سے تعزیہ رکھتا تھا اور میاں بیوی شب عاشور رات بھر جاگ کر بسر کرتے تھے اس کے مرنے پر محلہ کے مسلمانوں نے اس کی طرف سے تعزیہ رکھنا شروع کیا اور یہ جدت کی کہ بڈھے کی تصویر بنا کر حجرہ میں رکھ دی۔ عوام نے اس کی یاد تازہ ہوتے دیکھ کر اس کام کو قدر کی نظر سے دیکھا اور تعزیہ کے ساتھ ساتھ اس جگہ بڈھا بنانے کی رسم بھی باقی رہی اور ایک ہمہ گیر دلچسپی پیدا ہوئی۔ اکبری دروازہ کے مجسمہ ساز کاریگر نے بھی دیوالی کے موقع پر مسلمانوں کا دل بہلانے کے لئے چوپٹیوں کا بڈھا بنایا اور مٹی کے کھلونوں کی تصویروں کے سلسلے میں آج تک گاہک چوپٹیوں کا بڈھا کہہ کر اس تصویر کو خریدتے ہیں جس کا سر تصویر میں بھی ہل رہا ہے الغرض ہر سال عشرہ کی رات کو محلہ کے مسلمان جو صورت بناتے ہیں وہ ایک سفید داڑھی کا مرد پیر لاغر اندام سامنے رحل کھلی ہوئی اور وہ بیٹھ کر قرآن شریف کی تلاوت میں مصروف بڑھیا بھی سامنے بیٹھی ہے اور روبرو چراغ روشن رہتا ہے۔ دوسرے پہلو میں حجرہ کے اندر تعزیہ رکھا جاتا ہے۔ اور سامنے لیمپ جلتا ہے اور تمام رات لوگ زیارت کرتے ہیں

رام جی مل مہاجن :۔ چوپٹیوں پر رام جی مل کا کاروبار رہن و بیع بہت بلند تھا ان کی دوکان پر مہدی بیگم صاحبہ دختر امجد علی شاہ بہادر کے ہاتھ کی پہنچی کی انگوٹھی تین سو روپے میں رہن ہوئی تھی جو پچیس ہزار روپے کی مالیت کی تھی اور آئی گئی پر ہاتھ سے جاتی رہی۔

قاری صاحب :۔ اس محلہ میں علم تجوید کے جاننے والے قاری مرزا مہدی صاحب ایک صاحب کمال تھے جو میرے ہوش میں اٹھ بیٹھ نہ سکتے تھے ایک دانت بھی باقی نہ تھا مگر فن قرأت میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ مؤلف کو ان کے زندگی کے آخری سال شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ یہ مسجد اب تک قاری صاحب کی مسجد[1] کے نام سے سڑک کے کنارے مشہور ہے ان کی اولاد باقی ہے۔

(نوٹ، فاضل نوگانوی نے مجلہ چوہٹہ کے نام سے جو بستی ظاہر کی ہے وہ میری رائے میں طباعت کی غلطی ہے اور چوپٹیوں کو کاتب نے چوہٹہ[2] لکھا ہے ان کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں حکیم فدا حسین[3] ایک صاحب کمال رہتے تھے جو مفتی سعد اللہ مراد آبادی کے شاگرد تھے۔

منشی دبیر الدولہ کا پھاٹک :۔ دروازہ کی کوئی اہمیت نہیں یہ مقام موجودہ حالت میں کچھ مکانات کا احاطہ ہے دبیر الدولہ

---

[1] مسجد رافیہ بیگم کی بنوائی ہے اور بہت قدیم عمارت ہے قاری مرزا علی احمد صاحب کے وقت تک یہ خاندان مسجد میں آباد رہا چھوٹے قاری صاحب محرم چہلم میں مجلسیں روزانہ پڑھنے کے اور سلسلے خدمت خلق کرتے رہے [2] تذکرہ بے بہا حاشیہ بر تاریخ العلماء [3] حکیم صاحب کا ایک رسالہ زیارت ناحیہ کے فقرہ تمنطقہ الکتاب کے موضوع پر یادگار تالیف ہے ص ۲۸۱

بھی پرانے زمانے کے ایک رئیس تھے جن کا نام ابھی تک چل رہا ہے۔ احمد رضا جائسی نے سلطنت اودھ کے فیوض و برکات میں کچھ نام نذر قرطاس کئے ہیں۔ کتاب مناظرہ کی ہے جس میں سے فقط فہرست اسرار پر مؤلف کی چند لفظیں نقل کر رہا ہوں "ظہیر الدولہ شرف الدولہ۔ دبیر الدولہ مرزا علی رضا بیگ کوتوال و رشید الدین خاں ساکن کاکوری داروغہ اخبار و ہمیں فقیر محمد خاں و صف شکن خاں و عبدالرحمن خاں قندہاری وغیرہما بسیارے از سنیان بدولت ایں خانہ ملک کاشانہ بجاہ منزلت و درجہ عزت و حکومت فائز گشتہ کسے سفیر و کسے وزیر و کسے خزانہ دار و کسے رسالہ دار گردید"[1]

(نوٹ) ۱۳۱۰ھ میں اس محلہ میں برکات احمد کتب فروش تھے اور بوعلی سینا کی لائف چھپ کر نشر ہوئی۔

<u>مہا نرائن کا باغ</u>:۔ اس مقام پر برہان الملک کے زمانے سے آبادی ہے اب بھی پرانے قطع کے مکانات یہاں پائے جاتے ہیں۔

<u>اہیری ٹولہ</u>:۔ عبدالعزیز روڈ پر واقع ہے اور کہا جاتا ہے کہ عہد اکبر[2] سے آباد ہے۔

<u>کٹرہ وفا بیگ</u>:۔ وفا بیگ برہان الملک کے سرداران فوج میں تھے بیگمات اودھ میں نواب قدسیہ بیگم زوجہ نصیر الدین حیدر بادشاہ آپ کی نواسی تھیں یہ ترکستان کی ایک غیور خاتون تھیں جن کے بزرگ نامور بہادر تھے۔ وفا بیگ کے دو بیٹے نوروز بیگ خاں اور ہمایوں[3] بیگ خاں تھے۔

صورت سنگھ کا احاطہ

عہد آصفی میں صورت سنگھ کو مہاراجہ کا خطاب حکومت کی طرف سے حاصل ہوا[4] تھا اور بانس بریلی کے علاقے سے پچاس لاکھ روپیہ سالانہ سپرد تھا ان کی رہائش کا مکان محلہ کی صورت میں مشہور ہوا۔

تاج محل کی بغیہ

تاریخ اودھ میں تاج محل کا نام محتاج تعارف نہیں ہے عراق تک اس خاتون کی سرمایہ داری کا فیض پہونچ رہا ہے مرزا جمعہ کے باغ سے قریب تاج محل کی ایک بغیہ اب تک باقی ہے لکھوری اینٹوں کی چار دیواری اور پچھم کی طرف کچھ عمارت باقی ہے ۳۰ر صفر کو بوقت صبح یہاں تعزیہ اٹھتا تھا تاج محل نے ۱۲۵۸ھ میں سفر آخرت کیا۔

مرزا جمعہ کا باغ

زبان اردو کی خصوصیت ہے کہ اہل زبان بچوں کے نام رکھنے میں دن کا لحاظ رکھتے ہیں جہلا اور پست طبقہ میں اس کی مثالیں موجود ہیں جیسے منگل کے دن پیدا ہونے والے لڑکے کو منگل خاں لڑکی کو منگلو، بدھ کے پیدا شدہ کو بدھو اور جمعہ کو جو پیدا اس کو جمن یا مرزا جمعہ کہتے ہیں۔ آدینہ[5] بیگ خاں نام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جمعہ کو روز آدینہ کہتے ہیں گویا ہفتہ کے صرف تین ہی دنوں پر نام رکھے جاتے ہیں عوام کی ذہنیت نے مرزا جمعہ کی لفظ کو مرزا جما کہہ دیا۔ مرزا جمعہ کا نام تاریخ میں اس طرح ہے مرشد زادۂ آفاق مرزا مظفر بخت بہادر عرف مرزا جمعہ خلف دسلی مرزا جہاندار شاہ مغفور مبرور۔ اور دوسری تاریخوں سے واضح ہے کہ مرزا جما سالار جنگ کے بیٹے اور جہاں بخت کے نواسے تھے ان کے داماد کا نام شمس الدولہ تھا نواب وزیر علی خاں نے حکومت اودھ سے معزول ہونے کے سلسلے میں جن لوگوں کو کمک پر تیار کیا تھا ان میں یہ بھی تھے جسم پر ہتھیار لگا کر ہاتھی پر سوار ہوئے اور

---

[1] ذکر الحافظ صفحہ ۵ [2] گزشتہ لکھنؤ صفحہ ۲۵ [3] بیگمات اودھ صفحہ ۱۳۸ [4] احسن التواریخ صفحہ ۱۲۶ [5] عماد السعادت فارسی

مدد کو چلے عہدنامہ[۱] بہو بیگم صاحبہ میں بھی مرزا جمعہ کا ذکر ہے یہ باغ اس وقت ایک لمبی چوڑی چٹیل زمین کی صورت میں ہے داہنے ہاتھ کی طرف برساتی پانی کی گڑھیا ہے۔

بھولا ناتھ کا کنواں

بھولا ناتھ کو عہد نواب سعادت علی خاں مرحوم میں راجہ بخشی کا عہدہ تفویض ہوا تھا اور منشی رام سہائے[۲] تمنا کا بیان ہے کہ بخشی بھولا ناتھ کے مکان پر دو مرتبہ نواب آصف الدولہ تشریف لے گئے۔ ایک مرتبہ زندگی میں دوسری مرتبہ اس کے مرنے کے بعد تعزیت کے لئے، اس کے بھائی کا نام ٹیکا رام تھا جو حکیم مہدی کے صاحبان اقتدار میں شمار کیا[۳] جاتا تھا۔ بھولا ناتھ کا کنواں اب تک موجود ہے بانی چاہ کے حالات زندگی میں یہ واقعہ نظر انداز نہیں ہو سکتا کہ نواب بڑے ذی علم اور خوشنویس تھے کاغذات میں اگر کسی تحریر کا املا غلط دیکھتے تو چڑھ جاتے ان کے آزردہ ہونے کے اردو ادب میں مختلف لطیفے ہیں ایک مرتبہ خود نواب کے لکھنے میں غلطی رہ گئی۔ بھولا ناتھ نے اس خوبصورتی سے گرفت کی اور عرض کیا کہ آج خانہ زاد کو اس لفظ کی صحت ہوئی نواب نے لغزش کا احساس کیا اور خود اپنے اوپر اس طرح جرمانہ کیا کہ جتنے منشی دفتر میں کام کرتے تھے سب کی تنخواہیں[۴] دوگنی کردیں۔

سعادت حسین دفتری:۔ اس محلہ میں ایک مسلمان دفتری رہتے تھے جو بہت مشکل سے لڑکوں کو شاگرد کرتے تھے جلد بندی کچا اور پختہ کام ان سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا تھا لکھنؤ کے جلد ساز (صحاف)، بعض انھیں کے شاگرد ہیں یہ کمال بھی اب رفتہ رفتہ دفن ہوگیا اس زمانے کے دفتری دفتی خود تیار کرتے تھے اور کاغذ سڑا کر روئی کوٹ کر بورڈ تیار ہوتا تھا اوراق کو تراشنا صرف قینچی کی مدد ہوتی تھی۔ چرمی جلد پر گلکاری اصلی سنہری باڈر بنانا فن کا اعلیٰ کام تھا جو ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی کتابوں میں عموماً شیرازہ بندی ہوتی تھی اور بائیس طرح کی سلائی جاننے والے کو کامل سمجھا جاتا تھا۔ چٹ بندی اس فن کی جان تھی مخطوطات کو داغ دوزی کرکے باقی رکھنا اور بوسیدہ ترین کتابوں پر پورا حاشیہ چڑھا دینا بہت بڑی بات تھی دفتری مسطر بھی بناتا ہے مسطر نظم و نثر کے علیحدہ ہوتے ہیں۔ مرثیہ کا مسطر بند وار ہوتا ہے اگر مسطر کی لکیریں کجی ہوں تو لکھنے والے کی سطروں میں بھی ٹیڑھا پن ہوگا شاعر کہتا ہے ؎

اس عہد میں راستی کا کیونکر ہو رواج — مسطر کج ہے قلم کی تقصیر نہیں

ولہ

مجموعہ خاطر ان دنوں ابتر ہے — جو رگ ہے بدن پہ رشتۂ مسطر ہے
اہل حق نے رہ تسلیم میں فاقے کرکے — جسم کو مشق ریاضت سے بنایا مسطر — اسیر

دفتری وصلی بھی تیار کرتے تھے جس پر طالب علم خوشخطی سیکھتا تھا یہ ایک قسم کا موٹا کاغذ ہے جو دو کاغذوں کو جوڑ (وصل) کے تیار ہوتا تھا اور اساتذہ کے بھی کام میں آتا تھا آتش کہتے ہیں ؎

خوش خطوں پر جو طبیعت مری آئی ہوتی — مجھ سے وصلی کی طرح پھر نہ جدائی ہوتی

---

[۱] عماد السعادت فارسی ص ۱۴۹ [۲] احسن التواریخ ص ۱۲ [۳] تاریخ اودھ نجم الغنی ج ۴ ص ۷۱ [۴] تاریخ اودھ ج ۴ ص ۱۰۱

جلد ساز کے اوزار میں شکنجہ بڑی ضروری چیز ہے آتش کہتے ہیں ؎

کریں گے جمع معنی فہم اجزائے پریشان کو — شکنجے میں بہت کھینچینگے صحاف اپنے دیوان کو

دوسرا شعر ؎

کتابی چہرہ کے نظارے سے آنکھیں منور ہوں — دلِ احباب کو کھینچے شکنجہ تیرے حسان کا

گاماں کا پُل

سرکٹا نالہ کئی محلوں سے گذرتا ہوا دریا میں جاکر گرتا ہے اور راہ چلنے والوں کو جگہ جگہ اس کے سدِ راہ ہونے سے جو دشواری تھی وہ کسی طرح اس ندی سے کم نہیں جس کو پار کرنے میں مسافر چلتے چلتے رک جاتا ہے رعایا فارغ البال تھی اور حکومت کی توجہ کا آسانی سے بظاہر کوئی آئین نہ تھا۔ اس لئے نالے نے جہاں زور کیا محلہ کا کوئی دل چلا کوئی شخص اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے پل بنا دیا۔ کمہاروں کا پل، کچاپل۔ اس کی کھلی ہوئی مثالیں شہر میں موجود ہیں گاماں والدہ نصیر الدین بہادر کے رنگریز کا نام تھا اس کی کنیا جب شادی کے لائق ہوئی اور بادشاہ بیگم کو اطلاع ہوئی کہ گاماں شادی رچا رہے ہیں تو مہمانوں کی سہولت کے لئے دارو غہ تعمیرات کو حکم ہوا کہ پل بن جائے کام شاہی پیسے سے ہوا مگر نام گاماں کا چلا۔ رنگ سازی میں گاماں کا جواب نہ تھا گلنار، بسنتی، دھانی، سبز کاہی، ماشی، زنگاری، اودا کشمشی، عنابی، عباسی، کپاسی، پستئی، بادامی، زعفرانی، سوسنی دانا قرمانی، کاسنی، شربتی، صندلی، سرمئی، ملاگیری، آبی، کافوری، سردئی، بیجنی، پیازی، فاختئی، نارنجی، سنہری، اگرئی، طوسی ہر رنگ میں کپڑے رنگنے میں اس کو کمال تھا طول ہو جائے گا اگر میں ہر رنگ کی کیفیت بتاؤں دو رنگوں کا اس شعر میں غزل کے پتہ ہے ؎

اگرئی کا ہے گماں دھیان ہے ملاگیری کا — رنگ لایا ہے دوپٹہ میرا میلا ہوکر

میر عشق کہتے ہیں ؎

تیغوں[1] سے کج عمامہ محبوب ذوالجلال — طوسی قبا میں تیر گریباں ہوے لال

قرمزی رنگ گہرا سرخ اور شالباف کا ایسا ہوتا ہے ثبوت میں مصحفی کا یہ واقعہ کافی ہے کہ آپ نے ایک بہشتی کو پانی بھرتے دیکھا دل سینے سے نکل گیا منہ میں پانی بھر آیا۔ غزل کہی جس کے بعض شعر یہ ہیں ؎

پانی بھرے ہے یار وہ یہاں قرمزی دوشالہ — لنگی کی سج دکھا کر سقنی نے مار ڈالا

کاندھے پہ مشک لیکر جب قد کو خم کرے ہے — کافر کا نشر حسن ہو جائے ہے دوبالا

دریائے خوں میں کیونکر ہم نیم قد نہ ڈوبیں — لنگی کے رنگ سے جب وانس تا کمر ہو لالہ   ف دہان

<u>فخر الدین مصور</u>:۔ گاماں کے پل پر فخر الدین مصور رہتے تھے جو مصوری میں یکتا اور مخطوطات کا سرورق یعنی لوح سازی میں طاق تھے طلائی کام صفحۂ قرطاس پر کرنے والا ان کے بعد کوئی نہیں رہا یہ ۲۶ سال سے زیادہ کا ذکر ہے۔

<u>مرکان کلیم اللہ شاہ</u>:۔ آپ گاماں کے پل پر رہتے تھے اور نبی بخش شاہ کے نام سے مشہور تھے باپ کا نام فیض بخش تھا پیری مریدی شغل زندگی تھا تحسین کی مسجد کے مینار دور دور سے دکھائی دیتے تھے ان کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی کہ اس مسجد کو مسلمانوں

---

[1] گلزار غم صفحہ ۹۶

کی خانقاہ بنانا چاہے انگریزوں کی نئی نئی عملداری تھی۔ حق دار تر سیں انگارے برسیں کا مضمون قرار دے کر شاہ صاحب نے حکومت میں ایک درخواست اس مضمون کی دیدی۔ یہ مسجد اہلسنت کے پیش امام کی نماز پڑھانے کے لئے سنی طلبار کے جار قیام کے واسطے تحسین خواجہ سرا نے معین کی تھی اور ۱۲۶۶ھ تک اس پر اہل تسنن کا قبضہ رہا امجد علی شاہ کے عہد میں ممتاز العلماء سید محمد تقی نے اس پر قبضہ کیا جو کسی طرح جائز قبضہ شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کلکتہ سے واجد علی شاہ کا فرمان آنے پر یہ مقدمہ ڈسمس ہوا ہے۔

جھوائی ٹولہ

اکبری دروازہ کے پچھواڑے محمود نگر سے قریب یہ محلہ ہے اور چوک کی صفائی میں نا ف شہر کے صاف ستھرا رکھنے کے لئے اس حصہ زمین کو کوڑا گھر بنایا تھا۔ حلقہ کی مہترانیاں اپنے ٹوکرے لئے ہوئے گاڑی آنے کی منتظر رہتی تھیں کہ جھوا خالی کرکے گھر پلٹیں۔ گاڑی کو ایک موٹا تازہ بیل یا کبھی بھینسا کھینچتا تھا اور اس کو "کراچی" کہتے تھے ہکانے والا بھی مہتر ہی ہوتا تھا جو خاکروب لیٹ ہوجائیں کراچی چھوٹ جاتی تھی اور میلے سے بھرے ہوئے ٹوکرے یہاں رکھے جاتے تھے اس لئے جھوائی ٹولہ نام ہوا گندگی دور ہونے میں عبدالعزیز روڈ نے اچھا خاصہ حصہ لیا۔ یہ زمین عہد شاہی سے یونانی حکیموں کا مرکز رہی اور خاندان طبابت کے مورث اعلیٰ حکیم یعقوب تھے جو حکیم سید محمد مرتعش کے شاگرد تھے۔ مفردات سے علاج کرکے ان لوگوں نے طبابت کو آسمان پر پہنچا دیا اور ایسے ایسے نامور حکیم پیدا ہوئے جو اپنے زمانے میں لاثانی سمجھے گئے اور انگریزوں نے اس گھرانے کے حکیموں کو شفاء الملک کے لقب سے برابر سرفراز کیا حکیم یعقوب کے مطب کے نسخے ان کے شاگرد حکیم اکرام رضا نے جمع کئے اور "دستور العلاج" نام رکھ کر مطبع قاسمی بجان نگر لکھنؤ سے ۱۹۰۶ء میں چھپوایا لکھنؤ اور دہلی کے حکیموں میں یہ فرق رہا کہ یہاں کے حکیم کشتہ سے علاج نہیں کرتے تھے۔

تیرہویں صدی کے آخر میں اس خانوادہ نے ملکی خدمت کو اور زیادہ ٹھوس بنایا اور پبلک سے چندہ لے کر ڈسپنسری کھول دی اور غریبوں کو مفت دوا دی جانے لگی اس اسپتال کی تاریخ بنیاد ذیل کے قطعہ سے واضح ہے ؎

مسیحائے ثانی ہیں عبدالعزیز — مطب کے لئے یہ ان کے گھر بنا ہے
لکھی کلک اشرف نے تاریخ ہجری — یہ دار الشفا ہے یہ دار الشفا ہے ۱۲۹۴ھ

حکیم عبدالعزیز نے ۱۳۲۹ھ میں اس دنیائے ناپائدار سے سفر آخرت کیا تکمیل الطب ان کی یادگار ہے اطبائے جھوائی ٹولہ کے نسخہ مفردہ و مرکب مرزا سجاد حسین عطار کے دواخانہ میں تیار ہوتے تھے۔ کانپور کی علمی جنتری مؤلفہ عبداللہ عثمان سوداگر کے پورے صفحے پر دواخانہ کے بانی کی قلمی تصویر کے ساتھ اشتہار نکلتا تھا۔

حکیم حاجی ابراہیم علی خاں :- جھوائی ٹولہ کے طبیبوں میں ایک زبردست حکیم تھے میں نے ان کا عکس دیکھا ہے میانہ قد کتابی رو وجیہہ آنکھیں بڑی اور خوبصورت داڑھی گھنی اور مدور شاندار بڑا شالی رومال جو قدموں تک پہونچتا ہے جبہ پرے اوڑھے ہوئے جبہ بھی شال جامہ وار کا ہے جس میں کلابتو کی بچی بیل دوہری مغزی کی گوٹ ہاتھ میں نین سکھ کا آدھ گز کا کھلا ہوا رومال سر پر عمامہ پیروں میں بعید نہیں کہ کفش ہو سن ۵۰ سے تجاوز کر چکا ہے کوئی بال کالا نہیں ہے غدر کے بعد آپ نواب کلب علیخاں والی رامپور کی سرکار میں گئے اور پانچ سو روپیہ مشاہرہ پر مقرر ہوگئے۔ ایک مرتبہ آپ لکھنؤ سے رامپور جارہے تھے۔ شاہجہان پور

لہ گزشتہ لکھنؤ ۔ حکیم صاحب موصوف کے نواسہ سید محمد علی ایک مشہور شخص تھے جو مولوی گلشن علی صاحب المتوفی ۱۲۹۰ھ کے شاگرد تھے (تذکرہ بے بہا)

ہیں ریل کے انتظار میں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں کے کسی رئیس کی بیٹی ایک شبانہ روز سے غش میں پڑی تھی کسی طرح ہوش نہ آتا تھا تمام حکیم اور ڈاکٹر عاجز آ گئے رئیس کو حکیم صاحب کا پتہ چلا منت سماجت کر کے اپنے گھر لے گئے حکیم صاحب نے کیفیت پوچھی، لڑکی کی ہمجولیوں نے بتایا کہ جھٹپٹے[1] وقت صاحبزادی کوٹھی پر کھڑی تھیں ایک کھیت میں گائے بیل بھینس چر رہے تھے اس میں سے ایک بیل جفتی کھانے لگا صاحبزادی دیکھتے ہی غش کھا کر گر پڑیں حکیم صاحب نے لڑکی کے والد سے کہا کہ اسی وقت ان کا نکاح کر کے ازالہ بکارت کرا دیجئے۔ لڑکی کے والد نے کہا کہ نکاح ہو چکا ہے رخصتی نہیں ہوئی ہے حکیم صاحب کے اصرار پر رخصتی کا انتظام ہوا اور تعمیل حکم کی گئی مریضہ اچھی ہو گئی حکیم صاحب نے چند دوائیاں لکھ دیں اور رامپور چلے آئے حکیم صاحب کے پوتے حکیم عبدالقوی صاحب موتی دارثی تھے ان کے پاس تصویر موجود تھے۔ اطبا کے کمالات میں ان کے کمالات اس قدر وزن رکھتے ہیں کہ انسان ان کے عقل و دماغ کی تعریف پر مجبور ہوتا ہے۔ کسی رئیس کی لڑکی دوا پینے پر تیار نہ تھی اور باپ فرط محبت سے اصرار بھی نہ کرتا تھا حکیم نے اس کشمکش میں اس کے مناسب مزاج دواؤں کا پنکھا تیار کیا جو خادمہ جھلتی تھی ہوا نے اس کو صحت دی۔

حکایت:۔ مدرسہ تکمیل الطب کے طلبا میں ایک مرتبہ بحث ہو رہی تھی کہ غذا جب بدن میں داخل ہوتی ہے تو جزو بدن ہو جاتی ہے خواجہ عشرت نے مسکرا کر کہا مجھے اس کلیہ سے اتفاق نہیں ہے سب نے کہا کہ آپ کے پاس کوئی دلیل بھی ہے۔ آپ نے یہ شعر موزوں کر کے پڑھا ؎

حکما کہتے ہیں ہوتی ہے غذا جزو بدن ہم تو تحلیل ہوئے جاتے ہیں غم کھانے سے

سب نے ایک زبان ہو کر کہا کہ فی الحقیقت یہ آپ کی شاعرانہ تحقیق کا ایک کلیہ ہے پھر اسی زمین میں مطلع کہا ؎

بزم ابتر ہوئی نکلی جو وہ میخانے سے شیشے توڑے گئے[2] چھلکی گئی پیمانے سے

مصنوعی جامہ وار

عہد شاہی میں ادنیٰ چھینٹیں بنائی جاتی تھیں جس کا مرکز معلوم نہیں مگر جھوائی ٹولہ لحاف کی فردیں اور پلنگ پوش، فرد رضائی کے کام میں کافی شہرت رکھتا ہے ۱۹۲۰ء کے پہلے اور بعد جامہ وار شال کی نقل کاریگروں نے تیار کی یہ کپڑا بالکل شالی معلوم ہوتا تھا دور سے دیکھنے والا تمیز نہیں کر سکتا تھا کہ اصلی شال ہے یا نقلی، لوگ انگرکھے اور اچکنیں بناتے تھے اور اسی کپڑے کے زنانہ اور مردانہ رومال پختہ رنگ کے تیار کئے جاتے تھے رضائی اور لحاف کی فردیں اب اسی شان کی ہوتی ہیں۔ مگر پارچہ جات بننا موقوف ہو گئے۔

اسرار حسین خاں نے جھوائی ٹولہ کے چھاویں خاص مصنوعات میں شمار کئے ہیں۔ (دیکھو قدیم ہنر ص۱۸۶)

معین العلاج:۔ مرزا سجاد حسین مذکور کے دواخانہ کا نام تھا اور ۱۹۲۵ء میں مرزا صاحب نے قائم کیا تھا مدت تک بڑی نیک نامی کے ساتھ جاری رہا اور پبلک خدمات میں جھوائی ٹولہ کے ساتھ مرزا سجاد حسین کا نام باقی ہے۔

امامباڑہ میر فجو:۔ پرانے زمانہ کے سید تھے جن کا زیادہ حال معلوم نہیں ہو سکا مدرسہ تکمیل الطب اسی امامباڑہ کی آراضی پر قائم ہے اور یہ وہ حصہ زمین ہے جو شہر کی قبر سے پہلے ختم ہو جاتا ہے۔

---

[1] قدیم ہنر و ہنرمندان اودھ ص۹۶   [2] بزم خیال ص۱۹۵

<u>ڈیوڑھی بادشاہ محل</u> :- اس محلہ میں نصیر الدین حیدر بہادر مرحوم کی فرانسیسی ملکہ کی دولت سرا تھی جس نے نومبر ۱۸۳۰ء میں سلام لاکر "بی حسینی" نام تبدیل کیا اور شاہ کی طرف سے بادشاہ محل خطاب ہوا۔ اس محل سرا کی اب بنیاد بھی باقی نہیں ہے بادشاہ محل بیوہ ہونے پر تھوڑے دن زندہ رہیں اور محمد علی شاہ بادشاہ نے ماں کی تنخواہ صرف دو ہزار روپے ماہوار باقی رکھی ——— ۱۸۹۶ء تک اس عالیشان مکان کے دیوار و در باقی تھے۔ باپ کے ساتھ بادشاہ محل کربلا معلی روانہ ہوئیں بادشاہ محل کی ایک لے پالک لڑکی کا نکاح مولوی سید امداد علی بن سید قلندر علی کیرانوی کے ساتھ ہو گیا تھا داماد کرنال کے رہنے والے تھے اور شاہ کی طرف سے محلات میں مجلسیں پڑھنے کا عہدہ عطا ہوا تھا۔ یہ پرائیویٹ مجلسیں ہوتی تھیں پردہ کی آڑ میں بیگمات اور باہر منبر پر آپ شاہ اور ارکان سلطنت سامعین پہلی مجلس سننے پر پانچ پارچہ کا خلعت اور پانچ سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے سید الذاکرین کا خطاب ملا[۱] شادی کے سارے مصارف سلطنت نے برداشت کئے۔ اس کے بعد مولوی صاحب موصوف کو شاہی باورچی خانہ کی نگرانی تفویض ہوئی اور سات سو روپیہ ماہوار پانے لگے۔ بیگم صاحبہ کو اس کے علاوہ دو سو روپیہ پاندان کے خرچ میں ملتے رہے بادشاہ مجلس میں شربت اپنے ہاتھ سے ان کے سامنے پیش کرتے تھے۔ سید صاحب کے تالیفات شاہی پریس میں چھپے اور شاگردوں نے بھی استاد کے نام پر عزت حاصل کی اور صاحب[۲] تصنیف ہوئے ۲۹ رجب ۱۲۹۰ء سید الذاکرین کا یوم وصال ہے مثنوی عالم بادشاہ محل کے ذوق شعر و سخن پر گواہ ہے جو بعض تجارتی کتب خانوں میں میں نے دیکھی۔

<u>امام باڑہ بادشاہ محل</u> :- سنا جاتا ہے کہ بڑا خوبصورت امام باڑہ تھا اور دھوم سے مجلسیں ہوتی تھیں یہ امام باڑہ محترمہ بانی عمارت کے نام کو ملحوظ رکھتے ہوئے "حسینیہ" کہا جاتا تھا اور یہ لفظ صحیح اور برمحل تھی بادشاہ محل کے بعد امام باڑہ کا سامان تلف ہو گیا۔

<u>مطبع محمدی</u> :- حاجی ولی محمد نے اسی امام باڑہ میں کچھ عرصے کے بعد پریس کھولا جو لکھائی چھپائی اور کام کی عمدگی کے لحاظ سے معیاری پریس تھا جو کتاب شائع ہوتی وہ قدیم خصوصیات کی[۳] حامل ہوتی مطبع محمدی کے چھپے ہوئے کام میں وہ قرآن شریف ایک یادگار ہے جو ضیاء الدولہ مظفر الملک نواب کاظم علی خاں ذوالفقار جنگ خلف یمین الدولہ ناظم الملک نواب سعادت علی خاں بہادر جنگ نے ۱۲۵۵ھ میں صرف سو کاپیاں علماء کے لئے چھپوائیں اور وقف کیں اس کی چھپائی کی تحریک مولوی غنی نقی ایک دوسرے عالم نے کی تھی۔ قرآن شریف میرے پاس موجود ہے لمبان ۱۲½ انچ چوڑان ۹ انچ صفحات ۸۴۸، ہر صفحہ میں گیارہ سطریں مطبع سلطانی کے قرآن مجید کے بعد جس پر ہر رکوع کی جگہ تاج بنا ہے یہ قرآن پاک بہترین شاہکار ہے۔ مطبع حاجی صاحب کے مرنے پر ان کے بیٹے عبداللہ کی زیر نگرانی آیا اور ۱۲۶۲ھ کا شائع شدہ لٹریچر بھی کچھ کم نہ تھا[۴] پھر ۱۲۶۴ھ میں محمد حسین و ولی محمد کی شرکت سے پریس نے تیسری منزل طے کی۔ اس پریس کے مطبوعات کلاں کوٹھی کے سلطانی مطبع میں بھی تیار ہوئے اور ۱۲۶۹ھ کے نشریات پر مطبع حاجی ولی محمد کے ساتھ کارخانہ علی بخش خاں کا اضافہ ہے ممکن ہے کہ پرنٹر اور پبلشر تبدیل ہوا ہو چھاپہ خانہ کے یادگار ہونے میں شبہ نہیں ہے۔

<u>مطبع اسدی</u> :- جھوائی ٹولہ کا دوسرا پریس ہے اس کے مطبوعات میں کوئی خاص بات نہ تھی پھر بھی صحت و صفائی کے لحاظ سے پریس

---

[۱] تاریخ العلما موسوم بہ تذکرۂ بے بہا میں ہے کہ بحر المصائب اور نہر المصائب واقعہ کربلا میں اسی فیاض ملکہ کے سرمایہ سے چھپ کر عزاداری مظلوم کربلا میں معین ہوئیں۔

[۲] نجوم الفرقان کے نسخہ سے واضح ہے کہ امام باڑہ بادشاہ محل کا مطبوعہ ہے [۳] سفینۂ نجاۃ کا وہ قدیم نسخہ دیکھو جس میں تہرے باڈر ہیں۔

اچھا تھا ۱۲۹۰ھ کی چھپی ہوئی کتابیں سابق کے مطبوعات سے کم نہ تھیں۔

وضعداری کا ایک اعلیٰ نمونہ :- یہاں ایک شخص تھے مرزا[1] مہدی حسین ان کے پاس وقت مقررہ پر منشی گنج سے ان کے ایک دوست روز آتے تھے اور آندھی پانی کوئی ان کو روک نہ سکتا تھا غدر کے دن مرزا صاحب جب بھاگنے پر تیار ہوئے تو پلٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے کہ دوست آجائیں تو گھر چھوڑیں دفعتہ مرزا صاحب نے آکر گلے میں باہیں ڈال دیں اور توپ کے گولے نے اپنی بھیانک صدا سے دونوں کو جدا کیا اپنا اپنا راستہ اختیار کیا محبت اس کو کہتے[2] ہیں۔ کوئی طاقت آنے کے وقت روک نہ سکی جھوائی ٹولہ میں فرد رضائی پلنگ پوش کی چھپائی کا کام عہد شاہی سے اب تک ہوتا ہے جس کی دور دور مانگ ہے بزازہ میں مال اسی جگہ سے سپلائی ہوتا[3] ہے اس محلے کے جہانوں بھی اچھے ہوتے تھے۔

مسجد رکھی :- جھوائی ٹولہ میں تکمیل الطب سے پہلے داہنے ہاتھ کی طرف ایک بلندی پر چند زینوں کے بعد یہ مسجد ہے دروازہ کی بغل میں ایک خوشنما محراب ہے جس میں میٹھے پانی کا کنواں ہے۔ سطح زمین سے متصل کنواں زیر محراب اس طرح بنا ہے کہ چبوترا اور صحن مسجد سے اس حصہ زیریں میں ڈول رسی پہونچا کر پانی بھرا جائے اور مسجد کے نیچے اترنا نہ پڑے۔ نجم الغنی[4] کا بیان ہے کہ عہد آصفی میں سندر نامی طوائف سید قاسم علی شاہ پسر میر انور داستان گو پر عاشق تھی۔ کچھ تعجب نہیں اگر سندر کے کار خیر پر میلان میر صاحب کی محبت ہی ہو سندر اپنے ابتدائی دور میں بہترین گانے والی عورت تھی تان سین اور بیجو باورے کی یاد اس کے نغموں سے تازہ ہوتی تھی رکھی سندر کا عرف تھا۔ حوض کے پہلو میں اس کی قبر اب تک موجود ہے پتھر ٹوٹ کر محلہ کے لوگ لے گئے ہیں نے جب تلاش کرنے میں بہت بڑی کوشش کی تو دلِ عشاق کی طرح ٹکڑے دستیاب ہوئے جو ایک دوسرے سے فٹ نہ ہو سکے چار ٹکڑے ملنے پر جو کچھ پڑھا گیا وہ ناقص لوح مزار کی صورت میں یہ ہے۔

سندر کہ نمود رحلت از ملک جہاں	...... ومشتری شدند اشک فشاں
ناھید زروئے گفت کنیز	دردا کہ غنا را شدہ خورشید نہاں
م صفر روز جمعہ	۱۲۲۰ھ

دوسرے مصرعہ میں جو لفظ نہیں پڑھی گئی وہ شاید زہرہ ہو تیسرے مصرعہ میں جو جگہ خالی ہے وہاں زروئے اعداد ہو سکتا ہے اور اس مصرعہ کے آخر میں کنیز کی لفظ مشتبہ ہے ممکن ہے کہ منیر ہو خوش قسمتی سے مادہ کا مصرعہ صاف اور دست برد زمانہ سے بچا رہا آخر میں نثر سطر بھی ناقص ہے بظاہر پنجم یا بستم صفر ہے۔ اگر یہ پتھر نہ ہوتا تو کوئی بتانے والا نہ تھا کہ سندرا دور رکھی ایک عورت ہے محلہ کے چلا سشناسا قبر کو بانی مسجد کی قبر بتاتے ہیں۔ سندر کے کمالات کا ہنرمندان لکھنؤ میں بھی ذکر ہے۔

مسجد میں چند دوکانیں ہیں اوپر مختصر چبوترہ اور داہنے ہاتھ کی طرف ضرور کچھ عمارت تھی بعض محرابیں کہنہ دیواریں بتاتی ہیں کہ اس سمت مکانات تھے اور پہلوئے مسجد سے راستہ تھا محلہ کے بوڑھے لوگ بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں یہ حصہ کھنڈر کی شکل میں ہے مدت سے بھی تین در اب تک قدیم راہ کے ثبوت میں گواہ ہیں۔ صحن مسجد میں حوض ہے اور مسجد صرف ایک درجہ ہے تین گنبد سقف پر ہیں اور دونوں گوشوں پر مینارے ہیں بانی مسجد کی نسل میں لکھنؤ میں کوئی موجود نہیں جن لوگوں کو اس مسجد کے مالکانہ حقوق حاصل تھے ان میں مرزا

[1] وضعداران لکھنؤ [2] وضعداران لکھنؤ ص۴۹ [3] قدیم ہنر [4] تاریخ اودھ ج ۵ ص ۱۱۱

عابد حسین بیگم ریختی کے باکمال شاعر تھے اپنی جوانی میں دکھن چلے گئے یہ جان صاحب کے آخری شاگردوں میں بہت بڑے صاحب کمال تھے ۱۳۵۰ھ میں مجھ سے ملاقات ہوئی۔ دراز قامت، وجیہ کشادہ رو منہ پر داڑھی، پیرانہ سالی کے باوجود خمیدہ پشت نہ تھے حیدرآباد کے حسینی محلہ میں رہتے تھے جذب وطن میں غالب جنگ کی ڈیوڑھی پر مجھ سے ملنے آئے اور مسجد کے چپہ چپہ کو پوچھا اور بتایا کہ غوطہ طہارت کے سلسلہ میں ہم اور دوسرے لوگ بھی جن کے نام مجھے یاد نہیں رہے مسجد پر آتے جاتے تھے اور مسجد نہ تھی ایک پھولوں کا گلدستہ تھا بیگم کے اشعار حیدرآباد کے بچہ بچہ کو یاد ہیں ایک شعر مجھے بھی یاد رہ گیا ؎

ذرا ماما پانی سے بھر دے لگن کو ۔۔۔ کہ میں آج دیکھوں گی سورج گہن کو

کسوف دیکھنے کا یہ پرانا طریقہ تھا کہ آفتاب سے آنکھ لڑانا تو تار نظر کے لئے مضر ہے اس لئے تسلہ میں پانی بھرنے سے سورج کی کانپتی ہوئی تصویر پانی پر اتر آتی ہے اور نماز کے پابند سمجھتے ہیں کہ اب نماز کا وقت جاتا رہا بیگم نے حیدرآباد ہی میں انتقال کیا ان کی صاحبزادی سے نسل موجود ہے مسجد اس وقت انجمن پنجتنی جھوائی ٹولہ کے زیر اہتمام ہے اور ساٹھ برس سے انجمن کا علم نو چندہ ہفتہ کو اٹھتا ہے رکھی کی مسجد اس قدر مشہور ہے کہ شہر بھر واقف ہے۔

توپ دروازہ

اس محلہ میں عہد آصفی سے آبادی ہے شہر کے چنے ہوئے شرفاء، حکماء یہاں رہتے تھے ایک امامباڑہ ہے جس کے حالات معلوم نہیں ہو سکے اور دکھیں توپ دروازہ کا کچھ اثر ہے یہ عہد نوابی کے مناظر ہوں گے جس کا اب کوئی نشان نہیں ہے حضرت عباس کی درگاہ کے تحفظ میں فرقہ وارانہ فساد کو روکنے کے لئے خطرہ کی راہ پر دروازہ بنا کر توپ نصب کی گئی تھی اس لئے اس محلہ کو توپ دروازہ کہا گیا ہے ایک زمانے میں سڑک پر کئی حکیموں کے مطب تھے حکیم محمود نواب، حکیم محمد صاحب مدہوش طبیب ریاست خیرپور، نجوم اور جفر میں بھی ماہر تھے ان کا تعویذ تیر بہدف ہوتا تھا مدتوں خیرپور کے روپیہ سے نو روز کے موقع پر ایک تقویم نکالتے رہے پکے عامل تھے۔ علاج مفردات سے کرتے تھے ان کے علم و عمل کے افسانے اب تک زبانوں پر ہیں یہ ذکر تو پچاس سال پہلے کا ہے اور اس سے قبل محلہ کے باشندگان میں۔

مولوی میر حیدر صاحب :۔ مشہور شخص گذرے ہیں صاحب دیوان تھے عربی اشعار کا مجموعہ ان کا بلند پایہ دیوان ہے آپ پٹنہ عظیم آباد میں امامت جمعہ و جماعت فرماتے تھے اور چھ مہینہ لکھنؤ میں قیام رہتا تھا۔ آپ کے شاگردوں میں حکیم علی[1] اظہر صاحب کھجوی اور مولانا سید محمد باقر صاحب مجتہد لکھنوی اور مولوی علی جواد صاحب بنارسی مشہور لوگ ہیں ۱۹ محرم کو ۱۳۰۲ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی اور درجہ[2] شمالی امامباڑہ ممتاز العلماء مدعزبی کے گوشہ میں زیر آسمان سپرد خاک ہوئے ؎

بولا سر ادب کو جھکا کر دل حزیں ۔۔۔ تاریخ لاجواب عدیم النظیر ہے

مرحوم کا نام میر حیدر علی تھا اور اس دور کی کتابوں[3] میں ان کا ذکر پایا جاتا ہے اولاد کلکتہ، لکھنؤ اور پاکستان میں موجود ہے

علی عباس عامل :۔ شرفاء لکھنؤ کی وضع قطع سے زندگی بسر کرتے تھے اور صورت دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہتا تھا کہ دعا تعویذ کرتے ہیں ان کے کمالات فنی سے اہل لکھنؤ اچھی طرح واقف ہیں مجھ سے ممدوح کے ہمسفر نے بیان کیا کہ ہم سیتاپور یکہ پر جا رہے تھے۔

---

[1] تذکرہ بے بہا صفحہ ۲۶ [2] ایضاً صفحہ ۱۲ [3] دیکھو تاریخ عباس کواکب دریہ ظل ممدود

قبلہ کی طرف سے آندھی اٹھی زمین و آسمان تاریک ہو رہا تھا اور مسافر سراسیمہ ہو گئے۔ عامل موصوف نے راستہ سے ایک ٹھیکری اٹھا کر کچھ لکھا اور آندھی کی طرف پھینکا رخ پلٹ گیا اور قافلہ محفوظ رہا ان کے بیٹے تھے حسن عباس، وہ بیشک عامل معلوم ہوتے تھے بڑی بڑی زلفیں، لانبی داڑھی۔ بمبئی اور دیگر مقامات پر سفر کر چکے تھے۔ کمالات میں یہ تھا کہ چاول پر سورۂ توحید لکھتے تھے۔

گلّو کا تکیہ:۔ اس محلہ کا قدیم قبرستان تھا بعد گلّو آگات پیر پیش لام مشدد) کے یا تو تکیہ دار ہوا پھر حیدر حسین غسال اموات کو غسل دیتے تھے محلہ کے اہل علم و کمال کا پرچھانواں پڑنے سے اس کے خاندان نے وہ ترقی کی کہ ذاکر، عالم، پروفیسر، شاعر اور اہل قلم پیدا ہوئے جن کے نام ظاہر کرنا مصلحت نہیں۔

کٹرہ محمد علی

محمد علی خاں عہد برہان الملک کے سردار اور ہمعصر ابو تراب خاں و خدا یار خاں تھے حسن اتفاق سے طبیب شاہی حکیم محمد علی نے اس محلہ میں قیام کر کے علم و حکمت کے چشمے جاری کر دئے وہ بڑے فیاض اور رفاہ عام کے کام کرنے والے شخص تھے۔ منشی افضل حسین ثابت لکھنوی حیات دبیر میں لکھتے ہیں کہ چار آدمی کھیل کر بڑے ہوئے تھے جن میں مرتے مرتے محبت قائم رہی۔ خدا کی شان ہے ہر ایک اپنے فن میں کامل اور یکتا ہوا حکیم مرزا محمد علی و میر باقر تاجر اور مرزا دبیر اور میر علی حکیم (ص ۱۲۳ حیات دبیر) وہ ممتاز العلماء کی تقلید میں تھے اور امور خیر انجام دینے کے لئے سترہ ہزار روپے کے نوٹ جناب کو دئے۔ جو آج تک باقی ہیں اور شیعہ ریلیجس اینڈ چیریٹیبل کمیٹی لکھنؤ کے زیر اہتمام ہیں۔ حکیم محمد علی کا مقبرہ توپ دروازہ سے آگے بڑھ کر کھنڈر کی صورت میں اب بھی موجود ہے۔ ساٹھ برس پہلے یہ ایک خوبصورت ہال تھا جس میں محلہ توپ دروازہ اور قرب و جوار کے رہنے والوں کی طرف سے مجلس نذر، عقد کی محفلیں ہوتی تھیں ایک مکتب بھی تھا جس میں لکھنؤ کے مفتی اعظم مولوی احمد علی صاحب مجتہد نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس وقت کٹرہ محمد علی میں بکر قصاب رہتے ہیں جن کے پانچ سو سے کم گھرنہ ہوں گے۔

حکایت:۔ حکیم صاحب سر راہ اپنے مطب میں مریضوں کو دیکھ رہے تھے کہ راستے سے جنازہ گذرا جس کے ساتھ میت کا باپ سر و سینہ پیٹتا ہوا جا رہا تھا اور حکیم صاحب کا شناسا تھا۔ انسانی ہمدردی میں پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس کی بیٹی اچانک مر گئی ہے۔ حکیم صاحب کو شبہ ہوا کہ مبادا سکتہ ہوا اور موت واقع ہوئی ہو جانے والوں کو روکا اور میت کا چہرہ دیکھ کر کہا کہ اس کو روکو جنازہ رکھ دیا گیا اور دس سیر دودھ کفن تلے کا کڑھاؤ میں چڑھوا دیا جب ابال آیا اور دودھ اچھی طرح پک کر تیار ہوا کڑھاؤ چارپائی کے نیچے رکھوا کر بستر کے گرد چادریں اوڑھا دیں کچھ دیر کے بعد میت کے چہرے پر سرخی دوڑی اور چند لمحے کے بعد پسینہ پیشانی پر آیا اور زندہ معلوم ہوئی حکیم صاحب نے نسخہ لکھا اور عورت صحتیاب ہوئی۔

بدایوں کے حکیم عبدالعلی ہنسوانی ان کے شاگرد تھے نفیسی شرح موجزان سے پڑھی تھی وقائع عبدالقادر خوانی میں ہے کہ وہ اپنے دوست عبدالعلی سے ملنے کے سلسلہ میں اچانک حکیم صاحب کے درس میں پہونچے بحث ہو رہی تھی کہ معتدل حقیقی کا اگر وجود ہو بھی تو کہاں ہو کیونکہ ہر مرکب اپنے غالب جز کے مکان میں ہوگا ہے اور معتدل میں کوئی جز غالب نہیں اس کا وجود محال ہے۔ عبدالقادر ہدایت الحکمۃ کی شرح ملاصدرا میں بحث دیکھ چکے ہے رباعی پڑھی ؎

نیکو بنگر کہ ہست در ملک وجود　　　خیر کلی ز شر جزئی مقصود

بر چہرہ زیبا نہ بود خال سیاہ   پیدا است کہ جز حسن چہ خواہی افزود

حکیم صاحب بہت خوش ہوئے اور دربار آصفی کے شاعر انشاء اللہ خاں سے ملوایا حکیم صاحب کا انتقال ۱۲۶۲ھ ۱۸۴۶ء میں ہوا - میر علی اوسط رشک نے تاریخ وفات کہی ؎

بقراط زمانہ بو علی سینا   اے فخر ہمہ سابق و لاحق افسوس
تاریخ وفاتش قلم رشک نوشت   افسوس طبیب ہائے حاذق افسوس

علم و عمل کے فاضل مصنف نے یہ واقعہ ص ۱۵۸ مختصر سیر ہندوستان حکیم وحید اللہ بدایونی ص ۸۳۲ مطبع احمدی ۱۲۷۳ھ سے اخذ کیا ہے۔

مطبع علوی :۔ اس محلہ کا بہترین چھاپہ خانہ تھا اس کے مطبوعات کی نظیر پریس کا نیا دور اور الیکٹرک سے چلنے والے برقی پریس پیدا نہیں کر سکے ۔ مطبع کے مالک علی بخش خاں[1] ولد پیر محمد تھے اور پریس مین نوروز علی اور مسیح تھے ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ تک پریس کے باقی رہنے کا علم ہے علی بخش کے مطبوعات کلاں کوٹھی میں بھی چھپے ہیں ۔ علوی مطبع کے پریس مین حیدر علی ، امام بخش ، امام الدین تھے۔ اس مطبع میں درسیات پر حواشی علماء فریقین کے ہوتے تھے ۔ حمداللہ مطبوعہ ۱۲۶۳ھ میں مولوی مبین ، مولوی احمد علی ، مولوی تراب علی اور حکیم شریف خاں کے حواشی ہیں ۔ ان میں بعض اہل علم ہمعصر تھے ۔ محمد علی عثمان[2] پور کے رہنے والے تھے ۔ نہیں کہا جا سکتا کہ ضلع بارہ بنکی وطن تھا یا جلال پور ، دونوں اضلاع میں عثمان پور ہے محلہ کے آثار علمیہ میں مطبوعات ہر لائبریری میں موجود ہیں اور حکیم محمد علی کے امور خیر جاری اور ان کے شاگردوں کے خدمت خلق سے بھی ابھی قوم منقطع نہیں ہوئی ہے مولوی جواد علی ساکن بہیڑہ سادات کے حال میں ہے ۔ آپ نے معقولات[3] ممتاز العلماء اور قائمۃ الدین سے اور کتب طبیہ حکیم سبحان علی صاحب سے اور حکیم نبا صاحب سے پڑھیں اور مطب حکیم مرزا محمد علی صاحب حکیم شاہی کے یہاں کیا

آقا سید ابراہیم موسوی اپنے ایک خط میں جو سید العلماء سید حسین مجتہد لکھنؤ کے نام ہے حکیم صاحب کے زیارت سے مشرف ہونے اور ان کے ہاتھ سے مشاہرہ وصول ہونے کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

وتنخواہے کہ سابق برین از جناب حکمت و حذاقت نصاب آقا میرزا محمد علی حکیم ارسال فرمودہ بودید
موافق خاطر خواہش بہر کس کہ حاجت بخصوصہ ..... قبض گرفتہ مجموع را روانہ خدمت نمود   خط نمبر ۲۶

کٹرہ بزن بیگ

بزن بیگ اس افسر کا خطاب ہوتا تھا جو اپنے حکم سے فوج کو حملے کی اجازت دے آپ برہان الملک کے زمانہ میں سردار فوج تھے محلہ مذکور ان کا بسایا ہوا ہے اس جگہ کچھ مندر اور ریوجا پاٹ کے ٹھکانے ہیں ۱۸۸۸ء سے دلگداز رسالہ عبد الحلیم شرر مشہور ناولسٹ نے جاری کیا جو لکھنؤ کے جرائد میں قدیم میگزین تھا ۔ محمد علی خاں نامی ایک شخص[4] اس محلہ میں رہتے تھے جو علی مدد کے موجد مانے جاتے تھے ۔

---

[1] فقہ امامیہ کی مشہور کتاب شرائع اسلام جس شان سے اس مطبع میں طبع ہوئی کوئی پریس نہیں چھاپ سکا [2] معیار الاذکار کے مطالعہ سے واضح ہوا کہ علی بخش عثمان پور کے رہنے والے تھے یہ کتاب ادبی ۱۲۶۶ھ کی چھپی ہوئی میرے پاس موجود ہے [3] تذکرہ بے بہا [4] قدیم ہنر ص ۱۲

بیر خاں کی گڑھی

گزشتہ بیان سے واضح ہو چکا ہے کہ ناکہ پر کچھ بہادر سپاہی تعینات رہتے تھے جو غنیم کا مقابلہ کریں اور اس وقت کی گڑھی بالفاظ دیگر قلعہ تھی۔ بیر خاں عہد آصفی کے مرد میدان تھے محلہ شہری بستی سے دور اور ناکہ پر تھا یہاں پر کچھ شاہی نوکر چاکر اور کچھ سادات کے گھر تھے ایک میر بھبکا کا خاندان تھا بھبکا بظاہر پبلک کا رکھا ہوا نام ہے۔ دوا سازی کے اصول پر عرق جس طرح کھینچا جاتا ہے اس میں ایک طریقہ بھبکے سے کھینچنا بھی ہے ممکن ہے کہ شاہی دوا ساز یہاں رہتا ہو اس محلہ میں کچھ آثار قدیمہ مٹے ہوئے اب بھی ہیں۔

میر اکبر علی :- عہد شاہی سے ۹ر صفر کو یہاں سے ایک تعزیہ اٹھتا تھا اور بانی مجلس بڑھاپے سے چل پھر نہ سکتے تھے۔ ڈولی پر بیٹھ کر گھروں پر وعدے لیتے تھے اور روٹی سالن کا حصہ خود پہنچاتے تھے بڑا کار خیر انجام پاتا تھا۔

راجہ مہرا :- نواب آصف الدولہ کے کہار راجہ مہرا کا مکان اسی محلہ میں تھا یہ بہت بڑا عقلمند اور پڑھا لکھا آدمی تھا سرجی نام تھا نوکر ہوتے ہی اپنے کردار اور تعلیم و تہذیب سے بھرا ہوا محلاتی زبان میں کہاری کو مہری اور کہار کو مہرا کہتے ہیں ترقی کی اور ڈیوڑھی پر جتنے کہار رہتے تھے سب کا چودھری ہو گیا تنخواہیں اسی کے ہاتھ سے بٹتی تھیں اور نواب کی پالکی میں بھی پیش پیش تھا جان چیری رزیڈنٹ نے جب چاہا کہ نواب گھوڑا گاڑی (بگھی) پر نکلیں سرجی نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ گھوڑے سے تیز کہار چلتے ہیں رمنہ کے میدان میں ٹاکرا ہوا اور کوس بھر تک سرجی رزیڈنٹ کی بگھی سے آگے رہا اس ہار جیت پر نواب نے اس کو راجہ مہرا کا خطاب دیا اور بے تکلف لوگ راجہ مہرا ہی کہتے رہے۔ یہ شخص فارسی درسیات اور کچھ کچھ عربی اور سنسکرت بھی جانتا تھا عشرہ محرم میں بڑی دھوم سے تعزیہ داری کرتا اور عشرہ کو سروپا برہنہ تعزیہ لے کر کربلا جاتا۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت کا بیان ہے کہ آج تک (۱۹۳۱ء) اسی کے خاندان کے لوگ لال تعزیہ رکھتے اور اٹھاتے ہیں اور مرثیہ پڑھتے ہوئے جلتے ہیں اور مجلسیں بھی کرتے ہیں۔ راجہ مہرا کا مکان ان کے خاندان کے قبضے میں اب تک ہے راجہ مہرا کو سیاق میں طبعی لگاؤ تھا اور جھاؤلال کہا کرتے تھے کہ یہ تو کسی کایستھ کا بچہ ہے۔ راجہ مہرا نے عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ میں بہت بوڑھے ہو کر دنیا چھوڑی گھوڑے کے ساتھ پالکی لے کر ان کا آگے نکل جانا تاریخی واقعہ ہے جس کو ہم نے مختصر لکھا ہے۔

رانگے کی ضریح :- عہد شاہی کے تعزیوں میں بیر خاں کی گڑھی سے ۳۰ر صفر کو رانگے کی ضریح کا جلوس نکلتا تھا اور امرا و رؤسا شریک ہوتے تھے۔

نور بیگ کا احاطہ

احاطہ نور بیگ ایک کابلی مشہور شخص کی طرف منسوب ہے حیدر بیگ اور نور بیگ افغانی دو بھائی تھے دونوں بڑے سخت مزاج اور بد خو تھے۔ نور بیگ نے راجہ بینی بہادر کی سفارش سے نواب شجاع الدولہ سے اعظم گڑھ اور سلطان پور ٹھیکہ پر لے رکھا تھا۔ جب ڈیڑھ لاکھ روپے مالگذاری کا ان کے ذمہ باقی رہ گیا تو دونوں بھائی قید کر لئے گئے اور طرح طرح کی سختیوں کے بعد بھی روپیہ دینے کا اقرار نہ کیا یہاں تک کہ نور بیگ دنیا سے گذر گئے۔

ملاحظہ ہو درج ادب حصہ سوئم مؤلفہ گھاسی رام ایم اے۔ ایل ایل بی ایڈوکیٹ میرٹھ صفحہ ۲۳

میر محمد باقر اس حلقہ کے میر محلہ تھے جو ہندو مسلم جھگڑوں کو دفع کرتے تھے اس محلہ میں کبھی چوری نہیں ہوتی تھی۔ دروازہ رات کو کھلے رہتے تھے۔

توکل کا مقبرہ:۔ اس محلہ کے آثار قدیمہ میں ہے توکل شاہ فقیر تھے عمارت عہد آصفی کی ایسی قدیم معلوم ہوتی ہے۔

کشمیری محلہ

وزیر علی خاں کی شادی میں جو لوگ کشمیر سے شرکت کے لئے آئے تھے اور پھر وطنی ہو گئے ان میں غیر مسلم گروہ تھے جنھوں نے یہ محلہ بسایا اور اب تک ہندو نسل کے کشمیری لوگ آباد ہیں۔ حکومت کا عدل و انصاف فرقہ وارانہ جذبات کا قلع قمع کر چکا تھا۔ اس لئے رفتہ رفتہ محلہ میں مسلمانوں کی آبادی بھی بڑھی اور اس وقت جو آثار قدیمہ ہیں وہ ملاحظہ ہوں

باؤلی حیدر بیگ:۔ فتحپور سیکری کا فاضل مؤلف تحقیق لفظ کے سلسلہ میں رقمطراز ہے کہ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ باؤلی کا لفظ اصل میں بابری تھا جس کا رواج شہنشاہ بابر کے وقت سے ہوا لیکن یہ خیال غلط ہے۔ باؤلیاں عہد بابر سے پہلے ملک میں تھیں پہلے انھیں بائیں یا دائیں کہا کرتے تھے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں یہ لفظ استعمال کی ہے۔ بابر نے بھی اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ در ہندوستان چاہ کلانے زینہ دار را دائیں می گویند۔ لیکن باؤلی کا لفظ اصل میں باہُولی تھا بابلہ اس چشمے کو کہتے ہیں جو فوارے کے مانند زمین سے زور سے نکلتا ہے۔ تاریخ لکھنؤ میں کئی جگہ آپ کو باؤلیاں ملیں گی۔ یہ کنواں حیدر بیگ کا بنوایا ہوا ہے اور عمارت کا کھنڈر اب بھی باقی ہے۔

نواب امیر الدولہ حیدر بیگ اور نور بیگ وزارت صفدر جنگ میں کابل سے ہندوستان آئے۔ سلطان پور میں جو عزت حاصل کی اس کا گزشتہ صفحہ میں ذکر ہو چکا ہے لکھنؤ میں جب ایلچ خاں کا اقتدار ختم ہوا تو جان برسٹو انگریز کی سفارش سے شعبان ۱۱۹۰ھ میں ان کی جگہ پر مقرر ہوئے اور امیر الدولہ حیدر بیگ خطاب ہوا۔ ان کی زندگی کا یہ کارنامہ ہے کہ راجہ صورت سنگھ کو جو سعادت علی خاں مرحوم کے بعد بریلی پر قابض تھا معزول کر دیا اور کندن لال کو مقرر کیا ان کو نجومیوں سے بڑی عقیدت تھی کوئی کام بغیر ساعت دیکھے ہوئے نہ کرتے تھے ضعف معدہ میں مبتلا ہو کر ذیقعدہ ۱۲۰۶ھ میں وفات پائی اور کشمیری باغ میں دفن ہوئے قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

زیں جہاں نواب حیدر بیگ خاں — عازم ملک عدم گردید ہائے
سال تاریخ وفاتش پیر عقل — گفت رحلت کرد امیر الدولہ وائے

امیر الدولہ کے بیٹے اکبر علی خاں نواب امین الدولہ وزیر کے پیش دست تھے اور پوتہ مرزا محمد تقی منصور نگر میں رہتے تھے حیدر بیگ کا ایک تالاب بھی موجود ہے جس میں کبھی پانی ہوگا باؤلی دو سو برس کی عمارت ہے جس کی پختگی اور پائیداری دیکھنے سے بھی واضح ہے۔
۳ شوال ۱۳۷۷ھ کو میں نے بارہ دری حیدر بیگ کی ایک دیوار دیکھی جو اس قدر چوڑی ہے کہ اس پر کھٹولا بچھایا جا سکتا ہے اس دیوار کے محاذ میں کوٹھے پر ایک چھوٹی سی مسجد اسی وقت کی ہے جو مسجد خانہ ہے

مطبع سبحانی:۔ مسیح الزماں پسر نور محمد نے اس محلہ میں ایک چھاپہ خانہ کھولا ۱۲۶۲ھ کے مطبوعات اور درسیات بہترین طریقے پر چھاپے یہ رسالہ عہد شاہی کی طباعتی خصوصیات کے حامل تھے۔

کشور گنج:۔ تاج آرا بیگم دختر نواب حسین الدین خاں مرحوم کا آباد کردہ علاقہ اس وقت بالکل ویران ہے یہ خاتون آخری تاجدار اودھ

؎ تاریخ فتحپور سیکری ص۱۵۱

کی ماں تھیں۔ ان کے مورث اعلیٰ وزرائے دہلی کی نسل سے تھے جب بادشاہ چہارم حضرت امجد علی شاہ کی رفیقۂ حیات ہوئیں تو عقد کے بعد ملکہ کشور کا خطاب ملا بڑی شاندار زندگی بسر کی۔ انقلاب سلطنت کے بعد مصائب کا شکار ہوئیں اور جاہ و حشم اس طرح مسافرت میں ختم ہوا کہ انقلاب سلطنت کے بعد بیٹے[۱] کی خاطر لندن روانہ ہوئیں۔ آغا حجو شرف نے اپنی مثنوی میں اس سفر کا ذکر کیا ہے ؎

نہ پھر ملکہ کشور نے تاخیر کی — سفر کی بہت جلد تدبیر کی
غرض ایک دخانی منگایا جہاز — سواری کی خاطر جب آیا جہاز

لندن میں جس اعزاز و اکرام سے آپ کا خیر مقدم ہوا تاریخ میں نمایاں الفاظ کے ساتھ موجود ہے ایک مورخ لکھتا ہے کہ۔ لندن میں ملکہ کشور کا آٹھویں دن دربار لگتا تھا، پنجشنبہ کو سیکڑوں لیڈیاں ان سے ملنے آتی تھیں جب سے انگلستان کی سلطنت قائم ہوئی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ملکہ وکٹوریہ نے زنانہ دربار کیا ہو۔ زنانہ دربار میں کوئی مرد نہ ہوتا دربار خاص میں ملکہ کشور اور دونوں شاہزادے اور راقم گئے۔ ملکہ کشور سے ملکہ معظمہ نے ہاتھ ملایا۔ اور جیسی کرسی پر خود بیٹھتیں ویسی کرسی ان کے لئے تھی ایک پہلو میں مرزا ولیعہد بہادر اور ایک پہلو میں مرزا سکندر حشمت کھڑے[۲] ہوئے۔ لکھنؤ میں غدر ہو جانے سے ملکہ کشور کا احتجاج کمزور ہو گیا اور مایوسی میں پیرس (فرانس) چلی آئیں اور وہیں مر گئیں۔ واجد علی شاہ کا کلام ملاحظہ ہو ؎

جو تھیں ملکۂ کشور خوش لقب — وہ تھیں والدہ میری اے ذی نسب
مقدم رجب پر جو ہوتا ہے ماہ — ہوا اس میں یہ واقعہ آہ آہ
نویں تھی جو تاریخ اس ماہ کی — قیامت بپا ہو گئی آہ کی
مری والدہ تھیں جو عفت مآب — وہ جنت کو راہی ہوئی ہیں شتاب
وہ دن بدھ کا ایسا قیامت ہوا — کہ مجھ دل جلے پہ آفت ہوا
لکھوں ماں کا سن میں بصد بیم و یاس — کٹے سال تھے پانچ پر پچاس

۱۳ر فروری ۱۸۵۸ء کو آپ نے رحلت کی سلطان روم اور بہت سے مختلف حکومتوں کے سفیر اور لاتعداد معززین اور عام پبلک نے جنازے میں شرکت کی اور پیرس آپ کا مدفن ہوا مشایعت جنازہ کرنے والوں کا مجمع گاڑیوں اور پیادہ سمیت[۳] دمیل تک شمار کیا گیا

کشمیری محلہ میں چوک سے جاتے وقت اب تک بائیں ہاتھ کی طرف ایک چھوٹی مگر خوبصورت مسجد موجود ہے جمعہ مسجد کے بعد اس سے بہتر مسجد بنوانا بیگمات اودھ کے تصور میں بھی نہ تھا اور پھر خلوص نیت میں بھی فرق آجاتا۔ اس لئے مادر شاہ نے یہ مسجد بنوائی جو قبولیت کی منزل سے قریب رہی گرد و پیش کچھ عمارت بھی تھی جو کھنڈر کی صورت میں ہے اور نیچے دوکانات ہیں۔ ناواقف اس کو نواب محمد ہادی کی مسجد کہتے ہیں۔ مسجد کے وہ قدیم باشندہ تھے۔

گندہی کی مسجد:۔ انگوری باغ کے قریب سڑک کے دست راست کی طرف ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کے پہلو پر دیوار قبلہ سے قریب شیشی اور کنکر کا نپ چونے کا بنا ہے یہ کسی تیل اور عطر بیچنے والے کی یادگار ہے حال ہی میں اہل محلہ نے مرمت کی ہے۔

رفیق الدولہ کا پھاٹک:۔ آپ حضرت محمد علی شاہ بادشاہ کے مصاحب خاص تھے مزاج میں فروتنی اور غریب پروری تھی وزارت کی خبر

۱؎ سفر اودھ لکھنؤ ص۹۵ ۲؎ مثنوی حزن اختر ۳؎ سفر اودھ ص۱۰۰

شہر میں گرم بھی اور وہ متمنی بھی تھے پانچ بیٹے چھوڑ کر دنیا سے گذرے صاجزادوں کو تین تین لاکھ روپیہ ترکہ میں ملا۔ ایک بیٹے کا نام نواب بندگا تھا تخت نشینی کے بعد شاہ نے فرمایا۔ اپنے بیٹے کو کبھی نہیں لاتے۔ عرض کیا قبلہ عالم اس کا دماغ خراب ہے اور واقعی وہ مالیخولیا میں مبتلا تھے حسب الطلب سمجھا بجھا کر دربار میں لائے۔ اشرفیاں نذر کرنے کا وقت آیا تو باپ کے حسب ہدایت نذر دی مگر جب بادشاہ نے ہاتھ رکھا تو ایک سخت لفظ کہہ کر بولے ...... لے لیگا ہاتھ سمیٹ لیا۔ رفیق الدولہ مارے خوف کے تھر تھر کانپنے لگے۔ بادشاہ نے فرمایا۔ وہ تو پاگل ہے میں تو پاگل نہیں ہوں یہ کہہ کر علاوہ سات پارچہ کے خلعت کے ایک رقم جو سوا لاکھ بتائی جاتی ہے مٹھائی کھانے کو دی۔

حکایت[1] ہے کہ رفیق الدولہ نے ایک شادی کی تقریب میں مجتہد العصر کے سامنے سونے کا اوگالدان تھوکنے کے لئے بڑھا دیا۔ آپ نے ان کو غور سے دیکھ کر کہا کہ ہم چاندی سونے پر تھوکتے بھی نہیں۔ رفیق الدولہ کا عالیشان مکان موجود ہے اور ان کی اولاد سکونت پذیر ہے۔ رفیق الدولہ کا امامباڑہ بھی محلسرا کے سامنے تھا جو ذاتی مکان کی صورت میں باقی ہے۔

حسن پوریہ:۔ یہ محلہ بھی کشمیری محلہ کا ٹکڑا ہے اور نواب حسن رضا خاں صاحب مرحوم کی طرف نسبت سے حسن پوریہ کہا جاتا ہے اس حلقہ کے بیشتر قدیم مکانات کی جگہ شرعہ پارک ہے کمال لکھنو کے آخری دور میں اس محلہ میں ہر منگل کو بلیغ، دانش، آفتاب، ظریف اور ان کے ہمعصر شعراء جمع ہوتے تھے اور اپنا کلام سناتے تھے۔ ان لوگوں کے بعد لکھنؤ کی قدیم تہذیب ختم ہو گئی۔

ایلچ خاں کا میدان

ایلچ خاں کا اصل نام ایرج خاں تھا جو افغان زادہ تھے اور مذہباً حنفی تھے پہلے افلاس میں دن گزرتے تھے۔ زمانہ شجاع الدولہ میں بازار شکر کی داروغائی ملی لکھے پڑھے نہ تھے عقل و دماغ سے ترقی کی اور آخر میں مختار الدولہ کی جگہ آصف الدولہ کے وزیر ہو گئے۔ مزاج نے کئی مرتبہ کروٹ لی اور واقعات زندگی تاریخ میں مخفی نہیں ہیں۔

مکان مفتاح الدولہ:۔ اودھ کے خزینہ دار غدر کے بعد سے میدان ایلچ خاں میں رہتے تھے اور یہ عہدہ ان کو موروثی اپنے باپ کپتان فتح علی سے حاصل ہوا تھا یہ وہی با مرد اور وفادار انسان تھا جس نے انگریزوں کو شاہی خزانہ نہ بتایا اور توپ کے منہ پر بندھوانے تک بھی انگریز کامیاب نہیں ہوئے۔ مشہور ہے کہ خزانہ دو حصوں میں تقسیم تھا جورا، بھورا۔ جورا ملکی، سیاسی اور ذاتی ضرورتوں پر خاندان شاہی کی صرف ہوتا تھا اور بھورا انکسڈ ڈپازٹ تھا وہ تاحال محفوظ ہے اور وہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ مفتاح الدولہ کا وہ مکان جس میں ان کے صاجزادے مخزن الدولہ رہتے تھے۔ پچاس برس پہلے کامیں نے دیکھا تھا۔ ایک کھپریل تھی اور شاید ایک دالان۔ مخزن الدولہ بہت بوڑھے مگر خوبصورت وحسین تھے گوری رنگت شہاب ایسا رنگ، نورانی چہرہ خشخشی داڑھی عوام میں شہرت ہے کہ واجد علی شاہ کلکتہ جانے کے بعد بھیس بدل کر لکھنؤ آئے اور یہاں سے جواہرات لے کر مٹیا برج گئے اور مخزن الدولہ نے اسی گھر سے ان کی ضرورتیں پوری کر دیں تاریخی حیثیت سے دوبارہ شاہ مرحوم کا آنا ثابت نہیں ہے۔ آخری شاہ اودھ مفتاح الدولہ کو چچا کہتے تھے اور کافی احترام کرتے تھے مفتاح الدولہ کا خاندانی شجرہ "موہنی کے پورودے" تک پہونچ کر آئے گا اور خزانہ پر مختصر بحث قیصر باغ اور لال باغ کے عنوان کی تحت انشاء آئے گی۔

---

[1] ارشاد یہ چودھویں رات کا چاند ص۹

رستم نگر

تاریخ میں صراحت نہیں ملتی کہ رستم نگر کس کا بسایا ہوا ہے۔ عہد نصیر الدین حیدر میں رستم خاں قاسم خاں کا کہیں کہیں ذکر ہے جو فتح مراد بنارسی کی نسل سے تھے۔ ماں کا نام جمیل النسا اور باپ بیگ تھے اور کچھ تعجب نہیں۔ اگر یہ محلہ ان کی یادگار ہو۔ رستم نگر میں معززین لکھنؤ آباد تھے اور جگہ جگہ اہل دول کی ڈیوڑھیاں تھیں۔ ایک قبرستان کا بھی ذکر ہے جو کھیتوں کے حصے میں ہے اس محلے کے بہتیرے آثار قدیمہ مٹ گئے اور کچھ اب بھی باقی ہیں۔ تفصیل مرقومہ ذیل عناوین میں ملاحظہ ہو۔

مکان بی ملانی:۔ یہ ایک علم دوست خاتون تھیں نواب محبت خاں ابن حافظ رحمت خاں والی روہیلکھنڈ کے بچوں کو قرآن شریف پڑھاتی تھیں۔ دس روپے ماہوار اور خوراک پر نوکر تھیں۔ آب و دانہ لکھنؤ لایا ہنرمندی نے یہاں بھی سر افتخار بلند کیا رستم نگر میں گھر لیا امرا اودھ نے اپنے نونہال کی اتالیقی اور تعلیم متعلق کی۔ بنارس کا وہ قافلہ جس میں حسینی بیگم آئندہ ہونے والی ملکہ زمانیہ تھیں[1] انھیں کے مکان میں اتری تھیں۔

نواب محبت خاں:۔ حافظ رحمت خاں کی اولاد کو بھی لکھنؤ آنا پڑا اور نواب محبت خاں اور ان کے پیر بھائی شاہ خواجہ حسن و شاہ خواجہ حسین بھی ساتھ آئے۔ یہ دو فرد یں خواجہ حسن مودودی کی نسل سے تھیں لکھنؤ کو وطن بنانے کے بعد اس خاندان کی ایک لڑکی سلطان عالم کے عقد میں آئی اور اشتیاق محل لقب قرار پایا۔ شاہ کے ساتھ دیرینہ کینہ رکھنے والے افراد سسرال والوں نے وفا کی اور اس خاندان کے محمد شریف شاہ کے ساتھ کلکتہ بھی گئے اور ۷ اگست ۱۸۶۳ء کو ۴۰ سال کی عمر میں انتقال کیا اور درد شکم سے جانبر نہ ہوئے لاش چوب صندل کے صندوق میں لکھنؤ آئی اور مقبرہ رستم نگر میں دفن ہوئے[2]۔

اس محلہ میں حسن مرزا کا تابوت بڑی مشہور تقریب عزا اور جلوس غم ہے جو ۲۱ رمضان المبارک وقت سحر اٹھتا ہے۔ اور جناب مولوی سید علی میاں صاحب مرحوم اجتہادی کی ذاکری بڑی پر اثر ہوتی تھی۔ موصوف کوئی دولت مند شخص نہ تھے خود بھی غریب اور غریب پرور مزاج واقع ہوا تھا۔ مذہب امامیہ کا نادار طبقہ اور عام لوگ ان کے دینی خدمات سے فیض یاب ہوتے تھے عمامہ سر پر، عبا بر دوش، داڑھی غیر مدور مگر کسی قدر بڑی۔ نیاز فتحپوری اپنے مقالہ "لکھنؤ کی پھبتیاں" مندرجہ اخبار جنگ کراچی میں موصوف ہی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور مجتہد جن کے یہاں چالیسویں کا سامان اور نماز روزہ کا نقد سامان جاتا تھا ان کا نام لوگوں نے جنت کا پٹواری رکھ دیا۔

نیاز کے حافظے نے غلطی کی یا جان بوجھ کر انھوں نے لفظ تبدیل کر دی مرحوم کو زندہ دل طبقہ باغ فدک کا پٹواری کہتا تھا ۱۳۴۳ھ کے کچھ پہلے انتقال کیا اور امام باڑہ ممتاز العلماء واقع عقب مسجد تحسین چوک سپرد خاک ہوئے موصوف مولانا مقبول احمد صاحب مرحوم کی پیش خوانی کے بعد اسی یوم غم میں پڑھتے قدیم خطابت کے ماہر تھے۔

باغ آغا مرزا:۔ نصیر الدین حیدر کے کوکا کا باغ اس مقام پر تھا جہاں اس وقت کاشت ہوتی ہے اور ایک بلند مسجد اس وقت کی یادگار ہے۔ آغا مرزا کے کردار سے پبلک عاجز تھی حکیم مہدی اور آغا مرزا سے چوٹ چلتی تھی۔

---

[1] بیگمات اودھ ص ۱۰۳

[2] بیگمات اودھ ص ۲۳۶

قدم رسول :۔ عہد آصفی یا شیخوں کے زمانے کی مقدس جگہ ہے جو ایک غیر نمایاں چھوٹی مسجد اور حجرے سے زیادہ حیثیت کی نہیں ہے۔ اگلے زمانے میں یہاں حضرت رسول صلعم کے قدم مبارک کا پتھر نصب تھا جو غدر میں تلف ہو گیا تھا۔ سرکار حسینی کا جدید امام باڑہ (یا چھوٹی درگاہ)، جو عہد مؤلف میں تعمیر ہوئی ہے روشن خیال بانی نے اس پرانی مقدس جگہ کو اپنا لیا ہے اور اب یہ اسی کا جز معلوم ہوتا ہے۔

اماماباڑہ نوروز علی :۔ نوروز علی کو آغا مرزا کی بہن بیاہی ہوئی تھیں اور وہ شاہی آنا کے داماد تھے قوم کے سید تھے اور مذہبی دلچسپی میں کمی نہ تھی۔ درگاہ حضرت عباس سے قریب امام باڑہ بنوا کر شیشہ آلات سے آراستہ کیا۔ اس اماماباڑہ کی سجاوٹ اس عہد میں نمایاں تھی۔ جب میر نوروز علی نے سفر آخرت کیا تو ان کی آرزو کے مطابق کربلائے تالکٹورہ میں ضریح کے قریب دفن کئے گئے[۱] ورثہ میر خدا بخش کسی اختلاف کی بنا پر راضی نہ تھے اور قانونی چارہ جوئی کی نوبت آئی مگر قبر بن گئی۔

سردار باغ :۔ عہد شاہی کے باغات میں پختہ چار دیواری کا باغ تھا جس میں شمالی رخ پر ایک کوٹھی بھی تھی جواب بھی ہے۔ درخت کٹ کر زمین ہموار ہو گئی یہاں سید عبدالحسین بارہوی کا کتب خانہ تجارتی تھا جس کی فہرستیں لائبریری کی جامعیت پر گواہ ہیں ظریف نے اپنے ایک شعر میں اس محلہ کا یوں ذکر کیا ہے ؎

طے کیا کریں گے کوئے جاناں کے ہفت خواں کو ... جس کا مکان میان رستم نگر نہیں

نواب بڈھن صاحب :۔ آپ کا نام نواب سید علی نقی صاحب تھا اور سات سو والی مشہور رئیس زادی آپ کی رفیقۂ حیات تھیں لکھنؤ کے بڑے روسا میں شمار تھا نوکر چاکر مصاحب سواری خدا کی دی ہوئی ہر نعمت پاس تھی سہ پہر کو آپ فٹن پر نکلتے تھے۔ میر علی حسین کوچوان گھوڑا ہانکتے ہوئے جلو میں شیدی پیارے صاحب سڑک درگاہ حضرت عباس کے رخ پر دو منزلہ ہال میں تشریف رکھتے تھے اور یہی ملاقاتی کمرہ تھا آپ خاندان معتمدالدولہ بہادر کے ایک رکن تھے مخطوطات اور پرانی چیزوں کا بہت شوق تھا۔ خاندانی وقار کے مطابق عام طور پر تقاریب میں شرکت نہیں کرتے تھے اور محلسرا سے کم نکلتے تھے۔ غریب پرور مسافر نواز اور اعلیٰ ذہنیت کے مالک تھے۔ عوام کو ان سے جو فائدہ پہونچتا تھا۔ اس کی بلند مثال یہ ہے کہ آپ کسی فقیر کا عطیہ آتشک کی گولیاں اپنی نگرانی میں بنوا کر مریضوں کو بلا قیمت بانٹتے تھے اور اس تباہ کن مرض میں مبتلا لوگ دور دور سے آ کر صحت یاب ہوتے تھے اس دوا سے مالی فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے اور پرہیز میں مریض ہر وہ چیز کھا سکتا ہے جس کی تیاری مرچ چنے سے ہوئی ہو اس کے سوا دوران علاج میں گھی دودھ کے سوا کسی قسم کی بد پرہیزی نہ ہو اور پہلی گولی کھاتے وقت پس پشت صرف پہلے دن ایک گولی پھینک دی جائے جناب مرحوم نے یہ نسخہ اپنے صاحبزادے نواب سید حضور عالم کو بخش دیا ہے اور وہ بھی ایسے مریضوں کا بڑی دلچسپی سے علاج کرتے ہیں۔ وہ مریض بھی جس کے جسم پر زخم ہوں اس دوا سے اچھے ہوتے ہیں (نوٹ) ایک وقت وہ تھا کہ دسترخوان پر بیٹھنے کے آداب یہ تھے کہ جو چیز کھائی جائے وہ تھوڑی زمین پر پھینک دی جائے۔ انا کھلائیاں کہتی ہیں "حقُ للناظرین" "نظر گذر" کا۔ ممکن ہے کہ دوا میں اس رسم کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔

---

[۱] تاریخ اودھ ص ۲۷۵ جلد چہارم نجم الغنی

اس حلقہ کے مشہور لوگ

طومار میں محلہ سعادت گنج ودرگاہ و رستم نگر و محبوب گنج کے عنوان کے تحت میں جو نام درج ہیں وہ یہ ہیں صاحب عالم مرزا مصطفٰے علی حیدر بہادر، نواب معز الدولہ بہادر، نواب شجاعت علی خاں صاحب، حکیم سید حسین صاحب، میر علی جان صاحب، عباس مرزا صاحب، میر نواب صاحب، آغا علی حسن خاں صاحب، محمد مرزا خاں صاحب، بڑے مرزا صاحب، مرزا آغا حسن صاحب، نواب مرزا صاحب، احمد علی خاں صاحب، قاسم مرزا خاں صاحب، ہادی مرزا خاں صاحب، مولوی سید علی صاحب، داروغہ میر فرزند علی صاحب، مولوی میر عباس علی صاحب، حکیم میر حیدر حسین صاحب، حکیم میر باقر حسین صاحب، نواب مہدی علی خاں صاحب، آغا قاسم علی خاں صاحب، آقا وزیر حسین صاحب، نواب فرخ مرزا صاحب، مولوی سید حیدر صاحب، حکیم وزیر مرزا صاحب، حکیم میر جعفر صاحب، مرزا محمد عسکری عرف نواب مرزا صاحب، فخر الدین حسین خاں صاحب، میر جان صاحب کمیدان، نواب پیارے صاحب، داروغہ میر آغا صاحب، نواب بہادر علی خاں صاحب

پرنس مرزا عظیم الشان بہادر:۔ درگاہ میں ایک مسجد ہے جو شہزادہ صاحب کی کہی جاتی ہے مسجد میں کوئی خاص بات قابل تذکرہ نہیں ہے۔ تاریخ میں ہے کہ نواب نے ایک مرتبہ ایک شادی کے موقع پر سمدھی کی دعوت کی تھی جس میں سلطان عالم شریک تھے اس دسترخوان پر نمکین اور میٹھے ستر قسم کے چاول تھے کبابوں کی بھی صدہا قسمیں تھیں۔

اعظم بیگ کی گڑھیا:۔ یہ محلہ کشمیری محلہ اور رستم نگر کے بیچ میں واقع ہے اعظم بیگ اور گھنڈ بیگ ہمعصر تھے۔ سلطنت اودھ سے ان کو تمنداری کا عہدہ ملا تھا۔

کٹرہ محبّت خاں

جھنّی لال اور ٹیکارام دو سگے بھائی تھے ایک رستم نگر سے متصل علاقہ کا رہنے والا، دوسرا احسن پوریہ کا متوطن، چنانچہ ٹیکارام کا احاطہ آپ کو آگے کسی دوسرے باب میں ملے گا۔ جھنّی لال روضہ فاطمین کے بانی ہیں یہاں ایک سربلند مسجد ہے جو روضہ فاطمین سے پہلے واقع ہے اس مسجد کو محبت علی خاں نے بنوایا ہے۔ ان کا اس گروہ سے تعلق تھا جو قندھار کے رہنے والے سخت مزاج اور فتنہ پرور تھے مسجد پر پلاسٹر کی نوبت نہیں آئی۔ مگر اینٹوں کی تنظیم اور بغیر استرکاری عمارت اسی طرح باقی ہے اور محلہ کے مسلمان نماز پڑھتے ہیں۔ محبت علی خاں کے گھرانے میں رضا میاں علی میاں تھے اور قندھاریوں کا قبرستان یہاں سے آگے بڑھ کر اب تک موجود ہے یہ قندھاری درگاہ کی عزاداری میں سدراہ ہوتے تھے اور کوئی جلوس کم ہی ایسا تھا جس میں تلوار نہ چلتی ہو ماتمی دستے کے نوجوان آزادانہ نعرے لگاتے تھے۔ اور قندھاریوں کا حملہ ہوتا تھا۔ فسادات کے انسداد میں نواب اودھ نے چاہا کہ اس طبقے کو یہاں سے کسی دوسری جگہ بسادیں شورش پسندوں نے عرض کیا کہ ماتمی جلوس کا پرامن راہ سے گزرنا تو کچھ کمال نہیں ہے۔ انتظام کے معنی یہ ہیں کہ رعیت اپنی اپنی جگہ پر رہے اور حکومت فریقین کو قابو میں رکھے۔ لڑائی عموماً انفرادی ہوتی تھی اور ایک کا مقابلہ ایک کرتا تھا کمیں گاہ سے کبھی حملہ نہیں ہوا۔ یلغار نہیں ہوئی واپسی میں کبھی دشمن ٹوٹ نہیں پڑے۔ مخالفت اسی وقت تک تھی جب تک مجمع علم کے ساتھ ہو اور جذباتی نعرے لگاتا ہو۔ نواب نے انتظاماً قندھاریوں کے راستے پر دروازہ لگوا کر توپ رکھوادی اور وہ علاقہ توپ دروازہ سے مشہور ہوا۔

دری والی گلی

درگاہ حضرت عباس کے آگے وزیر باغ کی راہ میں دری والے آباد ہیں اور یہ بستی بہت قدیم ہے۔

مقبرہ قطب اعظم :۔ نہیں کہا جاسکتا کہ محبت خاں کا کٹرہ یہاں تک ہے یا اس کا تعلق قندھاری قبرستان سے ہے بعض بن رسیدہ یہ بھی کہتے ہیں کہ توپ دروازہ سے مابین درگاہ و امام باڑہ مغل صاحب ہوتے ہوئے کربلائے دیانت الدولہ تک مسلسل قبرستان تھے جن میں بعض باقی ہیں اور زیادہ تر منہدم ہوکر راستوں میں آگئے۔ قطب اعظم کا مقبرہ دست چپ کی طرف اب تک ہے اور پرانی عمارت ہے جس میں پتھر استعمال ہوا ہے۔ یہ عہد نوابی کے خدا رس فقیر تھے اپنے کمالات کے مظاہرے میں ایک دن حاضرات کا نقش لکھا اور نواب ہاتھی پر بیٹھ کر جلتی دوپہر میں آگئے فراست ذہنی سے سمجھے کہ یہ سواری تعویذ کا اثر ہے فقیر سے کہا کہ ایک مملکت میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے فقیر نے عرض کیا کہ میں ہی مملکت کو چھوڑتا ہوں۔ بایں ہمہ فقیر رہا اور ایسی قدرشناس مملکت اپنے باکمال رعایا کو کہاں جدا کرسکتی تھی اور فقیر کی قبر بھی اسی زمین پر ہوئی ہر سال گیارہ سے تیرہ ذی الحجہ تک حکیم دری والے کے اہتمام سے ان کا عرس ہوتا ہے اور وہی اس مختصر خانقاہ کا ٹرسٹی ہے۔

نواب گدورا کا مقبرہ بھی یہاں سے قریب ہے ان کے حالات زندگی اور وجہ تسمیہ بتانے والا کوئی نہیں ہے۔

درگاہ حضرت عباس

درگاہ کے بانی کا نام مرزا فقیر بیگ ہے اور ان کی خواب گاہ روضہ ہے کی عمارت ہے مرزا صاحب کے بعد ان کے بیٹے مرزا فتح علی ٹرسٹی ہوئے۔ اس عمارت پر کثرت سے مقالات لکھے گئے ہیں اور مجھے عبد اللطیف لوحانی خالص پوری کا بیان پسند ہے وہ لکھتے ہیں۔

"حضرت عباس کی درگاہ کے بارے میں مشہور ہے کہ جو علم ہے وہ خاص حضرت عباس کا ہے جس کو ایک درویش ملک شام سے لایا تھا اور اکثر بزرگ اس طرح سے ناقل ہیں کہ جہاں حضرت عباس کی درگاہ ہے وہاں ایک شخص سید بہت افلاس کی حالت میں رہتے تھے ان کو بشارت ہوئی کہ یہاں پر حضرت عباس کا علم ہے جب وہ جگہ کھدوائی گئی تو حسب بیان ان کے وہاں سے علم برآمد ہوا"

(تعزیت حسین ص۳ مطبع تیغ بہادر ۱۹۱۳ء)

بعض اہل قلم کا یہ شبہ قوی ہے کہ علم حضرت عباس تو از جملہ تبرکات ہے اور حضرت حجت کے پاس ہے وہ زمین سے برآمد ہوا ہو یا درویش کے ہاتھ سے انڈیا آیا بہر حال منسوب ہے اور منسوبات میں اسلامی لحاظ سے جو عظمت ہے وہ ظاہر ہے فقیر بیگ نے اپنے گھر رستم نگر میں اس علم کو نصب کیا اور شہر میں وہ غلغلہ ہوا کہ ہزارہا آدمی زیارت کو آنے لگے نواب آصف الدولہ آئے اور مقبولیت دیکھ کر پختہ گنبد بنوا دیا۔ نواب سعادت علی خاں کے دل میں سلطنت کی آرزو تھی منت مانی کہ اگر مجھے حکومت مل جائے تو سونے کا گنبد بنوا دوں گا مراد برآئی ان کے صرف سے عمارت میں گنبد طلائی نظر آنے لگا۔ عورتوں کے لئے زنانہ حصہ تعمیر کرا کے عمارت میں وسعت دی۔ غازی الدین حیدر نے اپنے دور میں نقار خانہ بنوایا اور نوبت رکھی گھڑیال بجا نوبت ۱۹۱۹ء کے بعد تک تھی دروازہ رواق پر چاندی اسی تاجدار نے چڑھائی۔ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ملکہ زمانیہ نے باورچی خانہ تعمیر کیا اور طے کیا کہ مردانی درگاہ کی آمدنی خزانہ شاہی میں داخل ہو اور زنانی درگاہ کے چڑھاوے مرزا فقیر بیگ کی اولاد کو ملیں نواب سعادت علی خاں کے وقت سے یہ دستور ہو گیا تھا کہ جو بادشاہ تخت پر بیٹھتا وہ اس آستانہ مبارک پر جلوس کے ساتھ ضرور حاضر ہوتا بادشاہ کے درگاہ جانے کا منظر یورپین مورخین نے بھی نذر قرطاس کیا ہے اور دولہا دولہن اور بڑی شادی کے بعد ختنہ کا دولہا سلام کے لئے درگاہ آنا، تبدیل مذہب کرنے

والے، بیماریوں سے صحت یاب ہو کر مریض، کسی جھگڑے میں قسم کھا کر دادرس کا آنا۔ ایک ہجوم تھا جو آج تک جاری ہے۔ انگریز مورخ نے پچاس ہزار چاندی سونے کے علم سالانہ چڑھائے جانے کا اوسط دریافت کیا ہے۔ درگاہ میں شہ نشین کے علاوہ صرف ایک لانبا دالان اور بیچ میں علم کھڑے ہونے کی جگہ چوکور حجرہ اس پر گنبد حجرے کے محاذ میں مجاور اور خادم کے بیٹھنے کا فٹ پاتھ جس پر شمع دان اور اگر سلگانے کی جگہیں۔ پہلوؤں میں علم داہنے اور بائیں دیواریں قدم اور پنجہ شریف، سمت راست پر نماز پڑھنے کا ایک چھوٹا حجرہ جہاں زیارت کی تقطیع اور بورڈ اور چند مرقع نصب ہیں۔ کسی زمانے میں شیشہ آلات زیادہ سے زیادہ تھے اب مختصر سامان روشنی کا ہے درجہ اول کے آخر میں چبوترہ پر ایک بڑی چوبی ضریح زیر سقف ہے جو جدید ہے۔ وسیع دالان میں بڑا منبر روضہ کے سامنے ہے۔ اور دوسرا منبر پشت منبر کلاں پر تاکہ بیک وقت چند مجلسیں ہوتی رہیں صحن میں چہل چراغ کے بعد پانی کی نہر اور دیوار حصار میں ہر سہ طرف لانبے دالان جن میں اوقات بارش میں ماتمی دستے آزادی سے سینہ زنی کریں اور تکلیف موسم نہ ہو پھاٹک اور نقار خانہ کے عمارتی حصے پر جو علم نصب ہیں وہ حسین آباد کے امامباڑہ سے ملتے ہوئے غدر کے بعد نواب سعادت علی خاں کے پوتے امیر الدولہ نے چہل چراغ اور نہر بنوائی جس کی تاریخ سلیمان خاں اسد نے ثانی کوثر ۱۲۷۵ھ قرار دی۔

سلطان عالم جب کلکتہ روانہ ہوئے تو اپنا تاج اور تلوار درگاہ میں چڑھا گئے تھے۔ درگاہ میں مذہب امامیہ کے ہر شخص کا آٹھویں دن یا نوچندی کو اور اربعین کے لئے اور بعض کے لئے روزانہ حاضر ہونا ضروری تھا۔ جنگجو طبقے میں جب کبھی تکرار یا کسی طرح جھگڑا ہو جاتا تھا تو آپس میں یہی کہتے تھے کہ درگاہ میں سمجھ لیں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان خوف دشمن سے روپوش ہو مگر درگاہ میں ضرور مٹ بھیڑ ہوگی۔ ہولی کی روشنی عہد شاہی میں دریا سے درگاہ تک ہوا کرتی تھی شاعر نے کہا ہے ؎

روشن الدولہ کی تھی یہ روشنی ۔۔۔ کب ہوئی تھی کہیں ایسی روشنی
وہ چراغاں گو کہ تھی درگاہ تک ۔۔۔ تھے تماشائی گدا و شاہ تک[1]

روضہ ۱۸۵۷ء میں توپوں کا مرکز ہوا اور احمد اللہ شاہ ڈنکا شاہ کا آخری مورچہ درگاہ تھی کشت و خون ہوا گوروں کے ہاتھوں سامان لٹا۔ علم خاص جس سے درگاہ کی بنا ہوئی تھی جس کا وزن تیرہ سیر کا تھا سب نے درگاہ سے نکلتے تو دیکھا۔ صحن میں ایک شہتوت کا درخت تھا یہاں تک آنے کے بعد پھر کسی کو اس علم کا نشان نہ ملا۔ شرف الدولہ نے ایک ہزار روپیہ انعام اور مفتاح الدولہ[2] نے بھی اس راہ میں روپیہ عزیز نہ کیا مگر علم کا پتہ نہ چلا۔ درگاہ میں عہد شاہی سے نوچندی کے علم اور نویں محرم کی شب کو زیارت کرنے والوں کا ہجوم ہوتا ہے درگاہ کا پبلک کی نظر میں وہ وقار رہا کہ اس زمانے کے اطبا درگاہ سے متصل رہنے والے مریضوں سے فیس نہ لیتے تھے۔ احمد اللہ شاہ نے مزار آغا میر کے مورچے سے شکست اٹھا کر درگاہ حضرت عباس میں جنگ کی تیاری[3] کی تھی اور انھیں وجوہ سے درگاہ پر بھی فوج کا قبضہ تھا ذیل میں محافظ خانہ کے ایک خاص کاغذ کی نقل ملاحظہ ہو۔

بموجب حکم محکمہ ۱۸ مارچ سنہ حال کے گذارش ہے کہ مقبرہ سعادت علی خاں و مقبرہ مرشد زادی و مقبرہ جناب عالیہ و مقبرہ نصیر الدین حیدر بادشاہ بموجب حکم روبکار ۲۰ اپریل ۱۸۶۰ء کو واگذار ہوا اور دخل بھی سائل کا دلا دیا گیا مگر دخل نامہ سائل نے بوجہ اس کے کہ مقبرہ نصیر الدین حیدر ——— سرکار تھا نہیں ہوا اور درگاہ حضرت عباس نواب حسن علی خاں بموجب حکم ۲ ستمبر ۱۸۶۰ء

---

[1] کلیات تنویر طبع چہارم منشی نولکشور ص ۵ ۱۹۰۸ء
[2] احسن التواریخ ص ۱۰۵

واگذار ہوئی ہے سو دخنامہ اس کا ارسال سرکار ہو چکا ہے سو اب سائل چاہتا ہے کہ کل پھر دخل ہمارا دلایا جائے سو بدون حکم حضور کے نہیں ہو سکتا۔ کیفیت یہ تھی کہ گذارش کی سید کرامت حسین داروغہ نزول مورخہ ۱۵ اپریل ۱۸۶۱ء

اس وقت درگاہ محکمہ آثار قدیمہ کی تحت میں ہے اور ٹرسٹی شپ کا کام کمیٹی انجام دیتی ہے نواب ترک مرزا صاحب درگاہ کے آخری متولی تھے جو اس قدر طاقتور تھے کہ ایک مرتبہ چرسا خود کھینچا تھا جس کو بیلوں کی جوڑی کھینچتی تھی۔

درگاہ کے آخری مرثیہ خواں احمد رضا ایک مرد سیہ فام دراز قامت ایکبر السن منہ پر داڑھی تھی جسم ورزشی تھا۔ آخر میں کٹرہ ابو تراب خاں میں رہتے تھے۔ چالیس یا پچاس مجلسیں مسلسل پڑھنا ان کے نزدیک دشوار نہ تھا۔ ایک نوچندی میں اس سے زیادہ مجلسیں پڑھنے کی نوبت آتی تھی اور چند بند ختم کرنے نہ پاتے تھے کہ دوسرا بانی مجلس اشارہ کرتا تھا اور حافظہ اس غضب کا تھا کہ جہاں سے چھوڑا وہیں سے پڑھتے تھے اور سال مجلس خوب حاصل ہوتا تھا رجب اور بقرعید کی نوچندی درگاہ میں بہت دھوم سے ہوتی ہے۔ عورتوں کے اجتماع تہ پشت کی طرف کا حصہ درگاہ سمجھا جاتا ہے اور زنانی ڈیوڑھی علیحدہ ہے۔

عمارت میں تعمیری تغیرات تین مرتبہ ہوئے ہر کتبہ پتھر پر موجود ہے آخری قطعہ تاریخ مرزا کاظم حسین محشر کا یہ ہے ؎

سہ بارا گنبد درگہ بنا گشت ۱۳۵۱ھ

فاطمین :۔ پیغمبر اسلام کی بیٹی کے روضہ کی نقل بانی کا نام چنی لال عمارت عہد نوابی کی ہے وسیع احاطہ میں ایک حجرہ وسط میں ضریح مزار جنت البقیع کی نقل صحن میں قبور مومنین، پہلے ولایت علی میر محلہ مجاور تھے ان کے بعد ان کے نواسے قاسم علی نے یہ خدمت انجام دی پھر اکبر علی سوز خواں اسلاف کے قائم مقام رہے جنھوں نے کربلائے معلیٰ میں جا کر انتقال کیا۔

فاضل نگر

درگاہ حضرت عباس کی پشت پر واقع ہے اس کو گھنڈ بیگ کی گڑھیا بھی کہتے ہیں پرانے لوگ بتاتے ہیں کہ یہ ایک مخیر خراج تھے ان کے ہاتھ میں روپیہ ٹھہرنے نہیں پاتا تھا بیچ کھوچ اودھار گروی گانٹھ کسی بات میں بند نہ تھے کار خیر بھی کرتے تھے جب کچھ نہ رہا تو خوش قسمتی سے گھر کے سامنے کی مٹی لیسدار اور اچھی تھی اس کو بیچنا شروع کیا یہاں تک کہ خندق ہو گیا اور برساتی پانی نے جمع ہو کر گھنڈ بیگ کی گڑھیا نام رکھا۔ ان کے نام کی وجہ یہ تھی کہ بادشاہ نے کسی بات پر خوش ہو کر ہاتھی دیا اور ان کو دوسرے دن سے ہاتھی پر سوار ہو کر اصولاً آنا چاہیے تھا۔ ہاتھی راستے ہی میں گھر تک آتے آتے بک گیا اور ضرورتوں میں روپیہ اٹھ گیا دربار میں غیر حاضر ہوئے بادشاہ سے آنکھ چار نہ ہوتی تھی بیچنے میں گھنڈ رہ گیا تھا وہی گردن میں ڈال کے حاضر دربار ہوئے حاضرین ہنس پڑے۔ اور بادشاہ سمجھ گئے کہ ہاتھی بیچ ڈالا۔ اسی دن سے گھنڈ بیگ مشہور ہوئے۔

اس گڑھیا میں اس قدر پانی تھا کہ ایک ہاتھی کا ڈباؤ تھا جس وقت محمد علی شاہؒ بادشاہ نے کربلا دیانت الدولہ کی زیارت کا ارادہ کیا اس وقت دیانت الدولہ کے حسن تدبیر سے ۲۴ گھنٹے میں نشیب پاٹ کر یہ راستہ نکالا گیا عمق دو گزوں میں تقسیم ہوا جو اس وقت بھی نمایاں ہے ورنہ شاہ کے کربلا جانے کی سبیل نہ تھی اور جلوس شاہی گزر نہ سکتا۔

گھنڈ بیگ کا اصلی نام مرزا عنایت علی بیگ تھا ان کی بہادری کے کارناموں میں شب خون کی صورت میں ایک ہندو راجہ کا

لہ زمانہ کانپور سلور جوبلی نمبر ۱۹۲۶ء

قدم فتح کرنا ہے جس کو خواجہ عشرت مرحوم نے بڑے دلچسپ انداز سے لکھا ہے بارش میں عہد محمد علی شاہ کی سڑک پایاب ہوکر دونوں ٹکڑے مل جاتے ہیں۔ وہ عہد نصیر الدین حیدر میں افسر نون تھے تنومندی اور بلندی قامت سے اس قدر ممتاز تھے کہ گھوڑا ان کا بوجھ سنبھال نہ سکتا تھا۔ بادشاہ نے سواری کے لئے ہاتھی دیا تھا۔

محلے کے رہنے والوں میں وارث تخت وتاج نواب مصطفےٰ علی خاں بہادر تھے جو اس وقت کی تہذیب میں جب سر برہنہ رہنا صرف باپ کے غم میں بیٹے کے لئے جائز تھا ورنہ بعض امرا بستر پر بھی ٹوپی پہن کر آرام کرتے تھے یہ شاہزادہ سر برہنہ رہے اس لئے کہ سر کے قابل صرف تاج ہے۔ ان کے شاہانہ زندگی کے واقعات ابھی تک مشہور ہیں۔ کسی راجہ کی گاڑی آگے بڑھ جانے سے امین آباد میں اس کو کوڑے لگائے تھے اور انگریزوں نے اس کی گستاخی کو جرم قرار دیا اور شاہزادہ سے اس کو معاف کرنے کی استدعا کی۔ ان کے دو بیٹے بڑے صاحب عالم اور چھوٹے صاحب عالم اپنے زمانہ میں بڑی آن بان کے رئیس تھے چھوٹے صاحب عالم کا نام مرزا محمد شمس الدین حیدر بہادر تھا۔ آخر عمر میں حسین آباد کے ٹرسٹی مدت تک رہے ان کی محل سرا، اور ملاقاتی کمرہ اب تک ہے اور سڑک پر چھوٹے صاحب عالم روڈ لکھا ہے ان کے یہاں چہلم تک آٹھویں دن جمعرات کو مجلسیں ہوتی تھیں چائے اس وقت تقسیم ہوتی تھی جب چائے کا بالکل رواج نہ تھا بارہ بجے دن کو لوگ شرکت مجلس سے فراغت کرکے گھر آتے تھے۔

<u>مشاعرہ</u>:۔ شہزادہ مرزا قیصر بخت چھوٹے صاحب عالم کے فرزند ارجمند تھے جنھوں نے باپ کی زندگی ہی میں داغ فراق دیا ان کو شعر وسخن سے کافی ذوق تھا۔ آغا مظہر کے شاگرد تھے ہر مہینے میں مشاعرے ہوتے تھے۔ شعرا کے مکانوں پر خود وعدہ لینے جاتے تھے ایک مشاعرے میں خواجہ عشرت نے غزل نہیں کہی صرف شرکت کے لئے آگئے۔ حاضرین نے پڑھنے پر مجبور کیا تو ایک مطلع پڑھا جو لوگوں کو یاد رہ گیا ؎

باغ جہاں میں ہم نہ کبھی شادماں رہے　　　شبنم کی طرح عمر بھر آنسو رواں رہے[1]

<u>مرشد کی مسجد</u>:۔ فاضل نگر کا وہ حصہ جو زنانی درگاہ کی پشت پر ہے یہاں ایک صاحب کمال مرشد رہتے تھے اور دعا تعویذ ان کا ہندو مسلم عورت مرد ہر طبقہ میں نفع بخش اور فائدہ رساں تھا انھیں کے نام سے مرشد کی مسجد مشہور ہوئی ورنہ مسجد کے بانی میر ظہور علی کوئی بزرگ تھے مسجد چھوٹی ہے صحن میں حوض تھا جو بند ہے ایک پختہ قبر دروازۂ مسجد سے نکلتے ہی زمین دوز نظر آتی ہے اور مسجد کے پہلو میں میر ظہور علی کا تکیہ ہے ایک حصہ کے نشانات قبر محو ہوکر چھپروں میں کچھ لوگ بس گئے ہیں اور کچھ زمین دوز پختہ نشانات قبر باقی ہیں مرشد مسجد کے بائیں گوشہ میں بیٹھتے تھے ان کا خون مرغ کا تعویذ بہت زیادہ مقبول تھا۔ مرشد کا زمانہ پچاس برس پہلے تھا مرشد کے بعد ان کے بیٹے ارشد علی پبلک خدمات انجام دیتے رہے مگر وہ فروغ ان کو حاصل نہ تھا یہ مسجد اس وقت انجمن افتخار حسینیہ کے زیر نگرانی ہے اور مرمت طلب ہے آٹھویں دن نماز جماعت ہوتی ہے۔

<u>نواب گھسیٹا صاحب</u>:۔ پیکر خیر رئیس تھے چھ سو روپے ماہوار وثیقہ تھا جس سے مرد وعورت، عوام وخواص، ہندو مسلم برابر سے فیضیاب ہوتے تھے انڈین نیشنل کانگریس کی جب بنیاد قائم ہوئی اور ہندوستان کی رعیت بیدار ہوئی تو فرقہ امامیہ میں بھی تنظیم شروع ہوئی اور حلقہ کمیٹی نے اپنا صدر نواب صاحب کو بنایا ان کی بزم کی حاشیہ نشینوں میں سید اکبر حسین مسرور، مرزا الطاف حسین عالم

---

[1] بزم خیال ص ۱۶۹

شعرا میں اور چھمن صاحب مسخروں میں رہ گئے تھے مسرور کا نام تو شعرا میں تھا اور تفریح افزا خبریں پہونچانے کا کام سپرد تھا عالم شعور سخن میں بلند جگہ رکھتے صحبت کے خوش مذاق اور بے فکروں نے طے کیا کہ چھمن صاحب فاضل نگر سے چوک تک ہاتھوں کے بل زمین پر چلتے ہوئے جائیں اور خیراتی کی دوکان سے حلوہ سوہن لائیں چھمن صاحب خود اونچے طبقے کے ذی اثر لوگوں میں عابد علی خاں دور انگریزی کے صف اول کے وکلا میں کے بیٹے تھے کپڑے اتارے کمر میں مصنوعی دم لگی اور چلے راستے میں جو ملا اس سے یہی کہا کہ نواب گھسیٹا نے حلوہ سوہن منگایا ہے۔ فاضل نگر سے چوک تک تمسخر کا ایک طوفان تھا جو خیراتی کی دوکان پر پہونچ کر ختم ہوا اس حلوہ سوہن کا کیا ذائقہ تھا۔ اس کو کھانے والوں کی زبان سے پوچھو چھمن صاحب کی مجلس چہلم میں خطیب اعظم سبط حسن صاحب نے بھی موضوع مزاح پر مجلس پڑھی۔ نواب صاحب کی اوسط درجے پر ایک بلند مسجد ان کی آراضی پر موجود ہے جو مشہور نہیں ہے۔

نور باڑی

نور بیگم عہد نوابی کی معزز خاتون تھیں ان کے نام پر درگاہ حضرت عباس کے پچھم کی سمت پورا محلہ بسا کچھ پختہ گھروں کے آثار خام مکانات اجڑی ہوئی زمین اب تک اسی نام سے مشہور ہے۔

قبرستان نیشاپوری:۔

گذر ناگاہ ہوا شہر خموشاں میں | عجب نقشہ مجھے آیا نظر شاہان عالم کا
کہیں آئینہ دلبر شکستہ تھا سکندر کا | کہیں ٹوٹا پڑا تھا کاسہ سر خاک میں جم کا

یہ وہ قبرستان ہے جس میں شہر کے چوٹی کے رئیس بے شمار دولت مند آغوش لحد میں سوتے ہیں زندگی میں ان کا کر و فر سطوت و جبروت اپنی مثال آپ تھا۔ اور اس وقت ان کی بے چراغ قبروں پر سایہ بھی نہیں ہے غفلت شعار اولاد دفن کرنے کے بعد پھر کبھی بھولے بھی ادھر نہ آئی شمع مزار اور تربت پر پھول کیسے۔ مشرقی کمالات کے مجسمہ علوم قدیم کے پیکر، خلق و مروت کے خاتم نگین تھا وجود کے خاتم اس زمین پر محو خواب ہیں اور کچھ علم و فضل کے سوتے بھی موت کے ہاتھوں قطع ہو کر بحر کمال سے سیراب ہونے والوں سے سورہ فاتحہ کے محتاج ہیں۔ اس مقبرہ میں پچھم کی دیوار سے قریب ایک خوبصورت حوض اور چھوٹی مسجد بھی ہے جو اینٹوں کا ایک مضبوط ڈھانچہ ہے اور مسجد کے سامنے نہایت مستحکم اور مضبوط کنواں ہے جس کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلی ہے۔ اس قدر چھوٹا کنواں لکھنؤ کی مسلم آبادی میں کہیں نہیں ہے۔ اگر ان لوگوں کے حالات ضبط تحریر میں لائے جائیں جو مؤلف کے علم و یقین میں دفن ہیں تو بھی طول کلام کا ڈر ہے تاہم چند قبور پر تبصرہ ضروری ہے۔

(۱) نور بیگم کی قبر مسجد مذکور سے دست چپ کی طرف اب تک موجود ہے اور اہل محلہ واقف ہیں۔

(۲) کور صاحب کی قبر یہ نواب شجاع الدولہ کے ماموں تھے اپنی طاقت اور قوت میں اس قدر ممتاز تھے کہ بادشاہ کے سر پر دھوپ تھی تو درخت کو اکھیڑ کر چھتری بنائی بادشاہ کو اس غیر معمولی طاقت سے اپنی سلطنت میں اندیشہ محسوس ہوا پہلے اقرار وفا لیا۔ پھر آنکھیں طلب کیں اور ان کو نابینا کرا دیا گھر بیٹھے روٹی دی خزانہ شاہی سے تنخواہ کر دی وظیفہ اولاد تک پہونچا اور خود کور صاحب کے نام سے مشہور ہوئے قبر تمام قبروں میں لمبی چوڑی ہے۔ عماد السعادت[1] میں کور صاحب کے بیٹے کا نام مرزا شاہ میر خاں لکھا ہے مگر

---

[1] عماد السعادت ص ۱۶۲

مرقومہ بالا واقعہ مجھے تاریخ میں نظر نہیں آیا زبان زد ہے۔

(۳) اسد اللہ کی لحد۔ آپ نوابی کے رئیس تھے ۲۲ر شعبان صبح سہ شنبہ ۱۲۲۶ھ مرنے کا دن ہے سنگ مزار بہت خوشخط ہے اور حیدر شاعر کا قطعہ تاریخ حسن خط کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

مقبرہ علی قلی خاں:۔ قبرستان مذکور سے فاصلے پر علی قلی خاں جونپور کے حاکم عہد اکبری میں بڑے علم دوست اور دانشور گزرے ہیں۔ ان کی ادب نوازی میں یہ واقعہ صفحہ تاریخ پر موجود ہے کہ مولانا غزالی مشہدی کو ہزار دینار سرخ اور چند عربی گھوڑے بھیجکر دکھن سے طلب کیا اور یہ رباعی تحریر کی ؎

اے غزالی بحق شاہ نجف — کہ سوئے بندگان بیچوں آئی
چونکہ بیقدر گشتہ آنجا — سرخود گیرد زود بروں آئی

غزالی کا سرغ ہزار کی طرف اشارہ ہے وہ طلبیدہ آئے اور جونپور میں درس و تدریس شروع ہوا جب اکبر نے خان زمان کو قتل کیا تو غزالی کو اپنے پاس بلایا اور وہ جونپور سے واپس ہوئے شاہانہ نوازشوں سے سرفراز کیا۔ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ لکھنؤ میں کیوں دفن ہوئے یہاں موت آئی یا لاش آئی ان کے مہمان غزالی کی وفات ۹۸۰ھ ہے لہذا علی قلی خاں کی موت جن کا مقبرہ ہے اس سے پہلے ہوئی (دیکھو اخبار سرحد کراچی ۲۹ بابت مئی ۱۹۷۳ء)

سونا آج جس قیمت پر بازار میں ہے اس حساب سے بتاؤ کہ علی قلی نے جو ہزار اشرفیاں بھیجیں وہ گراں قدر تحفہ اور بڑی پیش کش تھی۔

یہ بہت بڑی سر بلند عمارت ہے جس کو بھراؤ دے کر بلند کیا گیا ہے اور اس سے ملتی جلتی دو عمارتیں رائے بریلی میں مقبروں کی بھی ہیں جس سے اصول تعمیر کے لحاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر مقبرہ ایک زمانہ اور ایک قسم کے نقشے اور ڈیزائن کے تحت میں ہے۔ مرنے والے کی مٹی یہاں کی تھی۔ قبر سرداب میں خام ہے اس قسم کے مقبروں میں ایسا نہیں ہے کہ سنگ مزار تھا اور تلف ہو گیا بلکہ شہری زندگی نہ تھی اور کندہ کرنے والے مقامی نہ ہونے سے نام محفوظ نہیں کئے جاسکے۔ جب تک متوفی کے دور کے لوگ زندہ رہے اس وقت تک نام باقی رہا پھر لاعلمی کا حجاب آیا جو اخبار سرحد سے دفع ہوا یہ مقبرہ دسویں صدی کی عمارت ہے۔

مسجد راحت السلطان:۔ محلہ کے بعض بوڑھے کہتے ہیں کہ یہ چوڑی والی تھی جس نے ایک خوشنما اوسط درجہ کی مسجد بنوائی یہ عورت شاہ عالم کے چشم و چراغ سلیمان شکوہ کے ہمراہ دہلی سے آئی تھی اور مجھے اس لقب کی ایک خاتون کی طرف تاریخ اس طرح رہنمائی کرتی ہے کہ سلطان عالم کی خاصہ بردار کا لقب تھا اور وہ کلکتہ بھی ہمراہ گئی تھیں خود شاہ مرحوم فرماتے ہیں ؎

مقدم ہو سلطان پہ راحت اگر — تو ہو نام اک زن کا اے خوش سیر
وہ کھانا پکانے کو ہمراہ ہوئی — مرے ساتھ زنداں میں بھی وہ رہی

مسجد کی کرسی بلند ہے پہلو میں حوض اور مؤذن کا حجرہ ہے اور بانی مسجد کی قبر پچھواڑے انتہائی عقلمندی اور قدیم انجینئری اصول کی نئی تدبیر سے باقی ہے یہ قبر اس انداز سے بنائی گئی ہے کہ تربت قبر اور بلندی مزار زمانہ گذرنے سے گرتے پڑتے حصہ زیریں سے

دوسری تربت نمایاں ہو رہی ہے پہلی تعمیر کی صرف ایک اینٹ باقی رہ گئی ہے اس کے نیچے سے نیا تعویذ قبر نکل رہا ہے نشان کے باقی رکھنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے اور کچھ دن میں اوپر کا اثر مٹ جانے پر نیچے کی قبر ظاہر ہونے سے معلوم ہوگا کہ نئی قبر ہے یہ قبر بھی اتنے ہی دنوں تک باقی رہے گی جتنے دنوں میں پہلا نقش مٹا ہے میں نے ایسی قبر اسلامی ملک کے کسی گوشہ میں نہیں دیکھی۔

محبوب گنج

یہ محلہ عہد آصف الدولہ میں آباد ہو چکا تھا اور شہر کے امراء و شرفا عزت دار لوگ آباد تھے تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ آفرین علیخاں کا باغ اسی محلہ میں تھا جواب بابا ہزارہ کے قبضے میں ہے۔ اس محلہ کے مشہور لوگوں میں حکیم میر حیدر حسین، حکیم میر باقر حسین، حکیم میر جعفر اور مولوی سید حیدر صاحب کے نام طومار سے واضح ہوتے ہیں۔ اس محلہ کا دوسرا حصہ ــــ

گلشن کی بغیہ:۔ محبوب گنج کا وہ حصہ جس میں باغیچہ تھا معنوی لحاظ سے بھی گلشن تھا اور ایسے ایسے صاحب کمال رہتے تھے جو اپنی آپ نظیر تھے ان رہنے والوں میں مولوی اکبر علی ولد فضل علی عہد غفرانمآب سید دلدار علی صاحب مجتہد کے اہل قلم میں تھے ۲۱ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ کو مجتہد صاحب نے فرمائش کی کہ وہ ذاکری کریں سید صاحب نے کتابیں نہ ہونے کا عذر کیا جناب نے اپنا کتب خانہ وقف کیا اور واقعۂ کربلا پر اردو کی پہلی کتاب ضیاء الابصار لکھ کر تیار ہوئی۔ پریس نہ ہونے سے یہ کتاب چھپ نہ سکی اور علمی حلقہ میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی بلوم ہاٹ یورپین لائبریرین نے انڈیا آفس کے کتب خانے میں اس کتاب کی موجودگی پر فخر کیا ہے میری لائبریری میں بھی یہ کتاب موجود ہے۔ دوسو برس کی اردو کا نمونہ اور طرز ذاکری کی مثال فاضل مؤلف کی نسل میں سید محمد سجاد مناظر تھے اور دیگر افراد اب بھی موجود ہیں۔

منشی عبدالخالق:۔ قوم کے جلاہے تھے ان کا شمار اچھے لکھنے والوں میں تھا عبدالخالق کے ہاتھ کی وصلیاں اور کتبے رئیسوں کے کمرے میں آویزاں کئے جاتے تھے۔ شاہ نصیر کا یہ شعر کس قدر عبرت خیز ہے۔

تانے بانے پر نہ کر دنیا کے ہرگز اعتبار
غور کر چشم حقیقت سے کہ سر پر کوچ ہے

جو کاتب:۔ نام سید علی حسن تھا نسخ و نستعلیق کے استاد تھے غالب کا منظوم ترجمہ دعائے صباح انھیں کا شاہکار ہے منشی شمس الدین اعجاز رقم سے سینئر تھے عہد شاہی کے کاتبوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے قدیم خو بو کے انسان تھے۔ آخر عمر میں کتابت چھوڑ دی تھی۔ صرف ایک ٹائٹل روزانہ لکھتے تھے جس کی اجرت اس وقت کے ریٹ سے دو روپیہ ہوتی تھی جو ان کے اور ان کے کبوتروں کے صرف کے لئے کافی تھی کبوتروں کا شوق اس حد پر تھا کہ اگر صفوۃ المصادر نام لکھنے بیٹھے اور ص کی گردن بنانے پائے تھے کہ کبوتر چھتری پر آ کر بیٹھا قلم رکھ کر کوٹھے پر چڑھ گئے اور گھنٹوں کے بعد اترے مزاج میں قناعت تھی ضرورت سے زیادہ پیسہ نہیں کماتے تھے شاگردوں کے ساتھ محبت سے پیش آتے تھے کوئی اولاد نہ تھی شاگردوں کا حال آئندہ آئے گا۔

وزیر باغ

نواب معتمد الدولہ سید آغا میر اس باغ کے مالک تھے ان کی وزارت ختم ہونے پر جب جائداد ضبط ہوئی تو وزیر موصوف کا باغ بادشاہ نے ملکہ جہاں کو بخش دیا۔ لکھنو میں وزیر باغ کی کمرک بہت مشہور ہے پھولوں کے درخت بھی اس باغ میں زیادہ سے زیادہ ہیں اور مٹے ہوئے نقش و نگار کی خوشبو اب بھی باقی ہے۔

امامباڑہ مغل صاحب: - اس امام باڑہ کو حضرت محمد علی شاہ بادشاہ کی صاحبزادی نے تعمیر کیا پھاٹک عالیشان دالان وسیع خوشنما محرابیں شہ نشین کی کرسی بلند اینٹوں کی جڑائی اور پلستر میں جو مصالحہ صرف ہوا تھا اس کا جزو غالب سنگ جراحت ہے اور استرکاری میں وہ چمک ہے کہ جو کسی عمارت میں نہیں۔ صحن امامباڑہ وسیع اور پہلو میں مسجد بھی عالیشان ہے جس میں خانۂ خدا کے گرد سرتا سر کمرے اور حجرے ہیں شاہزادی صاحبہ کا ارادہ تھا کہ امامباڑہ حسین آباد کی طرح اس کو بھی شیشہ آلات سے آراستہ کر کے وقف کر دیں اور وہ ایسا کر بھی سکتی تھیں بہت سلیقہ شعار بھی تھیں لیکن موت نے مہلت نہ دی۔ مرنے کے بعد زر و مال، دولت و جواہر کے علاوہ ایک کوٹھری میں مٹی کے وہ استعمال شدہ برتن جو مجلس کے حصوں میں آتے تھے بوتلیں، کنٹر، قرابے، اثاث البیت میں معمولی چیزوں کا بھی اسٹاک کپڑوں کے تھان، شالباف، کھاروے، مارکین تک کی گٹھریاں، کیا کچھ نہ تھا جواہرات کس قدر چھوڑے اس کا ذکر آگے آئے گا۔ اس خاتون کا نام امۃ الصغریٰ فخر النساء بیگم تھا اور شوہر مجاہد الدولہ فخر الدین سیف الملک زین العابدین خاں جلادت جنگ تھے۔ جو اپنی خوبصورتی اور تنومندی میں یکتا تھے۔ شاہی گاڑی پر جب سواری نکلتی تھی تو راستے روک دئے جاتے تھے اور تماشائیوں کے ٹھٹھ لگ جاتے تھے غصب حکومت کے وقت ان کا ارادہ جنگ و جدل کا تھا چنانچہ خود شاہ مرحوم اپنی مثنوی میں فرماتے ہیں ؎

پھوپھا میرے نواب والا حشم مہابت میں محسن بڑے ذی کرم
یہ کہتے تھے وہ ہاتھ میں لے کے تیغ نہیں تم سے جاں اپنی مجھ کو دریغ
اگر حکم ہو لالہ گوں رنگ ہو کہا میں نے موقوف یہ ڈھنگ ہو
میں ہوں بے گناہ مری شرکت نہ ہے مصیبت پڑے پر بھی طاعت رہے

لڑنے کی اجازت نہ ملنے پر بادشاہ کے ساتھ کلکتہ گئے اور وہاں بھی دل نہ لگا تو عراق میں زندگی بسر کی اور مجاہد الدولہ کی نسل کے لوگ کاظمین اور لکھنؤ میں موجود ہیں کربلائی نواب کہے جاتے ہیں۔ امامباڑہ کا پھاٹک منہدم ہو گیا۔ اصل عمارت اور مسجد خراب اور خستہ حالت میں موجود ہے وزیر باغ میں بیلا، چنبیلی، موتیا، موگرا، چمپا، جوہی، کیتکی، کیوڑہ، گلاب، سدابہار، گیندا، گل داؤدی، گل عباس، گل مہندی، نازبو، گل زنبق، چمپا گل رعنا، گل فرنگ، گل چاندنی، گل شبو، کلغہ سیوتی، گل دوپہر، سورج مکھی، لالہ سوسن، سرو، مور پنکھی، عشق پیچاں کیا کچھ نہ تھا۔

ٹکلیاں: - یہ محلہ جس کو ٹکڑی اور ٹکلیاں کہتے ہیں عہد آصفی کا آباد شدہ ہے پرانے آثار باقی نہیں چھپر بند اور ادنیٰ طبقے کے کاروباری بسے ہوئے ہیں نیشاپوری قبرستان اور پرانے چبوترہ کے اسپتال کے بیچ میں واقع ہے۔

عنبر گنج

عہد آصفی کا آباد شدہ محلہ ہے اور ایک زمانے میں مشرقی تہذیب کا گہوارہ تھا اعلیٰ تہذیب و تمدن کے لوگ بستے تھے اور خصوصیت سے اطبا کا مرکز تھا۔ محلہ کے نام میں کوئی توجیہہ مجھے تاریخ میں نہیں ملی۔ ممکن ہے معجون میں مشک و عنبر لکھنے والے اطبا کی تجویز پر عنبر گنج ہوا ہو یا کسی خواجہ سرا کے نامزد ہوا اور عنبر علی خاں شیدیوں کے نام ہوتے تھے۔ عنبر گنج سب سے پہلے طب کا مرکز تھا اس کے بعد جھوائی ٹولہ نے یہ جگہ لی اس محلہ کے حکیم سید علی بڑے نامور طبیب تھے ان کے تجویز کردہ نسخے میری لائبریری کی خطی بیاضوں میں موجود ہیں اور دواؤں کی ترکیب عام نسخوں سے جداگانہ ہے۔ مزاج ادویہ میں اسلوب خصوصی کا استخراج پایا جاتا ہے جس کو ایک سمجھدار حکیم ہی سمجھ سکتا ہے۔ حکیم

صاحب موصوف کے بیٹے ایک مرتبہ حکیم عبدالحفیظ عرف منجھلے صاحب طبیب نامور جھوائی ٹولہ کے مطب میں آگئے حکیم صاحب مریضوں کے ساتھ جو عدل کرتے تھے اس کو بھول کر صرف انھیں کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اور سارے مطب کو چھوڑ دیا۔ میں کم سنی میں اپنے والد ماجد کے ساتھ نسخہ لکھوانے گیا تھا میرا چشم دید واقعہ ہے منجھلے صاحب نے حکیم سید علی صاحب کے بیٹے کی آمد پر اپنے مطب میں فخر محسوس کیا اور والد ماجد سے موصوف کا تعارف کرایا وہ پیرانہ سالی کے عالم میں تھے سر پر چوگوشیہ ٹوپی کتروان داڑھی، جسم میں دگلا منہ پوپلا پچھتر سال سے کم عمر نہ ہوگی۔ خاموش انسان تھے یہ واقعہ ۱۹۱۰ء کے قبل و بعد کا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ بزرگ بھی حکیم تھے یا نہیں اور ان کی اولاد باقی ہے یا نہیں اس ایریا کے حکیم شیر علی اور ان کے بھائیوں اور ہمعصر اطباء کے ریاض الامراء صفحہ ۱۶ میں تذکرہ ہیں۔

اگلے حکیموں کے نسخے تین چار پیسے کے ہوتے تھے۔ روٴسا اور تعلقہ داروں کی خواہش پر قیمتی مرکبات تجویز ہوتے تھے ہر نسخہ بازار کی عام دوکانوں سے بندھتا تھا حکیم کے لئے ذاتی دواخانہ ہونا خلاف شان تھا۔ بعض اطبا ایسے ضدی مزاج تھے جو کسی امیر کے گھر پر بڑی فیس ملنے پر بھی نہیں جاتے تھے اور چاہتے تھے کہ جس کو علاج منظور ہو وہ خود مطب میں آئے اوقات کے اس قدر پابند اور پبلک مفاد کا اتنا خیال تھا کہ اگر گھر میں موت ہوگئی تو مطب کا ناغہ نہ ہوگا اور میت بعد مطب اٹھے گی بیشتر حکیم نماز شب کے پابند اور مریضوں کے لئے بالحاح وزاری تہجد میں دعائے صحت کرتے تھے غریبوں سے فیس لینا حرام تھا اور بعض بعض نسخوں کے ساتھ نادار مریضوں کو چھپا کر روپیہ پیسہ بانٹتے تھے بعض نے ریل نکلنے پر کبھی گاڑی میں قدم نہیں رکھا اور لکھنؤ کے باہر جانا اپنی بے عزتی اور وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے۔ مجھے زمانہ شباب میں ایک بڑے بوڑھے حکیم صاحب ملے ان کی طول عمر اور صحت جسم کا معیار یہ معلوم ہوا کہ موصوف نے کبھی وطن نہیں چھوڑا عمر بھر کسی شادی میں شریک نہیں ہوئے کبھی کسی کی دعوت قبول نہیں کی اور یہ وجہ بتائی کہ سفر روزمرہ کے پروگرام میں فرق لاکر صحت پر برا اثر ڈالتا ہے۔ شادی بیاہ میں شرکت اور دوسرے لوگوں کے یہاں کھانا کھانا اوقات میں بگاڑ پیدا کرکے مریض کردے گا نیز جس غذا کی طبیعت عادی ہے اس کے خلاف دسترخوان پر اقدام مضر صحت ہے سفر اور مہمانداری میں غذا کے اوقات بگڑنے کے ساتھ سونے کے اوقات فطرتاً بگڑتے ہیں اس لئے گوشہ نشینی میں صحت ہے۔

حکیموں کی ایمانداری اور خالص خدمت خلق کے جذبے کے ساتھ ساتھ عطار بھی ایماندار تھے دوائیں اصلی فروخت کرتے تھے زہر مہرہ خطائی کے عوض میں چھاپہ خانہ کے پتھر کا ٹکڑا نسخے میں شامل نہیں کرتے تھے۔ عرق بادیان کی بجائے نل کا پانی کبھی نہیں دیں گے حکیم اور عطار کسی میں بھی مذہبی تعصب نہ تھا سنی حکیم شیعہ مریض کے علاج میں جان لڑا دیتا اور شیعہ ڈاکٹر سنی مریض کو اچھا کرکے چھوڑتا عہد شاہی ختم ہونے پر ڈاکٹر بھی پیدا ہوچکے تھے ڈاکٹر ناصر علی سنی ہونے کے باوجود ہر شیعہ طبقہ میں پیش پیش تھے۔

اس وقت اشتہاری دوافروش نہ تھے عطائی بھی کم تھے خلائق زیادہ ترجان کی ذمہ داری کا احساس کرکے قابل حکیم سے رجوع کرتے تھے نوجوانوں میں تندرستی کو اپنے ہاتھ سے برباد کرنے کی عادتیں نہ تھیں اور امراض مخصوصہ پھیلے نہ تھے ایسے مریضوں کو دیکھ کر طبیب اپنی روزی کا شکار ہرگز نہ سمجھتا تھا اور دیانت کی روشنی میں فیصلہ کرتا تھا کہ کمزوری کے کیا اسباب ہیں ایک خوبصورت اور تندرست خوش رو توانا نوجوان کو شادی کے بعد محروم مسرت ہونے پر دنیا ءطب کی آخری شمع حکیم محمد نواب صاحب نے تین دن مکمل فاقہ دے کر غذا میں صرف امرتیاں تجویز کرکے بلا دوا صحتیاب کیا اور شہر میں ڈنکا بجا اسی طرح دور آخر کے دوسرے لاجی

طبیب نے مئی جون میں علاج شروع کردیا اور موسم سرما کا انتظار نہ کیا یہی بی پٹّی چڑھلنے پر مریض کو اتنا تیز بخار چڑھا اس کے خاندان کے جملہ طبیب تپ اتار نہ سکے اور وہ جاں بحق تسلیم ہوا اس قسم کے واقعات اور معالجات کو اگر تفصیل وار لکھتا ہوں تو کتاب کا حجم بڑھ جائے گا اس عنوان کے خاتمے میں مجھے وہ رقعہ نقل کرنا ہے جو ایک طالب العلم نے اپنے دوست کی کمزوری کا اظہار کرتے ہوئے حکیم صاحب کو لکھا اور اردائیگی مطلب میں تہذیب اور شائستگی میں چار چاند لگا دئے۔

"مردے ناقص بعقد صحیح دختر عدیم المثالے خواستہ وبعدم حرکت ماقبل التقا، ساکنین لازم آید امر بخو فعلی برانگیز دکہ عامل اوناصب گردد جزم است ایں ہمہ مہربانے خواہد بود"

چھاؤنی حسین الدین خاں

اسی علاقے میں یہ قدیم بستی بھی ہے جو اس وقت شہر کا ناکہ سمجھی جاتی تھی مگر اب گرے ہوئے مکانات شکستہ کھپریلیں کہیں کہیں چھپر اور کچھ خام مکان، یہ محلہ کا نقشہ ہے یہ تاریخی مقام تھا۔ اور نصیرالدین حیدر بہادر شہزادگی کے زمانہ میں یہاں نظربند تھے۔ اس محلے کے آثار قدیمہ میں نواب سعیدۃ النسار کی مسجد اور خود حسین الدین خاں کی مسجد ابھی موجود ہے اور یہ مسجد صاحب عالم بہادر کے مکان سے قریب واقع ہے درمیان میں کھیت اور راستہ ناقابل مرور ہونے سے میں اندر نہیں جا سکا۔ حسین الدین خاں کی بیٹی کا نام فخرالنسار بیگم تھا۔ آپ نے ایک قرآن شریف ۱۴ رشعبان ۱۲۵۵ھ کو مطبع محمدی میں حاجی محمد حسین کے اہتمام سے ۲۰ × ۲۶ تقطیع (۱/۲) پر بڑی صحت اور خوبیوں کے ساتھ دو حصوں میں سفید کاغذ پر چھپوایا پہلی جلد سورہ کہف ۵۵۵ صفحات پر ختم ہے اور جلد دوئم سورۂ مریم سے شروع ہو کر، ۴۴۴ صفحوں پر ختم ہے اگرچہ آخر میں غلط نامہ شامل ہے مگر حسن خط اور پختگی قلم کے لحاظ سے خط عرب کا نمونہ ہے۔

محمد علی شاہ بہادر کے عہدنامے سے واضح ہوتا ہے کہ بیگم صاحبہ موصوفہ کی تنخواہ ساٹھ[1] ماہوار تھی۔

امام باڑہ شہزادہ بیگم:۔ اس محلے میں یہ امام باڑہ کھنڈر کی صورت میں موجود ہے شہزادہ بیگم کے شوہر کا نام میر نواب تھا اس سے زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکے۔

شیخ ببر علی شہسوار:۔ عہد واجدی کے باکمال شخص تھے ہاتھ میں پانی کا بھرا کٹورہ لے کر گھوڑے کو کاوا دیتے تھے اور پانی نہیں گرتا تھا ان کا ہمعصر رشیدی علی پہلوان بڑا طاقتور شخص تھا۔ ایک دن شیخ نے کہا کہ جب جانوں میری ران زین سے کھسکا دو پانچ سیر امرتیاں ابھی کھلاتا ہوں گھوڑے پر بیٹھے رشیدی نے زور کیا مگر اپنی جگہ سے نہ ہلے ان کا ایک کمال یہ بھی تھا کہ گھوڑے پر سوار ہوتے بائیں ہاتھ میں لگام لی اور داہنے ہاتھ کی ہتھیلی ایک آدمی[2] کے سر پر رکھی اور گھوڑے کو پھیرنا شروع کیا ایسی ہی مختصر جگہ میں گھوڑا پھیرتے رہے اور کیا مجال تھی کہ ہتھیلی آدمی کے سر پر سے ہٹ جائے۔

---

[1] عہدنامہ ص۱۷۵ [2] قدیم ہنر ص۱۸۱

تیسرا باب

چاول والی گلی سے عالم نگر تک

گزشتہ باب میں اکبری دروازہ سے نکل کر محمود نگر ہوتے ہوئے چھاؤنی حسین الدین خاں تک کی سیر کی تھی اب چاول والی گلی سے عالم نگر تک جانا ہے قلم میں طاقت میرے بس کی بات نہیں کسی دوسری قوت کا کام ہے۔

چاول والی گلی :۔ اکبری دروازہ سے سیدھے چلے جاؤ تو پہلے خیمہ دوز ملیں گے جہاں دری چاندنی نمگیرہ خیمے ڈیرے تنبو کرائے پر چلتے ہیں اور شادی کے خلعت جھوٹے کام کے، روشنی کا سامان اور اب میز کرسی وغیرہ وغیرہ۔ عہد شاہی کے خیمہ دوزوں میں میر فدا حسین خیمہ دوز جو بڑھاپے میں دوکان کا جملہ سامان گوالٹولی کانپور اپنی لڑکی کے یہاں منتقل کر کے چلے گئے اور وہیں سپرد خاک ہوئے دراز قامت، بات کے دھنی شاید پہلے۔ ان کے بعد ضامن حسین اور پھر رضا علی وغیرہ کے ہاتھ میں یہ کاروبار آیا ان دوکانات کے ساتھ چاول کی دوکانیں شروع ہو جاتی تھیں عورتیں موصل لئے ہوئے وہاں سے چاول نکالتی ملتی تھیں اور اسی بنا پر گلی چاول والی گلی قرار پائی یہ نیچے کا حال تھا اور بالائے بام چوک کا انوکھا منظر جیسے ایک دریا سے گذرتے ہوئے تم نے دیکھا ہوگا کہ بیچ بیچ کہیں نالہ آکر ملا کہیں ندی کی شاخ پھوٹی اس طرح چوک کے گرد و پیش اور درمیانی تمام راہوں میں چوک کے خصوصیات پھیل پھیل کر شام اودھ کو وسعت دیتے رہے چاول والی گلی میں یہ بات چوک سے مسلسل تھی اسی گلی میں داہنے ہاتھ کی طرف بستی جان کا امام باڑہ اور سمت چپ نواب منصور علی خاں عرف نواب منجھو صاحب رمال جو دعا تعویذ میں کافی مشہور رہتے پانچ سو روپے ماہوار وثیقہ مرد حلیم شمیم وجیہ جاڑوں میں روئی کا لبادہ اوڑھے ہوئے خوش مذاق خوش فکر خدمت خلق میں بلا اجرت نفس ت فائدہ پہونچانا بستی کا امام باڑہ اساس کمزور ہونے سے ویران اور در و دیوار گرے پڑے منجھو صاحب بھی نہ رہے یہی علاقہ۔۔

نخاس قدیم :۔ عہد آصف الدولہ میں نخاس آباد ہو چکا تھا اور نخاس کی حدیں چاول والی گلی سے شروع ہوتی تھیں۔ لغت میں نخاس بازار بردہ فروشاں کے معانی میں آیا ہے لکھنؤ کا نخاس بنیادی لحاظ سے تو لونڈی غلام خریدنے کی جگہ کا نام تھا۔ لیکن اس بازار میں نوابی اور شاہی کے زمانہ میں پرانی ہر چیز ملتی تھی اور ضرورت مند اپنا اپنا مال بیچ کر پیٹ پالتے تھے۔ جمعہ کا دن سلطنت میں روز تعطیل تھا اور آٹھویں دن اکبری دروازہ کے سامنے بازار شروع ہوتا تھا دہلی میں بھی یہ بازار تھا۔

مادہ کوتا سنگ برہنگا مہ زنم   تبعہ بازار شب آدینہ را برہم زنم

امامباڑہ نواب اکرام اللہ خاں :۔ اکرام اللہ عہد آصفی کے سرمایہ دار تھے نواب حسن رضا خاں وزیر آصف الدولہ کی رفاقت میں دولت وحشمت کے مالک ہوئے۔ اکرام اللہ خاں اور تفضل حسین خاں چچا زاد بھائی تھے یہ امام باڑہ بائیں ہاتھ کی طرف سے ایک بلند زینے کے بعد پھاٹک سے گذر کر وسیع مگر محدود صحن بلند شہ نشین صرف ایک لانبا دالان جو طول میں امام باڑہ جھاؤلال کے بعد سب امام باڑوں سے بڑا ہے پہلی منزل میں سڑک کے کنارے نانبائی وغیرہ کی کچھ دوکانیں ہیں اور امام باڑہ میں داخل ہونے کا دوسرا پرائیوٹ راستہ اس طرف سے بھی تھا صدر درجہ کے محاذ بائیں صحن میں کمرے تھے بعض مجلسوں میں امام باڑہ شروع سے آخر تک بھر جاتا تھا اور کمروں کی چھت پر پردہ سا، امرا، بڑے طبقے کے لوگ بیٹھتے تھے۔ میر انیس کے چشم وچراغ سید خورشید[1] حسن عروج کے پڑھنے کی عید کے تیسرے اتوار کی مجلس میں سارا امامباڑہ کبھی کبھی بھرتا اور پھاٹک میں دیر کرکے آنے والوں کا ہجوم اور دولہا صاحب مرحوم کا ساقی نامہ میں یہ مصرعہ ع "سٹھ لگے ہیں ترے دروازے پہ میخواروں کے" مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ دنیائے تغزل کے آفتاب تابندہ حضرت علی رشید[2] کے پڑھنے کی مجلس بھی ۲۴ رجب کو اسی امامباڑہ کا کثیر انبوہ تھا روسا امرار کی گاڑیوں اور سواریوں سے تنگ سڑک بند ہوجاتی تھی۔

حکایت :۔ بانی مجلس نے رشید کے نئے مرثیہ کی مجلس میں جدت کی اور تربوز تقسیم کئے ہزاروں کے مجمع میں تربوز بانٹنا کار دارد۔ رشید کے معاصر جاوید کو تربوز جو بلا وہ سڈول اور گول نہ تھا وہیں تربوز کی شان تھی آپ اپنے دوستوں کے ساتھ تربوز ئے ہوئے نکلے اور جو پھبتی کہی اس کو نہ پوچھو ایک حکیم یاد آئے جن کا مسجد میں قیام تھا بعض حصہ جسم کی بزرگی سے پیجامہ بہت جوڑے در پھیلاؤ کا پہنتے تھے۔

نادان محل روڈ جب امین آباد سے بنتی ہوئی وکٹوریہ اسٹریٹ سے ملی تو اس امامباڑہ کے غربی گوشے میں ایک جدید مسجد کا اضافہ ہوا اب امامباڑہ اور مسجد ہر حصہ عمارت کا ۱۹۳۲ء کی بارش کے بعد سے منہدم ہے۔ اکرام اللہ بانی امامباڑہ کی قبر اس امامباڑہ میں ہے ان کے مرنے پر بانی ان کی قابض ہوئیں اور ورثہ زوجہ اکرام اللہ سے شہنشاہ حسین وکیل نے اپنے پسر نابالغ بادشاہ حسین وکیل کے نام سے بیعنامہ کرالیا۔ اس امامباڑہ کا ذکر اردوئے معلیٰ میں بھی ہے گزشتہ علم وادب کا ایک مرکز تھا جو اب اجاڑ ہے امامباڑہ کے رقعات مجلس اور پتہ میں "واقع نخاس قدیم" کی لفظ ہے۔

علی حسین کی نہاری :۔ نوابی سے اس محلہ میں علی حسین کی نہاری مشہور ہے نہار عربی میں دن کو کہتے ہیں اور اس رعایت سے نہاری دوپہر سے پہلے بک جاتی ہے جس طرح شامی کباب کی لفظ سہ پہر کی پخت کی طرف اشارہ تھا علی حسین نخاس کے پرانے نانبائیوں میں جس کی دوکان خوب چلتی تھی اور علی حسین محمدو کا شاگرد تھا جس نے شیرمال ایجاد کی آج بھی نخاس کے اس سائڈ میں نانبائی کی دوکان اور شیرمال کی پخت ہوتی ہے شیرمال اور باقرخانی پر اپنے محل پر آئندہ بحث ہوگی۔ آتش کہتے ہیں ؎

خون دل لخت جگر کی ہے نہاری تیار   رزق ہر صبح پہونچتا ہے مجھے بے منت

(نوٹ) رقعات مرزا قتیل میں نخاس کا بار بار ذکر ہے اور اس محلہ سے مراد یہی قدیم آبادی ہے۔

---

[1] ۱۳۵۰ھ میں انتقال کیا۔ [2] وفات ۱۳۳۶ھ

حویلی اور باغ :۔ رقعات مرزا قتیل سے واضح ہوتا ہے کہ نخاس میں ایک حویلی تھی جس کے پہلے دروازہ سے دوسرے دروازہ تک ایک قطعہ زمین تھا جو حصہ بیرونی کا طول و عرض میں دوگنا تھا اس زمین پر وسیع مکان تعمیر ہو سکتا تھا میر عبداللہ اور خواجہ جان وغیرہ کے یہاں مکانات تھے اور حویلی مذکور کے دوسرے دروازہ سے کنویں تک سو گز لانبی اور ۷۰ گز چوڑی زمین تھی ۔ دوسری سمت کنویں کی جگت سے سو گز لانبا اور پچاس گز چوڑا دوسرا قطعۂ زمین ہے جو تمام کا تمام باغ ہے اور پانچ سو درخت گلاب کے اور چھ سو درخت بیلہ موتیا اور کالے اور زرد انگوروں کے ۸۰ درخت علاوہ اس کے درخت مولسری آڑو چنبیا اور میوہ دار دوسرے درخت باغ میں تھے۔[1] محلہ کی موجودہ حالت دیکھ کر تصور بھی نہیں ہو سکتا کہ چاول والی گلی میں اتنا بڑا ٹکڑا کوئی زمین کا تھا۔ **شاگرد انیس** ۔مصاحب گنج پہونچکر معلوم ہوگا کہ وزیر اودھ میر فضل علی نے بڑی شاندار مسجد تعمیر کی حیات دبیر دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے برادر حقیقی کا نام میر نور علی تھا اور ان کے نواسہ میر مظفر حسین انیس کے شاگردوں میں تھے انہوں نے میر انیس سے بچپن میں فارسی پڑھی تھی یہ ۱۹۱۲ء میں اللہ کو پیارے ہوئے۔

امامباڑہ اکرام اللہ خاں کی مجلس کا ایک منظر خاندان منیر شکوہ آبادی کے قلم سے

سید محمد عسکری صاحب نقوی صفی پوری اپنی ڈائری میں جس کا اصل نسخہ میرے پاس موجود ہے لکھتے ہیں۔

۱۲/ اکتوبر ۱۹۰۴ء مطابق ۲/ شعبان ۱۳۲۲ھ چہارشنبہ آج شام کو میر بادشاہ علی صاحب بقامرحوم کے یہاں سے مجلس کا حصہ آیا کل جناب مرحوم کے چہلم کی مجلس ہے حصہ لے لیا گیا۔ دوسرے روز کے حال میں لکھتے ہیں "۹ بجے دن کو امامباڑہ اکرام اللہ خاں مرحوم واقع نخاس میں جاکر شرکت کی ۱۲ بجے دوپہر کو مجلس چہلم ختم ہوئی ۔مولوی مجن صاحب خلف الصدق مولوی سید علی صاحب مرحوم نے ذکر مصائب فرمایا مجلس ٹھس رہی رقت نہیں ہوئی"

معزز واقعہ نگار نے اس سے پہلے کی تاریخ میں شب کو گوہر جان آف کلکتہ کے رقص و سرود پر اپنی رائے اور مغنیہ بنگال کے کمالات پر گرویدہ ہو جانے کا ذکر کیا ہے اس خوشنوائی کے بعد مجلس کے مولویانہ ذکر کو وہ پُر اثر کیونکر سمجھتے ۔مولوی مجن صاحب کا نام مولوی سید محمد عباس تھا اور وہ نورانی صورت اپنے فن میں یکتا مانے گئے ہیں خوش گلو نہ تھے مگر ان کی مجلسیں ہمیشہ قابل ذکر ہوتی تھیں ۔ جن شخصوں نے مولوی صاحب کا زمانہ دیکھا ہے وہ میری رائے کا وزن محسوس کر سکتے ہیں۔

امامباڑہ شمشیر بہادر :۔ اس محلہ میں امام باڑہ اکرام اللہ خاں کے نزدیک امام باڑہ کا تذکرہ ملتا ہے جس کا نشان بھی باقی نہیں ہے

مرزا زینہ کی مسجد

اکبری دروازہ سے غلام حسین کے پل کو جاتے ہوئے داہنے ہاتھ پر انگریزوں کے زمانہ حکومت کا ایک پارک اور دست چپ کی طرف مرزا زینہ کی مسجد ہے یہ مقام چوراہہ ہے مسجد اوسط درجہ کی ہے نہ کوئی خاص بات ہے نہ کوئی خصوصیت ہے مسجد میں حوض اور مؤذن کا حجرہ بھی ہے بانی مسجد کا نام زین الدین احمد خاں تھا لوگ مرزا زینہ کہتے تھے ۔ ان کو علامہ تفضل حسین خاں کی ہمشیر ابتہاج النساء کے شوہر ہونے کا فخر حاصل تھا ۔مولانا احمد علی صاحب محمد آباد ضلع اعظم گڑھ سے جب تحصیل علم کے لئے لکھنؤ آئے تو اسی مسجد پہ ٹھہرے ۔ حیرتناک ضیق و عسرت کا مقابلہ کیا کچھ دنوں مسجد پر اذان دی اور مختصر مشاہرہ میں گذر اوقات کی کچھ دن اہل محلہ

---

[1] رقعات مرزا قتیل۔ صفحہ ۶۳

نے طالب علم سمجھ کر امداد پہونچائی اور غفران مآب کی مجلس درس میں شرکت کر کے علامہ بن کر نکلے اور ان کی اولاد میں علی میاں کامل ایسے ادبار پیدا ہوئے۔

مسجد کے روبرو مشعلچی شام کو پرے باندھ کر کھڑے ہوتے تھے اس انتظار میں کہ کوئی شادی بیاہ کے موقع پر روشنی کا سامان لینے ادھر آئے پنجشاخہ اور اس وقت کی روشنی کا سارا سامان یہاں آدمی بھیجکر حاصل کیا جاتا تھا۔

کسی وقت میں مرزا زینہ کی مسجد کے نیچے شامی کباب عمدہ ملتے تھے اور پھر عرق بید مشک، کیوڑہ گلاب کی بوتلیں اور خمیرہ بنفشہ سید صاحب کی دوکان پر قابل تعریف بکتا تھا۔

سنگی بیگ کا احاطہ

عہد اکبر بادشاہ میں صوبیدار اودھ جواہر خاں کے نائب قاضی محمود نے محمود نگر اور یہ احاطہ آباد کیا سنگی بیگ اس زمانہ کا کوئی سخت مزاج آدمی تھا یہاں کے رہنے والوں میں میر بادشاہ علی بقا بہت بڑے ادیب اور شاعر گذرے ہیں جو میر وزیر علی صبا کے چشم و چراغ تھے صبا کی ۱۲۷۱ھ تاریخ وفات ہے۔ سید عابد حسین رسا بھی ادیب کامل تھے اس خاندان کی ایک مسجد بھی محلہ میں موجود ہے ہر گوشہ میں اس محلہ کے کوئی صاحب کمال رہتا تھا فقیر کا تعزیہ امامی سنگی بیگ کے احاطے سے پہلی ربیع الاول کو اٹھتا تھا اور بادشاہ علی صاحب بقا محلہ کی آخری شمع تھے ان کے اوصاف جمیلہ میں جاوید کا یہ قطعہ تاریخ آئینہ زندگی ہے ؎

آں بقا، پاک طینت خوش نہاد — از جہان بے بقا رحلت نمود
ذاکر والا نسب عالی حسب — قلب او از رنج و غم مجروح بود
بود نمک پاش جراحت ہر نفس — نظم دلکش از پئے قلب حسود
روشنی بخش جہان بدان چراغ — از ہوائے نور گشتہ آہ زود
عالم فن بود و نقاد سخن — مثل او شاعر نہ آمد در وجود
او نشستہ چو بہ منبر آہ آہ — ہر طرف بر خواست آواز درود
چو بگویم دامن او را سحاب — بود یکتا در سخا و بذل وجود
خم سر محراب مسجد ہم شدہ — مثل چوں او را کی و ساجد نبود
سال فوتش عیسوی جاوید گفت — ہست ممکن شرح اخلاص و دود
خود مرض آخر علاج زخم شد — چوں اجل آید ز کوششہا چہ سود
از سر افسوس گفتم ایں چنیں — داغ شاہ کربلا بر سینہ بود
۱۹۰۲ء

بقا کی قبر صحن مسجد کے سامنے ہے ان کو مرزا دبیر کے داماد ہونے کا فخر حاصل تھا مرزا صاحب نے لڑکی کو اتنا جہیز دیا تھا کہ گھر میں سمائی نہ تھی عاقبت بیں داماد نے اس اثاثہ سے مکانات خریدے اور وہ محلہ میں کئی مکانوں کے مالک قرار پائے۔

مسجد و امامباڑہ :- احاطہ سنگی بیگ میں ایک امامباڑہ کا بھی پتہ چلتا ہے جو بقا ہر بقا کے مورث اعلیٰ کا تھا۔ ممکن ہے کہ ان کے والد منیر علی شیدا یا دادا صبا بانی ہوں مگر عمارت کا نشان باقی نہیں ہے خیال ہوتا ہے کہ مسجد سے ملا ہوا ہو گا مسجد موجود ہے۔

شاہ گنج :- نخاس اور احاطہ سنگی بیگ سے ملا ہوا واقع ہے اس محلہ میں مرزا محمد مرتضیٰ عرف مچھو بیگ رہتے تھے جو مایہ ناز ادیب اور صاحب زبان تھے ان کا مرتب کردہ اردو کا لغت بہار ہند حصہ اول میں نے دیکھا ہے لفظ ایندھن تک پہلا حصہ چھپا ہے اور باقی تین حصے نہیں چھپے ـــــ اس لغت میں مرزا سلیمان قدر بہادر کی تقریظ ہونے سے لٹریچر کا معیار بہت بلند ہوگیا ہے وہ شاہزادہ صاحب کی صحبت کے خاص آدمی تھے اس لغت کی طباعت شایان شان نہیں ہے لکھائی چھپائی رسمی ہے نہیں کہا جاسکتا کہ اس محلہ کو کس نے آباد کیا حیدر گنج سے آنے والوں کے لئے اس علاقے کو چوک کا مقدمہ یا تمہید اور چوک سے گذرنے والوں کے لئے چوک کا تتمہ کہنا صحیح ہے دوسرے درجہ کی زنان بازاری بالاخانوں پر اور نیچے خیمہ دوز شامیانے اور شادی بیاہ کے تقاریب میں کرایہ پر دی جانے والی چیزیں ۱۹۱۹ء میں رضا علی میر فدا حسین کی دو کانیں اور آگے بڑھ کر بستی کا امام باڑہ جو جدید عمارت ہے اور نواب سلیمان بہادر اس کے متولی ہیں

حسین باندی طوائف :- بازار حسن کے چند کوائف قابل ذکر ہیں سید افضل حسین ثابت مرحوم نے ایک شادی میں بانی محفل کے سلیقہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دو محفلیں ترتیب دیں ایک ثقہ طبقہ کے لئے دوسری عام دوستوں کے لئے۔ خاص بزم میں مرزا دبیر اور شہر کے دوسرے چنے ہوئے لوگ، مگر ادھر کی اطلاع یہاں بھی آجاتی تھی مرزا دبیر کو معلوم ہوا کہ حسین باندی نے ان کی غزل گا کر محفل کو زیر و زبر کردیا۔ دل پر اثر ہوا وہ ہرگز گوارا نہ کرتے تھے کہ ان کی غزلیں زنان بازاری کی زبان سے محفل رقص و سرود میں گائی جائیں۔ بڑی افسردگی سے آپ وہاں سے اٹھے گھر پہونچ کر نماز شب میں مصروف ہوئے دل سے رنج نہ گیا۔ اس مقام پر ان کے نانا صاحب کا بیان ہے کہ دوسرے دن میں جو شاہ گنج میں ہو کر نکلا تو حسین باندی کا لڑکا ملا اور کہا کہ آپ اجازت دیں تو میں کسی وقت حاضر ہوں میں نے کہا اچھا پانچ بجے شام کو آنا۔ جب وہ آئی تو مجھ سے کہا کہ آپ نے مرزا صاحب سے یہ ذکر کردیا کہ آپ کی غزل حسین باندی نے گائی۔ میں بولا۔ ہاں، باتوں باتوں میں میں نے کہا تھا تو پھر کیا ہوا۔ مرزا صاحب نے پہلے تو مجھ سے پوچھا تم کو میری کئی غزلیں یاد ہیں۔ میں نے جواب دیا بس ایک غزل، انھوں نے مطلع پوچھا میں نے مطلع پڑھ دیا۔ پوچھا کتنے شعر یاد ہیں میں بولی نو دس شعر۔ پوچھا رات کو یہ غزل گائی بھی تھی۔ کہا جی ہاں، یہ سنکر وہ گھر میں اٹھے ہوئے چلے گئے اور ایک توڑہ پانچ سو روپے کا ایک رومال میں باندھ کر لائے مجھ سے فرمایا یہ روپیہ تم اپنی ڈولی میں رکھ لو۔ آج سے اس غزل کو نہ گانا میں نے بہتیرا کہا کہ میں آئندہ اس غزل کو نہ گاؤں گی آپ روپیہ رہنے دیجئے اس کی ضرورت نہیں فرمایا نہیں میں اب یہ روپیہ نکال چکا تم اس کو کسی کار خیر عزاداری وغیرہ میں صرف کرنا۔ جب مجھے قسم دے کر مجبور کردیا تو میں وہ توڑہ ڈولی میں رکھ کر آئی۔ اس حکایت کے لکھنے سے غرض یہ ہے کہ خود مرزا صاحب نے کوشش کی کہ ان کا عاشقانہ کلام مشہور نہ ہو اور ارباب نشاط نہ گائیں (حیات دبیر ص۵۰)

غلام حسین کا پُل

چوک ختم ہوتے ہی زمین کا طبقہ پست ہونا شروع ہوتا ہے اور سارا پانی برساتی اور روزانہ لوگوں کی ضرورتوں کا سرکٹے نالے میں گرتا ہے اور بارش کے زمانے میں تا دیر راستہ بند ہو جاتا ہے منصور نگر جانے کے لئے راہ میں ایک پختہ پل کی ضرورت تھی جس کو غلام حسین نے انجام دیا۔ نہیں کہا جاسکتا کہ غلام حسین کس عہد کے آدمی تھے۔ اس نام کے حسب ذیل لوگ اودھ میں شہرت یافتہ ہوئے ہیں۔

(۱) عہد سعادت علی خاں میں غلام حسین چکلہ دار تھے اور سلطان پور میں ان کا قیام تھا (۲) غلام حسین اصفہانی یہ دونوں شخص

ہمعصر تھے مؤخر الذکر کے والد کا نام مرزا محمد اسمٰعیل اصفہانی تھا ان کی مہر میں یہ عبارت تحریر تھی غلام حسین خاں بہادر ثابت جنگ ۱۲۱۷ھ صاحب تصنیف تھے اور ماہ صفر ۱۲۳۲ھ کے مخطوطات میں ان کی تحریریں میرے سامنے ہیں۔ مرزا محمد اسمٰعیل سعودی گردہ کے ہاتھ سے غدیر کے دن شہید ہوئے تھے ———— (۳)

غلام حسین سائیں جن کے امام باڑہ کا قیصر باغ میں پتہ ملتا ہے (۴)، داروغہ غلام حسین (۵) غلام حسین جو عہد غازی الدین حیدر میں تھے کوکب تخلص تھا محامد حیدریہ پر ان کی تقریظ ہے اور قصبہ جائس میں ان کی بنوائی ہوئی جامع مسجد اور پختہ حویلی ابھی تک موجود ہے پل غالباً انھیں کا بنوایا ہوا ہے (۶)، منشی غلام حسین (۷)، میر غلام حسین بانکے۔

کتاب ہذا کے اثنائے تالیف میں مجاور درگاہ حضرت عباس نے کوشش کر کے اپنا بیان قلمبند کرایا ان کو علم سینہ اور خاندانی معلومات سے پتہ ہے کہ غلام حسین کا پل جن کا ہے وہ سید اور بانکوں میں تھے ان کے زمانے کے اکثر بانکے ان کے نام لیوا یا شاگرد تھے اور سب ان کا کلمہ پڑھتے تھے ان کو کسی موقع پر روپیہ کی ضرورت ہوئی اور مہاجن کے یہاں گئے، وہ دیکھ کر ڈر کے مارے کانپنے لگا۔ فرمایا مجھے پانچ ہزار روپے کی ضرورت ہے فلاں دن اور تاریخ دیدوں گا اس نے بہت ادب سے کہا کہ آپ کے خود تشریف لانے کی ضرورت نہ تھی کسی کو بھیج دیتے انھوں نے ایک ڈبیہ بھی دی اور کہا کہ اس کو رکھ لو۔ میر صاحب روپیہ لے کر گھر آئے اور جب ادائگی کا وقت آیا تو مہاجن کے یہاں حسب وعدہ پہونچ گئے ڈبیہ طلب کی روپیہ سامنے رکھا مہاجن نے روپیہ لیا اور ڈبیہ جو کھولی تو اس میں کچھ نہ تھا اس کی روح پرن گئی کہ جو کہیں گے تاوان دینا پڑے گا میر صاحب نے مضطرب دیکھ کر تشفی دی اور کہا ڈرو نہیں۔ اس میں میری مونچھ کا ایک بال ہے وہ موجود ہے روپیہ اسی کی قیمت تھا۔

(نوٹ، منشی غلام حسین جائسی تین بھائی تھے۔ غلام حسن، غلام حسین اور غلام رضا۔ ہر ایک کو سلطنت اودھ سے تعلق تھا غلام حسن اتالیقوں میں کسی ڈیوڑھی پر مقرر تھے منشی غلام حسین کی قبر پکے تالاب کے قریب جائس میں موجود ہے اور ان کے دونوں غلاموں عبداللہ اور عبدالحسین کی قبریں بھی ان کے ساتھ ہیں۔

اس پل پر قدسیہ بیگم زوجہ نصیر الدین حیدر بہادر کی ماں کا عالیشان مکان تھا جہاں وہ قدسیہ بیگم کے زہر کھانے کے بعد اپنے نواسے پیرن کو لیکر جو قدسیہ بیگم کے شوہر اول سے تھا چلی آئی تھیں داروغہ غلام حسین معتمد الدولہ کے خیر خواہوں میں تھے جب معتمد الدولہ کی رہائی ہوئی تو غلام حسین بھی بادشاہ کی طرف سے استفسار حال کو آئے تھے کہا جاتا ہے کہ غلام حسین کا امام باڑہ بھی یہاں تھا چنانچہ کمہار کا چاک جس مقام پر چلتا ہے اور کمہار کے بال بچے جس گوشے میں رہتے ہیں یہ وہی آثار قدیمہ امامباڑہ کے ہیں غلام حسین کی مسجد کا ذکر آگے آئے گا۔

اچھوتی گلی

تاریخ اودھ کا اہم باب اچھوتوں کی سرگزشت ہے جس کو واقعہ نگاروں نے افسانوی رنگ دیکر وہ وہ طبع آزمائی کی ہے کہ ورق کے ورق سیاہ ہیں۔ حالانکہ کئی معزز اہل قلم نے اس افسانہ کی حقیقت کا پول کھولا ہے اور میں آزادی کے ساتھ اس نتیجے تک پہونچا ہوں کہ اگلے زمانے میں کتنی لڑکیاں ایسی تھیں جو ہمسر نہ ملنے سے بن بیاہی رہ گئیں اور سن گذرنے پر اگر امکان ہوا بھی تو ان کو شادی کی طرف رغبت نہ ہوئی۔ خاندان کے لوگ اور دوسرے غیر متعلق لوگ ان کی عفت اور پاکدامنی کو نگاہ عزت سے

دیکھتے تھے ۔ ایسے واقعات نوابی سے شاہی تک برابر ہوتے رہے ۔ بادشاہ تک کچھ خواتین کی خبر تجرد پہونچی اور انہوں نے تنخواہیں پرورش کے لئے مقرر کردیں تو اس امداد کو اچھوتیوں کا محکمہ قائم کرنا ہرگز نہ کہا جائے ۔ تاریخ اودھ کو نگاہ تنقید و نظر سے دیکھنے والے یورپ کی داد عیش پر غور نہیں کرتے ۔

ایران کے سیاسی اور ادبی جریدہ دنیا مورخہ ۱۰ شہریور ماہ ۱۳۳۶ھ نے صفحہ ۳ پر ایک بلاک شائع کیا ہے جس میں چند لڑکیاں نئے فیشن کے عریاں لباس کے برخلاف سروں پر مقنع اور تمام جسم کو تا قدم چھپائے ہوئے مگر کشادہ رو چہل قدمی کر رہی ہیں - ان تصویروں کو دیکھ کر عورت کا وقار رفتہ یاد آجاتا ہے ۔ معاصر مذکور کا ان نوجوان عورتوں کے بارے میں یہ بیان ہے کہ "دختران تارک دنیا کہ بخواہران خدا در پاریس و صومعہ آں شہر زندگی بسر می کنند" عیسائیوں کے نزدیک خدا کے بیٹے پر ایمان تو ان کی قدیم روایت تھی مگر خدا کی بہن اب پیرس ہی پیدا ہوئیں اگر اچھوتیوں کا وجود سلطنت اودھ میں صحیح روایت سمجھا جائے تو وہ بہرحال چند مقدس ائمہ کی طرف نسبت تھی جو رشتۂ زوجیت کی صلاحیت رکھتے تھے اس پر واقعہ نگار حقیقت کو افسانہ قرار دے رہے ہیں اور پیرس کے متمدن شہر میں مقدس لڑکیاں اس منزل پر ہیں جو مسلم اکثریت کے نزدیک اللہ کے لئے قبیح ہے اور اچھوتیوں سے کہیں بدتر یہ لڑکیاں ہیں جو انگریز خدا کی بہن سمجھ رہی ہیں ۔ اچھوتیوں کا وجود ڈیڑھ سو برس کا واقعہ ہے اور پیرس کا منظر عصر حاضر کی عیش پسند حکومت کا ذوق طبع ہے ۔ اس خبر کے وجود پر گلی گواہی دیتی ہے ۔

بھارت کے مندروں میں دیوداسیاں جو ساری عمر دوشیزگی کی زندگی بسر کرتی ہیں اور ان کے لئے یہ مشہور کر دیا جاتا ہے کہ ان کے اعصاب اور ان کی جلد میں قاتل زہر ملا ہوا ہے جو مس کرے گا فی الفور ہلاک ہو جائے گا اس ماحول کو سامنے رکھ کر اچھوتیوں کا افسانہ تراشا گیا ہے ۔

نجم الغنی نے سلطنت اودھ کے حریف طبقے کو خوش کرنے کے لئے قلم اٹھایا اور بعد میں کام کرنے والے دوسرے طبقے نے رنگ آمیزی کی اور یہ نہ دیکھا کہ نجم الغنی نے اس شاخسانہ کی سب سے پہلے اپنے قلم سے رد کی ہے اور ان کا یہ لکھنا واقعے کے اضطراب میں کافی ہے ۔

آخر سید محمد صاحب مجتہد خلف مولوی دلدار علی صاحب نے فتویٰ لکھ کر بھیجا کہ اگر اس سے ثواب مقصود ہے تو بہر کیف حاصل ہوا ۔ اب مناسب ہے کہ ان لڑکیوں کا نکاح مومنین کے ساتھ کر دیا جائے تو یہ ثواب عذاب میں داخل کر دے گا ۔

(تاریخ نجم الغنی ص ۳۹۷ جلد چہارم)

نجم الغنی کی کاوش قلم کے بعد بیگمات اودھ میں دوسری بار بحث ہوئی یہاں تک کہ فرنگی محل کے مرکز علم اور ذمہ دار طبقہ سے اس عامیانہ اسلوب نگارش کا جائزہ لیا گیا اور سیر حاصل بحث ہوئی ۔

انوار رزاقیہ کے مطبوعہ نسخہ میں نہیں بلکہ اصل مسودہ میں اچھوتیوں کے سلسلے میں مولانا عبدالرزاق صاحب (متوفی ۲۵ صفر ۱۳۰۷ھ) کا جو بیان ہے وہ نہ صرف تاریخ اودھ کے ایک راز کو کھولتا ہے بلکہ انگریزوں کی زبردستیوں کا ایک ہولناک تصور بھی ہمارے سامنے پیش کرتا ہے ۔ اچھوتیوں کے سلسلے میں یہ بالکل نیا پہلو ہے جو کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتا اصل راوی مشاہدے کی بنا پر بیان دے رہے ہیں ۔ مولانا کے مرید مولوی فخر الحسن موہانی کہتے ہیں کہ مولانا عبدالرزاق صاحب فرماتے تھے کہ ۔

نصیر الدین حیدر بادشاہ نے ایک مکان خفیہ گومتی کے اندر پانی کے نیچے بنایا تھا اور مشہور کیا تھا کہ اس میں بارہ امام کی اچھوتیاں رہتی ہیں وہ مکان ایک مکان خلوت تھا کہ اعلیٰ درجے کے ارباب دانش اور ہر فن کے کامل ارباب حل و عقد وہاں جمع ہو کر امور سلطنت پر رائے زنی کرتے تھے۔ مولانا عبد الباری صاحب نے اپنے دادا کے اس قول کو نقل کرتے ہوئے اس تخلیہ کا پتہ دیا تھا اور مولانا عبد الوالی اور مفتی ظہور اللہ کا تہ خانہ میں آنا نقل کیا ہے۔ اچھوتی گلی کا غلام حسین کے پل پر ہونا بھی واقعہ کے افسانہ ہونے کا مددگار ہے۔ شاہی عمارت میں دریا کے اس پار یا ادھر کہیں کسی عمارت کا اچھوتیوں کی طرف منسوب ہونا نہیں ہے۔

منصور نگر

منصور نگر شہر کے امراء و رؤساء و شرفاء کے رہنے کی جگہ اور بعض بانکے جن کی نزاکت مزاج زود رنج ہونے کے واقعات کو دوہرانے سے مفاد عامہ نہیں اس لئے ترک کرتا ہوں یہاں کے رہنے والوں میں مرزا محمد تقی امیر الدولہ ولد حیدر بیگ کے پوتے قابل ذکر ہیں۔ موصوف نے جوزف خارث عیسائی کو غدر میں پناہ دی تھی۔

سلطان بہادر لائن سے ٹاپے والی گلی جاتے ہوئے سمت غرب بنیادباغ کے کھنڈر ایک دیوار کی صورت میں موجود ہیں۔ اور مشہور ہے کہ سعادت گنج سے اٹھ کر نواب سعادت علی خاں نے بنیادباغ ہی میں قیام کیا تھا اور غازی الدین حیدر بہادر کا محل اسی باغ میں قرار پایا اور بنیاد سلطنت اودھ قائم ہوئی۔

ٹاپے والی گلی میں میر حامد علی مختار پیشہ ایک سید رہتے تھے جن کو خدا نے وہ بلند اقبال اور مدبر فرزند عطا فرمایا۔ جس کا نام شیعی دنیا میں باقی رہے گا خان بہادر نواب مہدی حسن انھیں کے چشم و چراغ تھے۔ انگریزی داں نہ ہونے کے باوجود بڑے بڑے تعلیمیافتہ ان سے قانونی مشورہ لیتے تھے۔ شیعہ اوقاف اور قومیات میں ان کا نام بار بار آتا ہے خوش نصیب ایسے تھے کہ ان کی ایک بہن شمس العلما سید ناصر حسین صاحب کو منسوب ہوئیں اور دوسری سید محمد باقر صاحب مجتہد کو۔ لکھنؤ کے زندہ دل طبقے نے ان کو پہلا خطاب فی النورین کا دیا بہن کے ورثہ پانے سے اپنے آبائی محلے سے کٹرہ ابو تراب خاں میں آئے ۳ ذی الحجہ ۱۳۲۷ھ کو انتقال کیا اور امامباڑہ غفرانمآب میں سپرد خاک ہوئے۔

<u>کاظمین</u>۔ اس روضہ کے بانی کا نام جگن ناتھ تھا اور وہ قوم کے اگروال تھے مرزا منڈی سے قریب نال دروازہ میں رہتے تھے حضرت امجد علی شاہ کے زمانہ ۱۸۴۲ء میں اسلام لائے اور نام غلام رضا خاں رکھا گیا۔ حسن خدمات سے شرف الدولہ خطاب ہوا۔ درگا پرشاد ہندو مورخ ان کے حال میں لکھتے ہیں " رفتہ رفتہ در بارش مرجع انام و سرمایہ حل و عقد خواص و عوام شد مرد با جرأت و دوجاہت بود " جلوس سلطان عالم کے چھٹے برس ۱۲۶۹ھ میں ان کے حساس دماغ کو خیال ہوا کہ لکھنؤ میں تمام روضوں کی نقلیں موجود ہیں شبیہ کاظمین نہیں ہے منصور نگر کے آگے ایک بڑا ٹکڑا زمین کا خرید کر روضہ بنوایا جس کی گل کاری اور رنگ آمیزی نہایت دلکش نظر فریب اور قابل دید ہے روضہ میں داخلہ ایک شاندار پھاٹک کے ذریعے ہوتا ہے جس کے بعد وسیع صحن ہے اور دو بلند گنبد پہلو بہ پہلو ہیں۔ ان گنبدوں کا انداز ساخت اس طرح ہے کہ دو بڑے مدوّر مونڈھے بنا کر دونوں پر شلجم نما قبے بنائے ہیں اور خوشنما کلسیاں نصب کی ہیں دونوں مونڈھوں یا قبوں پر سونا چڑھا ہوا ہے اور طلائی گموں کی ایسی جڑائی دکھائی ہے کہ جب

---

[1] دیکھو نیا دور ماہ اگست ۱۹۵۵ء صفحہ ۴۲ مقالہ مولانا محمد رضا فرنگی محلی

سورج کی کرن ان قبوں پر پڑتی ہے تو چمک دمک اور جگمگاہٹ سے آنکھوں میں چکا چوند ہوتی ہے۔
قبے کے نیچے چوبی حضیرے میں حضرت امام موسیٰ کاظمؑ اور امام محمد تقیؑ کی قبروں پر پوشش پڑی ہوئی ہے اور دو تابوت رکھے ہیں۔ ضریح کے سامنے انگیٹھی، اگردان، رحل پر قرآن شریف اور بعض تبرکات قدم رسولؐ کا ایک پتھر بھی ہے۔ چھت آئینہ بندی کی ہے جس سے پرانی آرائش کے منظر سامنے آجاتے ہیں۔ دیواروں پر پرانی قسم کے بوکٹے زر فریم، اور قد آدم آئینے نصب ہیں۔ بالائے عمارت چار مینار دور سے بہت خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ رواق میں دونوں طرف مجالس اور نماز جماعت کی جگہ ہے۔ غلام گردش میں ایک طولانی سنگی تعزیہ بھی نصب ہے جس کو سید تصدق حسین صاحب نے اپنے مقالے میں روضہ ظاہر کیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کاظمین کے ہر دو معصوم کی نقلِ قبور تو قبے کے نیچے برابر برابر موجود ہیں یہ یا تو کسی رئیس کی قبر کا سنگی حضیرہ ہے یا تعزیہ ہے جس کے بارے میں نہ تو تاریخ میں صراحت ہے نہ کوئی بوڑھا باقی ہے جو نشاندہی کرے۔

غلام رضا خاں نہایت خوش فکر مقدور آدمی تھے اور زندگی کے ہر دور میں کامیاب رہے اور پکے راسخ العقیدہ مسلمان تھے غدر ۱۸۵۷ء میں شرف الدولہ کی تلاش میں روضہ پر بھی گوروں کا حملہ ہوا اور یہ مقدس روضہ بھی انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔ جب شرف الدولہ کے عقل و تدبر سے روضہ گوروں کے قبضے سے واپس ملا تو پھر نئے سر سے آراستہ کیا اور لٹے ہوئے سامان کی فراہمی میں شرف الدولہ نے جان لڑادی۔ روضہ کا سن تعمیر اس قطعہ سے واضح ہے ؎

در زمانِ ظلِ حق سلطان عالم بادشاہ — ناصرِ دین محمد دوستدارِ کاظمین
افضل و اشرف غلام حضرت موسیٰ رضا — ہست شرف الدولہ باصد جاں نثارِ کاظمین
زوجہ اش شرف النسا خانم کنیز فاطمہ — محسن خلقِ خدا خدمت گذارِ کاظمین
از سکوں را شہرت دار و شرف در ہر دو ہم — یا رفت تسکین از عطائے بیشمارِ کاظمین
ہر دو عالی منزلت با حسن نیت ساختند — خوشنما نقلِ رواق نورِ کاظمین
شد نصیب ہندیاں الحال بے رنج سفر — خاک بوسِ روضہ گردوں وقارِ کاظمین
لکھنؤ شد غیرتِ فردوس زیں رنگیں بنا — رونق اسلام افزود از بہارِ کاظمین
گشت نقل مدفنِ سبطین ایں بیت باشرف — گفت راقم سال تاریخش مزارِ کاظمین ۱۲۶۹ھ

روضہ کے تحفظ میں کوئی جائداد وقف نہیں ہے صرف دو ہزار روپے کے نوٹ ہیں اور دوکانات کا کرایہ ماہوار آمدنی ہے ۱۹۱۶ء سے یہ روضہ آثار قدیمہ میں شمار کیا گیا ہے اور وقف حسین آباد کے زیر انتظام ہے غلام رضا خاں نے ۲۶ جمادی الاول ۱۲۷۲ھ کو انتقال کیا۔ مرتے وقت تک ان کی زبان پر سورۂ توحید کی آیتیں تھیں اور اسی روضہ میں دفن ہوئے۔ یہ قطعہ تاریخ ان کی قبر پر موجود ہے ؎

چوں دین حق غلام رضا خاں قبول ساخت — زیں دولت زاہد شرف الدولہ نام شد
با صدقِ دل نمود بنا نقلِ کاظمین — زیں جانواں ساخت کہ عالی مقام شد
تا زیست خیر خاتمہ بالخیر گشت و بس — چیزش پسند ایزد خیر الانام شد

تا نزع داشت سورۂ اخلاص وردِ لب — اخلاص میان ہمہ خاص وعام شد
در کاظمین گشت چو آسودہ زیرِ خاک — رحمت مجاور لحدش تا قیام شد
ناگاہ عقل طالب تاریخ سال فوت — از پیشگاہ ہاتف شیریں کلام شد
بگرفت حرف معجم و گفتا بقلب صاف — از کاظمین راہی دار السلام شد ۱۲۷۸ھ

قبر شرف الدولہ کے پہلو میں شرف النساء شیریں کی قبر ہے شرف النساء خانم اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر خوب کہتی تھیں ان کے ابتدائی استاد میر محمد حسین بشر تھے پھر امداد علی بحر سے اصلاح لی اور اس قدر مشق بہم پہونچائی کہ صاحب دیوان ہوئیں۔

مسجد کوفہ :- احاطہ روضہ سے ملحق مسجد کوفہ کی نقل ہے اور چاروں طرف محراب دار دالان ہیں پچھم کا درجہ محراب و منبر سے قبلہ رخ ہے اور وسیع صحن میں انبیا کے مصلّوں کی جگہ طوفان نوحؑ کا نشیب، دھوپ گھڑی کا ستون غرض مکمل نقل ہے اور عمارت سرخ رنگ کی ہے۔ صحن کاظمین اور مسجد کوفہ میں کھجور کے درخت ہیں اور دیوار مسجد کے پاس وضو کا زمین دوز حوض ہے اور آخری حصے میں تعزیہ دفن ہونے کی جگہ ہے نقل روضہ حضرت مسلم وہاں بھی مسجد کوفہ میں موجود ہے یہ عمارت نواب رفیق الدولہ کی بنوائی ہوئی ہے۔

شرف الدولہ اپنی سیاست سے انگریزی عملداری میں بھی مقرب بارگاہ رہے چنانچہ رام سہائے نے ان کے حال میں لکھا ہے شرف الدولہ غلام رضا خاں چیلا امجد علی شاہ بعد انقلاب سلطنت اپنی حسن کارگذاری سے پیشگاہ حکام انگریز میں خدمت گنجہات و باغات سے سرفراز ہوئے۔ حاضری دربار بہ جبیں قدرے عذر کیا چند سپاہی ان کے مکان پر گئے وہ انکار کرتے رہے بندوق چلی آخر کو فوج سے اطمینان حاصل کر کے حاضر دربار ہوئے اور انتظام رسد رسانی اور باغات عطا ہوا[1]۔

نواب آغا علی خاں :- محلہ کے رہنے والوں میں نواب صاحب کا حال بیان کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے آپ محلہ کے رئیس تھے۔ بدیع تخلص تھا جس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اگر اس لفظ کے اختیار کرنے میں ناظرین کو کوئی اعتراض ہو تو میں پوچھوں گا کہ آفتاب الدولہ زیب النساء یہ نام اور لقب کب صحیح ہیں اگر اس کو دنیا نے صحیح سمجھا تو بدیع بھی صحیح ہے۔ نواب اصغر حسین فاخر کی صحبت میں یکتائے عصر تھے جن کا نام تقی تھا نام کو مقطع میں اس لئے نہیں آنے دیا کہ میر تقی کا احترام مطلوب تھا ع ہر عیب کہ سلطان بہ پسندد ہنر است پانچ سو باسٹھ روپے کے تنخواہ دار تھے۔ صحبت کے لوگ حوصلے کے مطابق داد دیتے تھے۔ ہاں خوب آیا اڑتیس روپے پنشن کے تھے ۱۰ لاکھ روپے کا اندوختہ تھا جو خیر و خیرات میں صرف کر چکے تھے یہ دولت نجم الدولہ کی تھی جو عمر بھر بلند حوصلگی سے صرف ہوئی۔ ان کی سرکار سے مصاحبین کو بجائے ماہوار کے روزینہ مرحمت ہوتا تھا اور خزانچی کو صحبت کے اشاروں پر عبور حاصل تھا کسی کا نام قاسم ہوا تو قاف کے چار آنے محسن کے لئے میم کے دس آنے اور اگر دو رفیقوں کے نام میں ایک ہی حرف ہوا تو جو سن میں زیادہ تھا اس کے لحاظ سے بڑی میم کو اس قدر چھوٹی میم کو اتنا یہ دینے کے انداز تھے تاکہ کسی خود دار کی سبکی نہ ہو۔

نواب اقبال الدولہ کا سکونتی مکان بھی کاظمین میں تھا اور مکان کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی تھا منصور نگر روڈ پر ٹوٹی ہوئی ایک مسجد خانہ جو اکبری دروازہ سے گزرتے ہوئے دست چپ کی طرف پڑتی ہے اس عمارت کو کتب خانہ اب تک کہتے ہیں یہاں نواب الحاج سید سلطان علی خاں عرف باسو صاحب کے آبا و اجداد کی کتابیں تھیں۔ ممکن ہے کہ یہ وہی کتب خانہ ہو۔

۱؎ احسن التواریخ ص ۸

اقبال الدولہ مذکور کی لائبریری کا ایک خطی نسخہ میں نے ۴ر رمضان ۱۳۶۰ھ کو شبلی منزل اعظم گڑھ میں دیکھا۔

ترمنی گنج

عہد آصفی کا آباد شدہ محلہ ہے اور اس مقام پر اعلیٰ جاہ والا جاہ دہلی کے شاہزادگان رہتے تھے جو اپنی آن بان شان و شوکت اور شعور میں بے مثال تھے۔ ایک بھائی کا واقعہ ہے کہ شیر کے شکار میں باگھ جست کرکے ہاتھی تک آ گیا اپنے ہودے میں بیٹھے ہوئے گاؤ تکیہ اس کے منہ میں دے کر تلوار سے گردن اڑا دی۔ لڑائی اور شکار میں حواس باقی رہنا ضروری ہے اگر حواس باقی ہیں تو بچت کی تدبیر آپ سمجھ میں آتی ہے۔ والا جاہ معقولات و منقولات فقہ و اصول میں بڑے بلند پایہ شخص تھے اور عمامہ اور عبا ان کی پوشش تھی گھوڑوں پر سوار ہو کر انہوں نے اپنے مصاحبین سمیت سفر عراق کیا قطعہ تاریخ ملاحظہ ہو ؎

بسکہ مرگ حضرت نواب والا جاہ سے — ہے جگر بیتاب مثل طائر بسمل ہے آہ
حاجی و زائر و فیاض و امیر ابن امیر — جلوہ فرمائے لحد ایسا مہ کامل ہے آہ
علم میں بے مثل اخلاق کرم میں بے نظیر — صدق خود یہ سخن کا شاہد عادل ہے آہ
متقی و شاعر و شاعر نواز کوہ حلم — آج زیر خاک علامہ فاضل ہے آہ
مصرعۂ تاریخ میں کہتا ہوں حق حق اے منیرؔ — ماتم نواب والا جاہ زخم دل ہے آہ ۱۲۶۹ھ

واقعہ نگاروں نے ان کو مجتہدین و علما کے صنف میں شمار کیا ہے والا جاہ کو شعر و سخن میں بھی ذوق تھا تخلص عاشق تھا اور کلیات آپ کے دیوان فیض کے نام سے چھپ چکے ہیں کھتولال تائب نے اپنی کتاب انشائے در بند مطبوعہ گلزار محمدی میں ان کا یہ شعر لکھا ہے ؎

خو نامۂ و پیام کی دلبر نہیں رکھتے — بت کیسے خدا ہیں کہ پیمبر نہیں رکھتے
ترے دیوانے کا ہے عرس کیا جلسے ہیں مرقد پر — اکھاڑا راجا اندر کا پری زادوں کا دنگل ہے

میر خلیق ان کی صحبت کے شاعروں میں تھے اور نواب اس باکمال کی خدمت کو فخر سمجھتے تھے۔ ایک دن کسی بات پر خلیق اٹھ گئے دربار کا آنا چھوڑ دیا آپ کو صدمہ محسوس ہوا۔ اتفاق سے راہ میں کسی دن ملاقات ہو گئی ہاتھی روک کر نواب نے سلام کیا ؎

مستحسن خلیق ہمارا سلام لو — مدت کے اے رفیق ہمارا سلام لو

خلیق چاہتے تھے کہ آنکھ بچا کر کسی گلی میں چلے جائیں شعر سنتے ہی ٹھہر گئے اور نواب نے ہاتھی بٹھا کر ہاتھ پکڑ کے اپنے پاس بٹھا لیا عالیجاہ بہادر بھی بھائی کی طرح بے مثال رئیس تھے ؎

منجھلے صاحب حضرت عالی جاہ تھے — لکھنؤ کے سب امیروں میں بہت صاحب جود
مرزا حیدر بہادر کے تھے فرزند بسیط — خلق کا ان کے نمونہ ہے شمیم مشک و عود
شاعر و شاعر نواز و فاضل و علامۂ عصر — صالح و محتاط و محو طاعت رب ودود
لکھنؤ سے پھر زیارت کے ارادوں میں چلے — بمبئی سے باغ جنت میں کیا جا کے ورود

؎ سبیکۃ الذہب عربی لکھنؤ

وصف ان کے نظم میں تاریخ رحلت میں منیر   حاجی و زائر امیر متقی دریائے جود   ۱۲۸۱ھ

ہر دو بزرگ کے عکس میرے البم میں مع ان کی اولاد کے تصویروں کے موجود ہیں ان کے والد ماجد کا نام مرزا حیدر صاحب تھا۔ ان کے عروج و فروغ کی یہ تاریخ بتائی جاتی ہے کہ نواب امۃ الزہرا دختر اسحاق خاں مرحوم ملقب بہ بہو بیگم صاحبہ نے ایک لڑکی لطف النسار کو نور جہاں کی طرح زمین پر پڑا ہوا پایا شاید کسی قزاق کے دست تعدی سے یہ لڑکی ماں باپ سے جدا ہوئی اور یقیناً کوئی حادثہ عظمیٰ تھا جو ماں کی گود سے محروم ہوئی۔ اس قسم کے مظالم پبلک پر ظالموں کے ہاتھ سے ہوا کرتے تھے رحم دل بیگم نے شفقت سے اٹھا کر پالا پوسا اس سنہرے ماحول میں لڑکی عقل و شعور کی مالک ہوئی اور بیگم کی سرکار میں وہ تقرب حاصل ہوا کہ آصف الدولہ بیٹے ہو کر اپنی مالی ضرورتیں اس کے ذریعے ماں سے پوری کرتے تھے اور نواب کی لکھنؤ میں مہاجرت بھی لطفاً ہی کا وقار دیکھ نہ سکتے تھے۔ بیگم نے اپنی جگہ پر طے کر لیا تھا کہ بھائیوں سے کہوں گی وہ چھوکری کو اپنے لڑکوں سے بیاہ دیں گے تینوں بھائیوں نے انکار کیا کہ ہم سویا میتیمی پالک کے ساتھ اپنی اولاد کا نکاح نہیں کریں گے نیشا پوری خاندان کے ایک بزرگ بسر و چشم تیار ہو گئے۔ بہو بیگم صاحبہ نے لڑکی ان کے سپرد کی یعنی لے پالک کا نکاح مرزا محمد تقی صاحب کے ساتھ ہو گیا بیگم نے انگریزوں سے جو عہد نامہ کیا اس میں لڑکی کے دولہا محمد تقی خاں کو ڈیڑھ ہزار روپے ماہوار مقرر کئے اور ان کے پسر مرزا حیدر کو ایک ہزار روپے ماہوار دیا جانا تحریر کیا اور یہ وثیقہ آج تک ان کی نسل میں موجود ہے۔ مرزا حیدر صاحب اس دولت کے بڑے کروفر سے مالک ہوئے اور شہر میں اس اولوالعزمی کی زندگی بسر کی۔ مرزا حیدر صاحب نے علمار ادبار شعرار میں صاحبان کمال کی جو ہمت افزائی کی اس کی نقشہ کشی ایک طولانی باب ہے اور قلم میں طاقت نہیں جو ان کی صحبت کے دانشوروں کی سیرت پیش ہو شیخ محمد بخش شہید ناسخ کے شاگردوں میں اور مرزا صاحب کے وظیفہ خوار تھے ان کی کئی غزلوں کی تضمین کر چکے تھے ؎

طینتِ پاک سے میں رشک کروں کیا ممکن   کہ طبیعت میں ازل سے یہ نہیں ہے مزمس

قول آتا ہے شہید اپنے لبوں پر ہر دن   گو مجھے رشک کی عادت نہیں حیدر لیکن

ہاں کبھی رشک بھی آتا ہے تو زواروں پر

عربی قواعد کے لحاظ سے زائر کی جمع زوار خود ہے مگر اردو محاورات میں زواروں بالعموم کہا جاتا ہے شعر میں لطف زبان ہے عربی قواعد کے تحت میں نہ دیکھئے۔

اعلیٰ جاہ و والا جاہ انھیں کے چشم و چراغ تھے جو جود و عطا اور کمالات ذاتی میں باپ سے بڑھ گئے مرزا حیدر صاحب بخلاف رؤسا کے ۹ بجے رات تک دربار کرتے تھے۔ ان کی بزم سب رؤسا سے پہلے درہم برہم ہوتی تھی ورنہ امرار لکھنؤ ساری رات جاگتے تھے اور ان کی محلسرا میں رات کو دن رہتا تھا کئی پشت تک یہ عادت باقی رہی۔ میں نے خاندان نظام الدولہ کے ایک علم پرور ہوشمند بیدار مغز سے رت جگے کا راز پوچھا تو مرحوم نے بتایا کہ ہم کو رات کو خوف دشمن اور اندیشۂ قتل میں سونے کا موقع نہیں۔ دولت کے ہزاروں دشمن ہوتے ہیں دن کی بہ نسبت رات کو زیادہ جان کا خطرہ رہتا ہے۔ مرزا حیدر صاحب ۹ بجے محل میں چلے جاتے تھے بڑے بڑے شرفاء ذی عزت دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ ایک دن نواب نے انگڑائی لے کر کسی سید مصاحب کی طرف پاؤں پھیلا دیا مصاحب

سلہ وضعداران لکھنؤ صلا۳

کی جبیں پر شکن آگئی اور اٹھنے سے پہلے انہوں نے انگڑائی لے کر نواب کی طرف پاؤں پھیلایا اور دوسرے دن سے آنا چھوڑ دیا نواب کو یقین ہوگیا کہ میری غیر معتدل روش سے میر صاحب خفا ہوگئے کئی روز کے بعد معذرت کے لئے گھر تشریف لے گئے اور یہاں میر صاحب کے گھر میں فاقہ تھا اور کھٹیا پر لیٹے گویا دم توڑ رہے تھے۔ بی بی نے پوچھا کون ہے۔ نواب نے کہا آپ کا بھائی۔ میر صاحب نے برجستہ کہا کہ بھائی ہیں تو اندر کیوں نہیں آتے۔ نواب پہونچے گھر کا حال اپنی آنکھ سے دیکھا بی بی کو بہن کہہ کر پانچ سو روپے ان کے پاس رکھ دئے اور میر صاحب کا ہاتھ پکڑ کر اپنی دولت سرا کی طرف لے آئے۔ مرزا صاحب کے دسترخوان کے واقعات بھی مشہور ہیں اس گھرانے کے دو رئیس آغا مہدی حسن خاں اور آغا مہدی حسین خاں تھے جو باپ دادا اعلیٰ جاہ والا جاہ کے ہم رتبہ اور حکام رسی میں شہرۂ آفاق تھے غدر کے بعد سے پبلک ڈر کر انگریزوں کو "صاحب" کہتی تھی ان کے بہادر باپ نے بیٹے کی کنیت ابو الصاحب قرار دی تھی اور عوام آغا ابو صاحب کہتے تھے ترمنی گنج ان کی ڈیوڑھی سے آباد اور تا حیات دروازہ پر ہتھنی بندھی رہی گورنر گھر پر آتا تھا اور اس کا راز یہ تھا کہ اسلاف نے انگریزوں کو بلوۂ عام میں پناہ دی تھی گورنمنٹ برطانیہ سے خطاب بھی تھا اور حسین آباد کے اعلیٰ ٹرسٹی تھے عہدہ ٹرسٹی کی تنخواہ کبھی نہیں لی۔ اور رقم مذکور جمع کر کے سلطان المدارس کی عمارت بنوادی آغا صاحب کی آرزو تھی کہ بڑے بھائی آغا مہدی حسن بھی اپنا سارا روپیہ عربی تعلیم گاہ کے لئے دیدیں انہوں نے ایسا نہ کیا اور ان کی تمام حشمت و ثروت فنا ہوگئی لیکن آغا ابو صاحب کی دولت جامعہ سلطانیہ کی صورت میں باقی ہے آغا صاحب بھی عربی داں تھے اور آسانی سے عربی میں بات چیت کرتے تھے گھوڑے پر سوار ہوتے تھے آخر عمر میں روزہ نہ رکھنے کی طاقت سے مجبور ہو کر ماہ رمضان سفر کانپور میں گزرتا تھا سختی سے پابند مذہب تھے ان کا امام باڑہ اور وقف حسین آباد ٹرسٹ کی ایک برانچ کی حیثیت میں ترمنی گنج میں موجود ہے جس میں مجلسیں اب تک ہوتی ہیں پچاس برس پہلے دونوں بھائی میزبان بن کر امام باڑہ میں علیحدہ علیحدہ بیٹھتے تھے ہر بھائی کے احباب اور ملنے والے اس کے قریب بیٹھتے تھے اور وہ نورانی مجلس ہوتی تھی جو عزا داری اودھ کی آخری یادگار تھی۔ آغا صاحب کے کئی فوٹو میرے پاس ہیں ان کی وفات ۱۹۱۰ء میں ہوئی طومار میں محلہ منصور نگر اور ترمنی گنج کے بڑے بڑے لوگوں کے نام حسب ذیل الفاظ میں ہیں۔

نواب محسن علی خاں صاحب، مرزا محمد عسکری صاحب، مرزا محمد کاظم خاں صاحب، منے صاحب، مرزا والا جاہ صاحب بہادر، آغا ابو صاحب، آغا مہدی حسن خاں صاحب، آغا محمد تقی خاں صاحب، مہدی علی خان صاحب، وکیل آغا محمد صاحب اہتمام الدولہ بہادر مع صاحبزادہ یوسف مرزا صاحب، مولوی بندہ حسن صاحب، حکیم مرزا فدا حسین صاحب، ملا احمد علی صاحب۔

آغا صاحب کو شکار کا شوق بڑے پیمانے پر تھا اور شکار کو ہمیشہ وائسرائے یا گورنر کے ساتھ جاتے تھے سارا خرچ خود برداشت کرتے تھے شیر کے شکار میں باون ہاتھیوں تک کو لے جانے کی نوبت آتی تھی اسی ساز و سامان سے ایک مرتبہ شیر کو اپنی گولی سے گرایا۔ یوروپین نے کہا یہ میری گولی سے گرا۔ آپس میں اختلاف ہوا اور فیصلہ اس بات پر ٹھہرا کہ اس شکار میں جو شیر مارا جائے اس کے اسی جگہ گولی پڑے جہاں پہلا شیر زخمی ہوا ہے کئی شیر اپنے اسی نشانہ پر گرائے اور وہ انگریز بہت شرمندہ ہوا۔

شہسواری میں بھی آپ یکتا تھے عراق میں عربی گھوڑوں کا ایک تاجر ملا اس کے سودا کرنے کا قاعدہ یہ تھا کہ گاہک قیمت ادا کر کے گھوڑے پر بیٹھ کر واپس ہو اور اپنی قیامگاہ پر گھوڑے کو پہونچا دے تو گھوڑا اس کی ملکیت ہوگیا۔ اصطبل میں جو یکتا رہوار تھا اس کی قیمت طے ہوئی اور تاجر یہ سمجھا کہ یہ خریدار کو کبھی اس کے گھر پر پہونچنے نہیں دیتا کچھ دیر میں آجائے گا۔ آغا صاحب سوار ہوئے اور تیسرے دن اپنی قیامگاہ تک

لے ہوئے پہونچے عرب کے صحراؤں میں گھوڑے نے پھرایا ناہموار راستوں میں لئے ہوئے گھوما تین دن کے بعد تھک کر قابو میں آیا تاجر قدموں پر گر پڑا اور عرض کیا کہ میرا روزگار یہی ہے گھوڑا واپس کر دیجئے۔ آپ نے گھوڑا بھی اس کو دیدیا اور دام بھی نہ لئے۔ اس فیاضی اور شہسواری کے عرب بھی قائل ہو گئے۔

آپ کی سواری جب صبح کو نکلتی تھی تو چار گھوڑے زین و لجام سے آراستہ تیار ملتے تھے ایک گھوڑے پر خود اور دو گھوڑوں پر دونوں صاحبزادے اور چوتھے گھوڑے پر چابک سوار ہوتا۔ ممکن نہ تھا کہ باپ کے گھوڑے کے آگے صاحبزادوں کا گھوڑا پہنچ جائے یا چابک سوار کی گھوڑی مرشدزادوں کی سواری سے بڑھ جائے جب تک شہر میں گھوڑے رہتے آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتے ہوئے آگے بڑھتے اور بستی سے نکل جانے کے بعد سرپٹ گھوڑا دوڑایا جاتا اس وقت ان کی سواری کے لئے سڑک خالی ہو جاتی۔ کبھی آپ کے ساتھ گھوڑوں پر دوستوں میں راجہ دین دیال اور خان بہادر ڈاکٹر عبدالرحیم بھی ہوتے۔ بعض اوقات گھوڑے پر سوار سلطان المدارس کی نئی عمارت میں آجاتے اور مدرسہ کا رجسٹر حاضری اپنی آنکھ سے ملاحظہ کرتے۔ آغا صاحب کا ایک ناصحانہ شعر ملاحظہ ہو ؎

گربہ میر وسگ وزیر موش دربانی کند ایں ہمہ ارکان دولت خانہ ویرانی کند

آغا صاحب کے چابک سواروں میں عہد واجدی کا پورن صاحب کمال تھا شیخ ببر علی کا شاگرد تھا آخر عمر انگریزی دور میں ترمنی گنج کی نوکری اس کے لئے سہارا تھا۔

بھوانی گنج

یہ محلہ عہد آصفی میں آباد ہوا۔ اس وقت بھی غریب طبقہ رہتا تھا اور اب بھی سستے کرایہ پر مکان مل جاتے ہیں زیادہ تر غیر مسلم بستی ہے شہریت کاظمین سے گذرنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔

کٹرہ خدا یار خاں

خدا یار خاں عہد برہان الملک کے سرداروں میں تھے اپنے زمانے میں اس جگہ کو آباد کیا یہاں نواب ابراہیم حسین خاں ایک چیچک رو دراز قامت شخص رہتے تھے جو زیادہ تر ریاست الور میں رہتے تھے خط شکستہ اور شفیعہ کے بہترین ماہر تھے نستعلیق بھی ان کا بہترین خط تھا لکھنؤ کی تہذیب قدیم اور ادبی صحبتوں کے یادگار تھے۔

خاک شفا کی مسجد:- کٹرہ خدا یار خاں سے مہدی گنج جانے کے لئے راہ میں ایک قدیم مسجد پڑتی ہے جس کے بارے میں کوئی بتلانے والا نہیں کہ بانی مسجد کا کیا نام تھا۔ دست راست ہی کی طرف ایک دوسری مسجد ہے جس کے درجہ میں کربلا معلیٰ کی خاک کی زیر سقف ایک مسجد ہے جو خاندان مرزا حیدر صاحب کے کسی شخص کی یادگار اور نسبتاً جدید ہے اس خصوصیت خاص کے ساتھ بھی شہرت سے خالی ہے اور بہت کم لوگ اس راز کو جانتے ہیں اور نمازیوں کے استعمال میں بھی نہیں ہے اچھی حالت میں ہے فرش زمین خراب ہو چکا ہے۔

مہدی گنج

اس محلہ کو حکیم مہدی نے اپنے زمانہ وزارت میں آباد کیا یہ منصور نگر سے بائیں ہاتھ کی طرف واقع ہے پہلے راجہ دین دیال کی کوٹھی اور نالہ کا پختہ پل لکھوری اینٹوں کا ملے گا جہاں ہفتہ میں پانوں کا بازار لگتا ہے جس کو دریبہ کہتے ہیں راجہ بڑے علم دوست شریف نواز مسلمانوں سے میل جول رکھنے والے آدمی تھے اپنے زمانہ میں سڑکوں پر مویشی اور گھوڑوں کے پانی پینے کے حوض آپ ہی نے بنوائے اور بگھی، بیگہ

اور دوسری سواریاں چوراہوں پر ٹھہر جاتی تو سیراب ہوتے تھے علم طب میں بھی راجہ کو درک تھا۔ کوٹھی میں آیات قرآن اور پنجتن پاک کے ناموں کے طغرے فریم میں لگے رہتے تھے کہیں بسم اللہ شریف کا جو کھٹا کہیں لی خمسۃٌ وہ اکثر گھوڑے پر سوار ہوتے تھے حکیم یعقوب کے شاگرد تھے ان کے بیٹے برجموہن دیال باپ کے رنگ پر تھے قیصر باغ میں پریس کھولا تھا جس میں شرح لمعہ مذہب امامیہ کی فقہی کتاب کی عربی ت انگریزی کر رہے تھے کسی خانگی معاملے میں مدراس کی طرف چلے گئے اور بعد زمانہ دراز وطن پہونچکر دنیا سے گذرے۔

حکیم بھرتا صاحب:۔ آپ کا نام حکیم سید احمد حسین اور خاص مہدی گنج کے ایسے مشہور شخص تھے جن کو شہر بھر پہچانتا تھا اور خدمت خلق میں ممتاز تھے معمولی قیمت کے نسخے سے لاکھوں مریضوں کا بلا فیس علاج کرتے رہے دو مہینہ تک زمانہ عزا میں مجلسیں کرکے پہلے روٹی سالن بانٹتے رہے پھر کسی مجبوری سے بھرتا تقسیم کیا تو حکیم بھرتا نام ہو گیا علم و عمل میں ان کا جواب نہ تھا۔

کربلا عظمت الدولہ۔ اس کربلا کو منصف الدولہ سید محمد باقر شریف الملک نے بنوایا جو غفرانمآب کے پوتے تھے اور محکمہ قضا ان کے ہاتھ میں تھا آخر میں آبکاری کا محکمہ سپرد ہوا تھا کسی شاعر نے کہا تھا ؎

جناب قبلہ و کعبہ کو آبکاری ہے ۔۔۔ شراب جو نہ پیے ان دنوں وہ ناری ہے

ایسے سخی تھے کہ حضرت فردوس منزل امجد علی شاہ مرحوم نے قیمتی دوشالہ عنایت کیا اور فرمایا میری خوشی ہے کہ یہ آپ کے پاس رہے وہ قبول تو فرمایا مگر ایک مومن کی لڑکی بیاہنے کو بیٹھی تھی سامان عروسی نہ تھا ان کو دیدیا دوشالہ بیچ کر غریب کی شادی ہو گئی ان کو علم طب اور مناظرہ میں بھی کمال تھا میرے پاس منصف الدولہ کی قلمی تصویر موجود ہے جس کی عکاسی مشکور الدولہ فوٹوگرافر نے کی تھی یہ عکس مرنے کے بعد دفن سے پہلے لیا گیا اس وقت سن شریف ساٹھ برس تھا۔ اس تصویر میں آپ گاؤ تکیہ سے لگے بیٹھے ہیں بائیں طرف تکیے پر استخارہ کا کنٹھا رکھا ہے اس کے برابر اوگالدان پر بینی پاک اور سامنے رحل پر قرآن شریف ہے رنگت گوری سر کے بال اور داڑھی مونچھیں بالکل سفید لبیں کتری ہوئی۔ چہرہ چوڑا چکلا بھرا شاندار آنکھیں بڑی بڑی، پیشانی چوڑی، اعضا متناسب، ڈاڑھی کتروان کی حد سے کچھ یوں ہی سی بڑھی ہوئی سر پر چوگوشیہ ٹوپی، گلے میں انگرکھا جس پر سے دوشالہ اوڑھے ہوئے تاریخ سلطان العلما میں ان کا فوٹو آپ دیکھ سکتے ہیں۔ آج دوشالہ کا فیشن نہیں رہا نہ کوئی قدر ہے۔ اس وقت شالی رومال یا دوشالہ سرمایۂ مقلر اور چسٹر کا قائم مقام ہوتا تھا ؎

کمبل کا رتبہ دیکھ کے کم لی کسی نے مول ۔۔۔ اس دور آسماں میں گئی قدر شال کیا

کربلا جب بن کر تیار ہوئی تو آپ زیر بار ہو گئے اور اخراجات تعمیر ادا نہ ہوئے ذاتی تمام آمدنی نقار کی نذر ہو جاتی تھی کسی محبت میں عظمت الدولہ کے سامنے اس قرضداری کا ذکر ہوا وہ ادائیگی پر تیار ہوئے آپ نے فرمایا مجھے اس شرط سے منظور ہے کہ کربلا پھر آپ ہی کی کہی جائے اس وقت سے کربلائے عظمت الدولہ مشہور ہوئی پھر بھی مدتوں لوگ مولوی صاحب کی کربلا کہتے رہے۔ کربلا میں صرف ایک عالیشان امام باڑہ بنا ہوا ہے جس میں لمبی چوڑی شہ نشین ہے دالان کے علاوہ بغلی درجہ بھی ہے وسیع صحن میں تعزئے دفن ہوتے ہیں انگنائی پکی دیواروں سے محدود ہے شہ نشین پر چوبی ضریح ہے جو اودھ الیکٹرک کمپنی لکھنؤ نے امام مظلوم کے روضہ کی اندرونی تصویر بنوا کر حال میں تیار کی ہے اس ضریح کا بلاک سرفراز محرم نمبر ۱۳۵۴ھ میں شائع ہوا ہے کربلا کے باہر بھی تعزئے دفن ہوتے ہیں اور ایک درخت صحن میں ہے جو اس درخت کی نقل ہے جو اصل روضہ امام مظلوم میں گنبد

درواق سے پہلے راہ بتاتا تھا۔ بخشو اور فقیر کا تعزیہ اور جیب تعزیہ پہلے اسی کربلا میں آتا تھا خود منصف الدولہ کے تعزیہ کے ساتھ معالیخاں کی سرا سے مہدی گنج تک سونے چاندی کے پھول لٹتے تھے اور خلق خدا کو فیض جاری تھا۔ اما مباڑہ کے آمنے سامنے ایک مسجد بھی کسی خانم صاحبہ کی ہے جو شائد ۱۲۸۲ھ کی تعمیر ہے۔ پتھر مدت دراز سے پڑھا نہیں جاتا کنواں بظاہر مسجد کا جز ہے۔ ممکن ہے کہ پہلے کی تعمیر ہو۔ منشی رام سہائے تمنا نے تاریخ میں لکھا ہے کہ عشرہ اور چہلم گذرنے پر ہزارہا تعزیہ اس کربلا میں دفن ہوتے تھے اور آراستگی کربلا کی عظمت الدولہ کے ہاتھ سے ہوئی اور روشنی کا خوب انتظام کیا۔ سقہائے آب کش ہر سو واسطے چھڑکاؤ اور تسکین تشنگان ماتم ساغر نکہت گشت کرتے تھے۔ پلاؤ شیر مال وغیرہ حصے بٹتے تھے۔ بانی کربلا کا قطعۂ تاریخ اس طرح ہے ؎

عالی نسب والا حسب باقر لقب ۔۔۔ رفت دشور ماتمش، زماہ تا ماہی شدہ
زین بلا کز آسماں نیلگوں خوں می چکد ۔۔۔ بتواں گفتن کہ رنگ شرع ودیں کاہی شدہ
خستہ شد زیں درد طبع قبلۂ ارباب دیں ۔۔۔ گرچہ در رم لیک دل رازیں غم آگاہی شدہ
بود کم گویا غم جاں سوز علیین مکاں ۔۔۔ کز مہر نواین مرد ساماں جا نگاہی شدہ
سال تاریخ وفات اکبر اولاد او ۔۔۔ منصف الدولہ سوئے دار البقا راہی شدہ
۱۲۷۶ھ

میر فدا علی نثار:۔ محلہ کے مشہور صاحبان کمال میں تھے جنھوں نے ذاکری میں اس عہد میں عروج حاصل کیا جب میر محمد شاہ اور میر انیس و دبیر مالک منبر سمجھے جاتے تھے نثر خوانی مرثیہ اور حدیث کا بیک وقت نمونہ ہونے بام ارتقا تک پہونچی۔ میر صاحب اپنے کمال کی ابتدائی منزلوں میں عاشق مزاج سیاحت پسند آزاد طبیعت انسان تھے۔ ذاکری کی بدولت ہر شیعہ آبادی میں ان کا تعارف ہوا۔ صبح بنارس دیکھ کر ان کی ذہنیت میں انقلاب ہوا اور یاد خدا کی فکر ہوئی۔ مناظرہ عقل و دل کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی جوان کی مختصر لائف ہے یہ منظومہ جو انھیں رشحۂ کلک تھا مطبع العجائب پریس بمقام چھتہ آغا خاں ایک جزء بدہلی میں چھپی اس مثنوی میں موصوف نے اپنی تئیں زیدی لکھا ہے والد کا نام سید امجد علی اور دادا سید فتح علی تھے۔ دیباچہ میں یہ بھی ہے کہ وہ مرزا محمد رضا تنور کے شاگرد تھے۔ اس مجمل ذکر میں یہ بات رہ جاتی ہے کہ تلمذ شعر و سخن میں تھا یا محمد رضا تنور نثر خواں بھی تھے۔

مثنوی کی تاریخ اشاعت میں یہ شعر ہے ؎

مثنوی جس سنہ میں یہ چھاپی گئی ہے اے خدا ۔۔۔ تیرہ سو بارہ تھے سال ہجرت خیر الوریٰ

مثنوی کا مآل یہ ہے کہ عشق حقیقی کی منزل صرف محمدؐ و آل محمدؐ ہیں جن کی مودت اللہ نے واجب کی ہے کتابچہ اس مدحیہ شعر پر ختم ہوتا ہے جس سے ان کی قوت تغزل کا تعارف ہوتا ہے ؎

اہلِ دل دل سے ان پر مرتے ہیں ۔۔۔ دل جو لے کر نہیں مکرتے ہیں

مہدی گنج میں میر فدا علی نثار کا مکان اور ان کی نسل اب بھی موجود ہے۔

مہدی گنج کے رہنے والوں میں اعجاز حسین سوز خواں بھی قابل ذکر ہیں اور کربلا سے قریب حیدر حسین خاں کی بارہ دری کا کھنڈر بھی ہے وہی حیدر حسین جن کا چوک میں پھاٹک ہے۔

کربلائے دیانت الدولہ

آغا مرزا نامی ایک مرد علم دوست دیانت الدولہ کے احباب میں تھے ان کے شوق دلانے پر وہ سفر حج و زیارت پر آمادہ ہوئے اور ۱۲ برس میں ان کا یہ سفر ختم ہوا اور منزلوں کی صعوبت سفر کی زحمت اٹھا کر گھر آئے۔ کربلا کی پاک سرزمین پر پہونچنے میں یہ جذبہ بھی پیدا ہوا تھا کہ وطن پہونچ کر کربلا بنواؤں گا حرم امام کا قلم کار نقشہ لیتے آئے اور تھانہ سعادت گنج میں جو ایک وسیع علاقہ غربی شہر کا ہے کربلا بنوائی اور مصارف کے لئے سرمایہ وقف کیا۔ عمارت دیانت الدولہ کی کربلا کے نام سے مشہور ہوئی۔ آغا مرزا نے اپنا وطن ایران چھوڑ کر لکھنؤ میں قیام کیا اور ایک فرزند آغا محمد علی مرزا چھوڑ کر انتقال کیا۔ جن کو لکھنؤ کے علمی و ادبی گرد و پیش میں شاعری کا شوق ہوا اور فنی ریاضت میں کافی شہرت حاصل کی عزیز و محشر اساتذہ فن کی صف میں جگہ لی اردو فارسی میں ان کا کلام بلند ہوتا تھا اور عجمی لہجے میں پڑھتے آصف تخلص تھا۔ ان کے گھرانے کی قبریں داقف کے خدمات میں در قبلہ سے متصل کربلائے مذکور میں موجود ہیں آصف کو وقت آخر مستقل ذریعہ معاش نہ ہونے سے میں نے تکلیف میں دیکھا۔ شہر کا بے فکر طبقہ عموماً مسجدوں میں دن گزارتا پیری کے زمانے میں وہ ایک بار مسجد تحسین سے اسہال کی تکلیف میں بمشکل گھر لائے گئے ان کے نواسے یٰسین مرزا مشہد مقدس ایران میں زائروں کی خدمت کرتے ہیں اور وطنیت کی کوشش میں ہیں امام حسینؑ کا یثرب سے سفر کا جلوس ۲۸ رجب کو باہتمام سید زوار حسین اسی کربلا سے اٹھتا ہے کربلا اس وقت وقف داراب علی خاں خواجہ سرا میں شامل اور شہر کے بہترین خطاط سید شوکت حسین موسوی کے زیر نگرانی ہے آغا میر کی ڈیوڑھی اس علاقے کا مشہور مقام ہے جو معتمد الدولہ کی طرف منسوب کربلا کے پچھواڑے ہے یہاں کی مجلسوں اور دینی چہل پہل کا ماتمی جنتری میں ذکر ہے۔

کاظمین سے تھوڑے فاصلے پر یہ کربلا عالیشان عمارت کی صورت میں واقع ہے اور نسبتاً اصل روضہ امام مظلوم سے زیادہ مشابہ ہے عالیشان پھاٹک کے بعد محدود میدان اور درمیان میں عمارت روضہ پچھم کی طرف ایوان طلا اور در قبلہ کی نقل برآمدہ میں حوض محاذ روضہ میں ایک وسیع دالان جس پر زیارت بخط نسخ دیوار پر لکھی ہے گنبد اور منارہ مثل دیگر کربلاؤں کے بلند ہیں۔ پہلو میں باغ اور تعزیہ دفن ہونے کی جگہ ایک احاطے کی صورت میں ہے جو پہلو سے قبرستان نیشا پوری کی طرف ملحق ہو جاتی ہے بانی کربلا کا پورا نام دیانت الدولہ متدین الملک محمد معتمد علی خاں بہادر امانت جنگ تھا اختری پلٹن کا عہدہ کمیدانی سپرد تھا۔ واجد علی شاہ نے خود ان کی مدح میں کہا ہے ؎

دیانت میں اس طرح سے تھا سپر   کہ جس طرح پروانہ ہو شمع پر

دیانت الدولہ کی وفات پردیس میں ہوئی اور لاش لکھنؤ پہونچا کر اسی کربلا میں سپرد خاک ہوئی ممتاز العلماء فخر المدرسین نے نماز جنازہ پڑھائی۔ دیانت الدولہ کے کارندہ کا نام داروغہ[1] علی حسین تھا۔ صفدر[2] مرزا پوری ناقل ہیں کہ ایک حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ میر نفیسؔ مرحوم ایک دفعہ دیانت الدولہ کی کربلا میں مرثیہ پڑھنے تشریف لائے سامعین کا ہجوم کثرت سے تھا بیٹھنے کی جگہ نہ ملتی تھی گرمی کا زمانہ تھا میر صاحب نے ایک سلام پڑھا جس کا مقطع اسی وقت موزوں کر کے یہ پڑھا ؎

نفیسؔ افسوس ہم تو ہند میں ہیں دوست جا پہنچے   خراساں میں نجف میں روضۂ سبط پیمبر میں

---

[1] زمانہ کانپور سلور جوبلی نمبر ۱۹۲۸ء   [2] بزم خیال ص ۱۴۹

سعادت گنج

عربی لکھنؤ کا آباد محلہ پہلے مبارک گنج نام تھا۔ نواب سعادت علی خاں مرحوم نے قیام کیا اور بنارس چلے گئے۔ اس وقت سے سعادت گنج نام ہوا اور دورِ حکومت میں نواب نے اس محلے

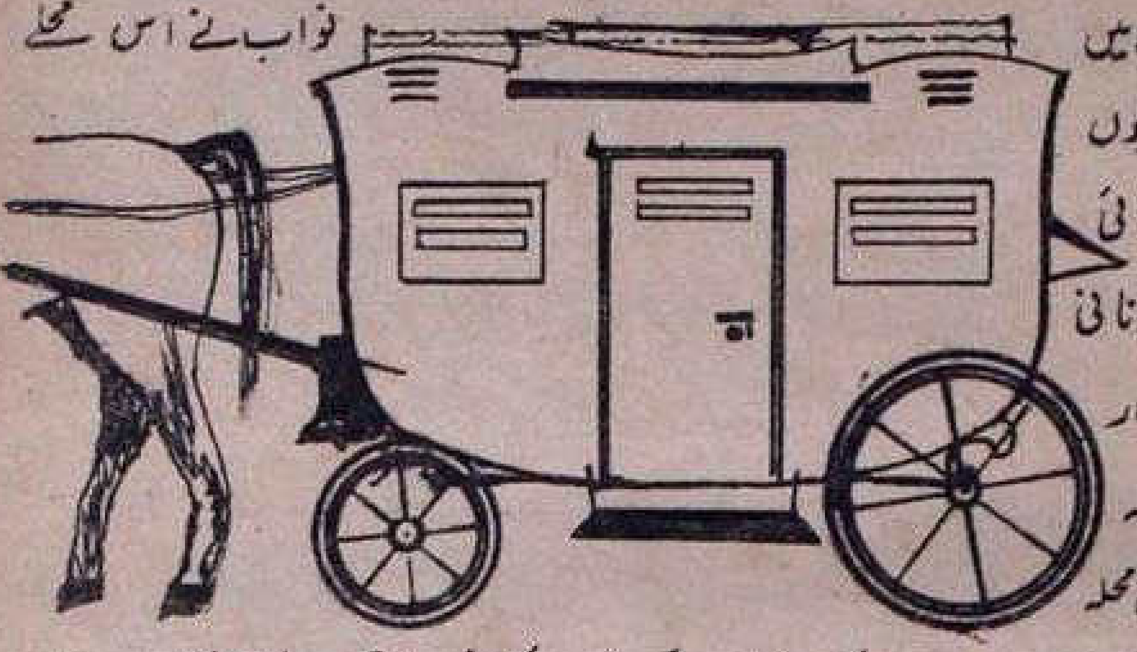

کے لئے خاص قوانین وضع کئے تھے اور تاجروں دوکانداروں کو زیادہ سے زیادہ سہولت[1] بہم پہونچائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سعادت گنج غلہ، روئی، یونانی ادویہ کی اب تک منڈی ہے اگرچہ یہاں کے بازار میں ضرورت کی ہر چیز دستیاب ہوتی ہے مگر مرقومہ بالا اشیا سعادت گنج کے خاص اسٹاک میں ملتی ہیں محلہ اس قدر وسیع ہے کہ قدم قدم پر رؤسا کی ڈیوڑھیاں اور امیروں کی سرکاریں تھیں بعض کے آثار باقی اور بعض کا صرف نام صفحۂ تاریخ پر ہے۔

دلّی دروازہ:۔ گاڑی اڈہ میں ایک پھاٹک تھا جس سے دہلی کے مسافر داخل ہوتے تھے اور اسی مقام پر ٹھا کر دوارہ پنجم سنگھ حلقہ سعادت گنج میں سرحد بہاری پور پر واقع ہے اور خسرہ میں نمبر ۲۵، ۱۷ ہے ایک پختہ شوالہ بھی ہے جو ۱۳۹۹ نمبر خسرہ میں درج ہے اس پر ۱۸۶۲ء میں جگن ناتھ اور بھولا چودھری کا قبضہ تھا یہ حلقہ آباد ترین محلات لکھنؤ میں تھا ۱۸۶۲ء کے پہلے بند وبست میں جو انگریزوں کے ابتدائی دور میں ہوا پرانے نقشۂ خسرہ دیکھنے کا محافظ خانہ لکھنؤ واقع کوٹھی روشن الدولہ میں موقع مل گیا تو دو بڑی بڑی کتابوں میں صرف اس علاقے کے رہنے والوں کی فہرست ہے ان کتابوں کے مطالعے کے لئے مہینوں درکار ہیں جستہ جستہ چند نمبر دیکھے اور میرے رفیق نے ان کنوؤں کو شمار کرنا شروع کیا جو مسلمانوں کے بنائے ہوئے تھے ۹۱ کنوئیں شمار کرنے پائے تھے کہ فیس معائنہ سے تجاوز ہو گیا اور کام بند کرنا پڑا خسرہ کے مختلف نمبروں میں جو مقامات برآمد ہوئے ان کا کوئی پتہ اب بھی نہیں ہے مثلاً تکیہ حاتم شاہ تکیہ مدن شاہ، تکیہ ممن شاہ ولد بھورے شاہ مؤخر الذکر قبرستان موضع بہاری پور کی سرحد پر واقع ہے مقبرہ توکل ولد آغا محمد کا نمبر ۷۰۳ ہے مسجدیں بھی کثرت سے ہیں۔ جن کے بنانے والے کا نام واضح نہیں ہوتا نمبر ۱۷۴ پر جو مسجد ہے اس پر محمد علی ولد بھیکا کا قبضہ ہے اور ۱۳۹۳ نمبر کے احاطے کی مسجد پر امام بخش ولد مصاحب علی کا قبضہ ہے اور احاطہ نمبر ۵، ۸ میں میر سید محمد ولد سید محمد تقی قوم سید کا قبضہ اور مسجد واقع ہے۔

مغلسرائے:۔ اسی علاقہ میں تھی جہاں پردیسی ٹھہرتے تھے نہ دلی دروازہ کی عمارت ہے نہ سرائے اور مغلسرائے کا تو نام بھی باقی نہیں۔ گاڑی اڈہ اب تک مشہور ہے۔

گاڑی اڈہ:۔ میں حضرت امجد علی شاہ کے ماموں معین الدولہ عنایت علی بہادر کی محلسرا تھی اس قصر کی ایک دیوار اب بھی باقی ہے آخری وارث اس محلسرا کے نواب سید رسالت علی عرف منے صاحب تھے جو وضع قطع تہذیب میں بزرگوں کا نمونہ تھے ۱۵ محرم چار بجے

---

[1] گزشتہ لکھنؤ

دن کو اس مکان میں مجلس کرتے تھے اور ۱۴ صفر کو تعزیہ اٹھتا تھا۔ اس محلہ کو گاڑی اڈہ اس لئے کہتے ہیں کہ کرایہ پر چلنے والی گاڑیاں یہاں سواری کے انتظار میں کھڑی رہتی ہیں۔ گاڑی اور یکہ لکھنؤ کی قدیم سواریاں ہیں۔ فٹن اور ٹمٹم اور بگنٹ لینڈو انگریزی دور میں رؤسا اور صاحبان حیثیت کے یہاں سواری میں چلتی تھیں۔ تانگے کا رواج بھی ۱۹۱۴ء کے بعد رفتہ رفتہ ہوا ہے گاڑی جس میں دو گھوڑے جوتے جاتے تھے اس کو بگھی یا پالکی گاڑی بھی کہتے تھے اور قریبی دیہاتوں میں لے جانے والی گاڑیوں کو شکرم کے نام سے پکارتے تھے شکرم اور بگھی میں کوئی فرق نہ تھا۔ شکرم پر حضرت گنج کے باب میں بحث ہو گی بگھی میں عموماً چار آدمی آمنے سامنے دونوں سیٹوں پر پاؤں لٹکا کر بیٹھتے تھے اور ایک کوچ بکس پر کوچوان کے پہلو میں بیٹھتا اور خدمت گار گاڑی کی پشت پر بیٹھ جاتا یا کھڑا ہو جاتا

پرانے لوگوں میں جو بگھی پر بیٹھنے کے عادی تھے تا حیات تانگے پر نہیں بیٹھے وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے حکیم عبدالحفیظ صاحب طبیب جھوائی ٹولہ تانگہ پر بیٹھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مریضوں کو دیکھنے ہمیشہ بگھی پر جاتے تھے اور بلانے والے سے شرط کرتے تھے کہ تانگہ پر نہ بیٹھوں گا۔

میرن صاحب پچ بھیتی:- عہد شاہی میں آپ سعادت گنج میں رہتے تھے اور آخر تک رؤسا رشیش محل سے وابستہ رہے۔ بندوق لگانے میں جواب نہ رکھتے تھے عورت نتھ پہنے کھڑی ہے اور انہوں نے تاک کر گولی لگائی۔ گولی نتھ کے اندر سے نکل گئی۔ ایک انگریز ان کے کمال کی تعریف سنکر مدمقابل ہوا۔ اور کہا کہ شمع کی لو کو جس طرح میں کہوں اڑا دیں میرن صاحب نے کہا میں تیار ہوں انگریز نے شیشے کے کنول میں موم کی شمع لگائی شمع کو جلایا اس نے چالاکی یہ کی تھی کہ شمع کی لو کی نوک کو کنول کی لگن سے ملا دیا تھا میرن صاحب نے گولی لگائی شمع بجھ گئی اور کنول کو ضرر نہ پہونچا انگریز ہاتھ کی صفائی کا قائل ہو گیا۔

آپ نے ایک مرتبہ یہ کمال دکھایا کہ ۳۲ پیسوں کی گڈی بنائی اور بیچ میں اٹھنی رکھی اور کھڑے ہو کر گولی لگائی اٹھنی نکل گئی اور گڈی قائم رہی۔ اس سکی سے گولی لگائی کہ گولی کی ہوا سے اٹھنی نکل گئی۔

ایک مرتبہ آپ نے اور یہ کمال دکھایا کہ نیم کی پتی کاغذ کی طرح ایک مٹکے پر چپکا دی اور نشانہ لگایا پتی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اور مٹکے کو ضرر نہیں پہونچا۔ میرن صاحب کے شاگرد امراؤ مرزا صاحب ہیں۔

نواب لوٹا صاحب:- اس محلہ میں ایک خوشرو، خوش اخلاق ورزشی ہاتھ پاؤں کے نواب صاحب رہتے تھے جن کی ڈیوڑھی کا ساز و سامان ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی زمیندار کا گھر ہے نوکر چاکر مصاحب اور دوست احباب سے دیوان خانہ میں خاصی رونق تھی۔ دوستوں کو پہونچانے کے لئے ان کے ساتھ اپنی ڈیوڑھی سے چوک تک چلے آتے تھے اور اندھیری رات میں خدا حافظ کہہ کر پھر واپس ہوتے تھے آپ فالج کے مریضوں کا یوں علاج کرتے تھے کہ لوہا گرم کر کے دہکتی ہوئی آگ میں جب اچھی طرح لال ہو جائے تو بیدھڑک پہلے اپنی زبان پر پھیرتے تھے پھر مریض کے جسم کو داغ دیتے تھے فالج زدہ عضو میں دوران خون ہو جاتا تھا اور مریض اچھا ہو جاتا تھا صحبت کے لوگوں نے بہت پوچھا کہ یہ راز بتا دیں مگر ہمیشہ یہی فرمایا کہ اس عمل کا عقیدہ سے تعلق ہے۔ میرے سوا کوئی پکے عقیدے سے یہ جرأت نہیں کر سکتا اور مرض کا چلا جانا عقیدے پر موقوف ہے قرآن شریف کی کوئی آیت پڑھتے تھے اور کتنے مریض ان کے عمل سے اچھے ہوتے تھے۔

۱؎ قدیم نمبر ۱۲۵ لغایۃ ۱۲۸

نواب پٹھان دریابادی :- عہد امجدی کا بڑا طاقتور[1] آدمی تھا دو من پختہ بوجھ سعادت گنج سے دریاباد ساٹھ کوس آسانی سے لے جاتا تھا۔

وکٹوریہ اسٹریٹ بزازہ میں بھی سعادت گنج کی طرح گاڑیاں کھڑی رہتی تھیں اور کرایہ پر چلتی تھیں مگر گاڑی اڈہ نام سعادت گنج ہی کے حصۂ شہر کا تھا۔

لاڈو خانم کا امام باڑہ :- لکھنؤ میں ایک عورت تو لاڈو ساقن تھی جس کا تعزیہ عہد شاہی میں بڑی دھوم سے نکلتا تھا۔ اس کے دلدادہ رند مشرب چوک میں تھے۔ لاڈو خانم شریف عورت اس کے علاوہ تھیں اس عمارت کے کچھ کچھ نشانات اب تک ہیں۔ اسی امام باڑہ میں نواب جعفر حسین خاں کی تحریک سے ۱۳۰۶ھ میں مفتی میر عباس صاحب قبلہ کے بعد انتقال مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ نے نماز و وعظ شروع کی۔ مولانا ممدوح اپنی نوشتہ حالات میں خود لکھتے ہیں —— ماہ[2] رمضان میں نواب جعفر حسن خاں صاحب نہایت مصر ہوئے اور دیگر حضرات بھی کوشاں ہوئے اور لاڈو خانم کے امام باڑہ میں نماز و وعظ کی بنا رہوئی اچھا مجمع ہوتا تھا کبھی کبھی مولانا سید[2] علی نقی صاحب بھی تشریف لاتے تھے۔ نجم العلماء کو جناب ابو صاحب قبلہ مرحوم خویش جناب ممتاز العلماء سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ وہ مفتی میر عباس کے ہمعصر تھے پہلے مفتی صاحب نے پھر ابو صاحب قبلہ نے رحلت کی (تاریخ العلماء ص ۳۰)

باگڑ بلا :- محلہ سعادت گنج کی ایک خاص تقریب مسرت تھی جو محرم چہلم کے بعد کسی فرصت کے زمانے میں بڑے پیمانے پر ہوتی تھی اور شہر کی زندہ دلی ختم ہوتے پر بند ہو گئی بڈھن صاحب، بنّن صاحب، چھٹّن صاحب پسران مرتضیٰ حسین اس کے بانی تھے۔ عدالت عالیہ سے اجماع کا حق تھا حسن اتفاق سے بڈھن صاحب کی نماز جنازہ اس موقع پر ہوئی جب ۸ ربیع الاول ۱۳۶۶ھ کو سید علی ظہیر کی کامیابی کا الیکشن کا جلوس چوک سے نکلنے والا تھا میں امین آباد کلاں پھاٹک کی مسجد سے مغربین پڑھا کر واپس آرہا تھا راہ میں بدر الحسن فیض آبادی نوجوان نے نماز جنازہ پڑھانے کی تحریک کی اور نماز میت ہوئی اور وکٹوریہ اسٹریٹ کا راستہ اژدہام میں رکا۔ لوگوں نے سات ہزار نفوس کا تخمینہ کیا یہ تو اسلم زندگی کے دو پہلو ہیں جو خوشنودی رب کا مرکز ہے۔ موضع بیتی ضلع بجنور میں جہاں صرف مذہب امامیہ کی بستی ہے۔ اب بھی لکھنؤ کی تقلید میں یہ رسم منائی جاتی ہے اور جوائنٹ مجسٹریٹ ضلع نے خلاف قانون نہیں قرار دیا معتصم باللہ منتصر باللہ مستعین باللہ معتز باللہ تو اسلامی حکمراں تھے باگڑ بلا عوامی حکمراں کا نام ہے مجھے یہ رویہ پسند نہیں۔

مکارم نگر :- حلقہ سعادت گنج کا ایک محلہ ہے نہیں کہا جا سکتا کہ پار میں جو مکارم نگر ہے وہ قدیم ہے یا یہ مکارم نگر زنانوں کی بستی ہے اور اس مکارم نگر میں زنانوں کا میلہ بھی ہوتا تھا۔

دخوٹ، کبھی زنانے کی لاش اٹھتے ہوئے تم نے نہ دیکھا ہوگا یہ لوگ اپنا جنازہ رات کو چھپا کر سناٹے میں اٹھاتے ہیں۔

کوڑے والی بیگم :- نواب امیر جہاں بیگم سعادت گنج کی معزز ترین خاتون خاندان شاہی کی رکن ان کی ڈیوڑھی باعزت اب تک باقی ہے۔ ان کے جلال کے قصے زبان زد ہیں۔ پردہ دار گاڑی پر نکلتی تھیں اور طیش آنے پر بے ادب کو کوڑے لگانا، سزا دینا معمولی بات تھی۔ ان کے داروغہ بھی بڑے کرّ و فر کے آدمی تھے جواہرات اور آرائی ساز و سامان ان کی محفل میں بڑے پیمانے پر تھا۔

---

[1] قدیم ہنر ص ۱۱۱ [2] تجلیات حصہ دوم ص ۲۲ [3] پروفیسر کیننگ کالج مراد ہیں۔

دھنیا مہری کا پُل

سعادت گنج سے عالم نگر جاتے میں یہ پل پڑتا ہے جو دھنّو مہری کا بنوایا ہوا ہے دھنیا یا دھنّو مہری ڈتّو مہری دو بہنیں عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ کی کہاریوں میں تھیں دھنیا دو سو کہاریوں کی افسر تھی ڈیوڑھی کی دیکھ بھال (نظارت) اور خواصوں کو انعام واکرام یا کوئی خطا کریں تو سزا دینا اور محل میں حاضر ہونے والوں کو مناسب ہدایات اس کے فرائض تھے بادشاہ کی طرف سے افضل النساء خانم خطاب اور چودہ پارچوں کا خلعت، تلوار اور سپر عطا ہوئی تھی ۔ روشن الدولہ کی پالیسی یہ تھی کہ وہ ان سے محبت کرتے تھے دھنّو نے اپنے زمانۂ عروج میں اونچے اونچے محل، مسجدیں، امام باڑے بنوائے اور نادار طبقے کو امور خیر میں مدد دی اور خود بھی عالیشان مسجد اور امام باڑہ بنوایا ۔

بیر علی عہد نصیری میں گھٹیلے جوتے کے کاریگر تھے ان کا بنایا ہوا جوتا بہت قیمتی ہوتا تھا ۔ دھنّو مہری نے پندرہ روپے دیکر ان سے جوتا اپنے لئے بنوایا ۔

بادشاہ مذکور کو زہر دینے کا الزام بھی دھنّو کے دامن پر ہے اور رؤساء لکھنؤ اس کی تصدیق کرتے ہیں اور بنائے مخاصمت میں یہ واقعہ بتایا جاتا ہے کہ جب ممتاز الدہر بیگم نئی نئی بیاہ کر آئیں اور شرم وحیا سے بادشاہ کے سامنے آنے میں دیر ہوئی اور انتظار کی زحمت میں دھنیا غصّہ کا شکار ہو گئی اور بادشاہ نے مہری کے سینے پر چڑھ کر اتنے گھونسے مارے کہ جسم سوج گیا اور بیگم نے شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر فریاد رسی کی اور جان بچائی ۔ یہی کینہ تھا جو دھنّو دل میں لئے رہی اور بعد مدت بادشاہ کو کمزور پاکر بیماری سے اٹھنے کے موقع پر زہر دیدیا ۔ کمینہ کی بلندی کبھی اس کو شریف نہیں بنا سکتی ۔

امام باڑہ :۔ دھنّو کو عزاداری کا غیر معمولی شوق تھا اور جو امامباڑہ بنوایا وہ فقیر محمد خاں کے شترخانہ سے ملا ہوا تھا اور یہ عزاخانہ اس قدر لق ودق تھا کہ امام باڑہ کی ضرورت کے لئے کئی قطعہ مکان کھد چکے تھے لنگر خانے کے لئے جو خالص پبلک مفاد کے لئے تھا ۔ سو گز زمین کی ضرورت ہوئی ۔ دھنّو نے چاہا کہ فقیر محمد خاں اپنے شترخانے سے سو گز زمین دیدیں فقیر محمد نے انکار کیا ۔ مہری نے بادشاہ سے تعصب مذہبی کی شکایت کی اور بادشاہ نے راجہ درشن سنگھ اپنے خاص کارندہ کو بھیج کر زمین اختیارات شاہی سے لے کر امامباڑہ کی تکمیل کی ۔ فقیر محمد خاں گھات میں رہے اور دھنّو کے خلاف ماحول تیار کرتے رہے اور بڑی چالاکی کے ساتھ دھنّو کو شاہی ڈیوڑھی سے علیحدہ کر دیا ۔ دھنّو اقتدار ختم ہوتے اور عتاب شاہی کے بعد اپنے گھرانے کو لیکر کانپور چلی گئی جائداد ضبط ہوئی مگر دھنّو کو پسند نہ تھا کہ امامباڑہ کی شان بگڑے ۔ فقیر محمد خاں نے اپنی زمین پر قبضہ کیا ۔ دھنّو نے سمجھایا کہ یہ اقدام آپ کے شایان شان نہیں ہے جس زمین کو دیدیا ہو پھر واپس نہ لینا چاہئے ۔ فقیر محمد خاں نے شنوائی نہ کی یہاں تک کہ بقرعید کے مہینہ ۱۲۵۲ھ میں افضل النساء کی خطا معاف ہوئی اور گئی ہوئی عزت پھر ہاتھ آئی اور اس نے ارادہ کر لیا کہ اب کی محرم اتنی دھوم سے ہو جیسا کبھی نہیں ہوا تھا چونکہ امام باڑہ کی زمین دوسرے کے قبضے میں پہونچ گئی تھی اور رکاوٹ لازمی تھی ۔ اس مرتبہ دھنّو نے بادشاہ سے زور دے کر کہہ دیا اور روشن الدولہ کو بھیج کر ظل اللہ نے فقیر محمد خاں کو معزول کر دیا اور حکم دیا کہ لکھنؤ چھوڑ دیں فقیر محمد خاں اپنے وطن مرزا گنج چلے گئے ۔ عالم نگر میں دھنیا مہری کی مسجد موجود ہے ۔ امام باڑہ بھی اسی علاقے میں ہونا چاہئے ۔ اور یہ توقع اس وقت صحیح ہے جب عالم نگر میں فقیر محمد خاں کا سکونتی مکان مانا جائے ورنہ امامباڑہ کو فقیر محمد خاں کے احاطے میں ہو۔

چاہیئے۔ دھنیا مہری کا پل لکھوری اینٹوں کا موجود ہے۔

شہدرہ

شہدرہ کب آباد ہوا اور اس کے نام کی کیا وجہ تھی اس سلسلے میں مختلف روایتیں مشہور ہیں جو ایک دوسرے سے ضد واقع ہوتی ہیں پہلا بیان یہ ہے کہ شیوخ کاکوری نے جب اکبر کو ادھر آنے کی دعوت دی اور تاجدار ہند وارد ہوا تو یہی راہ تھی جس سے اکبر وارد ہوئے اور دروازہ بطور یادگار بنا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ نواب سعادت علی خاں کے دوران قیام سعادت گنج میں اس دروازے کی تعمیر ہوئی اور نواب نے ۱۲۲۹ھ میں دنیائے فانی کو چھوڑا۔ اس وقت دروازہ موجود تھا۔ تیسری خبر یہ ہے کہ جب نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کی ماں غم قدریہ بیگم ہیں کالے کپڑے نہ پہننے کے سلسلے میں خفا ہو کر شہر سے باہر چلی گئیں شہدرہ اس وقت آباد ہوا اور مسجد بنائی گئی۔ پہلے دو قول عقل اور واقعات سے مطابق ہیں اور تیسری رائے اگرچہ تاریخی واقعہ ہے مگر بادشاہ کا قیام الماس باغ میں تھا (دیکھو نقش لکھنؤ) بنا بریں مسجد شہدرہ والدہ سلطان کی تاسیس نہیں ہے موجودہ طبقہ بزرگان شہر میں سید اصغر علی صاحب نیشاپوری صفوی کہتے ہیں کہ ۱۹۱۰ء تک اسی جگہ دروازے موجود تھے اور دوسرے محترم اور سن رسیدہ بزرگ مرزا محمد رضا بیگ صاحب رئیس اشرف آباد لکھنؤ کا مشاہدہ ہے کہ آج سے بہت پہلے موصوف نے شابدرہ میں ایک دروازہ شکار کے سفر میں دیکھا تھا جو بیدار اودھ اسی دروازے سے داخل ہوتا تھا۔

<u>مسجد شابدرہ</u>:۔ مسجد "بدھے مر" مقام سے ایک میل کے فاصلے پر ہے اور عالم نگر اسٹیشن راستے میں رہ جاتا ہے۔ مسجد بڑی شاندار اور پرانی انجینئری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ لکھنؤ میں کسی مسجد میں یہ خصوصیات تعمیر نظر نہیں آتے۔ چھت پر کئی گنبد ہیں جو اس قدر خوبصورت اور سلیقے سے بنائے گئے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا سقف میں اس کے تحمل کا بار کیونکر پیدا ہوا۔ گولکنڈہ، لاہور، عراق و ایران وغیرہ کے آثار قدیمہ دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس مسجد کا کلس بھی سنگی ہے اور یہ فتحپور سیکری کی کلسی کے نمونے پر بنا ہے۔ اور خاص وضع کا ہے مسجد شکستہ حالت میں ہے گرد و پیش کے حصے گر چکے ہیں اور طول زمانہ نے خوبصورتی پر جو ضرب لگائی ہے اس کے باوجود شان عمارت باقی ہے ایک وسیع اندازہ اور دور کے نمازیوں کے ٹھہرنے کی جگہ بھی ہے۔ نوچندی جمعرات کو مرد و عورت، عوام و خواص مسجد میں آ کر دعائیں مانگتے ہیں اور جنوں کی مسجد سمجھتے ہوئے مراد پوری ہونے پر میٹھی کھچڑی وہیں پکا کر نذر دیتے ہیں۔

<u>مقبرہ عالم نگر</u>:۔ پرنس دارا قدر تیموری[1] شہزادہ سکندر قدر کے چھوٹے بھائی تھے شطرنج میں اس قدر مہارت تھی کہ یوروپین انگریز ان کے کمال کے معترف ہوئے اور شکست کھائی۔ عہد واجدی کے پیدا شدہ صاحب فن تھے اپنے آبائی تکیہ میں دفن ہوئے مرزا ذی ہوش قدر ۱۹۳۰ء تک زندہ رہے جوان کے بیٹے تھے۔

---

[1] قدیم ہنر ص ۲۱۵

چوتھا باب

جوہری محلہ سے تالکٹورہ تک

جوہریوں کی آبادی جو یاقوت، زمرد، ہیرا، پنا، پکھراج، نیلم، فیروزہ، موتی، لیسنیا، عقیق، مونگا، سیپ، زبرجد کی تجارت کرتے تھے اور ہر جواہر کو پہچانتے تھے۔ پہلی نظر میں قیمت مقرر کرتے تھے بیع قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری کے معنی اسی محلہ میں نظر آتے تھے اس محلہ کے مشہور مکانات ہیں

کچہری :۔ محکمہ قضا جوہری محلہ میں تھا اور دیوانی و فوجداری کے مقدمات فیصلہ کئے جاتے تھے اور مدعی و مدعا علیہ مستغیث و مجرم کی شرع محمدی کی رو سے داد رسی ہوتی تھی۔ مؤلف کے ننھیال کی ایک کبیر السن خاتون سکینہ بیگم صاحبہ مرحومہ فرماتی تھیں کہ ہم نے مقتولین کے سر ٹوکروں میں آتے ہوئے اپنی آنکھ سے دیکھے اس عمارت کی پہلی صورت بگڑنے پر اس وقت اس آراضی پر منے آغا صاحب راز اجتہادی کا مکان نیم منہدم صورت میں ہے۔

بارہ دری :۔ جوہری محلہ میں بارہ دری کے نام کو خاص شہرت حاصل ہے یہاں محکمہ صدر الشریعت تھا اور خلاصۃ العلما سید مرتضیٰ پسر مجتہد العصر والزماں سلطان العلماء اپیلیں فیصلہ کرتے تھے اس آراضی پر عہد شاہی کا ایک غیر مرتفع کمرہ ہے جس کے بانی عمدۃ العلماء سید محمد ہادی تھے اور ہمارے زمانے کے شیعہ مجتہد میر آغا صاحب قبلہ فقیہہ کا بیٹھکا تھا۔ اب کئی پشت سے اس کمرے میں جماعت کی نماز ہوتی ہے کتنی مسجدیں ایسی ہیں جہاں نماز پڑھنے والے نہیں پہونچ سکتے اور ویرانی ہے مگر یہ کمرہ مسجد نہ ہوتے ہوئے زمانۂ دراز سے استعمال نمازیں ہے فوجداری کے مقدمات میں قتل کا حکم اسی جگہ سے صادر ہوتا تھا اور قبلہ و کعبہ مجتہد العصر والزماں کے رہنے کا مکان بھی اسی سے متصل تھا۔ گنگا بخش نامی ایک ڈاکو کو سزائے موت تجویز ہوئی۔ اس کا سگا بھائی محبت برادرانہ سے مجبور ہو کر غصہ میں بھرا ہوا مجتہد صاحب کے پاس اس وقت پہونچا جب آپ صحبت برخواست کر کے اٹھ رہے تھے اطلاع ہونے پر آپ ٹھہر گئے اور بات چیت شروع ہوئی۔

مجرم کا بھائی :۔ گنگا بخش کے قتل کا آپ نے حکم دیا ہے۔

مجتہد العصر:۔ (اطمینان بخش لہجے میں) ہاں میں نے حکم دیا ہے۔

برادر مجرم:۔ میں اس کا بھائی ہوں اگر آپ نے یہ حکم واپس نہ لیا تو اچھا نہ ہو گا۔

مجتہد العصر:۔ حکم تبدیل نہیں ہو سکتا۔

ان لفظوں کو سنکر تہور ونے کے تیور بدل گئے اور آگ بگولہ ہو کر پیش قبض ہاتھ میں لئے ہوئے جھپٹا اور چاہا کہ حملہ کرے مجتہد بوڑھے ہو چکے تھے مگر پوری طاقت سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ نوکروں کو آواز دی صدا بلند ہوتے ہی آنے والا پکڑا گیا اور یہ case خود بادشاہ کے سامنے پیش ہوا اور اقدام قتل کے جرم میں شاہ نے بھائی سے پہلے اس کی سزائے موت کا حکم دیا اور دونوں کے سر قلم ہوئے۔

(نوٹ، تاریخ اودھ اور مکاتیب غالب میں جہاں جہاں مجتہد العصر والزماں کی لفظ ہے اس سے مراد سلطان العلماء سید محمد صاحب رضواں مآب ہیں جنھوں نے ۱۲۸۴ھ میں عہد ملکہ وکٹوریہ میں انتقال فرمایا اور اپنے امامباڑے میں سپرد خاک ہوئے۔

امامباڑہ سوداگر:۔ حضرت غازی الدین حیدر کی شہریاری میں میر باقر نامی جواہرات اور شیشہ آلات کی تجارت کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ ایک شادی کے موقع پر انہوں نے دربار اودھ میں دو شالہ رومال بہم پہونچائے تھے جوہری محلہ میں رہتے تھے اور مکان سے قریب ہی امامباڑہ کے لئے ایک وسیع ٹکڑا زمین کا پا گئے اور یہ امامباڑہ دوسرے امامباڑوں کے برعکس جو اتر دکھن ہیں مغرب رخ تعمیر ہوا ہے بلند پھاٹک ہیں ترکی وضع کی مانگدار محراب بنا کر اسی کے موافق جوڑی لگائی گئی ہے۔ داخلے کا صدر دروازہ اس ڈھنگ سے بنوایا ہے کہ بازار چوک کے محاذ میں ہے امامباڑہ میں شہ نشین در بلند کرسی کے دالان در دالان کے بعد چبوترہ اور دو منزلہ صحنچیاں پہلو میں تھیں چبوترہ کے نیچے انگنائی شروع ہوتی ہے اور حصار کی دیوار میں حجرے اور اوپر کی منزل پر کمرے ہیں شیشہ آلات سے ہر درجہ مکمل طور پر آراستہ ہے۔

میر باقر کے مورث اعلیٰ میر زین العابدین تھے جو نیشاپور کے باشندہ تھے۔ میر باقر بڑے دیانت دار تھے اور منور الدولہ سے بہت رسم وراہ تھی۔ ۱۰ ربیع الآخر ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۲ء کو امامباڑہ مذکور میر باقر نے اپنے بیٹے اور جناب ممتاز العلماء مجتہد کے نام وقف کر دیا اور گورنمنٹ پرامیسری نوٹ مالیتی ۲۱۸۲۶ روپیہ سکہ انگریزی اخراجات کے لئے وقف کئے اور جو جائداد تجویز کی اس کی آمدنی میں جناب ممتاز العلماء کو اختیار دیا کہ

"در وقتیکہ سادات و مومنین را احتیاج زائد شود جناب ممتاز العلماء یا قائم مقامان اوشان را اختیار است کہ دریں دکاکین و مکان بیرونی نیز اجازت قیام و سکونت بسادات مومنین و محتاجین بدہند" اس امامباڑہ میں عشرہ کی روشنی قابل دید ہوتی تھی اور پوری عمارت جگمگا اٹھتی تھی اور صدر دروازہ میں ایک عجوبہ روزگار پتھر کی ہانڈی روشن ہوتی تھی جو دودھیا شیشے کی طرح ضو دیتی تھی اور ایسی ہانڈی کہیں نہیں ہے میر باقر شیشہ آلات کے تاجر تھے اس لئے اپنے امامباڑہ کو بہترین قسم کے جھاڑ جو ڈال ہانڈی چھاب سے سجایا تھا یہاں تک کہ چھت سے باتیں کرنے والے اور خوشنما بیٹھک کی دھوم تھی۔ وقف نامے سے صرف ایک سال بعد میر باقر ۱۸۶۳ء میں رحلت کر گئے اور پھاٹک کے سامنے ایسے مقام پر دفن ہوئے کہ امامباڑہ میں زائرین اور شرکاء مجلس کی آمد و رفت ان کی قبر پر سے ہو میر باقر کی ایک بیگم رنگ محل کے نام سے مشہور تھیں۔ میر باقر کے تجارتی فروغ کا راز ان

کی سچائی تھی ان کی مدح میں مثنوی بیت الحزن کا ایک شعر شاہد عدل ہے ؎

بدنیسان نقل کرد از میر باقر   کہ مرد راست گفتار یست تاجر

۱۸۶۹ء یا ۱۸۷۰ء میں میر وزیر حسین صاحب مؤلف چہل مجلس شبیر، لکھنؤ میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے اس زمانے میں ایک مجلس میر باقر سوداگر کے امامباڑہ میں ہوئی اور مرزا دبیر صاحب مرحوم نے نیا مرثیہ پڑھا جس کا مطلع یہ تھا ؎ متصل ہے چمن فصل بہاری کی ہے آمد (جلد دوم قلزم ماتم) ہجوم کی یہ کیفیت تھی کہ چھتوں پر لوگ لدے ہوئے تھے اور منڈیروں پر مثل گھوڑوں کے سوار تھے اور درختوں پر چڑھے ہوئے تھے جب مجلس ختم ہوئی تو میر وزیر حسین نے جو مجلس میں موجود تھے مرزا صاحب سے درخواست کی مرثیہ جو ابھی پڑھا ہے مجھ کو مرحمت ہو مرزا صاحب نے وعدہ فرمایا بہت اچھا   (حیات دبیر ص۱۵)

حمام و مسجد :۔ امامباڑہ کے پہلو میں ایک وسیع مسجد اور حوض ہے جہاں نمازیوں کو ادائیگی فرائض میں آرام ملتا ہے خانہ خدا میں صرف ایک چوڑا درجہ ہے گنبد اور منارے نہیں ہیں دوسری طرف پھاٹک سے قریب حمام ہے جو مدت دراز سے بند ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ محلہ وار حمام تھے اور جاڑوں میں پبلک کو نہانے کی بڑی سہولت تھی۔

امامباڑہ حکیم شیخ علی محمد

مرزا محمد ہادی عزیز لکھتے ہیں۔ فرنگی محل و جوہری محلہ یہ دونوں محلے لکھنؤ میں قریب جلوہ خانہ شاہی واقع ہیں جہاں ایک وقت میں علما کا معدن اور فضلا و اطبا کا مخزن تھا اور ایسے کامل الفن یگانۂ روزگار اس بستی میں بستے تھے جن کا نظیر آسمان ڈھونڈھتا رہے گا یہاں کا چپہ چپہ فقر عبرت ہے ذرہ ذرہ زبان حال سے کہہ رہا ہے ؎

ہر کجا خشتے بود افتادہ در ویرانہ   ہست فرد دفتر احوال صاحب خانہ

مکان ویران مکین پیوند زمین۔ دیکھتے دیکھتے وہ مجمع پریشان ہو گیا ؎

تھی جو کل تک جلوہ افروزی میں شمع انجمن   آج وہ شکلیں چراغ زیر داماں ہو گئیں

اس سے قریب امامباڑہ میر باقر سوداگر مسافر خانہ شاہی تھا جس میں حاجی و دائرو وارد بیرون شہر مہمان ہوتے تھے۔ ذی الحجہ ۱۲۶۵ھ تک[1] مسافر خانہ تھا حکیم محمد جی برادر زادہ و قائم مقام حکیم نبا صاحب اور آخر میں حکیم شیخ عابد علی اس محلہ کے بڑے اطبا میں تھے شیخ صاحب نے جمادی الاول ۱۳۲۶ھ میں اس دنیا کو چھوڑ کر گوشۂ لحد آباد کیا امامباڑہ حکیم شیخ علی محمد وہ مکان ہے جس میں حکیم علی نقی اور پھر ان کے بیٹے حکیم امیر حسین اور پوتے حکیم مجن رہتے تھے اب یہ مکان حامد ہاؤس سے نامزد ہے امامباڑہ میں مجلسیں ہوتی تھیں آٹھویں دن نماز جماعت ہوتی تھی اور بعد غدر ۱۲۹۷ھ میں اس کی بنیاد پڑی تھی مادۂ تاریخ[2] جس سے سنہ تعمیر واقع ہوتا ہے یہ ہے ؎

نکلا مثالِ اشک بصحت یہ مادہ ۱۸۸۰ء   دردعزا کو واہ یہ بیت الشفا مفید ۱۲۹۷ھ

حکیم نبّا :۔ عربی میں نبض دیکھنے والے کو نباض کہتے ہیں اور نبّا اس کا مخفف ہے اطبائے لکھنؤ میں حکیم نبّا کا پایہ بہت بلند تھا یہ کبھی

---

[1] تجلیات ص۱۰۹   [2] دیوان برق میں یہ قطعہ تاریخ ہے

مطب سے اپنے کسی مریض کو گھر پر دیکھنے نہیں گئے چہ جائیکہ لکھنؤ کے باہر سفران کے زمانے میں دواخانے کا چلن نہ تھا جو مریض اپنی خوشی سے اپنی حیثیت کے مطابق نذرانہ پیش کرتے تھے اس میں ۵۰۰ روپیہ روز کی آمدنی گھر بیٹھے تھی۔ یوپی کے تمام اطبا کا سلسلہ شاگردی حکیم نبا تک پہونچتا ہے وہ غدر ۱۸۵۷ء میں بھی لکھنؤ سے باہر نہ گئے شہر کی پرآشوب حالت دیکھ کر احباب نے بہت چاہا کہ کسی طرف نکل چلیں مگر حکیم صاحب راضی نہ ہوئے قدرت نے بھی ان کا ساتھ دیا اور اس طرح ان کی جان بچائی کہ حکیم صاحب تے کئی بوتلیں شربت انار اس موقع پر تیار کر لیا تھا جو گورا گھر لوٹنے آیا اس کو ایک خمراک شربت انار دیا اور وہ تعریف کرتا ہوا دوسروں سے سفارش کرتا ہوا پلٹ گیا چار پانچ بوتلوں میں بلا ٹل گئی اور توکل کی صفت کام آئی۔

جوہری محلہ اطبا کا مرکز تھا انھیں کے شاگردوں میں اور جوہری محلے کے طبیب کا ذکر ہے کہ وہ ایک مریضہ کے لئے استخارہ دیکھکر نسخہ لکھ رہے تھے لاتعداد استخارے منع آئے اور حیرت تھی کہ کسی دوا کے گھٹانے بڑھانے سے مصلحت الٰہی شامل حال ہو یہ فکر دیکھ کر باپ دادا کے وقت کا نوکر اصلیت تک پہونچ گیا اور اس نے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے حکیم صاحب کو توجہ دلائی کہ یہ حاملہ ہے حمل کی رعایت کی اور چھوٹتے ہی استخارہ آ گیا۔

منڈی

جوہری محلہ کے ختم ہونے پر منڈی کا میدان تھا جہاں بغیر کسی عمارت کے زیرآسمان ترکاری اور سبزی، آم، خربوزے، تربوز اور لسن پیاز تھوک مال فروخت ہوتا تھا صبح سے دوپہر تک ایک ہنگامہ بپا رہتا تھا۔ انگریزوں کے آخری دور میں حیدر جان کے احاطے میں ترکاری منڈی کے لئے آہنی سائبان اور چبوترے بنانے پر یہاں کے تمام کبڑیئے اور کنجڑے وہاں پہونچا دئے گئے۔ اور مدت تک یہ زمین اجاڑ رہی یہاں تک کہ گول دروازہ رفیوجی مارکیٹ اور نئی فلک نما بلڈنگوں نے اس خلا کو پورا کر دیا جو منڈی کی جدید عمارت سے ادھر محسوس ہو رہا تھا

نیاز فتحپوری اپنے مقالہ "لکھنؤ کی پھبتیاں" میں لکھتے ہیں۔

پھبتی کی ایک عجیب و غریب مثال ہے۔ بڑی معنوی اور لطیف پھبتی کہنا چاہئے لکھنؤ کے ایک کنجڑے نے پیش کی وہ ٹوکرے میں سنترے لئے بیٹھا تھا کہ ایک بڑا دراز قامت انسان آیا اور کھڑے کھڑے سنتروں کا سودا کرنے لگا اس نے دام پوچھے تو کنجڑے نے بتادئے۔ وہ بولے تم دام زیادہ بتاتے ہو حالانکہ سنترے بہت چھوٹے ہیں اس نے سر اٹھا کر سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولا کہ "سنترے چھوٹے نہیں ہیں حضور بیٹھ کر ملاحظہ فرمائیں"۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس سے زیادہ لطیف طنز کسی شخص کی غیر معمولی درازی قد پر اور کیا ہو سکتا ہے"

اس بیان میں نیاز نے کنجڑے کی لفظ استعمال کی ہے۔ پھل ترکاری بیچنے والے ہندو مسلم دونوں ہوتے ہیں مسلمان کو کبڑیا اور ہندو کو کنجڑا کہتے ہیں۔ کھٹیک بھی غیر مسلم سبزی فروش کے لئے ہے ایک عذر

دوسرے لکھنؤ کی زبان میں ۔ وہ بولا میں بولا نہیں کہتے 'اس نے کہا' 'میں نے کہا یا عرض کیا۔ بتایا اس قسم کی لفظیں تہذیب میں زبان زد ہیں اور "بولا" غیر ذی العقول کے لئے ہے۔ چڑیا بولی، گائے بولی، علی ہذا

قدیم منڈی بزازہ سے جانے والے کو بائیں ہاتھ کی طرف اور جدید منڈی حیدر جان طوائف کے احاطے میں دست راست کی موڑ پر جہاں ۱۹۳۲ء کے قبل و بعد میر مہدی حسین ماہر کی مجلس نہم محرم پنڈال میں ہو چکی ہے۔ نیاز فتحپوری لکھتے ہیں ۔ حیدر جان

لکھنؤ کی مشہور طوائف تھی جس کے یاں ایک ہاتھی پلا تھا۔ ایک نواب (محمد حسن خاں) صاحب پستہ قد گردن ڈبل اس کے عشاق میں تھے کسی نے ان پر " حیدر جان کا ہاتھا " پھبتی کہی اور وہ اس نام سے مشہور ہوگئے۔

امامباڑہ آغا باقر

خاص

لکھنؤ کا سب سے پرانا اور تاریخی امامباڑہ حلقہ چوک کی موجودہ نئی منڈی کے پہلو میں جانب شرق واقع ہے جس سے امامباڑہ غفرانمآب تھوڑی دور رہ جاتا ہے اس کو آغا اسمٰعیل دلاور جنگ کی خواہش پر ان کے چچا اور کارپرداز آغا باقر خاں نے بعہد شجاع الدولہ مسافرخانہ کے قریب بنوایا تھا یہ لکھنؤ کا دوسرا امامباڑہ ہے یہاں چوڑی والیاں آباد تھیں۔ ان کے مکانات کھدوا کر وسیع امامباڑہ بنا۔ امامباڑہ حسین آباد اسی امامباڑہ کے نقشے پر محمد علی شاہ نے بنوایا۔ آغا باقر پنج ہزار سواروں کے رسالدار تھے آغا اسمٰعیل کالپی کے حاکم ہوکر جب روانہ ہوئے اور مرہٹوں سے مقابلہ کرتے رہے یہاں تک کہ موت کی نیند سو گئے پھر آغا باقر اس منصب کے حامل ہو کر روانہ ہوئے۔ انھوں نے وہاں بھی امامباڑہ بنایا دشمن ان کی بھی گھات میں تھا۔ ٹھنڈائی میں زہر دے کر ان کا بھی کام تمام کردیا اور قبر پر ایک مقبرہ بھی بنوا دیا۔ اس امامباڑہ میں ایرانی طریقے پر مجلس ہوتی تھی۔ امامباڑہ ۱۸۵۷ء کی شورش تک باقی تھا ۱۸۵۸ء میں انگریزوں کا جب دوبارہ تسلط ہوا اور بڑے امامباڑہ کو قلعہ قرار دیا تو چاروں طرف پانچ سو گز تک سب عمارتیں کھود کر میدان کر دیا تھا اور امامباڑہ بھی حصار قلعہ میں مسمار ہوگیا مرزا کام بخش خلف مرزا سلیمان شکوہ پسر دوم شاہ عالم شاہ دہلی اس عزاخانہ میں دفن ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے بیٹے حیدر شکوہ شاہ دہلی نے انگریز حکومت سے آراضی امامباڑہ حاصل کرکے ٹین ڈلوایا جس میں اس وقت ایک خوشنما سورج مکھی بنا تھا جب مرزا حیدر شکوہ کی بیوی طیبہ بیگم نے انتقال کیا تو صحن قبروں سے بھر چکا تھا اس لئے وہ حوض کے مقام پر دفن کی گئیں۔

چہل ممبری:۔ ہندوستان میں محرم کے موقع پر بچوں کی منت مراد یا واقعۂ کربلا کی تاریخی حیثیت سے یادگار رہیں جو آئین و رواسم پھیلے ان میں چہل ممبری ایک قدیم رواج تھا جو امامباڑہ آغا باقر ہی سے شروع ہوتا تھا چہل ممبری کی شان یہ تھی کہ حاجت مند منت مانتے کہ میرا فلاں جائز مقصد پورا ہوگا تو چہل ممبری کروں گا عشرہ کی رات کو صاحبانِ حاجت اپنے گھروں سے چل کر ہر امامباڑہ میں منبر رسولؐ پر دو شمعیں روشن کرکے خاموشی کے عالم میں آئیں اور دعا مانگ کر واپس ہوں راستے میں کسی سے بات نہ کریں چالیس منبروں کی قرار داد ختم ہونے پر گھر واپس ہوں۔ ایک قول تو یہ ہے کہ امامباڑہ آغا باقر سے چودھرائن کے امامباڑہ تک چہل منبری ختم ہوجاتی تھی ــــ چودھرائن کا امامباڑہ روشنی کی کثرت سے بقعۂ نور ہوتا تھا وہ خود زائروں کے خیر مقدم میں بڑے پائچوں کا پاجامہ پہنکر سلام علیکم کہتے ہوئے مانتداروں کو علم تعزیہ ضریح تابوت کی زیارت کراتے۔

حکیم سید یوسف حسین نے " جنت کی کھڑکی " کے نام سے جب امامباڑہ غفرانمآب کے روبرو نیا امامباڑہ بنوایا تو بڑے منبر پر چھوٹے چھوٹے چالیس منبر رکھ دئے اور زیارت کرنے والوں کو اس حسن تدبیر سے روکا اور آگے بڑھنے نہ دیا اس عرصے میں اگلے رواسم لوگ بھولتے جارہے تھے اور عقیدت مندوں کے فقدان سے پرانے روایات دفن ہونے لگے اور چہل منبری بھی موقوف ہوگئی۔

یہ آراضی پھر بھی اس قدر چوڑی تھی کہ ۱۸۸۲ء میں ایک بڑا حصہ حیدر جان نامی عورت کے ہاتھ بیچ دیا۔ جس کا نام حیدر نگر یا احاطہ حیدر جان قرار پایا اس احاطہ میں میر مہدی حسین ماہر کی بنا کردہ نویں محرم کی مجلس ایک مرتبہ پنڈال میں ہوچکی ہے۔ جس میں

آدمیوں کا جنگل تھا اب یہ زمین حلقہ چوک میں ترکاری کی مارکیٹ ہے جس میں پھل، ترکاری، مچھلی اور شام کو بھیڑ بکری، دنبہ، مینڈھا، قربانی کے جانوروں کا بازار لگتا ہے۔ اس امامباڑہ کی سب سے پہلے راجہ شعبان علی خاں مرحوم نے اپنے روپے سے مرمت کی۔ پھر ۱۸۸۸ء میں راجہ امیر حسن خاں المتوفی ۱۹۰۳ء والی محمود آباد ضلع سیتاپور نے تعمیر میں امداد کی اور تیسری مرتبہ بمبئی کے کسی رئیس کے سرمایہ سے درستی ہوئی۔ امامباڑہ کی موجودہ شکل کمرے کی وضع کی ہے جس کے آگے برآمدہ میں آہنی سائبان ہے اور روکار میں وسیع صحن اور پہلو میں کچھ زمین ہے گرد پختہ چار دیواری ہے اور زیارت گاہ کے دو حصے ہیں زنانہ و مردانہ۔ عورتوں کا درجہ جانب شمال اور مردوں کا حصہ سمت جنوب ہے۔ امامباڑہ بہت مقبول اور عہد شاہی سے زیارت گاہ خلق ہے نوچندی کو اجتماع اور ہر جمعرات کو لوگ منت مراد کے لئے آتے ہیں اور حاضری چڑھاتے ہیں مصحفی مشہور شاعر کا قول ہے کہ مرزا رفیع سودا کی قبر اسی امامباڑہ میں ہے وہ تذکرۃ الشعراء میں لکھتے ہیں کہ محرم میں ایک دوست کے ساتھ آغا باقر کے امامباڑہ جانے کا اتفاق ہوا سودا کا خیال آیا اور فاتحہ پڑھنے قبر پر بیٹھ گئے تو دیکھا کہ لوح مزار پر حسب ذیل قطعہ کندہ ہے ؎

خلد میں جب حضرت سودا گئے فکر میں تاریخ کی ماہر ہوا
بولے منصف دور ہو پائے عناد شاعران ہند آں سرور گیا

مصحفی کو اپنے ہمعصر کا قطعۂ تاریخ پسند نہ آیا گھر پہونچ کر دوسری تاریخ خود کہی جس کا مادہ یہ ہے ع

گردید مدفنش زقضا خاک لکھنو
۱۲۹۰ھ

سودا کا کلام دیوان کی صورت میں کلکتہ سے ٹائپ حرفوں میں چھپا ہے۔ ثاقب نے انتخاب سودا انوار بکڈپو لکھنؤ میں چھاپا۔ اس کے بعد شیخ چاند ایم اے ایل ایل بی عثمانیہ یونیورسٹی نے کلام سودا پر سیر حاصل بحث کی۔ سودا کا کلام انتہائی بلیغ ہوتا تھا بعض قصائد تو زبان اور ذہن و فکر رسا پر اس قدر بار ہیں کہ جو عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ سودا زبان نہیں کہہ سکتے تھے اور ان کا کلام مغلق ہوتا تھا غزل کا ایک شعر اس سے زیادہ کیا عام فہم ہوگا ؎

ساق سیمیں کو تری دیکھ کے گوری گوری شمع مجلس میں ہوئی جاتی ہے تھوڑی تھوڑی

ان کے بینیہ اشعار بھی دلدوز ہیں ؎

نہیں ہلال فلک پر مہ محرم کا چڑھا ہے چرخ پہ تیغا مصیبت و غم کا

سودا نے ۱۲۹۰ھ میں قضا کی سودا کے نواسہ ۱۸۵۵ء میں جب محمد حسین آزاد لکھنؤ آئے زندہ تھے آشفتہ حال نظر آئے۔ پڑھے لکھے بھی نہ تھے۔

<u>مرزا دبیر کی ایک مجلس</u>:۔ سید افضل حسین ثابت لکھنوی حیات دبیر میں لکھتے ہیں کہ تیرھویں اور ماہ صفر کی اٹھارھویں کو احمد علیخاں سوز خواں مرحوم کے یہاں مرزا صاحب بہت بڑی مجلس پڑھا کرتے تھے ادھر حیدر خاں نامی ایک مومن کے یہاں انھیں تاریخوں میں میر صاحب پڑھتے تھے چنانچہ مجتہد العصر مولانا السید علی حسن صاحب قبلہ جائسی مدظلہ العالی ایک سال کی اٹھارھویں ماہ صفر کی نسبت یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ احمد علی خاں مرحوم زمانہ شاہی میں قریباً پچاس مجلسیں کیا کرتے تھے۔ امام باڑہ آغا باقر مرحوم کے قریب ان کا مکان تھا جو مکانات اب بالکل کھد گئے ہیں ہر روز ان کے یہاں ایک ذاکر کامل پڑھتا اٹھارہ صفر کو پچاسویں مجلس ہوتی۔ دونوں

مجلسیں بالمقابل ایک وقت پر ہوتیں اور میرے استاد جناب سید العلماء عرف میرن صاحب قبلہ علیین مکان طاب ثراہ بھی اکثر مجلس کے یہاں شریک ہوتے۔ ایک روز میر صاحب مرحوم حیدر خاں کے یہاں کچھ پہلے پڑھ چکے تو وہاں کے اکثر سامعین بھی یہاں آئے۔ یہاں آدمیوں کی کثرت سے زانو بدلنا دشوار تھا اور پیچھے کے تمام مکانات سامعین سے بھر گئے ایک کنواں جو صحن مکان میں تھا۔ اس پر تخت پڑا ہوا تھا اور اس پر بھی آدمی تھے جب آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ نہ رہی تو صاحب خانہ نے مکان کا دروازہ بند کر کے اندر سے زنجیر لگا دی۔ اب جو دوسری مجلس کے آدمی آئے انہوں نے باہر سے زور لگایا تڑاق سے زنجیر ٹوٹ گئی اکثر آدمی اندر آگئے آدمیوں کے جزر و مد سے ایسا تلاطم ہوا کہ مرزا صاحب منبر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بالآخر اس مجمع کو مجلس میں لے لیا مجلس تو برہم ہو چکی تھی مگر واہ رے مرزا صاحب کا کمال بس ایک دو رباعیاں پڑھی تھیں کہ مجلس ہمہ تن گوش ہو گئی۔

رباعی

یاں مجھ کو بچھانا تھا فرو آنکھوں کا — اس پردہ میں تھا عین سرور آنکھوں کا
پر اب تو نہیں تل کے بھی رکھنے کی جگہ — آنکھوں کے عوض بچھاؤں گا نور آنکھوں کا

دوسری رباعی

ہر عضو سے بلند گو آنکھیں ہیں — پر فرش کی ہو کمی تو لو آنکھیں ہیں
کس کس کے زیر پا بچھاؤں میں دبیر — ہم چشم بہت ہیں اور دو آنکھیں ہیں

وہ مجلس قتل گاہ کے نام سے مشہور ہوئی اور مہینوں لوگوں میں اس کے چرچے ہوئے۔ دفتر ماتم کی بیسویں جلد میں جو رباعیاں اس ردیف و قافیہ میں ہیں وہ اسی مجلس کی ہیں (حیات دبیر ص ۱۵)

مسافر خانہ:۔ تاریخ اودھ سے ایک مسافر خانہ کا پتہ چلتا ہے عزیز لکھنوی اس کو جوہری محلہ میں بتلاتے ہیں جیسا کہ گذرا جوہری محلہ میں مسافر خانہ کی گنجائش ہرگز نہ تھی۔ عزیز کو میر باقر سوداگر کے امامباڑہ واقع جوہری محلہ نے رائے قائم کرنے میں مغالطہ دیا ہے مسافر خانہ آغا باقر کے امامباڑہ سے قریب تھا اور ایک قول یہ ہے کہ عہد شجاع الدولہ میں مسافر خانہ آغا باقر ہی نے بنوایا تھا۔ یہ عمارت بھی امامباڑہ آصفی کے قلعہ قرار پانے پر منہدم ہو گئی مسافر خانہ میں نووارد معززین اترتے تھے اور سرکاری و نیم سرکاری مہمان ٹھہرتے تھے

امامباڑہ غفرانمآب

یہ امامباڑہ لکھنؤ کی دو بڑی سڑکوں وکٹوریہ اسٹریٹ اور کیننگ اسٹریٹ کے بیچ میں ہے بانی امامباڑہ ہندوستان میں مذہب امامیہ کے پہلے مجتہد ہیں جنھوں نے نماز جمعہ و جماعت اس فرقے کی جانب سے پڑھانا شروع کیا اس امامباڑہ کا موجودہ راستہ ترکاری منڈی اور امامباڑہ آغا باقر سے گزر کر ہے اور سید دلدار علی صاحب نے ۱۲۲۶ھ میں ایک لمبی چوڑی زمین لے کر امامباڑہ بنوایا۔ اس سے پہلے لکھنؤ میں علاوہ امامباڑہ آصفی کے دو امامباڑہ بننے پائے تھے امامباڑہ آغا ابو طالب خاں اور امامباڑہ آغا باقر، اس امامباڑہ میں دو دالان اور شہ نشین، گنجائش اور وسعت کے لحاظ سے لکھنؤ کے امامباڑوں میں اوسط درجے پر شمار کیا جاتا ہے تینوں چھتیں لکڑی کی دھنیوں سے پٹی ہیں اور شہ نشین میں اسی زمانے کی ضریحیں رکھی ہیں عمارت زمیں دوز اور پورب پچھم صحنچیاں ہیں قبلہ کی طرف غفرانمآب اور ان کے چھوٹے بیٹے سید العلماء علیین مکان کی قبریں ہیں ان پر کٹہرے لگے ہیں

سید العلما کی قبر کا سنگ مرمر اتنا لمبا چوڑا ہے کہ کسی بادشاہ کی قبر پر بھی ایسا پتھر نہیں ہے۔ صحن بہت لمبا چوڑا تھا۔ جو ایک طرف کیننگ اسٹریٹ سے جا کر ملتا ہے اور شمالی سمت میڈیکل کالج کی زمین سے ملحق ہے ان زمینوں پر ورثار کی غفلت سے کچے مکان بن گئے ہیں اور حدود صحن کم ہو گئے۔

صحن میں پورب اور پچھم کی طرف حجرے تھے جو بانی نے طالبانِ علم[1] اور اہل فضل کے لئے قرار دیئے تھے چنانچہ مولوی سید علی نقی داعی پوری پروفیسر کیننگ کالج (وفات ۱۳۰۵ھ) مدتوں انھیں حجروں[2] میں سکونت پذیر رہے مزار غفرانمآب[3] کی صحنچی کے سامنے برآمدے میں دیوار پر غفرانمآب کا پشت نامہ اور سلسلہ روایت کا شجرہ رنگین ——— ثبت تھا۔ یہ رنگین گلدستہ اب استر کاری باقی نہ رہنے سے باقی نہ رہا اس زمین پر لاتعداد اہل علم اور کمال اطبا' ذاکر' واعظ زیر زمین محو خواب ہیں۔ لبعض علمائے عراق کی قبریں بھی ہیں۔ چنانچہ مولوی مرزا امین خراسانی نے بعد غدر لکھنؤ میں جب رحلت فرمائی تو وہ اسی سرزمین پر سپرد خاک ہوئے۔ صفی، عزیز، محشر اور مہدی حسین ناصری ایم اے وغیرہ مشاہیر قوم نے اپنی نظموں میں اس امامباڑہ کا تعارف کیا ہے اور تاریخی اور ادبی دنیا میں بھی امامباڑہ مشہور ہے۔

عزیز لکھنوی

بیا دریں حسینیہ کہ منبع کبریائی   کشادہ ہر طرف باب زعلم مرتضیٰ بینی

مرزا کاظم حسین محشر

وہ حسینیہ کہ جو ہے قصر فردوس بریں   مدفن غفرانمآب و مرکز ارباب دیں
منہدم ہونے کو ہے لے قوم شیعہ ہوشیار   تجھ سے فریادی ہے ایک ایک ذرہ خاک مزار

ناصری المتوفی ۱۳۴۹ھ

جب تک اس دہر میں نام شہ ناشاد رہے   یا الٰہی یہ عزا خانہ بھی آباد رہے

مفتی صاحب

ایں خوابگاہ مجتہد العصر والزماں   سید محمد است و حسین است و ہم حسن
ایں جا ہزار مرتبہ مجلس بنا شدہ   از قطرہ ہائے اشک فتادہ در عدن
ہر صفہ و رواق دے و ہر حظیرہ اش   پاکیزہ منزل برکا تست بے سخن
در ہر مقام دے کہ ستونہ ستادہ است   سرو یست از حدیقہ و شمعیست در لگن

ایک پردیسی کے اہم خدمات ؛ ملا محمد مہدی ابن محمد شفیع استر آبادی مازندرانی سلاطین اودھ کی داد و دہش سنکر لکھنؤ آئے۔ اور ۱۲۳۲ھ سے جہاد قلم شروع کیا ہدیۃ السلطان رسالہ لکھ کر نصیر الدین حیدر بہادر کے نام پر معنون کیا پھر عزۃ الجبین دوسری کتاب نواب معظم الدولہ مہدی علی خاں کے نام سپرد قلم کی۔ اس کے بعد بحار الانوار مشہور حدیث شیعہ کی آٹھویں جلد کا ۱۲۴۶ھ[4] میں فارسی ترجمہ کیا۔ والدہ شاہ کی فرمائش سے ترجمہ کر رہے تھے کہ دو باب لکھنے کے بعد ۱۲۵۹ھ میں پیام موت آگیا اور امامباڑہ میں دفن ہوئے۔

---

[1] تذکرۂ بے بہا ص ۱۵۲ [2] منہ ص ۲۳۲ [3] الواعظ دسمبر ۱۹۳۶ع میں اس عزا خانہ پر ایک بسیط مقالہ مؤلف نے تحریر کیا ہے۔ [4] تجلیات ص ۱۳۶

استرآباد داد ما بود وطن | اے دلے بذیقعدہ برفت از عالم
شد دفن قریب قبر دلدار علی | ملا مہدی بیافتہ قصر ارم
۱۲۵۹ھ

یہ وہ قبر ہے جس پر علماء فاتحہ پڑھنے کی کوشش کرتے تھے اور لوح مزار صاف کرتے ہوئے کہتے تھے ایسا بلند مرتبہ عالم اب تک عراق سے ہند میں نہیں آیا[1]۔

ایک مدراسی کی زیادتی:- امامباڑہ ہی کا واقعہ ہے۔ مولوی غلام نبی اللہ احمد خاں نے جب مولانا احمد علی صاحب سے ایک مناظرہ میں ایسی بات چیت کی کہ مولانا نے ان کو کافر کہہ دیا۔ اسی دن امامباڑہ میں مجلس تھی ملک العلماء اور دوسرے عالم شریک مجلس تھے غلام نبی اللہ کے سامنے جب مجلس کا شربت آیا[2] تو مولوی احمد علی صاحب نے ٹوک دیا کہ اس پیالہ کو پاک کر لینا اس واقعہ کے بعد وہ جدھر سے نکلتے تھے انگلیاں اٹھتی تھیں حتیٰ کہ حیدرآباد چلے گئے۔ امامباڑہ[3] سے جنوری ۱۸۷۵ء میں فدا علی عیش نے آثار الامصار اخبار ہفتہ وار جاری کیا ہر جمعرات کو نکلتا تھا اور جولائی ۱۸۸۱ء میں ایک اخبار اصح الاخبار ہفتہ وار یہاں سے جاری ہوا۔

پریس:- شاہی پریس جب تک علمی خدمات میں مصروف رہے اس سے بہتر مطبوعات ہندوستان آج تک نہ چھاپ سکا انگریزوں کا دور شروع ہونے پر امامباڑہ میں کنز العلوم نامی مطبع قائم ہوا اور ۱۲۹۱ھ میں اس پریس سے مثنوی معراج المضامین چھپی۔ جس کے ناظم منشی سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی مشہور شاعر ہیں۔ اس مثنوی میں ۲۲۵ شعر بارہ اماموں کی مدح میں نظم ہوئے ہیں اور حضرت امید لکھنوی کی اس پر تقریظ ہے۔ اس مطبع کے پریس مین شیخ احسان علی گورکھپوری تھے۔ جن کی اردو فارسی لیاقت بہت اچھی تھی اور سو برس کے ہو جانے پر مجذوبوں کی ایسی باتیں کرتے تھے حافظہ اس قدر قوی تھا کہ بعد حمد ہندی اور مناقب مدح اہل بیت میں مناجاتیں یاد تھیں ماہ رمضان میں سحر کے فقیروں کا مقابلہ اپنی طاقت لسانی سے سڑک پر کھڑے ہو کر کرتے تھے اور شعر پڑھتے پڑھتے بھیڑ ہو جاتی تھی ان کی اولاد گورکھپور میں موجود ہے۔

آل انڈیا شیعہ کانفرنس اور تبرا ایجی ٹیشن اسی امامباڑہ سے شروع ہوا یہ ہے امامباڑہ کی تاریخ۔

مسجد:- امامباڑہ کے ساتھ جو مسجد ہے یہ سلطان العلماء مجتہد العصر والزماں کی تعمیر کردہ ہے قالب دار چھت، کشادہ درجہ مختصر صحن، گنبد و مینار ندارد، صحن میں ہشت پہل حوض عمارت کسی اعلیٰ انجینئر کی ذہنی کاوش کا نتیجہ اور اندر سے ہوادار ہے سنگ تعمیر بجائے روکار کے پشت مسجد نالہ کی طرف پچھم کی دیوار میں ہے اور بخط نسخ اوپر لکھا ہے نشہد ان مولانا امیر المومنین علیا ولی اللہ ۱۲۳۹ سلطان العلماء نے ۲۲ ربیع الاول ۱۲۸۴ھ میں رحلت کی اور امامباڑہ کے ضریح والے دالان میں دفن ہوئے دیوان ناسخ میں جو قطعہ تاریخ مسجد غفران مآب کا درج ہے وہ نصیرآباد کی مسجد ہے نہ کہ یہ مسجد۔

امامباڑہ سید نقی صاحب زبدۃ العلماء:- موجودہ ترکاری منڈی کی سڑک پر ڈوروالی گلی سے قریب داہنے ہاتھ پر یہ اوسط درجہ کا عزاخانہ عہد شاہی کی عمارت ہے زبدۃ العلماء معین المومنین سید علی نقی آخری تاجدار اودھ کے خاص عالم اور ہمہ وقت صحبت سلطان میں رہنے والے بزرگ تھے مرزا غالب مرحوم نے آپ ہی کے ذریعے بادشاہ سے ملنا چاہا تھا تاریخ اودھ میں آپ کا نام نامی چھپا ہوا نہیں ہے۔ امامباڑہ کا پھاٹک کیسا تھا؟ دروازہ سے متصل سشان عمارت کیسی تھی؟ کوئی

---

[1] تذکرۂ بے بہا ص ۳۲۸ [2] تذکرہ ص ۲۷۱ [3] نیا دور دسمبر ۱۹۵۹ء لکھنؤ

بتانے والا نہیں۔ گر پڑ کر اندر جانے کا ایک تنگ راستہ رہ گیا ہے جس کے بعد کشادہ صحن اور امامباڑہ کے رہے سہے درجے بلند شہ نشین نیچے تہہ خانہ زبدۃ العلماء کی قبر سرداب ہی میں ہے اس امامباڑہ کی چھت رنگین پھولدار دری کے ڈیزائن کی تھی اور دھنیوں کے بجائے موتے پٹرے خوبصورتی سے جڑے تھے۔ سہ پہر کو مجلسیں ہوتی تھیں آخری ذاکر مرزا محسن صاحب حدیث خواں جو مفتی گنج میں رہتے تھے اور مشہور ذاکر تھے اس امامباڑہ کی ابتدائی تاریخ ہائے عشرہ میں بادشاہ مرحوم شرکت فرماتے تھے اور جو تاریخ مقرر تھی وہ کبھی ناغہ نہ ہوتی تھی زبدۃ العلماء کے خاص محل سے صرف ایک صاحبزادی تھیں جو شمس العلماء سید محمد ابراہیم فردوس مکان کو منسوب تھیں جو آپ کے حقیقی بھتیجے تھے۔ اس کے علاوہ دیگر بیبیوں سے جو اولاد تھی ان میں نجم العلماء سید ہدایت حسین امامباڑہ پر بحیثیت متولی اور قائم مقام قابض رہے زوجہ اولی کی اولاد نے اپنے استغناء میں کبھی توجہ نہیں کی۔ نجم العلماء کے بعد سید سعادت حسین عرف پیارے جان اور اب ان کی اولاد متعرف ہے زبدۃ العلماء کی شان میں شاعر کہتا ہے ؎

رونق منبر و محراب فقیہ دوراں   باعمل و مفتی صدر و ارشاد

ادبی جرائد اور رسالوں میں آپ کے حالات شائع ہو چکے ہیں۔ امامباڑہ کا موجودہ راستہ پھاٹک سے نہیں ہے بلکہ اصل در گلی کی طرف ہے جس کو ورثا نے مکان قرار دیدیا ہے اس دروازے پر فضائل گریہ کی حدیثیں اب تک بخط نسخ کندہ ہیں۔ سید افضل حسین صاحب ثابت لکھنوی مرحوم حیات دبیر میں رقمطراز ہیں مرزا صاحب مرحوم کا جو اعزاز ان کے کمال کے سبب سے خاندان عالی نشان اجتہاد میں تھا اسی نظریہ سے وہ جناب حضرت زبدۃ العلماء معین المومنین سید نقی صاحب مرحوم خلف الصدق سید العلماء طاب ثراہ کی مجلس میں پڑھا کرتے تھے اس مجلس میں خاندان اجتہاد کے تمام مجتہد اور لکھنؤ کے قریباً تمام اہل کمال شریک ہوتے تھے۔ یہ عزت تمام اعزازوں پر فوقیت رکھتی ہے ص۳۸۸

مسجد زبدۃ العلماء:۔ محلہ مذکور میں یہ شاندار اور خوبصورت مسجد بھی اس دور رفتہ کی یادگار باقی ہے جو بہترین نقشہ کے تحت تیار ہوئی ہے بالائے محراب سنگ مرمر پر قطعہ تاریخ لکھا ہے چبوترہ سے متصل حوض اور مختصر صحن ہے

حمام زبدۃ العلماء:۔ مسجد سے قریب امامباڑہ کے پہلو میں واقع ہے اس حمام میں جامہ خانہ کے بعد آداب طہارت انجام دینے کی علیحدہ جگہ تھی اندر بڑا حوض غوطہ کے لئے سنگ مرمر کی زمین پورے حمام کی، ٹھنڈے پانی کا حوض گرم پانی کے حوض میں نیچے بھٹی اور آگ مشتعل عہد شاہی کے بعد جو حمام باقی رہ گئے تھے ان میں سب سے ممتاز حمام تھا اللہ رکھوا اور اس کے بعد علی حسین حمامی تھا جو بڑی روانی کے ساتھ فارسی لب ولہجے میں باتیں کرتا تھا سقف حمام پر مناسب عمارت اور مشت مال جہانواں کیسہ کرنے والوں کے رہنے کا ٹھکانا تھا۔ عہد شاہی میں زبدۃ العلماء کا حکم تھا کہ نادار لوگ بغیر اجرت کے غسل کریں اس حمام کی تاریخ ملاحظہ ہو ؎

وہ چہ حمام کہ بانیش علی نقی است   آنکہ جد و پدرش کرد بنائے اسلام
بسکہ از عترت اطہار بود طینت او   کار و بارش ہمہ پاکیزہ و پاکست انجام
آب و تاب سخن از مدحت و صورت یافت   شستہ و رفتہ ازیں مادہ گردید کلام
سرد مہری جہان گرچہ ز حد بگذشتہ   بہر خاصان خدا ساختہ گرما بہ عام
بر زبانم شدہ تاریخ بنایش جاری   یادم از آیہ تطہیر دہد ایں حمام ۱۲۶۱ھ

رنوٹ، پشت مسجد پر زبدۃ العلماء کا کتب خانہ اور لائبریری کے عقب میں فیل خانہ تھا۔ ۵ برس پہلے ڈولی کے کہاروں کو فیل خانہ کہہ کر پتہ بتاتے تھے اصطبل اور پشت اما باڑہ پر وسیع باغ تھا جو بڑی پرفضا جگہ تھی۔

دفتر تقسیم زکوٰۃ :۔ عہد امجد علی شاہ مرحوم سے زبدۃ العلماء زکوٰۃ بانٹتے تھے ان کے خطاب میں معین المومنین کی لفظ اسی بنا پر تھی۔ دفتر زکوٰۃ اما باڑہ اور مسجد ہی کے گرد و پیش تھا اور کچھ مکانات اب بھی باقی ہیں جن کے دروازوں پر گلکاری اور رنگین پھول بیل اگلی دیدہ زیبی کا اب بھی پتہ دے رہے ہیں تقسیم زکوٰۃ میں خیال رہتا تھا کہ کوئی مستحق محروم نہ رہے اور مسادات باقی رہے روپیہ بڑی جانچ پڑتال سے تقسیم ہوتا تھا بارہ منڈی حساب لکھنے والے تھے ہر ایک کے پاس رجسٹر تھا اور زکوٰۃ لینے والوں کو بارہ جگہ نام لکھوانے پڑتے تھے۔ اور جانچ کے وقت تمام رجسٹروں کا معائنہ ہوتا تھا۔ اس چھان بین میں نہ کوئی محروم رہتا تھا اور نہ دو دفعہ لے جا سکتا تھا عام لوگ اس طرز عمل اور ظاہری دشواری سے چیخ اٹھتے تھے کسی ظریف کا مشہور شعر اسی محل پر ہے ؎

سید نقی کا ظلم دجاد امصیبتا ۔۔۔ بارہ منڈی ایک گلا وامصیبتا

آپ کو میراث کے مسائل حل کرنے میں بڑی مہارت تھی اور تقسیم زکوٰۃ بھی کامل دیانت سے ہوتی تھی۔ میر وحید صاحب مشہور شاعر مدح میں فرماتے ہیں ؎

حاسداں گاہے نہ در تحریر لغزش یافتند ۔۔۔ ناقصاں مانند دائم در پے نقصان علم

اجلاس :۔ زبدۃ العلماء کے احکام جس قصر سے صادر ہوتے تھے وہاں آپ کی حاکمانہ نشست بھی تھی اور پیچیدہ معاملات میں تشفی بخش حل آپ کے ناخن تدبیر سے ہوا کرتا تھا اور پبلک اس قدر راضی تھی کہ آپ کو نہ کسی پہرہ کی ضرورت تھی نہ حفاظت کی کبھی فکر کی۔ مفتی صاحب ان کی مدح میں فرماتے ہیں ؎

رونق محراب و منبر و فقیہہ دوراں ۔۔۔ باعمل و مفتی صدر درشاد

زبدۃ العلماء کی تمام جائداد باستثناء موجودہ مسجد و اما باڑہ کے اعظم علی سوداگر جنرل مرچنٹ حضرت گنج نے خرید کر کوٹھی بنوائی جس پر ان کے بعد ڈتن سوداگران کے بیٹے مدت العمر قابض رہے۔

فیلخانہ :۔ وہ جگہ تھی جہاں زبدۃ العلماء کا ہاتھی بندھا رہتا تھا۔ مجتہد العصر کے لئے ہر عید بقر عید کو ہاتھی خلعت کے ساتھ آتا تھا چنانچہ تاریخ کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

بروز ہائے اعیاد کہ خلعت بجناب اجتہاد مآب عنایت می شد بہتر از خلعت وزارت مع فیل و اسپ و شمشیر و پالکی وغیر آنہا می بود و بمقتضائے حسن عقیدہ دینداری بادشاہ گاہ بگاہ، بخانہ می آیند" مجتہد کا خلعت وزارت کے خلعت سے بہتر ہوتا تھا علاوہ اس کے شاہزادگان نواب زادگان کے عاقبتی جوڑے کے ساتھ چالیسوین کے دن سواری کا ہاتھی بھی ہونا ضروری تھا خادم عرض کرتے تھے قبلہ وکعبہ ہاتھی بھی آیا ہے۔ آپ فرماتے تھے کسی حلقے میں باندھو"۔ امراء گھات میں لگے رہتے تھے مردہ کا مال سمجھ کر سستے داموں میں خرید لیتے تھے۔ اس وقت ہاتھی کی سواری وہ حیثیت رکھتی تھی جو آج موٹر کار کی ہے۔ ہاتھی سے بھی قدم قدم پر نقصان ہوتے تھے آج فلاں نواب کا ہاتھی بگڑ گیا کل فلاں ہاتھی چھوٹ گیا غریب آدمی کی جان ہمیشہ خطرہ میں رہی۔ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ فیلبان ہمیشہ سادات ہوتا تھا چونکہ یہ بادشاہ کی طرف پشت کرکے بیٹھنے پر مجبور تھا اس لئے صرف سادات اس کے مستحق تھے کہ وہ اولاد رسولؐ ہونے کی حیثیت سے بادشاہ کی طرف

پشت کرسکیں۔ زبدۃ العلماء کے خاندان میں سے صاحب اصدا ابن صاحب عن مرکے دو استاد تھے جو اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔

پاٹا نالہ

امامباڑہ آغا باقر اور امامباڑہ غفرانمآب کی شہرت نے دونوں امامباڑوں کو اس کا محتاج نہیں رکھا کہ امامباڑہ کا نام آنے پر محلہ دریافت کیا جائے اس وقت پتہ مکمل ہو۔ دونوں امامباڑوں کی گرد و نواح کی عمارتیں محلہ پاٹا نالہ میں شمار کی جاتی ہیں اور پاٹا نالہ نام ہونے کی وجہ ظاہر ہے کئی مقامات پر نالہ پاٹ کر راستہ نکالا ہے۔

غسل خانہ :۔ سید العلماء کا بنوایا ہوا پختہ اور وسیع مکان ہے جس میں مردوں کے غسل کے واسطے حوض پانی کی گذرگاہ غسل کے لئے چبوترہ صحن میں بیری کا درخت تجہیز و تکفین میں شرکت کرنے والوں کے لئے دو رویہ عمارت عالیشان پھاٹک اور پشت پر دوسرا دروازہ لاتعداد اموات کو یہاں سے غسل دے کر مختلف امامباڑوں اور قبرستانوں میں دفن کیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ عمارت کے کئی حصے گر چکے ہیں صرف غسل کی جگہ باقی ہے اور صفائی اور مرمت کی بڑی ضرورت ہے ظریف نے غسلخانہ کو بھی اپنے مزاحیہ کلام میں یاد کیا ہے:

غسل خانہ میں یہ غسال سے مردہ بولا جیل ہے قبر تو یہ گھر ہے حوالات مجھے

اس محلہ کے مشہور رہنے والوں میں مرزا محمد عسکری کتاب خواں تھے جو ۱۳۲۳ھ تک زندہ تھے کتاب خوانی عموماً فارسی زبان میں ہوتی تھی اور پیش خواں جب مرثیہ پڑھ کر منبر سے اترتا تو کتاب دیکھ کر یہ حضرات پڑھتے اور جب سلسلہ بیان ختم ہوتا تو منبر سے اترتے وقت زبان پر یہ شعر ہونا ضروری تھا ؎

مجروح لب لعل امام مدنی بود از خون در دنداں چو عقیق یمنی بود
اے دوست بگو راست بحق شہ مرداں زینب بجہاں لائق درّہ زدنی بود

کتاب خواں سب سے آخر میں پڑھتا تھا اس کے بعد ماتم حسین اور زیارت اور فاتحہ ہوتا قدیم مجلس کا آغاز و انجام تھا اس محلہ کے مشہور رہنے والوں میں ـــــ مرزا محمد اخباری، شیخ محمد جان شاد، میر مہدی حسین ماہر، حکیم میر باقر حسین، چھوٹی شاہزادی وغیرہ قابل ذکر ہیں اور

میر احسان کا امامباڑہ :۔ محلہ کی پرانی عمارت تھی جس کو اس عہد کے محدث اور ذاکر اعظم مرزا محمد اخباری ابن مرزا ابر علی نے خریدا اور سکونت اختیار کی فن خطابت میں ان کا نظیر نہ تھا ہر تقریر حدیث "من بکی علی الحسین او ابکی او تباکی" سے شروع کرتے تھے اور گھنٹوں پڑھتے تھے اس عنوان کلام سے اس قدر شہرت حاصل کی کہ احباب خطوط پر پتہ لکھنے میں ان کے نام کے بجائے "من بکی" لکھتے تھے اور چٹھی رساں ڈاک پہونچاتا تھا دور شاہی میں آپ کسی خفیہ ریشہ دوانی سے جلا وطن کر دئے گئے حسین بخش حبشی ملازم فیض آباد ساتھ گیا بادشاہ کو بھی اس صاحب کمال کے ترک وطن کا صدمہ تھا مگر ملکہ کی ناراضگی ناگزیر تھی اپنی صفائی میں ممدوح نے دعائے بد کا بھی ارادہ کیا تھا غدر کے بعد تبدیلی سلطنت ہوئی اور آپ پھر لکھنؤ آگئے اور ایک عرصے کے بعد رحلت ہوئی۔ آخر ماہ رمضان یا شروع ماہ شوال میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ تیر شکوہ آبادی تاریخ وفات میں کہتے ہیں ؎

فاضل اخباری و ہم زینت بزم عزا حضرت مرزا محمد ایکہ بد شیوہ زبان
زجہاں شتافت انگہ جانب جنات عدن عالم اخباری و زوار و پاکیزہ بیان ۱۲۸۵ھ

امامباڑہ مذکور میں آپ سپرد خاک ہوئے۔ افسوس ہے کہ عہد شاہی کے امامباڑوں پر جو مقالہ قومی جرائد میں چھپا اس میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے حکیم سید احمد حسن صاحب مرحوم کے مطب کے روبرو واقع ہے اور اس وقت اپنی اگلی حالت کو فنا کر کے دو قطعہ مکان سید علی عباس ابن حکیم رضا محمد مرحوم کا جز ہے اور مطب مذکور کے محاذ میں مکان ۲۳/۲۱ کی صورت میں تبدیل ہوا ہے مدت دراز سے اس کے انتقالات ہوتے رہے ۲۴ جون ۱۹۱۳ء کو کنیز مرتضیٰ بنت منے صاحب نے زوجہ نظر علی ساکن نیا گاؤں لکھنؤ سے خریدا۔ پھر ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو دوسرا بیعنامہ ہوا رجسٹری شدہ کاغذات میں حدود امامباڑہ کا ذکر ہے موجودہ مکان کے دروازہ سے نکلتے ہی ایک چھوٹی مسجد ہے جو قدیم آثار پر گرے سے بنائی گئی ہے اس عمارت کی نامکمل صورت ہے اور استر کاری سے پہلے مالک مکان گوناگوں تردد سے کام روک چکے ہیں مشرقی سمت کے گوشہ جنوب میں امامباڑہ کی اصل دیوار باقی ہے اور علامہ کی قبر اسی دیوار سے ملحق بے نشان قبر باقی نہیں ہے، ۲۷ رمضان ۱۳۷۷ھ کو میں نے مالک مکان کی رہنمائی سے اس قبر پر فاتحہ پڑھا دوسری قبر مولوی سید جواد صاحب اخباری معلم دینیات حسین آباد ہائی اسکول لکھنؤ کے باپ کی ہے آپ تاحیات شب جمعہ کو یہاں آ کر پہلے علامہ کی قبر پر پھر اپنے والد کے مزار پر فاتحہ پڑھتے رہے۔

شیخ محمد جان شادؔ :- آپ بہت بڑے شاعر تھے میر کلو عرشؔ آپ سے اصلاح لیتے تھے وہ بھی بڑے جوشیلے شخص تھے ان کا ایک شعر زبانوں پر آج تک ہے ؎

اس مسخرہ کے واسطے کھڑی بھی آئی ہے   گھسیارا ہمسری کرے دلدل سوار کی

شادؔ ایسے بلند پایہ شاعر تھے کہ قواعد و اشارہ میں تصرف بھی کرتے تھے چنانچہ مندرجہ ذیل دوسرے مصرعہ میں ملک کی لفظ بالفتح نظم کی ہے

مثل مشہور ہے اے شادؔ ہم کج مج زبانوں کی   زباں شیریں ملک گیری زباں ٹیڑھی ملک بانکا

فارسی میں بھی کلام نظر آتا ہے مدح ممتاز العلما میں کہتے ہیں ؎

عالی مراتبے کہ چو عیسیٰ فلک مقام   پیرے کہ مثل موسیٰ عمران عصا بدست

ان کے مرنے پر امانتؔ مرحوم کی تاریخیں قابل ذکر ہیں اور عنوان کلام میں "پیر و میر" کی لفظ ان کے القاب میں ہے ۱۳۰۳ھ تک زندہ تھے سو برس کی عمر میں انتقال کیا۔

میر محمد حسین واقعہ خواں :- آپ بھی اسی محلہ کے رہنے والے تھے اور اپنے فن میں ممتاز تھے واقعہ خواں مجالس مظلوم کربلا کا پہلا ذاکر ہوا کرتا تھا جو منبر پر کھڑے ہو کر دلدوز لہجے میں اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان اللعین الرجیم کہہ کر فارسی میں شہادت عظمیٰ پڑھتا تھا اور بیچ بیچ میں اشعار چاشنی کلام بھی زبان پر آتے رہتے تھے خاتمہ بیان میں ان کا یہ شعر مقطع سخن ہوتا ؎

عرض بیان غم اہلبیت آسان نیست
حکایتیست کہ آں را بشرح پایاں نیست

اس کے بعد آہستہ آہستہ ماتم کرتا اور جملہ حاضرین بھی ماتم کرتے اور ختم نوحہ کے بعد منبر سے اترتا اور بانی مجلس تحت اللفظ پڑھنے والے مرثیہ خواں کو اشارہ کرتا اور میاں دلگیر یا ضمیر اور انیس و دبیر کا کلام پڑھا جاتا۔

نواب میر مہدی حسین ماہر :- لکھنؤ کے امیروں میں ماہر مشہور شاعر گذرے ہیں جو دولت مندی میں اور اردو ادب میں ممتاز ہستی تھے ان کی کوٹھی پاٹا نالہ پر انگریزی دور کی بنی ہوئی آہنی پھاٹک کے نام سے اب بھی باقی ہے آپ کو خاندان شاہی کی مشہور خاتون

تاج محل کی دولت سے ۲۲ لاکھ روپیہ علاوہ جواہرات ورثہ میں ملے تھے جس میں سے ۸ لاکھ ۳۲ ہزار روپیہ کسی سیاسی مصلحت سے پیرس ملک فرانس کے بینک میں جمع کر دیا تھا جو ماہر کے دنیا سے گزرنے اور غیر ملکی قوانین کی زد میں آنے سے ان کی اولاد برآمد نہ کر سکی یہ روپیہ کارِ خیر میں بھی لٹا شررؔ نے گزشتہ لکھنؤ میں ماہر کی بناکردہ مجلسوں اور سامانِ عزا میں جدت طرازیوں کا ذکر کیا ہے ان مجلسوں کا اودھ اخبار، تذکرہ بے بہا وغیرہ میں بھی ذکر آیا ہے ماہر رشید کے ہمعصر تھے "خزینۂ خیال" ان کے مطبوعہ دیوان کا نام ہے وہ بہت بڑے مفکر، مدبر، قانون داں اور بہادر تھے کربلائے معلیٰ کے بند حمام میں ان سے اور ایک جن سے بڑی دیر تک بھیگی لنگیوں سے مار ہوئی ماہر گراں گوش تھے ان کے کئی فوٹو مختلف سن و سال کے میرے پاس موجود ہیں ان کی اولاد میں دو بیٹے شہرت یافتہ تھے ۔ نذیر حسین و عابد حسین جو چھوٹے صاحب اور بڑے صاحب کہہ کر پکارے جاتے تھے ۔ نذیر حسین لکڑی بنوٹ کشتی کے استاد تھے اور عمدہ شہسوار تھے فوجی لباس میں ان کا گھوڑے پر سوار فوٹو میرے پاس موجود ہے بڑے صاحب شعر بھی کہتے تھے شیدا تخلص تھا مرثیہ پڑھتے خوب تھے باپ کے مرثیے وہی پڑھتے تھے ۔ چھوٹے صاحب مجلسوں کے مجدد تھے تصویریں بھی خوب بناتے تھے انہوں نے گھر میں ٹیلیفون کے رواج سے پہلے ہی ٹیلیفون لگا رکھا تھا اپنے کمرے میں پٹری بچھا کر ایک ریل بنائی تھی کوٹھی آہنی پھاٹک کا نام قصر بکار رکھا تھا یہ چار گھوڑے اور آٹھ گھوڑوں کی گاڑی پر نکلتے تھے عربی نسل کے مشکی ان کے اصطبل میں تھے جارج پنجم جب لکھنؤ آئے تو موصوف ہی کی گاڑی پر میڈیکل کالج کا سنگِ بنیاد رکھنے لائے گئے اور چھوٹے صاحب نے حسن انتظام سے واپسی کے وقت گھوڑے کی جوڑیاں بدل دیں حکام ضلع کو حیرت ہوگئی کہ ان کے اصطبل میں کتنے گھوڑے ہیں دونوں بھائی لاولد تھے ۔ ماہر نے ۱۳۲۵ھ میں ملک وادب کو داغ فراق دیا وہ مضمون آفرینی میں یکتا تھے غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

شبِ وصال وہ سر رکھ کے جس پہ سوئے تھے　　تڑپ رہا ہوں وہ تکیے گلے لگائے ہوئے

آثار موت جب شروع ہوگئے اور ہچکی آنے لگی اس وقت کی آخری رباعی یہ تھی جو نظم کی ؎

کیا خوش نہ ہوں دل شاد کیا ہے تو نے　　سو فکروں سے آزاد کیا ہے تو نے
آواز سے ہچکی کی یہ دیتا ہوں صدا　　حاضر ہوں اگر یاد کیا ہے تو نے

ماہر کے داماد سید مصطفےٰ عرف لڈن صاحب خورشید بھی بڑے بلند پایہ شاعر تھے ان کی کتاب افادات جو مدت ہوئی چھپی اس کے مطالعے سے کتنے لوگ شاعر بن گئے نمونۂ سخن ملاحظہ ہو ؎

کب حالِ دل اپنا کہنے والے ہم ہیں　　غم شمع کی طرح سہنے والے ہم ہیں
روشن ہے سبھوں پہ صبر اپنا خورشید　　جل جل کے خموش رہنے والے ہم ہیں

خورشید نے عمر مرثیہ گوئی میں صرف کی ان کے مراثی میں مظلوم کربلا کے حال میں جو مرثیہ ہے اس کا مطلع یہ ہے ع " رخصت ہے اب حرم سے شہ مشرقین کی " اور حضرت عباس علمدار کے حال میں ان کے مرثیہ کا مطلع یہ ہے ع " پھر آج کلک رواں بہر نظم اٹھاتا ہوں " اور عون و محمد کے حال میں مرثیہ کا سرنامہ یہ ہے ع " تا ظہر نثار ان میں دربار حسینی " اور حضرت حر کی عبرت افزا حالت اس مرثیے میں نظم کی ہے ع " ہاں بیان خوبیِ الفاظ و معانی دکھلا " خورشید پٹنہ عظیم آباد مجلس پڑھنے گئے تھے وہیں انتقال کیا اور وطن سے دور پردیس میں سپرد خاک ہوئے ۔ خورشید کے تین صاحبزادے مولوی سید محمد عابد، اعنی قمر نوجوانی میں اللہ کو پیارے ہوگئے چھوٹے

صاحبزادہ وقار آغا عرف بنے اختر ادھیڑ عمر میں لاولد فوت ہوئے۔ شاعری گھر کا مشغلہ تھا ایک قصیدہ نواب باقر مرزا صاحب متولی حسین آباد مبارک کی مدح میں میرے علم میں ہے اور غزل کا یہ شعر ؎

جل رہی ہیں ہڈیاں اور آ رہی ہے بوئے دوست
آگ بھڑکی عشق کی کھا کر ہوائے کوئے دوست

پاٹا نالہ کے رہنے والوں میں حکیم میر باقر حسین صاحب مرحوم بہت بڑے طبیب تھے جنھوں نے ۲ رجمادی الاول ۱۳۲۶ھ کو انتقال کیا فن طب میں بلند درجے پر ہونے کے علاوہ سپہ گری میں بھی باکمال تھے دوسرے شخص محمد کاظم عرف منے صاحب گراں گوش تھے جو رستم خوانی میں استاد تھے سید محمد کاظم جاوید اس محلہ کی آخری مشہور ہستی تھے جن کے شعر وسخن کا پایہ اس قدر بلند تھا کہ ملک کا کوئی گوشہ باقی نہیں جہاں شہرہ نہ ہوا اور ان کے ادبی خدمات پر ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

حکیم سید محمد نواب فن طب میں عروج حاصل کرنے کے ساتھ جلبا نک کے جاننے والے تھے اور لکڑی کے جملہ فنون میں کامل تھے میر ہادی علی سے تلمذ تھا کیمیا بھی جانتے تھے اور بعض شاگردوں سے اپنی نگرانی میں سونا بنوا دیا۔ باپ نے منع کیا تھا۔ اس لئے خود فیضیاب نہیں ہوئے۔ اب بھی اس محلہ میں دواخانہ اکسیر ہند کے دواساز منے صاحب رہتے ہیں جو فن دواسازی میں یکتا ہیں اطریفل معجون شربت کشتہ عرقیات میں ماہر کامل ہیں اور کیمیاگر بھی ہیں ان کے مصنوعات آم کی سوئیاں بے نظیر شے ہے۔

رمضانی باورچی کی دوکان پاٹا نالہ پر بہت مشہور تھی جس میں دو پیسے میں لوگ کھانا کھاتے تھے ایک پیسے کا آٹا دھیلے کا اصلی گھی دمڑی پر سٹھے بکوانے کی دمڑی کا سالن۔ اس دوکان کے کھانے والوں میں اب تک شائقین موجود ہیں اور اپنی عمر کی آخری گھڑیاں ختم کر رہے ہیں۔ سیاہ روشنائی اور شنگرف کی دوکان پاٹا نالہ کا خاص تحفہ تھا اور تمام اہل علم اور طلبا اسی روشنائی سے لکھتے تھے یہ عہد شاہی کا کاروبار تھا جو ۲۰ سال سے ختم ہو گیا یہ روشنائی کسی درخت کے پتوں پر سکھائی جاتی تھی اور پڑیوں میں فروخت ہوتی تھی شنگرف بنانا موقوف ہو چکا تھا فرمائش پر مشکل سے تیار ہوتا تھا۔ آتش کہتے ہیں ؎

شنگرف سے ہوا ہے سیاہی کا رنگ سرخ
تحریر وصف لعل نگارین یاد ہیں

اس نسل کا آخری کاریگر لنگڑا اور دونوں پیروں کا پنجہ گھوما ہوا تکلف سے راستہ چلتا تھا یہ محلہ مطب حکیم باقر حسین کے سامنے جو گلی گئی ہے اور راہگیر کھرادیوں کی طرف جب جانا چاہتا ہے یہاں سے سیاں شہدے کی سبیل تک سنی شیعہ فسادات کا مرکز اور کئی بار کی فرقہ وارانہ لڑائی کا محاذ رہے ظریف کہتے ہیں ؎

پاٹا نالہ بن گیا ایک نہروان لکھنؤ
سب وشتم آل محمد عین سنت ہو گئی

نواب اصغر حسین فاخر کا مکان ان کی اولوالعزمی اور فیاضی کو یاد دلاتا ہے ان کی بنا کردہ مجلسوں میں پبلک چائے کی تعریف میں یہ کہتی تھی کہ کپ میں اس قدر دودھ اور بالائی گاڑھی کہ تنکا کھڑا ہو جائے اور شربت اس کثرت سے کہ پاٹا نالہ کے دھوبی اپنے بیل تک کو پلائیں اب اس مکان کی ایک کوٹھری غیر مسقف تصویر عبرت نظر آ رہی ہے اصغر حسین فاخر مرثیہ پڑھ رہے تھے ہاتھ میں ہیرے کی انگوٹھی تھی کسی مصرعہ کو بنانے کے سلسلے میں ہاتھ اٹھایا انگوٹھی منبر سے دور مجلس میں گری ایک مرد شریف نے ان کی آنکھوں کے سامنے اٹھائی مگر فاخر نے مجلس کے بعد چشم پوشی کی فاخر کے مراثی میں چند مطلع مجھے یاد ہیں۔

(۱) یارب بہار میں کوئی گلشن خزاں نہ ہو
مشتمل بر حال شہزادہ علی اکبر علیہ السلام

(۲) اے باغبانِ طبع ریاضِ سخن دکھا ״ ״
(۳) آثار صبحِ قتل جو رن میں عیاں ہوئے ״ امام حسین علیہ السلام
(۴) جب رن میں قتل بنت علی کے پسر ہوئے ״ حضرت قاسمؑ
(۵) گردوں پہ جب ہلال محرم عیاں ہوا ״ شہربانو

نواب بہادر حسین خاں انجم پاٹہ نالہ کے رہنے والے شاعر اور فوٹوگرافر تھے جنھوں نے درگاہ حضرت عباس میں اولاد ہونے کی دعا کی اور بیٹا ہونے پر درگاہ رسید (نظم کرکے)، چڑھائی یہ نظم دیکھنے کے لائق تھی۔ انجم ایک باتصویر مثنوی اہل لکھنؤ پر نظم کر رہے تھے۔ افسوس ہے کہ عمر نے وفا نہ کی اور جام حیات لبریز ہوا۔

بدلے شاہ کی مسجد :- پاٹہ نالہ پر اگلے زمانے کی ایک چھوٹی مسجد ہے جس کے بانی کا اصلی نام بدر علی شاہ تھا۔ دار المبلغین لکھنؤ سے گزر کر بائیں ہاتھ کی گلی میں ہے اس گوشہ کا نام چڑیمار ٹولہ ہے ممکن ہے کہ کبھی صید یہاں بستے ہوں مسجد کی امامت مولوی احمد علی صاحب حنفی کرتے ہیں۔

فرنگی محل

عہد اکبر سے لکھنؤ کی آبادی کا آغاز ہوتا ہے اور فرانسیسی تاجر نے جو گھوڑوں کی تجارت کرتا تھا قیام کرکے دربار شہنشاہی سے سال بھر کے لئے یہاں حق سکونت حاصل کیا برس دن گذرنے پر توسیع نہ ہوئی اور یہ مکانات ضبط ہوگئے۔ اصطبل کے علاوہ چار عالیشان مکان تھے جو بعد میں ملا نظام الدین سہالوی کو ملے۔ نجم الغنی کا بیان ہے کہ عہد نواب سعادت علی خاں مرحوم میں محلہ آباد ہوا اور گھوڑوں کی تجارت کے سلسلے میں جو عیسائی ٹھہر گئے تھے ان کی وجہ سے فرنگی محل ہوا ہماری اردو میں عیسائی مرد کو فرنگی اور عورت کو فرنگن کہتے ہیں اکبر کہتے ہیں ؎

فکر ساری کی تھی نہ کنگن کی ‏ ‏ ‏ اب تو دھن ہے انھیں فرنگن کی

مجھے اس میں عذر نہیں ہے کہ عہد سعادت علی خاں میں فرنگی محل نام ہوا مگر یہ یقینی ہے کہ عہد اورنگ زیب میں ملا قطب الدین شہید سہالوی کی اولاد کو رہائش کے لئے یہ جگہ دی گئی اور احتمال ہوتا ہے کہ ملا محمد اسعد فتاوی عالمگیری کے سلسلے میں صحبت شاہ میں باریاب ہوئے ہوں اور اس تقریب سے فائدہ اٹھا کر فرمان شاہی ۱۱۰۵ھ مطابق ۱۶۹۳ء سے اس گھرانے کا قبضہ ہوا۔ آتش نے ایک مطلع میں کہا ہے ؎

ڈھلتی ہے عاشقانہ ہماری غزل تمام ‏ ‏ ‏ چھائے ہوئے ہیں کوئے فرنگی محل تمام

بعض اہل قلم نے اس محلہ کی قدیم حدوں کو مکانات جوہری محلہ سے ملحق قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ سلطان العلماء اور سید العلماء کا مکان بھی فرنگی محل میں تھا۔ یہ رائے صحیح نہیں ہے زیادہ سے زیادہ مفتی میر عباس صاحب کا مکان جس کے سامنے ایک بہت چھوٹی سی مسجد زمین دوز بغیر زینے کی اب بھی ہے اس کو ٹکڑہ فرنگی محل کا کہا جا سکتا ہے۔

علماء فرنگی محل :- علماء کے طبقے میں مولوی ولی اللہ حنفی مولوی تراب علی حنفی جناب سید العلماء کے ہمعصر تھے اور شیعہ طبقہ کو بڑی دلچسپی

؎ تذکرۂ بے بہا

سے پڑھاتے تھے مولوی نعمت اللہ کا دور درس وتدریس بھی بہت کامیاب تھا ان کی مجلس درس کا یہ واقعہ ہے کہ جب مولوی تفضل حسین صاحب تعلقہ دار فتحپور ربسواں ممدوح سے معقول پڑھتے تھے اور دو سو روپیہ ماہوار شاگرد کی جیب سے پیشکش حاضر کیا جاتا تھا ایک دن مولوی صاحب کی نظر پڑ گئی کہ تفضل حسین کی کتاب ملازم کی بغل میں ہے یہ فعل سخت ناگوار ہوا اور نوکر سے کہا تو بھی مجھ سے پڑھ ہم طالب علم اس کو جانتے ہیں جس کے پاس کتاب ہو۔ آپ ایک ماہ تک جاتے رہے اور مولوی صاحب نے نہ پڑھایا آخر میں سید العلمار نے سفارش کی اور تفضل حسین خاں اپنے ہاتھ میں کتاب لے کر پہونچے اس وقت سے سبق شروع ہوا[۱] علمار فرنگی محل میں مولوی فیض اللہ صاحب بڑے صاحب کمال تھے اور حکیم صفدر حسین کو آپ سے شرف تلمذ تھا۔

مولوی محمد نعیم، مولوی ولی اللہ صاحب، مولوی علار الدین احمد وہ اہل فضل تھے جن میں کبھی فرقہ وارانہ جھلک نظر نہیں آئی۔ یہ حضرات حکومت اودھ کے مورث اعلیٰ برہان الملک سے پہلے[۲] اس سرزمین پر آباد تھے اور فرنگی محل کی آبادی شہریت سے پہلے کی آبادی ہے۔ مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی اور ابوالحسنات مولوی عبدالحئی وہاں کے آخری علمار میں ہیں یہ سب مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ فرنگی محل میں وہ آبادی بھی تھی جس سے شاعر کو شکوہ ہے فضیلت نامی کنیز اس کی بھاگ گئی اور کہا سے

جھلکی دکھلاکے مجھ کو فضیلت جو ٹل گئی
اٹھی تھی مولوی سے فرنگی محل گئی

محمدو نانبائی :۔ عہد نصیر الدین حیدر بہادر میں محمدو نامی ایک پردیسی نے فرنگی محل میں باورچی کی دوکان کھولی اور اس کی نہاری کی وہ شہرت ہوئی کہ بڑے بڑے رئیس اور شاہزادہ تک کوشش سے نوکروں کو بھیج کر نہاری خریدنے لگے اور ایسا حوصلہ بڑھا کہ اس نے شیرمال ایجاد کی جو لکھنؤ کی سرمایہ نازش[۳] ہے۔ محمدو کی دوکان فرنگی محل کی باہر والی مسجد کے پیچھے تھی۔ رات کو دوکان بڑھاتے وقت جو کچھ سامان فروخت ہونے سے بچ جاتا تھا وہ سب کا سب طالب علموں اور محتاجوں کو بانٹ دیتا تھا واجد علی شاہ جب کلکتہ گئے تو محمدو بھی اپنی دوکان لے کر کانپور تک پہونچا۔ نواب معتمد الدولہ نے خاصہ کی بخت اس کے سپرد کی۔[۴]

[۵]عبدالحلیم شرر کا بیان ہے کہ شیرمال کی ایجاد نے محمدو کی اس قدر ترقی کی کہ مجالس اور تعزیوں کے لئے بعض بعض دن ایک لاکھ شیرمالوں کے آرڈر آتے تھے اور اس دوکان سے ضرورتیں پبلک کی پوری ہوتی تھیں۔ شیرمال اور باقرخانی میں کیا فرق ہے۔ اس کو اہل لکھنؤ تو جانتے ہیں ذائقہ اور صورت دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں شیرمال موٹی اور باقرخانی پتلی ہوتی ہے۔ شیرمال پر جو کچے دئے جاتے ہیں وہ صرف گھی یا دودھ کا چھینٹا جذب کرنے کے لئے اور باقرخانی کے کوچے اس قدر گہرے ہوتے ہیں کہ دوسری طرف سے نظر آتے ہیں میں نے ایک بوڑھے نواب زادہ سے فرق پوچھا تو مجھے یہ جواب ملا کہ شیرمال نرم اور باقرخانی بھربھری، اور خشکی کے ساتھ لوچ نہ ہونا۔ یہ باقرخان نان بزکی یادگار ہے جو شاید ایرانی تھا۔

امامباڑہ نواب محمد ذکی یا بندہ علی کا حمام

فرنگی محل کے پل پر ایک امامباڑہ اور حمام تیرہویں صدی کا موجود ہے جو عوام کی زبانوں پر بندہ علی کا حمام کہا جاتا ہے۔ چونکہ اس حلقہ میں یہ بہترین حمام ہے اس لئے اس کو شہرت ہوئی اور حمام کا مہتمم بندہ علی جراح اپنی خدمات کے لحاظ سے خود مشہور شخص

۱؎ تذکرہ بے بہا ص۱۰۲
۲؎ قومی آواز ۳ فروری ۱۹۵۸ء ص۳
۳؎ گزشتہ لکھنؤ ص۲۱۳
۴؎ آجکل مورخہ جنوری ۱۹۵۶ء
۵؎ گزشتہ لکھنؤ ص۲۱۴

تھا اس لئے عمارت اس کے نام پر مشہور ہے حمام میں جامہ خانہ، اندر سنگ مرمر کا فرش، گرم اور ٹھنڈے پانی کے کشادہ اور علیحدہ علیحدہ حوض، کھیسہ اور مشت مال کرنے کے لئے آدمی ہمہ وقت موجود، عموماً نہلوائی ۲ر نفر تھی جس میں بہت تھوڑا بیسن چکنائی چھڑانے کے لئے ملتا تھا۔ نہلوائی نہلانے والے کے حسب حیثیت دو روپیہ، چار روپیہ، پانچ روپیہ ریٹ تھا حمام میں کہیں ہوا کا گذر نہ تھا۔ اور لوگ گرم پانی میں آرام سے نہلتے تھے حمام پھاٹک سے متصل اور ڈیوڑھی امام باڑہ میں ہے ۲۰، ۲۵ سال سے بند ہے اور اب حمام میں نہانے کا چلن بھی نہ رہا۔ اگلے لوگ نہ رہے اور پہلے کی ایسی سردی بھی نہیں پڑتی حمام کی تاریخ۔ حمام قدیم اور حوض طاہر۔ پھاٹک کے بعد صحن ہے اور تینوں طرف عمارت ہے امام باڑہ کا حصہ دو دالانوں پر مشتمل ہے قبریں اندر سے باہر تک ہیں۔ امامباڑہ سے پہلے یہاں میر جعفر وزیر آصف الدولہ کا مکان تھا چنانچہ ان کی قبر منبر کے سامنے اب تک باقی ہے۔ یہ مکانات وکٹوریہ اسٹریٹ نکلنے پر غدر میں کھود دے گئے یہاں سے مشرقی حصہ تک چونے والے رہتے تھے اور یہ مقام اب تک اسی نام سے مشہور ہے۔

امام باڑہ مرزا محمد ذکی خاں صاحب نے غدر کے بعد ۱۲۸۱ھ میں بنوایا جس کی تاریخ یہ ہے۔

بنا کرد مرزا محمد ذکی خاں   عزا خانہ سرور انس وجاں

صدائے ملائک آمد ز غیب   پئے تاریخ فرخ نشاں   ۱۲۸۱ھ

حمام امام باڑہ سے پہلے کی تعمیر اور عہد شاہی کی تاسیس ہے امام باڑہ کی موجودہ تعمیر سے قبل یہاں رجسٹری کا محکمہ پہلے پہل ۱۲۶۲ھ میں قائم ہوا تھا۔

فرنگی محل سے اخبار الاخیار[1] یکم نومبر ۱۸۶۲ء کو مولوی سید محمد علی صاحب نے جو مذہب امامیہ کے روشن خیال فرد تھے ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔

اس ہفتہ وار آرگن کے پہلے مولوی محمد یعقوب صاحب نے اسی محلہ سے اخبار طلسم جاری کیا تھا اور وہ ۱۸۵۶ء سے ملکی اور ادبی خدمات انجام دے رہا تھا۔

(نوٹ، فرنگی محل میں آغا محمد شریف کی ۲۲ حویلیاں تھیں یہ بزرگ امامباڑہ آغا باقر کے ورثہ میں تھے۔

فقیر کی دعا:۔ شیخ نجابت[2] علی شاہ ایک بزرگ عہد سعادت علی خاں میں فرنگی محل میں رہتے تھے ایک بار یہ اتفاق ہوا کہ نواب نے اپنے آب بردار وضو کو بلا طلب پانچ سو روپے دیدئے اور اس سے پوچھا کہ بتاؤ کہ میں نے تم کو اس قدر روپیہ کیوں دیا۔ کیا تم نے کوئی عمل پڑھوایا ہے۔ ملازم نے عرض کیا فرنگی محل میں فلاں بزرگ سے میں نے لڑکی کی شادی کے لئے کہا تھا کہ کوئی سامان نہیں ہے۔ اس کے علاوہ غلام نے کچھ نہیں کیا شب کو اپنی مہر اور قلمدان شیخ کے پاس بھجوایا کہ یہ چیزیں موجود ہیں جس کو چاہئے بادشاہ بنائیے۔

بھانڈوں کا تماشہ:۔ فرنگی محل کے کسی عالم کے یہاں جو رقص و سرود فضول رسم سے پرہیز کرتے تھے شادی تھی انہوں نے اپنے بعض رند مشرب دوستوں کو بھی مدعو کیا انہوں نے جواب دیا کہ آپ کے یہاں تقریب میں آنا کسی تیجہ اور فاتحہ خوانی کی ایسی شرکت ہے ہم کو کیا لطف ان کے اصرار پر ایک طائفہ بھانڈوں کا ان شرطوں کے ساتھ بلایا گیا جو صرف نقل کریں اور باجہ نہ ہو گانے کی ضرورت نہیں ہے بھانڈوں نے اپنی عادت کے موافق پہلے صاحب خانہ ہی کی نقل شروع کی اپنے جتھے کے نمودار آدمیوں کو عمامہ جبہ تسبیح، داڑھیاں لگوا کر یک صحبت اہل علم

---

[1] قدیم ہنرمند صفحہ ۲۲
[2] نیا دور بابت ماہ دسمبر ۱۹۵۹ء لکھنؤ

کی مرتب کی ہر طرف سے دست بوسی اور نئے آنے والوں کی آمد و رفت، حاضرین میں تعارف شروع ہوا اور چند مقدس لگے جو روح میں تھیں گزشتہ علماء اور صاحبانِ کمال کی جب وہ صحبت پراگندہ ہوئی تو نقالوں نے بھیس بدل کر ان پر نکتہ چینی کی اور کہا وہ جو اس شان و صورت کے تھے علامہ سکاکی تھے دوسرے قاموس کے مؤلف فیروز آبادی تیسرے امام فخرالدین رازی اور حضرت جلال الدین سیوطی (اس لفظ پر نوجوان طلبہ میں قہقہہ پڑا) اور وہ جو چھریرا بدن پیشانی پر سجدہ کا نشان میر باقر داماد تھے۔

مہذب طبقے کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ اس نے میر باقر پر نکتہ چینی شروع کی بڑے فلسفی تھے حکمت کا پتلا معلوم ہوتے تھے بات کم کرتے تھے ان کی کتابیں معمولی علم والے کچھ تھوڑی سکتے تھے جب ان کی وفات ہوئی اور قبر میں اتارے گئے۔ منکر نکیر نے خدا کو پوچھا تو جواب دیا "اُستقس فوق اُستقاس"، فرشتے اس جواب سے حیران ہوگئے نہ سوال و جواب ختم کئے واپس جا سکتے تھے اور نہ دوسرا سوال کر سکتے تھے مجبور ہو کر حق تعالیٰ جل شانہٗ و عم نوالہٗ میں عرض کیا کہ میرے معبود تیرا بندہ کیا کہتا ہے مجھے نہیں معلوم۔ حکم ہوا فرشتوں کو کہ واپس آؤ یہ اتنا قابل ہے کہ کبھی اس کی بات میری بھی سمجھ میں نہیں آتی اس کفریہ گفتگو پر محفل درہم برہم ہوگئی طنز و مزاح کے نشتر صفحۂ تاریخ پر تصویر بن کر رہ گئے قہقہوں کا ایک طوفان تھا جو اٹھا اور بلند ہوا۔ وہ سینما اور پکچر جو نظر کو کمزور قتل و غارت فریب سکھاتا ہے یہ اس سے اچھا ہے۔

<u>شاہ پیچڑہ کی گلی</u>:۔ عہد شاہی میں ایک شخص تھے جنھوں نے رات کو اپنی رفیقۂ حیات سے ان کے فرائض کی ادائیگی کا مطالبہ کیا انہوں نے عذر کیا اور دوسری مرتبہ پھر کہا اور آپ محروم رہے اور آپ نے غصّہ میں خاص اعضاء جسم کو کاٹ دیا اور پیر میں چھڑا پہن کر باہر آگئے لوگوں نے کچھ تو ہمدردی میں رجوع کی کچھ سادہ لوح اس فعل کو ولایت کا درجہ سمجھے اور زندگی میں ان کے گرد ہجوم رہنے لگا اور بعد موت قبر پر قوالی شروع ہوگئی جو آج تک سال بھر کے بعد ہوتی ہے ان کی قربانی نے وہ ہمہ گیر شہرت حاصل کی کہ گلی انھیں کے نام پر نامزد ہوئی۔

<u>شاہ پیچڑہ کی قبر</u>:۔ شاہ چھڑا نام دو لفظوں سے مشتق ہے چھڑا خواہ وہ زیور ہو جو عورتیں پاؤں میں پہنتی ہیں خواہ بانس کی چھڑے لفظ نے بلندی حاصل کر کے صورت اختیار کی ہو۔ اس کے سوا تاریخ میں کہیں محلہ کا ذکر نہیں ہے شاہ پیچڑہ کی قبر نمایاں طور پر اب تک موجود ہے بارہ رجب کو عرس ہوتا ہے معلوم نہیں کس سنہ کے آدمی تھے۔

چاد کنکر اور شاہ پیچڑا کی گلی پر بہار رہنے میں جو اشعار ہیں وہ ابتذال کے دائرے میں ہیں اس لئے تہذیب تحریر اجازت نہیں دیتی کہ نقل ہو۔

<u>ڈیوڑھی نواب عظمت الدولہ</u>:۔ فرنگی محل کے پل کے سامنے وکٹوریہ اسٹریٹ پر واقع ہے عظمت الدولہ معظم الملک سید محمد رضا خاں انتظام جنگ اور معز الدولہ احتشام الملک سید محمد تقی خاں بہادر اسد جنگ دو سگے بھائی مفخر الدولہ مرزا ابوالقاسم خاں جنرل فوج کے بیٹے تھے جن کو شاہ غازی الدین حیدر کی بیٹی نواب زہرہ بیگم منسوب تھیں اس سرکار کے مختار اور داروغہ رضا حسین صاحب کشمیری مقبرہ جناب عالیہ کے ممتاز اور نمودار شخص تھے دروازہ پر گھنٹہ نواب سکندر آرا آمنہ بیگم کے وقت تک رہا۔ بیگم صاحبہ کی طرف سے مقبرہ گولا گنج میں بقرعید کے دن اونٹ نحر ہوتا تھا، ۲ رجب کو ہزاری روزہ کے دن شام کو نذر ہوتی تھی جس میں بلا مبالغہ ایک امرتی پلیٹ کے برابر ہوتی اور ہر قاب ایک بڑی امرتی سے بھری رہتی تھی۔

دلالی محلہ

گاہک اور دوکاندار کے درمیان میں ایسی گفتگو کرنا جس سے تاجر کی ایمانداری، چیز کی عمدگی ثابت ہونے کے ساتھ گاہک کے دل پر ایسا قبضہ کیا جائے کہ وہ دوسری دوکان پر نہ جائے اس کا نام ہے دلالی اور یہ پیشہ عہد جاہلیت سے دنیا میں قائم تھا دلالی کی اصطلاحیں فن کے کرتب دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ چونکہ ہر تجارت کا مرکز اور اس سے قریب دلالوں کی بستی ہونا ضروری تھا جمع ہوئی اور یہ بازار میں آگئے بعض بعض اوقات گاہک سے بھی بخشش لی اپنی ریاضت دکھا کر ورنہ دوکاندار سے تو کمیشن لینا ان کا وہ حق تھا جس میں دوکاندار کبھی عذر بھی نہ کرتا دلالی محلہ میں یہ لوگ آباد تھے اس محلہ میں وکٹوریہ اسٹریٹ سے جانے کے دو راستے پہلا راستہ ابتدار محلہ میں فرنگی محل کے پل کاظم ہوٹل سے دوسرا عدیا گبڑن کے پاس سے پھٹتے ہیں ہو کر یہاں مرزا محمد عسکری صاحب کا امامباڑہ ہے جو قدیم عمارت نہ ہونے سے قابل ذکر نہیں ہے۔

دفتر اودھ پنچ:- یہ مزاحیہ آرگن ۱۸۷۷ء میں پبلک اور حکومت پر جائز نکتہ چینی کرنے کے لئے جاری ہوا ۱۹۱۲ء میں منشی سجاد حسین ایڈیٹر تھے۔ آخری دور میں عنان ادارت محمد ممتاز حسین عثمانی کے ہاتھ میں آئی جو عربی، فارسی، انگریزی، عبرانی میں قابل شخص تھے اور قومیات پر ان کا آزاد قلم معرکہ آرا بحث کرتا تھا لکھنؤ کا کوئی شخص ایسا نہ چھوٹا جس پر نکتہ چینی نہ کی ہو نظم و نثر دونوں حیثیتیں بلند تھیں رلے زنی میں علمی آثار کو زندہ رکھنا اس جریدہ کا کام تھا پہلے دور ادارت میں عبدالحلیم شرر پر ایک شعر نظم کر ڈالا ؎

ترقی بھی شرر نے کی تو کیا کی　　　گھٹا کی عمر اور داڑھی بڑھا کی

لکھنؤ کے مذہب امامیہ کے مجتہد سید علن صاحب گھوڑے سے گرے اودھ پنچ نے نوٹ لکھا جس کی سرخی تھی "السلام علی خدالترب سلام بور خسار گرد آلود پر" اس میں اشارہ واقعہ کربلا کے ایک پہلو پر تھا چونکہ جناب ممدوح ذاکری میں بھی بلند درجہ پر فائز تھے اور ذاکری کو علمی لباس سب سے پہلے آپ ہی نے پہنایا اس لئے یہ ہیڈنگ برمحل تھی۔ اودھ پنچ کے آخری ایڈیٹر عثمانی صاحب نے ۱۹۳۶ء میں انتقال کیا ان کی صحبت کے لوگوں میں تھا کر نواب علی خاں مؤلف معارف النغمات حکیم منے آغا فاضل آغا مرتضی بہبہانی، ڈاکٹر باقر سید علی غضنفر صاحب سکریٹری اول آل انڈیا شیعہ کانفرنس۔

مولوی سید ہادی حسن صاحب جفار:- عہد شاہی میں نجوم، رمل، جفر کے جاننے والے کثرت سے تھے جن کے اسما بھی محفوظ نہیں لیکن ان اسلاف کی یادگار اور علوم رفتہ کے حامل مولوی صاحب تھے جو مدرسہ ناظمیہ میں مدرس تھے بڑے غصہ ور آدمی تھے ان کے کمالات کی یہ حد تھی کہ شمس العلماء مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ اور خطیب اعظم مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ ایسے مجسمۂ کمالات و روحانیت رجوع کرتے تھے اول الذکر بزرگ کے فرزند ارجمند کی سفر مشہد مقدس پوری سرگزشت تاریخ وار لکھنؤ میں بیٹھے بیٹھے لکھوا دی۔ جب وہ واپس ہوئے تو حالات حرف بحرف صحیح تھے ہر دو بزرگان دین نے ایک مرتبہ سوال کیا کہ ظہور امام زمان کب ہو گا۔ جواب برآمد ہوا "از یٰسین بپرس" یاسین سے پوچھو اس کے دو معنی ہیں یا پیغمبر اسلام سے دریافت کرو اس لئے ان کا نام نامی یٰس تھا یا سورۂ یٰسین میں یہ جواب استفسار موجود ہے خود تلاش کرو مولوی صاحب نے آخر عمر میں امامباڑہ دلالی محلہ میں قیام کر کے داعی اجل کو لبیک کہا وہ جفر کی آخری شمع تھے سال وفات ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء ہے۔

وکٹوریہ اسٹریٹ

ملکہ وکٹوریہ آنجہانی کے نام دیہ سڑک ترکاری منڈی سے شروع ہوکر تالکٹورہ روڈ پر ختم ہوتی ہے اس سڑک کے بعض محلوں کو ہم نے بیان کیا اور بعض اب سلک تحریر میں آتے ہیں یہ پہلی سڑک ہے جو علاقہ چوک میں انگریزوں نے نکالی ملکہ کا سن جلوس اس قطعہ سے واضح ہوتا ہے ؎

چو ملکہ انگلستان بہ تخت و تاج رسید — برآمد از پئے تاریخ ایں ندائے فصیح
ہزار و دو صد و پنجاہ و سہ ہجرت — ہزار و ہشت صد و سی و ہفت سال مسیح
۱۲۵۳ — ۱۸۳۷

۲۲ جنوری سنہ ۱۹۰۱ء میں ملکہ کی موت کے حساب سے مدت سلطنت ۶۲ سال ہوتی ہے۔

منگل کا بازار:۔ لکھنؤ سے شغف رکھنے والے ساگر کے اہل قلم کا بیان ہے کہ اودھ میں ایسی مصنوعات کی وہ کثرت تھی کہ کاریگروں کو بیک وقت و بیک جا اپنی دستکاری کی نمائش کا موقع نہ تھا اور ہر ایک صنعت کا بازار آٹھویں دن لگتا تھا ہفتہ گذرنے پر بھی اس کی باری آتی تھی جو آٹھ دن سے دو کان بڑھا چکا تھا بازار کا مقام وکٹوریہ اسٹریٹ جو اس وقت کی سڑکوں میں سب سے چوڑی سڑک ہے دورویہ زمین پر دوکاندار اپنا مال لے کر بیٹھتے تھے اس سے زیادہ تفصیل اس بازار کی معلوم نہیں منگل کا بازار انگریزوں کے دور اور سنہ ۱۹۱۰ء تک باقی تھا۔ کاکوری اور ملیح آباد کے جلاہے گاڑھا اور ثاپٹی اور سوتی کپڑے کے تھان لاکر بیٹھتے تھے لنگیاں اور جانمازیں، دسترخوان دوسوتیاں ملتی تھیں بغداد میں بھی ایک بازار عہد عباسیہ میں تھا جس کو سوق الثلثا کہتے تھے منگل کو اس بازار میں چہل پہل ہوتی تھی۔

وکٹوریہ اسٹریٹ سے چپ و راست چونکہ لکھنؤ کے بیشتر صاحبان کمال کے گھروں کی راہیں اور خود اس سڑک پر صاحبان کمال کے گھر ہیں اس لئے جوش ملیح آبادی نے اس سڑک کو "لکھنؤ کی مانگ" کہا ہے۔

منگل کے بازار میں کاکوری کے جلاہے لنگیاں، گاڑھے کے تھان، دوسوتیاں، دسترخوان اور جانمازیں لے کر آتے اور یہ تمام سخت مقامی ہوتی ہوشیار بزاز اپنی پسند کی چیزیں خرید کر رکھتے اور اپنے گاہکوں کے ہاتھ تعریفیں کرکے بیچتے یہ کاروبار بہت پرانا ہے شاہ نصیر کہتے ہیں ؎

تانے بانے پر نہ کر دنیا کے ہرگز اعتبار — غور کر چشم حقیقت سے کہ سر پر کوچ ہے

بزازہ:۔ آغا میر صاحب کی ڈیوڑھی سے شروع ہوکر فرنگی محل کے پل تک مسلسل ہندو مسلم بزازوں کی چھوٹی بڑی دوکانیں تھیں۔ تنزیب، جنگل باڑی، ایتو، صدر بیل، کمخواب، مشجر، مخمل، اطلس، گرنٹ، گاڑھا دھوتر، مارکین، ڈوریا، کشمیرا، شالباف، گلبدن، مشروع، چوبڑ، شربتی، جامدانی، چکن، زربفت، تاشبادلہ، سوسی، آب رواں، زری بوٹی، بابل لوٹ، دھنیا لوٹ، نین سکھ، آدھی لاہی، کریب زیادہ سے زیادہ فروخت ہوتا تھا۔ فرنگی محل سے قریب میں چند مسلمانوں کی دوکانیں تھیں جہاں بغدادی چھینٹ اور نقل جامہ وار کی چھینٹیں فروخت ہوتی تھیں۔ آتش

خوش ہوتے ہیں ناداں پہن کر کمخواب کا جوڑا — کفن ہے عاقبت اس عالم اسباب کا جوڑا

سنہ ۱۹۲۰ء میں گولدروازہ سے پہلے نیا بزازہ تعمیر ہونے پر زیادہ تر دوکانیں اٹھ گئیں بزازہ کے محاذ اور دوسرے سائڈ میں پالکی

گاڑی والے آباد تھے اور بگھی کرایہ پر چلتی تھی۔

آغائی صاحب کی ڈیوڑھی:۔ بزازہ کے سامنے لکھنؤ کے رئیس اعظم ناظم آغا علی صاحب کی ڈیوڑھی اب تک ہے جنھوں نے امامباڑہ بنوایا اور عربی علوم کی درسگاہ مشارع الشرائع تعمیر کی ناظم صاحب کا نام تاریخ اودھ میں مخفی نہیں ہے ۲۹ جمادی الاول ۱۳۱۳ھ ان کی تاریخ وفات ہے اس وقت ان کا امامباڑہ سب امامباڑوں سے زیادہ مجالس کے استعمال میں ہے ناظم صاحب کے بعد مرزا محمد عباس علی خاں مرحوم نے ان کے نام کو اور زیادہ روشن کیا۔ آپ بھی ان رؤسا میں تھے جن کے گھر پر ہاتھی بندھا رہتا تھا کار خیر میں یہ بھی شہرۂ آفاق تھے۔

عدیا کبڑن:۔ ناظم صاحب کی ڈیوڑھی کے سامنے کبڑن کی دوکان تھی جو اس قدر مشہور ہوئی کہ اطراف لکھنؤ سے آنے والے مسافر یا تفریح کرنے والے سیاح دور دور سے یکہ اور بگھی والوں کو پتہ بتاتے تھے کہ ادیا کبڑن کے سامنے اتریں گے اس کی دوکان اس سڑک پر بڑے اونچے برگد اور پیپل کے درختوں کے سایے میں جو دوکانیں تھیں اس میں زیر آسمان تھی معاملات کی صفائی اور دیانت نے کبڑن کو شہرت دی۔

تھوئی ٹولہ:۔ یہاں معمار رہتے تھے اس لئے تھوئی ٹولہ نام ہوا عہد شاہی ختم ہونے پر اس محلہ میں قادر بخش نے طباعت کا کام شروع کیا اور انجم المطابع جاری کیا شیخ کے کام کا نمونہ عہد شاہی کے اعلیٰ کام سے ملتا ہوا تھا انشار فائق صفر ۱۲۷۸ھ کی چھپی ہوئی میرے پاس ہے وہی کاغذ، وہی لوح، وہی دیدہ زیبی۔ اس محلہ میں جلاد کا مکان تھا جو نوابی میں گردن زدنی کرتا تھا۔ ایک مسجد اور پانی کے نل کے روبرو حصہ ہے یہ جلاد کی جگہ تھی۔

نخاس جدید چڑیا بازار:۔ موجود نخاس کا وہ حصہ جہاں مرغ، بٹیر، لال، چرکوے، تیتر، بلبل، مینا، چیل، کوا، چڑے، ہریل، مرخاب، چکور لوا، پریاں، تکوریاں، بگلا، حواصل اور راتوا اور دوسرے پرند فروخت ہوتے ہیں چڑیمار زیادہ تر پارے جانور لاتے ہیں اور یہاں دن بھر رہتے ہیں پنجرے بٹیروں کی کابک اور جانور پالنے کا دوسرا سامان بھی یہاں فروخت ہوتا ہے۔

عہد شاہی کا نخاس چانول والی گلی سے شروع ہوتا تھا انگریزوں کے زمانے میں وکٹوریہ اسٹریٹ نکلنے پر یہ بازار ادھر منتقل ہو گیا چڑیا بازار، گدڑی بازار، گھوڑے والی گلی یہ ٹکڑے نخاس کے اسی وقت کی یادگار ہیں اور انگریزوں کے آخری زمانہ تک نخاس سنیٹری روڈ سے شروع ہوتا وکٹوریہ گنج کے پل تک پہونچکر ختم ہو جاتا اب نخاس نے وہ ترقی کی ہے کہ قدیم بزازہ یعنی فرنگی محل کے پل سے آغاز اور داہنی طرف سنیٹری روڈ پر پھیلتا ہوا پھر بائیں جانب نادان محل روڈ پر دوسری شاخ ہو کر وکٹوریہ گنج پر ختم ہوتا اور اتوار کے دن لکھنؤ اور کانپور کے تمام تاجر یکجا ہوتے۔ چوک کے حال میں گذرا کہ عبدالحلیم شرر کے زمانہ ۱۹۲۶ء تک بازار میں چار کا رواج نہ ہو سکا اس وقت اگر کوئی چار پیتا تو لوگ طنزیہ کہتے تھے کہ کشمیری ہو گئے یا افیونی ہو۔ افیون کے ٹھیکے پر جہاں چند افیونی جمع ہوں وہاں چار کا دور روزانہ چلتا رہتا ہندوستان میں چار ۱۹۱۶ء سے پھیلی لکھنؤ میں پہلا چار خانہ ۱۹۲۶ء کے بعد چڑیا بازار میں کھلا یہ ایرانی کی دوکان تھی جہاں استکان بے دودھ کی چار ملتی تھی۔

نخاس میں پرانا اور نیا ہر قسم کا مال بکتا ہے ظریف کہتے ہیں ؎

بو کہیں بیچتے نخاس میں دیکھا اس کو کس جگہ جا کے ملا پیرِ خرابات مجھے

لکھنؤ میں حکیم مرزا محمد تقی کا مطب ایک یادگار جگہ تھی جہاں مفردات سے علاج اور چار چھ پیسے کے نسخہ میں مریض صحتیاب ہوتا تھا

۱۸۶۸ء میں مرزا محمد علی نے نخاس سے ہفتہ وار اخبار "تمیان الاخبار" جاری کیا۔

مزار مرزا دلگیر:۔ وکٹوریہ اسٹریٹ سے حکیم ہادی رضا خاں (منبع الطب) کی طرف کڑہ جاؤ تو گلی کے نکڑ پر زیر درخت جو ٹیڑھی قبر ہے یہ مشہور مرثیہ خوان مرزا دلگیر کی قبر ہے جو میر تقی اور میر حسن کے ہمعصر تھے اور ناسخ کے شاگردوں میں ممتاز تھے بظاہر اسی جگہ ان کا مکان تھا اور قبر گھر کے سامنے ہوگی سڑک نکلنے پر مکان منہدم ہو کر قبر باقی رہی دلگیر کا نام جھنو لال تھا اور وہ راجہ جھاؤ لال کے سگے بھائی تھے اسلام لا کر مرثیہ گوئی کی داغ بیل ڈالی اور سیکڑوں سلام اور مرثیے نظم کئے۔ میر علی سوز خواں اور سلطان علی خاں انھیں کے مراثی سوز میں پڑھتے تھے اور آج تک پرانے بستہ ان کی مراثی سے معمور اور مجلسیں دلگیر کے اشعار سے خالی نہیں ہیں ضمیر سید اور آل رسول ہونے کے لحاظ سے ان کے ہمعصر تھے اور برتر تھے مگر تبدیل مذہب کے جذبے نے ان کو بام ارتقا سے بھی بلند کیا جب دلگیر کا انتقال ہوا تو لکھنؤ میں عام شہرت تھی کہ وہ مرزا دبیر کے استاد تھے مرزا صاحب نے جب سنا تو فرمایا کہ میں ان کا شاگرد ہوتا تو میرے لئے فخر تھا۔ اس قبر پر مرزا محمد ہادی رسوا اور منشی مرزا نادر حسین جنون نے تاعمر فاتحہ پڑھا۔ اہل محلہ ہندو مسلم ان کو شہید مرد سمجھتے ہوئے قبر پر شمعیں روشن کرتے ہیں اور تربت چونا کاری سے نمایاں ہے۔

دلگیر کا کوئی شعر تغزل میں کسی کو یاد نہیں نہ ان کا کوئی دیوان، واسوخت، مثنوی ہندوستان سے یورپ تک موجود ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تبدیل مذہب کیا تو معشوق مجازی کی مدح چھوڑی اور اپنے تمام دیوان غزلیات دریا برد کر دیئے ان کے مرثیے مطبوعہ جلدوں میں کثرت سے موجود ہیں۔

بھانڈوں کی مسجد:۔ کشمیر کے رہنے والوں کا وہ گروہ جو زنانہ لباس میں ہو کر تماشہ کرنے گانے اور مزاحیہ کرتب دکھانے میں شہرۂ آفاق تھا اور شادیوں میں ان کا گروہ بھی ناچنے والے طائفہ کے ساتھ بڑے بڑے رقوم اور نذرانے لینے پر مدعو ہوتا اگر ان کی ذہانت کی حکایتیں، پھبتیاں، چٹکلے بیان کئے جائیں تو ایک کتاب بن جائے۔ یہ زنانوں (ہیجڑوں) کے علاوہ گروہ ہے جو نقلیں کر کے فروغ حاصل کرتا رہا اور جائز نکتہ چینی اس کا ذریعہ معاش تھا بالغ نظریں ان کو مصلح سمجھتی تھیں پرانا دوشالہ ملنے پر ان کا یہ لطیفہ کہ اس پر لا الٰہ الا اللہ لکھا ہے اور دوسرے کا تڑپ کر اعتراض کہ آدھا کلمہ کیسا محمد رسول اللہ بھی ہوگا اس کا بے ساختہ کہنا کہ یہ حضور سرور اکرمؐ کی بعثت سے پہلے کا ہے۔ کسی دعوت میں آلو کے سالن میں شوربا زیادہ ہو جانا اور ان کا اعتراض کہ غسل ارتماسی کرو۔ اس قسم کے ہزاروں واقعات ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے دہلی کے واقعات میں کچھ حکایتیں نذر قرطاس کی ہیں۔ مبتلا کے والد کا ذکر سے آنا ہے

میں بھی دو واقعہ پیش کرتا ہوں (۱) میاں الماس کا لکھنؤ میں طوطی بول رہا ہے بزم صاحبان کمال سے آراستہ ہے زر و جواہر لٹ رہا ہے بھانڈوں نے نئی سوجھی اور قرآن شریف میں نام داخل کرنے کا ارادہ کیا تمام ارباب ادب اور علم پرور ہستیاں موجود ہیں۔ اور ایک نے بڑی خوش الحانی سے قل اعوذ برب الناس شروع کیا اور ہر آیت کے بعد "میاں الماس" کا اضافہ، حاضرین ہنس پڑے اور آپس میں جنگ بھی شروع ہوگئی کہ قرآن میں زیادتی کرتا ہے یہ حق تجھ کو کس نے دیا ہنگامہ آرائی میں انسانی دست تعدی کا بھی جائزہ ہو گیا۔ (۲) ایک عالم دین کے یہاں شادی تھی کشمیری بھی پہونچے پابند شرع طبقے میں روپیہ اینٹھنے کی پہلی دھمکی ـــــ تو ان کی طرف سے یہ ہوتی ہے کہ ڈھول بجا دیں اس کے بعد نکتہ چینی میں تلخی کا ڈر وہ شہر کے حالات پر ناظر ہوتے ہیں جب بخشش میں دیر ہوئی تو

دبی زبان میں عرض کیا ہم تو — ذوی القربیٰ میں ہیں زیادہ حقدار ہیں۔ مجتہد صاحب کشمیری تھے اس لئے نکتہ برمحل تھا کشمیریوں کے علاوہ ایک گروہ ساود بچہ کا تھا جو نسبتاً ان سے زیادہ شریف اور متین خود دار تھا بھانڈ تو ہر جگہ تماشا کریں مگر ساود بچہ صرف اہل وثائق شہزادوں اور امیروں کی ڈیوڑھی پر جاکر بلند آواز سے کوئی قطعہ دعائیہ یا مدحیہ نظم پڑھ دیں اور محل سے روپیہ آٹھ آنہ آجائیں عہد شاہی میں ان کے فرائض زیادہ سخت تھے قصر حکومت پر جاکر روز نیا قصیدہ پڑھنا اور انعام لینا یہ وضعداری شعرا کی کثرت میں آسانی سے نبھ رہی تھی جس کے پاس پہونچ گئے کچھ نئے شعر کہلوالئے اور کام چلتا رہا آخری ساود بچہ پر یہ کام ختم ہوگیا۔ پندرہ برس جس کی موت کو ہوئے ہیں۔

نخاس کے پل سے چاول والی گلی جانے والوں کو اتار میں داہنے ہاتھ پر جو بلند مسجد واقع ہے اس کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا کہ کس کی تعمیر کردہ ہے بھانڈوں کی اس مسجد میں نماز پڑھنے سے شہر میں بھانڈوں کی مسجد مشہور ہے اور اس مسجد میں مرزا دلگیر مرحوم کا قطعہ تاریخ کندہ ہے ماہ رمضان میں حسن مرزا کا تابوت جب ادھر سے گزرتا ہے تو نمازیوں کے اژدہام میں اس کی صبح کو رونق ہوجاتی ہے

مرزا دبیر کی گلی :۔ نخاس کے پل سے گذر کر بائیں ہاتھ پر کوچہ مرزا دبیر ہے جہاں آپ رہتے تھے۔ اب نہ آپ کی اولاد میں کوئی ہے صرف نشان قبر ہے مرزا دبیر نے ۱۲۹۲ھ میں انتقال کیا۔ یہاں میر اعظم علی ایک سید رہتے تھے جن کے پاس ایک یادگار قرآن مجید تھا۔ جس میں دحواشی، سورۂ رحمٰن پر ائمہ طاہرین کے نام بخط ولایت تحریر تھے۔ قرآن مذکور کی زیارت کرنے والے اس مصحف کو عجائبات میں سمجھتے تھے۔

کنگھی ٹولہ :۔ نخاس کے پل پر دست چپ کی طرف سینگ کی کنگھی بنانے والے زین دوز دو کانوں میں کام کرتے ہیں ان کی دوکان سے پہلے ایک مسجد ہے جو نہیں کہا جاسکتا کہ کس کی تعمیر کردہ ہے[ع] اس محلہ میں محمود خاںؓ فن سپہ گری کے استاد رہتے تھے۔ ان میں خاص بات یہ تھی کہ شاگردوں کو مثل اولاد کے سمجھتے تھے۔ بندہ حسن خاں ان کے ایک شاگرد احاطہ مرزا علی خاں کے رہنے والے تھے ان سے نواب علی نقی خاں کے بھانجے سے گولی چل گئی۔ واقعہ یہ بتایا جاتا ہے کہ بندہ حسن نے طپنچہ سے حملہ کرکے نواب کو ختم کردیا تو شہر میں خبر پھیل گئی کہ وزیر اودھ کے کنبہ میں قتل ہوگیا۔ اس قاتلانہ حملے کے بعد وہ استاد کے گھر آئے اور اپنی بہادری اور آنے والے خطرہ کا ذکر کیا محمود خاں نے وعدہ کیا کہ گھبراؤ نہیں بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ شاہی رسالہ اور دوڑ آگئی بندہ حسن کو فوجیوں نے تلاش کرنا شروع کیا۔ محمود خاں اپنے گھر کی توہین سمجھ کر دوسرے شاگردوں کو لے کر مقابلے پر تیار ہوگئے اور چند بہادروں نے پورے رسالہ کو شکست[س] دی اور بندہ حسن کو بچالیا محمود خاں کی شجاعت اور بہادری کے اور بھی واقعات ہیں۔

اشرف آباد

اشرف آباد کو کس نے بسایا اس سوال کے جواب میں میرے سامنے دو رائیں مورخین کی ہیں پہلی رائے یہ ہے کہ یہ محلہ القوتاشش خاں کے بیٹے میر اشرف کا آباد کردہ ہے۔ میر اشرف اور میر مشرف عہد عالمگیر ثانی میں دو بھائی تھے جو لکھنؤ کے رہنے والے تھے تاریخ شیعہ میں میں نے اسی قول کو اختیار کیا ہے مزید انکشافات یہ ہیں کہ اس محلہ کو میر اشرف ناظم شاہی ابن میر کاظم ابن میر عبدالصمد نے آباد

ع مصری دائی اس مسجد کی بانی تھی جو عہد شاہی کی عورت تھی پتھر پر حسب ذیل قطعہ بخط نستعلیق درج ہے —

دایہ مصری چوں ساخت بیت خدا + سر مناران فلک فرسا — کرد سال بنا شہید رقم + کہ بنا ساخت مسجد والا

۱۲۶۶ھ

س وضعداران لکھنؤ صلا — شمس العلماء سید محمد ابراہیم صاحب قبلہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

کیا جو کلید بردار شاہ خراسان کی نسل تھے اور ان کی قبر بھی وہیں ہے قول اوّل کی بنیاد دستاویزات شاہی تھے جو میں نے بچشم خود دیکھے اور القو تاش خاں کے خاندان کے بعض لوگوں نے واقعات بتائے دوسرا قول جو تاریخ میں موجود ہے ممکن ہے کہ اس کا راز یہ ہو کہ میر اشرف نے اس محلہ میں سکونت اختیار کی ہو اور یہاں دفن ہوئے ہوں بعد کی نسل اشتراک اسم سے یہ سمجھی ہو کہ محلہ انھیں کا آباد کردہ ہے۔ اشرف آباد کا رقعات مرزا قتیل میں بھی ذکر ہے اور اس محلہ کی عہد آصف الدولہ میں "کھڑکی" کوئی مشہور جگہ تھی ملاحظہ ہو ترجمہ رقعہ

"خیرات علی خدمتگار نواب آصف الدولہ کو صاحب (انگریز) بھی اچھی طرح پہچانتے ہیں ان دو لفافوں میں سے وہ لفافہ جس کی عربی تحریر ہے مکتوب الیہ کو ہرکارہ پہونچا دے اور کہہ دو کہ اشرف آباد کی کھڑکی میں پہونچکر حکیم میر صادق کا مکان تلاش کرے ان کے گھر سے مولوی غلام ضامن کا مکان ملا ہوا ہے لفافہ مولوی صاحب کے ہاتھ میں دیا جائے"

اشرف آباد میں متمول ہندوؤں کی آبادی اور رستوگی ٹولہ کی طرح محلہ کے شروع اور آخر میں آہنی دروازے ہیں جو رات کو بند ہو کر اہالیان محلہ قلعہ کی طرح بہ اطمینان شب بسر کرتے ہیں۔

علم محاضرات کی مشہور کتاب دیوار قہقہہ کے لطائف میں بھی اشرف آباد کا ذکر ہے اور حکایت ۲۴۸ میں سائیس کے ہاتھ اشرف علی خاں کا اشرف آباد سے شریفہ بھیجنا دیکھو یہ کتاب ۱۹۲۹ء تک لکھنؤ میں اٹھارہ بار چھپی۔

میر اشرف کی قبر خیرات خانہ شاہی میں داخل ہوتے وقت بائیں ہاتھ پر قناتی دیوار کے گوشہ کج میں بنائی گئی ہے اور یہ قطعہ زمین نمایاں طور پر اب بھی موجود ہے۔

اشرف آباد میں بڑے بڑے صاحبان کمال ارباب ہنر اور مشہور ہستیاں رہتی تھیں جن کے نام بھی ہمارے پاس نہیں کچھ ذرائع ضبط و تدوین کے اب بھی ہیں مگر موجودہ نسل کی توجہ نہیں ہے اس محلہ میں صرف ایک چھوٹی سی مسجد خانہ عہد شاہی کی یادگار ہے جو اندرون احاطہ واقع ہے اور بڑی کسمپرسی میں ہے آگے بڑھ کر امام کا چبوترہ ہے جو ایک قدیم یادگار ہے۔

مولوی محمد مہدی صاحب ادیب:- حیدر گنج کا مرکز علم و ادب آپ کا گھر تھا جہاں فنون مشرقیہ کے ماہر عربی اور فارسی کے ادبا جمع ہو کر طبع آزمائی کرتے تھے صاحب خانہ مصطفےٰ آباد ضلع رائے بریلی کے رہنے والے تھے لکھنؤ کی تعلیم و تربیت نے ان کو صاحب کمال بنا دیا تھا اس مجلس علمیہ میں جس کا نام بہجۃ الادب تھا زیادہ تر مفتی میر عباس صاحب کے شاگرد جمع ہوتے تھے۔ تذکرہ بے بہا میں کہیں کہیں ان علمی صحبتوں کا ذکر ہے جناب نجم الملۃ مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ مجتہد لکھنؤ کا شباب خطیب اعظم مولانا سید سبط حسن صاحب اور ان کے ہمعصر طلبا مولانا سید محمد داؤد صاحب قبلہ مولانا سید محمد ہارون صاحب حافظ فرمان علی صاحب کی طالب علمی اور وہ آغاز جو عصر حاضر کے حد انجام کو پہونچنے والوں کو نصیب نہیں ان پھولوں کا چمن اور مظاہرۂ کمالات کا سنٹر یہی تھا صاحبان ثروت بھی جمع ہوتے تھے اور طالب علموں میں بہت ہی مفلس ہوتے ہیں وہ اپنی نظر انتخاب سے جانچ کر کسی سے کہتے تھے کہ فلاں کتاب میں فلاں بحث آپ گھر جا کر دیکھ ڈالیں میں کتاب ساتھ کئے دیتا ہوں اس بجکٹ کے کھولنے پر روپیہ کے نوٹ نکلتے گیارہ گیارہ بجے رات تک یہ صحبت گرم رہتی تھی اور علمی اور ادبی مسئلے حل ہوتے تھے "کواکب دریہ" اس زمانہ کی عربی خط و کتابت پر ایک ٹھوس کتاب ہے مولانا ادیب کا انتقال مصطفےٰ آباد

۱؎ رقعات مرزا قتیل ص۵

اپنے وطن میں ۷؍ صفر ۱۳۱۷ھ میں ہوا شعراء جاہلیت کے کئی ہزار شعر ان کو یاد تھے۔

اشرف آباد میں کاظمی بیگم ایک علم دوست خاتون رہتی تھیں جن کے ہاتھ کا خوشخط نسخہ ضیاء الرمل دیکھا گیا حسن خط کے لحاظ سے بہترین شاہکار ہے۔[1]

نوبستہ

بارہویں صدی ختم ہو رہی تھی کہ عالمگیر ثانی کے وقت میں میر مشرف نے اس زمین پر قدم رکھے اور یہ جگہ نوبستہ مشہور ہوئی لفظ میں نئی آبادی کا اشارہ ہے اور بعض اہل تحقیق کہتے ہیں کہ نو محلے آباد ہوئے تھے۔ جو لکھنؤ کی شہری آبادی سے پہلے کا ذکر ہے۔ منشی رام سہائے کہتے ہیں ؎

خط نوبستہ جان لکھنؤ است　　　لکھنؤ در ہندوستان دیگر است

شد فضا رونق افزاء ایں زمین　　　ایں زمیں را آسماں دیگر است

<u>قدم رسول</u> :- ۱۱۶۶ھ میں التوتاش خاں نے زیارت گاہ بنائی اور مجاورت کے لئے اپنے بیٹوں میر اشرف اور میر مشرف کو چھوڑا خود دہلی چلے گئے اور وہیں رحلت کی وہ سید تھے اور خان خطابی تھا ان کی قبر مزار نظام الدین اولیاء دہلی کے پچھواڑے جو نسخہ کھمبہ میں ہے نوبستہ کا پل اس زیارت گاہ کے بعد تعمیر ہوا ہے اس کا مادہ تاریخ اس مصرعہ سے واضح ہے ؎ پل نوبستہ بزیر قدم پاک رسول ۱۲۰۷ھ

ایک زمانے میں زیارت کرنے والوں کا ہجوم رہتا تھا اور عقیدت کیش جوق جوق آتے تھے کسی شاعر کا شعر ہے ؎

پس گئے رنڈیوں کے کولوں سے　　　باز آئے قدم رسولوں سے

یہ لکھنؤ کی پہلی مسلم زیارت گاہ ہے قدم رسول دہلی میں بھی تھا اور جن تجدد پسند اصحاب نے اس کا مضحکہ اڑایا ہے اس کی رد میں مولوی شاہ محمد عمر اخوند دہلوی نے بڑا فاضلانہ رسالہ لکھا جس کا نام سیف المسلول علیٰ من انکر اثر قدم الرسول رکھا وہ شاہ عبد العزیز کے شاگرد تھے ۱۲۳۶ھ میں فوت ہوئے۔

<u>تمنائی پریس</u> :- منشی رام سہائے تمنا نوبستہ میں رہتے تھے صوبہ اودھ کے حالات پر دو مہینہ میں احسن التواریخ تالیف کی خود کہتے ہیں ؎

نہ رنگین عبارت نہ عمدہ کلام　　　یہ تاریخ دو ماہ میں کی تمام

ماتا پرشاد نکہت اور دوارکا پرشاد منشی صاحب کے دو اور بھائی تھے اور نظم و نثر میں وہ بھی قابل تھے۔

مطبع تمنائی اپنے نام پر جاری کیا اور تاریخ مذکور اسی پریس میں طبع ہوئی اور اخبار بھی اس مطبع سے جاری کیا۔ اخبار[2] کا نام مہر ظرافت تھا جو ۲؍ ستمبر ۱۸۸۶ء سے ہفتہ وار شائع ہوا۔

<u>منشی جی سکھ رائی</u> :- نوبستہ کے پرانے رہنے والوں میں سکھ رائے عہد نصیر الدین حیدر میں خیر آباد سے آ کر رہے آپ قوم کایستھ سری باشب تھے اور فرمان نویسی کا عہدہ آپ کو تفویض تھا۔ تمنا نے حسب ذیل الفاظ میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ سے تا زمانہ ختم سلطنت واجد علی شاہ بلا فصل عہدہ فرمان نویسی پر ممتاز رہ کر تاریخ انیسویں ماہ اپریل ۱۸۶۶ء انتقال فرمایا۔ صدہا خوشنویس شاگرد ان کے محکمہ جات سرکاری اور چھاپہ خانوں میں ملازم ہیں اور منشی دھنپت رائے

---

[1] ملاحظہ ہو فہرست کتبخانہ تجارتی سید سخاوت حسین ملد دار در نیر یاد علی واقع باغ کمہ لکھنؤ　　[2] نیا دور دسمبر ۱۹۵۹ء

ولادا کبر منشی صاحب علم وفضل میں مشہور ونزدیک و دور سرکار فیض آثار وحید الدولہ عضد الملک مرزا مہدی حسین خاں بہادر اسد جنگ رئیس اعظم شہر لکھنؤ میں ممتاز باعزو وقار ہیں۔ ص۱۳۱ احسن التواریخ

کھالہ کا بازار

کسی زمانہ میں یہاں کھالیں فروخت ہوتی تھیں اب کھالوں کا کاروبار چک منڈی میں ہے قدم رسولؐ سے آگے بڑھ کر ایک وسیع میدان ہے جو گردھاری سنگھ ہائی اسکول کا پچھواڑہ ہے اس زمین پر دو مقبرے آمنے سامنے نظر آتے ہیں دونوں عمارتیں مقبرہ نوربازی سے ملتی جلتی ہیں۔ چھوٹے اور بڑے کا فرق ہے غربی مقبرہ کسی قدر بڑا ہے اور ٹھیک سے معلوم نہیں ہو سکا کہ عمارت کس صدی کی ہے اور کس کی قبر ہے بعض اہل محلہ قاضی صاحب کا مقبرہ کہتے ہیں اور دوسرا مزار ان کی رفیقۂ حیات کا ہے فتاوی عالمگیری کی تالیف میں جو قضاۃ جمع ہوئے تھے ان میں ایک قاضی ہیں جن کی دکھن میں موت ہوئی اور لکھنؤ میں دفن ہوئے ان کے عزیز بنارس میں ہیں۔

یہ بیان بالکل غیر ذمہ دارانہ ہے اور اس سے زیادہ بے وقعت اور محتاج ثبوت وہ قول ہے جس میں کہنے والا کہتا ہے کہ یہ مقبرہ لال جی کلال جی کا ہے۔ لفظ کے معانی اور ذات کے تعارف میں پہلے یہ شعر ملاحظہ ہو؂

کس گل کے قبضہ میں ہے گلابی زلال کی   امسال کس طرف کو ہے بھٹی کلال کی

بنا بریں صاحب قبر کا تعلق محکمۂ آبکاری سے معلوم ہوتا ہے اور تاریخ اودھ میں بھی راجہ لال جی کلال جی کا تذکرہ ہے جو راجہ بھگوانداس اتالیق نواب آصف الدولہ کی بڑی لڑکی کے بطن سے تھے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی میں نوکر تھے لکھنؤ پہونچ کر عہدہ بخشی گری پر فائز ہوئے ان کے بعد ان کے فرزند راجہ الفت رائے پھر ان کے بیٹے راجہ دھنپت رائے انقلاب سلطنت تک کام کرتے رہے ان کے بھائی کا نام کنور محبت رائے تھا اس خاندان کی شاہ خرچی تاریخ میں مشہور ہے۔[1]

کنور محبت رائے کے نام پر سڑک اس وقت تک موجود ہے اور مہدی گنج کو وکٹوریہ اسٹریٹ سے یہی راستہ جاتا ہے۔

مقبرہ:۔ چوکور کوٹھری اور چھت پر خوبصورت گنبد جس کی استرکاری باقی نہیں ہے بظاہر گنبد کے چاروں طرف مینار رکھے اب گوشۂ شمال میں دو مینار باقی ہیں۔ چھت قالب دار ہے اور گنبد کے پہلو میں روشن دان اس خوبصورتی سے بنائے گئے ہیں کہ حجرہ میں روشنی پہونچتی ہے۔ درمیان میں نشان قبر ہے پتھر باقی نہیں رہا۔ دوسرے مقبرے میں کوئی منارہ نہیں ہے اور اسی وضع قطع کا ہے اور دونوں گنبدوں میں چھت پر سے قبہ کے نیچے پہونچنے کی جگہ ہے جیسا کہ مسجد تحسین اور مسجد توجی میں چھت پر سے مشی کرتے ہوئے گنبد کے اندر انسان جا سکتا ہے اور چھتیں دوہری ہیں دوسرے مقبرہ کی بیرونی دیواروں پر نقش و نگار قابل دید ہیں اور صدیاں گذرنے پر دیدہ زیبی باقی ہے میری رائے میں یہ عمارتیں شاہان مغلیہ کے دور سے بھی کچھ پہلے کی ہیں۔ جلد اول فتاوی عالمگیری کے مترجم احتشام الدین مراد آبادی ہیں اور دوسری جلد کے ترجمہ کرنے والے مولوی امیر علی ہیں جنھوں نے ۱۹۱۰ء میں ترجمہ کیا فاضل کنتوری نے فتاوی قاضی خاں کا جامع قاضی حسن بن بدر الدین منصور بن شمس الدین ابو القاسم بن عبد العزیز اوزجندی عرف قاضی فخر الدین خاں کو قرار دیا ہے اور اس کے ساتھ ایک رسالہ مزاحیہ طبع ہوا ہے جو مولوی سراج الدین ہندی کی تالیف ہے ممکن ہے کہ ان کی قبر ہو مگر اس وقت جب مؤلف کو اس دور کا مانا جا سکے۔[2]

---

[1] احسن التواریخ ص۱۳۱   [2] دیکھو فہرست کتب خانہ تجارتی منشی نولکشور لکھنؤ ص۳۵

شکستہ مسجد یا خزانہ والی مسجد

مقبروں سے تھوڑے فاصلے پر پچھم کی طرف ایک مسجد ہے چھوٹا سا صحن طے کرکے تین پکے زینے چڑھنے پر محراب اور درجہ شروع ہوتا ہے گنبد منہدم ہو چکے ہیں کچھ حصہ قبہ کا باقی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ دونوں مقبرے اور مسجد قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ روکار پر آیات قرآن بخط عرب تحریر ہیں اور عمارتی مصالحے کاتب نے بظاہر پورا رکوع سورۂ آل عمران کا لکھا تھا بجائے پتھر کے مصالحے سے اُبھرے ہوئے حرف کہیں کہیں باقی ہیں۔ ایک سطر داہنی طرف حصہ زیریں در سے شروع ہو کر دو سطریں روکار پر اور تیسری سطر بائیں طرف ہے بیشتر حروف گر چکے ہیں کہیں کہیں قرآنی لفظ نظروں کو اپنی طرف موڑتی ہے اور چونکہ قد اهمتهم قرآن شریف میں صرف ایک بار ہے اس لئے بڑے غور اور خوض سے یہ صحیح فیصلہ ہوتا ہے کہ آل عمران کا پورا رکوع محراب پر لکھ دیا گیا ہے۔ سقف مسجد باقی نہیں پشت مسجد پر کچھ قبریں پرانی آسمان کے سایہ میں ہیں جن میں ایک قبر پر سفیدی ہوتی رہتی ہے اور نیچے نالہ بہتا ہے۔ اور اینٹوں کا گارہ ہے اس قبر کے بارے میں ہندو مسلم اہل محلہ میں شہرت ہے کہ جس عورت کے دودھ کم ہو وہ یہاں لاکر نمک رکھ دے اس نمک کے کھانے سے دودھ پلانے والی عورت کا دودھ زیادہ ہو جائے گا۔

مسجد پر کتبہ میں جو خط ثلث میں بخط عرب لکھا ہے صرف بسم اللہ تو باقی ہے حرف جا بجا گر گئے ہیں اور اسلوب نگارش یہ ہے۔

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم ثم انزل علیکم من بعد الغم امنة نعاسا يغشى طائفة منكم وطائفة قد اهمتهم انفسهم يظنون بالله غير الحق ظن الجاهلية يقولون هل لنا من الامر من شئ قل ان الامر كله لله يخفون في انفسهم ما لا يبدون لك يقولون لو كان لنا من الامر شئ ما قتلنا ههنا

آیت مذکور کا اردو میں ترجمہ یہ ہے۔

پھر بعد اس رنج و غم کے خدا نے تم پر نیند اتاری جو تم میں سے ایک جتھے پر طاری ہوئی اور ایک جتھے کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے اور خدا کی نسبت ناحق شناسی سے بدگمانی کرتے رہے کہتے تھے کہ اس معاملے میں کچھ ہمارا بھی اختیار ہے تم کہہ دو کہ یہ معاملہ تو خدا کے ہاتھ میں ہے وہ ان پردوں میں وہ جو کچھ چھپا رہے ہیں جو تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ (پ ۴ رکوع ۷ پارہ ساتواں رکوع) یہ آیت فقرہ ذات الصدور تک کامل آیت سمجھی جاتی ہے اور عاملوں نے فتوحات کے لئے اس کے عمل مقرر کئے ہیں۔ اس آیت میں یہ خصوصیت بھی موجود ہے کہ سارے حروف تہجی الف سے یا تک بیک جا موجود ہیں جو قرآن مجید میں کسی جگہ نہیں ہے عوام کو تو اتنی قابلیت نہیں کہ آیت کو سمجھیں اور میرے خیال میں جس وقت کچھ دن اور گزر گئے اس وقت اس آیت کا دریافت کرنا بھی امکان سے باہر ہوگا عام نگاہوں نے برخلاف دیگر مساجد کے دوسرے کتبوں کے نئے اسلوب اور نئے طرز پر طولانی آیت دیکھی اور پرانے اقوال کی روشنی میں جو مسجد کی تعمیر کے وقت سے مسجد کے دیکھنے والوں نے علم سینہ کو دوسرے لوگوں تک پہونچایا یہ کہا کہ مسجد پر یہ لکھا ہے کہ منارہ کے سمت الراس پر جہاں سایہ ختم ہو زمین میں دفینہ ہے جو شخص اس کو تلاش کرکے حاصل کرے وہ ½ خرچ محنت خود لے اور ½ خیرات کردے اور ½ میں مسجد بنوا دے اور مرمت میں صرف کرے۔ آیت کا ظاہر تو نہیں بتاتا کہ دفینہ ہے اور ایسی آیت کا بانی مسجد کی طرف سے انتخاب بھی اخفائے راز کا باعث تھا ورنہ ممکن تھا کہ سورہ کہف کی آیت وکان تحتہ کنز لھما

لکھ دی جاتی تحریر کردہ آیت چونکہ ان آیات سے جداگانہ ہے جن کا مسجد کے پتھر پر اظہار ہو سکتا تھا اور جو مسجد یا شعائر اللہ کی عظمت پر دلالت کرتی ہیں اس لئے اس آیت سے دفینہ کی طرف اشارہ بے محل بھی نہیں ہے اگر مسجد اور مزار ایک شخص کا ہے تو ممکن ہے کہ صاحب قبر کے علم افروز دماغ سے اس آیت کا استخراج ہوا ہو بانی مسجد اس قدر علم نواز تھا کہ اس نے قرآن مجید کے چھ ہزار سے زیادہ آیات میں اس آیہ کو پسند کیا دفینہ کے تلاش کرنے والے غفلت کی نیند میں ہیں اور اگر پا جائیں تو مفلسی تونگری سے تبدیل ہو کر آیت کا پہلا وعدہ سامنے آجائے خزانہ کی جستجو میں انسان ناکام اور علم الٰہی میں اس کا ہونا لازم ہے قل ان الامر کلہ الی اللہ اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ڈھونڈنے کے بعد نہ پانا یخفون فی انفسھم مالا یبدون لک پیشین گوئی کا نتیجہ ہے ھھنا کی لفظ بانی مسجد کے ضمیر کا اعلان عام ہے مگر راز قدرت کا بند افشا نہیں کر سکتا یہ زمین رہن و بیع کے ذریعے مالکان کارخانہ عطر اصغر علی محمد علی کے قبضہ میں ہے اور مقدمہ بازی سے اصل مالک سے ہاتھ سے جاتی رہی اور تلاش دفینہ میں کوئی دقیقہ مالک نے اٹھا نہیں رکھا مگر "ان الامر کلہ الی اللہ" افسوس ناکام رہا۔

خوشنویسی کے ماہر اچھی طرح اندازہ کرسکتے ہیں کہ ایسا پختہ خط اور زور قلم لکھنؤ کی کسی عمارت کے کتبہ میں نہیں ہے۔ شکستہ عبارت ٹوٹے ہوئے پلاسٹر، کا پڑھنا اگر قل ھھنتھم کی لفظ پر نظر نہ پڑتی اور باقی نہ ہوتی تو ناممکن تھا۔ یہ قرآنی اعجاز ہے کہ ٹوٹی ہوئی عمارت میں ایک لفظ نے پورے کتبے پر راہنمائی کی۔

وکٹوریہ گنج میں جعفر ٹوپی والے عمدہ کاریگر تھے ایک قدیم روزنامچہ میں ذکر ہے کہ ۵ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو کاریگر مذکور کو ۳ عدد کلاہ چوگوشیہ شال کی تیار کرنے کو دی گئیں اور کہا کہ دو ٹوپیوں کی شال بھی بدلی جائے گی۔ سفید شال لگائی جاوے اور دو ٹوپی جالی کی دوہری یعنی سچی جامدانی اور اوپر باریک جامدانی کی تیار کردیں۔

وکٹوریہ گنج

حیدر گنج سے پہلے وکٹوریہ اسٹریٹ کی آخری حدوں میں وکٹوریہ گنج ہے جو ملکہ وکٹوریہ کے نام پر شروع انگریزی میں آباد ہوا اور اور عوام ٹوریا گنج کہتے رہے یہ غلہ اور ترکاری کی منڈی نمبر ۲ پر ہے گیہوں، جو، چنے کے آڑھتے، دال، چاول اور اناج کا ذخیرہ ہے اور کہیں کہیں مسلمان کبڑیے ترکاری لے کر بیٹھتے ہیں۔

<u>خیرات خانہ شاہی</u>:۔ یہ وہ پبلک ادارہ ہے جسے حضرت نصیر الدین حیدر بہادر نے ۱۲۴۶ھ میں ساڑھے تین لاکھ روپے سے خلق خدا کو فائدہ پہونچانے کے لئے جاری کیا۔ یہاں لولے، لنگڑے، اپاہج اور بے وارث مرد و عورت جن کا کوئی ذریعہ نہ ہو تنخواہیں اور دونوں وقت کھانا دے کر رکھے جاتے ہیں اور قدیم وضع کے پھاٹک کے بعد مفلسوں کی رہائش کے کمرے ہیں پھاٹک پر بادشاہ کا نام اور سنہ تاسیس لکھا ہے خیرات خانہ کے اندر داخل ہو کر پشت ادارہ پر محلہ بھدیوں کے بڑے بڑے میدان اور کشادہ زمینیں ہیں یہ ادارہ ایک روشن خیال اور باضابطہ کمیٹی کے زیر نگرانی غریبوں کی مدد کر رہا ہے۔

<u>مہر کن کا احاطہ</u>:۔ یہ بھی حیدر گنج سے قریب بائیں ہاتھ پر واقع ہے یہاں عقیق اور فیروزہ در نجف پر آیات قرآن دعائیں کندہ کرنے والے اور چاندی پیتل تانبا پر مہریں کھودنے والے آباد تھے ان سب کی دکانیں کپتان کے کنوئیں پر چوک میں تھیں ان کے ہاتھ کے طغرے نسخ و نستعلیق کے نمونے اب بھی کبھی کبھی بازار میں نظر آتے ہیں۔

عہد قدیم میں مہر کی وہ بلند حیثیت تھی کہ جب تک خاتمہ دستاویز پر مہر نہ ہو وہ کاغذ جعلی سمجھا جاتا تھا ہر اقرار نامہ اور رسید پر مہر ہونا ضروری ۔ کوئی تحریر ایسی نہ تھی جو مہر سے خالی ہو سرکاری کاغذات پر اور زیادہ مہر ہونا ضروری تھا یہ فن بھی اب ختم ہو گیا ادھر مہر کی حیثیت دستخط نے لی ادھر مہر کن اپنے کمال کو قبروں میں لے گئے ۔

اس محلہ میں ایک پرانا قبرستان اور بعض مسجدیں ہیں جن کے بارے میں کوئی تاریخی ثبوت میرے سامنے نہیں ہے ۔

بارہ دری حکیم حیدر حسین :۔ وکٹوریہ گنج میں یہ عمارت بلسی ہاؤس کے نام سے اب تک ہے عہد شاہی میں میر باقر رسالدار بڑے مشہور شخص تھے ان کے علاوہ حکیم حیدر حسین و حکیم صفدر حسین فن طب کے چاند سورج سے کسی طرح کم مشہور نہ تھے حکیم حیدر حسین دارالشفا شاہی چوک کے طبیب اول تھے ان کے بعد ان کے بیٹے حکیم جعفر حسین اس عہدے پر آئے اور فن طب کی شاندار خدمت انجام دی ۔ حکیم حیدر حسین ورزشی جسم کے تنومند قدآور شخص تھے ۔ غیر معمولی غذائیں از قسم بادام و حریرہ و یخنی اور گھی دودھ ان کی روزمرہ کی غذا تھی یہ ان اطبا میں تھے جو اپنے مریضوں کے لئے نماز شب میں دعائے صحت و شفا کیا کرتے تھے حکیم صفدر حسین نے جمادی الاول ۱۳۲۶ھ میں انتقال کیا ۔

کربلا سعید الدولہ

نواب سعید الدولہ حضرت محمد علی شاہ بادشاہ کی نسل سے تھے اور پرنس مرزا خرم بخت کے داماد تھے آپ نے عنفوان شباب میں رحلت کی اور اپنی نانی ملکہ زمانیہ کے امامباڑہ میں دفن ہوئے ۔ کربلا کا پچھلا حصہ ناتمام ہے روضہ کے اندر در و دیوار میں نسخ اور خط ثلث کے اعلیٰ نمونے رنگ آمیزی سے زیارت اور اسمائے الٰہی سورہائے قرآن کی صورت میں موجود ہیں اور وسیع احاطہ کربلا کی آراضی میں شمار کیا جاتا ہے پہلو میں گڑھوں کی جگہ ہے ۔ سعید الدولہ بضرورت کلکتہ جا رہے تھے ہاتھ سے چابک گر گیا دوسرے چابک کی ضرورت ہوئی ۔ گاڑی روکی دوکان پر آئے مالک دوکان سامان بڑھا رہا تھا چابک دینے سے اس نے انکار کیا ۔ آپ نے حکم دیا کہ سوداگر سے پوری دوکان خرید لو ۳ لاکھ کی بولی سوداگر نے بتائی اور سوداگر نے کہا کہ میں مع کاغذ تیر قلم دوات کاغذ فرش ۳ لاکھ میں دیدوں گا آپ نے تین لاکھ کے نوٹ اس کے حوالے کئے بیچک مانگی وہ کاغذات کا بستہ لے آیا بستہ گاڑی میں رکھوایا اور کہا کہ کل قیامگاہ پر آکر بیعنامہ کی تکمیل کرا لینا اس کے بعد حکم دیا کہ دوکان کا سارا مال غریب لوٹ لیں سوداگر سے کہا کہ دیکھو ہم فقط یہ ردی خرید کرے جا رہے ہیں سوداگر کو یاد آیا بستہ میں اس کے بچی کاغذ بھی تھے منشی نے جائزہ لیا تو چند کوٹھیوں کے قبالے ہوٹل کا بہی کھاتہ کئی تمسک بھی نکلے منشی جی سمجھے کہ نواب صاحب نفع میں رہے اور کاغذات بہت زرخیز ہیں مگر آپ نے دوسرے دن کاغذات اس کے حوالے کر دئے ۔

کربلا منشی فضل حسین

خان بہادر منشی فضل حسین عہد سلطان عالم میں دفتر بخشی گری میں نوکر تھے انقلاب سلطنت کے بعد سر محسن الدولہ کے یہاں ملازم ہوئے ان کی ایک کوٹھی وکٹوریہ گنج میں تھی جس کے سامنے بازار لگتا تھا آخر عمر میں حسین آباد ٹرسٹ میں ایک اعلیٰ منصب پر پہونچے اور انگریزی حکومت میں فرزندان مسلم کا روضہ بنوایا عہد شاہی ختم ہونے پر اب درگاہ کربلا بنوانے کا کسی میں جذبہ نہ تھا صرف فضل حسین خاں محسوس کر رہے تھے کہ لکھنؤ میں سب ہے فرزندان مسلم کا روضہ نہیں ہے شمع بجھ چکی تھی اور روشنی باقی تھی اس کار خیر کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ۔ اور روضہ بنوایا جس میں دو حجرے پہلو بہ پہلو اور دو قبے پاس پاس نکاس کے پھاٹک کے سامنے چار دیواری میں مسجد اور حوض،

۱ے وضعداران لکھنؤ ص۲۵

کنواں غسلخانہ ہے۔ روضہ کی آراضی بہت لمبی چوڑی ہے اور واقف کے گھرانے کی قبریں بھی اس زمین پر ہیں ان روضوں کی تاریخ میں مفتی میر عباس صاحب فرماتے ہیں ؎

روا قش مصفا و مرغوب و موزوں — چو بینی زا بیات رنگین نگارے
کنم بر شمار غرض تاریخ روضہ — یتیمان مسلم نباشد مزارے ۱۲۹۶ھ

۲۴ رجب کو منشی فضل حسین خاں نے ۱۸۹۱ء میں انتقال کیا اور اسی زیارت گاہ میں دفن ہوئے چہلم اور عشرہ کے دن تاکٹورہ جانے والے ماتمی دستے اور عام زائر زیارت کرتے ہیں۔

انگریزی علاج کا اسپتال

یہ اسپتال سنہ ۱۲۴۱ھ میں عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ کے سرمایہ سے کھلا رد کار کی دیوار پر جلی قلم سے ۱۸۶۴ء لکھا تھا جسے سڑک کے گذرنے والے پڑھتے تھے جمہوری حکومت کے زیر انتظام آنے پر یہ لکھا مٹا دیا گیا اس اسپتال کی بنیاد حضرت گنج میں قائم ہوئی تھی اسپتال کے پہلے ڈاکٹر STEUENSON تھے اس سال حضرت گنج سے حیدر گنج اسپتال منتقل ہوا۔ اور مشہور معالجوں میں خان بہادر ڈاکٹر عبد الرحیم تھے جنھوں نے سنہ ۱۳۴۳ھ میں وفات پائی اس اسپتال میں عمل جراحی آنکھوں میں قدح اور ہر بیماری کا علاج ہوتا ہے مریضوں کے ٹھہرنے کے وارڈ بھی ہیں جمہوری حکومت نے اسپتال کو ترقی دے کر سرکاری اسپتال قرار دیدیا اور منشائے واقف پر ضرب ہے۔

حیدر گنج

لکھنؤ کے رہنے والوں کی زبان پر پرانا حیدر گنج بار بار آتا ہے یہ محلہ وکٹوریہ گنج سے دست چپ کی طرف —— شروع ہو کر وسیع آبادی پر حاوی ہے اور نام میں اسلامی ہیبت موجود ہے مشرقی تہذیب کے بہت سے رئیس اس سرزمین پر تھے جن کا اب صرف ذکر باقی ہے اور بعض آثار قدیمہ فنا ہو گئے بعض ہنوز باقی ہیں۔

عظیم الشان مندر :۔ لکھنؤ کی پہلی آبادی ہندو ہیں ان کی اکثریت کے شایان شان مندر نہ ہونے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ طبقہ پست تھا چھوٹے چھوٹے مندر تو ہر سمت تھے مگر سلطان عالم کے دور حکومت میں زبدۃ العلماء کی زمین پر حیدر گنج میں عالیشان مندر تعمیر ہوا جس کی بلندی کا یہ حال تھا۔ قبہ مرتفع چہ سبع شداد۔ مفتی میر عباسؒ صاحب مرحوم نے ۴۶ شعروں میں مندر پر بحث کی ہے اور سرگذشت شائع ہو چکی ہے۔ عدل پرور شاہ نے مالک آراضی کے احتجاج پر مندر کو باقی نہیں رکھا۔

مسجد راجہ ٹکیت رائے :۔ حیدر گنج میں راجہ ٹکیت رائے کی سربلند مسجد موجود ہے جو ہندو مسلم اتحاد پر گواہ ہے عمارت کی شان دیکھنے تعلق رکھتی ہے ٹکیت رائے کی دو مسجدیں نجم الغنی نے بتائی ہیں اور دونوں حیدر گنج میں ہیں بلند مسجد کے پہلو میں امام باڑہ بھی تھا جو باقی نہیں رہا۔

نواب صاحب کا دربار :۔ ۱۹۴۰ء میں مجھے منجھن پور ضلع الٰہ آباد سفر کی نوبت آئی اور وہاں کچھ تہذیب لکھنؤ کے دلدادہ مل گئے اور ایک صاحب نے بیان کیا کہ پہلے حیدر گنج میں ایک شاہزادہ رہتے تھے جو صورت شکل میں آخری شاہ اودھ کی تصویر تھے پیر دن

سنہ ریاضی جنتری ۱۹۳۳ء ص ۳۴۲ مرتبہ کتب خانہ ریاض التجارت چوک لکھنؤ میں اس مندر کے حکومت کی طرف سے جائز طور پر کئے جانے کا تذکرہ ہے کتاب چونکہ بھارت

میں ایک کلی کا لال گرنٹ کا پاجامہ پرانی وضع قطع صبح سویرے ان کی صحبت گرم ہوتی تھی نام مرزا مغل تھا اور پندرہ بیس مصاحب ڈیوڑھی پر حاضر رہتے تھے ساٹھ برس پہلے شہر میں چائے کا کوئی ذکر نہ تھا صرف شہزادہ صاحب کے یہاں چائے کا دور چلتا تھا۔

راوی ناقل ہے کہ میں نوجوان تھا اور تہذیب لکھنؤ دیکھنے کے لالچ میں ان کی صحبت میں پہونچ گیا صورت دیکھتے ہی اپنے نزدیک ادب سے سلام کیا تھا مگر نواب صاحب کی جبیں پر شکن آگئی اور فرمایا صاحبزادہ! تم کو ابھی تک سلام کرنا بھی نہیں آتا جھک کر سلام کرو اور کھو مجرا میں نے تعمیل حکم کی اور نواب صاحب نے کورنش کہہ کر جواب سلام دیا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا میں دوسری مرتبہ سلام کر کے اپنی جگہ بیٹھا اور کچھ دیر میں سب مصاحب جمع ہو گئے۔ اور چائے آنا شروع ہوئی اس طرح کہ ہر کپ پر ایک گاؤزباں[۱] رکھی ہوئی حاضر بن فراشی سلام کر کے چائے کی پیالی ہاتھ میں لیتے تھے اور بڑے لطف سے یہ نشست برخواست ہوتی تھی۔ گاؤزبان ایک لانبی شیرمال تھی جو چوک کے نانبائی بناتے تھے اور ایک پیسے کو دیتے تھے گھی میں خستہ میدے کی ہر پرت میں زعفران کی رنگینی چائے میں پہونچتی ہے ملائم ہو جانا اور ذائقہ میں کلیجے سے بہتر۔

تمام مصاحب تنخواہ دار تھے ہر مہینے کی پہلی تاریخ مشاہرہ کے ساتھ چاندی کی مختلف وضع قطع کی ڈبیاں کسی پر چڑیا کسی پر مور، کسی پر مچھلی تحفہ کے طور پر پیش کی جاتی تھیں اور ڈبیاں ایک دوسرے سے مشابہ نہ ہوتیں یہ غریبوں کی امداد کے طریقے تھے اور فیاضی کی نئی نئی صورتیں تھیں۔

<u>پرنس سکندر قدر</u>:۔ یہ بزرگ شہزادے تھے اور امامباڑہ ممتاز العلماء میں سال بھر کے بعد ایک مجلس کرتے تھے جس میں تبرک کے بجائے دوانی چونی تقسیم ہوتی تھی علماء کے پاس ٹکٹ حاضر کر دئے جاتے تھے اور وہ مستحقین کو تقسیم کر دیتے تھے یہ ٹکٹ دکھا کر دروازہ امامباڑہ باغ کے پھاٹک پر حصہ بٹتا تھا۔ زینہ کی دیواریں بھیڑ میں ہر سال گرتی تھیں اور نواب صاحب ہر سال ان کو اٹھواتے تھے۔ پولیس انتظام کرتی تھی۔ کسی نے پوچھا حضور علماء کے یہاں چٹھیاں بھیجدیتے ہیں اس کا کیا سبب ہے ریزگاری اس کے بغیر بھی بٹ سکتی ہے فرمایا بھائی یہ مجلس کا تبرک ہے اس کو کسی دشمن امام تک نہ پہونچنا چاہئے اور آپ مسجد تحسین کی نماز ظہرین میں بھی ریزگاری نمازیوں کے افطار کے لئے بانٹتے تھے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ موصوف کا نام نبن صاحب تھا۔ یہ ذکر پچھتر برس پہلے کا ہے۔

<u>ڈاکٹر مرزا اعجاز حسین صاحب مرحوم</u>:۔ وکٹوریہ گنج میں مطب تھا آپ کے والد مرزا جعفر علی بیگ صاحب سبزمنڈی چوبداری محلہ کے رہنے والے تھے اس محلہ میں انہوں نے کافی فروغ حاصل کیا ڈاکٹر عبدالرحیم اور حکیم صفدر حسین کے معاصر تھے ۱۹۰۷ء کے روزنامچہ میں راجہ توکل حسین صاحب کے والد جب بیمار ہوئے تو آپ کے زیر علاج رہنے کا ذکر ہے۔

<u>حامد ڈاکو کی مسجد</u>:۔ منشی فضل حسین خاں کی کربلا سے گزر کر وہ قدیم اور شکستہ حال مگر خوبصورت امامباڑہ و مسجد ہے جو عہد شاہی کی یادگار اور بانی عمارت کا نام لاعلمی کی نذر ہو چکا ویرانہ۔ عہد مؤلف میں لکھنؤ کا مشہور ڈاکو حامد یہاں حصہ بانٹ کرتا تھا اس کو حامد ڈاکو کی مسجد کہنا شروع کیا حامد کی ڈاکہ زنی اور بہادری اور عیاری عصر حاضر کے لوگ جانتے ہیں۔

---

[۱] تقریباً ایک بالشت کا لانبا اور چار انگل کا چوڑا کلچہ اسم باسمی جو اکبری دروازہ کے نانبائی بناتے تھے اگلے صفحہ پر مزید کیفیت دیکھو

بھدیواں

حیدر گنج کے مقابل اور وکٹوریہ اسٹریٹ کے دوسرے سائڈ میں یہ قدیم محلہ ہے جو مدتوں ویران رہنے کے بعد اب آ. د ہو . ہے اور یہاں کچھ شاہی عمارات کے آثار اور ایک قدیم امامباڑہ کے اجزا اب بھی دوسرے لوگوں کے قبضے میں ہیں جن کو دیکھنا ممکن نہیں ہوا تاریخ میں اس محلہ کا اس سلسلے میں ذکر ہے کہ سلطان عالم نے اپنے قدیم مصاحب میرن نامی کو میر مہدی امیرانہ کا خطاب دیا اور وزارت کے عہدے پر لا رہے تھے خلعت وزارت عطا نہیں ہوا تھا کہ تقرر کے تیسرے دن موصوف نے بھدیواں کا مندر جو ان کے مکان سے قریب تھا کھدوا دیا اور شہر کی ہندو پبلک نے ہڑتال کیا دوکانیں بند کیں واجد علی شاہ نے پبلک کے جذبات کا احترام کر کے مصاحب مذکور کو وزارت کے عہدے تک نہ آنے دیا اور معزول کر کے اپنی عدل گستری کا ثبوت دیا۔

جنت البقیع

فرزندان مسلم کے روضے سے گزر کر شبیہ جنت البقیع بھی داہنے ہاتھ کی طرف واقع ہے بعض لوگ تالکٹورہ کے قریب سے روضۂ حُر سمجھتے ہیں جو غلطی ہے اس بارگاہ کو نتھو خاں ٹھیکہ دار نے عہد نصیر الدین حیدر بہادر ۱۸۳۳ء میں تعمیر کیا مولوی منجھلے مرزا صاحب منطقی کی یہاں قبر ہے اور بہت سے قبور عہد قدیم کے ہیں۔

یہاں زیادہ تر ہندوؤں کی بستی تھی عمارت ۱۲۶۰ھ کی تعمیر ہے ماتمی جنتری ۱۳۴۹ھ کے صفحات سے واضح ہوتا ہے کہ داخلہ کے دروازے پر پلاسٹر میں جو قطعہ تاریخ کندہ ہے اس کے پانچ اشعار میں صرف تین شعر باقی رہ گئے ہیں ؎

قبر زہرا و شبیر و سجاد | قبر باقر و جعفر خوشخو
فکر تاریخ چوں در غیب | این ندا آمد بگوش او
اے شبیر حزیں تو روضہ را | ثانی جنت البقیع بگو

دوسری جانب مسجد تھی اور دونوں کے بیچ میں نہایت شاندار امام باڑہ تھا جس میں دو منزلیں رنگ کے بہت بیش قیمت اور مرقع دیواروں پر آویزاں تھے حضرت محمد واجد علی شاہ اس عزاخانہ میں تو تصنیف مرثیہ پڑھتے تھے مسجد اور امامباڑہ کی تعمیر ۱۲۲۹ھ میں ہوئی نتھو کی وفات پر ان کے غیر شیعہ نواسے نے سامان عزا اور تبرکات بیچ دئے اور متعلقہ آراضی ماتا دین بودھ کو بارہ روپے سالانہ لگان پر کاشت کے لیے دی اور خود بمبئی چلا گیا ماتا دین نے عمارت میں مویشی کا چارا رکھنا شروع کیا ربیع الاول ۱۳۱۵ھ میں آراضی امام باڑہ پر پیاس ڈالی گئی اور قبور مومنین گندگی ت آلودہ ہوئے۔ میرذکی الدولہ سید ذکی حسین خاں بہادر نے روکا اور وہ آمادہ فساد ہوا اور قدرت ایزدی سے ۲۰ روز کے اندر تخریب سے باز آیا اور ۹ اگست ۱۸۹۷ء کو اسٹامپ پر اقرار نامہ لکھ کر روضہ نواب کے قبضے میں دیا روشنی، فرش اور جمعرات کی مجلس شروع ہوئی اور نواب کے فرزند سید احمد حسین بھی کرتے رہے اس وقت شیعہ انجمن کی زیر نگرانی ہے اس عمارت کا گنبد موافق تحریر جنتری مذکور تمام قبوں سے لکھنؤ کے اپنی عظمت اور بزرگی میں سبقت لے گیا ہے اندرون عمارت آیات قرآن اور اسماء پنجتن نہایت خوشخط لکھے ہیں اور بیرونی دیوار و در پر بھی طغرے ہیں عمارت استرکاری گرنے سے قابل مرمت اور گنبد شق ہے خوف انہدام ہے۔

باغ:- نشاط باغ وہ مقام ہے جہاں نواب سعادت علی خاں جنوری ۱۷۹۸ء میں مسند نشین ہونے کے بعد کئی برس تک حکومت کرتے

رہے۔ اس باغ کو ٹکیت رائے نے بنوایا تھا۔

ٹکیت رائے کا تالاب

عہد آصف الدولہ میں دیوانی راجہ ٹکیت رائے کایستھ کے سپرد تھی جن کی یادگار راجہ کا بازار ڈیوڑھی آغا میر سے متصل اور یہ تالاب اور نشاط باغ تھے تالاب تاریخی حیثیت رکھتا ہے جو اس وقت تو دب گیا ہے مگر عہد آصفی میں یہاں کی چہل پہل صفحۂ تاریخ پر آج تک باقی ہے آٹھوں کے میلے نے تالاب کو زیادہ سے زیادہ شہرت دی اور یہ جماؤ چیت کے شروع میں اب تک ہوتا ہے رتن ناتھ سرشار نے لکھا ہے کہ اس وقت میلہ میں یہ جماؤ ہوتا تھا کہ گویا پورا لکھنؤ امنڈ آیا ہے راجہ کی اتحاد پروری دیکھو تو تالاب پر ہندوؤں کے لئے سیتلا دیوی کا مندر اور مسلمانوں کے لئے مسجد بھی تیار کی ٹکیت رائے نے ۱۲۱۴ھ آصف الدولہ کی وفات کے دو برس بعد دنیا چھوڑ دی ان کی عمارتیں باقی ہیں اور راجہ کا بازار اسی طرح آباد ہے جس طرح ان کی حیات میں آباد تھا آٹھوں کے میلے میں ناچ رنگ کھیل کود کے ساتھ لکھنؤ کے مصنوعات کی بھی نمائش ہوتی تھی اور وہ چیزیں بکتی تھیں جو کسی بازار میں نہ تھیں اس کے علاوہ شعر و سخن کے نظارے بھی اس میلہ کا امتیازی مقصد تھا بلند طبقے کے شعراء اور اساتذہ تو شرکت نہ کرتے تھے مگر شاگردوں کے ذریعہ ان کا کلام ضرور پڑھا جاتا تھا اور آٹھوں کے میلے کے موقع پر غزلیں بکتی تھیں انشا جس مزاج کے تھے وہ ادبی دنیا پر چھپا ہوا نہیں ہے ان کی شرکت ہوتی تھی مگر نواب سعادت علی خاں میلہ میں نہیں گئے ایک دن کا ذکر ہے کہ انشا نواب کی صحبت سے اٹھنا چاہتے تھے۔ اور سرکار کی جبیں پر شکن آجاتی تھی۔ اس دن کی گفتگو شمس العلماء محمد حسین آزاد کے قلم سے ملاحظہ ہو۔

انشا:۔ غلام کو اجازت ہے۔

نواب:۔ کہاں؟

انشا:۔ حضور آج آٹھوں کا میلہ ہے۔

نواب:۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ

انشا:۔ مناسب تو یہ تھا کہ حضور بھی تشریف لے چلتے۔

نواب:۔ انشا ایسے ناروا مقاموں میں جانا تم کو کس نے بتایا۔

انشا:۔ وہاں جانا تو ایک اعتبار سے فرض عین اور ایک نظر سے واجب کفائی ہے ایک لحاظ سے سنت ہے۔

انشا نے سب صورتوں پر اپنے مزاحیہ انداز سے روشنی ڈالی اور مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔ کون ہے آج سوا سید انشا کے جو کچھ کہے اسے عقل سے نقل سے آیت سے اور روایت سے ثابت کردے نواب نے عاجز آکر کہا قصہ مختصر کرو اور[1] جلدی سدھارو

میلے کا شعراء کے کلام میں بھی ذکر ہے وزیر کہتے ہیں ؎

غمزہ و ناز و انداز و کبر و مہر و لطف و حسن ساتھ یہ اور ایک تم آٹھوں کا میلہ ہو گیا

تالاب میں پانی فراوانی کے ساتھ موجود ہے اور سفید پتھر کے کئی کتبے ہیں جن پر عربی، فارسی، اردو، ہندی میں علیحدہ علیحدہ تاریخیں ہیں حرف اچھی طرح پڑھے نہیں جاتے۔

---

[1] آب حیات ص ۲۹۳

زینبیہ

یہ روضہ تکیت رائے کے باغ نشاط باغ کے سامنے واقع ہے اس کو میر مدد علی عرف اچھے صاحب عیش نے اپنے پیسے سے بنوایا عیش مرزا سلیمان قدر بہادر کے مختار اور رشتہ میں خسر تھے اور عمارت بعد غدر کی ہے داخلہ کے دو پھاٹک ہیں مرد و عورت کے لئے روضہ کے سامنے چوڑا صحن ہے اور ایک مسجد موصوف کی بنوائی ہوئی ہے اصل عمارت سادی مگر شاندار ہے دالان در دالان سے متصل شہ نشین ہے جس میں دروازوں کی جوڑیاں بڑے سلیقے سے لگی ہیں اور عمارت کے دونوں پہلوؤں میں کمرے ہیں شہ نشین میں حضرت زینب ہمشیرہ مظلوم کربلا کی نقل ضریح ہے جو سیاہ پوشش سے ڈھکی ہے پشت پر مزار فضہ کی شبیہ اور برابر والے دوسرے درجے میں جناب سکینہ دختر امام کا روضہ ہے اس کے کٹہرے پر بھی دونوں طرف غلاف چڑھا ہے اوپر ایک بڑا اکہری گنبد ہے اور یہ روضہ ۱۸۷۶ء ۱۲۹۷ھ میں تعمیر ہوا ہے اور مادہ تاریخ "روضہ زینب محبوس ملال" ۱۲۹۷ھ ہے

۴ر دسمبر ۱۸۸۶ء کو بانی عمارت نے عمارت کے پچھواڑے مصارف روضہ کے لئے کچھ زمین بھی وقف کی اور بی بی کی بھانجی مہدی بیگم کو متولی قرار دیا میر مدد علی ۱۲۹۳ھ کے لگ بھگ رحلت کر گئے اور روضہ میں دفن ہوئے ۔ مہدی بیگم کو اس زیارت گاہ سے عشق تھا اور وہ شاہزادہ مرزا سلیمان قدر کی رفیقہ حیات تھیں چنانچہ ۲ مارچ ۱۹۰۲ء کو اپنی جائداد یادلی باغ وقف کیا پھر ۱۳ر نومبر ۱۹۰۲ء کو اپنی تمام جائداد مالیتی پچاس ہزار بحق روضہ وقف کر دی اور ۳ ماہ کے بعد انتقال کر کے اس روضہ میں دفن ہوئیں ورثہ نے آخری وصیت نامہ کو قانوناً ناجائز قرار دے کر توڑ دیا اور پریوی کونسل تک یہ فیصلہ بحال رہا۔

اس سفاکانہ اقدام نے عمارت کے شکست و ریخت کا کوئی ذریعہ نہ رکھا اور روضہ کی حالت مرمت طلب ہو گئی اور اگر کچھ دن یہی حال رہا تو فنا اور بقا کا سوال ہو گا روضہ کے صحن اور درجوں میں قبریں ہیں۔

سب سے چھوٹی مسجد:۔ روضہ کے باہر ایک بہت چھوٹی مسجد ہے جس کو ڈیڑھ گز کے چبوترے پر بنایا ہے چھوٹے چھوٹے محراب دار در ہیں اس کی بنیاد کا سبب یہ تھا کہ ۸ جمادی الآخر کو روضہ میں دلیہ جناب زینب اور ۱۰ صفر کو دلیہ حضرت سکینہ کا جب دن آتا تھا۔ تو میر مدد علی روضہ کی مسجد میں نماز پڑھتے عورتوں کے ہجوم میں نہیں جا سکتے تھے اور عادت مسجد میں نماز پڑھنے کی تھی شوق ثواب میں یہ مسجد صرف دو مرتبہ سال بھر میں اپنی نماز پڑھنے کے لئے بنوائی یہ تیرہویں صدی کی آخری عمارت ہے اس کے بعد کوئی عمارت چہاردہ معصومین کے روضوں کے نام سے اس عہد میں نہیں بنائی گئی قدم رسولؐ تو بستہ سے پہل ہوئی اور مزار سکینہ پر ختم ہوا۔

کربلائے حاجی مسیتا

یہ کربلا الماس علی خاں کی کربلا تعمیر ہونے کے بعد نواب سعادت علی خاں بہادر کے اشارے پر بنائی گئی اور کربلائے تالکٹورہ کے جانب جنوب واقع ہے ولایتی محل (۳)، نواب مخدرہ علیا کے بھائی نواب امیر مرزا خاں نے اسی کربلا میں اپنا امامباڑہ تعمیر کرایا تھا اور بعد انتقال وہ اور ان کے بیٹے نواب مہدی علی خاں عرف نواب منجھو صاحب آنریری مجسٹریٹ ساکن گھسیاری منڈی اس کربلا میں دفن ہوئے سلاطین اودھ کے سیرت نگار شیخ تصدق حسین حنفی کربلا مذکور کے حال میں لکھتے ہیں " راقم السطور نے اس کربلا کو ۱۹۳۰ء میں دیکھا تھا ۔ عمارت چاروں طرف سے کھلی ہوئی بارہ دری کی شکل کی تھی اور بالکل بے مرمت پڑی تھی بلکہ جا بجا سے مع چھت کی ڈاٹ کے شق بھی ہو گئی تھی کوشوں اور جدولوں میں آیات قرآنی مسالہ سے نہایت نستعلیق تحریر میں اور رنگ آمیزی بھی نہایت دلکش تھی اس کربلا کا خاص

طورسے قابل تذکرہ ایک پورے قد کا بیٹھا ہوا چوبی اونٹ تھا جس کو کسی ہوشیار کاریگر نے اصل سے مشابہ بنایا تھا اونٹ کے دونوں جانب کجاوے تھے اور پشت پر نہایت خوبصورت چوبی ضریح رکھی تھی اب یہ عمارت بالکل منہدم ہوگئی ہے حاجی میتا ایک سنی المذہب کشمیری مسلمان تھے ان کا سہ منزلہ مکان میر باقر سوداگر کے اماباڑے کے سامنے جوہری محلہ میں تھا اور اسی سے متصل موجودہ چھتہ کے مقابل ایک چھتہ بھی تھا جو حاجی میتا کا چھتہ کہلاتا تھا اب نہ وہ مکان باقی ہے نہ وہ چھتہ ۔ حاجی میتا کے ایک بیٹے میاں جعفر تھے جن کے دو بیٹے محسن علی، اکرم علی تھے ان دونوں نے لاولد انتقال کیا اور حاجی میتا کی نسل منقطع ہوکر ان کا گھر بے چراغ ہوگیا۔

کربلا الماس علی خاں

نواب سعادت علی خاں بہادر جنوری ۱۷۹۸ء میں تخت نشین ہوئے ایک روز آموں کے باغ سے سواری گذر رہی تھی اور اس مقام پر پہونچی جہاں مستقبل میں میر خدا بخش کی کربلا بننے والی تھی صبح کا سہانا وقت اور نواب اودھ کے دینداری میں ڈوبے ہوئے تخیلات ۔ جناب عالی نے نواب قاسم علی خاں پسر نواب سالار جنگ برادر زادہ نواب بہو بیگم صاحبہ سے فرمایا کہ اگر اہل شہر بجائے سیتہ پر تعزیہ دفن کرنے کے یہاں دفن کریں تو یہاں صحرائیت زیادہ ہے پس بموجب ارشاد نواب پہلے قاسم علی خاں نے چوبی جنگلے کا ایک چھوٹا سا حصار بنوا کر وسط چبوترہ میں بہت سے تبرکات مشاہد مقدسہ دفن کئے اور اپنی مجلسیں بھی وہیں کرنے لگے خود مرثیہ پڑھتے تھے پلاؤ تقسیم ہوتا تھا شہر کے قریبی مواضعات الماس علی خاں کی عملداری میں تھے چنانچہ بحکم سعادت علی خاں بچاس بیگہ آراضی پختہ کا حصار کرکے کربلا کے لئے ایک خاص رقبہ علیحدہ کیا جس میں دو درجوں کا انتظام تھا اور دالان کی لمبان تخمیناً سو گز قرار دی۔ پہلے درجے کے بیچ میں تعزیہ اور منبر تھا اور دوسرے درجے میں فرش عزا تھا جس پر سامعین گذرتے اور مجلس و ماتم ہیں یہ جگہ استعمال ہوتی اس عمارت کا نقشہ حاجی میتا داروغہ تعمیرات نے تیار کیا تھا اور مٹی جو ایک مقام سے کھود کر دیواریں بنائی گئیں تو وہ گڑھا مثل تالاب کے ہوگیا اس لئے یہی کربلا تالکٹورہ کی کربلا مشہور ہوئی اور یہی کربلا بھی تھی اس کے بعد حاجی میتا نے اور پھر میر خدا بخش نے کربلائیں بنوائیں اور تالکٹورہ کا نام میر خدا بخش کی کربلا سے مخصوص ہوگیا۔

کربلا الماس علی خاں ہیں میاں حیدر بخش کا تالاب کے کنارے تعمیر کردہ ایک بڑا کمرہ بھی تھا اور اس کربلا کی بنیاد کے بعد شہر کے ہزاروں مرد و زن جمع ہونے لگے اور مرکزیت قائم ہوگئی۔

نہر غازی الدین حیدر بہادر

نجم الغنی مورخ اودھ ناقل ہے کہ راجہ بختاور سنگھ کی تحریک پر نصیر الدین حیدر بادشاہ نے نہر گنگ بنوانا شروع کی اگر گنگا کا پانی لکھنؤ تک آجاتا تو یہاں کی تجارت اور زراعت کو بہت کچھ ترقی ہوتی ۔ افسوس ہے کہ اس کام کے لئے کوئی ماہر فن انجینئر نہ ملا اور کام[۱] ناقص رہا۔

یہ بیان بھی نجم الغنی کا حقیقت سے بے خبری کی ایک دلیل ہے نہر غازی الدین حیدر بہادر کی رعایا پروری کا ایک نقش تھا مگر ۲۸ کوس سے پانی کاٹ کر لانا آسان کام نہ تھا لکھنؤ کی زمین گنگا سے ۲ فٹ بلند واقع ہوئی ہے پست مقام سے بلند مقام پر پانی لانے میں انجینئر کامیاب نہ ہوا اور چھ لاکھ روپیہ راجہ کا صرف ہوا معتمد الدولہ نے اس رقم کو ادا نہ ہونے دیا اور راجہ نے کہا کہ یہ رقم میں نے

---

[۱] تاریخ اودھ ج ۲ ص ۲۴۳

گنگا جی کی نذر کردی اٹھائیس ہزار بیگہ زمین کی زراعت میں ناکامی ہوئی ٹھیکیداروں کو فائدہ ہوا جن کے سپرد یہ خدمت ہوئی تھی یہ نہر بنارسی باغ کے مشرق اور ہیولاک روڈ کے متوازی جنوبی حصہ شہر سے تالکٹورہ تک پہونچتی ہے سوائے موسم بارش کے اس کی زمین ہمیشہ خشک رہتی ہے برسات میں پانی نالہ کی طرح بہتا رہتا بزمانہ حکومت نصیرالدین حیدر میں میجر ڈیوڈسن کو اس کام کے خراب ہوجانے کا افسوس تھا چار باغ اسٹیشن کی جدید تعمیر کے بعد سے نہر کا وہ حصہ جو چار باغ کے حدود میں ہے ریلوے کی طرف سے پختہ اور دونوں طرف سے ہموار کردیا گیا اور بارش کا پانی آسانی سے گزر جاتا ہے۔

کربلائے میر خدا بخش (تال کٹورہ)

یہ کربلا شہر کی آبادی سے دور جانب مغربی و جنوبی گوشہ موضع گڈھی کٹورہ میں واقع ہے جس کو ہر چند پور کٹورہ بھی کہتے ہیں گزشتہ بیان سے معلوم ہوا ہو گا کہ لکھنؤ میں جو کربلائیں ہیں ان میں پہلا نمبر کربلا الماس علی خاں اور دوسرا کربلائے حاجی میتا کا ہے کربلائے میر خدا بخش تیسری کربلا ہے جو عہد غازی الدین حیدر ۱۲۳۲ھ میں بنی پہلے کے بیان میں یہ بھی گذرا کہ حاجی میتا کی کربلا "کربلائے تالکٹورہ" کہی جاتی تھی اور اسی کی شہرت نے جبکہ وہ باقی بھی نہ رہی میر خدا بخش کی کربلا کو کربلائے تالکٹورہ مشہور کیا اگر یہ وجہ تالکٹورہ نام قرار پانے کی نہیں ہے کہ عمارتی ضرورت میں مٹی کا صرف کیا جانا ایک تالاب ہوجانے کا سبب تھا تو یہ وجہ بھی ہو سکتی ہو کہ لفظ درحقیقت تھال کٹورہ ہو جیسا کہ میرٹھ کی غدر پر سہارنپوری گوجر عورتیں جو گیت گاتی تھیں ان میں ایک شعر یہ ہے ؎

لوگوں نے لوٹے تھال کٹورے   میرے پیارے نے لوٹے گلاس   (عوامی گیت ص۹۹)

میر خدا بخش کو میاں آفریں علی خاں خواجہ سرائے آصف الدولہ کی سرکار میں فروغ حاصل تھا اور وہ میر صاحب کو اولاد کی طرح سمجھتے تھے وہ اہل علم اور فضلائے روزگار سے تھے غفرانمآب شیعہ مجتہد ؒ ان کے استاد تھے اس کربلا کی تعمیر کا سبب یہ ہے کہ میر خدا بخش کی ایک چھوٹی لڑکی قضا کر گئی اور کربلائے الماس علی خاں میں دفن ہوئی اس سلسلے میں موصوف نے ایک قناتی مسجد بنوادی اور عشرہ کے دن وہیں اعمال کرنے لگے اثنائے عمل عاشور میں کربلا بنوانے کا خیال ہوا اور تیس بیگہ پختہ اراضی کپتان حسن علی سے لے کر ۱۲ رجب ۱۲۳۲ھ کو معرفت میر صادق علی زائر تعمیر شروع کر دی اور چھ مہینے میں محرم تک کربلا بن کر تیار ہو گئی۔ روضہ کے مغربی دروازے پر قطعہ تاریخ کندہ ہے ؎

مقتل اطہر حسین شہید   شدہ تاریخ ایں خجستہ بنار   ۱۲۳۲ھ

درزمان وزیر ابن وزیر   غازی الدین حیدر آصف جاہ

رفعت الدولہ بحر جود و سخا   روز افزوں جلال او بادا

زیر ظلہ حمایتش باشد   شد خدا بخش سیدش بانی

عز و جاہ آفریں علی خاں را   جاں نثار جناب آل عبا

کربلا میں داخلے کے تین پھاٹک ہیں مثل ترپولیہ جانب مشرق تعمیر ہیں بیرونی حصہ پر مصالحہ سے کچھ لفظیں بھی لکھی ہوئی تھیں جو کہ سفیدی پھر جانے سے اب پڑھی نہیں جاتیں صدر پھاٹک کے اندر ایک وسیع صحن ہے جس کے آخر میں جانب مغرب روضہ کی غلام گردش ہے کیوان

؎ نجوم السماء مطبوعہ مجمع جعفری

جاد کا امام باڑہ اور بے چھت کی مسجد جو عید گاہ کی نقل معلوم ہوتی ہے علیحدہ عنوان میں بحث ہو گی روضہ میں زائرین عموماً جنوبی دروازہ سے داخل ہوتے ہیں اسی راستے کی جانب جنوب دوسری قناتی مسجد جس کے آگے جانب غرب ایک کمرہ مع سبیل ہے جس کی بغل میں پھر تیسری قناتی مسجد ہے مشہور ہے کہ یہ کمرہ میر فضل علی اعتماد الدولہ وزیر اعظم شاہ نصیر الدین حیدر نے بخیال ادب و احترام کربلا حقہ نوش کرنے کے لئے بنوایا تھا۔ اس کے آگے چبوترہ پر سبیل رکھی جاتی ہے روضہ کے پختہ احاطے میں داخل ہونے کے لئے چند دروازہ ہیں پہلا اور دوسرا جنوبی رخ پر درِ حسینیہ یعنی زنجیری دروازہ پھر اس کے جانب غرب ۵۰ قدم پر درِ حاجت تیسرے مغرب کی طرف کا پھاٹک درِ قبلہ چوتھا جانب شمال درِ عباسیہ پانچواں دروازہ درِ زینبیہ ہے روضہ کے چاروں طرف نہایت عمدہ صحن ہے جس کی ہر طرف غلام گردش اور داخلہ کے دروازہ میں غلام گردش کی صحنچیوں کی روکار پر مصالحہ سے آیات قرآن و زیارت تحریر ہے روضہ میں صرف ایک حجرہ ہے جس میں ضریح اقدس ہے اور پہلو میں گنج شہیداں کا ایک رخ خفیرہ بالین سر مجلس کے لئے ایک مختصر جگہ اور چھوٹا سا منبر، چھت گول گنبد دار ہے اندرونی در و دیوار پر آیات قرآن، اسمار الٰہی بخط طغرا لکھے ہیں رواق کے شمال و مشرقی گوشے میں بانی کربلا کی قبر ہے جس پر کوئی کتبہ نہیں ہے بالائی حصہ میں ایک سنہرا گنبد ہے جس کے آگے عراقی وضع کے دو گلدستے ہیں ان کی چوٹیوں پر سنہری گمزیاں اور کلسیاں ہیں روضہ کے جانب جنوب بھی عراقی وضع کا ایک بلند گلدستہ برائے اذان تعمیر ہے روضہ کے مغربی دروازے سے جانب چپ ایوان اعتماد الدولہ ہے انہوں نے فتح گڈھ میں انتقال کیا تھا اور لاش لکھنؤ لا کر دفن کی گئی اور ان کی وصیت کے بموجب ان کے زر مملوکہ سے قبر بنا کر ایک ایوان تعمیر ہو گیا۔

چہلم اور عشرہ کے دن ہر ماتمی انجمن اسی جگہ ماتم کر کے علم بڑھاتی ہے اور سادے دنوں میں اس ایوان میں مجلسیں ہوتی ہیں۔

نیاز فتحپوری لکھتے ہیں رجب کی نوچندی ہے تالکٹورہ کی کربلا میں ماتم داران حسین جمع ہیں لوگ چھت پر کھڑے ہوئے آنے والوں کی سیر دیکھ رہے ہیں اسی وقت اتفاق سے ایک برقعہ پوش طویل القامت عورت آتی ہوئی دکھائی دی جس کے برقعہ میں ہوا بھری ہوئی تھی اس ہیئت کو دیکھ کر ایک صاحب نے پھبتی کسی کہ "ارے بھائی دیکھنا یہ حسین آباد کا غلاف پوش جھاڑ کون لے آیا"! خود میری موجودگی میں رجب کی ایک نوچندی کو صحن کربلا میں علموں کی زیارت کے لئے لوگ جمع ہیں مولوی عابد علی عرف ننھے مرزا صاحب نے ایک نئی قبر پہ نظر کی جو مختلف رنگ کے پتھروں سے ٹکڑے کی شکل میں بنی تھی بے ساختہ کہا۔ کیا چتھڑی قبر ہے۔

یہ واقعات ذہن کے ہر وقت حاضر رہنے کی دلیل ہیں اور جذبات غم میں بھی جودت طبع ساتھ نہیں چھوڑتی۔ مولوی صاحب عتبات عالیات کی زیارت سے واپس ہو کر کراچی میں رحلت کر گئے اور علی باغ قبرستان میں دفن ہوئے۔

خیمہ گاہ:- یہ عمارت احاطہ کربلا کے باہر ایک بلندی پر واقع ہے اور پچھم کی طرف ہشت پہل درجہ ہے جس پر بڑا سا گنبد ہے زیر قبہ کچھ تعزیہ اور چوبی ضریح ہے۔

عہد شاہی میں سب کربلائیں آباد اور شیعہ پبلک کے اژدہام سے بروز عاشور چھلکتی تھیں بانیان کربلا یا ان کے ورثہ جن کو کربلا کے فروغ میں کاوش بھی موجود تھے اور ہر شخص کا حلقہ اثر اپنی کربلا کی سمت روانہ ہوتا تھا غدر ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے اعلان کیا کہ تمام تعزیہ کربلا میر خدا بخش جائیں اور سب کربلاؤں میں بیک وقت پولیس کا انتظام نہیں ہو سکتا یہ حکم اس کربلا کی مرکزیت اور دوسری کربلاؤں کی بے رونقی کا سبب ہوا شیعہ سنی مسلم و ہندو سب اپنے تعزئے دسویں محرم اور ۲۰ صفر کو اسی جگہ لاتے تھے۔ ۱۹۰۵ء سے

سنی شیعہ فسادات کے موقع پر سنیوں نے اپنی دوسری کربلا بھول کٹورہ میں قرار دی۔ بانی کربلا کی اولاد جرول کنتور وغیرہ میں موجود ہے میر خدا بخش نے بڑی سلامت روی کی چال اختیار کی باس میں قدیم وضع کا جامہ ہوتا اور سفید پوش رہتے میانہ میں سوار ہوتے سواری میں صرف ایک یا دو میواتی (نو مسلم) پٹھان ساتھ رہتے ان کی صحبت کا رنگ وزراء کے دربار کی طرح تھا۔

داروغہ ظل حسین زیدپوری اور ان کے شاگرد میر حبیب اللہ خوشنویس میر خدا بخش کے طرز زندگی کی تحسین علی خاں خورد خواجہ سرا نے اپنے بیانات میں بڑی شکایت[1] کی ہے

سلطنت اودھ کے ضبط ہونے پر روز معزولی شاہ انگریزوں نے عالم باغ سے تالکٹورہ تک فوجیں آراستہ کردی تھیں یہ سمجھتے ہوئے کہ یہاں بڑا معرکہ ہوگا۔

امامباڑہ کیواں جاہ :۔ تالکٹورہ کی کربلا سے پہلے پھاٹک سے گزر کر امامباڑہ داہنے ہاتھ پر واقع ہے اس کے بانی مرزا امجد علی کیواں جاہ تھے جو ملکہ زمانی کے پہلے شوہر کی اولاد تھے۔ عمارت اوسط درجے کی بہت خوبصورت اور نقشہ دیدہ زیب ہے مگر مکان بے مکین ہونے سے عمارت ختم ہو رہی ہے کیواں جاہ کی قبر بھی اسی امامباڑہ میں ہے انہوں نے ہیضہ میں انتقال کیا تھا۔

سلطان دولہن صاحبہ :۔ خاندان شاہی کا ایک معزز رکن رقمطراز ہے[2]۔ نواب افضل الدولہ سید احمد حسین خان بہادر کی صاحبزادی اور میری حقیقی دادی جان تھیں عہد واجدی کی تھیں ۱۹۱۶ء میں انتقال فرمایا کربلائے تالکٹورہ میں دفن ہوئیں میں نے آج تک ایسی نفیس اور پاکیزہ اردو زبان کسی کو بولتے نہیں سنا جیسی دادی اماں مرحومہ کی زبان تھی اور نہ اس لفاست اور پاکیزگی سے کسی کو کھانا کھاتے دیکھا مجھے حسرت رہ گئی کہ کبھی تو نوالہ بنانے میں انگلیوں کی دو پوروں سے زیادہ جناب مرحومہ کی بھری ہوں ایک مرتبہ مرحومہ نے کیتھے کے کباب ایجاد کئے اور جناب بڑے چچا صاحب قبلہ کی معرفت نواب باقر علی خاں صاحب رئیس شیش محل کو بھجوائے۔ نواب نے نوش کئے مگر مطلق نہ پہچان سکے کہ کباب کاہے کے تھے وہ یہی سمجھے کہ ماہی تولے کے گوشت کے کباب ہیں۔ بڑے چچا صاحب سے اصلی کیفیت معلوم ہوئی تو فرمائش کرکے دوبارہ پکوائے اور کھائے ان کبابوں کے پکنے میں پندرہ سولہ گھنٹے صرف ہوتے ہیں لیکن گھی نہایت عمدہ ہونا چاہئے۔ اور زیادہ بھی صرف ہوتا ہے۔

کربلائے عظیم اللہ خاں

اعظم الدولہ عظیم اللہ خاں، محمد علی شاہ بادشاہ کے خط تراش تھے دولتمندی اور فیاضی کا یہ عالم تھا کہ سواری کے وقت سیکڑوں روپیہ محتاجوں کو بانٹ دیتے تھے ان کی اولوالعزمی نزاکت مزاج، لفاست طبع کی سیکڑوں حکایتیں زبانوں پر ہیں۔ بادشاہ کی بارگاہ میں انتہائی تقرب تھا تحسین علی خاں خورد کی ضبط شدہ جائداد آپ ہی نے حضرت فردوس منزل سے ابو تراب[3] خاں کو دلوادی تھی۔

شیخ تصدق حسین صاحب وکیل لکھتے ہیں کہ ایک قلمی تصویر عظیم اللہ خاں کی نظر سے گذری جس میں چہرہ گول بھرا ہوا رنگت سانولی مائل بہ تیرگی، خط بنا ہوا مونچھیں کتری ہوئی، آنکھیں کسی قدر بڑی، جسم گداز گٹھا ہوا، سر پر لٹودار پگڑی گلے میں جامہ وار کی کلی دار اچکن کاندھے پر شالی رومال، پیروں میں غرارہ دار پجامہ اور گھیتلا جوتا۔ یہ کربلا فرقہ امامیہ کے آٹھویں امام رضا کے مزار واقع خراسان ملک ایران کی نقل ہے عمارت سربلند اور دوسری کربلاؤں سے کسی طرح کم نہیں ہے روضہ کے چاروں طرف غلام گردش صحن میں پکیسی

---

[1] ذات یقین [2] قدیم نمبر ۱۵ [3] ذات یقین مخطوطات

کی طرح نہر ہے جو ان کے جراح ہونے کی طرف اشارہ ہے جراح کے پاس مرہم کی ڈبیا ایسی ہی ہوتی ہے جس میں برابر برابر خانہ کسی میں لال مرہم کسی میں زنگاری کہیں سفید یا زرد جانب غرب مسجد ہے جس میں پتھر کا خوشنما حوض ہے اور مسجد گوہر شاد کی نقل ہے دوسری مسجد بھی باہر واقع ہے عظیم اللہ خاں نے ۲ رجمادی الآخر ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۸۴۹ء میں انتقال کیا اور اپنی کربلا میں سپرد خاک کئے گئے۔ ظریف نے اپنی مشہور نظم "نشتر غمزہ" میں ایک صاحب پر بڑی لطیف نکتہ چینی کی تھی جو زبان زد بھی ہے اور ظریف کے کلام میں بھی موجود ہے ؎

بہت خفیہ عظیم اللہ خاں سے ان کا رشتہ ہے ۔۔۔ وصیت نامہ کی رو سے یہی حقدار بیٹھے ہیں

پٹہ بازکی مسجد

لکھنؤ پٹہ بازوں کا مرکز تھا علی مدرستم خوانی بنوٹ بانک جاننے والے گلی گلی تھے عہد غازی الدین حیدر میں پٹہ باز خاں خطاب کے ایک شخص تھے اور کہا جاتا ہے کہ علی مد کے موجد تھے یہ مشہور ہے کہ نومسلم تھے۔ شریفوں کے سوا پست طبقے کو فن نہیں بتاتے تھے ان کے تمام شاگرد معزز خاندان سے تھے۔ عبدالحلیم شرر کہتے ہیں کہ ان کی مسجد دھنیا مہری کے پل کی طرف ہے عالم نگر سے متصل لیکن ان کا بیان صحیح نہیں ہے اور بظاہر بغیر دیکھے ہوئے قلم اٹھایا ہے میں نے اس مسجد کو بچشم خود دیکھا ہے اور تالکٹورہ سے چار باغ کے راستے میں عظیم اللہ خاں کی کربلا سے ہٹ کر بلندی پر موجود ہے اور پشت جدار مسجد پر گتکا بنا ہوا ہے مسجد بڑی نہیں ہے گتکا اس لکڑی کو کہتے ہیں جس سے شمشیر زنی کے بجائے فن حرب کی تعلیم دی جاتی ہے اس کی ضرب روکنے کے لئے بجائے سپر کے پھری لڑنے والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو سرکیوں سے تلے اوپر مدور بنائی جاتی ہے اور بیچ میں دستہ کی جگہ روئی کی گدی پر ہاتھ کی گرفت کی جگہ اور دور میں چرمی گوٹ ہوتی ہے۔ منشی اسیر کہتے ہیں ؎

کہیں پٹے کی کسی جا رہے بانک کی کثرت ۔۔۔ وہ جست و خیز وہ چوٹیں کہ عقل ہے حیران

کربلائے امین الدولہ

اس جگہ کا نام دریا گنج تھا نواب امین الدولہ امداد حسین خاں عمدۃ الملک وزیر اعظم محمد علی شاہ نے عہد اختری ۱۲۶۶ھ میں بڑی اولوالعزمی سے یہ روضہ بنوایا اس کا سنگ بنیاد سلطان العلماء سید محمد صاحب مجتہد العصر والزمان نے اپنے ہاتھ سے نصب کیا اس کے ساتھ سو بیگہ اراضی قبروں کے لئے بھی وقف کی ہے۔ واجد علی شاہ بادشاہ عشرہ اور چہلم کے دن دو مرتبہ یہاں آتے تھے امین الدولہ کو طبقہ شیعہ میں "امین الملۃ والدین" کہا جاتا تھا اور بادشاہ کی طرف سے ذوالفقار جنگ کا خطاب تھا جو اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

اے شان حیدری ز جبین تو آشکار ۔۔۔ نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار

امین الدولہ راتیں عبادت خدا میں جاگ کر بسر کرتے تھے۔ اس کربلا کا قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

ان وزیر امین دولہ قیصر ۔۔۔ لبنی شبیہ مزار خیر الناس
قد خوطب الکیوان فی تاریخہ ۔۔۔ قل انّ ھذا مرقد العباس

اس عمارت کی دیواروں پر آیات قرآن نہایت پختہ خط میں لکھے ہیں رنگ آمیزی اور نقش و نگار بڑے دیدہ زیب ہیں

روضہ کے چاروں طرف صحنچیاں ہیں جن میں معززین کی قبریں ہیں چاروں طرف چار پھاٹک ہیں غسلخانہ اسی دیوار سے متصل ہے گنبد کی کھت میں چوبی ضریح اور تبرکات ہیں جن میں قدم رسولؐ بھی ایک یادگار ہے قدیم زمانے کی فرش زمین رنگین پتھروں سے آراستہ ہے اول الذکر تاریخ پتھر پر نمایاں جگہ روکار میں نصب ہے اور فارسی تاریخ کربلا کی جو واقعہ نگار نقل کرتے ہیں یہ ہے سے

امین الدولہ نواب فلک جاہ — کردو دو الفت آل پیمبر

بنا فرمود چوں درگاہ عباس — سلام حق بر وتا روز محشر

چنیں تاریخ سالش گفت ہاتف — بنا شد خواب گاہ ابن حیدر ۱۲۶۶ھ

مولانا احمد علی صاحب محمد آبادیؒ جو بڑے ذی علم اور پیکر کمال تھے امین الدولہ کے بیٹوں کو پڑھاتے تھے اس توسل کی وجہ سے ممدوح نے جب اس دنیا کو خیرباد کہا تو کربلا میں دفن ہوئے قطعہ تاریخ یہ ہے سے

امسال زحکم قضا رفتہ سوئے دار بقا — حاجی و سید صالح الاعمال میر متقی

جعفر بگفتم مصرعہ تاریخ بہر رحلتش — علامہ زمن خلد مسکن مولوی احمد علی ۱۲۹۵ھ

دیوپور (جلال پور)

یہ موضع بھی تالکٹورہ کے گرد و نواح میں ہونے سے اس سلسلے کی ایک مستحکم کڑی ہے دیوپور کو شاہ غازی الدین حیدر نے حکیم مرزا علی خاں کے نام معاف کیا تھا وہ طبیب شاہی کے منصب پر مامور اور حکیم الملک کے خطاب سے سرفراز تھے ان کے بعد ان کے بیٹے حکیم مرزا علی حسن خاں اس منصب پر سرفراز ہوئے اور شاہ اودھ نے ان کو سلطان الحکما حیوۃ الملک مسیح الدولہ بہادر جاوید جنگ خطاب دیا اور آپ ۱۸۵۶ء میں سفارت شاہی کے عہدہ پر بھی متمکن تھے ان کے صاحبزادے کا نام تھا حکیم مظفر حسین خاں ان کو کتابوں کا شوق تھا اور کتب خانہ ان کا شہرۂ آفاق تھا۔

عالم باغ

کان پور روڈ پر واقع ہے اور مدتوں ویران رہنے کے بعد اب آباد ہوا ہے اس باغ کو آخری تاجدار اودھ نے اپنی ملکہ عالم آرا خاص محل کے لئے بنوایا تھا اس کے نقوش اجڑی ہوئی صورت میں اب بھی موجود ہیں باغ کے گرد چار دیواری تھی اور قصر ملکہ دو منزلہ عمارت کی صورت میں تھا بعد انقلاب سلطنت یہ باغ ضبطی میں آگیا۔ خاص محل نے اس کی واگذاری کے لئے درخواست دی۔ اور عذرداری کی جو مسموع نہ ہوئی غدر میں عالم باغ کی لڑائی بہت نمایاں واقعہ ہے۔ راجہ مان سنگھ باغیوں کا نمائندہ بن کر پہلے گئے آئے تاکہ بادشاہ کو راضی کرکے چپکے سے لکھنؤ لائے بادشاہ نے ملنا منظور نہ کیا اور باریاب ہونے کی ممانعت کی ادھر مبارک پور کے سپاہی بھی جو کلکتہ میں تھے چاہتے تھے کہ شاہ کلکتہ میں ان کی قیادت کریں لیکن وہ اپنی استقامت رائے پر باقی رہے مان سنگھ وہی ذی کیش ہے جس کی بیٹی برج راج کنور کی شادی جب بابو نرسنگھ نرائن کے ساتھ ہوئی تو ایک پورا موضع جہیز میں دربار اودھ سے عنایت ہوا تھا اور اس لڑکی کو اپنی بیٹی تصور کیا تھا۔

۵ دسمبر ۱۸۵۷ء وہ دن تھا کہ افواج باغیہ اور دیگر اہل شہر و بیرون جات بھی تو اس روز آمادہ پیکار تھے اور عالم باغ کا رخ

لہ تذکرہ بے بہا

تھا راہ میں کثرت انبوہ سے جگہ نہ ملتی تھی امین الدولہ کے مکان میں راجہ نواب علی خاں محمود آبادی جو نبی بخش خاں کے ماموں ہوتے تھے. فروکش تھے راجہ صاحب نے ان تینوں بھائیوں کا بعزم جنگ عالم باغ کی طرف جانا سن فرط لغت سے بیتاب ہو کر پھاٹک ہی جو سرِ راہ تھا آگئے ان لوگوں کو بہت اصرار اور تدبیر سے روکا اور سمجھایا کہ یلی گارد کی مورچہ بندی اور بات تھی اب کھلے میدان کی لڑائی ایسی باقاعدہ فوج سے آسان نہیں ہے الغرض کچھ نہ ہوا یہ لوگ آگے بڑھے بنڈ منہ کے ناکے کے قریب پہونچکر یہ ارادہ تھا کہ ہر کے پل سے آگے نکل کر مقابلہ کرنا چاہئے مگر ہجوم بسیار و انبوہ بے شمار سے راہ میں مرور دشوار تھا اس مقام پر ایک پختہ باغ تھا کے زیر دیوار کھڑے ہوئے ہمراہیوں کو داہنی طرف جو گلی تھی اُدھر اس غرض سے بھیجا کہ دیکھیں اگر راہ صاف ہو تو اس طرف سے نکل چلیں ان لوگوں کا ادھر جانا ادھر کیا دیکھتے ہیں کہ وہی انبوہ کثیر و جم غفیر جوشِ نبرد میں نعرہ کناں و رجز خواں ناکہ پر جا رہا تھا نہایت بیتابی اور بدحواسی سے بھاگا آتا ہے اور اس کے ریلے میں انسان کیا پہاڑ ہو تو رک نہ سکے آخر کچھ چارہ نہ ہوا بیلداران ہمراہی سے دیوار کھدوا کر ایک جانب سے باغ میں داخل ہوئے دوسری جانب سے اس سڑک پر نکلے جو زیر دیوار باغ نہر کے پل پر گئی تھی۔ گھوڑے تو باغ کے باہر ہی چھوڑ دینا پڑے پر اب سامنے سے دیکھا کہ اسی سڑک پر مفرورین تنگی راہ سے بالکل منہ کے بل گرے پڑتے اور صف بر صف پڑے ہیں ان کی پشت پر گورے اپنی سنگینیں اس طرح مارتے ہیں جیسے کہ درخت چلتا ہے ایک کی پشت کو توڑ کر دوسرے کی پشت تک پہونچتی ہے نیچے کی صف والے سینے کے بل زمین پر گھسٹ گھسٹ کے نکل نکل کر بھاگتے جاتے ہیں۔

عالم آرا بیگم بہت بڑی ادیب اور شاعر تھیں ان کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نہیں ایک وضع پر جہاں کا رنگ — عارضی ہے فقط یہاں کا رنگ

خود غرض ہوتے ہیں جہاں کے دوست — جب غرض نکلی پھر کہاں کے دوست

عالم باغ کی خصوصیات تاریخی میں یہ بھی ہے کہ بعد فتح دہلی جب ہڈسن شریک معرکہ عالم باغ ہوئے اور دلکشا سے دلی دروازہ کی طرف اور حضرت گنج جانا چاہتے تھے کہ مارے گئے عالم باغ میں ان کی قبر ہے۔

بودہ علی شاہ کا تکیہ: دہ تالکٹورہ سے کانپور کی راہ پر پڑتا ہے شہر کے طول و عرض اور قدیم حدود آبادی کی تحت میں اس مقام کا نام نظر آتا ہے۔

پانچواں باب

مرزا منڈی سے موہنی کے پُروہ تک

ناظرین! یاد کیجئے کمپنی باغ سے ہم نے قلم اٹھانے میں ابتدا کی تھی اور اب چوتھے پھیرے میں پچھم لکھنؤ کے عمارات پر بحث مطلوب ہے یہ خطہ روح لکھنؤ اور شہر کی جان تھا صاحبان کمال کا یہی مسکن تھا۔

سلہ آثار یادگار ص۲۲

مرزا منڈی

مرزا منڈی کی بنیاد مرزا سلیم کے ہاتھ سے ہوئی جو تخت نشین ہو کر نورالدین جہانگیر کے لقب سے شہرت پذیر ہوا۔ باپ کی زندگی اور اپنی ولیعہدی میں یہ محلہ آباد کیا یہ محلہ مچھی بھون سے جانب[1] غرب واقع ہے گول دروازہ سے حسین آباد مبارک جاؤ تو داہنے ہاتھ کی طرف یہ محلہ ہے نام کی شان بتاتی ہے کہ کبھی ترکاری بکتی تھی اب سبزی فروش ایک بھی نہیں ہے کچھ پرانی عمارتیں اور آثار دورِ رفتہ پر توجہ دلانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

نال دروازہ

میں سمجھتا ہوں کہ نعل دروازہ صحیح ہے اور نعلبندی ٹولی کی طرح یہ مقام بھی گھوڑوں کے نعل درست کرنے سے اس نام سے موسوم ہوا یہاں شرف الدولہ کا مکان تھا اور غدر میں وہ اسی مکان میں پھاٹک بند کر کے بیٹھ رہے تھے اور خان علی خاں فوج باغی کے ایک سردار کو ملا کر پانچ سو روپیہ دے کر دو سوار اپنی حفاظت کے لئے مقرر کرائے تھے مگر فوج باغی گھر لوٹنے آپہونچی اور تلنگوں نے یہ الزام لگا کر محمود خاں کوتوال اور انگریزان کے گھر میں چھپے ہیں دھڑا دھڑ گولیاں مارنی شروع کر دیں۔ غلام رضا کے سپاہی بھی رندوں سے گولیاں چلانے لگے تلنگے موت کے گھاٹ اترے۔ جب یہ خبر اختری پلٹن کو ہوئی تو اسی وقت نادری پلٹن کے ساتھ گھر کھودنے آگئے ادھر غلام رضا خاں نے ہزار روپیہ اپنی وکیل کی معرفت برکات احمد رسالدار کو بھیج دئے اور کہلا بھیجا کہ میری جان اور آبرو بچایئے اور احمد اللہ شاہ کے پاس بھی نذر اور ایک تاج بھیجا رسالدار نے روپیہ لے کر تلنگوں کو منع کر دیا اور رفع شر ہوا ایک مہینہ کے بعد شرف الدولہ کسی صورت سے مموخاں داروغہ دیوان عام مرزا برجیس قدر اور داروغہ میر واجد علی تک پہونچے۔

ساہ جی کی ڈیوڑھی

ساہ جی فرخ آباد کے رہنے والے تھے پیشہ ساہوکاری تھا۔ تاریخ اودھ میں ان کے نام کا تذکرہ ہے ایسا مخیر شخص ہندو دھرم میں کم گذرا ہوگا خیر و خیرات میں پیسہ صرف کرنا شغل زندگی تھا۔ حضرت محل نے جب قیصر باغ چھوڑا تو نال دروازہ میں رہیں۔ شرف الدولہ عاقبت اندیش تھے انجام پر نظر کر کے عرض کیا کہ یہاں سے گورے قریب ہیں اگر کوئی بری صورت پیش آئی تو غلام کی روسیاہی کا سبب ہوگا۔ وہاں سے آپ شرف الدولہ نواب ابراہیم خاں کے گھر گئیں وہاں بھی وسوسہ ہوا کہ مبادا نواب اپنا رسوخ جتا کر گرفتار کرا دیں پھر حسین آباد کی محلسرا میں گئیں وہاں سے پھر شرف الدولہ کے گھر آئیں اور رات ساہ جی کی ڈیوڑھی پر بسر کرتی رہیں یہی وہ مکان ہے جہاں سے ان کی آخری سواری نیپال روانہ ہوئی۔ میں نے اس محلسرا کو دیکھا اس میں آج کل امرت لال ناگر رہتے ہیں یہ لمبی بلڈنگ ہے تین قطعہ مکان ایسے ہی اس سے متصل ہیں۔ قدیم وضع کی ڈیوڑھی کشادہ صحن پردہ در و دیوار ہیں۔ اونچی چھت کھلے ہوئے ہوادار دالان اس مکان کی خصوصیت ہے۔

(نوٹ) بان (پاند) والی گلی میں ایک امامباڑہ لوگ بتاتے ہیں جس کے بانی کا نام معلوم نہیں اور نہ عمارت باقی ہے۔

کالکا داس گوٹے والے عہد غازی الدین حیدر میں جس جگہ رہتے تھے اس محلہ کا نام کالکے مشہور ہوا تمام محلات شاہی میں بچکہ پٹھا، کرن ستارے آنچل پلو، گوٹہ، گوکھرو، بنت چنکی، قیطون، بیل مقیش، بانکڑی، کلابتو ان ہی کے دوکان سے جاتا اور

---

[1] گزشتہ لکھنؤ

نزاکت پسند خواتین لکھنؤ زیادہ بھاری جوڑا پہننے پر تیار نہیں ہوتیں انشا کہتے ہیں ؎

گوکھرو بنت ڈک ترے کی چیز — اس سے ہو جاتی ہے کمبخت گنواری انگیا

کارکاد اس نہ کاری ڈیوڑھی سے کھینچی ہو گئے[1]۔

کالی جی کا مندر:۔ لکھنؤ کی مشہور تیرتھ گاہ ہے جہاں سب سے پرانی مورتیاں بلا تغیر ابھی تک رکھی ہیں اور یہاں کے پجاری نے کسی فوٹوگرافر کو ان کا عکس لینے کی اجازت نہیں دی عہد آصفی سے تا حال مندر ایک صورت پر ہے اس مندر کی یہ خصوصیت بھی بیان کی جاتی ہے کہ تیرتھ کے معنی پانی کے ہیں کوئی زمانہ ایسا تھا کہ یہاں دریا بہتا تھا اور مندر ساحل پر تھا اب دریا اور مندر میں کئی محلے اور سڑک حائل ہے۔ گومتی ہٹ کر اتنی دور پہونچی اس وقت مندر نالہ پر ہے ایک راستہ چوک اور دوسرا سرائے معالی خاں اور تیسرا کاکوری روڈ پر ختم ہوتا ہے۔ عہد شاہی کے بعد یہ محلہ ایسا ویران ہوا کہ مہتروں کے گھروں کے سوا یہاں اونچے طبقے کی بستی نہ رہی اور دن کو رات کا ایسا سناٹا نظر آتا ہے نالہ میں پرانے کچھوے نظر آتے ہیں۔

پیر بخارا

شہر کا پرانا محلہ اور گنجان بستی تھی امیر غریب سب ہی رہتے تھے کچھ گھر شُہدوں کے بھی تھے جن کے شُہدپن نے اس محلہ کو خاص شہرت دے رکھی تھی حسین آباد کی راہ میں اس محلہ کے آثار قدیمہ کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں شُہدوں کو غنڈا کہنا صحیح نہیں ہے وہ صرف مرنے جینے کے موقع پر امیروں کی ڈیوڑھی پر جا کر دعائیں دے کر اور کام نہ چلا تو برا بھلا کہہ کر روپیہ اینٹھتے تھے چوری یا فریب جو گُنڈا پن ہے یہ ان کا کام نہ تھا یہ گروہ شجاع الدولہ کے ساتھ بھی رہ چکا تھا۔ چنانچہ تاریخ میں ہے "از صادقان مردیست کہ نواب شجاع الدولہ بہادر ان روز صدہا سقہ را ہمراہ گرفتہ مزدوران کون برہنہ کہ در ہند موسوم بشُہدہ ہستند فرمان داد" راست گفتار لوگوں کا بیان ہے کہ ایک موقع پر شجاع الدولہ کے ساتھ کئی سو بہشتی پانی بھرنے والے تھے اور وہ ننگے مزدور جو ملک میں شُہدہ کی لفظ سے مشہور[2] ہیں ان کو بھی حکم ہوا۔ اگر کسی شریف کا لڑکا آوارہ ہو جاتا ہے تو آج بھی کہا جاتا ہے کہ وہ تو پیر بخارا کا شُہدہ ہے اس محلہ کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کہ یہاں ملک بخارا کے کسی پیر کی قبر تھی۔ اور قبر پرستوں میں وہ اتنے مشہور تھے کہ لکھنؤ سے دہلی تک ان کی دھوم تھی کاکوری جانے والی سڑک (جس کا نام نیپیر اسٹریٹ تھا) نے راستہ بلند ہونے سے اس محلہ کو پست کر دیا اس وقت پیر بخارا دو سڑکوں کے بیچ میں ہے کاکوری روڈ اور حسین آباد جانے کا راستہ دو طرف سے اس محلہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ خزانہ اودھ کی تلاش میں حال ہی میں جب جا بجا شہر میں کھدائی ہوئی تو پیر بخارا کا وہ حصہ زمین بھی کھدا جو امام باڑہ حسین آباد جاتے وقت بائیں ہاتھ پر واقع ہے قد آدم زمین کے نیچے ایک تربت قبر برآمد ہوئی جس سے اس بات کا فیصلہ ہو سکا کہ سڑک نکلنے سے پہلے ایک مرد کے قد و قامت کے برابر زمین نیچی تھی تعویذ قبر پر چراغ کا طاق اور گلکاری بھی ہے لوگ کہتے ہیں کہ پیر بخارا کی یہی قبر ہے اکبر کے نورتن میں ابوالحسن، ملا دوپیازہ جو مشہور عالم گذرے ہیں ان کے ایک شاگرد عبدالجبار نے کہا استاد غزل کہنے کو جی چاہتا ہے کوئی مصرع طرح عنایت ہو تو طبع آزمائی کروں ملا نے یہ مصرعہ پڑھا ع شاہا چہ عجب گر بنوازند گدارا" شوخ مزاج شاگرد نے استاد کے رنگ کو سامنے رکھتے ہوئے غزل کہی ؎

استاد کو میدان[3] میں آج ہم نے پچھاڑا — چھاتی پہ چڑھے کود کے داڑھی کو اکھاڑا

---

[1] تاریخ اودھ نجم الغنی ج ۲ ص ۱۵۷ [2] عماد السعادت ص ۲۰۲ [3] بزم خیال

استاد کے مصرعہ پہ لگاتے ہیں گرہ ہم — شاعر ہمیں کردیجئے یا پیر بخارا
یہ طرفہ غزل ہم نے کہی مولوی صاحب — صدقے سے دل کیجئے خورسند ہمارا
پہلی ہی غزل پر ہیں ہوا داد کا خواہاں — شاباش عجب گر بنوازند گدارا

ملّا نے غزل دیکھ کر یہ شعر پڑھا دیا ؎

یہ طرفہ غزل لائے ہو استاد کے آگے — صد لعنت و پھٹکار چنیں ذہن رسارا

میر مستحسن خلیق اکثر فیض آباد میں رہتے تھے لکھنو آتے تھے تو پیر بخارا میں ٹھہرتے تھے پرگوئی کا یہ عالم تھا کہ ایک لڑکا آیا اس نے کہا میر صاحب آٹھوں کا میلہ ہے ہم جائیں گے ایک غزل کہہ دیجئے اسی وقت غزل کہہ دی وریا دکرادی اس زمانے میں غزل بکا کرتی تھیں۔ ایک دن ایک اور خریدار آیا اور خلیق سے اپنا تخلص ڈلوا کر ناسخ کے پاس پہونچا کہ اصلاح دیدیجئے شیخ صاحب نے غزل پڑھ کر اس کی طرف دیکھا اور بگڑ کر کہا اے تیرا منہ ہے جو یہ غزل کہے گا ہم پہچانتے ہیں یہ وہی پیر بخارا ہے میر خلیق کے کمالات کو آتش بھی تسلیم کرچکے تھے چنانچہ خلیق نے فیض آباد میں جب آتش کے سامنے یہ مطلع مشاعرہ میں پڑھا ؎

رشکِ آئینہ ہے اس رشکِ قمر کا پہلو — صاف ادھر سے نظر آتا ہے ادھر کا پہلو

آتش نے اپنی غزل پھاڑ ڈالی اور کہا جب ایسا شخص یہاں موجود ہے تو میری کیا ضرورت ہے خلیق کمالات شعری میں بھی انیس کے باپ تھے چنانچہ انیس نے جب وہ روایت نظم کی۔ فرزند رسولؐ نے نانا کے سامنے بروز عید سواری کی ضد کی اور آقائے دوجہاں نے فرمایا غمگین نہ ہو یہ نانا تیرا اشتر ہے۔ اس مطلب کو یوں ادا کیا "اچھا سوار ہوجئے ہم اونٹ بنتے ہیں" اس بلند ترین مصرعہ پر مصرعہ لگتا تھا انیس بڑی دیر سے سوچ رہے تھے۔ آپ نے پوچھا کیا سوچ رہے ہو۔ عرض کیا مصرعہ چاہتا تھا پہلا مصرعہ سنکر فرمایا یہ کہہ دو ؎

جب آپ رو ٹھتے ہیں تو مشکل سے منتے ہیں — اچھا سوار ہوجئے ہم اونٹ بنتے ہیں

بیٹے نے باپ کو جھک کر تسلیم کی اور مصرعہ کہہ لیا۔

کالا امام باڑہ

پیر بخارا کا مشہور تعزیہ خانہ کالا امام باڑہ ہے جس کو عہد آصفی میں نواب قاسم علی خاں خلف سالار جنگ نے تعمیر کیا بڑا امام باڑہ اور بڑا امام باڑہ دونوں ۱۱۸۵ء ایک سال کی تعمیر ہیں اس امام باڑہ میں بڑی دھوم سے مجلسیں ہوچکی ہیں سربلند پھاٹک کے بعد صحن کی چار دیواری اور تین درجے پہلا دالان شہ نشین اور بیچ کا درجہ چوڑا باہر کا دالان پتلا، پہلوؤں میں صحنچیاں اور تمام عمارت پر سیاہ رنگ آمیزی سفید حروف میں بخط نسخ طغرے اور آیات قرآن لکھے ہوئے۔ گوشے میں اونٹ کی پشت پر کجاوہ دار تصویر۔ اسیری اہل حرم کی یادگار ہیں اس امام باڑہ کی خصوصیت ہے انگنائی میں گھنٹہ اور صحنچی میں دفتر ہے بانی امام باڑہ نے عہد غازی الدین حیدر میں بعمر ۸۵ سال انتقال کیا اور اسی امام باڑہ میں دفن ہوئے عمارت کے سامنے جو مسجد ہے وہ اس سے پہلے کی پرانی تعمیر ہے اور مسجد کو میاں الماس کی تعمیر کہنا درست نہیں ہے سنہ تعمیر اور بانی مسجد کا نام پتھر پر درج ہے مادہ کا شعر یہ ہے ؎

سروش از آسماں دوباب تاریخ — بگفت از باب رحمت درکشادہ — ۱۱۹۵ھ

سہ آب حیات ص۳۸

امامباڑہ اچھی حالت میں ایک کمیٹی کے زیر انتظام ہے۔

مقبرہ مرزا علی خاں

خانۂ خدا سے تھوڑی دور ایک ہشت پہل عمارت ہے یہاں آصف الدولہ بہادر کے ماموں مرزا علی خاں دفن ہیں ان کی تاریخ رحلت ۱۱۹۳ھ ۱۷۷۹ء ہے مقبرہ دو منزلہ ہے اور قبر گولکنڈہ کے مقبروں کی طرح تہ خانہ میں ہے مرزا علی خاں وہی مشہور شخص ہیں جن کا آگے بڑھ کر احاطہ آج تک آباد ہے۔

امامباڑہ حاجی بیگم صاحبہ

محلہ پیر بخارا کا دوسرا عزاخانہ بڑی شاندار حیثیت میں تھا جو حسین آباد کی پشت پر واقع ہے اور پہلو میں نالہ بہہ رہا ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بجز اس زمین کے کہیں عمارت کی گنجائش نہ تھی بانی امامباڑہ نواب محسن الدولہ کی بیٹی تھیں عمارت پر پچپن ۵۵ ہزار روپیہ صرف ہوئے اور اتنی ہی رقم میں شیشہ آلات خرید اگیا اور ایک کثیر رقم شکست و ریخت اور ماہوار مصارف کے لئے جمع کی جو افسوس ہے کہ ورثہ نے لین دین کی نذر کردی اور امامباڑہ بغیر کسی سرمایہ کے منہدم ہوگیا کچھ دیواریں باقی ہیں جس سے عمارت کی خوبصورتی اور گزشتہ شان کا پتہ چلتا ہے بعض لوگوں کا بیان ہے کہ امامباڑہ کی تعمیر میں ایک سرنگ برآمد ہوئی جو روشن الدولہ کی کوٹھی تک پہونچتی تھی تاریخ میں اس خصوصیت کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

بانی امام باڑہ کے پوتے کا نام باقر علی خان تھا جو بہت کم سن تھے اس لئے بجائے ان کے نواب صادق علی خاں متولی قرار پائے حاجی بیگم صاحبہ کے مرنے پر باقر علی خاں نے وقف کو تلف کرنا شروع کیا اور کچھ باقی نہ رکھا۔ نواب صادق علی خاں زندگی بھر مجلسیں کرتے تھے اور محرم کا صرف ان کی جیب پر تھا۔ اس سرکار کا جمعدار بچو نامی اپنے محلہ ڈیوڑھی آغا میر اور بازار راجہ کے نانبائی کے یہاں سے روٹی سالن پکوا کر روزانہ تبرک تقسیم کرتا تھا۔ پیارے ملازم وقف حصہ بانٹتا تھا مجلسیں سہ پہر کو ہوتی تھیں اور ایک واقعہ خواں جو ایک آنکھ سے معذور تھے ذاکری کرتے تھے۔

لکھنؤ میں جب مولوی مقبول[1] احمد صاحب کی ذاکری کو فروغ ہوا تو ان کے پڑھنے کی ایک مجلس امامباڑہ سے قریب حدود ۱۹۰۵ء میں ہوئی اس وقت تک امامباڑہ آباد تھا۔

<u>جعفر حسین عامل</u>:۔ آپ امامباڑہ مذکور کے سامنے پیر بخارا میں رہتے تھے صورت سے کوئی عامل نہیں کہہ سکتا تھا دراز قامت، لاغر اندام بوسیدہ لباس ۳۰ سال پہلے ستر برس سے اونچے ہو چکے تھے اور کہتے تھے کہ میرے استاد موجود ہیں جو اپنا نام ظاہر نہیں کرتے ان کے کمالات میں یہ منظر میں نے خود دیکھا کہ تازہ انڈے پر کچھ پڑھ دیتے تھے اور اس پر پاؤں رکھ کر جو کھڑا ہو جائے تو بجز چھلکے کے کچھ نہ نکلتا۔ کئی کئی بار لوگوں نے آزمایا اور لطف یہ ہے کہ پڑھتے دل ہی میں تھے۔

<u>استاد ابو صاحب</u>:۔ لوگ ان کو شاہ جن والے ابو صاحب کہتے تھے۔ نواب سجاد علی خاں مرحوم کے ہمعصر اور بنوٹ کے آخری جاننے والے تھے تقریباً پندرہ برس ہوئے کہ اس دنیا کو چھوڑ دیا۔

<u>مطبع مظہر العلوم</u>:۔ پیر بخارا کا یہ پریس مظہر حسین نامی کا قائم کردہ تھا جس کی لکھائی چھپائی بہترین تھی اس پریس سے ماہ شعبان

---

[1] ۱۳۲۰ھ میں انتقال کیا۔

۱۳۱۲ھ میں دعائے صباح کلام حضرت امیر المومنین علی مرتضی کا وہ اڈیشن طبع ہوا جو اسد اللہ خاں غالب کے منظوم ترجمہ دعا کا شاہکار اور لکھنؤ کے مشہور خوشنویس مجو کاتب کی یادگار ہے نسخ و نستعلیق میں مجو کا جواب نہ تھا اس مطبع سے غم کدۂ خیال، دیوان محوی، زبدۃ النجوم اور بہت سی کتابیں چھپ کر شائع ہوئیں پریس کے مطبوعات میں مثنوی باغ ایمان و چراغ ایمان سوال و جواب کی صورت میں جناب غفراں مآب سید دلدار علی مجتہد لکھنؤ کا عیسائی عالم سے مناظرہ درج ہے یہ منظومہ مجھے آج تک کسی لائبریری میں نظر نہیں آیا مظہر العلوم پریس کی فہرست اس علمی اور ادبی شاہکار پر متوجہ کرتی ہے۔

قدیم صحبت سرور

امامباڑہ کے خصوصیات میں وہ قدیم صحبت بیر بخارا شریف ہے جو عہد شاہی سے ربیع الاول کے آخری اتوار کو ہوتی تھی شیخ تصدق حسین وکیل کی رائے ہے کہ یہ صحبت کالے امامباڑہ میں ہر سال ہوتی تھی یہ رائے ٹھیک نہیں ہے محفل ہمیشہ محلہ کے مشہور شخص مرزا علی حسین کے مکان میں ہوئی اور جب مکان گر گیا تو اس زمین پر مدت تک جلسہ ہوا اس محفل کا پروگرام امامباڑہ کے شایان شان نہ تھا اس لئے امامباڑہ میں ہونا غلط ہے۔ میاں مشیر کا مزاحیہ کلام اسی محلہ اور محفل سے دنیا میں نشر ہوا۔ یہ جشن غدر ۱۸۵۷ء سے چھ سال تک بند رہا۔ بے فکری کے مشاغل کو کہاں باقی رکھ سکتا تھا ۱۸۶۳ء یا اس کے دوسرے سال اس جشن کو کچھ منچلے اہل شہر نے پھر زندہ کیا۔ اس ملتوی شدہ جشن کے موقع پر میاں مشیر نے کہا تھا ؎

چھ سال سے در میخانہ بند ہے موقوف دور بادہ ہے پیمانہ بند ہے

اشعار مشیر کی داد دینے والوں میں مرزا حیدر صاحب امیر کبیر لکھنؤ تھے جن کا تعارف گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ وہ ہر سال دوشالہ اوڑھاتے تھے۔ اس عطا کو خود مشیر نے بڑی خوبی مگر فحش الفاظ میں ادا کیا ہے ناقابل تحریر لفظیں چھوڑ کر میں ان کے دو شعر نذر قرطاس کرتا ہوں ؎

ہوتی ہے بزم سنتے ہیں ہجو . . . کبیر شہر میں ہے آغا حیدر کوئی امیر

ہر سال ایک حلہ انھیں اعلیٰ وہ دیتے ہیں . . . کی ہجو سن کے دوشالہ وہ دیتے ہیں

مشیر نے پشمینہ کی لفظ سے دوشالہ کا ربط قائم کیا ہے اور نواب صاحب کا ابر کرم حفاظت زبان کرنے والے پر برستا تھا اور بیر بخارا زبان کا ایک ٹکسال تھا جہاں خزانہ عامرہ سے سکے ڈھلتے تھے۔ مشیر کی سیف زبان سے کشمیری بھی زخمی ہو چکے تھے اور یہ دلیل ہے کہ ان کا کلام گولہ گنج میں نہیں پڑھا گیا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

ملکی تو کہہ کے دل کی چلے راہ گھر کی لی مجمع میں تھے کھڑے ہوئے ایک کاشو بھائی بھی

کشمیری بیچ بھی نہ چلے سنیئے اب مزے اک ہکلے یار دیکھ رہے تھے کھڑے کھڑے

بیر بخارا ہی کی یہ علمی پیداوار تھے جواب تک قلمی بیاضوں میں ادباء کی زبانوں پر کبھی کبھی آجاتی ہے۔ مرزا حیدر صاحب کا دسترخوان شہر میں مشہور تھا ان کے خصوصیات سے تھا کہ وہ جس محفل میں آجاتے تھے ان کا آبدار خانہ اور گلوریوں کا ساز و سامان خاصدان ہمراہ لایا جاتا تھا اور ڈیڑھ سو[1] ڈیڑھ سو حقے ان کے ساتھ چلتے تھے اوسط طبقے کے لوگوں کو ان کے مدعو کرنے سے حقہ پان کی غیر معمولی

---

[1] گزشتہ لکھنؤ ص ۲۰۹

راحت پہونچتی تھی ۔ لکھنؤ میں فحش مشاعرے بھی مکان کے دروازے بند کرکے ہوتے تھے اور اساتذہ سب وشتم کے برمحل استعمال پر تبادلۂ خیال کرتے تھے ۔ فحش گفتار میں برمحل غلط استعمال کرتے ۔ غالب نے اس لڑکے کو قابل اعتراض قرار دیا تھا جس نے ادھیڑ عمر کے مرد کو ماں کی گالی دی تھی یہ امر تحقیق طلب ہے کہ مشیر کا کلام بابائے اردو کی لائبریری میں محفوظ ہے ۔ شہدوں کے کارنامۂ حیات میں یہ واقعہ بھی نظر آتا ہے کہ جب یہی گارد انگریزوں سے خالی نہ ہو سکی تو آزادی کے حامیوں نے رائے یہ کی کہ کوئی تدبیر ایسی کرنا چاہیئے کہ سب انگریز بغیر مارے مرجائیں اور کوئی شخص ایسا ملے جو وہاں جاکر سب کنوؤں میں زہر ملادے کسی نے جانے کا اقرار نہ کیا مگر شہدوں کے افسر نے کہا یہ کام ہمارا ہے ۔ سنکھیا ہمیں عنایت ہو ۔ ممو خاں داروغہ نے پانچ سیر سنکھیا فراہم کرکے غلام رضا خاں سے بجبر منگوائی اور اس نے کہا کہ ہمارے شہدے جاکر اپنا کام کر آئے ۔ ممو خاں دمبدم خبر منگواتے تھے کہ انگریز زندہ ہیں یا مرگئے مگر ہر مرتبہ یہی خبر آتی تھی کہ سب زندہ ہیں بظاہر ایسا ہوا کہ ماتحت شہدے نے غلط بیانی کی اور انگریز دوستی میں پانی زہر آلود کرنے سے باز رہا اگر تمام باشندگان شہر حب وطن میں ثابت قدم رہتے تو غیر ملکی حکومت کبھی قائم نہ ہوتی ۔

گھنٹہ گھر

صوبہ میں انگریزوں کے جو آثار قدیمہ رہ گئے ان میں کلاک ٹاور قابل ذکر ہے جو تالاب حسین آباد کے کنارے اپنی بے زبانی پر کچھ سماں باتیں کر رہا ہے یہ سر جارج کوپر کی یادگار ہے جو صوبہ اودھ اضلاع مغربی وشمالی کے پہلے لفٹیننٹ گورنر اور حسین آباد ٹرسٹ کے بہی خواہ تھے ۱۸۸۱ء میں یہ بنتا شروع ہوا ۔ سید ہدایت علی بن موسیٰ رضا رامپوری نے مجھ سے بیان کیا کہ ہم نوجوانی میں ادھر سے گذرے اور معمار سے کہا کہ یہ اتنی اونچی عمارت بھلا کہاں ٹھہر سکتی ہے ۔ آندھیاں زلزلہ موسلا دھار پانی گرادے گا ۔ کاریگر (معمار) نے کہا صاحبزادے لو میں اینٹیں مصالحے سے جوڑے دیتا ہوں اس کو دھوپ میں رکھ دو جب میں کہوں اٹھا کر دونوں کو علیحدہ کردو ۔ واقعی کچھ دیر کے بعد اینٹ پتھر ہو گئی اور بڑی کوشش کی جوان ہاتھ سے علیحدہ نہ ہوئی ۔

اس عمارت کو بہت دور تک زمین میں آثار قائم کرکے ۱۲ زینہ کے چبوترے پر پھر پانچ زینہ قائم کرکے منارہ بنانا شروع کیا ہے قد آدم دروازہ اور اندر زینہ ہے نیچے سے اوپر تک منارہ چوکور ہے دروازے کی تھوڑی اونچان طے کرکے پھر چوگرد حاشیہ بنا کر پایہ دیئے گئے ہیں اور اوپر کے حصے میں چاروں طرف چار گھڑیاں اور پھنگی پر گلدستہ نما صورت ختم کرکے ایک پیتل کا بگلہ کلس پر نصب کیا ہے جو ہوا کا رخ بتاتا ہے اور جدھر کی ہوا ہو گی ادھر گھوم جائے گا بجنے والی مشین نہایت پائدار ہے اس کی صدا بڑی پاردار ہے اور سناٹے میں اگر ہوا مخالف نہ ہو تو وہاں سے چوبداری محلہ تک آواز آتی ہے ۔ اس گھنٹہ گھر میں گھنٹہ پورا ہونے سے پہلے سننے والوں کو متوجہ کرنے کے لئے اولاً کچھ آوازیں پے در پے آتی تھیں اس کے بعد ٹھہر ٹھہر کر بجتا تھا لیکن یہ جز عہد نواب باقر مرزا صاحب مرحوم متولی کے وقت سے نہیں رہا ۔ اور اب دس بجتے ہیں تو دس کی صدا اور گیارہ بجتے ہیں تو گیارہ کی آواز آتی ہے ۔

۱۹۰۵ء میں لکھنؤ کے رئیس نواب امجد علی خاں قیصر نے اے ایل سانڈرس ڈپٹی کمشنر لکھنؤ کو اس جگہ پارٹی دی تھی جس میں تعلقہ داران اودھ اور دربالسٹ کے جملہ معززین شریک تھے اس اجتماع کا عکس میرے پاس موجود ہے جو پرانی تہذیب کا ایک آئینہ ہے ۔

گھنٹہ گھر دور دور سے دکھائی دیتا ہے اور ۱۸۸۷ء میں بن کر تیار ہوا بہتر (۷۲) سال پرانی عمارت ہے ۔

جمنیا باغ میں حسین آباد مبارک

امامباڑہ کی تعمیر سے پہلے یہاں شاہی کا جمنیا باغ تھا گنگا جمنا ملک کی دو بڑی نہریں ہیں جو اپنے پاٹ کے لحاظ سے یو پی کے دریا کہی جاتی ہیں اور کانپور والہ آباد و آگرہ پانی کی گزرگاہ ہے جمنیا کی لفظ دریائے جمنا کی طرف اشارہ کرتی ہے امامباڑہ حسین آباد کی عمارت اسی باغ کی آراضی پر بننا شروع ہوئی۔ اس امامباڑہ کا پھاٹک رومی دروازہ کے محاذ میں پچھم کی طرف واقع ہے اور یہ مقدس عمارت شروع ہونے سے پہلے دو برجیاں نظر آتی ہیں جو عموماً پہرہ دار کے ٹھہرنے اور نگہبانی کی جگہ ہوتی ہے حسین آباد میں مسجد امامباڑہ تالاب اندارہ کوٹھیاں نوبت خانہ نادار طبقہ کے ٹھہرنے کی جگہ رئیس منزل شریف منزل حمام مقبرہ ست کھنڈہ مختلف مقامات ہیں جن کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

تالاب :- لکھنؤ میں ٹکیت رائے کا تالاب، بخشی کا تال، فتح علی کا تالاب اپنی نوعیت میں ممتاز مقامات ہیں وسط شہر میں کوئی تالاب نہ تھا اس کمی کو حسین آباد کے تالاب نے پورا کیا یہ تالاب حسین آباد کی برجیوں سے گزرتے ہوئے داہنے ہاتھ پر پڑتا ہے لکھوری اینٹوں کا بہت گہرا زینہ دار مربع مرکز آب ہے ردکار پر تفریح کرنے والوں کے لئے ایک مختصر اور خوشنما گیلری ہے نیچے تالاب بہہ رہا ہے چاروں طرف سیڑھیاں بھی اور شرقاً و غرباً پانی بھرنے والوں یا نہانے والے طبقے کے لئے تالاب کے پہلوؤں سے اندر جانے کے راستے جس سے مویشی بھی سیراب ہو سکیں بارش میں عموماً پانی چڑھتا ہے اور طغیانی کے زمانے میں چھلک کر حسین آباد کا راستہ بند کر دیتا ہے مچھلیاں کثرت سے ہیں اور شکاری کے بیٹھنے کے لئے گرد مختلف منڈیریں ہیں یار علی شاعر کا یہ مصرعہ جان تاریخ ہے ؎

آبرو لی چاند خاں نے کل ہماری رات کو   اے بوا گوہر؟ حسین آباد کے تالاب پر

شیخ بدلو کے کمالات تالاب پر :- بدلو قوم کا نائی تھا عہد واجدی میں اس نے ترقی کی اور سب پیراکوں کا استاد مانا گیا پالتھی کی پیرائی خوب پیرتا تھا صرف پیر کے دونوں انگوٹھوں سے پانی کو حرکت دیا جاتا تھا کبھی ایک ہاتھ میں گڑگڑی ہے اور پیتا چلا جاتا ہے اور کبھی بچے کو گود میں لٹا لیا اور چادر آب پر رواں ہے ڈیوٹ کی پیرائی بہت اچھی پیرتا تھا یعنی سر سے کمر تک جسم کا حصہ پانی کے اندر ہے اور باقی پانی کے اوپر ہے اور پیرتا چلا جاتا ہے۔ بدلو پانی میں ریل گاڑی بناتا تھا۔ اس طرح کہ پچیس تیس آدمی ایک کے پیچھے دوسرا لگا ہوا اور سب کے خود انجن بنا ہوا کبھی ملاحی سے سب کو کھینچے لئے جاتا ہے کبھی کھڑی سے کبھی کسی اور پیرائی سے۔ غدر کے بعد حسین آباد کے تالاب میں ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں یہ کرتب دکھائے گئے۔ بدلو کھڑی بھی اچھی لگاتا تھا۔ ایسی مشق بہم پہونچائی تھی کہ موضع کانکرآباد سے چلا اور چار بجے پکے پل آگیا۔ (قدیم ہنر ص۱۳۵)

بارہ دری :- اسی سمت تالاب کے دوسرے کنارے پر یہ عالیشان قصر ہے جو اپنی رفعت، پختگی، خوبصورتی، کشادگی میں اپنی آپ نظیر ہے اس کو تصویر والی بارہ دری کہتے ہیں اور سلاطین اودھ کی یہاں تصویریں اور بعض نوادر میوزیم کے طور پر ہیں ــ

حسین آباد ٹرسٹ کا آفس اور وثیقہ کی تقسیم اسی بارہ دری سے ہے یہ دو منزلہ عمارت ہے اور نیچے کے حصے میں تالاب کے قرب اور زمانہ طغیانی میں گومتی بڑھ آنے کے تصور میں صرف ستون دے کر پہلی منزل کو خالی چھوڑ دیا ہے تالاب کے رخ پر بارہ دری کی پشت اور دوسری رخ پر داخلہ کا عالیشان انگریزی وضع کا راستہ اور کشادہ زینہ ہے۔ وثیقہ کے مقامات اور ایک ڈپٹی کلکٹر کے پوزیشن کا سکریٹری، سپرنٹنڈنٹ آفس اور ہر شعبہ کے علیحدہ کلرک اپنی اپنی جگہ پر بیٹھتے ہیں دیوان جی اور خزانچی ہمیشہ ہندو

دھرم کار رہا۔ دوسری کوٹھی وہ ہے جس میں پنشنر ڈسٹی مرزا باقر مرزا عمر بھر رہے۔

اس حصے میں ایک چھت دار کنواں بھی ہے جو ٹھنڈے پانی کا بہترین چشمہ ہے نجم الغنی کے قلم سے تاریخ اودھ میں ان عمارات پر کوئی تعریف نہیں ہے [تصویر والی بارہ دری کو راجہ امام علی خاں نے لال کوٹھی کی لفظ سے یاد کیا ہے اور میرا دل چاہتا ہے کہ ان کی پوری عبارت اس باب میں لکھدوں۔ حضرت بیگم کے طلب کرنے پر ہندو مسلم سیاستیں اپنی فوجیں لے کر لکھنؤ پہونچیں اور انگریزوں سے مقابلہ شروع کیا اس موقع پر کچھ سرفروشان وطن حسین آباد میں ٹک گے۔

نبی بخش خاں وغیرہ تینوں بھائی کئی مہینے لکھنؤ میں رہے۔ ایک واقعہ اسی اثناء قیام لکھنؤ میں تجمل حسین خاں کی دلیری سے متعلق یہ ہے کہ لال کوٹھی میں حسین آباد کے قریب چودھری حشمت علی چکلہ دار و تعلقہ دار سندیلہ فردکش تھے ان سے اور تجمل حسین خاں وغیرہ سے نہایت گہری رسم وراہ تھی جس کا سلسلہ اب تک دونوں خاندانوں میں جاری ہے ایک روز تجمل حسین خاں چودھری صاحب سے ملنے گئے امجد علی خاں بلوچ بھی وہاں بیٹھے تھے ان کے علاوہ اور لوگ بھی صحبت میں تھے ہر شخص اونچی بنا بنا تھا اور یہ وہ زمانہ تلنگوں کی شورش کا ہے اور ہر تلنگہ اپنے تئیں بادشاہ گر جانتا ہے۔ اتفاقاً ایک صوبیدار تلنگوں کا بہت سے طلائی زیور مثل کنٹھا و مالا وغیرہ پہنے ہوئے نہایت عمدہ لباس و اسلحے سے آراستہ بہت نفیس گھوڑے پر سوار پوری کمپنی تلنگوں کی اور قریب سو سوار ہمراہ لئے ہوئے چودھری صاحب کی ملاقات کو آیا انہوں نے بہت تواضع اور مدارات سے پہلو میں جگہ دی صوبیدار نے چودھری صاحب سے حاضرین مجلس میں سے ایک کا نام پوچھا وہ بتانے لگے تجمل حسین خاں کا نام سن کر ان کی جرأت و دلاوری کی ثنا و صفت کی پھر امجد علی خاں بلوچ کا نام سن کر ان سے مخاطب ہوا اور کہا آپ تو اس وقت خوب مل گئے آپ کے والد نے اپنے زمانہ چکلہ داری میں ہمارے اکثر مواضع خام ضبط کرکے ہمارے پٹیتوں کو دے تھے اور لاکھوں روپے کا ہمارا مال لوٹ لیا تھا پس آپ وہ کل مال اسی جگہ پر دیکر اٹھنے کا قصد کیجئے گا۔ راوی حکایت بیان کرتا ہے کہ یہ سنتے ہی تمام مجلس کا رنگ متغیر ہو گیا کہ اگر اس صحبت میں اس کی جانب سے امجد علی خاں پر کوئی صدمہ پہونچا تو خلاف حمیت ہے اور اگر اس صوبیدار سر شور کو روکتے ہیں تو بیکار کشت و خون ہوتا ہے ادھر صوبیدار وہی کلام امجد علی خاں سے کر رہا ہے۔ آخر تجمل حسین خاں برافروختہ ہوئے تلوار ٹیک کر اٹھ کھڑے ہوئے اور امجد علی خاں کا ہاتھ پکڑ کے کہا کہ اٹھو بھائی چلیں پھر صوبیدار کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ اب اگر ان کی نسبت کچھ بھی زبان سے نکالا تو مارے تلواروں کے اسی جگہ ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں گا۔ اقبال مندی اس کا نام ہے کہ یہ کلام سن کر ایسا رعب صوبیدار اور اس کے ہمراہیوں پر چھایا کہ پھر کسی کے منہ سے بات نہ نکلی تجمل حسینؑ خاں اپنے ہاتھی پر امجد علی خاں کو بٹھا کر اپنی فرودگاہ پر لے آئے۔

حسین آباد کا پھاٹک

حسین آباد کی لفظ مرزا دلگیر کے ایک شعر سے ماخوذ ہے وہ لکھنؤ کی عزاداری کے جوش کو دیکھ کر ایک سلام میں کہتے ہیں ؎

تعزیہ داری کے باعث لکھنؤ آباد ہے　　اس پہ اطلاق ہو سکتا حسینؑ آباد کا

ع جنرل بیرونے جب قیصر باغ نزول ہو رہا تھا تعلقہ داران اودھ کو قیصر باغ کے حصے کرکے چند شرائط اور شکست و ریخت کی ذمہ داری پر نسلاً بعد نسل دیا تو آپ کو مغربی پھاٹک سے قریب جانب جنوب مکان ملا ص ۱۴۱ آثار یادگار

ف آثار یادگار، تاریخ بھٹوا مئو ص ۱۶۲　　ف مراثی دلگیر طبع نولکشور ج ۱۶ ص ۴۴ کانپور ۱۹۰۵ء

مرزا دبیر کا آخری دور حیات محمد علی شاہ بادشاہ کے عہد میں تھا جیسا کہ آئندہ صفحات سے معلوم ہوگا۔

پہلا پھاٹک تین دروازوں کی صورت میں انتہائی شاندار نقش و نگار سے آراستہ اور پہلوؤں میں عمارت کمروں کی صورت میں جس میں ۴۰ سال پہلے اسپتال تھا۔ اامباڑہ چونکہ عظیم اللہ خاں کی نگرانی میں تعمیر ہوا اس لئے پھاٹک پر سنگ مرمر سے ان کے نام کا اعلان ہو رہا ہے اور بہترین نستعلیق میں یہ اشعار بھی موجود ہیں ؎

فدوی خاص و امین و سرفروش و معتمد	جانثار بادشاہ کشور ہندوستان
صاحب فہم و خلیق و عاقل و دانائے خلق	عاشق و شیدائے حضرت ہست بیشک بیگماں
روز و شب معروف حکم شاہ می باشد بدل	جز بایں کارے ندارد و ہیچ کارے در جہاں
نیست ایں تاریخ نادر مثل تاریخ دگر	واقعی صنعت بطرز نو شد از رقم عیاں
کم کن اول یکہزار و دو صد و پنجاہ و چار	تا سنہ ہجری نماند اہل بینش رانہاں
از ترقی شد دو چند سال ایں تاریخ سعد	مہتمم بالطف حق بودہ عظیم اللہ خاں
بہر سال عیسوی در گوش ہوش سامعین	از فلک آمد ندا نامی عظیم اللہ خاں

پھاٹک میں ایک سمت عہد برٹش کے پہلے سیلاب ۱۸۹۴ء کا نشان اور دوسری طرف ۱۹۲۳ء کی طغیانی کی یادگار پتھر کی صورت میں موجود ہے آغاز اکتوبر ۱۹۵۵ء میں بھی اس کتاب کے دوران تالیف میں گومتی بڑھنے سے پھاٹک میں ناؤ چلتی تھی۔

لنگر خانہ:۔ پھاٹک کے بعد لنگر خانہ ہے یہ اس جگہ کا نام ہے جہاں مجلس کے حصوں کی بخت ہوتی ہے امام حسین کے نام غریب اور محتاج کو جو کھانا بٹتا ہے اس کو لنگر کہتے ہیں محرم چہلم میں تورہ بندی میں اسی جگہ سے حصے تقسیم ہوتے ہیں ماہ رمضان المبارک میں افطار کے وقت روزہ داروں کو خمیری روٹی سالن بھی یہاں سے مدت تک بٹتا رہا۔

باولی اور حمام:۔ تاریخ میں اس حمام کا ذکر موجود ہے جو برہا برس سے بند پڑا ہے اس سے متصل جو بڑا کنواں زیر سقف ہے وہ گرمیوں میں ہر وقت پیاسوں کو سیراب کرتا ہے حمام کا قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

سلطان جہاں خدیو باذل	کسرائے زمانہ شاہ عادل
حمام لطیف کرد تعمیر	تاکید نمود بہر تطہیر
تاریخ سعید ہست ظاہر	حمام لطیف حوض طاہر
	۱۲۵۴ھ

اور کنوئیں کی تاریخ ملاحظہ ہو ؎

آب ایں چاہ و شیرینی چوں	شربت قند و نبات پاکست
راست ز مصرعہ تاریخ رسید	چشمۂ آب حیات پاکست
	۱۲۵۴ھ

ریئس منزل:۔ پھاٹک سے حسین آباد کے گذر کر بائیں ہاتھ پر وہ راستہ ہے جو عظیم اللہ خاں کے اامباڑہ کو جاتا ہے اور کچھ مکانات داہنے اور بائیں ہیں جن میں لوگ بلا کرایہ رہتے ہیں حسین آباد کا حمام اور بڑا کنواں جو ہر وقت گرمی میں کھنچا رہتا ہے اسی سائڈ میں

بے افسوس ہے کہ حمام بند پڑے رہتے ہیں کیا کوئی اس کو دیکھ نہیں سکا۔ کنواں چھت کے نیچے ٹھنڈے پانی کا سرچشمہ ہے اس راستے سے چند قدم جانے کے بعد جو پلٹ آؤ تو پھر حسین آباد کے پھاٹک سے پہلے رئیس منزل کا پھاٹک ملتا ہے اس کے بعد وسیع آراضی مسجد اور غربا کے لئے رہنے کے مکانات ہیں جن کو عزت دینے کے لئے رئیس منزل نام رکھا گیا ہے اور اس احاطہ میں باشندگان محلہ کو مجلس ماتم تابوت کی مکمل آزادی ہے۔ رئیس منزل میں داخل ہونے سے پہلے برما اسٹائل کی ایک برجی نظر آتی ہے جو ہندوستانی کاریگری کا بہترین نمونہ ہے آج امریکن وضع کی عمارتیں شہر میں بن رہی ہیں اور تعجب نہیں ہے۔ اخبارات میں فوٹو سیاحوں کے ذریعے نقشے آتے رہتے ہیں اور آسکتے ہیں مگر عہد محمد علی شاہ میں برمائی عمارت کا نقشہ کیونکر بنا بادشاہ کی قدر افزائی کا ایک کرشمہ ہے اسی شان کی دوسری برجی شریف منزل کے سائڈ پر ہے۔

نوبت خانہ:۔ اصل امامباڑہ کے پھاٹک کے جواب میں جو عمارت اسی وضع قطع کی ہے اس کو نوبت خانہ کہتے ہیں نوبت کا آئین شاہان اودھ میں یہ رہا کہ ہر پہر کے خاتمے پر گھڑی بھر تک نوبت بجے اس طرح دن رات میں آٹھ مرتبہ نوبت بجنا چاہیئے مگر معمول یہ تھا کہ سات دفعہ نوبت بجتی تھی پہلی نوبت تڑکے نماز صبح سے پہلے یہ صبح کی نوبت کہلاتی۔ دوسری جب ایک پہر دن چڑھتا تیسرے زوال کے وقت یہ دوپہر کی نوبت کہلاتی۔ پھر تیسرے پہر کو اس کے بعد سورج ڈوبتے وقت پھر تین دفعہ باری باری رات کو اور ساتویں نوبت کے بعد لوگوں کے آرام میں خلل پڑنے کے لحاظ سے آٹھویں ناغہ کرکے ڈیوٹی ختم کردی جاتی ہے لکھنؤ میں اب صرف حسین آباد کی صبح و شام نوبت باقی ہے اور سناٹے میں کبھی کبھی چوک تک آواز آتی ہے جو تُرھی (بڑا بگل) پر ختم ہوتی ہے اس کو باجہ والا کھڑے ہوکر بجاتا ہے نوبت کو صبح کو وردی بھی کہتے ہیں رشید مرحوم فرماتے ہیں ع "غنچے چٹکے کہ بجی صبح کی گویا وردی" حیدرآباد دکھن کے روُسار کی ڈیوڑھیوں پر بھی نوبت بجتی تھی۔ مشہد مقدس مزار امام رضا پر بھی نوبت خانہ ہے۔

پھاٹک:۔ حسین آباد کا امامباڑہ نوبت خانہ کے روبرو والے پھاٹک سے شروع ہوتا ہے یہ دروازہ درگاہ حضرت عباس کے پھاٹک سے بالائی حصے میں مشابہ ہے۔ دروازہ کے پہلوؤں میں تاکمر دو چبوتروں پر پتلیاں تھیں جن کا چہرہ عورت کا اور جسم چوپایہ کا بیٹھنے میں سینہ ابھرا ہوا یہ مجسمہ ۵۰ سال پہلے تک تھا۔ اس سائڈ میں چکن اور کامداتی اور ظروف نقرہ کی دوکانیں تھیں جن میں چوک کے مہاجن تجارت کرتے تھے اور آنے والے سیاح ہر شے بڑی بڑی قیمتوں پر خریدتے تھے۔

گھنٹہ:۔ دروازہ تین پھاٹکوں پر مشتمل جن میں لوہے کے خوشنما دروازے اور درمیانی باب سے آمدورفت پھاٹک میں تمندار اور چپراسیوں کی جگہ اور داہنے ہاتھ پر جو حجرہ ہے اس میں گھنٹہ نصب تھا جو گھڑیوں کے رواج سے پہلے پرانے طریقے پر بجتا تھا۔ عبدالحلیم شرر تے اپنے الفاظ میں اس کی حقیقت پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس وقت ایک پہر میں تین گھنٹے ہوتے تھے اور دن رات کے آٹھ پہر قرار دئے تھے ہر پہر کی آٹھ گھڑیاں تھیں گھنٹہ کی صورت یہ تھی کہ ناندے میں پانی بھرا رہتا تھا اور ایک خالی کٹورہ جس کے پیندے میں باریک سوراخ ہو اس میں ڈال دیا جاتا جو پانی پر تیرتا رہتا اور دھیرے دھیرے اس میں پانی بھرتا رہتا یہاں تک کہ پانی سے بھر کر ڈوب جاتا اس وقت گھنٹہ پورا ہوکر نوکر موگری سے پیتل کی آویزاں ٹکیہ پر ضرب لگاتا۔ سننے والے شمار کرنے کو گیا بجا ہے۔ ۸ بجے صبح و شام اور ۱۲ بجے گجر بجتا یعنی ۸ کے بعد پھر آٹھ دفعہ اور ۱۲ پر ۲۴ آتش کہتے ہیں۔

شب جو تم نے صبح وعدہ باغ چلنے کا کیا ہر گھڑی دل کو زیادہ تھا گجر کا انتظار

گجر دم کی لفظ ۴ بجے صبح کے معنی میں استعمال میں تھی۔ یہ طریقہ ذرا بھی دشوار نہیں ہے آج بھی اس کا تجربہ ہو سکتا ہے۔ گھڑی دیکھ کر نمونے کے طور پر چھید دار کٹورہ پانی میں ڈالو ایک گھنٹہ میں جتنا پانی چڑھے اتنا بڑا کٹورہ بنوالو سوراخ بھی اتنا ہی بڑا ہونا چاہیے اس کٹورہ سے وقت کی جانچ ہو سکتی ہے اور اگر ایک وضع قطع اور برابر وزن کے ۱۲ کٹورے ہوں ان پر رنگین نمبر دے جائیں اور نمبر وار کٹورے ڈالے جائیں تو ہر دیکھنے والا نمبر دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ کیا بجا ہے؟ اور اگر کٹورہ پر ½ اور ¼ نمبر بھی ہوں تو ہر پندرہ منٹ کا بھی علم ممکن ہے لیکن ایک شخص کا متعین ہونا ضروری ہے۔ دروازوں کے بعد ایک سہ درہ اور ہے جس پر سنہری مچھلی نصب ہے جو ہوا کی طرف رکھتی ہے۔ دروازے سے گزر کر وسیع صحن اور باغیچہ ہے اور چپ و راست دو پیتل کے مجسمے انسان صورت نصب ہیں جو ہاتھ میں زنجیریں لئے ہیں اور زنجیر کا آخری حصہ پھاٹک سقف میں بلند کنگروں سے وابستہ ہے عوام سمجھتے ہیں کہ دونوں آدمی لنگوا اتار رہے ہیں مسجد کے محاذ میں دو مجسمے ایک چھوٹی گائے کے تھے جو بچے کو دودھ پلا رہی تھی یہ بھی ۴۰ سال سے نہیں ہے گائے سانول داس سکریٹری حسین آباد کے وقت نصب کی گئی تھی۔ اس وقت عملے میں چاند کا پرشاد، سکندر لال وغیرہ کرتا دھرتا تھے امبکا پرشاد سپرنٹنڈنٹ آفس تھے سکریٹری ضریح کے ساتھ ننگے سر جلوس میں چلتے تھے۔

مسجد:- پھاٹک سے نکل کر پہلے مسجد نظر آتی ہے جس کا دو کشادہ زینوں سے دو طرف راستہ ہے اور رہگذر گاہ سے پہلے زرد پتھر کا ایک ستون تا بہ زانو نصب ہے جس کے سایہ کے گھٹنے اور بڑھنے کے لحاظ سے گرد اسی قسم کے نفیس پتھر مخروطی شکل کے زمین میں جڑے ہیں یہ دھوپ گھڑی ہے اور پتھر کی پرچھائیں اس گوٹ پر پڑنے سے وقت معلوم ہوتا ہے۔ دھوپ گھڑی سے کلاک یا ناج کے تطابق کا نقشہ نواب عطا حسین خاں ابن حیدر حسین خاں نے جو نواب تفضل حسین خاں کے نواسے تھے جدول اثنا عشری کی صورت میں ۱۲۸۶ھ میں چھاپا ہے۔ صحن مسجد میں دو خوشنما گلدستے ہیں جس پر مؤذن چڑھ کر اذان دے سکتا ہے پہلو میں حوض اور سنگی خوشنما کنواں ہے اور سنگ مرمر پر جو تاریخ نصب ہے اس کا ایک مصرعہ یہ ہے ع "ان ھذا مقام ابراھیم" اس مسجد کی تعریف میں دو سلطانی کے کسی شاعر کا قول ہے ع "مسجد پر نور را کعبہ اگر گویم بجاست" دو درجہ اور وسعت مسجد کے لحاظ سے مینار اور گنبد در پشت مسجد بر محاذ مسجد میں دوسری مسجد جوابی عنوان سے ہے اس مسجد کے مؤذن شیخ محمد سجاد فیض آبادی کے پاس میں نے ایک قلمی کتاب میزان التسکیہ دیکھی مؤلف کا نام سید محمد عباس ابن مرزا بہادر علی خلف نواب شجاع الدولہ بہادر اور کتاب اصل کاپی تھی۔ بخط مؤلف اس کی کتابت ۱۸ ذیقعدہ ۱۲۷۰ھ فلسکیپ سائز سے دو انچ زائد بڑی تقطیع موٹے کاغذ پر جس میں مخمس اور مسبع اور مثمن اور اس سے بالاتر درجات کے نقوش تھے اور کتاب کے دیباچے سے معلوم ہوا کہ مؤلف کی اس فن میں ایک اور کتاب مقالید نجات ہے شیخ صاحب کے فرزند کے پاس یہ کتاب کراچی میں موجود ہے۔

مقبرہ مجلسی بیگم:- صحن امام باڑہ میں عمارت مسجد کے بعد دختر شاہ کا مقبرہ ہے جن کا اصل نام بقول لے حمیدہ سلطان تھا اور ملکہ جہاں کے بطن سے تھیں حیات پدر اور زمانہ طفولیت میں رحلت کی ۱۲۵۳ھ میں تاج محل آگرہ کے نقشے سے کسی قدر مشابہ مقبرہ بنا اور جب امام باڑہ حسین آباد کی بنیاد قائم ہوئی تو اس عمارت کو احاطہ امام باڑہ میں شامل کیا گیا اس مقبرہ کے جواب پر دوسری طرف بھی عمارت ہے جو تر ستیاں کے چارپائی اور دوسرے استعمال میں ہے۔

صحن میں وسیع نہر اور نہر پر خوشنما بیل پہلوؤں میں برجیاں اور چبوترہ سے متصل آخری حصہ پر سطح آب میں ایک سنگی چبوترہ پر شبیہ دلدل اور لجام بکف قنبر کی تصویر۔

عمارت امامباڑہ:۔ کئی زینے بلند تین درجوں کی خوبصورت عمارت اور دونوں طرف شرقاً وغرباً صحنچیاں ہیں روکار پر نسخ و نستعلیق کے بہترین خط اور یہ تاریخ نظر آتی ہے ؎

شہ زمانہ محمد علی بنا فرمود　　امامباڑہ پئے ذکر مجلس حسنین
زروئے آہ دلم خواند نوحہ تاریخ　　بناء تعزیہ و ماتم امام حسین　۱۲۵۳ھ

امامباڑہ شیشہ آلات اور تبرکات سے آراستہ ہے اور دیواروں اور کھمبوں پر جا بجا سنہری ورق چپاں کرکے باڈر بنائے گئے ہیں پہلے دالان میں چاندی کا منبر چاندی کے تخت پر نقرئی شامیانہ بالائے منبر چاندی کی چوبوں پر نصب ہے اور چوکھٹوں میں دیوار رسل پر نسخ و نستعلیق کے طغرے قطعات مقامات متبرکہ کے عکس میر علی تبریزی کے قلم کا اصل کتبہ محفوظ رکھنے کا فخر اس ٹرسٹ کو حاصل ہے بیچ کے دالان میں بانی امامباڑہ حضرت محمد علی شاہ بادشاہ کی قبر نقرئی حفیرہ جس کے سامنے رحل پر قرآن شریف، شاہی تاج، چاندی کی انگیٹھی اور کشتی چوبداروں کا خصوصی پہرہ بہترین ایرانی قالینوں کا سنگ مرمر کی زمین پر فرش طرح طرح کے نقرئی اور طلائی علم حضرت عباس کے بڑے علم موم کی ضریح بھاری تعزیئے کارچوبی پٹکے سونے اور چاندی کے پنجے فولادی تلواریں جرید تین پر بارہ اماموں کے نام شیشہ کے تنگ دہن قرابہ میں ایک چھوٹی ضریح مبارک شہ نشین میں قدیم طرز کے اوٹ اسمائے معصومین لکھے ہوئے پردے زربفت کے اونچے اگردان، گلاب پاش روشنی کا سامان رکھنے کی خوبصورت چوکیاں اور ہر گوشہ میں وہ کثیر ساز و سامان کہ نہ اس کی تفصیل کی جاسکتی ہے اور نہ سرسری نظر میں چیزوں کی حقیقت کا فیصلہ ہو سکتا ہے سوز خواں، مرثیہ خواں، نثر خواں، کتاب خواں بانتخواہ ذاکری کے لئے مقرر رفتہ رفتہ فنون مشرقیہ ختم ہوتے گئے اور اسم تخفیف میں آتے گئے۔ کتاب خواں واقعہ خواں نہ رہا تو سوز خواں اور نثر خواں رہ گئے اب ان کی ذاکری بھی آخر ہے مرثیہ تحت اللفظ پڑھنے والے اور حدیث خواں رہتی دنیا تک رہیں گے اس لئے کہ یہ ایک حد تک مطابق فطرت ذاکری ہے اور فن آداب و آئین سے بے پرواہ ہے۔

کمال پرور نظر شاہ نے چوٹی پر کے ذاکرین کو تنخواہیں دیں کلیات دلگیر سے واضح ہوتا ہے کہ موصوف نے جو مرثیہ امامباڑہ کے دور اولیں میں پڑھا اس کا قطعہ یہ ہے ؎

غیب سے آئی ندا دلگیر کر جلدی دعا　　ہو گئی مقبول یہ مجلس حسین آباد کی
کی دعا میں نے رہے دائم سلامت بادشاہ　　دیکھے یہ شادی یہ ساری آل اور اولاد کی
خسرو عالی ہمم کو تندرستی کر عطا　　یا خدا تجھ کو قسم ہے حضرت سجاد کی

ایک دوسرے مرثیے میں اپنی پر خلوص زبان سے فرماتے ہیں ؎

دعا دلگیر کی سن لے خدایا　　یہ مطلب کر دے پورا میرے جی کا
ابوالفتح معین الدین کے سر پر　　رہے سایہ محمدؐ اور علیؑ کا

خدایا دیغ دردہائے شہ ہو — تصدق فاطمہ کی غم کشی کا
یہ شہ ہو بادشاہ ہفت کشور — تصدق فاطمہ کی غم کشتی کا

امامباڑہ کے مرثیہ خوانوں میں میرزا کی کا نام تاریخ اودھ میں موجود ہے آپ نے شاہ مرحوم کے ہاتھ ایک پنجہ علم مبارک کا ہدیہ کر کے قیمت کے علاوہ کثیر انعام پایا تھا۔ مؤلف کے ابتدائی دور میں پچاس برس پہلے سلطان الذاکرین میر محمد شاہ صاحب مرحوم کے بیٹے سید صاحب اور مرزا محسن صاحب ذاکری فرماتے تھے ۱۸۳۹ء میں تاجدار اودھ نے ۲۶ لاکھ روپیہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے کر امامباڑہ کے بقا کا پورا سامان کر دیا اور ۱۹ مئی ۱۸۴۲ء کو کوس رحلت بجایا اور اس متبرک مقام پر سپرد خاک ہوئے امامباڑہ کا سنہرا گنبد اس قدر خوشنما ہے کہ سورج نکلنے پر آفتاب کی کرن سے شعلۂ طور معلوم ہوتا ہے۔

مفتی گنج کا پھاٹک:۔ حسین آباد کے غربی پھاٹک سے گزر کر امامباڑہ کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں اور محلہ مفتی گنج شروع ہوتا ہے آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ پر ایک مسجد اور ٹوٹی ہوئی کچھ قبریں ہیں اس قبرستان میں سید اسمٰعیل مرزا میتا بیگ ابن سید عزیز اللہ کوتوال شہر کی قبر ہے اور قبر پر تاریخ بھی کندہ ہے۔ گوئے نیکے از جہان مرزا میتا بیگ بود۔ یہ مادہ تاریخ ہے مرزا علی رضا کوتوال انھیں کے فرزند تھے جن کی انتظامی صلاحیت لکھنؤ میں ضرب المثل ہے ان کی داد و دہش غربا پروری سچائی کون ہے جو نہیں جانتا وہ بڑے خوش خوراک اور فیاض شخص تھے اردو میں کہاوت ہے۔ "مزا تو گیا علی رضا کے ساتھ" اس کا مطلب یہ ہے کہ علی رضا کے بعد اچھا اور خوش ذائقہ کھانا کھانے والا کوئی نہ رہا۔ میاں مشیر کا ایک مصرعہ ہے ع "مرزا علی رضا کی دہائی ہے چھوڑ دے" قبروں کے محاذ میں ایک پرانی مسجد ہے جس کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ کس کی بنا کردہ ہے۔

شریف منزل:۔ بادشاہ مرحوم نے رئیس منزل اور شریف منزل خاندان کے ان لوگوں کے لئے بنوائی تھی جو چھوٹی چھوٹی تنخواہیں پاتے تھے اور نظر بندگان عالی میں قابل ہمدردی تھے اور دل چاہتا تھا کہ سب یکجا رہیں مگر ان حضرات کی آن بان کے خلاف تھا اور یہ کہہ کر انکار کیا کہ ہم خیرات خانہ میں نہ رہیں گے اس انکار پر عام لوگوں کو یہاں رہنے کا حق حاصل ہوا چنانچہ شریف منزل کی عمارت حسین آباد کے دوسرے غربی پہلو میں آج بھی موجود ہے اور لوگ رہتے ہیں جملہ مکانات آباد ہیں۔ شریف منزل سے واپس ہو کر حسین آباد کا غربی پھاٹک اور مفتی گنج کا راستہ ہے جس کے بعد یہ خاص حصہ ختم ہو جاتا ہے مگر تاریخ میں بعض مقامات کا اور ذکر ہے جو اب باقی نہیں ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں تھے لہٰذا اس کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے۔

سبیل:۔ پانی پلانے کی جگہ جہاں امام حسین کے نام پر بلا استثنا مذہب و ملت ہر پیاسے کو ٹھنڈا پانی دیا جائے ساتویں محرم سے خصوصی حیثیت سے سبیل کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے شاہی سبیل کا تاریخ اودھ میں ذکر ہے اور یہ اشعار دستیاب ہوئے ہیں ؎

نوشیرواں عصر ابوالفتح شاہ ہند — مقبول بارگاہ شہ مشرقین ہے
رکھوائی ہے سبیل تو تاریخ یہ ہوئی — آب سبیل نذر جناب حسین ہے ۱۲۵۴ھ

سرار:۔ امامباڑہ کے ساتھ کہیں سرار بھی تھی حسین آباد سے مفتی گنج تک سرار کا نام زبان زد نہیں ہے مگر تاریخ میں اس کا بھی ذکر ہے ؎

ابو الفتح منصور شاہ زمانہ	محمد علی سایہ حق تعالیٰ
رضا گفت تاریخ از حکم سلطانی	سرار ابو الفتح شاہِ معلی ۱۲۵۵ھ

یہ تاسیس امامباڑہ کے بعد کی ہے۔

سڑک[۱]:۔ تاریخ سے مدد نہیں ملتی کہ محمد علی شاہ بہادر کی سڑک کہاں ہے، ممکن ہے کہ بڑے امامباڑہ سے امامباڑہ حسین آباد تک کی راہ تعمیر کردہ مرحوم ہو اس کا وجود اس شعر سے واضح ہے ؎

بر روِش خطِ سڑک گشتہ صراط المستقیم	بر زمین پیدا شدہ گویا جواب کہکشاں
خسرو ہند ابو الفتح معین الدین است	رشک شاہانِ جہاں بادشہ ہندوستاں
چوں سڑک ساخت بنا مصرع تاریخ بگفت	ہست ایں نوعِ سڑک جادۂ راہِ ایماں ۱۲۵۳ھ

ست کھنڈہ:۔ تاریخ اودھ میں شاہی رصد خانہ کا ذکر ہے اور نجم الغنی نے محمد علی شاہ بادشاہ کے بنا کردہ عمارات میں ذکر کیا ہے اور ست کھنڈہ کو اس کے علاوہ دوسری عمارت شمار کیا ہے یہ رائے ان کی صحیح نہیں ہے تارہ والی کوٹھی کو عہد محمد علی شاہ کا تعمیر کردہ رصد خانہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے وہ اس سے پہلے کی عمارت ہے رصد خانہ کی تاریخ حسب ذیل ہے ؎

چوں محمد علی شہ دوراں	ساخت در لکھنؤ رصد تیار
کرد سالش رقم مہندس فکر	ایں رصد شہ بحکم شہ تیار ۱۲۵۴ھ

نجم الغنی ست کھنڈہ کو نا تمام عمارت بتلاتے ہیں اور اس کے بنوانے کی وجہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس پر سے بادشاہ تمام شہر کی عمارتوں کو دیکھنا چاہتے تھے صرف چار منزلیں بن کر رہ گئیں۔ اگر مرقومہ بالا تاریخ اسی عمارت کی ہے تو اشعار سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ عمارت بن چکی تھی اور یہ شہرت صحیح ہے کہ اوپر کے کھنڈ مخدوش ہو جانے سے اتروا دئے گئے احسن التواریخ کے فاضل مؤلف نے اس عمارت کے نو کھنڈ قرار دئے ہیں اور ہر طبقے کی ثنا و صفت میں ایک شعر نظم کیا ہے جس میں آسمان کے تاروں کا تلمیحاً ذکر ہے۔ قمر، زہرہ، مشتری، بہرام، خورشید مناسب الفاظ صرف کئے ہیں اور مادہ تاریخ وہی ۱۲۵۴ھ ہے ملاحظہ ہوں چند شعر ؎

محمد علی قبلۂ خسرواں	چوں افراخت ایں قصرِ نہ آشیاں
تاریخ اوّل رقم کرد ماہ	قمر گشت والا ز اوّل مکاں[۱] الخ

غدر ۱۸۵۷ء میں جو لوگ کاکوری کی طرف بھاگے تھے ان کی واپسی پر بے گھروں نے ست کھنڈہ میں قیام کیا تھا اور تاریخی واقعہ ہے کہ کہیں جگہ نہ تھی ست کھنڈہ کو رصد خانہ قرار دینے پر ہم مجبور ہوتے ہیں اور اتنی بڑی عمارت کا نیست و نابود ہونا تاریخ میں نہیں ہے۔

اس حلقہ کے مشہور لوگ:۔ طومار میں محلہ حسین آباد اور دولت خانہ کا عنوان قائم کرکے حسب ذیل لوگوں کے نام ہیں۔

نواب اشرف الدولہ، نواب منجھو صاحب، آغا مرزا صاحب، سلطان صاحب، میر سید علی صاحب، حاجی جعفر علی صاحب۔

---

[۱] احسن التواریخ ص۱۲۱

امامباڑہ عظیم اللہ خاں

شریف منزل اور احاطہ مرزا علی خاں سے متصل عقب حسین آباد تھا اور مجھے حالت اس قدر شکستہ ملی کہ اس کے آثار قدیمہ پر کوئی بحث نہیں ہو سکی بظاہر عمارت وسیع طویل و عریض تھی۔ انہدام سے پہلے دیکھنے کے قابل ہوتی۔ تاریخ میں ذکر ہے۔ اس امامباڑہ میں لکھنؤ کے مشہور پیراک خلیفہ رضا حسین رہتے تھے یہی عمارت کے آخری منتظم اور قابض تھے ورثہ میں تقسیم ہو کر اس کی حیثیت بگڑ گئی خلیفہ صاحب اور ان کی اہلیہ اسی امامباڑہ میں دفن ہیں خلیفہ صاحب دریا میں پیرنے کے بہت بڑے ہنرمند تھے دراز قامت تنومند، اور مضبوط اعضا جوارح۔ مختلف قسم کی پیراکی میں استاد مانے جاتے تھے نام کے ساتھ خلیفہ کا لفظ اس لئے موجود ہے کہ ان کے والد ماجد میر صفدر علی نے اپنے تمام کمالات فن میں ان کو جانشین کیا تھا جب مجلس میں آجاتے تھے تو ان کے ہم سن مزاح میں کہتے تھے کہ "تماشائی ڈھونڈتا ہے" شیرِ دجلہ میں ان سے بہتر کوئی نہ تھا اور جلیانگ کے بہت بڑے ماہر تھے ملاحی ایسی لگاتے تھے کہ پانی پر لکیر پڑ جاتی تھی ایک مرتبہ پتھری والے تالاب میں کھڑے ہو کر مگدر ہلاتے اور نواب باقر علی خاں رئیس شیش محل نے ان کے کمالات بچشم خود دیکھے آخر عمر میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔

طوطے اڑانا:۔ میر محمد علیؒ عہد محمد علی شاہ میں تھے انہوں نے طوطوں سے کبوتروں کا کام لیا اور بڑا کمال حاصل کیا طوطا فطرتاً بے وفا جانور ہوتا ہے وہ پنجرہ سے نکلتے ہی اڑ جاتا ہے لیکن خدا جانے میر صاحب نے کون سا افسوں دم کر دیا تھا کہ طوطے کی فطرت بدل دی تھی یہ دس بارہ طوطوں کی ٹکڑی اڑاتے تھے اور کیا مجال تھی کہ میر صاحب سیٹی بجا کر آ آ کریں اور وہ آسمان سے اتر کر سیدھے پنجرے میں نہ جائیں میر صاحب روز حسین آباد میں آکر طوطوں کی ٹکڑی اڑاتے تھے اردو میں طوطا چشم بے وفا آدمی کو کہتے ہیں۔ طوطے کی موت پر شعراء نے تاریخیں بھی نظم کیں ؎

میاں مٹھو جو ذاکرِ حق تھے — رات دن نام حق رٹا کرتے
گربہ موت نے جو آ دابا — مضطرب ہو کے اور گھبرا کے
چونچ میں داب کے سر کھپا — کچھ نہ بولے سوائے ٹے ٹے — ۱۰۲۸ھ

حسین آباد کے شہدے:۔ پیر بخارا کے شہدوں کے علاوہ حسین آباد میں بھی شہدوں کی ایک پارٹی تھی اور وہ نسبتاً شرافت پسند اور عزادار تھے عہد شاہی سے ان کے یہاں مجلسیں ہوتی چلی آرہی تھیں وہ شہر کے ہر طبقے سے واقف تھے ایک سال دینی مجلس میں میر محمد شاہ محدث سے پڑھنے کا وعدہ ہوا اور وہ وقت پر نہ پہونچے اس وعدہ کی کوئی اہمیت محسوس نہ ہوئی مجلس تیار اور ذاکر ندارد بعض تیز طبع سامعین طعنہ زن ہوئے کہ ذاکر کہاں ہے مجمع پراگندہ ہوا چاہتا ہے پورا گروہ اس غیر حاضری پر ناک بھوں چڑھائے تھا اور شہدوں کی عزت خاک میں مل رہی تھی یکایک ان میں کا ایک تنومند اور چالاک شہدا وعدہ کرکے روانہ ہوا میں ابھی لاتا ہوں محمد شاہ گھر پر احباب میں بے تکلفانہ بیٹھے تھے شہدے نے مجلس میں نہ پہونچنے کی سخت شکایت کرتے ہوئے جھنجھلا کر اٹھایا اور گردن پر سوار کرکے دوڑتا ہوا حسین آباد روانہ ہوا نخاس سے حسین آباد تک ہر راہگیر نے یہ منظر دیکھا میر محمد شاہ خود دوہرے بدن کے آدمی تھے شہدے پر سوار چلے جا رہے ہیں شہدے کی طاقت کی ہر سمت تعریف اور مہذب طبقہ گستاخی پر انگشت بدنداں کتنے

---

۱ قدیم ہنر ص۱۱۲

شائقین مجلس راستے ساتھ ہوگئے اور وہ مجلس میں اس ہیئت کذائی سے پہونچے۔ شہدا مجمع کو چیرتا ہوا صدر مجلس تک آیا اور منبر پر بٹھا دیا۔ اہل مجلس میں جو جوش پیدا ہوا وہ صرف حاضرین سمجھ سکے ناممکن ہے کہ ان کا ایسا قادر الکلام اس طرح کی آمد پر کچھ نہ کہہ سکا ہو ضرور کچھ کہا ہوگا مگر ترجمان اب کون ہے میر محمد شاہ ایسا پڑھے جیسا کسی سرمایہ دار کے یہاں بھی نہ پڑھے تھے۔ حسین آباد کے شہدوں کی سالانہ مجلس میرے زمانے میں ۲۶ صفر ۱۱ بجے دن کو ہوا کرتی تھی بدنصیبی سے مجھے کبھی شرکت کا اتفاق نہیں ہوا۔

میر محمد شاہ کے تالیفات میں غایۃ الشعور فی الحج المبرور ہے جو ۱۲۸۳ھ میں کلکتہ میں طبع ہوئی پھر منشی نولکشور نے ۱۲۹۰ھ میں لکھنؤ سے ۳۴۴ صفحات میں شائع کی۔

شبو پوری

مرزا احمد بیگ کٹیا کٹیا[1] عہد شاہی کے بانکوں میں محلہ شبو پوری میں رہتے تھے ایک دوسرے تلورئے اور ان سے تلوار چلی انہوں نے تلوار ماری اس نے سینے پر روکی اور تعریف کی کہ سبحان اللہ بے مثل ہاتھ پڑا اب اس نے بھرپور ہاتھ مارا انہوں نے بھی سینے پر روکا اور اس کے بھی ہاتھ کی تعریف کی کہ نہایت کاری ہاتھ پڑا ہے۔ اسی طرح دیر تک تلوار چلتی رہی مرزا نے لتنے ہاتھ روکے تھے کہ سینے پر تلواروں کے نشان کی ہیکل بن گئی لوگوں نے بیچ بچاؤ کرایا اس دن سے مرزا صاحب کٹیا کٹیا کے نام سے مشہور ہوگئے۔

ممتن خاں:۔ وہ عہد واجدی میں اس محلہ میں رہتے تھے اور گھوڑا نکالنے میں مشاق تھے شیخ ببر علی مشہور کامل الفن کے شاگرد تھے غدر کے بعد برسوں زندہ رہے پھر مر گئے۔[2]

شیش محل

لکھنؤ کی پہلی بنیاد اور شہری داغ بیل کا نقش اول اور وہ جگہ جہاں نواب آصف الدولہ بہادر کے خیمے ڈیرے نصب ہوتے تھے اور پڑاؤ میں مدتوں قیام فرمایا اور سنجیدہ ملازمین کی تحریک سے بارگاہ خاقانی نے عمارتی صورت اختیار کی تو اس کا نام شیث محل قرار پایا جو کثرت استعمال اور تبدیل ذہنیت سے شیش محل ہوگیا نام رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ محترم بانی علم پرور تھے اور مذہبی جادہ سے قدم نہیں ہٹاتے تھے ہر گام پہ فردتنی کا ثبوت دیتے تھے اور نام رکھنے میں راز یہ تھا کہ جب دنیا کی پہلی بستی قابیل کے ہاتھ سے قتل ہوئی یعنی ہابیل کو بھائی نے مار ڈالا تو نسل انسانی قابیل کے معذب ہونے کے بعد شیث سے قائم ہوئی اور ان کو ہبۃ اللہ (بخشش خدا) کہا گیا۔ واقعات سے باخبر طبقے کے لئے اس سے بہتر فال نیک نہ تھی کہ وہ پہلی بنیاد کا نام شیث محل رکھیں فتح پور سیکری میں بھی پہلی بستی کا نام اکبر کے دور میں آدم پور اور شیث پور رکھا گیا تھا[3] حقیقت سے بے خبر مکین نے اس نام کی عمارت کو اپنی ذہنیت کے مطابق ہر سمت شیشے جڑ کے دیواروں کو اپنے نزدیک شیش محل بنایا حالانکہ وہ شیشوں سے آراستہ ہونے کے پہلے ہی شیث محل تھا ؎

فلک نما ہے بلندی میں آبلہ دل کا — جواب شیش محل ہے وہ منزلہ دل کا

شیش محل میں کیا تھا؟ اس کی صحیح نقشہ کشی اب ممکن نہیں ہے اور دور اول کا نقش کہیں کہیں مٹا ہوا باقی ہے۔

شیش محل کا پھاٹک عظیم الشان اور دور رفتہ کی مکمل تصویر ہے وسعت، بلندی، قدامت در و دیوار سے واضح ہے۔ اور پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ کی پہلی بنیاد اسی کو ہونا چاہیے۔ دروازہ کے بعد محلہ سرائے آصف الدولہ شروع ہوتی ہے جس کا پہلا حصہ یعنی

---

[1] قدیم ہنر ص ۱۲ [2] قدیم ہنر ص ۱۵۳ [3] آثار اکبری ص ۹

ملاقاتی کمرہ دروازے کے محاذ میں تھا جو اب کھنڈر کی صورت میں ہے [بائیں ہاتھ پر سنگ مرمر کی ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس میں نواب نماز پڑھتے تھے سنگی عمارت ہونے سے اس پر شکستگی کے آثار طاری نہیں ہوئے، اہل محلہ نماز پڑھتے ہیں اور خانۂ خدا آباد ہے۔] بائیں ہاتھ پر رہائشی قصر ہے جس کے لامبے دالان، اونچی کرسی، بلند چھتیں موٹے موٹے کانپ چونے کے کھمبے یہ حصہ سلیقہ شعار رہنے والوں کی توجہ اور شکست وریخت کا انتظام وقتاً فوقتاً ہوتے رہنے سے ٹھیک حالت میں ہے عزاخانہ اور نشست دربار کی جگہ، زنانہ حصہ سب جگہیں اسی وقت کی بنیاد ہیں اور رقبہ بہت بڑا ہے۔

نیاز فتحپوری لکھتے ہیں نواب فدا پھبتی کہنے میں بہت مشہور تھے نواب شیش محل کا ایک ضعیف العمر ملازم تھا سانولا رنگ گول چہرہ چیچک رو، دانت گر گئے تھے اس لئے ہونٹ اندر کو دھسے رہتے تھے اس پر نواب فدا کی نظر پڑی چونچ ٹوٹے الو کی پھبتی کہی اور ایسی کہی کہ دھوئے دھوئے نہ چھوٹی۔

چاندی والی بارہ دری :۔ رقبہ شیش محل کا وہ حصہ ہے جو اب اجاڑ ہے اور یہ عمارت بھی کھنڈر ہونے والی ہے جنوبی سربلند دیوار دور سے نظر آتی ہے اور غربی درجہ باقی ہے کہا جاتا ہے کہ اس پوری عمارت پر چاندی منڈھی ہوئی تھی درمیانی ابھرا ؤ دار چھت اور دیواروں پر استرکاری نام کو بھی باقی نہیں ہے جنوبی و شمالی صحنچیوں میں چھت اصلی حال پر باقی ہے۔ رنگین گل بوٹے خوشنما بیلیں شوخ رنگ سے گلکاری اور جڑے ہوئے شیشوں کی چمک گزشتہ آراستگی پر اب تک گواہ ہے۔ یہاں سے تالاب تک کبھی بن برستا ہوگا اب کھیت ہیں اور بیلوں کا گوبر۔

تالاب :۔ بہت چوڑا چکلا ہے اور پانی زیادہ سے زیادہ اب بھی موجود ہے گرد کی عمارت تو اب باقی نہیں دست چپ کی طرف کچھ حصہ اس کا دروں کی صورت میں دھنسا ہوا موجود ہے۔

مہتاب باغ :۔ قدیم شیش محل کا خوشنما باغ جو مرقومہ عمارات کے عقب میں واقع ہے اور پھاٹک اس باغ کے بڑی خراب حالت میں اب بھی باقی ہیں پچاس برس پہلے باغ اچھی حالت میں تھا ابتدا انگریزی میں جب کلاں کوٹھی کے سامنے قواعد ہوتی تھی مزدوروں کے جمعدار اور گول اندازوں سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا پتھر اور ڈھیلے طرفین سے چلتے رہے سو گول انداز بھاگ کھڑے ہوئے اس واقعہ کے بعد سارجنٹ نے مہتاب باغ میں قواعد شروع کی، باغ اب ویران ہے۔

شیش محل میں ایک شخص رہتے تھے جو جانوروں کی بولیاں بولتے تھے بٹیر، تیتر، مور، مرغ، کتا، بلی کی صدائیں ان کی مشق کردہ آوازیں تھی ابھی چند سال پہلے تک تھے۔

گیند خانہ :۔ شمالی رخ پر ایک فلک نما دیوار ہے جس کے پہلوؤں میں بجائے برابر کی دیوار کے ڈھال دیوار ہے وسطی جدار کے اعلیٰ حصے سے بلند اور آخر میں دونوں طرف سے زمین دوز ہے۔ استرکاری کی سیاہی پرانے کام کی پختگی اور مضبوطی اور سیکڑوں برس کی بارش کے بعد بھی باقی ہے یہاں نواب گیند کھیلتے تھے بعض لوگ اس عمارت کو گیند خانہ کے بجائے چاندماری کہتے ہیں۔

سبحان خاں کا اکھاڑہ :۔ شیش محل میں یہ اکھاڑہ بھی قدیم ورزش کی جگہ تھا مشہور پہلوان استاد سکندر اسی اکھاڑے کے رودار جوان تھے شیدی فضل علی ان کے شاگرد تھے۔

۱؎ نیا دور اگست ۱۹۵۶ء ص ۲۱ از اخبار علم ۳ اکتوبر ۱۸۷۰ء

موتی مسجد:۔ شیش محل کے تالاب سے کچھ دور جاکر سامنے بلندی پر یہ عظیم الشان مسجد واقع ہے اور صرف ایک بلند چھت کا دالان ہے۔ اس کی سقف سے شہر کا دیہاتی حصہ اور دور دور نگاہ پہونچتی ہے۔ اس مسجد کے روکار کی صورت یہ ہے سنگ تعمیر

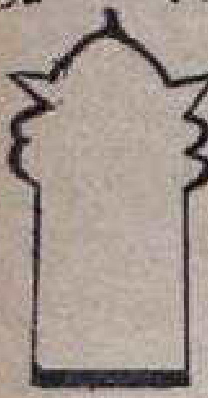

تھا۔ مگر کسی دست درازنے نکال لیا اس مسجد میں دو بغلی محرابیں خاص طور سے دیدہ زیب ہیں مسجد میں جانیوالے در تو تین ہی ہیں مگر بیچ میں چھوٹے دو در قرار دے کر پانچ دروازے بنائے ہیں گنبد اور میناروں کے کلس غائب ہیں مسجد سے قریب باغ ہے جس میں کچھ پرانی قبریں ہیں ایک کمرہ قیامگاہ کا بڑی خوبصورتی سے نکالا ہے جو کہ سقف مسجد سے آکر ملتا ہے اس مسجد کے مینار پکے پل سے دکھائی دیتے ہیں محراب اس نمونے کی ہے۔

(نوٹ) شیش محل غدر کے بعد سے نواب جعفر علی خاں اور نواب باقر علی خاں صاحبان کے مورث اعلیٰ کے قبضے میں آیا۔ یہ حضرات پہلے چارباغ میں سکونت پذیر تھے جب چارباغ اسٹیشن کی پہلی تعمیر انگریزی دور میں شروع ہوئی تو وہاں سے ہٹا کر شیش محل پر قبضہ ملا اور اس وقت نواب صاحب شیش محل انھیں دو مقتدر رئیسوں کی اولاد اور کنبہ کے لوگ کہلاتے ہیں نقرئی بارہ دری نواب باقر علی خاں صاحب مرحوم کے وقت تک تھی یہ شہر کے امیر کبیر تھے۔

(اطلاع) اب ہم آگے بڑھنے کے بجائے پہلو کے محلوں پر متوجہ ہوتے ہیں ان پر انشاء اللہ کامل بحث کے بعد پھر اس طرف گذریں گے اور موہن کے پور وا پر اس باب کو ختم کریں گے۔

شیخ حیدر بخش:۔ عہد سلطان عالم کا باورچی[1] تھا جو ۱۹۳۳ء میں مرگیا پچانوے سال کے قریب اس کی عمر تھی نواب محمد باقر علی خاں بہادر رئیس شیش محل کا ملازم تھا۔ ایک بار نواب مرحوم نے نواب سید بنیاد حسین خاں صاحب جاہ کو دو خوان کھانے کے بھیجے تھے جس میں سارا کھانا مونگ کی دال کا تھا (دہی بڑے) اروی کا سالن پراٹھے کباب پلاؤ وغیرہ یہ سب حیدر بخش نے مونگ کا پکایا تھا حیدر بخش انار پلاؤ اور شریفہ پلاؤ پکاتا تھا اگر اصلی اناروں اور شریفوں میں ملا کر اس کے ہاتھ کا بنایا ہوا شریفہ اور انار رکھ دیجئے تو کوئی پہچان نہ سکتا تھا کئی بار اس کا امتحان ہو چکا ہے حیدر بخش تین سو ساٹھ ۳۶۰ قسم کی روٹی پکانا جانتا تھا۔ ہاتھی کان روٹی ایسی پکاتا تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھی کا کان کتر رکھا ہے اندر کھائیے تو کسی قسم کی گرانی نہیں۔ حیدر بخش تنکی بے مثل پکاتا تھا ذرا سی ٹھیس میں ٹوٹ جاتی تھی میں نے خود اس کے ہاتھ کی تنکی نمش کے ساتھ کھائی ہے۔

شیخ محمد علی:۔ عہد نصیر الدین حیدر کا خیاط تھا اور اپنے کمالات[2] میں ممتاز تھا سعادت گنج کا رہنے والا تھا شیخ الٰہی بخش اس کے سگے بھائی تھے۔ محمد علی کا یہ کمال تھا کہ پورا انگرکھا ایک تاگے سے سیتا تھا اگر تاگے کو پکڑ کر کھینچ لو تو پورا انگرکھا کھل جائے۔ محمد علی ایسا بھی سیتا تھا کہ کاندھوں یا چو بغلوں میں جوڑ نہیں ہوتا تھا۔ آغا سید مجتبیٰ حسین خاں صاحب رئیس نے جو شیش محل کے رہنے والے تھے اس کے ہاتھ کے انگرکھے پہنے تھے۔ محمد علی کے مقابلے کے لئے ایک درزی فیض آباد سے آیا اور چار طرح سے بر کا پیجامہ سی کر دکھایا محمد علی نے (چوڑی مہری کا) سات طرح سے تیار کیا وہ استادی کو مان گیا محمد علی سرداری بھی بے مثل سیتا تھا۔ اس کے ہاتھ کی سی ہوئی سرداریاں سید مجتبیٰ حسین خاں پہنا کرتے تھے۔ اس کے ہاتھ کی سرداری نواب سید محمد حسین خاں عرف چھجو صاحب کے پاس ہونا چاہئے۔ محمد علی کا نواب جعفر علی خاں صاحب رئیس شیش محل اور آغا سید مجتبیٰ حسین

---

[1] قدیم ہنر ص ۱۳۵ [2] قدیم ہنر ص ۱۶۱

خاں شیش محل[1] سے مرتے دم تک توسل رہا ۱۹۳۳ء میں لاولد کچھ کم سو برس کا فوت ہوا۔

سرائے معالی خاں

اس محلہ کو عہد برہان الملک کے سردار نے آباد کیا اور اس قدر معزز لوگ یہاں آ کر بسے کہ ان کے ذاتی کمالات اور صفات زندگی کے کارنامے اب تک تاریخوں میں موجود ہیں اور وہ عمارتیں جو انقلاب زمانہ نے باقی نہیں رکھیں اور جو ہنوز گرتی ہوئی حالت میں باقی ہیں تاریخی یادگار ہیں اس محلہ کے حدود فینس والی گلی سے شروع ہو کر کاکوری روڈ سے مل کر ختم ہوتے تھے۔ اس سڑک کا نام انگریزوں کے زمانے میں ـــ نیپیرا سٹریٹ تھا سڑک نے لاتعداد امراء و رؤسا کی ڈیوڑھیاں زمین کے برابر کر دیں۔

مکان منصف الدولہ بہادر:۔ نام نامی سید محمد باقر خطاب منصف الدولہ شریف الملک تھا۔ آپ سلطان العلماء سید محمد صاحب مجتہد العصر والزماں کے بڑے بیٹے بیاہتا بیوی سے تھے۔ مہدی گنج کی کربلا آپ ہی کی تعمیر کردہ ہے۔ سلطنت اودھ میں خاص خصوصیات کے حامل تھے اور آخر عمر تک پختہ مکان نہیں بنوایا کھپریل میں زندگی بسر کرتے تھے امراء و روساء اور اعیان شہر کی ضرورتیں وابستہ رہتی تھیں اور کوئی دولہ اور ملک نہ تھا جو یہاں حاضر نہ ہو سکا ہو مگر منصف الدولہ کی قیامگاہ ہر شخص نے ایک رنگ پر دیکھی ان کی رحلت کے بعد ان کے بیٹے سید محمد جعفر امید آخر تک باپ کی قیامگاہ میں رہے یہاں تک کہ غدر کے بعد یہ مکان سڑک میں شامل ہو کر منہدم ہو گیا۔ منصف الدولہ مؤلف کی دادی صاحبہ مرحوم کے نانا تھے۔ اس لئے بار بار ان کی زبان پر یہ جملہ آتا تھا کہ ہم سرائے معالی خاں کے رہنے والے ہیں اور سڑک نکلنے پر یہ چار قیام شاہراہ عام ہو گئی سید محمد کاظم جاوید خلف امید کے بعد انتقال اس مکان کی نشان دہی کرنے والا کوئی نہ رہا۔

منصف الدولہ نے ساٹھ برس کی عمر میں فقیرانہ زندگی بسر کر کے اس دنیائے فانی کو چھوڑا۔ ان کی داد و دہش اور فیاضی کی حکایتیں اب تک لوگوں کی زبان پر ہیں۔ معالی خاں کی سرائے سے مہدی گنج تک ہر شب کے ساتھ سونے چاندی کے پھول لٹتے ہوئے چلتے تھے اس مکان کے ایک مشاعرے کا ذکر تاریخ سے واضح ہوتا ہے جس میں بانی مشاعرہ کی شخصیت سے مفتی میر عباس صاحب ایسے مجسمہ کمال نے شرکت کی ورنہ وہ زینت محراب و منبر تھے نہ کہ مشاعروں میں زندگی بسر کرنے والے امید آئے اور خود ان اجتہاد کا رکن ہونے سے مفتی علام نے تعظیم کی عرض کیا۔ آج میرے یہاں مشاعرہ ہے آپ کو بھی زحمت دوں گا مفتی صاحب نے ہنس کر فرمایا کہ مشاعرے میں میرا کیا کام، انہوں نے بے حد اصرار کیا راضی ہو گئے اور تشریف لے گئے شیخ ناسخ کی مشہور طرح تھی کہ "مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا"۔ کنول گردش کرتا ہوا مفتی صاحب کے سامنے آیا۔ لوگوں نے اصرار کیا کہ حضور بھی کچھ پڑھیں چند شعر جو وہیں بیٹھے بیٹھے نظم کر لئے تھے پڑھ دئے مشاعرہ الٹ گیا۔ عزیز لکھنوی فرماتے ہیں کہ ایک شعر اب تک لوگوں کو یاد ہے ؎

مریں گے صبح تک امیدوار وصل اے گردوں ۔۔۔ ابھی سے ماتمی کیوں پیرہن[2] ہے شام ہجراں کا

امید نے مرثیے بھی کہے اور ان کے ایک مشہور مرثیے کا یہ مطلع تھا ؏ "فکر ثنائے مشہد ذی احترام ہے"۔ امید صاحب دیوان تھے ان کا ایک شعر یہ ہے ؎

---

[1] منہ ص ۱۶۳ [2] تجلیات ص ۳۹۵

طالب اوج نہ ہو مثل فلک اے منعم   کہیں تجھ میں بھی نہ بیدادگری آجائے

امید نے ۲۴ ربیع الآخر ۱۲۹۳ھ میں سفر آخرت کیا اور امامباڑہ غفران مآب میں دفن ہوئے قبر پر سنگ مزار ہے قطعہ تاریخ آشکار ہے جو آپ مہدی گنج کی کربلا کے ذیل میں پڑھ چکے۔

منصف الدولہ کے کتب خانہ کا ذکر تشئید المطاعن[1] مشہور مناظرہ کی کتاب میں ہے۔ مخفی نماند کہ از نسخہ کنز العمال کہ نیمہ آن از کتب خانہ فضائل مآب فواضل ایاب السید محمد باقر نجل سلطان العلماء دام اللہ ایامہا ست و نیمہ ثانی آن از خزانہ کتب سلطان الحکماء مرزا علی حسن دام مجدہ کہ علی ماکتب فیہ از نسخہ مصنف مقابلہ شدہ پیش نظر فقیر حاضر بود۔

امام باڑہ زین العابدین خاں :۔ آپ میاں الماس کے ہمعصر اور کوڑی دلے کے نام سے لکھنؤ میں مشہور تھے اور عہد آصفی کے دو نوں سرمایہ دار تھے جن کی یادگار موجود ہے سڑک نے حدود امامباڑہ میں تغیر پیدا کیا اور امتداد زمانہ نے چھتوں کو باقی نہ رکھا بجز لق و دق دیوار و در امامباڑہ میں کچھ نہیں ہے۔ امامباڑہ شمالی رخ پر کھنڈر کی صورت میں واقع ہے درمیان میں سڑک ہے اور جنوب کی طرف کنواں ہے سن رسیدہ لوگوں نے بیان دیا ہے کہ امامباڑہ کی عمارت اور صحن کنویں تک تھا اور چاہ جزو امامباڑہ ہے۔

اس عمارت پر خط نسخ کے کتبے باقی ہیں جو لکھنؤ کی دوسری کربلاؤں کی طرح آیات قرآن یا فقرات زیارت کی صورت میں اس زمانے کی خطاطی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

میر صاحب موصوف کا ایک امامباڑہ و مسجد دریا کنارے مقام ٹیہور میں بھی ہے جو ۱۲۰۳ھ کی تعمیر ہے اور جعفر گنج کی مسجد کا سنہ تعمیر ۱۲۰۲ھ ہے۔ رفیقۂ حیات کا نام مصری بیگم تھا جو شوہر کی جائداد سے ستر لاکھ روپے کی مالکہ تھیں خدا نے ان کے بطن سے کئی بیٹے اور بیٹیاں بھی مرحمت کی تھیں سید کاظم میر ہادی علی باقر علی ان کی اولاد کے نام ہیں شعبان ۱۲۰۷ھ میں آپ نے رحلت کی جیسا کہ اس قطعہ تاریخ سے واضح ہے ؎

بچو وفات میر زین العابدین	خلق را افزود صد رنج و قلق
ماہ شعبان بود ہم یوم الخمیس	کرد غمش گردید خاتم سینہ شق
سال تاریخش نوشتن خواستم	از سواد خامہ غم بر ورق
گفت فائق با دو حرف حزن دل	گشت زین العابدین واصل بحق

اور زد و حروف شامل کر کے ۱۲۰۷ھ ہوتے ہیں۔

ایک لامعلوم حقیقت :۔ پشاور محلہ گل بادشاہ میں ایک امامباڑہ ہے جس کی تولیت سید واجد علی شاہ کربلائی کی ذات سے خاص ہے موصوف بیان کرتے ہیں کہ ہمارا آبائی وطن سرائے معالی خاں لکھنؤ تھا ہمارے والد سید ظفر علی شاہ ابن سید علی خاں ابن سید احمد خاں خاندان آغا میر جعفر کمانڈر سے تھے جو عہد برٹش میں اعلیٰ فوجی خدمات انجام دیتے تھے اور پشاور ان کا ہیڈ کوارٹر تھا پشاور میں انہوں نے امام باڑہ حسین آباد تعمیر کیا جو وہاں کے مشہور عزاخانوں میں ہے۔ موصوف لکھنؤ سے ہجرت کے وقت

---

[1] تشئید المطاعن ص۸ طبع لودیانہ ۱۳۲۲ھ

وہاں کے امام باڑہ سے شامیانہ، علم، اور سنگی حوض بطور یادگار لیتے آئے اور یہ چیزیں اب بھی پشاور کے امام باڑہ میں لکھنؤ کی موجود ہیں۔

امتداد زمانہ سے ناقل کو لکھنوی امام باڑہ کا نام محفوظ نہیں رہا محلہ یاد ہے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ امام باڑہ زین العابدین خاں کے آثار قدیمہ میں پایا گیا۔ مؤلف کے قیام پشاور کے بعد یہ حقیقت منکشف ہوئی میں اس عزاخانہ کو دیکھ نہیں سکا۔

رانی کا کٹرہ:۔ معالی خاں کی سرا، کا وہ حصہ جو چوپٹیوں سے گذر کر دست چپ کی طرف واقع ہے عہد شاہی میں یہاں مطبع محمدی تھا جس کے خصوصیات اپنے ہم عصر مطابع کے ایسے تھے وصیت نامہ نقد اکبر اس پریس کا چھپا ہوا میں نے دیکھا ہے جس کا نسخ و نستعلیق بہترین کتابت کا نمونہ ہے۔

کالی چرن مختار:۔ آپ نواب اختر محل دختر نواب علی نقی خاں کے مختار تھے اور اس سرکار سے کئی لاکھ روپے کی حیثیت حاصل کی تھی اور جس علم نواز خاندان کا نمک کھایا تھا اور اس کے فیض صحبت میں تمام سرمایہ صرف کر کے انگریزی اسکول بنا دیا جو اس وقت کالی چرن انٹر کالج کے نام سے باقی ہے نیپر اسٹریٹ کے بائیں طرف عقب اسکول کا وہ نشیبی حصہ ہے جہاں کچھ گرے ہوئے مندر اور ٹوٹی ہوئی مسجدیں اسی معالجے کی معلوم ہوتی ہیں جو عہد قدیم کا اپنی ساخت میں ممتاز ہوا کرتا ہے اس اسکول کی بنیاد پڑنے میں سیکڑوں مکانات شرفاء کے منہدم ہو کر شامل ہو گئے۔

قبر خواجہ حیدر علی آتش:۔ سڑک پر جانب شمال نواب بنن صاحب ثروت کا مکان تھا جو میرے ہمعصر اور لکھنؤ کی پرانی تہذیب کے نمونہ تھے ان کے مکان کے سامنے آتش کی قبر تھی اس قبر کا پتہ زمین کالی چرن اسکول کا نام سن رسیدہ لوگوں کی زبان پر آتا ہے اور بعض بوڑھے بنن صاحب ثروت کے مکان کا پتہ دینے کے ساتھ مسجد کے صحن کا بھی ذکر کرتے ہیں اور جو پڑی قبر ہے وہ آتش کی ہے۔

خواجہ اپنے رنگ میں یکتا تھے ان کے کمالات شعری تعارف سے برتر ہیں سراپائے محبوب میں کہتے ہیں ؎

چار ابرو ہیں ترے حیراں ہیں سارے خوشنویس — کس قلم کا قطعہ ہے یہ کاتب تقدیر کا

رنگ تغزل ملاحظہ ہو ؎

پاؤں بھی گھاؤ جمائی ہے جو مسّی کی دھڑی — شام تو دیکھی شفق کو بھی دکھایا چاہیئے

یہ مشہور شعر بھی آتش کا ہے ؎

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب — زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

بلند ہو نہ زمیں سے مرا مزار آتش — نشان قبر سے منظور مجھکو نام نہیں

سامنا اپنا کسی جنگل میں ہو گا موت سے — یاں کفن کے چور کا حصہ نہیں اسباب میں

کلیات آتش نول کشور پریس کانپور میں تقطیع ۲۲ × ۲۹ ۱/۴ ۱۸۷۳ء میں طبع ہوا دونوں حصہ ۲۵۵ صفحات پر ختم ہوئے ہیں

میر انیس کے پڑھنے کی مفتی گنج میں مجلس اور مکان بانی مجلس کا کھچا کھچ بھرا ہوا شروع کا وقت گذر گیا مگر انیس زینت منبر نہیں ہو رہے ہیں حاضرین دم بخود ہیں سامعین پر ایک سکوت چھایا ہوا ہے۔ بات کیا ہے؟ عہد شاہی کی مجلسیں تو عموماً وقت پر شروع

ہوتی تھیں انیس موجود بھی ہیں بڑے انتظار کے بعد معلوم ہوا کہ آتش آنے والے ہیں ان کی ہیئت کذائی دیکھتے ہی نظریں اٹھ گئیں اور صاحبانِ کمال نے ہاتھوں ہاتھ اس آزاد شاعر کو قریب منبر پہونچایا سارے مجمع کی نگاہیں آتش کی طرف ہیں کہ وہ کس مقام پر داد دیتے ہیں انیس ایسا خود دار انسان بھی ان کا احترام کرتا تھا۔

آتش گورے چٹے وجیہ چھریرا بدن رندانہ وضع کے آدمی تھے آدھا سر منڈا ہوا اور آدھے پر پٹے جو اس زمانے کے بانکوں کی وضع تھی ہمیشہ سیدھی دو رخی تلوار باندھتے تھے۔ ایک دوسرا بیان ہے کہ آتش گیروی تہمد باندھے ہوئے نظر آئے۔ ڈنڈا کبھی ہاتھ میں رہتا تھا جس میں سونے کا چھلا پڑا رہتا تھا جب دوسرا تیسرا فاقہ ہوتا تھا تو چھلا رہن کرکے فاقہ شکنی ہوتی تھی۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مکان میں دفن ہیں اور ۱۲۶۳ھ میں آتش نے قوم کو داغِ فراق دیا کچھ تعجب نہیں کہ کالی چرن اسکول کے قدم آراضی پر ان کا مکان ہو اور انقلابات دنیا کے بعد قبر مسجد کے قریب معلوم ہوتی ہو۔ واقعہ نگاروں نے جب آتش کے مکان پر بحث کی ہے تو وہ بیان بھی مقام قبر کو غلط ثابت نہیں کرتا۔ آتش کا مکان کہاں تھا؟ نوازگنج سے قریب چوبیٹوں سے آگے مادھو لال کی چڑھائی ہے وہاں سے اتار میں ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا آتش اس سے قریب کچے مکان میں رہتے تھے یہ مکان آتش نے خرید لیا تھا۔ منشی امیر اللہ تسلیم نے جب آتش کو دیکھا تو ستر برس کی عمر ہو چکی تھی ایک بالشت سے زیادہ لانبی داڑھی تھی اور مہندی کا خضاب کرتے تھے لنگوٹ باندھے ہوئے ایک ٹوٹے ہوئے زمین دوز کھٹولے پر تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے رہتے تھے۔ کھٹولے کے قریب دو تین نرکل کی چٹائیاں بچھی رہتی تھیں صد افسوس کہ نہ مکان رہا اور نہ مکین ؎

سرِ گورِ غریباں کچھ نہ پوچھو حالِ دل ثاقبؔ
زمانہ جن کو بھولا ہے ہم ان کو یاد کرتے ہیں

<u>امام باڑہ الماس</u>:- الماس علی خاں تحسین علی خاں ناظر کے ہمعصر اور نوابی کے سرمایہ دار خواجہ سراؤں میں تھے معالی خاں کی سرائے میں ان کا امام باڑہ زیادہ سے زیادہ زمین گھیرے ہوئے ہے۔ عہد شاہی کی اینٹ کہیں کہیں اب تک گلیوں میں فرش زمین کی صورت میں ہے جس کو لکھوری یا لگنگھی کی اینٹ کہتے تھے الماس علی خاں نے عمارت کے جلدی تیار ہونے کے لئے بڑی اینٹ بنوائی اور ان کے دماغ میں گز کا تصور تھا اگرچہ یہ اینٹ لکھوری کے مقابل میں پائدار ثابت نہیں ہوئی مگر مکانات جلدی بن کر تیار ہوتے تھے امام باڑہ الماس میں یہی اینٹ استعمال ہوئی۔ اس عمارت کے بعض غرفے آصف الدولہ کے امام باڑہ کی کھڑکیوں سے مشابہ عظیم الشان پھاٹک اور وسیع صحن جس کے پہلوؤں میں جو عمارت بھی ہو اس کا موجودہ حالت میں تصور نہیں ہو سکتا بلند دروازے سے سمت راست پر وسیع اور عالیشان مسجد ہے جس کے در و دیوار کی خوبصورتی محرابوں کی شان گنبدوں میں کاریگری میناروں کی استقامت دیکھنے کے قابل ہے کاکوری روڈ نے سڑک اور قدیم راہ کو غیر معمولی بلند کر دیا اور پہلو سے مسجد پر نظر کرنے میں خانۂ خدا کے تمام محاسن سڑک سے گذرنے والا دیکھ سکتا ہے زیر مسجد دوکانات یا کوٹھریوں کا سلسلہ ہے جو غریب طبقے کے بسانے میں بانی مسجد کے زیر نظر رہا یہ مسجد بھی دور دور سے دکھائی دیتی ہے اور غربی شہر کے ہر گوشے سے اس کا نظارہ ممکن ہے صحن مسجد میں حوض اور گرد عمارت ابھی باقی ہے افسوس ہے کہ امام باڑہ اس قدر کھنڈر ہو چکا ہے کہ اس میں بجز دیوار و در کچھ نہیں رہا پہلے پھاٹک کے بعد جو زمین بطور دیوان خانہ ہے اس کو قطع کرکے دوسرا پھاٹک اور صحن امام باڑہ شروع ہوتا ہے پہلو میں مکانات ہیں ان کی چھتیں بھی شق ہو چکیں مصالحہ نے ساتھ چھوڑ دیا ہے مگر مٹانے والے

اگلی صورت کے بگاڑنے میں اب بھی ساتھ نہیں چھوڑتے اگر ذاتی استعمال میں امامباڑے کے حصے رہتے اور تصرف سے محفوظ رہتے اپنے آرام کے لئے مرمت کرتے رہتے تو ایک قلعہ تھا جو سیکڑوں آدمیوں کو پناہ دیتا۔

الماس علی خاں نے بڑے آرام کی زندگی بسر کی اور دوسرے صاحبان حاجت کو مالی مدد میں کبھی عذر نہیں کیا چنانچہ امرا شہر پران کا لاکھوں روپیہ قرض پھیلا ہوا تھا جب مرنے کا وقت آیا تو تمام دستاویزات مسجد کے حوض میں ڈال دئے اور علے سے کہا کہ میں نے سب کو بقایا۔ تو تم معاف کردئے۔ الماس کے امامباڑہ میں اس وقت دھوبی رہتے ہیں اور ٹوٹے ہوئے دیوار و در تصویر انقلاب ہیں یادداشت لکھنؤ کی امیرزادیاں اور عام لوگ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ دھوبن رات کو کپڑے لے کر آجائے اس کو شگون بد سمجھتے ہیں اور دھوبن کو ٹکسالی زبان میں اجلی کہتے ہیں ؎

کاجکے میری نئی دیکھئے ٹروڑی انگیا — دھوبی ہے دیکھو بے طرح سے کیا اجلی نے

ثابت مرحوم نے میر ضمیر کی مجلس کا اس محلہ میں ذکر کیا ہے جس سے رجحان ہوتا ہے کہ ضمیر اس علاقے کے رہنے والے تھے۔

نواب کاظم حسین خاں :- آپ اولاد شجاع الدولہ سے تھے اور سرائے معالی خاں میں رہتے تھے یہ ذکر ہے عہد واجدی کا۔ تصویریں بنانے کا شوق تھا۔ جانوروں کی تصویریں بہت عمدہ بناتے تھے اور کبھی کبوتر کی تصویر تو ان سے بہتر کوئی نہ بنا سکتا تھا۔ مورخ کا بیان ہے کہ ۱۹۳۶ء تک ان کے ہاتھ کی تصویریں نخاس میں بکنے آتی تھیں تخمیناً ۱۹۲۶ء میں انہوں نے رحلت کی۔

قاری صاحب :- محلہ کے رہنے والوں میں وہ باکمال قاری ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ عہد شاہی میں دو عرب لکھنؤ میں آئے اور ان کو تمام قاریوں کا امتحان منظور ہوا اور ہر ایک کی قرأت سنی اور کسی کی وقعت نظروں میں نہ ہوئی ان کے کمال کی بہت تعریفیں تھیں معمر ہو چکے تھے دانت گر چکے تھے قوت باقی نہ تھی پھر بھی مطالبے پر قرآن پڑھا اور وہ مقام جہاں حرف ص کو ع سے ملایا گیا تھا ادا کیا عرب وجد میں آگیا قاری صاحب نے سترہ طریقوں سے پھر اس فقرے کو ادا کیا عرب مبہوت ہو گیا۔

لطیفہ :- عہد رضواں مآب میں ایک قاری آئے اور اپنے کمال پر اس قدر ناز تھا کہ ہر قاری کو طفل مکتب سمجھتے تھے۔ جلب منفعت میں انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ جو نکاح میں پڑھوں گا وہ صحیح ہوگا باقی ہر عقد حروف کے مخرج سے ادا نہ ہونے میں غلط ہے اور نکاح صحیح نہ ہونے کے بعد اولاد ظاہر ہے کہ صحیح النسب نہ ہوگی چونکہ امرا شہر اور سلاطین کی محفل عقد سے اس قدر مالی فوائد ہوتے تھے جس کا آج تصور بھی نہیں ہو سکتا اس لئے قاری صاحب کا یہ اعلان تھا جو ذوق سلیم رکھنے والوں کو انگشت بدنداں کئے تھا کسی بزم میں جناب رضوان مآب کے سامنے قاری صاحب آگئے اور جناب نے ان سے صرف اس قدر پوچھا کہ قاری صاحب آپ کی والدہ کا نکاح کس نے پڑھا تھا اس مطالبے کے ساتھ سارا نشہ ہرن ہو گیا اور پھر ان کی تعلی ختم ہو گئی۔

نواب آغا علی خاں :- آپ اسی محلہ میں رہتے تھے باوقار رئیس تھے چھ سو روپے ماہوار وثیقہ تھا شعر و سخن میں دستگاہ کامل

۱؎ تاریخ اودھ نجم الغنی ج ۴ ص ۶۵ ۲؎ قدیم ہنر ص ۹

تھی مہر تخلص تھا دیوان طبع ہو چکا ہے ان کی وضعداری تھی کہ ماہ رمضان میں ہمیشہ مسجد تحسین پر افطار کرتے تھے دونوں وقت بلا ناغہ مسجد پر پہونچ جاتے تھے اور مصاحبین بھی ساتھ ہوتے۔

امامباڑہ و مسجد منصف الدولہ بہادر:۔ امامباڑہ الماس سے چوبیتیوں کی طرف واپس ہونے میں داہنی طرف واقع ہے امامباڑے کے نہ تو آثار رہے نہ اس کے بارے میں میری کوئی رائے ہے پچاس سال پہلے اس کے حدود تھے اب صرف مسجد بلندی پر واقع ہے جو اوسط درجے کی اور مختصر صحن ہے جس میں کچھ پرانی قبریں اپنی پائداری کا ثبوت دے رہی ہیں یہ مسجد امامباڑہ الماس کی سائڈ میں اور امامباڑہ سے قریب واقع ہے عام لوگ نہیں جانتے ہیں کہ مسجد کس کی ہے سو برس سے پہلے کی تعمیر ہے بانی کی اولاد میں کوئی نہیں یہ وجہ بھی ان آثار قدیمہ کے فنا ہونے کا سبب ہے۔

بخشو کا امامباڑہ اور مسجد:۔ محمد بخشو کا نذی عہد سلطان عالم میں پھول پتی (آرائش) کا کام کرتا تھا بڑے انہماک سے امامباڑہ بنوایا جس کے نشانات ۱۹۵۶ء تک تھے بخشو کے تعزیہ میں روشن چوکی کا ذکر گزشتہ[1] لکھنؤ میں موجود ہے یہ تعزیہ ۲۲ر صفر کو بڑی دھوم سے اٹھتا تھا اور چوک سے گذرتا تھا بخشو کے ورثہ کے بعد مفتی گنج کے شیعہ مدت تک تعزیہ اٹھاتے رہے بخشو کی مسجد سرائے معالی خاں میں اب بھی موجود ہے ۱۹۰۶ء میں بخشو کا تعزیہ جس اژدہام سے اٹھا اس کو لوگ اب تک نہیں بھولے۔

چھاپہ خانہ:۔ ۱۲۵۹ھ میں مکان ظہیر الدولہ کے قریب ایک مطبع تھا جس کو محمد حسین پرنٹر نے بنائے ہوئے تھے درسیات میں صرف و نحو کی کتابیں خوبصورت اور خوشخط محشی اور صحیح چھپتی تھیں اور عبدالرحمن کاتب بہترین نستعلیق لکھنے والے کام کرتے تھے۔

بالکشن کا چھتہ:۔ آپ عہد سعادت علی خاں میں دار الضرب کے افسر تھے اور روپیہ پیسہ اشرفی تمام سکے انھیں کی نگرانی میں ڈھلتے تھے بڑا سکہ اشرفی تھی جو روپیہ اور اٹھنی کے برابر تھی سونے کی قیمت کے لحاظ سے اگر تیس روپیہ کو روپیہ کے برابر سکہ طلا خوردہ ہوا تو اٹھنی کے برابر پندرہ روپیہ کو۔

اس چھتہ میں قاری اچھے صاحب علم تجوید کے ایک ماہر رہتے تھے اور نواب باقر علی خاں عرف بنے صاحب مشاق بہت بڑے شاعر رہتے تھے جن کے بہت سے شاگرد تھے اعجاز حسین عجاز، مرزا علی خاں ہنر شاگردوں میں اور رشید صاحب مشق بیٹے تھے جو صفی اور ظریف کے ہمعصر تھے۔

۱۸۵۶ء میں اس محلے سے ایک اخبار سحر سامری آزادی کا حامی نکلتا تھا جس کے فائل علی گڑھ یونیورسٹی میں موجود ہیں۔ ایڈیٹر کا نام اس نوٹ سے واضح ہوتا ہے۔

"نثر نثرہ نثار ریختہ قلم منشی دوران سخن شناس زبان دان شاعر بے بدل عالم باعمل منشی امیر احمد سلمہ اللہ" آخر میں[2] یہ لفظیں ہیں۔ شہر لکھنؤ میں سرا ر معالی خاں کے پاس بالکشن کے چھتے سے متصل بیجناتھ کے اہتمام میں چھپا۔

رام گنج:۔ شیش محل سے موہنی کے پردہ کے راستے پر واقع ہے اور پرانا محلہ ہے مسجدیں جا بجا ہیں جن میں سے ایک مسجد کی مرمت

---

[1] گزشتہ لکھنؤ   [2] نیا دور مئی ۱۹۶۶ء لکھنؤ

روسا۔ شیش محل میں نواب فخر جہاں بیگم نے کی ہے یک دو مزلی مسجد ہے جس میں بجائے درجہ مسجد کے پہلوؤں میں مینار ہونے کے جنوبی اور شمالی دیواروں میں صحن مسجد کے منارے ہیں اور کوئی بتانے والا نہیں کہ یہ مسجد کس کی جدت طرازی کا نمونہ ہے۔ اس محلہ میں سید محمد حسن خلف زبدۃ العلما معین المومنین سید علی نقی رہتے تھے جو علی مد کے استاد تھے۔ ۱۹۰۶ء میں اکبری دروازہ چوک میں ان کی ایک دوکان جنرل مرچنٹ کی حیثیت سے تھی ان کے آخری باکمال شاگرد سید محمد رضی اجتہادی ملتان میں لکھنؤ سے ہجرت کر کے مقیم ہیں اور موجودہ افراد خاندان اجتہاد میں بیشتر ان کے شاگرد ہیں۔ موصوف نے اسہال کبدی میں مدت ہوئی انتقال کیا۔

مفتی گنج

یہ شہر کا وہ محلہ ہے جو صاحبان کمال کا مرکز اور ابتدائی زمانہ آبادی میں روز افزوں فروغ حاصل کر رہا تھا عالم فاضل حکیم، سپاہی، بانکے، قاری، ذاکر، رئیس، امیر غرض لکھنؤ کی ساری آبادی کا کھنچا ہوا عطر اور مجموعہ یہاں تھا۔ اس محلہ کو کس نے آباد کیا جو بیانات تاریخ سے ثابت ہوتے ہیں وہ عقل کی کسوٹی پر ٹھیک نہیں اترتے۔ ایک طرف تو واقعہ نگار یہ لکھتے ہیں کہ نواب آصف الدولہ کے زمانے میں شیخوں کو مچھی بھون اور دریا کنارے سے ہٹا کر مفتی گنج میں جگہ دی گئی اور ان کی بستی میں سرکاری عمارتیں بننا شروع ہوئیں انھیں شیخوں میں مفتی غلام حضرت تھے جن کے نام سے مفتی گنج موسوم ہوا اور مفتی کی کھڑکی اس محلہ میں اب تک موجود ہے دوسرے مورخین لکھتے ہیں کہ برجیس قدر کی حکومت میں مفتی غلام حضرت کو کاغذات بیتی پر دستخط کرنے کا عہدہ عطا ہوا[1] یہ دونوں بیان اسی وقت جمع ہو سکتے ہیں جب مفتی صاحب کو اتنا کبیر السن مانا جائے کہ وہ عہد آصفی دور اول سے آخری دور تک زندہ رہے اور نوابی و شاہی دونوں زمانے صرف دیکھے ہی نہیں بلکہ برسر عمل رہے محلہ کا نام مفتی صاحب کے نام پر ہونا تو ناقابل انکار ہے ہم کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ برجیس قدر ہی تک زندہ تھے یا مر گئے۔ یہ زمین آصف الدولہ کا وہ عطیہ ہے جو موصوف نے اپنی تخت نشینی کے آٹھویں سال مفتی غلام حضرت کو دی۔

مفتی غلام حضرت کو حکومت کی طرف سے فتویٰ دینے کا حق تھا اور وہ مسلمان جو یہاں عہد اکبر سے آباد تھے ان کے مقدمات اور اختلافات مفتی صاحب شرع محمدی کی رو سے طے کرتے تھے مفتی گنج کے آثار قدیمہ میں۔

<u>علی رضا کوتوال کا گھر:</u>۔ امامباڑہ حسین آباد کے غربی پھاٹک سے نکل کر ایک راستہ تو رام گنج جاتا ہے اور دوسرا احاطہ مرزا مینڈل کی طرف درمیانی خط مفتی گنج کی راہ ہے اور پل نواب قاسم علی خاں کے قریب پہونچ کر علی رضا بیگ کوتوال کا گھر تھا وہ بڑے منتظم، سخی، انسانی ہمدردی والا دل سینے میں رکھنے والے آدمی تھے اور یہی ان کی ہردلعزیزی اور نام باقی رہ جانے کا سبب تھا حلیم اور بردبار اس حد پر تھے کہ جو فطرتاً غصے کے اوقات تھے اس وقت بھی تحمل سے کام لیتے تھے ان کی فیاضی کے سلسلے میں یہ واقعہ قلمبند ہے کہ ایک ضرورتمند سید جو سپاہی منش تھے حاجت لے کر آئے ہتھیار لگائے ہوئے تھے پہلو میں بیٹھ گئے شرم سے سوال نہ کر سکے کچھ دیر کے بعد ان سے پوچھا گیا کہ آپ کا نام کیا ہے؟ نام بتایا کوتوال شہر معلوم نہیں کس دھن میں تھے پوچھا آپ کی بی بی کا نام کیا ہے کہا ان کا نام تو یاد نہیں سالے کا نام رضا علی بیگ ہے اس سخت جواب پر مطلق توجہ نہ

---

[1] دستعاران لکھنؤ ص۲ [2] احسن التواریخ ص۹۰

کرتے ہوئے ان کی حیا کی قدر نہیں کر دیکھو صاحب حاجت تھے لوتو ل سے مرعوب ہو کر نام بتا دیتے تو مردانگی کے خلاف تھا اور بے حیائی تھی اس جواب کے بعد وہ صحبت سے اٹھ گئے اور رضا علی بیگ پانچ سو روپے لے کر گھر پہونچ گئے آواز دی پوچھا کون ہے کہا آپ کے سلے اندر سے جواب آیا بھائی ہیں تو پردہ کیسا چلے آیئے۔ ان کی بی بی کے سامنے وہ نقد رقم معذرت کے ساتھ پیش کی اور عمر بھر بہن سمجھتے رہے علی رضا خاں[1] برجیس قدری میں بھی اپنے عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ اور انگریزوں کے زمانہ ۱۸۵۶ء[2] میں اکسٹرا اسسٹنٹ قرار پائے تھے۔ میاں مشیر کے کلام میں بھی ان کا ذکر ہے۔

علی رضا بیگ کا دسترخوان وسیع تھا اور کھانا بہت پرتکلف کھاتے تھے حتیٰ کہ گزشتہ صفحات میں آپ نے پڑھا لکھنؤ میں یہ بات ہر زبان پر ہے مزا تو گیا علی رضا[3] کے ساتھ۔ خوش خوراک لوگوں میں یہ ہو گیا کہ ان کے سوا کھانا پکوانا کسی کو نہ آیا سراغ رسانی میں اس قدر کامل تھے کہ یہ اعلان کہتے تھے جس کا مال چوری جائے اس کو اگر میں نہ دلا سکوں تو اپنی جیب سے خود اس کی قیمت ادا کروں گا سلطان عالم نے ان کو محمد علی رضا خاں بہادر منتظم السلطنت کا خطاب دیا تھا۔

<u>نواب قاسم علی خاں کا پل</u>:۔ حسین آباد کے پھاٹک سے آگے بڑھ کر جو نالہ پڑتا ہے اس کا زور بارش میں اس قدر بڑھ جاتا تھا کہ گذرنا ممکن نہ تھا نواب قاسم علی خاں جو سالار جنگ کے فرزند تھے ان کے حساس دماغ نے پل بنوانا چاہا اور ارادہ کے ساتھ پل تیار ہونا شروع ہوا۔ اس پل کی تعمیر میں ایک بڑھیا کا چھپر اجاڑ دینا پڑا واقعہ یہ تھا کہ وہ کسی قیمت پر اپنے چھوٹے سے مکان کو بیچنے پر تیار نہ تھی قاسم علی خاں نے لاکھ چاہا کہ وہ مکان کی مناسب قیمت لے کر کہیں اور زمین خرید کر چھپر ڈال لے بڑھیا نے کہا میں بے وارث ہوں زمین میرے بزرگوں کی ہے میں باپ دادا کی ہڈیاں نہیں بیچوں گی مجبوراً چھپر اس کا ہٹا دیا گیا وہ رنجیدہ ہو کر اسی چھپر میں تھونیاں لگا کر بیٹھی رہتی تھی۔ اس کی گذر اوقات کی صورت یہ تھی کہ ڈلی کتر کر بیچا کرتی تھی پل بہت جلد تیار ہو گیا نواب نے آصف الدولہ سے عرض کیا کہ حضور ملاحظہ فرمائیں۔ آپ تشریف لے گئے جیسے ہی سواری کا جلوس قریب آیا۔ بڑھیا کو بھی خبر ہو گئی وہ پل کے بیچوں بیچ آ کر بیٹھ گئی اور ایک ٹوکری میں ڈلیاں کترنے لگی ہر چند جلوس کے سواروں نے روکا لیکن اس نے نہ مانا سواروں نے اپنے گھوڑے دبا کر نکالے جب آصف الدولہ کی سواری قریب آئی تو اس نے پکار کر کہا نواب بھائی کچھ خدا کا خوف ہے قاسم علی خاں نے پل بنوا لیا اور ہمیں خانماں برباد کر دیا ہمارا چھپر زبردستی پھنکوا دیا اور گھر کھدوا دیا۔ نواب نے اپنے دانتوں میں انگلی دبا لی اور حکم دیا کہ اسی وقت پل کھود کر پھینک دو اور بڑھیا کا چھپر اسی طرح ڈال دو جس طرح پہلے تھا۔ اور نواب قاسم علی خاں سے ملنا چھوڑ دیا۔ آخر قاسم علی خاں نے بہت زیادہ روپیہ دے کر اس کو رضامند کیا اور اس کا مکان ایک علیحدہ مقام پر اہتمام سے بنوایا اور پل دوبارہ بنوا کر اس ضعیفہ کو اپنی طرف سے سفارش کو بھیجا۔ نواب نے خوش ہو کر نواب قاسم علی خاں کا قصور معاف کر دیا اور پل دیکھنے تشریف لائے۔

راجہ کاظم حسین خاں اور اہل مفتی گنج

راجہ صاحب کے اخلاق اور سیرت میں یہ واقعہ دیکھ کر مجھے مسرت ہوئی۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے[4] گرمی کے دن تھے شب کو بعد مغرب بھوانی مؤ سے بارہ بنکی چلے ایک بزرگ شیوخ مفتی گنج سے جو اہل

۱؎ وضعداران لکھنؤ ص۔۔ ۲؎ تاریخ اودھ ج ۵ ص۱۶۷ ۳؎ آثار یادگار ص۱۶۲ طبع تصویر عام پریس۔

۴؎ ان کے والد کی قبر مفتی گنج کی راہ میں سب سے پہلی مسجد کے روبرو ہے جو گوئے تکیہ ازجہاں مرزا میتا بیگ

برادری میں داخل تھے مگر عسرت اور تنگدستی نے بدحواس کر دیا تھا طالب اعانت برادرانہ ہو کر چند روز سے بھٹوا مئو میں مقیم تھے یہ بھی اس سفر میں ساتھ ہوئے۔ ان کو تو اپنی پالکی میں سوار کیا اور خود ہاتھی پر بیٹھے فتح پور تک پہونچکر جو بھٹوا مئو سے پانچ میل ہے شیخ صاحب کو نیند آگئی۔ جب راجہ نے دیکھا کہ ہاتھی کی رفتار خراب ہے ان کو بہت تکلیف پہونچ رہی ہے عرض کیا کہ اب شیخ صاحب کو یہاں بلالوں اور آپ پالکی میں تشریف رکھیں جواب میں یہ شعر پڑھا ؎

آپ کو سوخت غیر کو لذت — یہ مزا بس کباب میں دیکھا

اور فرمایا کہ مجھے ہاتھی کی سواری سے اگرچہ تکلیف ہے مگر ان کو اس سے زیادہ روحانی اذیت ہوگی اگر میں سواری کا تبادلہ کروں اور اپنی راحت کو مقدم جانوں۔

مولوی جراح :- عہد محمد علی شاہ میں اس نام کا ایک جراح مفتی گنج میں رہتا تھا۔ امراؤ مرزا صاحب کی داہنی آنکھ میں ناسور ہوگیا ڈاکٹروں اور حکیموں کا علاج کرکے ان کے والد تھک گئے ایک دن مولوی نے ان کے والد سے کہا کہ اپنی بغیہ میں مجھے ایک قبر کی جگہ دینے کا وعدہ کیجئے تو کچھ دن میں آپ کے لڑکے کو اچھا کر دوں انہوں نے وعدہ کیا تیرہویں دن زخم بھر گیا اور تا حیات پھر کوئی شکایت نہ ہوئی۔

شہزادگان دہلی :- محلہ کی معزز آبادی میں شاہزادگان دہلی بھی ہیں جن میں تاریخ سے ثابت ہے کہ مرزا حیدر شکوہ پسر مرزا کام بخت ابن مرزا سلیمان شکوہ خلف شاہ عالم کی محلسرا مفتی گنج میں تھی عتبات عالیات میں ان کی رحلت ہوئی۔ اور صاحبزادہ احمد علی شاہ کا مفتی گنج کے ٹیلہ پر مکان اور قیام تھا یہ بزرگ ولیعہد کہلاتے تھے آخر میں مفتی گنج سے ہٹ کر اپنے خسر معراج الدولہ کے گھر چلے گئے۔ مؤلف کے عصر میں اس محلہ کے سربرآوردہ رئیس مرزا محمد فریدون عالم صاحب تھے ان کے اخلاق عادات طرز معاشرت ملوکانہ تھے خوش طبع لوگ ان کو ظل سبحانی کہتے تھے ان کے قدیم مکان کا ایک کمرہ اب بھی باقی ہے موصوف کی حیات ہی میں لائق اولاد نے گھر کی حالت نئی تعمیر میں تبدیل کر دی۔ آپ کے پاس ایک اصطرلاب تھا جو ان کے مورث اعلیٰ دہلی سے اپنے ساتھ لائے تھے ایسا اصطرلاب میں نے کسی یونیورسٹی لائبریری اور میوزیم میں آج تک نہیں دیکھا وہ اس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے ۱۴ر جون ۱۹۲۹ء مطابق ۵ر محرم ۱۳۴۸ھ کو نواب صاحب نے انتقال فرمایا اور کربلائے امین الدولہ میں دفن ہوئے ان کے صاحبزادہ شہزادہ مرزا سلطان محمد شاہ صاحب کی بنا کردہ مجلس ۱۶ر صفر کو اور لکھنؤ کے تمام رؤوساء و امراء کا بیک وقت اجتماع یادگار تقریب غم ہے جس میں چالیس سال پہلے امراء و رؤوساء کی گاڑیوں کا سلسلہ نواب قاسم علی خاں کے پل تک پہونچتا تھا۔

حمام کی مسجد :- یہ وہ مسجد ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ۱۱۴۲ھ کی تعمیر تھی اور مرزا علی صالح نے اس کی بنیاد قائم کی تھی زمانہ دراز کے بعد عمارت کی پہلی صورت نہ رہی اور دوبارہ معمولی طریقے پر تعمیر ہوئی ستون مسجد وہی ہیں اور گرد و پیش باقی نہیں ہے اس مسجد میں حمام بھی تھا اور یہی وجہ حمام کی مسجد شہرت پانے کی ہوئی ساٹھ برس پہلے حمام باقی تھا یہ بھی شہرت ہے کہ اس مسجد میں نماز جمعہ کبھی ہوتی تھی بانی مسجد کے خاندان کے مشہور افراد میں مولوی مرزا ہادی صاحب مؤلف خلاصۃ المصائب

ـه قدیم ہنر ص ۹۵

اور مولانا مرزا رضا علی مرحوم مشہور و معروف مناظر جو علم کلام و مباحثہ میں یکتا تھے ۱۳۳۳ھ تک زندہ تھے ان کے تصانیف فصل الخطاب، سہل ممتنع، قول فیصل، عین الیقین، مفید مستبصر وغیرہ ہیں مسجد میں اس وقت چھت نہیں ہے اگر یہ بیان صحیح ہے تو لکھنؤ کی پہلی مسجد یہی ہو سکتی ہے محلہ کے قدیم رہنے والے بتاتے ہیں کہ سنہ مذکور پتھر کی مدد سے دریافت ہوا ہے اور وہ تلف ہو گیا اس لئے مسجد میں نصب نہیں ہے۔

مسجد میر ضمیرؔ :۔ نام نامی بانی مسجد کا سید مظفر حسین تھا اور یہ چھوٹی سی مسجد ان کی یادگار ہے امراؤ مرزا صاحب مفتی گنج کے رہنے والے تھے یہ مسجد ان کے مکان کے سامنے ہے میر ضمیرؔ عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ غازی کے شاعر اور مرثیہ گو تھے۔ مرثیہ کی بنیاد پچ پوچھو تو انھیں نے قائم کی مرزا دبیر ایسا باکمال ان کا شاگرد رشید اور تلمذ پر فخر محسوس کرتا تھا۔ ضمیرؔ نے بادشاہ کی مدح میں فرمایا ہے ؎

زہے بادشاہ رعیت نواز — زہے عادل و باذل و کارساز
سعید ان کے طالع اور بیدار بخت — وہ زینت دہ افسر و چتر و تخت
سخن اس طرح کا کہیں ہے سنا — کہ شاعر کو بیش از سخن دے صلا
رفاہی رعیت کا خواہاں ہے وہ — کہ اس عہد میں فخر شاہاں ہے وہ
زہے دبدبہ وز ہے رعب نام — کہ تھرا رہے ہیں پڑے روم و شام
جو تیغ اس کی پڑتی سر کوہ قاف — تو گاؤ زمیں کی بریدہ ہو ناف

ضمیرؔ کے کلام میں مراثی، سلام، رباعیات ان اعلیٰ حدود میں پائے جاتے ہیں جس کے تحت میں مرثیے کی بنیاد قائم ہوئی اور ضمیرؔ استاد مانے گئے ۱۲۷۲ھ میں غدر کے پہلے ضمیرؔ نے اس دنیائے فانی سے عالم بقا کا سفر کیا مثنوی ریحان معراج ضمیرؔ کا وہ عدیم المثال منظومہ ہے جو ۱۳۰۱ھ مطبع حسینی باہتمام میر عابد علی مرحوم لکھنؤ میں طبع ہوا۔

قبر ضمیرؔ :۔ مسجد مذکور کے سمت شمال جو مکان ہے اس میں میر ضمیرؔ محو خواب راحت ہیں اور موت کی نیند سو رہے ہیں مذہب شیعہ کی یہ قابل تعریف روش ہے کہ ایسے ایسے صاحبان کمال کی قبروں کی پرستش نہیں کی اور چادریں چڑھانے کا اقدام نہیں کیا۔

امامباڑہ سید محمد بنارسی :۔ مفتی گنج میں عہد سلطان عالم کی عمارت تھی جس میں میر انیس مرحوم کا ایک مرثیہ پڑھنا تاریخ سے ثابت ہے اب کہیں نشان بھی عمارت کا نہیں ہے۔

امامباڑہ میرن صاحب :۔ عہد سلطان عالم میں محلہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بنایا گیا اور بصورت خانہ اب بھی موجود ہے۔ او سو درجے کی زمین پر یادگار ہے۔

آغا احمد صاحب پیراک :۔ بہت بڑے پیراک تھے ان کے بھائی کا نام آغا محمود تھا آپ ذاکری بھی کرتے تھے اور کسی سے کوئی نذرانہ قبول نہیں کرتے تھے پیرنے میں اس قدر کامل تھے کہ ان کو چادر میں باندھ کر دریا میں پھینک دیتے تھے وہ تہ آب ٹکے پہونچتے پہونچتے سب گرہیں کھول کر ابھر آتے تھے طرح طرح کے کمالات دریا میں پہونچ کر دکھاتے تھے۔

دیگر صاحبان کمال:۔ میں ایک بزرگ حافظ خیرات علی[1] تھے جن کو قرآن مجید حفظ تھا ۱۲۵۹ھ تک حیات تھے (۱) مولانا مرزا رضا علی صاحب مناظرہ میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے ان سے گفتگو میں فریق مخالف چند منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا تھا سنہ وفات گزشتہ صفحہ میں گذرا (۲)، مرزا محسن صاحب مرحوم ایک بڑے ذاکر اور حدیث خواں تھے جو لکھنؤ اور حیدرآباد دکھن میں کافی شہرت رکھتے تھے پاٹ دار آواز تھی حملہ حیدری کے اشعار بڑی خوش لحنی کے ساتھ پڑھتے تھے دراز قامت، وجیہہ، تنومند، رنگت اس قدر گوری کہ دودھیا تھا ان پر پھبتی ہوتی تھی طاقتور ایسے تھے کہ امین آباد مجلس پڑھنے جارہے تھے ایک سائیکل سوار سے سامنا ہوگیا۔ جب آپ بائیں پر آجائیں تو وہ بھی دست چپ کی طرف ہو جائے اور جب آپ داہنے ہاتھ کی طرف ہوں تو وہ بھی سمت راست آجائے آپ نے اسے مع سائیکل اٹھا کر راہ پر لگا دیا دیکھنے والوں کو حیرت ہوگئی (۳)، قاری سید حسین صاحب ہکلے ایک شخص تھے جو بہترین لہجے میں قرآن شریف کی تلاوت کرتے تھے ان کے سورۂ رحمن پڑھنے کا سامعین کو انتظار رہتا تھا اور خاص کمال یہ تھا کہ تلاوت قرآن کے وقت ہکلاتے نہ تھے ورنہ معاشرتی زندگی اور روزمرہ بات چیت میں زیادہ سے زیادہ ہکلے تھے، ۲۰ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ کو رحلت ہوئی مصری کی لبنیہ میں دفن ہوئے۔

(۱)، مفتی گنج کے لوگ عالموں کا بڑا احترام کرتے تھے ایک مرتبہ چند روسا میں میدان بدا گیا اور کنکوے پیہم طرفین سے اڑتے رہے تضیع اوقات روپیہ کی بربادی، دلوں میں کامیابی کی توقع پر بغض پیدا ہو کر فتنہ و فساد بڑھ رہا تھا اور ہر پارٹی اپنی شکست پر تیار نہ تھی قبلہ و کعبہ کو خبر ہوئی دونوں گروہ ان کے مخلص تھے سمجھانے میں کام نہ چلا تو خود مفتی گنج تشریف لے گئے۔ پالکی کی آمد ہی میں طرفین کے جذبات افسردہ ہوتے گئے اور اب عالم دین کی عظمت کا تصوّر تھا آپ نے بیچ مجمع میں نینس سے اتر کر اپنے ہاتھ سے ایک فریق کی ڈور توڑ دی اور قصہ پرامن طور پر ختم ہوگیا۔

(۲)، خاندان مرزا رضا علی مرحوم میں کسی دیوار کی تعمیر پر باہمی جھگڑا ہوا ایک چاہتا تھا کہ ہم بنوائیں دوسرے کی خواہش تھی کہ اس کے پیسے سے مرمّت ہو۔ بات بڑھتے بڑھتے تلوار کھنچنے کی نوبت آرہی تھی قبلہ و کعبہ کو خبر ہوئی اور خود مفتی گنج پہونچکر اپنے صرف سے دیوار اٹھوا دی یہ دیوار ابھی تک موجود ہے۔

(۳)، سید طاہر حسین نامی مفتی گنج میں ایک شخص تھے جو جہاز پر ماں کے مرجانے سے اپنے زمانہ شیر خوارگی میں قریب ہلاکت پہونچ گئے تھے سفر دریا میں نہ تو یہ ممکن تھا کہ انا تلاش کی جائے نہ اوپر کے دودھ کی کوئی صورت تھی زائروں کے قافلے میں ایک عورت کے دل میں ہمدردی پیدا ہوئی جو نہ صاحب اولاد تھی اور نہ کوئی اس کا شوہر تھا بچے کو بہلانے کے لئے گود میں لیا فطرت نے دودھ پیدا کیا اور وہ بن ماں کا بچہ اس طرح پرورش پا گیا سن تمیز کو پہونچا جوان ہوا شادی ہوئی خدا نے صاحب اولاد کیا ان کے بیٹے احمد حسین نے مجھ سے اپنے باپ کی طفولیت کا واقعہ بیان کیا اب احمد حسین زندہ نہیں ہیں ان کی اولاد موجود ہے۔

مفتی گنج کے آخری دور میں لسان الزمن مرزا الطاف حسین[2] عالم رہتے تھے ان کا دعویٰ تھا کہ ہندوستان کے ہر ہر شہر میں مفتی گنج کا ایک باشندہ ملے گا یہ ذکر ہے چالیس سال پہلے کا۔ اور میں اپنے ہر سفر میں تجربہ کرتا جاتا تھا مفتی گنج کا ایک رہنے والا ہر شہر میں ملا یہ دلیل تھی اس محلہ کے آباد ترین حصہ شہر ہونے کی۔

---

[1] ذکر الحافظ مؤلفہ احمد رضا جائسی طبع نامی گلشن فیض   [2] بنے صاحب مشتاق مسلم الثبوت شاعر کے شاگرد تھے (دیکھو ص۲۲ آثار یادگار

لطفی تیلی :۔ عہد واجدی میں اس محلہ کا مسلمان تیلی رہتا تھا کولھا کر ہاتھ کسی کا ٹوٹ گیا فوراً بٹھا دیتا تھا انگریزی ہونے تک زندہ رہا اور کسی حاکم کے کتے کا کولھا اکھڑ گیا ۔ شہرت عام کی بنا پر وہ انگریز کتے کو لطفی کے پاس لایا اور کہا کہ اس کا کولھا بٹھا دو لطفی جانور کو اپنے گھر کے اندر لے گیا اور اس کے پیٹ کے نیچے ایک لکڑی ڈالی اور اس طرح شکاری کو اچھا لاکر کولھا بیٹھ گیا ۔ اور انگریز سے کہا کہ کتے کو بلایئے ۔ صاحب نے آواز دی کتا دوڑتا ہوا سامنے آیا لطفی کو انعام دیا یہ واقعہ چشم دید راوِ مرزا صاحب ساکن مفتی گنج کا ہے جن کی پیدائش ۱۸۵۸ء میں ہوئی اور بفضلہ زندہ موجود ہیں امراؤ مرزا صاحب کو میں نے بھی دیکھا تھا راست گو انسان تھے ان کی وفات کو عرصہ گزرتا ہے ۔

شیخ عابد حسین عرف محمدو جراح :۔ عہد واجدی کا سرجن میں ماہر شخص تھا مفتی گنج میں رہتا تھا جراحی اور خط تراشی دونوں فنون میں کمال حاصل تھا ایک مرتبہ ایک ہندو تعلقہ دار لکھنؤ آئے ران میں زخم تھا ڈاکٹروں نے ران کاٹنے کی رائے دی تھی ۔ جس پر مریض تیار نہ ہوا محمدو سے رجوع کیا ڈاکٹروں کے سامنے محمدو نے اچھا کر دینے کا وعدہ کیا ڈاکٹر اس کے عزائم پر مضحکہ کرتے رہے اس نے شریفہ کی سوکھی پتیاں جلا کر پہلے زخم کے اندر دھواں پہونچایا اور کیڑے بجبجا کر نکلنا شروع ہوئے ڈھیروں کیڑے نکلے اس کے بعد شریفہ کی ہری پتیاں ہتھیلی پر ملکر ان کا تازہ عرق زخم پر ٹپکایا سب کیڑے نکل گئے مرہم لگا کر کچھ دن میں زخم بھر دیا ران اچھی ہو گئی زمیندار نے بہت انعام دیا اور ڈاکٹر حیرت کر گئے ۔

مرزا امداد حسین :۔ عہد واجدی میں کپتان (کمیدان) تھے ان کی بقیہ آج تک مفتی گنج میں مشہور ہے یہ امراؤ مرزا صاحب کے دادا تھے ایک دن ایک مرکھنا بیل چھوٹ گیا یہ اس طرف سے آرہے تھے لوگوں نے منع کیا ادھر سے نہ جایئے انہوں نے سماعت نہ کی بیل ان کی طرف جھپٹ کے چلا انہوں نے بائیں ہاتھ میں سپر لے کے اس کے سینگوں کو سپر پر روکا لاکھ لاکھ بیل نے زور کیا مگر ان کے ہاتھ کو جنبش نہ ہوئی داہنے ہاتھ سے تلوار کھینچی اور گھٹنے زمین پر ٹیک کر ایک ہاتھ بیل کی گردن پر مارا سر الگ ہو گیا اور دھڑ الگ ۔ آپ غدر کے کئی برس بعد مرے ۔ بنوٹ بھی جانتے تھے ۔

مرزا قدرت اللہ بیگ :۔ عہد واجدی کے شہ زور مفتی گنج کے رہنے والے تھے قوت کا یہ حال تھا کہ بانس کی پوروں کو دونوں مٹھیوں سے پکڑا اور زور کر کے اس کے اندر کے ریشے کھینچ لئے ۔ ایک موٹی دہلیز کے لوہے کے کنڈے کو اس زور سے مروڑا تھا کہ دہلیز چر گئی ۔

رشیدہ خانم :۔ عہد واجدی کی نڈر عورت تھیں ان کے بیٹے کا نام نواب ہادی علی خاں تھا برسات کا زمانہ تھا سب اپنے اپنے پلنگوں پر انگنائی میں سو رہے تھے چور گھر میں آیا کھٹ پٹ سے آنکھ کھل گئی وہ بھاگا اور چاہا کہ جست کر کے دیوار پر چلا جائے خانم صاحبہ نے پاؤں پکڑ کے ایسا جھٹکا دیا کہ گٹا اکھڑ گیا لوگ دوڑ پڑے مگر ٹانگ خانم صاحبہ کے ہاتھ میں رہی چور نے بڑی توبہ تلا کے بعد ہاتھ سے چھڑایا اور اپنے گھر لنگڑاتا ہوا پہونچا ۔

میر مچھلی :۔ نام آپ کا میر احمد علی تھا پیراکی میں صاحب کمال تھے اس لئے لقب میر مچھلی قرار پایا نصیر الدین حیدر بہادر شاگرد تھے ان کے ہمعصر میرک خان یا میرن جان دوسرے صاحب کمال تھے جو مہاراجہ درب سنگھ والی بلرام پور کے استاد تھے ۔ دونوں مشاہیر میں تھے نصیر الدین حیدر بہادر نے ایک مرتبہ میرک جان کو استاد سے مقابلہ کا حکم دیا حکم حاکم مرگ مفاجات سمجھ کر میر مچھلی سے مقابلہ

سے قدیم ہند ص۹۳ سلہ قدیم ہند ص۹۸ [illegible]

کرنا ہی پڑا۔ دیر تک پانی کے اندر دونوں استادوں کے درمیان جل بانک ہوتی رہی آخر میں میرک جان نے میر مچھلی کو زیر کرکے انھیں اپنے پیروں میں باندھ لیا بادشاہ نے جو اپنے دو دلکش بجرے پر سوار تھے اور دریا کے کنارے دونوں استادان فن کے شاگردوں کا ہجوم تھا بادشاہ نے بجرے کے اندر سے جو بڑی تیز رفتاری سے چلا جارہا تھا روپیہ کا ایک توڑا ہاتھ میں لیکر بلند کیا اور دونوں طرف اشارہ کرکے کہا کہ جو ہمارے بجرے کو پیر کر پکڑ لے اس کو یہ توڑا دیدیا جائے گا میرک جان نے پھرتی سے بجرا پکڑ لیا۔ میر مچھلی کی مسجد مفتی گنج میں ایک موجود ہے۔

<u>مولوی مرزا مہدی</u> :۔ آپ بھی عہد شاہی میں تھے اور پیراکی میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے ان کا کمال یہ تھا کہ دریا میں اترے اور ایک تیز دوڑنے والے آدمی کو دریا کے کنارے اپنے برابر کھڑا کیا اور اس سے کہا کہ جہاں تک تیز دوڑ سکتے ہو دوڑو وہ سر پر پیر رکھ کے بھاگا اور انہوں نے ملاحی کاٹنا شروع کی اتنی تیز ملاحی کاٹتے تھے کہ وہ بانسوں پیچھے رہ جاتا تھا اور یہ آگے نکل جاتے تھے۔ یہ غدر ۱۸۵۷ء میں بمقام مفتی گنج گولی سے مارے گئے آپ بانک اور لکڑی سے بھی واقف تھے ان کے بیٹے حسین مرزا صاحب جو شاہی کے پیدا شدہ تھے وہ بھی پیراکی اور بانک میں استاد مانے جاتے تھے پرنس مرزا سلیمان قدر اور نواب سیف الدولہ کے استاد تھے۔ حسین مرزا کے بیٹے سلطان مرزا مٹیا برج میں سلطان عالم سے وابستہ رہے دریا میں اس طرح غوطہ لگاتے تھے کہ کوئی انھیں چھو نہیں سکتا تھا ۱۹۳۶ء میں ستر برس کی عمر ہے[1]۔ بصارت جواب دے چکی ہے۔

میاں مشیر

مرزا دبیر کے شاگردوں میں مشہور اور باکمال ہزل گو شاعر جس کی ظرافت طبع کا تتبع تمام مزاحیہ نگار ہستیاں آج تک کررہی ہیں اور ایسا نہ تھا کہ وہ صرف مذاقیہ اشعار کہنے پر قدرت رکھتے ہوں بلکہ ان کی وہ زندگی جو مدح اہل بیت میں گذری وہ بھی شاندار ہے مرثیہ گوئی میں بھی وہ بند نہ تھے اور کئی مرثیے ایسے ہیں جو مدحیہ اور المیہ پہلو سے یادگار ہیں چند مراثی جن کا مجھے علم ہوا ہے ان کے مطلع یہ ہیں (۱) سر و چمن جو تیغ ستم سے قلم ہوا (۲) دریائے فیض فاطمہ کا نور عین ہے (۳) قبضہ میں تیغ، تیغ میں جوہر بھی چاہئے (۴) دربار میں ورود ہے اب اہل بیت کا"۔ پہلا مرثیہ شہدائے کربلا میں حضرت قاسم کے حال میں ہے اس کے علاوہ ان کے لاتعداد ہزلیات میں جو ضلع اور جگت کی رعایتوں سے اس قدر آراستہ ہوتے تھے کہ جس وادی میں قدم رکھا تمام اصطلاحات، ہر پہلو، سارے گوشے سبک روی سے طے کر گئے۔ ان کے تصانیف میں مناظرہ کی مشہور کتاب کنٹاپ ہے جو قبقاب کا جواب ترکی بترکی ہے اس کتاب میں صدر سخن میں جس جگہ پیغمبر اسلام کی صاجزادی حضرت خاتون جناں کی مدح کی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص متانت کو ہاتھ سے جانے ہی نہیں دیتا اور گفتگو اس قدر مہذب ہے کہ رکاکت کا کوسوں پتہ نہیں علمار فرنگی محل ان کے ادبی خدمات کی قدر کرتے تھے اور عبدالحلیم شرر نے جابجا ان کے فنی جہاد کی تصویر کشی کی ہے۔ کنٹاپ ج ۲ ۱۲۸۶ھ مطبع اثنا عشری لکھنؤ میں طبع ہوئی اور مؤلف اور ناشر پر مقدمہ چلا اور بقول عبدالحلیم شرر وہ مٹیا برج چلے گئے ان کے قضا کرنے کا حال صدر کتاب میں گذرا مخطوطات کتب خانہ ممتاز العلماء میں ان کا ایک مرثیہ قلمی بیاض پر ہے جو مجتہد العصر والزماں کے بھائی سید العلماء سید حسین کے دنیا چھوڑنے پر اپنے تاثرات کو ظاہر کیا تھا بے حس قوم نے ان ادبی جواہر پاروں کو کبھی

---

[1] قدیم ہنر ص ۱۳۴

نہ سمیٹا جو جہاں تھا وہیں فنا ہوگیا۔

مشیر کے جو اشعار زبان زد ہیں ان میں ع تو اپنے ایک جام پہ ناز اں ہے ساقیا الخ مشہور مدحیہ نظم ہے اور جو شخص روضہ حضرت امام حسین کی زیارت کے بعد بھی اپنے کردار سے توبہ نہ کرے اور پہلے رنگ پر باقی رہے اس وقت مشیر ہی کا شعر ہے جو مدت دراز تک لوگوں کی زبان پر رہا ع ایماں لپٹ کے رہ گیا قبر حسین سے۔

مرزا قین :۔ عہد واجدی کے صاحب کمال مرزا قین کی بھبتی سے مشہور تھے یہ زیادہ تر کبوتریاں پالا کرتے تھے اور مفتی گنج میں رہتے تھے ایک دن گنگنی شو کل کے تالاب سے ایک کبوتر باز ان کے پاس آئے اور کہا کہ جب جانوں کہ آپ کے کبوتر میرے کبوتروں سے تالاب پر لڑیں انہوں نے کہا کہ بہت اچھا آج کے تیسرے دن لڑاؤں گا آپ نے ٹھاٹھر سے دو کبوتر نکال کے ان کو دیدئے کہ ان کو لے جا کر تھوڑی دیر کے لئے ٹھاٹھر میں چھوڑ دیجئے اور اس کے بعد اڑا دیجئے گا وہ کبوتروں کو لے گئے اور حسب ہدایت عمل کیا۔ دونوں کبوتر اڑتے مفتی گنج چلے آئے۔ مرزا نے تیسرے دن ان دونوں کبوتروں کو اپنے دوسرے کبوتروں کے ساتھ اڑایا اور تالاب کی طرف ہانکا پہلے والے دونوں کبوتر آگے آگے باقی کبوتر پیچھے پیچھے اڑتے ہوئے گنگنی شو کل کے تالاب پر پہونچے اور ان کے کبوتروں سے لڑے اور ان کے دو کبوتر لئے ہوئے مفتی گنج آئے مرزا قین نے ان کے دونوں کبوتروں کو مار لیا دوسرے دن وہ اپنے دونوں کبوتر لے گئے اور ان کی استادی کے قائل ہو گئے۔

شوقین اصحاب کبوتروں کو سونے چاندی کی پیجنیاں پہناتے آتش کہتے ہیں ؎

باغبان انصاف پر بلبل سے آیا چاہئے ‏ ‏ پیجنی اس کو زر گل کی پہنانا چاہئے

مفتی گنج کی مجلسیں :۔ یہ محلہ عزاداری کے لحاظ سے بھی شہرۂ آفاق تھا اور عشرہ میں پچھلے پہر (کچھ رات رہے) سے جو مجلسیں شروع ہوتی تھیں تو آدھی رات تک سلسلہ جاری رہتا تھا اور اس محلے کے لوگ دوسرے محلے میں جانے کا وقت نہیں پاتے تھے مجلس سے دلچسپی اس کو کہتے ہیں ۱۲ بجے رات کے بعد سونا اور سحر کے وقت پھر مجلس کے لئے اٹھ کھڑے ہونا یہی حسین دوستی ہے انھیں مجلسوں پر کسی کا شعر ہے ؎

نہ جاگنے میں ہے راحت نہ شب کے سونے میں ‏ ‏ مزا جو پایا تو پچھلے پہر کے رونے میں

میر عشق کہتے ہیں ؎

ہے عشق بہت خوب یہ وقت مجلس ‏ ‏ منہ ڈھانپ کے روتی ہیں سحر کو زہرا

کیونکر نہ ہو مقبول سحر کی مجلس

مرزا محمد اختر مرحوم جو اس حلقے کی آخری شمع تھے اور کربلائے معلی میں ان کی وفات ہوئی کثرت مجالس کے ثبوت میں کہتے تھے کہ میں نے دن بھر کی مجلسوں میں اپنے ہاتھ سے دو من کپیاں تقسیم کی ہیں ظاہر ہے کہ کچھ مجلسیں تقسیم شربت کی بھی ہونگی۔

احاطہ مرزا علی خاں

نواب آصف الدولہ کی مسند نشینی کے وقت ان کے ماموں نواب مرزا علی خاں فیض آبادی تھے بھیجے کے لکھنؤ آباد کرنے پر وہ

لہ بہار ہند لغت صـ ۲۲۳

بھی آپڑے اور ان کے رہنے کی جگہ احاطہ مرزا علی خاں کے نام سے مشہور ہوئی۔ جب محلہ کی بنیاد قائم ہوئی اس وقت احاطہ مذکور کی حد بیر بخارا سے شروع ہوتی تھی اور موجودہ کمپنی باغ کے اندر بھی کچھ حصہ شامل تھا۔

اس محلہ میں دیوان خانہ، محلسرا، فیل خانہ، شتر خانہ، اصطبل سب ہی کچھ تھا اور ان بنیادوں کے آثار کمپنی باغ کی زمین میں شامل ہو کر مٹ گئے جو محلہ اس وقت احاطہ مرزا علی خاں سے مشہور ہے وہ مرزا علی خاں کے بھائی نواب سالار جنگ کے پوتے مرزا علی خاں کا آباد کردہ ہے اور منشی گنج سے ملا ہوا ہے یہاں بھی اس وقت منتخب اہل شہر کی بستی تھی اور احاطہ مرزا علی خاں کے بانکے شہر بھر میں مشہور تھے نواب پیارے مرزا صاحب اس طبقے کی آخری یادگار تھے دراز قامت، سینہ چوڑا، اعضا و جوارح مضبوط اور ورزشی، اس قدر طاقتور کہ ایک مجلس میں آندھی آنے سے شامیانہ گرنے کے قریب تھا آپ نے چوب نگیرہ پر ہاتھ رکھ دیا اور مجلس کو درہم برہم ہونے سے بچا لیا میرے البم میں اس مجسمۂ تہذیب و اخلاق کا فوٹو ہے۔ آپ کے پاس ایک جیبی گھڑی تھی جو بڑی سریلی آواز سے بجتی تھی جس محفل میں آپ بیٹھے ہوتے لوگ حیرت سے دیکھتے کہ آواز کدھر سے آرہی ہے محلہ کے تاریخی مناظر قدیم روایات حسب ذیل ہیں۔

کبیرن کا تعزیہ:۔ عہد شاہی کی ایک خاتون تھیں جو اس محلہ سے تعزیہ اٹھاتی تھیں اور عورتیں شریک ہوتی تھیں جلوس میں کوئی مرد شریک نہیں ہو سکتا تھا جب معز زبانی عزا نہ رہیں تو شیدی صفدر حسین کی ماں نے یہ تعزیہ اسی طرح دھوم سے اٹھایا اور نجف لایا گیا۔

گمو خاں کا امامباڑہ:۔ آثار قدیمہ اور عہد شاہی کی عمارتوں میں یہ امامباڑہ تھا جہاں تک میری یاد کام کرتی تھی سید محمد کاظم جاوید کو میں نے اس امامباڑہ میں مرثیہ پڑھتے سنا تھا تھوڑا عرصہ ہوا کہ امامباڑہ بارش میں گر گیا اور کوئی دوبارہ تعمیر نہ کر سکا۔

قبر میر حسن صاحب مثنوی:۔ میر حسن جب دہلی سے آئے تو بظاہر اسی محلہ میں قیام تھا نواب قاسم علی خاں صاحب کے باغ کے پچھواڑے ان کی قبر ہے خاندان انیس کے مورث اعلیٰ یہی بزرگ تھے جو آسمان ادب کے تابندہ آفتاب تھے اور اپنا نظیر نہ رکھتے تھے ان کی نظم میں نثر کی ایسی روانی ہوتی تھی ؎

وہ جب تک کہ زلفیں سنوارا کیا — کھڑا اس پہ میں جاں وارا کیا
ابھی دل کو لے کر گیا میرے آہ — وہ چلتا رہا میں پکارا کیا
گیا دل اور جان بخشی بھی — حسنؔ اس نے احساں دوبارا کیا

مثنوی صرف عاشق مزاج طبقے میں مقبول نہیں ہوئی بلکہ عابدوں اور زاہدوں کی زبان پر بھی یہ شعر ہے ؎

تجھے فضل کرتے نہیں لگتی بار — نہ ہو تجھ سے مایوس امیدوار

مثنوی کا بھاشا میں ترجمہ پنڈت پیارے لال نے کیا اور میر حسن کا دیوان بھی چھپ چکا ہے اور تذکرہ شعرار اردو مولوی حبیب الرحمن خاں شیروانی نے اپنے اہتمام سے صحت کر کے چھپوایا ہے مصحفی نے مصرعہ تاریخ وفات یہ نکالا ہے ع شاعر شیریں بیاں وفات یافت

میر صفدر علی پیراک:۔ آپ احاطہ مرزا علی خاں میں رہتے تھے اور بہت بڑے پیراک مانے جاتے تھے مشکل پیرائیاں معلوم تھیں کھڑی ایسی لگاتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ پانی میں میخ گڑی ہے کیا مجال کہ ذرا تو جسم کو لغزش ہو جائے ایک وقت میں چھ سات آدمی ان کو دبلتے تھے مگر یہ ناف تک پانی میں کھلے ہی رہتے تھے پانی سے بھرا ہوا گھڑا ہاتھ میں لیا اور اپنے سر پر ڈالنا شروع کیا پورا گھڑا خالی ہو گیا مگر نیچے

نہ وہ جتنا کھلے تھے اتنے ہی کھلے رہے جبا بنک میں بھی بڑے استاد تھے سات آٹھ آدمی دریا میں ایک طرف اور یہ اکیلے ایک طرف، مگر وہ ان کا کچھ نہ کر سکتے تھے۔ آپ واجد علی شاہ کے استاد تھے میر صفدر علی اپنے شاگردوں کو لے کر کلیا گھاٹ پر ٹہلتے تھے غدر کے کئی برس بعد لکھنؤ میں انتقال کیا ان کے بڑے بیٹے میر فضل حسین تھے جنھوں نے ہز ہائنس نواب حامد علی خاں والئ رامپور کو پیرنا سکھایا تھا مدت تک رامپور میں مشاہرہ پاتے رہے۔ اور لکھنؤ میں وفات ہوئی ان کے چھوٹے بیٹے خلیفہ سید رضا حسین تھے جن کا حال آپ پڑھ چکے۔

نواب مرزا تقی ہوس:۔ مصحفی کے شاگرد اور مرزا علی خاں کے چشم و چراغ تھے ان کے اشعار میں زیادہ تر لیلیٰ مجنوں کا ذکر آتا ہے نمونۂ سخن ملاحظہ ہو ؎

ہم جا نہیں سکتے ہیں ہوس شرم کے مارے ہر چند گھر اس کا ہے بہ یک فاصلہ پا

یہ باکمال مکان سید اعجاز حسین خاں عرف دولارے نواب وثیقہ دار کے عقب میں نرکلوں میں دفن ہے

ثابت لکھنوی تحریر کرتے ہیں کہ وزیر خاں داروغہ دیوان خانہ شاہ اودھ کے یہاں احاطہ مرزا علی خاں میں ہر مہینے کی تیئیسویں کو عہد واجدی میں مرزا دبیر صاحب اور ان کے مقابلے پر محمد خاں داروغہ فیلخانہ شاہی کے یہاں اسی وقت پر میر انیس مرثیہ پڑھتے تھے (حیات دبیر ص۸۹)

مصاحب گنج

دہلی کے رہنے والے ایک شخص گھسیٹے خاں تھے جنھوں نے اپنی عقل اور حسن خدمات سے سلطان عالم کی سرکار سے مصاحب الدولہ کا خطاب پایا اور لکھنؤ کی آبادی اس قدر بڑھ چکی تھی کہ ان کو منشی گنج کے اس پار رہنے کو جگہ ملی اور اپنے نام پر مصاحب گنج بسایا دو محلسرائیں بنوائیں محلے کے چار طرف پھاٹک لگوائے۔ آبادی پچھم ہی کی طرف بڑھ رہی تھی جگہ کو محفوظ سمجھ کر دوسرے لوگ بھی آ کر بس گئے مصاحب الدولہ کو مورخین نے روزہ نماز کا پابند ظاہر کیا ہے کار خیر کی طرف خاص توجہ تھی۔

مصاحب گنج کا پھاٹک ایک بھی موجود نہیں ہے محلسرا کے کچھ کھنڈر بتائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مصاحب الدولہ نے حسب ذیل یادگار چھوڑی۔

مصاحب باغ:۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ بہت خوبصورت باغ تھا گوری بیہٹ اور فیض اللہ گنج جہاں کے پونڈے مشہور ہیں ہر دو مقام مصاحب الدولہ کی ملکیت تھے۔

مسجد:۔ مصاحب الدولہ نے جو مسجد بنوائی وہ ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۹ء میں تعمیر ہوئی زیادہ وسیع نہیں ہے اور کوئی خاص بات عمارت میں نہیں ہے۔

مقبرہ:۔ مصاحب الدولہ نے ۱۲۹۲ھ میں لاولد انتقال کیا مسجد کے سامنے دفن ہوئے قبر پر مقبرہ بنایا گیا جا بجا آیات قرآن در و دیوار پر بخط نسخ لکھے ہوئے تھے اب یہ عمارت بھی باقی نہیں ہے۔

میر بچو[1]:۔ مصاحب گنج میں رہتے تھے بڑے قوی پہلوان تھے اپنے سر سے کیتھا توڑ ڈالتے تھے دیواروں میں اس زور سے ٹکر مارتے تھے کہ نشان عمارت میں پڑ جاتا تھا۔ ان کے شاگردوں میں بڑے بڑے معزز اور بلند طبقے کے امرا اور رؤسا تھے نواب سید فدا حسین خاں بہادر

---

[1] قدیم ہنر ص۱۱۳

مؤلف قدیم ہنر کے دادا کے بڑے بھائی ان کے شاگردوں میں تھے جس کا تاریخ میں ذکر ہے۔

نواب مرزا مہدی :۔ آپ سالار جنگ کے خاندان سے تھے اور عہد واجدی میں آپ کے کمالات کا یہ مظاہرہ تھا کہ کنوئیں کی جگت پر بیٹھ کر بیر چھیلنا شروع کرتے اور اس قدر مہین چھلکا اتارتے تھے کہ کنوئیں کے اندر چھلکا اتر جاتا تھا ۱۸۹۵ء کے حدود میں انتقال ہوا [1]

کربلائے مصاحب الدولہ :۔ یہ روضہ مزار حضرت عباس کی شبیہ اور مصاحب الدولہ کی یادگار تھا پھاٹک داخلہ بلند اور شاندار دونوں پہلوؤں میں غلام گردش سامنے لمبا چوڑا صحن آگے بڑھ کر اصل روضہ کی عمارت جو درگاہ حضرت عباس واقع رستم نگر سے زیادہ مشابہ شہ نشین پر بہت پرانی مگر خوبصورت سنگ مرمر کی ضریح اوپر بڑا خشتی گنبد جس کے بالائی حصے میں سنہری گنبد ہے غلام گردش اور روضہ پر اگلی وضع کی منڈیر جس میں محراب اور طاق بنا کر ان پر کمہاروں کے ہاتھ کی چمکدار روغنی گمریاں جاذب نظر اور نگاہ افروز تھیں۔

بچوپڑہ کنواں :۔ مصاحب الدولہ نے ایک بڑا کنواں پیاسوں کو سیراب کرنے کے لئے بنوایا جس کا پانی زیادہ سے زیادہ کھنچتا رہا اور واٹر ورکس کی انگریزوں کے ہاتھوں بنیاد قائم ہونے تک چشمہ فیض جاری رہا۔

بلدار مسجد :۔ اس محلہ میں عہد شاہی کی ایک خوبصورت اور اوسط درجے کی مسجد ہے جس کے مینار عورت کی چوٹی کی طرح بنائے گئے ہیں اور اسی وجہ سے یہ خانہ خدا بلدار مسجد کے نام سے مشہور ہے تاریخ میں صراحت نہیں ہے کہ اس کا بانی کون شخص تھا صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ مسجد کے سامنے اما مباڑہ بھی تھا اور امامباڑہ آصف الدولہ کا معمار کفایت اللہ اسی جگہ خواب راحت میں گوشۂ قبر میں پنہاں ہے مسجد آباد اور مسلمانان محلہ کی وجہ سے اچھی حالت میں ہے۔

مرتضیٰ خاں :۔ ایک طاقتور شخص مصاحب گنج میں رہتے تھے اس قدر قوت تھی کہ بھینسے کی دم پکڑ کے اندارہ میں لٹکا دیا اور پھر کھینچ لیا۔ ایک پر جس کو دو بیل کھینچتے تھے انہوں نے تنہا کنوئیں سے کھینچ لیا (قدیم ہنر ص ۱۰۱)

جھانکڑ باغ

یہ باغ چھوٹے خاں کا لگوایا ہوا ہے جو انیس الدولہ کے لقب سے پکارے جاتے تھے شاہ اودھ کے خصوصی توجہات نے ان کے خطاب میں اضافہ کیا اور مونس الملک خانہ زاد خان بہادر مصاحب خاص" ان کی ترقی کا طرۂ امتیاز تھا انیس الدولہ اور مصاحب الدولہ سگے بھائی تھے جھانکڑ باغ ایک طرف مفتی گنج سے قریب دوسری طرف مصاحب گنج سے نزدیک واقع ہے انقلاب سلطنت کے بعد دونوں بھائی کلکتہ گئے انیس الدولہ نے شاہ مرحوم کی رفاقت میں وہیں انتقال کیا اور مصاحب الدولہ رحلت جان عالم کے بعد لکھنؤ چلے آئے جھانکڑ باغ سلطان عالم کی حکومت میں بنا اور اس باغ کے بیچ میں ایک عالیشان کوٹھی تھی انیس الدولہ کبوتر خانہ کے داروغہ بھی رہ چکے تھے ان کے متروکہ میں ورثہ نے ۲ لاکھ روپیہ نقد پایا

اس محلہ میں ایک پرانا تکیہ تھا جس میں ممتاز محل ملکہ غازی الدین حیدر کی قبر تھی اس لحد پر نصیر الدین بہادر نے عالیشان مقبرہ بنوا دیا تھا اب نہ کوٹھی باقی ہے نہ مقبرہ۔ نہ ملکہ کا نشان قبر جھانکڑ باغ ویران جگہ ہے۔

---

[1] قدیم ہنر ص ۱۵۶

نگریاں

یہ محلہ مصاحب گنج سے ملا ہوا آباد ہے اور تاریخ میں ہے کہ اس محلہ کی بنیاد حسن اتفاق سے اس دن قائم ہوئی جس روز آصف الدولہ نے علی گنج بسایا اس محلہ میں مشہور عمارت ۔

مسجد میر فضل علی :- عہد نصیر الدین حیدر بہادر میں معتمد الدولہ کی معزولی کے بعد میر فضل علی ۹ شوال ۱۲۴۳ھ کو وزیر اعظم ہوئے لقب ان کا اعتماد الدولہ ضیاء الملک سہراب جنگ اور والد کا نام میر غلام حسین تھا برست ضلع کرنال کے رہنے والے تھے ۔ والدہ سیدانی تھیں اور سیادت کی وجہ سے آغاز زندگی میں فیلبان کے عہدے پر فائز ہوئے بادشاہ کی طرف پشت کرکے سید کے سوا کوئی نہیں بیٹھ سکتا تھا قصر شاہی میں ماں کی بڑی عظمت تھی ان کی روحانیت کے تمام خورد و کلاں معترف تھے وزارت کے کسی امیدوار نے ان کو ۴۰ ہزار اشرفیاں اس لئے دینا چاہیں کہ وہ جناب عالیہ سے سفارش کرکے وزیر بنوا دیں ۔ سیدانی نے سادگی طبع سے والدہ شاہ سے عرض کیا کہ مجھے ۴۰ ہزار اشرفیاں مل سکتی ہیں جناب عالیہ نے جواب دیا اشرفیاں لینے کے بجائے میں تمھارے بیٹے کو وزیر مقرر کرتی ہوں چنانچہ وہ وزیر ہوگئے ۔

زندہ دلان لکھنؤ نے ان کی تاریخ وفات کہی "دُہت دُہت بری بری" ہاتھی چلاتے میں فیلبان یہی کہتا رہتا ہے ۔
۱۲۴۲ھ

میر غلام حسین کا خاندان وطن میں حویلی والے بانکوں کا مشہور گھرانہ تھا جو شمشیر زنی میں ممتاز تھا اور ان کے اسلاف کو اسم اعظم معلوم تھا جس کی وجہ سے بڑے بڑے عہدوں تک پہونچے ۔

ممدوح صرف ۹ ماہ کرسی وزارت پر سرفراز رہے بعض مصالح ذاتی سے خود اس عہدے سے سبکدوش ہوگئے اس تھوڑے عرصے میں انہوں نے ایک کروڑ روپیہ جمع کرلیا وزیر اعظم کی تنخواہ اس وقت پچیس[25] ہزار روپے ماہوار ہوتی تھی آپ میر خدا بخش کو اپنا نائب بنانا چاہتے تھے مگر جس دن خلعت نیابت جانے والا تھا اسی دن میر صاحب دنیا سے گذر گئے نگریوں میں جو عظیم الشان مسجد اور سربلند عمارت واقع ہے اس کے بانی میر فضل علی تھے ۔

نگریوں سے پچھم کی طرف جو کوچہ واقع ہے اس میں داہنے ہاتھ کی طرف یہ مسجد پڑتی ہے نیچے دو کانات اور کہیں کہیں کمرے زینے کے بعد صحن مسجد اور حوض ، گرد و پیش مکانات ، حجرے اور دوہرے درجے کے بعض دالان صحن مسجد کے بعد مسجد کی خوبصورت اور ایسی رفیع عمارت کہ دیکھنے والے یہ فیصلہ کرسکیں مسجد تحسین کے بعد اس شان کی یہ دوسری ہوادار مسجد ہے چبوترہ مسجد سے متصل ، اس مسجد کے دروں میں روشندان ہیں اور یہ صنعت قرار دی گئی ہے کہ اگر اندر چراغ روشن ہو تو صحن مسجد اور درجہ مسجد دونوں میں روشنی پہونچے اور معمولی ہوا اس چراغ کو بجھا نہ سکے ۔

برف خانہ

اگلے زمانے میں شوقین مزاج افراد شورہ قلمی اور دوسری دواؤں اور ترکیب سے جستہ کی صراحیوں میں برف تیار کرتے تھے اور ہر جگہ برف نہیں ملتی تھی ۔ ہیضے کے مریضوں کو اطبا اکثر دواءً برف دیتے تھے اس وقت رؤسا اپنے آب خانہ سے برف دئے جانے کا حکم دیتے تھے یہ محلہ مصاحب گنج اور ٹھاکر گنج سے قریب ہے ۔

ف گزشتہ لکھنؤ

<u>کربلا بی مصری</u>:- برف خانہ کی عمارت ہے مصری عہد آصفی کی ایک خاتون تھیں جو سفر و حضر میں نواب کے ساتھ رہتی تھیں اور بارہ بیگہ زمین ان کو عطیہ شاہی سے ملی تھی اس آراضی کے ایک جز کو اس وقت مصری کی بغیہ کہا جاتا ہے۔ مصاحب الدولہ کی کربلا عہد جان عالم میں مصری کی زمین پر بنائی گئی مصری نے اسی جگہ اپنی منزل قرار دی اور مکان کے ساتھ مسجد بنوائی گھر اور خانۂ خدا کے درمیان ان کا امامباڑہ بھی تھا مسجد نہایت خوبصورت بنی ہوئی ہے مگر استرکاری کی نوبت نہیں آئی زمانہ گذرنے سے داخلے کا پھاٹک اور باہر کے درجے جو پھاٹک کے پہلو میں تھے گر گئے صحن اور دالان باقی ہیں امامباڑہ کمرے کی وضع کا تھا جس میں ایک خوبصورت لکڑی کی پرانی ضریح رکھی تھی مصری کے سکونتی مکان کے کھنڈر ۱۹۴۶ء تک باقی تھے امامباڑہ کے باہر درخت کے نیچے ۱۱ تربتیں چھوٹی چھوٹی بنی تھیں آج سے پہلے اس بغیہ میں کثرت سے تعزیئے دفن ہوتے تھے اور مخلوق کا بڑا ہجوم ہوتا تھا۔ عشرہ کے دن بازار لگتا تھا۔ مفتی گنج کی رفتہ رفتہ ویرانی سے یہ کربلا بھی غیر آباد ہوگئی۔ ہمعصر سید جالب دہلوی نے اپنی حیات میں ایک مقالہ[1] لکھ کر پبلک کو بتایا تھا کہ مصری کی بغیہ جو آصف الدولہ کی معشوقہ کے نام سے ہے میں پرانا قبرستان ہے سحرالبیان کے جادو مصنف میر حسن (انیس کے جد امجد) اسی گورستان میں دفن ہیں۔ ہم نے احاطہ مرزا علی خاں کے ذیل میں میر حسن کی قبر کو باغ قاسم علی خاں کے پچھواڑے شمس العلماء آزاد کی تحقیق کے مطابق لکھا ہے۔ جالب کے سامنے آب حیات ہونا چاہیے۔ ممکن ہے کہ باغ قاسم علی خاں کے حدود مصری کی بغیہ سے ملے ہوئے ہوں۔

اسمٰعیل گنج

عہد برہان الملک میں جن لوگوں نے پڑاؤ ڈالے تھے وہ یہی جگہ تھی شررؔ[2] نے اس محلہ کو مچھی بھون کے شرق میں قرار دیا ہے جو غلط ہے اسمٰعیل گنج کا کوری[3] روڈ پر ہے اور کربلائے رفیق الدولہ اسی محلہ میں بنائی گئی ہے یہاں خاندان شاہی کی بڑی فرد ملکۂ دوراں اشرف النساء حسینی بیگم مخاطب بافسر بہو بیگم نواب افسر الدولہ پسر منیر الدولہ غدر ۱۸۵۷ء میں رہتی تھیں۔ ان کا باغ اور عالیشان محلسرا تھی یہ خاتون چھوٹی شہزادی کے نام سے مشہور رہیں آپ نے بعض حکام کو جو خط لکھا ہے۔ اس کی نقل ملاحظہ ہو[4] باعث تحریر این سطور آنکہ بیچ زمانہ غدر کے بدمعاشان میرے مکان واقع اسمٰعیل گنج میں گھس آئے اور تمام اسباب لوٹ کر لے گئے اور میں اس مکان سے بھاگ کر بمقام سعادت گنج اپنی نانی کے مکان میں آئی وہاں پر بھی بدمعاشان نے ستایا پھر ممو خاں کے مکان کے اندر گھس آئے اور مجھ کو لوٹا کر دوپٹہ تک سر سے اتار لے گئے۔ وہاں سے بھاگ کر اپنی ماں جناب عالیہ (جو لندن گئی ہیں) کے مکان گئی۔ وہاں جان بچا کر رہی جب وہاں بھی مفر نہ پایا تب جا بجا شہر میں متفرق چھپتی رہی بعد اس کے جب — میں اور میری بیٹی تن تنہا پا برہنہ بیرون شہر چلی گئی جو جو صاحب اس حال سے واقف ہوں مہرا اپنی اس کاغذ پر بحکم ولا تکتموا الشہادۃ ثبت کریں فقط المرقوم بست و دوم ماہ اکتوبر ۱۸۵۸ء" قاعدہ سے اس عرضداشت پر دستخطیں اکابر شہر کی ہوں گی مگر میرے سامنے جو مثل ہے اس میں نقل نویس نے اسی قدر لکھا ہے اور ایک دوسری تحریر بھی آپ کی اس مثل میں موجود ہے جس میں اپنی مصیبتوں کی زیادہ مدت زیادہ توجہ دلائی ہے۔

---

[1] روزنامہ ہمت لکھنؤ مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۲۹ء [2] گزشتہ لکھنؤ

[3] ملاحظہ ہو اشتہار مطبوعہ نور المطابع نوشتہ نواب محمد جعفر علی خلف نواب رفیق الدولہ۔

حکام عالیشان کو بمقام یہی کارد معلوم ہوا ہوگا کہ میں خیر خواہ سرکاری بدمعاش بیٹے میرے کو واسطے بنانے سرغنہ بدمعاشوں کے مانگتے تھے میں نے نہ دیا اور چھپا لیا اور اس سبب سے میرے اوپر یہ مصیبت گذری کہ تین دفعہ لوٹی گئی اور جا بجا شہر میں اپنی جان بچانے کو چھپتی رہی اور اس درجہ کو پہونچ گئی چنانچہ واسطے ثبوت لوٹنے بدمعاشوں کے تین دفعہ مجھ کو عدم سازش و آمیزش ساتھ بدمعاشوں کے محضر مہری داروغہ میر واجد علی کے پیش کرتا ہوا روبرو آپ کے۔ اب متوقع آپ کی مہربانی سے ہوں کہ جیسا حکام عالیشان سابق سے عزت اور توقیر اس خاندان کی کرتے رہے ہیں آپ بھی براہ ترحم میری تباہی اور بربادی اور افلاس پر خیال کرکے قطعہ سرٹیفکٹ معافی مرحمت فرمائیں اور روپیہ سود نوٹ میرے کا مجھے ملے کہ صورت گذارا میری کے ہووے ورنہ نوبت فاقہ کشی کی پہونچے گی۔

زیادہ بجز شوق کے کیا لکھا جائے" ملکہ دوراں نواب افسر بہو معرفت محمد فاخرالدین مختار عام ۱۲ نومبر ۱۸۵۵ء

اسمٰعیل گنج کا ذکر مرزا قتیل نے بھی اپنے رقعات میں کیا ہے اور ایک رقعہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو "اکبر علی خاں نے مذکورہ بالا خط برخوردار میر محمد تقی خاں کے حوالے کر دیا ہے اگر وہ بھیج چکے ہوں تو خیر ورنہ خدابخش کو اسمٰعیل گنج بھیج کر منگا لو۔[1]

تحسین گنج

تحسین علی خاں نواب ناظر نے اس محلہ کو بسایا خود ان کی عالیشان محلسرا اسی محلہ میں تھی جہاں صبح سے شام تک کتنے سیاسی مسئلے حل ہوتے تھے۔ ملک کی فلاح و بہبود پر غور کیا جاتا تھا۔ پبلک مفاد پر بحث ہوتی تھی ادبی چہل پہل اس محلسرا کا وہ طرۂ امتیاز ہے جس کا ذکر صفحہ تاریخ پر باقی ہے۔ بڑے بڑے مشاعرے یہاں ہوتے تھے دعوت نامہ بھیجکر ناخدایان سخن طلب کئے جاتے تھے اور وہ قابل ذکر اجتماع ہوتا تھا کہ جو کسی بزم میں نہ تھا وہ تاریخی مشاعرہ جس میں[2] دہن بگڑا، چلن بگڑا، کفن بگڑا، اس طرح میں غزلیں کہی گئیں اور بقولے پالا آتش کے ہاتھ رہا اس پر نور صحبت کی دو غزلیں ناسخ اور آتش کی ملاحظہ ہوں شیخ امام بخش فرماتے ہیں ؎

جو بوسہ لینے میں کل مجھ سے وہ شیریں دہن بگڑا
لگا کہنے بہت تیرا ہے ان روزوں چلن بگڑا

میں کہتا تھا نہ بیٹھا کر رقیبوں کی تو صحبت میں
مزاج آخر نہ تیرا مجھ سے اے پیماں شکن بگڑا

مزا یاد آ گیا ہے کس لب شیریں کے بوسے کا
تمہارا ذائقہ جو آج اے کام و دہن بگڑا

بتوں پر مر گیا ہوں میں بتوں کے نام لکھنا تھے
کفن دو اور مجھ کو مومنو یہ کفن بگڑا

آتش :۔

فریب حسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا
خدا کی یاد بھولا شیخ بت سے برہمن بگڑا

بناوٹ کیفِ مَے سے نکل گئی اس شوخ کی آتش
لگا کر منہ سے پیمانہ کو وہ پیماں شکن بگڑا

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روز محشر تک
نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا

اس عمارت کا اب کہیں بھی نشان باقی نہیں ہے مگر تحسین کی مسجد اور اماماڑہ چوک میں موجود ہے۔

میر علی سوز خواں :۔ اس محلہ کو میر علی صاحب کی قیامگاہ ہونے کا بھی فخر حاصل ہے اور میر علی صاحب کی حیثیت تاریخ اودھ اور

---

[1] رقعات مرزا قتیل ص۳۰ طبع دوم   [2] نیا دور مئی ۱۹۶۵ء ص۱۳

دنیائے عزاداری میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ عہد نواب سعادت علی خاں کے باکمال تھے موسیقی میں عمر صرف کی لحن داودی خدا نے قسمت میں لکھ دیا تھا اور اس وقت کی دنیا نے طے کیا تھا کہ نہ ایسا گلا ہے نہ ایسی آواز، قدرت کے ان دو عطایا پر تحصیل فن کے جوہروں نے اور زیادہ بناؤ پیدا کیا اور میر علی اپنے وقت کے بیجو باورے اور تان سین سمجھے جاتے تھے اور عام طور پر سمجھا جاتا تھا کہ گوالیار کھنچکر لکھنؤ آگیا ہے۔

یہاں کے مذہبی ماحول میں دفعتاً چونکے اور نام و نسب کی لاج رکھی نور ایمان کا جلوہ ہوا طے کر لیا کہ اب غزل نہ پڑھوں گا اس وقت کے پابند سخن انسان کا قول و قرار بات کے دھنی اور مرد کا عہد و پیمان اتنا مستحکم تھا کہ مرتے مرتے کسی طاقت نے نہ توڑا۔ اور طبیعت کا بہاؤ مرثیت کی طرف ہوا مرزا فصیح میاں سکندر، دلگیر اور ضمیر کے سلام اور مرثیے ملک میں فروغ حاصل کر رہے تھے سوزخوانی کی بنیاد قائم کی۔ اور فن کو اتنا باوقار بنایا کہ کسی کے در پر جاکر کبھی سوز نہ پڑھوں گا جس کو غرض ہو میرے گھر پر آئے جس دن سے میر علی صاحب نے توبہ کی ان کی ڈیوڑھی پر شائقین فن کا ہجوم ہونے لگا کمال میں وہ جذب تھا کہ راجہ و پرجا سبھی ادھر آتے تھے نازک مزاج بھی تھے ایک مرتبہ لکھنؤ چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا اور نواب سعادت علی خاں سے ملال ہوا اس واقعہ کو آزاد اپنے الفاظ میں لکھتے ہیں۔ انشا کو خبر ہوئی اسی وقت سعادت علی خاں کے پاس پہونچے۔ نواب نے متحیر ہو کر پوچھا خیر باشد کیوں آئے انھوں نے ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

دولت بنی ہے اور سعادت علی بنا   یارب بنا بنی ہیں ہمیشہ بنی رہے

پھر کہا حضور غلام جو اس وقت رخصت ہو کر چلا تو دل نے کہا کہ اپنے دولہا کی دولہن عروس سلطنت کو ذرا دیکھوں حضور واقعی بارہ ابھرن سولہ سنگار سے سجی تھی سر پر جھومر وہ کون مولوی دلدار علی صاحب کانوں میں جھمکے وہ کون دونوں صاحبزادے گلے میں نولکھا ہار وہ کون خوان علامہ غرض اسی طرح چند زیوروں کا نام لے کر کہا کہ حضور غور جو کرتا ہوں تو ناک میں نتھ نہیں دل دھک سے ہو گیا کہ اللہ سہاگ کو قائم رکھے۔ یہ کیا نواب نے پوچھا پھر وہ کون کہا حضور نتھ میر علی صاحب بعد اس کے کیفیت مفصل بیان کی۔ نواب نے ہنس کر کہا ان کی دور اندیشیاں بجا ہیں میں ایسے صاحبان کمال کو فخر لکھنؤ سمجھتا ہوں ۔ غرض اس شہرت بے اصل کے دفعیہ کے لئے ترقی کا پروانہ اور پانچ سو روپے کا خلعت لے کر وہاں سے پھرے۔[1]

میر سید علی کی خودداری کا دوسرا واقعہ ملاحظہ ہو۔ مرزا قتیل کا بیان — ترجمہ بزبان اردو[2] "آج میرا جی کی سترہویں ۱۲۲۶ھ پیر کے دن دو گھڑی دن رہے مرزا بزرگ پسر مختار الدولہ (جو پٹہ میں بڑے ماہر ہیں) کے ساتھ ہیں اور مرزا حاجی۔ میر علی صاحب کے سننے کے لئے جانا چاہتے ہیں اطلاعاً لکھا گیا" یہ تمام لوگ خود صاحبان کمال ہیں۔

تیسرا واقعہ[3] شاہ عبدالرحمٰن جن کا حال عنقریب آرہا ہے اپنے عہد کے صوفی اور ولی کامل کہے جاتے تھے حضرت مولانا ایک روز خود بخود فرمانے لگے ہماری طبیعت چاہتی ہے کہ مرثیہ میر علی صاحب کا کہ مرثیہ خوانی میں شہرۂ آفاق ہیں سنیں مگر مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاؤں میں طاقت نہیں ہے کہ ان کے مکان جاکر مرثیہ سنیں۔ وہ سوائے اپنے مکان کے دوسری جگہ مرثیہ نہیں پڑھتے خادموں نے عرض کیا کہ بسواری فینس ہیں ان کے مکان پر تشریف لے جائیں اور مرثیہ ان کا سنیں در جواب اس کے آپ نے فرمایا کہ مرثیہ سننے

---

[1] آب حیات   [2] رقعات مرزا قتیل نمبر ۳ ص۲۴ طبع شاہی   [3] خلاصہ ارشاد الرحمٰن ص۱۰

جائیے اور سوار ہو کر جائیے یہ بے ادبی ہم سے نہ ہو گی"۔ صاحبان ثروت کا جو خوش الحانی کے دلدادہ ہوں آنا تعجب نہیں ۔ تمنا اس کی سبب حیرت ہے جو خود مرجع خلق اور فقیر کامل ہو وہ مرثیہ کا دلدادہ ہے۔

ہندوستان میں جتنے سوز خواں تھے سب کا سلسلہ میر علی صاحب تک پہونچتا ہے اس سلسلے کے ایک مرد پیر جو مرض ضیق النفس سے لمحات زندگی پوری کر رہے تھے اور کامل فن سوز خواں تھے حامد حسین فتحپوری ان کا نام نامی تھا موصوف نے بتایا کہ میں اپنے طاقت و توانائی کے زمانے میں ٹھاکر گنج جاتے ہوئے بائیں ہاتھ کی طرف مڑ کر مکان نواب علی نقی خاں میں پہونچا اور وہاں میر علی صاحب کی قبر پر فاتحہ پڑھا ۔۳۰ سال پہلے نشان قبر بتانے والے باقی تھے۔

امامباڑہ میر عباس خواص والے :۔ عہد شاہی کے پرانے امامباڑوں میں اس عزاخانہ کا نام لیا جاتا ہے جو تحسین گنج اور مکان حامد علی خاں بیرسٹر مرحوم کے پچھواڑے تھا اب کچھ پتہ نہیں ہے اس زمین پر ایک پرانی مسجد ہے جو ممکن ہے کہ امامباڑہ کے ساتھ کی ہو۔

جمعہ مسجد :۔ مذہب امامیہ کی سب سے بڑی مسجد جو اپنے لمبان چوڑان میں یوپی کی ہر مسجد سے بڑی ہے تحسین گنج میں واقع ہے یہ عمارت حضرت محمد علی شاہ بادشاہ نے عہد دولت کے آخری زمانے میں بنوانا شروع کیا عمر نے دفانہ کی تکمیل سے پہلے بادشاہ نے رحلت فرمائی ان کے بعد نواب ملکہ جہاں نے شوہر کی یادگار کو تمام کیا اگلا نام اس محلہ کا سنا ہے کہ میر نعیم خاں کی گڑھی تھا اس وقت یہ مسجد سبزہ زار میں ہے اور چار دیواری اور پھاٹک عہد قدیم کے انگریزوں کے زمانہ حکومت میں باقی نہیں رہا مسجد بلند ہے اور کئی زینہ کے بعد لق و دق صحن شروع ہوتا ہے اور پہلو میں لانبا حوض ہے رو کار امامباڑہ آصفی کے رومی دروازہ کا نقش ثانی ہے محراب درمیانی کے دونوں طرف پانچ پانچ در قائم کئے ہیں جن کے اوپر دوسری منزل میں بھی منزل زیریں کے موافق در بنا کر اس کی منڈیر پر طاق گمزیاں اور کلیاں بنائی گئی ہیں ۔ اندرون مسجد کی گلکاری رنگ آمیزی سقف کے نقش و نگار آیات قرآن اور دعائیں اس قدر شوخ رنگ کے قلم سے لکھے گئے ہیں کہ نظروں میں کھپے جاتے ہیں پہلے درجہ سے دوسرا درجہ وسیع تر اور دیوار و در خط عرب کا اعلیٰ نمونہ گنبد دیگر مسجدوں کے برخلاف مسجد کی طویل و عریض حدود کے مطابق نزاکت سے دور سنگی نمونہ پر اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے اونچے پتھر تراش کر بصورت قبہ نصب کئے گئے ہیں بر سر گنبدوں میں سنہری کلیاں اور چاند تارے بنے ہیں کہا جاتا ہے کہ مسجد کے منارے سات کھنڈوں سے بھی اونچے تھے اور آسمان سے باتیں کرتے تھے زلزلہ میں شمالی منارہ کو نقصان پہونچ گیا اس لئے دونوں گلدستوں کے ناقابل تحمل حصہ بالا کو اتار دیا گیا۔

HISXCELLENCY THE EARL OF DUFFERIN , VICEROY AND GOWERNOR GENERAL OF INDIA MESSERS BAURUE

کا البم میرے کتب خانہ میں ہے جو SHEPHERED PHOTOGRAPHIC ARTISTS کا شاہکار ہے اور مسجد جامع کا اس وقت کا عکس ہے جب دست راست کے منارہ میں تین کھنڈ اور دست چپ میں ڈھائی کھنڈ باقی تھا اور ہر دو طرف پاڑہ بندی ہوئی تھی پشت مسجد کو اساس عمارت سے مضبوط اور مستحکم بند دے کر وہاں تک کمر بستہ بنایا گیا ہے جہاں سے زمین مسجد شروع ہوتی ہے مسجد پر بالغ نظر کرنے والا یہ رجحان بھی کر سکتا ہے کہ مسجد میں چار منارہ تھے ہم دیکھتے ہیں کہ مسجد کے پچھواڑے رو کار کے مناروں کے جواب میں نیچے سقف مسجد تک سرتا سر منارے بنے ہیں اور بام مسجد تک پہونچ کر اس کو قطع کر دیا گیا ہے اگر یہ حصہ اصل بانی کے وقت

کا ہوتا تو اس پر برجی اور گمزی کا ہونا ضروری تھا اس کی حیثیت اس وقت نا تمام یا منہدم شدہ کو روک دینے کی ہے۔

اس مسجد میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ پیش امام کے سجادہ کی جگہ تقریباً ۶ انچ پست ہے اور یہ اس لئے ہے کہ مسلک امامیہ کے مطابق امام کو ماموم سے بلند نہ ہونا چاہئے۔ ہودے میں پیش امام کی جا نماز ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ صحن میں جو نمازی شریک جماعت ہوں ان کی نماز آئین کے خلاف نہ ہو۔ مسجد کی گلکاری پر ہمعصر شیخ تصدق حسین بی اے ایل ایل بی وکیل نے اپنے مقالے میں حسب ذیل بیان دیا ہے۔

چھتوں میں ایسی نفیس اور دلآویز گلکاری ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے الفاظ اس کی خوبصورتی بیان کرنے سے قاصر ہیں کہیں انگور کی بیلیں بنی ہیں کوئی چھت پھانکوں دار خربوزے کی مثل بنائی گئی ہے کسی چھت میں پلیٹیں بنی ہیں جن کے ہودے میں نفیس کام بنایا گیا ہے اگلی دالان کی چھت میں ایک تالاب بنا کر اس کے کنارے کنارے لیمو، نارنگی، شریفہ، آم، خربوزے، انناس، انگور کے پھلوں اور شاخوں کے گلدستے اصل سے بالکل مشابہ کر کے بنائے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسجد اپنی صناعی اور خوشنمائی کے لحاظ سے بہترین عمارت ہے رنگوں کے تال میل گل بوٹوں قلمکار جالیوں کی دلفریبی اور سحر کاری کے آگے دوسری مسجد نہیں جچتی۔ مسجد کا نقشہ جس کی تحت میں یہ سر بفلک عمارت تیار ہوئی ایکسپرٹ کے یہاں رہن شدہ اشیاء میں ابھی تک موجود ہے۔

نجم الغنی نے اس مسجد پر توجہ مبذول کر کے پھر غلط بیانی کی ہے اور وہ اس کو اب تک ناتمام[1] عمارت تسلیم کرتے ہیں اس مسجد میں عہد شاہی کے بعد ملاذ العلماء سید ابو الحسن عرف بچھن صاحب مجتہد موروثی حیثیت سے نماز پڑھاتے تھے جن کی تاریخ وفات ۶ صفر ۱۳۰۹ھ ہے۔

نا تمام امام باڑہ:۔ مسجد جامع کے قریب ایک نامکمل عمارت ہے جس کی پختگی استحکام در و دیوار سے واضح ہے یہ مسجد کے ساتھ کا امام باڑہ تھا جس کے پایہ بلند ہو گئے تھے محرابیں اور چھتیں پاٹنا باقی تھیں بعد انتقال محمد علی شاہ بہادر سرمایہ کی کمی سے ادھورا رہ گیا عمارت کی اٹھان بتاتی ہے کہ اگر مکمل ہو جاتا تو مسجد کی طرح یادگار عمارت ہوتی اس ناتمام عمارت کے پشت کا رخ جو کاکوری روڈ جانے والوں کو نظر آتا ہے عمارت کے بھراؤ کی وجہ سے قریب تکمیل صورت میں ہے اور غربا اس میں رہتے ہیں اس میں ۵ در اور محرابیں مکمل ہیں اگر پوری عمارت بن جاتی تو یہ حصہ زیر امام باڑہ کے دو کانات میں شمار ہوتا۔

محلسرا، نواب علی نقی خاں:۔ آخری وزیر اودھ کا قصر بھی اسی محلہ میں تھا اور نواب علی نقی خاں انقلاب سلطنت سے پہلے ویسے ہی ہر دلعزیز تھے جیسا کہ ایک وزیر کو ہونا چاہئے چنانچہ میر تقیر صاحب مرحوم ان کی مدح میں فرماتے ہیں ؎

نواب ہے محسن مرا آباد رہے یہ ہمنام علی اور نقی[2] شاد رہے یہ

اس محلسرا کے کچھ کھنڈر اب بھی باقی ہیں نواب سید محمد نواب صاحب رئیس لکھنؤ اس عمارت میں بھائیوں کے ساتھ رہتے تھے ان کی حیات تک یہ مکان آباد رہا وہ سہ پہر کو فٹن پر ہوا خوری کے لئے نکلتے تھے موٹے تال کی عینک لگائے ہوئے نظر زیادہ کمزور چہرہ کا رنگ اور بال سیاہ گلپھے سر پر بہت پتلی اور خاص طرح کی ناؤ دار ٹوپی جو صرف انھیں کے سر پر نظر آتی تھی۔ نیچے دامن کی اچکن اور چوڑی دار گھٹنہ زیب جسم پہلو کے جیب میں گھڑی اور چین نواب سلطان علی خاں عرف باسو صاحب مرحوم نواب سید شفیع علی خاں آف گھسیاری منڈی حاجی منے نواب صاحب جن کا خود ایک خوبصورت امام باڑہ شیشہ آلات سے آراستہ اسی تحسین گنج میں

---

[1] تاریخ اودھ ج ۵ ص ۱۳۰ [2] مجموعہ مراثی میر تقیر نولکشور طبع ۱۹۰۸ء ج ۱، ص ۲۹۶

موجود ہے ان کے ہمعصر، وضع داری و وقار لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تصویریں تھیں۔

نواب علی نقی خاں نے ۱۲ رمضان ۱۲۸۳ھ کو محسن الدولہ کے مکان میں مبتلائے ہیضہ ہو کر انتقال کیا۔

علی نقی خاں کی غداری بادشاہ اور ملک کے ساتھ آفتاب سے زیادہ چمکتی ہے۔ میں نے عہد شاہی کے بوڑھوں سے سنا تھا کہ جب ان کا جنازہ اٹھا تو قوم کا ایسے وقت میں بھی ان کے بارے میں جو خیال قائم ہو چکا تھا وہ دلوں میں دبا نہ رہا اس مخالفت عام کا تاریخی ثبوت بھی مل گیا ہے۔ علی نقی خاں کا ارادہ تھا کہ کلکتہ میں شاہ سے ملیں اس ارادہ میں سفر کیا اس وقت کے حال میں ہے۔

جب شوارع سڑک پر گذری مردم بازاری نے سواری کا اہتمام کیا دم رخصت مسافر کو خدا و رسول کو سونپتے ہیں۔ ان لوگوں نے سب و دشنام کیا جو منھ میں آیا بے تکلف سنایا نواب صاحب نے بار وقار سے دب کر سر کو نہ اٹھایا۔

اماباڑہ اختر محل:۔ نواب علی نقی خاں اپنی صاحبزادی رونق آرا عرف اختر محل کے لئے اودھ کے دور آخر میں ایک اماباڑہ بنوا رہے تھے کہ غدر ہو گیا اور جو حدیں پڑی تھیں وہ مٹ گئیں۔

قبر اختر محل:۔ اختر محل وزیر اودھ کی صلبی بیٹی تھیں اور شاہ مرحوم کے ساتھ کلکتہ بھی گئیں اور شاہ مرحوم کی رحلت کے بعد ۱۸۸۷ء میں اپنے میکہ تحسین گنج آگئیں اور ۱۹۰۸ء میں بعمر ۵۹ سال درد سینہ میں مبتلا ہو کر دنیا سے عقبیٰ کو سدھاریں اور تحسین گنج میں دفن ہوئیں۔

اختر محل شعر و سخن میں یکتا تھیں شاہزادہ مرزا سلیمان جاہ انجم ایک مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ملکہ کی فرمائش سے اپنا کلام سنانے لگے اور یہ شعر پڑھا۔

دم مرا نکلا ترے دمدموں کے ساتھ   تری گھبرائی ہوئی ہوں ہاں کی طرح

ملکہ نے فرمایا دوسرا مصرعہ بدل دو۔ ع تری شرمائی ہوئی ہوں ہاں کی طرح

ایک دعوت:۔ حامد علی خاں بیرسٹر تہذیب لکھنؤ کی آخری شمع تھے ان کے دور تک لکھنؤ کے کمال میں زوال کا روز سیاہ نہیں دیکھا گیا مگر انگریزیت رفتہ رفتہ پھیل رہی تھی۔ دعوت میں حیدرآبادی طرز پر سب مہمانوں کے سامنے خالی پلیٹیں اور کاسہ میں سالن اور رقاب میں پلاؤ زردہ آ چکا مگر نکالنے میں کسی نے پہل نہ کی اس لئے کہ بارق صاحب خودداری کے ساتھ ہاتھ کھینچے ہوئے بیٹھے تھے وہی سب بوڑھے تھے جب تک ابتدا نہ کرتے کوئی سبقت نہیں کر سکتا تھا۔ بیرسٹر صاحب نے بارق صاحب کی طرف دیکھ کر ادب سے عرض کیا قبلہ بسم اللہ، انہوں نے پوچھیں کیجیے گا کہ یہ بھی بتا دیجئے کہ کتنا کھاؤں بس یہ سننا تھا کہ نوکروں کو اشارہ ہوا اور پلیٹیں اٹھا دی گئیں پیالوں میں قورمہ سالن قدیم دستور کے مطابق نکل آیا اور تمام حاضرین بارق صاحب کی پابندی وضع کے قائل ہو گئے

بارق میاں عشق کے ہمعصر اور پرانے روایات کے حامل تھے ان کا فوٹو میرے پاس ہے۔

ڈولے خاں:۔ عہد نصیر الدین حیدر میں پیدا ہوئے۔ عہد سلطان عالم میں فن موسیقی کی تکمیل ہوئی ہو رہی اور دھرپد میں استاد مانے گئے اور مدت العمر داد سخن لے کر آخرت کی راہ لی بڑے بیٹے کا نام محمد حسن خاں تھا جو موسیقی سکھانے میں کامل مانا گیا اور چھوٹے کا نام

لہ نیا دور دسمبر ۱۹۵۹ء از حلیم لکھنؤ

احمد خاں ہے اس کے معلومات تو بہت ہیں مگر خوش گلو نہیں ہیں۔ واقعہ نگار[1] لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کا مکان وہاں تھا جہاں کہ حامد علی خاں بیرسٹر کی کوٹھی ہے۔ تیرہویں صدی کا مؤلف عرض کرتا ہے کہ بیرسٹر صاحب کی کوٹھی بھی اب نہ رہی عقب مسجد جامع جو ٹیلہ ہے اور اس پر ایک مسجد ہے اس مسجد خورد کے سامنے حامد علی خاں کا مکان تھا۔ ڈولے خاں تا لکٹورہ کی مقدس کربلا میں سپرد خاک ہیں۔

مہدی حسن خاں :۔ آپ تحسین گنج میں رہتے تھے اور بین بجانے میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ واجد علی شاہ کو ان کی شخصیت پر ناز تھا۔ بعد غدر ریاست دتیا چلے گئے اور کوی سنگھ پکھاوجی سے مقابلہ ہوا اور اس کو شکست دی ایسی بین بجائی کہ وہ ساتھ نہیں دے سکا۔ راجہ نے انعام سے سرفراز کیا۔ مہدی حسن[2] ڈولے خاں کے بیٹے تھے لغمہ موت سنکر راہی ملک بقا ہوئے اور عظیم اللہ خاں کی کربلا میں دفن ہوئے۔

حکیم پناہ علی :۔ عہد واجدی کے مشہور طبیب تھے باغ نواب علی نقی خاں کی پشت پر ان کا مکان تھا نبض دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ کیا مرض ہے قیافہ شناسی میں ایسا کمال تھا کہ ایک دن اپنے گھر کے سامنے کھڑے تھے کہ ایک نوجوان[3] لڑکا ادھر سے جا رہا تھا اس کو بلایا اور کہا کہ تم کبوتر بہت اڑاتے ہو، اس نے کہا جی ہاں حکیم صاحب نے کہا خبردار اب تو زور سے نہ کرنا ورنہ مر جاؤ گے لڑکے نے نہ مانا حسب معمول کوٹھے پر چڑھ کے کبوتر اڑائے اور زور سے تو کی فوراً دم نکل گیا۔

کوٹھی نواب علی نقی خاں میں طاقت کا مظاہرہ

مرزا احمد حسین عہد واجدی میں دوسرے درجے کے رسالدار تھے مرزا علی رضا بیگ کوتوال کے بھانجے تھے۔ جب نواب علی نقی خاں تحسین گنج میں کوٹھی تعمیر کرا رہے تھے تو چھت کے سب لٹھے انھیں کے چڑھائے ہوئے عمارت میں لگے ان کا بوجھ گھوڑا نہ اٹھا سکتا تھا ہمیشہ ہتھنی پر بیٹھتے تھے اگر ہاتھی کی دم پکڑ لیتے تو وہ آگے نہ بڑھتا ہاتھی کی مستک پر گھونسہ[4] مارتے تو وہ چیخ اٹھتا اس قدر طاقت[5] کے باوجود نواب صاحب علی خاں نے ان کو زیر کیا ان کے مگدر کی جوڑی تین من کی تھی۔ اس میں سیسہ بھرا تھا غدر کے کئی سال بعد انتقال کیا۔

دھومی خاں :۔ آپ بتر بنانے میں یکتا[6] تھے تحسین گنج میں قدیم سکونت تھی۔

ٹھاکر گنج :۔ عہد نوابی کے ہندو جتہ میں کسی دل والے نے یہ محلہ بسایا اور حکومت کی رواداری تھی کہ ہر بستی کو نگاہ امتنان سے دیکھا اور بسانے والوں کی ہمت افزائی کی ٹھاکر قوم اس وقت سے بلند رتبہ سمجھی جاتی ہے جب اچھوت افراد پر نظر ذلت پڑتی تھی کاکوری سے آنے والوں کو پہلے ٹھاکر گنج پڑتا تھا اس لئے یہ محلہ اس وقت بھی غلہ اور ترکاری کی منڈی تھا اور آج بھی، ختم عہد شاہی کی ویرانی کے بعد کافی آباد ہے گیہوں، جو، چنا، مٹر دالیں فراوانی کے ساتھ آڑھتیوں کے یہاں فراہم رہتی ہیں اور آم خربوزے تربوز یا ترکاریاں دیہات سے براہ راست آتی ہیں اس محلہ میں۔

راجہ مہرا کا مکان :۔ نواب آصف الدولہ کی پالکی اٹھانے والا چہیتا کہار راجہ مہرا اس کی ایک پختہ حویلی ٹھاکر گنج میں بھی تھی عہد آصفی کی یہ عمارت اب باقی نہیں صرف تاریخ میں تذکرہ ہے راجہ مہرا کے حالات زندگی اور شخصیت کا کچھ تذکرہ محلہ پیر خاں کی گڑھی میں ہو چکا ہے اور آئندہ اپنے محل پر انشراح بسط کے ساتھ حالات آئیں گے ناظرین منتظر رہیں۔

---

[1] قدیم نمبر ص ۶۷ [2] ص ۸۵ منہ [3] قدیم نمبر ص ۹۵ [4] قدیم نمبر ص ۱۱۳ [5] قدیم نمبر ص ۱۱۵ [6] نمبر ص ۱۹۰

امامباڑہ جھاؤلال :- آپ نواب آصف الدولہ کے وزیر تھے لکھنؤ میں بڑی شاندار زندگی بسر کی۔ آپ کے سگے بھائی میاں دلگیر نے اسی دور میں مذہب تبدیل کرکے شعر و سخن اور مرثیہ گوئی میں وہ نام پیدا کیا جو آج تک باقی ہے جھاؤلال کے سفر عظیم آباد اور اسلام لانے کا ذکر درگا پرشاد نے[1] بیخ میں کیا ہے۔ ایک پل امین آباد کے قدیم راستہ پر اور ٹھاکر گنج کا امامباڑہ ان کی یادگار ہے۔

امامباڑہ :- گول دروازہ سے جاتے وقت ٹھاکر گنج پہونچکر داہنے ہاتھ پر ایک بلند اور شاندار مسجد ہے جس میں گنبد نہیں ہیں اور بائیں ہاتھ پر اور آگے بڑھ کر یہ امامباڑہ ہے جس کے حصار کی دیواریں باقی نہیں ہیں ایک لانبا نو دروں کا دالان اور اس کے بعد اونچی شہ نشین رہ گئی ہے صحن کی وسعت کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ پھاٹک اور پہلو کی صحنچیاں کس قدر شاندار اور رفیع ہوں گی چھتیں بھی باقی نہیں ہیں عہد جھاؤلال میں اس عزاخانہ میں بڑی دھوم سے مجلسیں ہوتی تھیں جن میں نواب امین الدولہ امداد حسین خاں کی شرکت کا تاریخ میں تذکرہ ہے قدوۃ العلما سید آقا حسن المتوفی ۱۳۴۸ھ نے شیعہ کانفرنس سے بددل ہونے کے بعد اس امامباڑہ میں شیعہ بیت المال کھولا تھا اور طلبہ کو چند مدرس علوم مشرقیہ کے سبق پڑھاتے تھے ۱۳۴۴ھ سے ابن سعود کے خلاف جنت البقیع کی بربادی پر اس امامباڑہ میں یوم غم منایا جاتا ہے

مولوی ہادی علی میلاد خواں :- آپ آخر عہد شاہی میں پیدا ہوئے تھے سیتاپور وطن تھا بارہ وفات کے موقع پر مسجد ٹھاکر گنج میں آکر ٹھہرتے تھے مسلمان ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے میلاد خوب پڑھتے تھے عربی کے بہترین خوشنویس تھے قاسمی پریس سبحان نگر نے ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف چھاپا ہے اور اپنی مرتب کردہ فہرست کتب میں اس خصوصیت کا تذکرہ کیا ہے مولوی اشرف علی دوسرے خطاط ان کے ہمعصر تھے لکھنؤ میں سنی شیعہ مصالحت کے سلسلے میں بمقام امامباڑہ آصف الدولہ اہلسنت کی طرف سے مجلس اور مولانا سید سبط حسن صاحب کی خواندگی کا اعلان اور دوسرے دن شیعوں کی جانب سے مولود اور مولوی ہادی علی صاحب سے پڑھنے کا وعدہ ایک تاریخی واقعہ ہے جو اخبارات میں موجود ہے اس موقع پر آپ کسی وجہ سے شریک صحبت نہ ہو سکے اور علماء کرام لکھنؤ میں مولانا سید نجم الحسن صاحب کی تحریک سے اس عظیم الشان اجتماع میں عین وقت پر مولانا سید محمد حسین صاحب مرحوم مشہور عالم شیعہ اور محدث پڑھے اور یادگار تقریر کی اتحاد کمیٹی نے موصوف کے اس برمحل تعاون کو آخر تک یاد رکھا۔

نواز گنج

نواب آصف الدولہ کا بسایا ہوا محلہ جس میں خاندان شاہی کے معزز طبقے اور امراء اودھ کی چودہ ڈیوڑھیاں تھیں جن پر گھنٹہ بجتا تھا دولت عزت حشمت اقتدار کا مرکز تھا اور چند ناموں کے سوا تمام ہستیاں گمنام رہ گئیں اور محلہ اس وقت سے اجاڑ ہونے کے بعد ابھی تک آباد نہیں ہوا کہیں کہیں آثار قدیمہ کسی مکان کی دیوار کسی قصر کی نیو اور کسی باغ کا دروازہ نظر آتا ہے۔

مرزا بیدار بخت بہادر :- اس محلہ کے پرانے رئیسوں میں آپ تھے اور وقف حسین آباد کی تولیت بڑے شاندار طریقے پر آپ سے متعلق تھی یہاں تک کہ جمادی الاول ۱۳۲۳ھ میں گوشہ قبر بسایا۔ اخبارات نے تعزیتی نوٹ لکھے کئی بیٹے چھوڑے مگر وجاہت ذاتی اپنے ساتھ لے گئے وثیقہ صرف چالیس روپیہ ماہوار تھا اور دروازہ پر ہاتھی مختلف گاڑیاں صاحبزادوں کی سواری اس کے علاوہ اندر سے باہر تک ڈیڑھ سو نوکر چاکر، ضرورت کے مواقع پر داروغہ نے آکر عرض کیا فلاں کام کے لئے پانچ سو روپے کی ضرورت ہے تو ہر مطالبے پر یہی جواب ملتا تھا کہ فرش کے نیچے سے نکال لو اور جتنا روپیہ مانگنے والا مانگتا اتنا ہی چاندنی کا گوشہ الٹ کر نکل آتا لوگ یہی سمجھتے تھے

---

[1] بوستان اودھ فارسی ص ۹۲ و ۹۳

کہ دست غیب ہے اور قلیل آمدنی پر یہ اولوالعزمی قدرت خدا ہے۔

نواب مرزا شوق :۔ اردو ادب کا مشہور انسان جس کا نام حکیم تصدق حسین تھا ان کی مثنوی زہر عشق سے زیادہ مقبول آج تک کوئی مثنوی نہیں ہوئی یہ مثنوی انگریزی دور میں خلاف قانون قرار دی گئی تھی مدتوں چھپ نہیں سکی۔ لوگوں نے زبانی یاد کر لی تھی بے اعتباری دنیا میں شوق کا ایک شعر ہے

صبح کو طائران خوش الحاں　　پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

موعظہ ہے کچھ معلوم نہیں کہ شوق کی اولاد کہیں ہے یا کوئی باقی نہیں پچاس برس پہلے ان کے بیٹے صفدر مرزا اودے رنگ کا ریشمی رومال گلے میں دوپلی ٹوپی سر پر بن ٹھن کر چوک میں نکلتے تھے بے پڑھے تھے مگر علم مجلس سے بے خبر نہ تھے ان کے دانتوں کی مستی اب تک لوگوں کو یاد ہے۔

مرزا علی عباس :۔ نواز گنج کے مشہور لوگوں میں تھے عہد واجدی میں ان کا کمال یہ تھا کہ اپنے گھر کے کبوتروں میں سے کوئی ایک بیاہ کر میں کسی سے کہہ دیا کہ جب یہ کبوتر کوٹھے پر آکے بیٹھے تو اور کبوتر جو ٹھاٹھر میں ہیں انھیں کھول دینا یہ کہہ کر کبوتر ہاتھ میں لے کر چلے۔ کسی رئیس کے یہاں آئے اور ان کے کوٹھے پر گئے اور اس کبوتر کو ان کے ٹھاٹھر میں اکیلا چھوڑ دیا چند منٹ کے بعد ٹھاٹھر کو کھولا کبوتر نکل کر ٹھاٹھر پر بیٹھا انہوں نے لے اڑا دیا وہ اپنے گھر پر آکر ٹھاٹھر پر بیٹھ گیا حسب ہدایت گھر میں کسی نے ان کے ٹھاٹھر کی کھڑکی کھول دی سب کبوتر نکل کر بیٹھے وہ پہلے والا کبوتر اڑا آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے بقیہ سب کبوتر وہاں پہونچے جہاں سے مرزا نے اس کو اڑایا تھا انہوں نے دانہ ڈال دیا سب کبوتروں نے کھایا یا مرزا کوٹھے سے اتر کر نیچے آئے کبوتر سب کے سب جو مہمان گئے تھے اڑتے ہوئے فضا سے اپنے گھر پہونچے۔

دوسرا کمال یہ تھا کہ اپنے سب کبوتر شہر بھر میں جہاں چاہتے لے جاتے اور کسی نواب یا رئیس کے کوٹھے پر انھیں لے جا کر اڑاتے۔ جب نواب تماشہ دیکھ چکتے تو وہی دانہ جو یہ اپنے گھر پر کبوتروں کو دیتے تھے نواب کے کوٹھے پر ڈال دیتے اور اپنے گھر چلے آتے جب کبوتر دانہ کھا چکتے پھر کسی کے لڑائے نہ لڑتے اور سیدھے اپنے گھر لوٹ آتے۔

تیسرا کمال ان کا یہ تھا کہ لکھنؤ سے بمبئی گئے اور وہاں کبوتر مول لئے سب کو پنجرے میں بند کیا اور جہاز پر کربلائے معلی روانہ ہوئے جہاز چھوٹا انہوں نے پنجرا کبوتروں کا کھول دیا کبوتر اڑاتے ہی جہاز چلا جاتا ہے جب سیٹی دی اور آ کہا کبوتر اپنے پنجرے پر آکر بیٹھ گئے۔ پورے سفر میں یہی تماشہ کرتے رہے معلوم نہیں کون سی گولی کبوتر کو کھلا دیتے تھے اور دانے میں کون سی دوا ملا دیتے تھے۔ کسی کو بتایا نہیں اپنا کمال اپنے ساتھ[2] قبر میں لے گئے۔

سانپ پکڑنے والے

عہد واجدی[1] میں رمضان علی نامی ایک باکمال نواز گنج میں رہتے تھے تھوئی کا کام کرتے تھے اور سانپ پکڑنے میں ان کا جواب نہ تھا ہزاروں سانپ پکڑ ڈالے ہمیشہ بائیں ہاتھ سے سانپ پکڑتے تھے اور ان کی کہاوت تھی کہ جو لوگ داہنے ہاتھ سے سانپ پکڑیں گے زک اٹھائیں گے کیونکہ سانپ داہنی طرف آسانی سے منہ مارتا ہے ان کے بہت سے شاگرد اس وقت لکھنؤ میں موجود تھے اور کتنے

لہ قدیم بزم ص۲۱۵　　ٹہ قدیم بزم ص۲۱۸

سانپ کے کاٹے ہوئے لوگوں کو انہوں نے اچھا کیا ان کے جھاڑنے کا طریقہ یہ تھا کہ جس کو سانپ نے کاٹا ہو اس کا کوئی عزیز پکارتا ہوا چلا اٹھو ڈنک جاگو جب رمضان یہ سنتے اس آدمی کو اپنے پاس بلاتا اور کچھ پڑھ کر ایک طمانچہ اس کو مارتا۔ وہ غش کھا کے گر پڑتا اور جس کو سانپ نے کاٹا وہ جہاں ہوتا اٹھ بیٹھتا تھا جد کو جسے غش آگیا تھا وہ اپنی اصلی حالت پر آجاتا تھا۔ میرے سامنے کتنی بار ایسا اتفاق ہوا۔ ایک بار اخبار ہمدم لکھنؤ میں سید جالب صاحب مرحوم اڈیٹر کے زمانہ میں میں نے اس کے کمال کو چھپوا دیا تھا۔

ایک بار رمضان علی ایک سیاہ ورپٹہ سانپ اچاری میں بند کر کے دکھانے لایا ڈیڑھ بالشت کا سانپ تھا جو نہایت زہریلا تھا اس سانپ کے پھن کو چھوڑ کر باقی سارا جسم عباسی رنگ کا رنگ دیا اور افریقہ سے ایک انگریز سانپ خریدنے لکھنؤ آیا تھا اس نے اس سانپ کو سو روپے کو مول لیا وہ انگریز یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ رنگا ہوا سانپ ہے پانچ سال کا عرصہ تقریباً ہوا رمضان علی نواز گنج میں بخار سے مر گیا۔

نواب پاپیہ :۔ کوتاہ قامت ہونے سے ان پر یہ پھبتی تھی وہ اعلیٰ درجے کے کبوتر باز تھے گرہ باز کبوتروں کو گولوں کی طرح لڑاتے تھے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ جس جگہ اور جس گھر میں چاہتے چمپی کے اشارے سے قلابازی کھلا دیتے۔

ببر علی :۔ آپ بھی نواز گنج کے رہنے والے تھے اولاد نہ تھی بمبئی میں امامباڑہ بنوایا اور منتظم الدولہ حکیم مہدی مرحوم نے حضرت فردوس منزل محمد علی شاہ کو زائرین عراق کے ٹھہرنے کے لئے توجہ دلائی۔ عمارت تیار ہوئی ببر علی متولی ہوئے افسوس ہے کہ لوگوں نے اس وقت ذاتی ملکیت بنا رکھا ہے۔ بھنڈی بازار میں یہ عمارت موجود ہے۔

کوکا پیر کا میلہ :۔ نواز گنج کا تاریخی جمارتھا جو پبلک کے ہجوم کا دن تھا اور بازاری لوگوں کے فرحت و انبساط کا واحد ذریعہ تھا۔ چرکیں کے کلام میں اس کی ایک ملتی ہوئی تصویر موجود ہے ؎

یہ دعا ہے روز و شب چرکیں کی کوکا پیر سے
میں بھی اب مہتر بنوں جا کر الہ آباد کا

میلہ ہے کوکا پیر کا چھڑیوں کی سیر ہے
چلئے نواز گنج کے بازار کی طرف

روضہ نجف :۔ یہ عہد امجد علی شاہ بہادر مرحوم کی عمارت ہے جس کے بانی قاری محمد علی تھے گرد روضہ کے شوالے اور پرانے مندر ہیں نجف کی تیاری پر بادشاہ کی طرف سے بہت بڑی پیش کش دی جا رہی تھی مگر پر خلوص بانی نے قبول نہ کیا اور جس قدر اپنی گاڑھی کمائی سے بنوا چکے تھے اسی پر اکتفا کی پھاٹک کے بعد چوڑی چکلی زمین درمیان میں نقل روضہ کا ایک کمرہ مع رواق آگے بڑھ کر ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد، عمارت نے مقبولیت حاصل کی اور نوچندی اور ہر جمعرات کو زائروں کا ہجوم ہونے لگا مجالس علم تعزیہ ایام غم میں یہاں آنے لگے قاری صاحب صاحب تصنیف بھی تھے تحفۂ محمدی ان کی ایک کتاب علم تجوید میں ۱۲۶۲ھ مطبع احمدی کی چھپی ہوئی ۱۸/۲۲ سائز ۱۰۰ صفحات پر میں نے دیکھی ہے جو ان کے علم و عمل پر گواہ ہے۔

امامباڑہ جعفری بیگم :۔ آپ نواب ملکہ جہاں کی سرکار میں داروغہ تھیں اور نواز گنج میں امامباڑہ بنوایا تھا جو زمانہ گزرنے پر باقی نہیں رہا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ امامباڑہ کس سائز میں تھا نواز گنج میں کوئی امامباڑہ موجود نہیں ہے۔

نواز گنج کی بالائی :۔ لکھنؤ میں جو محلہ وار خصوصیات تھے منجملہ اس کے نواز گنج کی بالائی بہت عمدہ ہوتی تھی بالائی کو اہل عراق "سرشیر"

ل قدیم بیر ص۲۱۹ ؎۲ ہمدم لکھنؤ ص۲۰۹ ؎۳ زاد زائرین سفرنامہ آخوند مرزا قاسم علی مرحوم لکھنوی ص۱۲

اور عوام ملائی کہتے ہیں۔ میر سید حسن نامی ایک وضعدار اپنے دوست کی فرمائش پر روزانہ عمر بھر پاؤ بھر بالائی پہونچاتے رہے اور بیماری دکھی سردی گرمی برسات کوئی دن ناغہ نہیں کیا۔

خاندان نوبت رائے نظر :- اہل شہر میں دو بھائی نوبت رائے نظر اور لکھپت رائے تھے جو مصوری میں طاق تھے اول الذکر نے انگریزی دور حکومت میں خدنگ نظر رسالہ نکالنا شروع کیا تھا یہ دونوں صاحب کمال وزیر علی انجم مصور کے ہمعصر تھے لکھپت رائے نواز گنج میں رہتے تھے اور کتاب کی لوح، سرورق ٹائٹل ان سے بہتر بنانے والا لکھنؤ میں نہ تھا کتاب کے صفحہ اول اور ٹائٹل کی یہ شان تھی کہ صفحے کے ہر چہار طرف بیلیں اور کئی کئی جدول دباڈر، درمیان میں جلی قلم سے نام پیشانی اور آخری سطر میں ایسی عبارت جس میں وائرے تحریر میں خوشنما معلوم ہوں۔

پہلی سطر:- بیمن و تفضل خالق کون و مکاں حی و سبحان صانع زمین و زمانہ۔

آخری سطر:- در مطبع علوی بخش خاں بحسن سعی حاجی محمد روشن خاں بحلیہ طبع رسید۔

صفحہ ۲ پر ۳/۴ حصہ میں اس سے زیادہ گلکاری کرتے ہوئے تین کامل گنبد یا درمیانی پورا اور پہلوؤں کے آدھے اور کبھی ہر سہ قبہ پر دوسرا کنا و بنا کر مسجد کی شکل کا عکس دو کی جس کا نمونہ قدیم کتابوں کے صفحہ اول پر دیکھا جا سکتا ہے۔

نوبت رائے کا قطعہ تاریخ وفات یہ ہے ؎

سخن سنج و سخن فہم و سخن داں — ادیب و شاعر و نثار اعلیٰ
قدیم الوضع نوبت رائے منشی — نظر پنہاں بشد از چشم دنیا — ۱۹۸۰ سمبت

لکھنؤ کے آخری دور نواز گنج کے رہنے والوں میں منشی احسن مرحوم جو صرف و نحو کے اچھے خاصے ماہر تھے مگر ان سے برتر لاتعداد اہل علم میں ان کو کون پوچھتا۔ ڈرامہ لکھتے تھے اور یہی ذریعہ معاش تھا ان کا بیٹا صادق نٹ بال کا کھلاڑی اور بھائی حکیم بتن صاحب کے پاس ایک قرآن مجید تھا، بخط عبرانی جو امام حسن اور امام رضا کی نظر مبارک سے گزر چکا تھا اور سورۂ اقراء سے اس کی ابتداء اور الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم الخ پر ختم تھا اور ایک وصیت نامہ بھی قرآن کے ساتھ تھا وہ اسناد اور خصوصیات مصحف پر روشنی ڈالتا تھا۔ عبرانی کے آخری جاننے والے عثمانی صاحب اڈیٹر اودھ پنچ تھے جن کا نام اس کتاب میں آچکا ہے۔

عباس باغ

گزشتہ بیانات سے واضح ہوا کہ سید امام علی کو محمد علی شاہ بہادر نے رفیق الدولہ کا خطاب دیا تھا حکومت اودھ کے وہ معزز ترین آدمی تھے اور حسین آباد کے امامباڑہ میں ان کو وصیت کے حقوق حاصل تھے مزاج میں دینداری اور جذبہ خدمت خلق تھا جو ان کے آثار قدیمہ سے واضح ہے۔

کربلائے رفیق الدولہ:- یہ کربلا ٹھاکر گنج سے آگے اور امامباڑہ جھاؤلال کو راستے میں چھوڑ کر بائیں ہاتھ کی طرف پڑتی ہے۔ اور کاکوری روڈ کے کنارے واقع ہے اور حضرت عباس علمدار کے روضہ کی نقل ہے دور سے ایک عالیشان گنبد اور دو بلند منارے نظر آتے ہیں پھاٹک سے گزر کر اندرونی آراضی اور عمارت کربلا میں رواق اور درمیانی حصوں میں دیواروں پر خوشنما گلدستے اور قمقمی

مناظر مختلف رنگوں کی بیلیں تال میل سے بنائی ہیں زیر گنبد ضریح مبارک اور تبرکات ہیں۔
رفیق الدولہ نے ۱۱ ربیع الآخر ۱۲۷۰ھ کو اسہال کی بیماری میں انتقال کیا اور اسی روضہ میں دفن ہوئے قبر پر یہ قطعہ تاریخ ہے :

چوں یاز دہم شد ز ربیع الثانی　　رفتہ ز جہاں وائے رفیق الدولہ
تاریخ رحلت او کیواں گفت　　شد قصر جناں جائے رفیق الدولہ

رفیق الدولہ کی اولاد میں نواب محمد جعفر علی خاں حکام رس اور معزز شخص گذرے ہیں ان میں خدمت خلق کا جذبہ بڑے پیمانے پر تھا بڑھاپے میں تین پہیوں کی سائیکل پر نکلتے تھے گول دروازہ پہونچکر سو روپے کا نوٹ صراف سے خوردہ کیا اور کھڑے کھڑے محتاجوں کو بانٹ دیا کہا جاتا ہے کہ وہ فراميشن لاج کے ممبر بھی تھے۔ قدیم وضع سر پر سنہرے فیتے کی جرنیلی ٹوپی جسم میں سیاہ کوٹ پہنتے تھے اور دندان سازی میں یکتا تھے مصنوعی دانت کا چوکا بنانا تو ہر دندان ساز کا کام ہے مگر وہ پلیٹ کے لئے خود دانت بناتے تھے اور ان کے پاس ایک مشین تھی جو دانت تیار کرتی تھی یہ کام کسی امریکن افسر سے حاصل کیا تھا۔ انگریز ان کی بڑی عزت کرتے تھے گورنروں کی دعوت میں انہوں نے بہت روپیہ صرف کیا اور یہ دندان سازی ایک ضیافت کا صلہ تھی طلبا اور اہل علم کی بڑی عزت کرتے تھے میر فدا حسن صاحب جرولی ان کی صحبت کے خاص آدمی تھے مولانا سید زین العابدین صاحب امام جمعہ و جماعت ملتان زمانہ تحصیل علم میں انھیں کے گھر پر رہتے تھے اور عباس باغ سے مدرسہ سلطان المدارس پڑھنے جاتے تھے نواب موصوف نے ۲ دسمبر ۱۹۳۰ء کو انتقال کیا اور اسی کربلا میں دفن ہوئے۔ جب تک وہ زندہ رہے کربلا کی حالت درست رہی نوچندی کو خود کربلا میں مجلس کرتے تھے اور پیسے تقسیم کرتے تھے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

جنوں کی مسجد

اسی گرد و نواح میں جو بڑی مسجد ہے وہ جنوں کی مسجد مشہور ہو گئی ہے اور اس شہرت کے دو راز بتلائے جاتے ہیں ایک یہ کہ آخری تاجدار اودھ پچھلے پہر سے فوج کو پریڈ کراتے تھے ایک دن تاخیر ہوئی اور نماز صبح کے لئے مسجد میں جانا چاہا۔ ارکان سلطنت نے عرض کیا یہاں مسجد کہاں جنگل ہے شاہ نے صحرا میں نماز پڑھی اور بعض حاشیہ نشینوں کو اسی وقت خیال پیدا ہوا کہ آئندہ پریڈ سے پہلے یہاں مسجد بن جائے اپنی کارگذاری اور حسن خدمات دکھانے کے لئے تعمیر میں اس قدر پھرتی ہوئی کہ دیواریں اٹھتی جاتی تھیں اور انگیٹھیوں میں آگ روشن کرکے استرکاری سکھاتے جاتے تھے غیر معمولی مدت میں مسجد بن کر تیار ہوئی اور پریڈ کے دن جان بوجھ کر سپاہیوں نے اتنی دیر کی کہ نماز کا وقت آیا اور عرض کیا کہ ظل اللہ مسجد میں چلیں حیرت سے پوچھا کہ مسجد یہاں کہاں ؟ عرض کیا کہ حضور کے اقبال سے تیار ہو گئی نظر مبارک سے مسجد گذری اور بے ساختہ فرمایا کہ بھئی یہ آدمی کا کام نہ تھا تم نے جنوں کا کام کیا اس دن سے جنوں کی مسجد مشہور ہوئی

دوسرا قول یہ ہے کہ کسی رئیس نے خواب میں دیکھا تھا کہ اس جگہ ایک جم غفیر نوحہ و ماتم میں مصروف ہے تعبیر خواب میں اس جگہ مسجد بنائے جانے کا ارادہ ہو گیا اور خانۂ خدا بن کر تیار ہوا۔

لکھنؤ کی چکنی مٹی جو مشہور ہے وہ اسی محلہ کی مٹی ہے جو لطافت صفائی میں ہر مٹی سے اچھی ہے۔

الماس باغ

یہ وہ باغ ہے جہاں نصیر الدین حیدر بہادر اور ان کی ماں بادشاہ بیگم میں جب کچھ رنجش ہو گئی اور وہ خاتون منا جان دیوتے

دے کر بیرون شہر مقیم ہوئیں تو اسی باغ میں قیام کیا۔ تاریخ میں بارہا اس باغ کا نام آتا ہے اور اس سلسلے میں کچھ وضاحت بھی ہوئے جو تشنۂ تحقیق ہیں مناجان کا اصل نام فریدون بخت[1] تھا اور ان کا سلطنت سے محروم ہونا تاریخی واقعہ ہے جس شخص کا قصہ دفتی بڑھ گیا ہو اس کو لکھنؤ کے محاورے میں مدتوں مناجان کی سلطنت سے یاد کیا جاتا رہا۔

موسیٰ باغ

یہ باغ نواب آصف الدولہ نے تیار کرایا اور نواب سعادت علی خاں کی سیرگاہ خاص قرار پایا یہاں جانور لڑائے جاتے تھے۔ موسیٰ باغ اس چمن کو کیوں کہتے ہیں اس کی وجہ میں دو رائیں اہل قلم کی ہیں پہلی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ نواب آصف الدولہ کی سواری میں ایک روز گھوڑے کی ٹاپ سے چوہا (موش) کچل گیا آپ نے شگون بد سمجھتے ہوئے اس کے دفن کا حکم دیا۔ دوسرا بیان یہ ہے کہ موسیو بجنیر فرانسیسی نے باغ کا نقشہ بنایا تھا اس لئے یہ نام ہوا۔ اس وقت یہ جگہ ویران ہے غدر ۱۸۵۷ء کے شعلے اسی جگہ سے بھڑکے حکومت اودھ ضبط کرنے کے بعد انگریزوں نے یہاں چھاؤنی بنائی تھی اور نواب سعادت علی خاں کا تعمیر کردہ محل ٹریننگ سینٹر تھا ۲ مئی کو مفسد پرداز جماعت نے ہندوستانی سپاہیوں کو بتایا کہ اب ان کو چربیلے کارتوسوں کے استعمال کی ترکیب بتائی جائے گی جن میں سور اور گائے کی چربی ہے سپاہیوں نے کارتوس لینے سے انکار کر دیا۔ انگریز افسران فوج کے نزدیک یہ انکار غدر کے مترادف تھا پھر انہوں نے معاملہ کو دوسرے دن پر ٹال دیا اور ہندوستانی افسروں کو حکم دیا کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر وہ سپاہیوں کو چربیلے کارتوسوں کے استعمال پر آمادہ کریں لیکن سپاہیوں میں جو غم و غصے کی لہر پھیل چکی تھی وہ ہندوستانی افسروں کی خوشامد سے نہیں روکی جا سکتی دوسرے دن جب سپاہی پریڈ پر دوبارہ جمع ہوئے تو پھر انہوں نے کارتوسوں کو چھونے سے انکار کر دیا جب سپاہیوں کو صفیں توڑ کر بارک میں جانے کا حکم ہوا تو سپاہیوں نے اس حکم کے ماننے سے بھی انکار کر دیا اور پریڈ گراؤنڈ میں تین ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کے اگلے دن کے بارے میں مشورہ کرنے لگے پورا دن اس طرح گذرا شام کو ان باغی سپاہیوں کا خط پکڑا گیا جو انہوں نے لکھنؤ میں انگریزی فوج کنٹونمنٹ منڑیاؤں میں مقیم ہندوستانی سپاہیوں کو لکھا تھا۔ ساتویں رجمنٹ کے سپاہیوں نے دوسرے ہندوستانی سپاہیوں سے امداد کی اپیل کی تھی اور کہا تھا کہ وہ دین اور دھرم کے واسطے انگریزوں کی مخالفت کر رہے ہیں اور ان کو امید ہے کہ دوسرے ہندوستانی سپاہی بھی اس لڑائی میں ان کی مدد کریں گے۔ خط کے پکڑے جانے کے بعد انگریزوں کو یہ خطرہ ہوا کہ کہیں یہ آگ پھیل نہ جائے انگریزوں کی خوش نصیبی سے ساتویں رجمنٹ کا یہ خط کنٹونمنٹ پہنچ بھی نہ پایا تھا کہ انگریزوں کے ہاتھ آ گیا۔ انگریزی افواج کے کمانڈر اور چیف کمشنر ہنری لارنس کو جب واقعات کا علم ہوا تو وہ فوراً انگریزی توپ خانے کو لے کر موسیٰ باغ کی طرف روانہ ہوئے۔ رات ہو چکی تھی قمری مہینے کی ابتدائی راتیں تھیں اور موسیٰ باغ کا محل چاند کی روشنی میں نہایا کھڑا تھا یہ چاندنی رات انگریزوں کے لئے نعمت ہو گئی۔ انگریز فوج نے ساتویں رجمنٹ کے پریڈ گراؤنڈ کو تین طرف سے گھیر لیا اور ان کے سامنے اور بازوؤں پر توپیں لگا دیں سپاہیوں کو میدان میں حاضر ہونے کا حکم ہوا اور جب سپاہی جمع ہو گئے تو انگریزی توپچی ہاتھوں میں مشعلیں لے کر کھڑے ہو گئے۔ انگریز مورخین کے بیان کے مطابق سر ہنری لارنس باغی سپاہیوں کے سامنے تقریر کرنے کے ارادہ سے آگے بڑھے تھے کہ ایک انگریز توپچی نے توپ کو مہتابی دکھا دی گولہ چلا اور کئی سپاہی زخمی ہو کر میدان میں تڑپنے لگے۔ توپ چلتے ہی ہندوستانی سپاہیوں نے بھاگنا شروع کیا۔ انگریزی فوج کے گھوڑے سوار دستوں نے ان کا تعاقب کیا اور بھاگنے والے سپاہیوں کو گھیر گھیر کر

---

[1] تاریخ اودھ نجم الغنی صفحہ ۴۸ ج ۴   [2] احسن التواریخ صفحہ ۲۶

لانا شروع کیا مارت بھر یہ سلسلہ قائم رہا صبح ہوتے ہی بیشتر تمام باغی سپاہی گرفتار ہو گئے دوسرے دن کورٹ مارشل[1] کی کارروائی شروع ہوئی

موسیٰ باغ کی کوٹھی :- اس عمارت پر عماد السعادت کا ترجمہ یہ ہے۔

کوٹھی دیکھنے کے لائق ہے خوش نصیب جو اس عمارت میں پہونچکر دیوار و در کو دیکھ سکے اس کے دل کا کنول ہرا ہو جائے گا[2]

کسے خانہ نخواست بدین طرز دلفریب   خانہ نکو مرقع مانی است نام سن

مشہور آدمی اس حلقہ کے :- جو مارہیں محلہ سرائے معالی خاں و چوپٹیاں و جھوائی ٹولہ و نوازگنج کے تحت میں حسب ذیل مشہور لوگوں کے نام ہیں۔ نواب غضنفر الدولہ بہادر، نواب نظام الدولہ[3] نواب بڈھن صاحب، نواب منے صاحب، میر محمد جان، سید محمد جعفر، آغا احمد علی خاں[4]، اعن صاحب، حکیم بڑے صاحب[5]، ظفریاب الدولہ بہادر، حکیم میر محمد تقی، میر ارشاد علی صاحب، نواب شمس الدولہ بہادر، نواب امیر الدولہ بہادر، نواب مرزا محمد عباس، قاری محمد علی خاں[6]، قاری اچھے صاحب، آقا امراؤ صاحب، آغا بادی صاحب، آقا علی خاں صاحب، مرزا اکبر الشان عرف مرزا محمد عسکری صاحب، مولوی مرزائی صاحب، مرزا محسن صاحب[7]، نواب مجید الدولہ بہادر، مرزا بیدار بخت[8] بہادر، میر فضل حسین صاحب، سید عسکری صاحب۔

موسیٰ کا پُروا

زیر بحث بستی کا آخری مقام ہے جس کا دولت گنج اور رام گنج سے راستہ ہے اور اس وقت ایک دیہات کی حیثیت ہے۔ الیکٹرک لائٹ اور پانی کا پمپ مصاحب گنج کے بعد ختم ہو جاتا ہے یہاں کے آثار قدیمہ میں کپتان فتح علی کا مقبرہ وغیرہ ہے یہ وہی شخص ہیں جو خزانے کے مالک تھے اور جن کا چوک میں کنواں موجود ہے ان کی وطن سے وفاداری تاریخ اودھ میں آب زر سے لکھنے کے لائق ہے۔ غیر ملکی حکومت اور انگریزوں کو خزانہ اودھ نہ بتانا تھا نہ بتایا توپ کے منہ پر باندھ دیئے گئے مگر بات پر جمے رہے ان کی اولاد اور خاندان کا اس طرح حال معلوم ہو سکتا ہے۔

---

[1] نیا دور لکھنؤ بابت اگست ۱۹۵۶ء   [2] عماد ص۲۳

[3] خاندان شاہی کے چند افراد سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ نظام الدولہ آغا میر کے فرزند نہیں تھے جو کانپور گوال ٹولی میں ہجرت کے بعد سے رہتے تھے ایک دوسرے بزرگ تھے جن کا نام اکبر علی خاں تھا۔

[4] جن کا چپ تعزیہ آج تک اٹھتا ہے معالیخاں کی سرائے میں رہتے تھے اور چپ تعزیہ پہلے یہیں سے اٹھا [5] حکیم بڑے صاحب ایک مرد پیر و بزرگ وضع باکمال تھے ان کے بیٹے کا نام عابد علی خاں عرف بڈھن صاحب تھے، ۹ محرم ۲ بجے دن کو سوداگرے امام باڑہ میں مجلس کرتے تھے شہر کے تمام امراء و رؤسا یکجا ہوتے تھے [6] جن کا جواب نہ تھا اپنے زمانے کے باکمال ذاکر [7] مرزا محسن صاحب حدیث خواں جن کا ذکر مفتی گنج کے اکابر کی فہرست میں آپ ملاحظہ کر چکے [8] نواز گنج کے وہ متمول شخص جو حسین آباد مبارک کے ٹرسٹی اور مشہور رئیس تھے۔

اقبال الدولہ — ظفرالملک — میر فتح علی

ظفرالملک

مجید الدولہ میر عابد علی خاں ہیبت جنگ

کنز الدولہ میر رمضان علی خاں المتوفی ۱۹۰۳ء — میر محمود علی خاں مفتاح الدولہ

مخزن الدولہ کو میں نے دیکھا تھا سرخ و سفید رنگ
نورانی صورت بڑھاپے میں بھی خوبرو اور حسین
بڑی بڑی مونچھیں۔

میر محمود علی خاں مفتاح الدولہ
مخزن الدولہ
سلیمان مرزا

اوسط قد کچہری میں قیام تھا اور لوگ کہتے تھے کہ وہ اب بھی کلکتہ جاکر خزانہ اودھ کے جواہر فروخت کرتے ہیں اور یہی ذریعہ معاش تھا۔

کپتان کا مقبرہ :۔ اول الذکر کا مدفن ایک خوبصورت عمارت کی صورت میں اب تک موجود ہے نقشہ عمارت خوشنما اور گول حجرے کی صورت میں ہے پھاٹک پر دو پایہ باقی ہیں جن پر روغنی مٹی کی گمزیاں بقدر دیگچی نظر آتی ہیں جن کا رنگ اس قدر شوخ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آج کسگرنے تیار کی ہیں عمارت دو منزلہ ہے اور دور میں چھوٹے چھوٹے خوبصورت دروازے برابر برابر بنے ہیں دیوار احاطہ بھی مدور ہے جو مقبرے کی علام گردش کہی جا سکتی ہے حصہ زیریں میں قبر ہے جس پر نہ پتھر ہے نہ کوئی نشان باقی ہے پہلی اور دوسری منزل میں مسلسل دروازوں کے سر دو بالائی حصہ میں نہ کوئی گنبد ہے نہ برجیاں بلکہ آہنی سلاخیں سرتاسر چلی گئی ہیں جو دو فٹ سے زیادہ نہیں ہیں اور ناگ پھنی کی نقل یا تصویر ہے۔

مسجد کپتان :۔ مقبرے سے ملی ہوئی بلندی پر ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کا زینہ طے کرکے صحن مسجد سے مقبرے کی دو منزلہ چھت ملحق ہوتی ہے مسجد کے گنبد بڑے خوش وضع اور خوبصورت ہیں اس مسجد کے نمونے پر لکھنؤ میں کوئی مسجد نہیں ہے۔

کپتان صاحب کے مقبرے کے سامنے ایک دوسرا مقبرہ اسی نمونے پر گول دیواروں کا ہے جس کی چھت اب باقی نہیں ہے مگر گوشۂ عمارت میں قبر کا نمایاں نشان موجود ہے مگر جس کا مقبرہ تھا یہ اس کا نشان قبر معلوم نہیں ہوتا قبر کے سامنے کنواں ہے۔

امامباڑہ معشوق محل :۔ نواب معشوق محل آخری سلطان اودھ کی بیگم تھیں جن کا خطاب تھا ملکہ ملک تاج النساء بیگم دو ہزار روپے ماہوار تنخواہ تھی اور قیصر پسند عمارت بنا کردہ روشن الدولہ کی مرمت کراکے رہنے کے لئے دی تھی موصوفہ نے موہنی کے پردہ میں امامباڑہ بنوایا مگر اب وہ منہدم ہو کر بے نشان ہے لیکن بقول تصدق حسین ایک شاندار مسجد ان کی یادگار میں بمقام مذکور خستہ[۱] حالت میں اب تک موجود ہے۔

معشوق محل کے داروغہ کا نام محمد مہدی[۲] تھا جو بنوٹ کے استاد تھے بنوٹ کے ماہروں کا ادنیٰ کرشمہ کمال یہ ہے کہ جنگلی کبوتر کو چوکی کے نیچے چھوڑ دو اور وہ نیچے سے باہر آنے نہ پائے۔

گئوگھاٹ

دریائے گومتی کے کنارے جو بستی شروع ہوتی ہے اس میں گئوگھاٹ کو پہلا درجہ حاصل ہے فقیروں کی قیامگاہ بھی دریا کا

۱؎ بیگمات اودھ   ۲؎ قدیم ہنرمندان لکھنؤ

کنارہ ہوتا تھا اور دیہاتی اہیر، پاسی، چمار، ٹھاکر، برہمن بھی پانی کی نزدیکی ڈھونڈنے ہی سے پتہ چلتا ہے کہ اس گھاٹ سے مویشی کثرت سے پانی پیتے تھے اور مویشیوں کی زیادتی ان کے مالک اور پالنے والوں کی تعداد پر روشنی ڈالتی ہے آج یہ مقام جنگل ہو مگر کسی وقت میں یہ خطہ گلزار اور عہد شاہی کے آثار کا مظہر تھا۔

ہم نے ابھی نوابی اور شاہی کی مخصوص عمارتوں پر روشنی ڈالنا شروع نہیں کی ہے وہ آخری باب کا قلمی کارنامہ ہوگا۔ لیکن جغرافیائی نقطۂ نظر سے موسیٰ کے بروا تک پہونچنے کے بعد گئو گھاٹ کی باری ہے اور یہ بستی بھی کسی صاحب کرامت پیر کے قدم رنجہ ہونے سے آباد ہوئی اور جو مزار اس مقام پر ہے وہ شاہ عبدالجلیل کا کہا جاتا ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ پیر جلیل اور یہ ایک شخص ہیں یہ چلہ کشی کا مقام تھا اور گولہ گنج میں مزار ہے یا اس کا عکس ہے۔

گئو گھاٹ کی تاریخی خصوصیت یہ ہے کہ سعادت علی خاں برہان الملک اپنے زمانہ صوبہ داری میں لکھنؤ اسی راستے سے آئے۔ اور یہ راہ عام نہ تھی تاریخ میں ان کی دلیری اور آمد کا ذکر ہے اور سیاست میں کمال ثابت ہوتا ہے کہ وہ شیخوں کے مقابلے میں صرف اسی راستے سے داخل ہونے میں کامیاب ہوئے۔

شیخ امام بخش ناسخ کے والدین کی قبریں بھی گئو گھاٹ کے قبرستان میں ہیں اور قمر الدولہ اور ان کے پیر مرشد حافظ شاہ سلیمان بھی اسی زمین پر دفن ہیں۔

جب فریدوں قدر جرنیل کی شادی علی نقی خاں کی بیٹی سے ہوئی اور ۲۲ ذی الحجہ کو ساچق اور ۲۳ کو برات کی تاریخ تھی تو گئو گھاٹ میں جو شاہی باغ تھا اس کے دروازے سے براتی واپس ہوئے اور مرزا ولی عہد اور بادشاہ نوشاہ کے ساتھ باغ میں تشریف لے گئے اور شام کو چھتر منزل واپس آئے اس موقع پر روشنی کا انتظام شرف الدولہ کے ہاتھ[1] میں تھا۔

۱۲۹۶ھ تک نواب محسن الدولہ کی کوٹھی اپنی شان و شوکت کے ساتھ آباد[2] تھی اور اس سال لکھنؤ پانی نہ برسنے کے سلسلے میں جب نماز طلب باراں ہوئی تو یہ جگہ دعا کے لئے قرار پائی۔

واجد علی شاہ بہادر کی کئی کوٹھیاں یہاں تھیں جواب باقی نہیں ہیں۔

کلاں کوٹھی:- اس عمارت میں سلطانی پریس تھا جس کے مطبوعات کی نظیر آج تک کوئی مطبع پیش نہیں کرسکا خوبصورتی، صحت، حسن خط، بیل بوٹے جو کلاں کوٹھی کے مطبوعات میں نظر آتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں ۱۲۶۶ھ و ۱۲۷۰ھ کے ایڈیشن[3] میرے کتب خانے میں موجود ہیں ان کے دلفریب اور نظرافروز ہونے کو سب تسلیم کرتے ہیں پریس کا نام سلطان المطابع تھا۔ یہ پریس کپتان مقبول الدولہ مرزا محمد مہدی علی خاں بہادر قبول کے زیر اہتمام تھا حاجی ابو محمد ابن حاجی ملا محمد ابراہیم سبزواری بہترین نسخ و نستعلیق لکھنے والے کاتب اور مصور تھے ان کے ہاتھ کی لوح بڑی نمایاں ہوتی تھی احمد اور اولاد علی اور امام الدین پریس مین تھے منیجر[4] داروغہ مددعلی تھے پروف ریڈر قائم علی تھے ٹریڈ مارک پر تاج و چھتر تھا۔ اس مطبع میں حاجی ولی محمد[5] اور علوی[6] بخش اور شیخ نثار علی[7] کے مطبوعات بھی چھپتے تھے۔ اس پریس کے

---

[1] تاریخ اودھ نجم الغنی ج ۵ ص ۹۹ [2] تاریخ عباس باب ۲ ص ۲۹ [3] لسان الواعظین حاشیہ عبدالنبی بر تہذیب رسالہ رجعت مجلسی کلاں کوٹھی کا لٹریچر ہے [4] دعاؤں کی فارسی کتاب سفینۃ النجات پہلے ایڈیشن میں اکہرا جدول اور دوسرے ایڈیشن میں تہرے خطوط ہیں اور ۱۲۶۶ھ کا شاہکار ہے ہر دو نسخ میں جوشن کبیر کی فصلوں کے بارے میں مددعلی نے لکھا ہے کہ اینچہ بر حاشی مقابل ہر فصل مرقوم است ۔۔۔ در کتب معتبرہ بنظر نرسید [5] لسان الواعظین۔
[6] رسالہ رجعت مجلسی طبع اول [7] جنات الخلود ۔۔۔

آخری چھاپنے والے کربلائی[۵۸] استاد لحیم و شحیم پالکی پر بیٹھ کر جاتے تھے۔ مالک رحمانی پریس کے والد منشی قادر بخش[۵۹] نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مطبع امینی کے مہتمم محمد عباس نے بھی اپنے مطبوعات اس پریس میں چھپوائے۔ کلاں کوٹھی کی عمارت کا کچھ حصہ اب تک موجود تھا وہاں کُہن کُہن جی (مہاجن گول دروازہ) نے ایک عالیشان کوٹھی بنوائی ہے کلاں کوٹھی کے سامنے جو میدان ہے وہاں زمانہ بغاوت میں انگریزوں نے تختہ دار لگا رکھا تھا اور انگریز گولہ اندازوں کی قواعد بھی ہوتی تھی صبح سے دوپہر تک نئی بھرتی ہونے والوں کو تعلیم جنگ دی جاتی تھی پھر مہتاب باغ میں قواعد ہونے لگی (نیا دور اگست ۱۹۵۹ء ص۲۱)

حکایت :- ایک مرتبہ مولوی سجاد حسین صاحب نے شیخ عابد علی سے کہا کہ آج کل دریا طغیانی پر ہے دل چاہتا ہے کہ سیر کریں شیخ نے کہا گوگھاٹ چلئے چنانچہ مولوی صاحب گوگھاٹ آئے شیخ عابد علی نے چار گھڑوں کی ایک نئی گھرنئی بنائی اور ایک گھڑے کے پیندے پر مولوی صاحب کو بٹھایا اور دوسرے پر خورشید حسین کو اور تیسرے پر ابوالحسن کو (مذکورہ تینوں شخص شناوری سے ناواقف ہیں) اور چوتھے پر اپنے بیٹے شیخ اسمٰعیل کو اور خود گھرنئی کو کھینچتے ہوئے چلے کر توڑے گھاٹ پر دفعتاً گھرنئی غرقاب سے بیٹھ گئی اور چاروں آدمی آپس میں غٹ پٹ ہو گئے۔ عابد علی نے ایک ہاتھ سے مولوی صاحب کو اور دوسرے سے خورشید حسین کو سنبھالا اور ٹانگ سے ابوالحسن کو ابھارا اور ایک ٹانگ سے پیرتے ہوئے کنارے پر آگئے شیخ محمد اسمٰعیل پیرنا جانتے تھے اس لئے خود باہر نکل آئے (قدیم ہنر ص۱۳۶)

مولانا مرزا ہادی صاحب صالح مفتی گنج کے صاحب کمال قبلہ و کعبہ کے شاگرد تھے اور ان کا گھرانہ اولاد غفران مآب کا دیرینہ عقیدت کیش تھا جناب نے علم ہیئت کی ایک اعلیٰ کتاب پڑھنے کے لئے طالب علم بھیجا اور مرزا صاحب نے وہ وقت مقرر کیا جو گوگھاٹ پر شاگردوں کو شناوری کی تعلیم دینے کے لئے تھا۔

موصوف جب دریا میں اتر چکتے اس وقت طالب علم مذکور کو حکم ہوا کہ عبارت پڑھو بغیر مطالعہ استاد نے مطالب بیان کرنا شروع کئے علمی لحاظ سے تو تشفی ہوئی مگر یہ روبہ پسند نہ تھا چند دن کے بعد قبلہ و کعبہ کو پڑھانے کے اس انداز سے اطلاع کی اور آپ نے جب مرزا صاحب سے طریق تدریس پر بات کی تو موصوف نے جواباً کہا کہ میں عالم متبحر بنا دینا چاہتا ہوں۔

بخشی کا تال

راجہ لال جی بخشی حکومت اودھ کے مشہور اور دل چالاک خدمت خلق کا جذبہ رکھنے والے آدمی تھے مفاد خلق کے لئے تالاب بنوایا عوام کی زبانوں پر اس کی بنیاد کا واقعہ یہ ہے کہ نواب نے ہاتھی خریدنے بھیجا تھا یہ ایسے گئے کہ گدھے کے سر سے سینگ بعد مدت پلٹے۔ کہیں دور نہ تھے لکھنؤ سے ۸ میل کے فاصلے پر تالاب بنوا رہے تھے جب سرکار میں باریاب ہوئے بے ساختہ کہا ہاتھی لے آیا ہوں حضور چل کر خود دیکھیں نواب نے جا کر دیکھا تو تالاب بنا ہوا مرحبا کہا اور غیر حاضری معاف ہو کر مزید انعام و اکرام لے کر سرفراز ہوئے۔ ان کے بیٹے راجہ الفت رائے ان سے بھی علم دوست، غریب پرور اور ادب نواز تھے ان کا مخمس ہفت بند کاشی فارسی میں ۸۰ صفحہ پر نولکشور نے چھاپا تھا۔ آغا میر کی ڈیوڑھی سٹی اسٹیشن سے جو چلو ڈالی گنج اسٹیشن پہونچو گے اس کے بعد محب اللہ پور آئے گا۔ یہاں سے گذر کر بخشی کا تال اسٹیشن ہے بہترین نقشہ اور اعلیٰ ترین انجینئری کا نمونہ ہے۔ راجہ ٹکیت رائے کا تالاب، حسین آباد کا شاہی تالاب۔ رائے بریلی میں ریوتی رام کا تالاب اس سے بہت پست قسم کی تعمیر ہے۔ بڑی لمبی چوڑی زمین ہے جو کئی حصوں میں تقسیم ہوتی ہے زنانہ اور

---

۵۸ نام نہیں معلوم اس لفظ سے مشہور تھے　　۵۹ اصح المطابع کے مالک۔

مردانہ گھاٹ، مویشیوں کے پانی پینے کی جگہ علیحدہ ہے لکھوری اینٹیں اور پتھر کثرت سے لگائے گئے ہیں اور بلند برجیاں ہیں جو ریل سے گذرنے والے مسافروں کو نظر آتی ہیں۔ برجیوں کی چھت میں رنگین پھول بوٹے اور دیدہ زیب بیلیں بھی ہیں ۲۵ جنوری ۱۹۵۹ء کو میں نے دوبارا یہ تالاب دیکھا بارہ زینے چھوڑ کر پانی تھا نیز بہت گہری اور اندرونی عمارت تہ خانہ کی صورت میں زیادہ پختہ اور خوشنما ہے جو پانی کے گھٹنے یا بڑھنے پر چھپتی اور دکھائی دیتی ہے۔ سات کنویں آب رسانی کے منبع کی صورت میں اندر ہیں۔ نہانے والے روشندانوں سے پورے تالاب کا معائنہ کرتے ہیں غرض نے اس طرح ہیں کہ عورتیں سارے تالاب کی سیر کریں اور عورتوں کو کوئی نہ دیکھ سکے۔ دو مندر اتر اور پچھم کی طرف گھاٹ کے سامنے ہیں ایک عام ہے اور دوسرا بخشی جی کی محلسرا کا پرائیویٹ ہے چاروں طرف راستے ہیں۔ اور ایک اسکول ہے جس کی دیوار دوہری ہے قدیم آبادی یہاں اس کثرت سے تھی کہ لڑکے اسکول میں پڑھتے تھے تعلیم گاہ کھنڈر کی صورت میں ہے۔ اس کے معلمان تھیر ۱۹۳۲ء تک زندہ تھے گرد و پیش کچھ کھجور کے درخت پیدا ہوئے ہیں جو جدید ہیں یہاں وہ مسجد مجھ کو نہ ملی جس کی بنیاد شاہ اودھ نے اس شرط کے تحت میں قائم کی تھی کہ جس کی نماز صبح تاحیات قضا نہ ہوئی ہو وہ پہلی خشت نصب کرے۔ اس جگہ ہوائی اڈہ بننے والا ہے۔

مرگھٹا

اس جگہ ہمیشہ سے مردے جلائے جاتے ہیں اور بعض بعض عورتیں ستی بھی ہوئی ہیں۔ انگریزوں اور سلاطین اودھ نے اپنے زمانے میں اس قبیح رسم کو روکا بھی ہے مرگھٹے کا راستہ اس وقت پختہ سڑک کی صورت میں ہے۔ لکھنؤ اور گرد و نواح کے نو مسلم اموات نذر آتش ہوتے ہوتے ہیں ظریف کا ایک شعر ملاحظہ ہو

عشق نے ... بت ... کے جلایا نہ ہو
مرگھٹے سے ترے عاشق کی صدا آتی ہے

کربلائے منشی فضل حسین خاں ... گنج لکھنؤ

کربلائے نواب عظمت الدولہ واقع مہدی گنج لکھنؤ

چھٹا باب

بنجاری ٹولہ سے چارباغ تک

جو لوگ گھوم پھر کر مال تجارت فروخت کرتے ہیں ان کو بنجارہ کہتے ہیں کسی کا شعر ہے ؎

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائیگا   جب کوچ کرے گا بنجارہ

تحقیق لفظ میں مشہور اہل قلم خواجہ حسن نظامی نے اپنے ایک مقالہ میں کیا اچھی مدد دی ہے وہ اپنے مخصوص طرز نگارش میں واقعہ کربلا کے ہیرو حضرت امام حسین کی چھوٹی بہن کی قبر کے غیبی نوشتہ میں لکھتے ہیں۔

اس لٹی ہوئی بنجارن کی قبر پر درود وسلام بھیجو جس نے نانا کی امت کی خاطر سب کچھ نثار کر دیا اور ہر دیکھنے والے کو سمجھا دیا کہ حق وصداقت کی پاسداری میں مسلمان عورتیں ایسی ہمت دکھایا کرتی ہیں۔

بنجاری ٹولہ :۔ اسی گروہ کی سکونت کا مقام ہے یہ محلہ[1] عہد اکبر سے آباد تھا اس کے حدود چاہ کنکر اور کٹرہ ابو تراب خاں کے مابین واقع ہیں ناف شہر ہونے سے اس جگہ چھوٹے بڑے مختلف لوگ آباد تھے جن میں

منشی علی حامد خوشنویس :۔ آپ نسخ ونستعلیق کے بہترین لکھنے والے تھے معدنیات اور عقیق پر بھی آپ کے قلم کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں مرصع رقم خطاب تھا منشی نولکشور کی فہرست کتب ۱۹۱۰ء میں آپ کے لکھے ہوئے قرآن شریف کا بلغز اشتہار موجود ہے جنوری ۱۹۲۰ء میں آپ نے بعمر ۷۵ سال رحلت کی اور اماباڑہ غفرانمآب میں سپرد خاک ہوئے۔ شیشے کے پیٹ میں لکھنے کے طریقے بھی آپ کو معلوم تھے اس طرح کہ نہ سطح رول سے خط ظاہر ہو نہ رو بشت بلکہ اندر تحریر پائی جائے۔

بتو ہرکارہ :۔ چٹھی رساں اور پوسٹ مین کو عہد شاہی میں ہرکارہ کہتے تھے ایک جگہ سے دوسری جگہ محکمہ اطلاعات کا کام بھی اسی کے سپرد ہوتا تھا لکھنؤ کے ابتدائی تاریخی حالات میں ہے "گرم اختلاط بودیم کہ ہرکارہ ڈاک ایں خط[2] را آورد" منی آرڈر بھی جس کو اس وقت ہنڈوی کہتے تھے یہی پہونچاتا تھا بنجاری ٹولہ میں بتو ہرکارہ کی مجلس جہاں تک میری یاد کام دیتی ہے، ۸ محرم سہ پہر کو ہوتی تھی یہ شاہ نجف میں اس عہدے پر مامور تھا۔ آتش کے دو شعروں میں ہرکارہ کی لفظ استعمال ہوئی ہے ؎

---

[1] گزشتہ لکھنؤ   [2] رقعات مرزا قتیل ص۵

روز و شب کے حال کا پرچہ لکھتا تھا روز و شب — کاتبِ اعمال مری ڈیوڑھی کا ہرکارہ تھا

کب جواب آئے خطِ شوق کا وہاں سے دیکھوں — روز ہو آتا ہوں ہرکارہ اخبار کے پاس

رقص و سرود :- ایک قدیم روزنامچہ میں ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء کی شب کو بنجاری ٹولہ میں محفل رقص و سرود کا پتہ ملتا ہے جس میں شریک ہونے والے حکیم سید واجد حسین خاں اور حکیم دلدار حسین کے ساتھ شرکت کی۔ لکھا ہے کہ ہرمزی ننھوا اور گوہر طوائف کا مجرا تھا ایک بجے شب کے بعد گوہر کا مجرا شروع ہوا سچ یہ ہے کہ خداوند عالم نے علاوہ حسن و خوبصورتی کے جامع کمالات کیا ہے فارسی، انگریزی، اردو، ہندی چار زبانوں میں گوہر کلکتہ نے اپنی ہی غزلیں گائیں اور چار بجے جلسہ برخاست ہوا۔ ایسے اثر کا گانا میں نے نہیں دیکھا (جنٹلمین ڈائری)

شیخ علی عباس وکیل :- تہذیب لکھنؤ کے آخری دور میں وہ اس محلہ کے مشہور رئیس تھے اور پرانی وضع کے انسان تھے ان کے والد کا نام داروغہ شیخ محمد عباس تھا ان کے یہاں ۸ صفر کو میر انیس پڑھتے تھے (حیات دبیر ص۹۴) مقدمات کی جرح میں ان کا جواب نہ تھا۔ شہر بھر کے پوست کندہ حالات ان کے خبر رساں ان تک پہونچا کر گواہوں کا نتھنوں میں دم کر دیتے تھے پالکی میں کچہری جاتے تھے۔ پندرہ صفر کو ان کی بنا کردہ مجلس امامباڑہ ممتاز العلما میں ہوتی تھی سامعین کا ایک جم غفیر ہوتا تھا اور پورے صحن امامباڑے تک شامیانہ ہوتا تھا۔ اس مجلس کی اطلاع میں پہلے سے اہل شہر کے گھروں پر کھیر کی بڑی قلفیاں تقسیم ہوتی تھیں اور شیخ صاحب کے دوستوں کو اکبرپور صفی پور وغیرہ تک یہ شیرینی اس اہتمام سے پہونچائی جاتی تھی کہ باسی ہونے سے پہلے تقسیم ہو جائے بیرون لکھنؤ کے روزنامچہ جات[ٹ] میں اس کا ذکر ہے نثر کار مجلس میں چودھری وزیر محمد صاحب مرحوم رئیس اکبرپور اپنی نمایاں شان و شوکت اور زیر منبر کھڑے ہو کر برمحل داد دینے میں تمام سامعین سے ممتاز تھے شیخ صاحب کی

کوٹھی :- جدید عمارت ہے اس کو آثار قدیمہ سے تعلق نہیں ہے صرف اس لئے اس مقام پر اس کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خطیب اعظم مولانا سبط حسن صاحب نے اس جگہ اردو ادب اور واقعۂ کربلا پر وہ سحر بیانی کی جو یادگار ہے مولانائے ممدوح کی کوٹھی اور مکانات بھی آگے بڑھ کر ہیں جو قبل از وقت اپنے معز مکین کے غم میں منہدم ہو رہے ہیں۔

مرزا علی نقی داستان گو :- آپ بنجاری ٹولہ میں رہتے تھے اور شہر کے آخری داستان گو تھے ان کے بعد زبانی قصہ کہنے والا کوئی نہ رہا آدمی قابل تھے ذاکری بھی کرتے تھے۔

الطاف حسن خاں کمبوہ :- اس محلہ میں خان بہادر شیخ الطاف حسن خاں کمبوہ کا مکان تھا جن کے یہاں ۸ صفر کو مرزا دبیر صاحب پڑھا کرتے تھے لفظ کمبوہ کی تحقیق میں لوگوں نے مختلف معنی بتائے ہیں مولوی سید اختر علی صاحب نقوی امروہوی مرحوم نے اپنے والد کی زبانی ظاہر کیا ہے کہ ایران سے جو لوگ انبوہ کی صورت میں روانہ ہوئے ان کو کثرت استعمال نے کمبوہ کر دیا۔ شیخ صاحب کی بیٹی مشہور ادیب اور بیرسٹر حامد علی خاں امروہوی کو منسوب ہوئیں اور ان کے بیٹے اشفاق حسن خاں مرحوم میرے احباب میں تھے۔

کٹرہ ابوتراب خاں

تاریخ میں دو شخص اس نام (کنیت) کے پائے جاتے ہیں پہلے سعادت خاں برہان الملک کے افسران فوج میں ایک سردار تھے

ٹ جنٹلمین ڈائری

جن کے ہمعصر میر خدا یار خاں، سید حسین خاں، آغا باقر میمونی اور میر جہانگیر خاں تھے۔ دوسرے ابو تراب خاں عہد فردوس منزل محمد علی شاہ میں تھے جنہوں نے عظیم اللہ خاں کی سفارش سے چھوٹے تحسین کی ضبط شدہ جائداد۔ یعنی[1] حتی بزار حاصل کی اول الذکر کے نام میں "تورانی" نسبت بھی ہے۔ واقعات سے اس بات کو قوت پہونچتی ہے کہ مرقومہ بالا محلہ کے بانی وہی ابو تراب خاں ہیں جو عہد اول میں برسراقتدار ہوئے اور جس طرح لکھنؤ کے بعض محلہ عہد اکبری میں آباد ہو چکے تھے اسی طرح اس بستی کی بنیاد عہد برہان الملک میں قرار دی جائے۔

عبدالحلیم شررؔ نے بتایا ہے کہ کنکوا کی موجودہ صورت آغا ابو تراب[2] خاں کی ایجاد ہے اور سب سے پہلے کنکوا انہوں نے بڑھایا ابو تراب خاں روہیلوں کی لڑائی میں قتل ہوئے اور وہ بڑے وجیہ تنومند قدآور انسان[3] سبز کپڑے پہنے ہوئے لڑ رہے تھے بھگوت سنگھ کو ان پر برہان الملک کا دھوکا ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر سینے پر برچھا مارا جو چھاتی کے پار ہو گیا۔ اور ابو تراب خاں ہلاک ہو گئے۔ دوسرے ذرائع تحقیق[4] سے واضح ہوتا ہے کہ شہر کے واقعہ نگاروں نے ان کو صوفیائے کرام اور اولیاء اللہ کی فہرست میں ابو تراب لکھنوی کی لفظ سے یاد کیا ہے اور ۲۸ رجب کو ان کا عرس ہوتا ہے۔

سبز پوش کو دوسرے اہل قلم کا سید کہنا کچھ تعجب بھی نہیں ہے یہ محلہ بیگم گنج کے نالا اور کٹرہ جہانگیر کے بیچ میں ہے اور یہاں بھی شہر کی آبادی اعلیٰ طبقے پر مشتمل تھی صاحبان ثروت، علماء، فضلاء، اطباء رہتے تھے جن کی اونچی اونچی محلسرائیں وسیع صحن، کشادہ مکانات کچھ تو اب تک موجود ہیں۔ دیوان خانہ یا انگنائی میں حوض کا ہونا اور بیت الخلاء میں اونچے اونچے قدمچے رہنے والوں کے نفاست مزاج اور غلو طہارت کی نشانی ہیں اور کتنی عمارتیں اور عالیشان قصر کھد کر زمین ہو گئے جن سے محلہ کی اگلی حالت کا پتہ چلتا ہے یہاں کے مشہور لوگوں میں

<u>نواب تفضل حسین خاں</u>:۔ نائب الریاسہ تھے علامہ لقب تھا نواب حسن رضا خاں کی سبکدوشی پر شوال ۱۲۱۱ھ میں منصب ملا اور نو مہینے کی وابستگی دامن دولت میں نو لاکھ روپیہ نقد علاوہ جاگیر اور دیگر ساز و سامان کے بارگاہ آصفی سے حاصل کئے جب نواب وزیر علی خاں کو تحسین علی خاں ناظر پر بے اعتمادی کا شبہ ہوا اور بعض شریر مصاحبین کے بھڑکانے سے دشمن آگ ہوئے اور ان کی گرفتاری کا حکم دیا اور غصے میں کہا کہ آج اس نافرمان کی ناک اڑا دوں گا اس وقت تحسین علی خاں اپنی آبرو بچانے کے لئے جلتی دوپہر میں کٹرہ ابو تراب خاں پہونچے اور علامہ کے پیروں پر گر پڑے موصوف نے ان کو بارہ دری کے بالاخانے پر بھیجکر میر مظہر کمیدان اور دوسرے لوگوں کو حفاظت کے لئے مقرر کر دیا۔ وزیر علی خاں نے جب یہ خبر سنی تو غصے میں بھرے ہوئے ہاتھی کے ہاتھے پر بیٹھ کر سیدھے نائب کے گھر پہونچے اور فرمایا کہ اس نمک حرام کو حاضر کرو انہوں نے عرض کیا آپ کے سر کی قسم تحسین علی خاں یہاں نہیں ہے۔ ہرکارہ کی خبر رسانی پر نواب نے خود سراغ لگانا چاہا۔ علامہ نے ہرکارہ سے بھی سخت گفتگو کی اور کہا کہ حضور کو غلام کی قسم کا اعتبار نہیں اور اس پاجی کے کہنے کا یقین ہے۔ نواب واپس گئے اور علامہ نے نماز مغرب کے بعد پردہ دار چوپہلے میں میاں تحسین کو سوار کر کے اسسٹنٹ رزیڈنٹ آرصاحب اور ان کے محرر محمد اسحاق خاں کے ہمراہ مسٹر میڈنٹ رزیڈنٹ کے پاس بھیج دیا اور صاحب نے حالات معلوم کر کے مرزا نملیل کے بنگلہ میں ان کو حفاظت کے ساتھ ٹھہرا دیا۔

---

[1] ذات یقین [2] گزشتہ لکھنؤ صا۱ [3] تاریخ اودھ نجم الغنی [4] دنیات الاخیار

علامہ کی بارہ دری کھنڈر اور ٹیلے کی صورت میں برسوں پڑی رہی اس بارہ دری میں تخت طلائی تھا جس کے چاروں طرف پوستہ کے خوشنما درخت تھے اور چوبی حصہ پر چاندی منڈھی ہوئی تھی بیچ میں بیٹھنے کی جگہ تھی اور یہ لکھنؤ کا تخت طاؤس تھا۔

بہت دن تک زمین ویران رہنے کے بعد اب یہاں پارک بنا ہے اور دور رفتہ کو یاد دلا رہا ہے علامہ کے باورچی خانہ کا صرف کئی سو روپیہ روز کا تھا اور کتنے آدمی دو وقتہ ان کے دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے۔

فراشخانہ :۔ بارہ دری کے سامنے فراشخانہ تھا جس کی زمین شیخ مصطفےٰ احمد تحصیلدار نے خرید کر مصطفےٰ منزل تعمیر کی فراشخانہ میں دریاں چاندنیاں، قالین، سوزنی مسند گاؤ تکیہ، جازم اور کیا کچھ نہ تھا غلام علی مورخ اودھ نے خان علامہ کی وفات ۱۲۱۲ھ کلکتہ اور مرشد آباد کے درمیان[۱] تحریر کی ہے۔

داروغہ عاشق علی :۔ سنت و جماعت تھے شیعہ سلاطین کے دلوں میں گھر پیدا کرنے کے لئے عیش باغ میں کربلا بنوائی اور ملکہ جہاں کے ہاتھ فروخت کردی محرم میں اپنے گھر میں بھی تعزیہ رکھتے تھے اور مجلسیں کرتے تھے شرف الدولہ کے زمانہ وزارت میں آپ سے اور منصف الدولہ شریف الملک سے ایک باغیچے کے بارے میں اختلاف ہوگیا اور عدالتی چارہ جوئی کی نوبت بھی آئی شرف الدولہ نے سمجھا بجھا کر کئی برسوں کی پیشیوں کے بعد صلحنامہ کرادیا[۲] موصوف نے ۱۲۶۹ھ میں انتقال کیا اور کٹرہ ابو تراب خاں کی ہر داتیں دفن ہوئے ان کی یادگار ایک عالیشان مسجد کٹرہ میں اچھی حالت میں موجود ہے اور اولاد بھی محلہ کے قدیم باشندوں میں ہے۔

حکومت برجیس قدر میں داروغہ صاحب کو نظربندی کی مصیبت کا سامنا ہوا تھا سنی شیعہ فرقہ وارانہ فسادات میں بھی داروغہ عاشق علی کا ذکر آتا ہے قمر الدولہ ان کے سگے بھائی تھے اور کیننگ اسٹریٹ پر رہتے تھے۔

امامباڑہ تجمل حسین خاں :۔ محلہ کا یہ ایک قدیم امامباڑہ ہے جس میں عمارتی لحاظ سے کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں تجمل حسین خاں بانی امامباڑہ تفضل حسین خاں کے چشم و چراغ تھے حکومت کی طرف سے سفارت اور دیگر عہدوں پر برقرار رہے اور دو بیٹے احمد حسن خاں اور حیدر حسین خاں چھوڑ کر انتقال کیا۔ ان کی جائداد میں ۲۷[۳] مکانات اور چھ لاکھ روپیہ ورثہ کو ملا بانی امامباڑہ اعلیٰ درجے کے خوشنویس تھے یہ امامباڑہ انھیں کی یادگار ہے امامباڑہ میں اتر دکھن دو دالان اوسط درجے کے اور انگنائی ہے اور پورب کی طرف جو درجے ہیں وہاں بانی امامباڑہ کی قبر ہے جس پر حسب ذیل عبارت کندہ ہے " مرقد منور جدم نواب تجمل حسین خاں فردوس مکین ۲۳ ماہ ربیع الاول ۱۲۳۵ھ وفات یافت - محمد ارتضیٰ حسین خاں نبیرہ"

مجلسیں اس حصہ میں بھی ہوتی ہیں اور کچھ اور قبریں بھی دالانوں میں ہیں امامباڑہ کا منبر قابل ذکر ہے۔ جس کے بارے میں شیخ تصدق حسین لکھتے ہیں ۔ منبر ایک نادر اور عجوبہ روزگار چیز ہے جس میں جالی دار لکڑی کی تختیاں جڑی ہیں اور سنگ تاج محل آگرہ کی ہو بہو نقل بنائی ہے دولت بھی نہ رہی مکانات گرے مگر امامباڑہ ہنوز باقی ہے۔

بی مصری :۔ بی مصری جن کا مصاحب گنج کے عنوان میں ذکر آچکا ہے اسی محلہ میں رہتی تھیں ان کی دو لڑکیاں بی مریم اور بی مصاحبہ تھیں جو عنایت علی اور رجب علی کو منسوب ہوئیں میر عنایت علی کے بیٹے سجاد حسن تھے جن کے بیٹے میر محمد تقی ۱۹۲۶ء تک زندہ تھے

مسجد حکیم بندہ مہدی :۔ مسجد عمارتی لحاظ سے معمولی تعمیر ہے اور کسی قدر بلندی پر واقع ہے دو طرف گلیاں اور لوگ راہ چلتے ہیں شیعہ

---

[۱] عمدۃ السعادت ص۱۸۱ [۲] ارشاد یہ چودھویں رات کا چاند [۳] تاریخ اودھ ج ۵ ص ۳۵

آبادی ہونے سے ہمیشہ چہل پہل رہتی ہے اور تاریخ سے ثابت ہے کہ اس مسجد میں ایک معرکہ آرا علمی مباحثہ مولوی کمال الدین بن حکیم نظام الدین صاحب موہانی اور مفتی سید محمد عباس صاحب شوستری کے مابین ہوا کسی مسئلے میں اختلاف ہوگیا تھا دونوں بحر مواج تھے روانی طبع نہ رکتی تھی آخرالامر حضرت سید العلماء نے (جن کے دونوں شاگرد تھے) مصالحت کرادی۔ فاضل تو گانوی نے لکھا ہے کہ یہ بزرگ کسی بات میں مفتی صاحب[1] سے کم نہ تھے البتہ ان کے تصانیف ملک میں شائع نہیں ہوئے تھے۔

علی جان خاں:۔ آپ کا امام باڑہ کٹرہ ابو تراب خاں میں موجود ہے پرانی وضع کے آخری نواب اور علی نقی خاں کے ہمعصر تھے ہمیشہ جامدانی کا کرتہ اور انگرکھا پہنتے تھے بڑے خوش خوراک اور دسترخوان کے آداب جاننے والوں میں تھے چائے میں نمک کی ایجاد انہیں کا طرۂ امتیاز تھا اور "جزو اعظم" کی لفظ سے نمک کو دریافت کرتے تھے ان کے دسترخوان پر کھانا کھاتے وقت ہر پلیٹ سرپوش سے ڈھکی رہتی تھی اور جس قاب یا کاسہ سے جو کھانا نکالا گیا پھر اس کو سرپوش کے نیچے رکھ دیا۔

عبداللہ عطر ساز:۔ اس محلہ میں عبداللہ عطر ساز رہتے تھے جن کی دکان سید حسین خاں کے کٹرہ میں پھاٹک کے سامنے تھی عطر سازی میں اس کی مثال نہ تھی۔

مولوی سید جواد اخباری:۔ کٹرہ ابو تراب کے رہنے والوں میں آپ ایرانی نسل میر صفدر قمی کے چشم و چراغ تھے دراز قامت، شیریں گفتار، مقفیٰ و مسجع، گفتگو میں بڑے زبان آور، عمر بھر شادی نہیں کی خان بہادر حکیم نظر حسن خاں کے مکان میں رہتے تھے اور حسین آباد ہائی اسکول میں پرشین ٹیچر تھے بے شمار انگریزی داں ان کے شاگردوں میں ہیں ان کے نتائج افکار میں "نغمۂ ہزار" ایک مجموعہ قصائد ۱۳۴۲ھ میں چھپا ہے نعتیہ اشعار میں دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

صفا بر تو حسنت بہار گلشن جنت	سواد موئے مشکینت فروغ لیلۃ الاسرا
دو چشمانت دو کوکب بود از نظم رحمت	دو ابرویت دو محراب بود از مسجد قصیٰ

عراق کی زیارت سے فارغ ہو کر خراسان جا رہے تھے سخت ترین موسم گرما میں صعوبت سفر برداشت نہ کرسکے اور گاڑی میں انتقال کیا اور وہیں ۱۹۲۴ء میں سپرد خاک ہوئے۔

مولوی نادر حسین صاحب:۔ بڑے مقدس قبول صورت خوش پوشاک عالمانہ لباس میں رہتے تھے اور بات چیت میں عربی فارسی الفاظ زیادہ استعمال کرتے تھے گھر میں چوری ہوئی تو آپ بولے۔ لیلہ بارحہ میں سارق آیا تھا قفل باب مفتوح ہوگا قریب مایہ کے نقصان ہوا، یعنی چاندنی رات میں چور آیا دروازہ کھلا رہ گیا تھا سو روپیہ کے قریب نقصان ہوا بزاز کی دکان پر گئے۔ فرمایا ایسا کپڑا چاہتا ہوں جو تلالو ظاہری کے ساتھ دبازت باطنی بھی رکھتا ہو مضبوط اور چمکدار کی یہ عربی تھی۔

مکہ کا باغ

اس محلہ کو کٹرہ ابو تراب خاں سے متصل نصیر الدین حیدر بہادر کے مکہ درزی نے آباد کیا کسی وقت باغ تھا اب کچے اور پکے مکانوں کے سوا باغ کا پتہ نہیں ہے مکہ سلطنت میں بارسوخ ٹیلر ماسٹر تھے اور اپنی دیانت سے زیادہ شہرت حاصل کی مکہ کا حال آئندہ اپنے محل پر نذر قرطاس ہوگا بہتر معلوم ہوتا ہے کہ عنوان بالا کی تحت میں اگلے زمانے کی پوشاک پر کچھ بحث ہوتا کہ

---

[1] تذکرہ بے بہا صفحہ ۲۹۹ [2] تذکرہ بے بہا نمبر ۹۰

قدیم پہناوے کے کم از کم نام باقی رہ جائیں اور نیم عریانی کے فیشن قرار پانے سے پہلے پرانے تمدن کی یاد دلوں سے محو نہ ہو۔

ٹوپی کی جگہ :- سلاطین کے سروں پر تاج اہل دربار کے لئے دستار شہزادگان اور مرشد زادوں کے لئے سیاہ مندیل اور گرمی میں بابل لوٹ کی گول ٹوپی خاندان وزارت اور اولاد معتمد الدولہ کے سروں پر خانہ ساز سیاہ گول ٹوپی جو ابھی تک نوابین کاپور کے زیب سر ہے مغلیوں اور فوجیوں کے لئے ماڈہ میں گاجر نما ٹوپی اور بعض نوابوں کے سر پر ناؤ دار پتلی ٹوپی دولہا کے لئے شملہ علما کے سروں پر عمامہ شاعر اور حکیموں کے سر پر پنجگوشیہ ٹوپی جو گرمی میں چکن کی اور جاڑے میں شالی بانکوں کے لئے دوپلی ٹوپی سی جاتی تھی اور ہر قسم کے کاریگر علیحدہ علیحدہ تھے جاڑوں میں دوپلی بیلدار ٹوپی کے کاریگر شہزادے تھے جو پاٹا نالہ پر رہتے تھے یہ تمام ایجادات مکہ اور ان کے شاگردوں کی صناعت ہیں۔

قمیص کے عوض ہیں :- اس وقت کلیوں دار کرتے مقدسین کے کرتوں میں کچھ کلیاں زیادہ اور گریبان میں بٹن کے بجائے ہلالی کنٹھا اور گھنڈی تکمہ جاڑے میں مرزائی، فتوحی، عرقی کرتے کے نیچے یا اوپر حسب عادت پہنتے تھے رؤسا اور امراء کے گھر کا پہناوا ایک کوٹ تھا جس کا نام آصف خوانی تھا اس میں آستین آدھی اور بوتام پہلو میں زیر بغل سے شروع ہوتے تھے۔ تاکمر یہ سلسلہ ختم ہوتا تھا اس کو آصف الدولہ بہادر پہنتے تھے موسم سرما میں واسکوٹ کی جگہ صدری تھی جس کا گلا کھلا ہوا نہ تھا۔

شیروانی کی جگہ :- اچکن، چپکن، انگرکھا پہنا جاتا تھا مسلمانوں کے انگرکھے میں داہنے ہاتھ کی طرف سینہ کھلا ہوا اور ہنود میں بائیں طرف کا۔ اس کا لحاظ درزیوں کے لئے ضروری تھا بعض پرانے فیشن کی اچکنوں میں آستین میں کف لگے ہوئے اور کسی اچکن یا انگرکھے میں روپہلی بیل اور گرد مغزی یا سنجاف کی گوٹ دوہرے سیپ کے بٹن، جاڑوں میں روئی کا دگلا اور نیز سردی میں لبادہ بعض نفاست پسند اونی چھینٹوں میں صرف چھٹانک بھر روئی بھروا کے اچکن بنواتے تھے اور دھنیے (نداف) اس قدر مشاق تھے کہ وہ اس قدر کم مقدار میں روئی آستینوں، مونڈھوں، پشت اور دامن ہر جگہ پہونچاتے تھے علماء عربی اور قبا پہنتے تھے جو چپکن اور شیروانی کی درمیانی وضع تھی اچکن پر سے جاڑوں میں شالی جبہ اور عبا یا دوشالہ، فرد، چادر اور گرمی میں ہندو مسلم شربتی کا دوپٹہ گلے میں ڈالے ہوئے ایک صدری آخری دور میں اچکن پر پہنی جاتی تھی اور اس کا فائدہ یہ تھا کہ اچکن کی بوسیدگی چھپ جائے۔ مدتوں یہ وضع پردہ پوشی کرتی رہی۔ عباس حسن فصاحت اور جاوید کبھی کبھی اس وضع میں دکھائی دیتے تھے وہ اس کو ساتر العیوب کہتے تھے معتمد الدولہ کے خاندان میں ایک کوٹ ساقو نام کا پہنا جاتا تھا جو لمبان میں پنڈلی تک ہوتا تھا جبہ اور لبادہ میں فرق یہ تھا کہ جبہ میں پشت اور دامنوں پر ترنج بنے ہوتے اور لبادہ پھولدار یا سادہ کپڑے کا جبہ کی طرح ہوتا جاڑوں میں شالی رومال اوڑھنا فردی تھا جو چھوٹا ہوا تو اس کو سربند کہا گیا جس سے کان اور گردن سردی میں ہوا سے بچایا اور بڑا ہو تو کمر کے نیچے تک دامنوں سے مل گیا شال میں ایک وضع کا نام چار باغ تھا جس میں برابر سے چار طرح کے ٹکڑے پھول بیل کے بنے ہوتے گرمی میں اس کی بجائے بابل لوٹ کا رومال کاندھے پہ پڑا رہتا تھا۔ ایک کپڑا مثل قبا کے انگالق تھا جو مرزا مچھو بیگ لنوی کے وقت تک ترک ہو چکا تھا میاں بحر کا ایک شعر اس کا پتہ دیتا ہے ؎

طرہ خورشید ہے جس کا وہ ہے تری کہکشاں
بیل ہے جس کے ترے انگالق ہے

انگالق میں پردہ نہیں ہوتا تھا۔

پیجامہ:- نوابی سے شروع شاہی تک مرد ایک ایک کلی کا پیجامہ پہنتے تھے اور یہ عام فیشن تھا بانکے اس کا راز یہ بتلاتے تھے کہ کلی دار پیجامہ پہن کر دشمن کے سامنے سے بھاگ نہیں سکتے تھے اور یہ تمنا ہر مرد کے دل میں ہوتی تھی پرانی تصویروں میں غور کرنے سے کلی دار پیجامہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے بعد چوڑی دار گھٹنہ کا رواج ہوا۔ علما اور مقدس لوگ غرارہ دار پیجامہ پہنتے تھے اور کابلیوں کی شلوار وگز کی ہوتی انھیں کپڑوں کی اور زیادتی کرکے سات پارچہ اور اکیس پارچہ کا خلعت دیا جاتا تھا۔

ہندو و مسلم پہناوے کا فرق:- درزی اور اس کے خدمات پر بحث کے سلسلے میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ قدیم لباس میں انگرکھا ہندو مسلمان دونوں پہنتے تھے فرق یہ تھا کہ مسلمان بائیں طرف سینے کا حصہ کھلا چھوڑتے اور ہندو داہنے طرف۔ خیاط کا یہی فن تھا کہ وہ گاہک کے چلن کا لحاظ کرے اس کا راز حکیم محسن صاحب منطقی نے ایک ملاقات میں بتایا موصوف پاٹہ نالہ کے رہنے والے کوتاہ قامت دراز ریش مذہب تسنن رکھتے تھے درسیات میں مولوی سید محمد سجاد صاحب مناظر کے شاگرد اور طب میں حکیم عبدالولی سے تلمذ تھا موصوف نے انگرکھے میں داہنی طرف کھلا رہنے کا راز یہ بتایا کہ طب یونانی کا معیار علاج بالضد ہے اور ویدک کا بالمثل ہے مسلمان اپنے اصول طب پر قلب کو حرارت سے بچاتے ہیں اور تازہ ہوا پہونچنے کے لئے یہ حصہ کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور ہندو ویدک کے اصول پر قلب کو ہوا سے بچاتے ہیں اور بجائے بائیں طرف داہنی طرف کا سینہ کھلا چھوڑتے ہیں۔ کیسے کیسے صاحبان کمال تھے جو زیر زمین پہونچے اور معالجہ پر انگریزی ادویہ نے زور و طاقت سے تسلط حاصل کیا۔

زنانہ لباس:- عورتوں کی پوشاک بھی آج سے بالکل جداگانہ تھی محرم کرتی، انگیا کا نام اردو شاعری میں بار بار آتا ہے ؎

رات کو عطر کی شیشی یہ نچوڑی اس نے
کہ سحر اٹھ کے وہ بندی نے نچوڑی انگیا

انگیا کے ہر گوشے بلکہ ایک ایک انچ حصہ کے جدا جدا نام ہیں اور شعرا نے طبع آزمائی کے ساتھ شعر کہے ہیں جو بخوف ابتذال درج نہیں کیے جاتے بہار ہند ص۲۵۵ و ص۲۵۶ میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

اسی مقصد کے لئے "جھولی" ایک قسم کی کرتی پہنی جاتی تھی جو کرتے کے نیچے پڑی رہتی تھی اسی کو محرم بھی کہتے تھے آتش ؎

کسی کی محرمِ آبِ رواں کی یاد آئی
حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا

بالوں میں موباف ؎

نہیں یہ بے جہت موباف چوٹی میں تمامی کا
تجھے ابر سیہ سے لے پری بجلی گرانی ہے

اور شلوکہ آستین دار یا آدھی آستین کا عورتیں پہنتی تھیں اور "بانہ کشی" بھی زنانہ لباس میں شمار ہوتی تھی سر کے لئے دوپٹہ، لڑکیوں کے لئے اوڑھنی، دولہن کے لئے مقنع اور بڑے پائچوں کا زیر جامہ جس میں چوڑی گوٹ، پراتہ کی گوٹ، ٹکڑی کی گوٹ، لو دار گوٹ ہوتی۔ ماماؤں اور لونڈیوں کے لئے چوڑی مہری کا پیجامہ جیسے آج مرد پہنتے ہیں۔ مہریوں کے لئے لہنگا پھریا، گھی والیوں کے لئے نیلے رنگ کی چادر، کٹرنوں کے لئے چندری کا دوپٹہ، جاڑے میں دوپٹہ پر سے رضائی یا کامدار دوشالہ یا اونی اور ریشمی چادر پشواز کی مذمت میں رنگین کا یہ شعر ہے ؎

کروں قربان میں پشواز کو جانی کی کرتی پر
دوگانہ مجھ سے اٹھ سکتا نہیں ہے بوجھ دامن کا

اس محلہ میں سید محمد مجتبیٰ عرف میر بڈھن صاحب ولد سید محمد عباس ایک نابینا ذاکر رہتے تھے جو مدیح خوانی میں شہرۂ آفاق

تھے شاید سنہ ۱۳۲۲ھ میں اس دنیا سے سفر عقبیٰ کیا ان کے شاگرد اب بھی لکھنؤ میں موجود ہیں۔

شلوار:۔ مرد و عورت دونوں پہنتے ہیں آتش کہتے ہیں ؎

دیکھئے کس کس کو وہ زریں قبا کرتا ہے قتل　　　　سرخ ایک پیجامہ غضب ہے قہر ہے شلوار سبز

چھلب داروں کا تکیہ

باغ ٹکہ اور راجہ کے بازار میں بلندی پر یہ محلہ آباد ہے اور دونوں طرف نالہ بہنے کی گندگی سے ہمیشہ پست طبقے کے لوگ یہاں رہے اور مرنے پر دفن بھی یہیں ہوئے چھلب دار قوالوں کے اس گروہ کو کہتے ہیں جو احمد کبیر کی گائے ماننے والوں کے یہاں ان کی مراد پوری ہونے پر زمین میں سے کوئلے بھڑکا کر ان میں آگ دیدیتے اور روئی کا بھیگا ہوا دگلا پہن کر گاتے ہوئے انگاروں پر لوٹتے آگ بجھتی جاتی عام مسلمانوں میں یہ رسم جاری تھی احمد کبیر مسلمانوں کے ایک ولی تھے جنھوں نے سنہ ۲۷۵ھ میں شرف وصال حاصل کیا عوام ان کے نام کی گائے ذبح کر کے اپنی عقیدت کا ثبوت دیتے تھے غدر کے بعد کی اصلاحی مثنویوں میں اس رسم کا ذکر ہے ؎

اور احمد کبیر کی کہیں گائے[1]　　　　کرتی ہیں یہ کم عقل و ناقص رائے

اس ڈھونگ کا نام "چھاتدا" تھا کسی پرانے شاعر نے مسلمانوں کی اس کمزوری کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

خاتمہ بغض و حسد کا ہے چھلب داروں پر　　　　کوئی شادی کرے یہ لوٹیں گے انگاروں پر

مفتی گائے کے کباب بھی چھلب دار ہی کھاتے تھے کلام ظریف میں بھی اس کا ذکر ہے ؎

کئے ہیں شمع نے چھاندے وہ دیکھو آگ روشن ہے　　　　چھلب داروں کی صورت کو دتا پروانہ آتا ہے

چھلب داروں کے ہاتھ میں جو ڈھولکی ہوتی اس کی لمبان چوڑان ایک منزل سے کسی طرح بڑی نہیں ہوتی شادی بیاہ کے موقع پر یہ دروازوں پر بجا کر بھی بخشش حاصل کرتے سید دلدار علی صاحب مجتہد العصر والزماں کے عہد آصفی میں لکھنؤ پہونچے اور آغاز تبلیغ دین میں اس قسم کی رسمیں بڑی حد تک موقوف ہوئیں اور آخری کرتب چھلب داروں نے نواب راضیہ بیگم کے زمانے میں دکھایا اب نہ چھلب دار ہیں نہ یہ رسم باقی ہے محلہ موجود ہے۔

صحبتیا باغ

تاریخ میں اس محلہ کا کہیں ذکر نہیں ہے معمار کاریگر یہاں رہتے تھے اور کتنی بسولی لے کر صبح ہوئے نخاس آگئے اور جس کو عمارت کے لئے ضرورت ہوئی وہ مزدور اور بیلدار کے ساتھ ان کو روزانہ مزدوری طے کر کے لے گیا اس محلہ میں حکیم حشمت علی رہتے تھے جس کی بسر اوقات کیمیا پر تھی۔

بیگم گنج

یہ محلہ عہد آصفی میں آباد ہوا بیگم گنج کا نالہ حلقہ ابو تراب خاں میں مشہور ہے اور مہاجنوں کی بستی یہاں سے شروع ہو جاتی ہے ایک راہ بیچی گنج گئی ہے دوسری رستوگی ٹولہ کی طرف۔

---

[1] مثنوی تحفہ جعفری ص۲

مطبع اصغری:- اس محلہ کا قدیمی پریس تھا جو مولوی نور محمد کے زیر اہتمام معیاری مطبوعات پیش کرتا تھا اس چھاپہ خانہ کا دوسرا نام مطبع مسیحائی تھا قمر الدین نقاش عہد امجد علی شاہ کا کاتب تھا جس کے شاہکار پرانی مطبوعات میں نظر آتے ہیں قصہ ہشت چمن کی لوح دیکھنے کے لائق ہے اور اعلیٰ نمونہ ہے قدیم کمالات کا۔

قاضی کا باغ

مسلمانوں کی پرانی بستی ہے مگر تاریخ میں اس محلہ پر کوئی نوٹ مجھ کو دستیاب نہیں ہوا اس محلہ میں منشی شمس الدین نستعلیق کے بہترین خوشنویس رہتے تھے جن کو پبلک سے اعجاز رقم کا خطاب تھا اور بیضاوی دائرے بنانے میں ان کا جواب نہ تھا نقم پر دیں اور پنجہ نگار میں منشی دبی پرشاد کی کتابیں نولکشور پریس میں ان کا شاہکار ہیں۔ ان کی رحلت کا مادہ تاریخ یہ ہے ؎

اعجاز رقم منشی تھے کامل   آہ محمد شمس الدین ۱۹۲۱ء

اس محلہ میں ایک شخص بڑے محمد ہادی رہتے تھے جو کنکوے کے استاد تھے اور ان کی محبوبہ کا پیجامہ عطر کے چراغ جلا کر درزی نے سیا تھا۔

مسجد دیوان ناصر علی:- کٹرہ ابو تراب خاں سے نکل کر یہ مسجد اور ایک چھوٹا امام باڑہ ہے جو عہد شاہی کی یادگار ہے۔ دیوان ناصر علی کجوہ ضلع سارن صوبہ بہار کے رہنے والے تھے ان کی پہلی بیاہتا بیوی سے دو بیٹے تھے۔

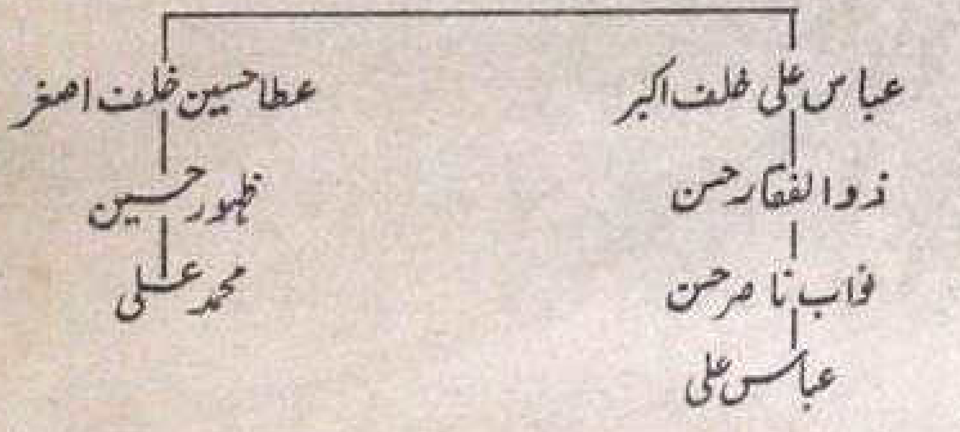

لکھنؤ میں سرکار اودھ سے وابستہ ہونے کے بعد ایک شادی کی جس سے کوئی اولاد نہ تھی مگر بیگم میں غریب پروری بہت تھی اور آپ نے یادگار باقی رہنے کے خیال سے دیوان صاحب کو آمادہ کر کے مسجد بنوائی اور امام باڑہ تعمیر کیا جس میں محرم کی ۴۰ دن مجلسیں اور رمضان شریف میں افطار صوم اور دلیہ کی مجلس ہونا نماز جماعت کی قرارداد منظور کی دیوان ناصر علی نے وطن جاکر آخرت کا سفر کیا اور وہیں ان کی قبر اور اولاد ہے جو مسجد امام باڑہ کی متولی ہے کانپور میں انھیں دیوان ناصر علی کا چھتہ ایک محلہ ہے

مسجد میں ایک درجہ اور مختصر صحن، حوض اس کے بعد پہلو میں دو درجوں کا امام باڑہ بلند شہ نشین اور چوڑا دالان جس میں منبر ہے اور مجلس ہوتی ہے تعزیہ خانہ کا معمولی سامان اور کچھ ہانڈیاں روشنی کی اس وقت کا بچا ہوا نمونہ ہے دروازہ سے ملی ہوئی بھی کچھ عمارت تھی جو کھنڈر کی صورت میں ہے اور ایک آدھ قبر نظر آتی ہے۔

کٹرہ جہانگیر

قدیم کاغذات اور دستاویزات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کٹرہ جہانگیر نخاس قدیم سے شروع ہو کر راہ نادان محل سے مل جاتا تھا جب انگریزوں کے ابتدائی دور میں وکٹوریہ اسٹریٹ نکلی تو اس محلہ کی قطع و برید ہوئی اور دو سرا تباہ کن موقع کٹرہ جہانگیر

کو نادان محل روڈ نکلنے پر دریش ہوا۔ اب کڑہ جہانگیر کے جن مکانات کا دستاویزوں میں ذکر ہے وہ کچھ تو نخاس چوکی کی پشت پر رہ جاتے ہیں اور باقی شہنشاہ حسین وکیل کے بڑے مکان کی مشرقی سرحد سے شروع ہوتے ہیں جہانگیر خاں ابوتراب خاں کے ہمعصر اور برہان الملک کی فوج میں سردار تھے سید تھے خاں خطابی تھا اس محلے کے سات مکانات اور معزز رہنے والوں کا ایک وصیت نامہ[1] میں ذکر ہے جو جائداد وقف ہے مگر وقف کرنے والے کے نام کو ظاہر نہیں کیا گیا ہے قطعہ مکانات جس میں میر حسن شاہ، میر محمد شاہ، میر جواد شاہ، خادم حسین خاں، سید اعجاز حسین والدہ اعجاز حسین اور میر حامد حسین رہتے تھے۔

جن اصحاب کے نام میں شاہ کا اضافہ ہے وہ حضرات کشمیری نژاد اور ممتاز العلماء فخر المدرسین کے شاگردوں یا صحبت کے لوگوں میں تھے جن کو ان کے استحقاق ذاتی کے لحاظ سے مکانات وقف میں رکھا گیا تھا۔ گولہ گنج کا مقبرہ اپنی وسعت کے باوجود کافی نہ تھا اور یہ حضرات خال خال دوسرے محلوں میں بھی رہتے تھے۔ نخاس کے پل سے اتر کر نادان محل جانے والے کو میر محمد شاہ کی گلی اب تک بتائی جاتی ہے یہ وہی صاحب کمال ذاکر تھے جنھوں نے محرم کی مجلسوں میں اپنے حسن بیان اور قابلیت ذاتی سے چار چاند لگائے اور شہر کی چوٹی پر کی مجلس یہی پڑھتے تھے حسین آباد کے شہدوں کا اپنے کاندھوں پر لاد کر میر محمد شاہ کو اچانک مجلس پڑھوانے جانا اس کتاب کے صفحات میں گزر چکا۔ میر محمد شاہ کے حال میں ایک مکمل مقالہ لکھا جا سکتا ہے ۱۳۰۵ھ میں موصوف نے انتقال کیا اور احاطہ تلسی رام واقع بدرجی ٹولہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ میر محمد شاہ اپنے زمانے کے قادر الکلام حدیث خواں تھے منشی سید نابت حسین رضوی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ آغا احمد علی خاں مرحوم کے مکان پر زمانہ چہلم کی ایک مجلس میں میر محمد شاہ مرحوم محدث مشہور و مقبول حضرت امیر المومنین کا رکوع میں انگوٹھی دینا بیان فرما رہے تھے کہ اوروں نے بھی انگوٹھیاں دیں مگر بجز جناب امیر کے اور کسی کی مدح خدا نے قرآن میں نہ کی ایک کشمیری لقال بولا کہ حضت وہ اوروں کی انگوٹھیاں طمع کی ہوں گی سب مجلس ہنس پڑی طمع کی لفظ پر۔ ورس کی مفید تلمیح پر خیال فرمائیں۔ لکھنؤ کے معمولی آدمیوں کی یہ ذہانت تھی یہ سب علم کی برکت تھی جو شاہی زمانے کا اثر چلا آتا تھا ریاکاری کی تصویر روشن گویا لفظ طمع دکھا رہا ہے کہ وہ دیکھنے میں اوپر سے کچھ اور ہوتا ہے اور حقیقت میں کچھ اور ہوتا ہے (حیات دبیر ص۵۱۶)

سید اعجاز حسین مشاہیر میں تھے آپ کے والد کی بڑی عالیشان کوٹھی جب غدر میں کھود کر مسمار ہوئی تو آپ نے اپنے بھائی مولانا سراج حسین صاحب کو چرکھاری میں اطلاع[2] دی اور غالباً اسی تباہی میں آپ کو مکان وقف میں رہنے کی ضرورت ہوئی آپ اہل قلم میں تھے اور اس قدر طاقتور تھے کہ آدمی کو زمین سے اٹھا لیتے تھے۔ آپ کا انتقال ۱۷ ماہ شوال ۱۲۸۶ھ ہوا اور امامباڑہ غفرانمآب میں دفن ہوئے مادہ تاریخ یہ ہے "قبر جنت شدہ آباد با عجاز حسین"

آخر میں علامہ سید حامد حسین صاحب جامع عبقات الانوار کا نام نامی آتا ہے جو شیعی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہیں آپ کی وفات ۱۸ صفر ۱۳۰۶ھ میں ہوئی اور دار السلام ہند امامباڑہ غفرانمآب میں سپرد خاک ہوئے۔

مؤلف کے دور شباب میں مکانات وقف میں سید ابوذر صاحب، حاجی یونس صاحب، حکیم مرزا محمد تقی صاحب وغیرہ رہتے

---

[1] وصیت نامہ جناب ممتاز العلما مورخہ ۸ اپریل ۱۸۹۶ء رجسٹری شدہ وصیت: شمس العلما السید محمد ابراہیم مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۸۹۵ء رجسٹری شدہ

[2] تاریخ العلماء معروف بہ تذکرہ بے بہا ص۱۷۲

تھے اور اب بھی مرقومہ بالا افراد کے ورثا حسب وصیت نامہ رہتے ہیں۔

امامباڑہ :۔ اس وقف میں ایک امامباڑہ بھی تھا جس کی صدر دیوار اب بھی باقی ہے اور دروازے کی سمت دو کھجور کے درخت ہیں ۱۳۲۷ھ تک اس امامباڑہ کے درجے موجود تھے ان مکانات میں سے ایک مکان کی دخلیابی کے سلسلے میں شعبان ۱۲۹۶ھ میں عدالت کا دروازہ بھی کھٹکھٹانا پڑا تھا۔

حاجی یونس صاحب اس دور آخر کے تاریخی آدمی تھے جنھوں نے ۱۹۳۰ء تک ۲۱ حج کئے تھے کسی زمانے میں ورزش کا شوق تھا کشتی لڑتے تھے ۱۳۵۲ھ ان کا سال وفات ہے۔

سرائے آغا میر

نواب معتمد الدولہ نے اپنی وزارت میں جو پبلک کی خدمت کی اس میں مسافروں کی یہ قیامگاہ بھی ہے جو بہت بڑی سرا تھی مختلف سڑکیں نکلنے پر اس کے طول و عرض کا تو تصور نہیں ہو سکتا مگر ایک ٹکڑا اب بھی باقی ہے جہاں تانگے والے اور کچھ پیشہ ور بستے ہیں غدر ۱۸۵۷ء کے ہلاکت آفریں دور میں یہاں ایک مورچہ بندی بھی انگریزوں نے اس وقت کی تھی جب احمد اللہ شاہ عیش باغ سے شکست اٹھا کر واپس ہوا تو آغا میر کی سرا میں قدم جمائے انگریزی فوج کا حملہ ہوا اور احمد اللہ شاہ نے راہ فرار اختیار کی اس سرا میں عربی گھوڑوں کے تاجر بھی ٹھہرتے تھے ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۰ء کے روزنامچے سے واضح ہوتا ہے کہ حسنی پور کے بعض رؤسا نے اس تاریخ لکھنؤ سے عربی گھوڑا خریدا۔

اس محلے کے قدیم باشندوں میں نواب قیصر جاہ خلف مرزا غلام علی بیگ تھے ان کی ڈبیا کی گلوری اس قدر مزیدار اور پر تکلف ہوتی تھی کہ کسی دوسرے رئیس نے ایسے عمدہ پان کم کھائے ہوں گے مجلس میں بلند آواز سے روتے تھے اور ان کی آواز گریہ سے در و دیوار ہل جاتے تھے ان کی موجودگی مجلس کو کامیاب بناتی تھی۔

۲۰ مارچ ۱۸۴۲ء کو عظیم آباد (پٹنہ) کے ایک معزز مسافر نجابت حسین خاں سرا میں اترے وہ لکھنؤ کا چہلم دیکھنے آئے تھے۔ انہوں نے بھٹیاری کی تمیز داری تہذیب پر پرانے روزنامچے میں جو تبصرہ کیا ہے وہ ملاحظہ ہو۔ بھٹیاری کا نام بھولا تھا وہ شہر کی تمام سراؤں یعنی نیم کی سرا، گڑھے کی سرا اور سرا حسین آباد وغیرہ کی بھٹیاریوں کی منھ بولی بڑی بہن تھی۔ بھولا کا حلیہ یہ تھا: بوڑا چہرہ، چیچک کے داغ سانولا رنگ، شوخ چشم، میانہ قامت، گداز بدن، ۳۵ سال سے زیادہ سن، لیکن تنزل شباب کے باوجود عشوہ گر بے باک اور عیارہ صفت وضع لباس اور تراش خراش پوشاک کے لحاظ سے دلکش اطلس کا لہنگا پہنے، جس کے نیفے میں سیمیں گوٹ، بنت اور سنہری گوکھرو لگے ہوئے پورے لہنگے پر، گوٹے کی چھڑیاں کاندھے پر، صندلی رنگ کے جالی لوٹ کا دوپٹہ جس کے حاشئے میں نقرئی پٹھا لگا ہوا طلائی بالی پتے، جگنو، چمپا کلی، کڑا چھڑا اور دوسرے زریں زیورات سے آراستہ، پاؤں میں زردوزی کا بیش قیمت پاپوش۔ بھولا اپنی برادری میں ممتاز اور عوام و خواص میں مقبول تھی۔ امرا اور رؤسا کے دربار میں بھی رسائی رکھتی تھی شرفا و نجبا کی محبت و وابستگی کا بھی دم بھرتی تھی سلاطین و اراکین سلطنت نے اسے ہزاروں روپیہ گھوڑے اور تمغے انعام میں دئے تھے لہذا خوش حال زندگی گزارتی تھی لیکن اس کے باوجود اپنے کام اور فرائض میں مستعد رہتی تھی مسافروں کی خاطر داری

۱؎ احسن التواریخ ص ۱۰۵

اور دبجوئی، پخت طعام اور دوسرے اوصاف جو بھٹیاریوں کے لئے مخصوص ہیں رقص وسرود، نقل سوانگ، جنگ وجدال، ایجاد دشنام وفحش گوئی طلاقت لسانی وچرب زبانی، شوخی وچالاکی، کرشمہ ونانہ میں ماہر وہوشیار تھی اس نے خاں صاحب کی مہمان نوازی کے لئے دو جوان بھٹیاریوں جمنی اور عدیا کو مقرر کر دیا تھا۔ ایک دن جمنی نے جلاب لیا تھا اور سب کام عدیا کے سپرد تھے لیکن صغر سنی کی وجہ سے اس نے ادائے فرائض میں کوتاہی کی تھی اور خاں صاحب کا کمرہ صاف نہ کیا تھا بھولا کی جب اس کی نظر کثافت پر پڑی تو عدیا کو مارنا شروع کیا سینے پر چڑھ گئی اس کے دانت اکھاڑنے کی کوشش کی۔ خاں صاحب نے ڈر کر مبادا مقدمہ چل جائے اور بھیس گواہی دینا پڑے بیچ بچاؤ کر دیا اور قسم دے کر عدیا کو چھڑایا۔ بھولا اپنے عمدہ تن پوشاک گراں بہا اور زیورات قیمتی کے باوجود ہاتھ میں جھاڑو لے کر جاروب کشی کرنے لگی خاں صاحب نے اسے منع کیا لیکن وہ نہ مانی اور کہنے لگی مسافروں کی خدمت کرنا ہمارا فرض اور سرمایۂ افتخار ہے جھاڑو دینے کے بعد اس نے اپنا کھانا منگوا کر اسی کمرے میں کھایا اور تھوڑی دیر تک میٹھی باتیں کرتی رہی۔ اس کے دریافت کرنے پر خاں صاحب نے شہر کی تعریف کی بھولا نے کہا غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے زمانے میں شہر زیادہ رونق دار تھا آج کل تو بادشاہ کی دنائت اور خست طبع کے باعث شہر میں ویرانی کا عالم ہے جب خاں صاحب سرا چھوڑ کر کرایہ کے مکان میں گئے تو بھولا ایک دن ان کی ملاقات اور مزاج پرسی کو آئی۔ ان دنوں خاں صاحب کی طبیعت علیل تھی چہرے کی زردی اور آنکھوں کی لالی دیکھ کر اسے گمان ہوا کہ شاید یہ کسی مہرو کی بے مہری اور کسی خوبرو کی عدم التفاتی کے شکار ہیں آتش کا یہ شعر پڑھا ؎

رنگ زرد وچشم تر سے کیجئے دعوائے عشق
دو گواہ حال اس قصے کے لایا چاہیے

اس نے پوچھا اے مسافر دل باختہ وبعید الوطن ولئے چہرہ زرد ساختہ دعشق گلبدن ؎

دل آشفتہ ودیدۂ خونبار داری
مگر با محبت سروکار داری

آپ کا حال کیسا ہے اور خیال کہاں ہے شاید شاہد دلفریبان لکھنؤ نے آپ کے دل کو اسیر اور جان کو دستگیر کر دیا ہے اپنا حال جلد بیان کیجئے اور مجھے اس خلجان سے خلاصی دیجئے۔ خاں صاحب نے جواب دیا مجھے دیار غربت میں کون پوچھتا ہے اور ہمارے ایسے مسافروں کی کون خبر لیتا ہے جب سے میں اس شہر میں آیا ہوں طرح طرح کے رنج وملالت میں گرفتار رہوں کوئی دن بھی راحت و صحت کے ساتھ نہیں گزرا۔ شہر کی آب وہوا کی ناموافقت سے مثل بلبل بیمار رہوں ایسی حالت میں ویران لکھنؤ کے سودا کا کہاں موقع ہے اس گفتگو کے بعد بھٹیاری نے اپنے ایک آشنا نوروز علی کا خط خاں صاحب سے پڑھوایا جو اس نے پردیس سے لکھا تھا۔ انہوں نے خط پڑھ کر مفہوم سے آشنا کیا اور موقع کے مناسب ناسخ کے چند اشعار بھی اپنی طرف سے سنائے ؎

دم مرا گھبرا کے کر جاتا سفر
گر نہ دم بھر اور آتا نامہ بر

غور سے دیکھوں میں ہر مضمون کو
کوئی ساعت دل مرا بہلا دے خط

دل باختہ بھٹیاری نے جب خط کا حسرت آگیں مضمون اور اشعار کے مطلب سنے تو بہت ملول ومحزون ہوئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک گئے تھوڑی دیر بیٹھ کر بھولا واپس چلی گئی۔ جاتے وقت خاں صاحب نے ایک روپیہ پان کھانے کے لئے رخصتانہ دیا حالانکہ یہ رقم اس کے رتبہ اور لیاقت کے لحاظ سے کم تھی جب وہ جا چکی تو نواب مرزا صاحب خاں صاحب کے لکھنوی دوست نے

انھیں بتایا کہ یہ عورت ہمیشہ شرفاء و نجباء کے عشق میں مبتلا رہتی ہے ہزاروں روپے جو اس نے سلطان نصیر الدین حیدر کے محل سے گانے بجانے کے صلے میں پائے تھے سب اسی محبت میں لٹا چکی چنانچہ کچھ دن پہلے نوروز علی نے جوئے میں سات سو روپیہ ہارا تھا اور بوجہ عدم ادائیگی رقم ساتھیوں نے اسے گرفتار کر رکھا تھا آخر اسی بھٹیاری نے سب روپیہ ادا کیا اور اپنے آشنا کو رہائی دلائی (نیا دور بابت مئی ۱۹۵۶ء لکھنؤ ص ۴۳،۱۳)

یحییٰ گنج

نواب آصف الدولہ بہادر کا نام یحییٰ علی خاں عرف مرزا امانی تھا اس محلہ کو نواب ہی نے بسایا اور ان کے نام پر شہرت ہوئی شہر کے تمام بازاروں میں جو چیزیں خوردہ فروشی میں دستیاب ہوں وہ یہاں تھوک بکتی ہیں مسلمانوں میں خاندان ہدایت رسول کے حافظ محمد عمر محمد حسن کی دوکان قدیم دوکانوں میں اور مکھن لال نرائن داس برتن والے ہندو کاروباری مشہور ہیں۔ تانبے پیتل اور لوہے کا سامان ہمیشہ سے یحییٰ گنج میں بکتا ہے عوام اس محلہ کو "اھیا گنج" کہتے ہیں ۱۹۱۰ء تک یہاں کا بزازہ بھی ایک حیثیت رکھتا تھا اور میر عبد الحسین تاجر کتب اپنے مکتبہ تجارتی کی فہرست میں عقب بزازہ کی لفظ لکھتے تھے۔

اس محلہ میں پرانے مندر اور مسجدیں ہیں جن کے بانیان کا نام بتانے والا کوئی نہیں ہے۔

کھجور کا درخت:۔ یحییٰ گنج میں ایک بیگم صاحب کی ڈیوڑھی ۲۵ سال ادھر تک باقی تھی اور سید ثروت علی صاحب ان کے وارث تھے کھجور کا درخت موصوف ہی کے مکان میں تھا جس کے بارے میں وہ راوی تھے کہ بیگم صاحبہ کی مورث اعلیٰ سفر عراق کی یادگار ہیں یہ درخت وہاں سے لائیں اور بوروں میں مٹی بھی بھروا کر لائیں اور باربرداری میں زیادہ سے زیادہ صرف کیا لیکن رطب میں وہ ذائقہ پیدا نہ ہوا جو کربلا کے خرمہ میں ہوتا ہے۔

اس محلہ میں کھنو لال تائب نے بزم تہذیب ایک سوسائٹی قائم کی تھی اور محلہ کے صاحبان کمال میں قاری مرزا محمد علی صاحب ذاکری کے ماہر فن اور استاد گذرے ہیں جنھوں نے ۱۳۲۵ھ کے پہلے یا بعد اس دنیا کو چھوڑا یہ دلدوز لہجے میں پڑھنے والے حدیث خواں تھے۔

مسجد نواب جعفر علی خاں:۔ یہ مسجد خاندان نواب شجاع الدولہ کے رئیس نواب جعفر علی خاں صاحب مرحوم کی بنا کردہ اونچی کرسی نیچے دوکانات اور ایک بڑا مکان مسجد سے متعلق ہے کسی زمانہ میں ایک مؤذن مغل اس میں اذان دیتا تھا۔

یحییٰ گنج سے ۱۸۴۷ء میں متصل مسجد مولانا حسن علی محدث ایک اخبار جاری ہوا جس کا نام اخبار ہلالی تھا اور بعض کہتے ہیں کہ یہ پریس کا نام تھا (نیا دور دسمبر ۱۹۵۹ء)

انجمن ہند:۔ یہاں سے ایک اخبار انجمن تعلقہ داران اودھ کی طرف سے ۱۸۶۲ء میں راجہ سر رانا بخش سنگھ تعلقہ دار کھجور گاؤں نے جاری کیا موصوف قائم مقام صدر تھے ایڈیٹر کا نام کنور ہر نام سنگھ تھا ہر ہفتہ ۱۰ صفحہ کا شائع ہوتا۔

بلوچ پورہ:۔ اس علاقے میں قصابوں کی بستی کو بلوچ پورہ کہتے ہیں بلوچ کے معنی خانہ بدوش کے ہیں پاکستان میں بلوچستان کا ریگزار مشہد مقدس امام رضا کے مسافروں کا لمبا اجاڑ ہوا صوبہ ہے یہاں کے اگلے زمانہ میں بلوچیوں کا دعویٰ تھا کہ وہ شام میں حلب کے مقام سے نقل وطن کرکے آئے تھے۔ رسول کریمؐ کی پیدائش سے پہلے وہ نوح حلب کی پہاڑیوں میں رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ

جب یزید نے حضرت امام حسین پر فوج کشی کی تو بلوچیوں نے امام مظلوم کا ساتھ دیا تھا۔ یہ طبقہ بعد میں ہجرت کر کے کرمان سیستان (ایران) سے ہوتے ہوئے مکران پہونچے۔ بلوچپورہ میں کوئی غیر ملکی انسان آباد نہیں ہے کبھی بلوچی آباد ہوں گے جن کا وجود نام سے باقی ہے۔ بلوچ قوم کو پردہ کا بہت زیادہ احترام ہے کسی موقع پر ملکی سازش سے بلوچی عورتوں کا ایک جلوس نکل گیا تھا تو کوئٹہ ۳۰ اگست کی خبر ہے کہ مسٹر جنیفر نے بلوچ قوم کی خواتین کے بے پردہ جلوس پر جو سخت ترین احتجاج کیا اس کا جزیہ ہے ان معزز خواتین کی عزت آبرو کے تمام بلوچ امین ہیں بلوچوں کی تاریخ میں کبھی خواتین نے سڑکوں پر گشت نہیں کیا ان کی آواز کبھی مردوں تک نہیں پہونچتی ہے بلوچوں کے رسم و رواج اور روایات کو کبھی پائمال کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ جنگ یکم ستمبر ۱۹۷۳ء صلا کالم ۱

سبحان نگر

تاریخ میں اس محلہ کا ذکر کہیں نہیں ہے صرف اس قدر پتہ ہے کہ داراب علی خاں کا کچا مکان درگاہی لال کی بارہ دری کے قریب تھا اور عہد قدیم میں یہاں ایک پریس تھا شگوفہ گلزار اور وہ نام اس پریس کے مطبوعات عہد شاہی کے مطابع سے نسبتاً دوسرے درجہ پر تھے گلستان سعدی یہاں طبع ہوئی۔

شیدیوں کی نسل :- سلاطین اودھ نے اپنی حفاظت کے لئے جن حبشی مرد و عورت کو تجویز کیا تھا اس میں مرد کو شیدی تو آج تک کہا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ اپنی سچائی، بہادری، وفا ہر لحاظ سے قابل تعریف رہے حبشی عورتوں کو رستی، کہتے تھے چنانچہ عورتوں کے ماتمی گروہ میں رستی حسینہ اور رستی جمیلہ نام عورتوں کے تھے اور دونوں کو ان الفاظ سے کیوں یاد کیا جاتا تھا اس کے بارے میں خان بہادر علی سجاد حسین خاں ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر و سابق کمشنر نے تحقیق کی اور وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ — سیدی۔ یعنی میرے سردار عربی جملے کا بگڑا ہوا لفظ شیدی اور "سیدتی" میری سردار عورت، عربی جملے کا تفرس شدہ لفظ رستی ہے اور اپنے قبیلوں میں یہ لوگ سردار تھے اس نسل میں میرے ہمعصر شیدی میاں عنبر بہت اچھے شخص اور کافی طاقتور اور دلیر تھے شیدیوں میں بہت ہر دلعزیز اور بہادر شخص شیدی غلام علی گذرے ہیں ان کے برابر نواب صادق علی خاں عرف شہنشہ دولہ صاحب رئیس گنگنی شوکل تالاب تھے اور دونوں سے زیادہ طاقتور اور مرد میدان غالب علی تھے تینوں شخصوں میں اتحاد تھا اور ایک دوسرے کی قوت و طاقت کو تسلیم کرتا تھا۔ کسی دن ٹہلتے ہوئے کھیت کی طرف نکل گئے دیکھا کہ دو طاقتور بیل کنوئیں سے چرسا کھینچ رہے ہیں۔ غالب علی نے ان میں سے ایک کو اشارہ کیا اس نے تلوار سے رسی کاٹ دی فطرتاً ڈول کو ٹوٹ کر تہ آب تک پہونچنا چاہئے تھا انہوں نے دوڑ کر رسی پر پاؤں رکھا اور ڈوبنے نہ دیا اس دھچکے سے وہ گراں گوش (بہرے) ہو گئے اور وہ چرسے کا ڈول جس کو بیل نکالتے تھے خود تنہا نکالا۔

شیدی غلام علی کو معلوم ہوا کہ ایک شخص باہر کے آئے ہیں جو سنگی چوکی ایک پایہ پکڑ کر اٹھا لیتے ہیں انہوں نے مقابلے کے لئے مشق کی اور ایک دن پہونچ گئے اور ناواقف بنکر ان سے تعارف حاصل کیا انہوں نے طعن کرتے ہوئے کہا کہ لکھنؤ والے پتلی دال کھانے والے کیا اٹھا سکتے ہیں یہ کہہ کر چوکی اٹھائی۔ غلام علی نے ایک پایہ اٹھا کر چوکی کو اٹھایا اور کہا اچھا ہوتا اس پر کسی لڑکے کو بٹھا دو ایک لڑکا بٹھایا گیا اور شیدی نے دوسرا پایہ جھکایا یہاں تک کہ ہر گوشے پر لڑکے کو بٹھا کر بلا تکلف اٹھایا اور پھر پوچھا کہ آپ دہلیز سے کتنا لوہے کا کیونکر نکالتے ہیں انہوں نے گھما کر نکالا اور شیدی نے یونہی کھینچ لیا اور وہ پردیسی ان کی طاقت

کالو بامان گئے۔

نادان محل

نخاس سے امین آباد جانے والی سڑک نکلنے پر یہ محلہ کھد گیا مگر مقبرہ نادان محل کی عمارت اپنی قدیم شان و شوکت کے ساتھ موجود ہے یہ شیخ عبدالرحیم صوبہ دار لکھنؤ کا مقبرہ ہے اور اس کی بنیاد اس وقت قائم ہوئی جب لکھنؤ میں شہریت نام کو بھی نہ تھی شیخ عبدالرحیم ضلع بجنور کے رہنے والے تھے تلاش معاش میں دہلی گئے وہاں مقدر کی یاوری سے منصب دار ہو گئے شیخ انھیں کی نسل[1] سے ہیں نجم الغنی نے تاریخ اودھ میں ندان محل بحذف الف لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے اور وجہ تسمیہ آج تک دریافت نہیں ہوئی لفظ کی ترکیب شیش محل، فرنگی محل کی طرح ہے اور عمارت انگریزوں کے زمانے سے آثار قدیمہ میں ہے ایک بلند سنگی چبوترے پر اونچی چھت پتھروں سے بنا کر سنگی ستون پر اس کو روکا ہے اور چبوترے پر سلاطین آصفیہ حیدرآباد دکن کی قبروں کی ایسی سنگی تربتیں ہیں اور شیخ ابراہیم کے کنبے میں جو لوگ قضا کر گئے تھے وہ اسی جگہ دفن کیے گئے اور شاید معمار کا نام افضل تھا ظریف کہتے ہیں ؎

کرسی کے لوگ ان کے آگے ہوشیار گر ان کو گدھا کہوں گدھوں کو بھی ہو عار

الّو دانا ہیں ان سے گھگّو عاقل نادان محل کے ہیں یہ افضل معمار

اس عمارت کے بعد شیخ ابراہیم چشتی کا علیحدہ مقبرہ ہے جو ایک حجرہ اور گنبد کی صورت میں بند رہتا ہے شاہ سبحان نے اگلے زمانے میں یہاں قیام کیا تھا یہ واقعہ عہد برہان الملک کا ہے ان کو لوگ پاک باطن کہتے تھے زمانے کے ظلم و جور کا ان پر بہت اثر ہوتا تھا چنانچہ انہوں نے پیشین گوئی کی کہ یہاں آگ کے شعلے بھڑکنے والے ہیں اور صدہا آدمی مر جائیں گے وہی ہوا کہ پٹھانوں کے بارود خانہ میں آگ لگی اور لوگوں کی جانیں گئیں۔[2]

شیخ ابراہیم کا وصال عہد ہمایوں میں ہوا اور اسی مقبرے میں دفن ہوئے قبر پر تاریخ وفات موجود ہے ؎ قضا یا شیخ ابراہیم چشتی کہ بودہ در زمان فرد یگانہ شد آں قطب جہاں از ملک فانی بسوئے عالم باقی روانہ ز سال موت ادھر کسی کہ پرسید بگو رفت از جہاں قطب زمانہ ۹۶۱ھ

عہد شاہی کے بعد جو تعزیہ بڑی دھوم اور اژدہام سے اوٹھے ان میں حاجی میر نواب علی صاحب مرحوم کا تعزیہ ہے جو نادان محل سے اٹھتا تھا پبلک کی طرف سے ان کو رکن عزا کا خطاب تھا اور اپنے تعزیہ کا اعلان ان لفظوں میں کرتے تھے کہ میرا مکان پائمال ستم انگریزاں ہو گیا۔

اصطبل چارباغ

یحییٰ گنج اور رکاب گنج کے بیچ میں واقع ہے گرد و نواح میں مسلمان آبادی کہیں کہیں ہے نہیں معلوم یہاں کب اصطبل تھا شاہی گھوڑوں پر سائیں چابک بردار، چھاتہ بردار، تپائی بردار ہوتے تھے اور چابک میں چاندی کی شام۔ اس محلے کے رئیس و رئیس حکیم کوچک عہد شاہی کے نامور طبیب تھے ان کا نام تاریخ میں محفوظ نہیں ہے قد و قامت کے لحاظ سے یہ لقب مشہور ہوا شہر میں با اقتدار ہستیاں ایرانی نژاد تھیں اور وہ اپنے ذوق سلیم کے مطابق محلہ اور اشخاص کے نام رکھتے تھے شروع گیارہویں صدی

---

[1] گذشتہ لکھنؤ عبدالحلیم شرر ص۱۴۱ [2] تاریخ اودھ ج ا ص۱۹۵ نجم الغنی

ہجری سنہ۱۲۰۰ھ میں قزوین سے[1] حکیم کوچک نامور شخص گزرے ہیں۔ اسی تصور میں ان حکیم صاحب کا نام بھی حکیم کوچک ہوا لا تعداد ہندو اہل محلہ اور سارواڑی حکیم صاحب کا علاج کرتے تھے۔ عبدالحلیم شرر نے اس خاندان کے مورث اعلیٰ کے طبی کمالات کا حسب ذیل الفاظ میں اعتراف کیا ہے چند روز کے بعد زبان اور شاعری کی طرح فن طب بھی خاص یہیں کا فن ہو کے رہ گیا۔ چنانچہ لکھنؤ نے حکیم مسیح الدولہ، حکیم مرزا محمد علی، حکیم سید محمد مرتعش، حکیم مرزا کوچک، حکیم بنّا ایسے عالی پایہ اور گرانقدر طبیب پیدا کئے جو سچ یہ ہے کہ اپنے فنون کے مجتہد تھے۔[2]

استاد مرزا علی کا اکھاڑہ:۔ مرزا علی تیرہویں صدی کے پیدا شدہ لکھنؤ کے آخری پہلوان تھے ان کی کشتی منا جان کے ساتھ بدی گئی تاریخ سے پہلے دونوں پارٹیوں میں وہ جوش جو نہ دیکھا نہ سنا رفتہ رفتہ اس ایجی ٹیشن کو فرقہ وارانہ لباس بھی پہنایا گیا مرزا علی کے باپ پکے پل پر جا کر بیٹھ گئے اس لئے کہ بیٹے کے چت ہونے کی خبر سنوں گا تو گومتی میں ڈوب جاؤں گا اس سے اچھا یہ تھا کہ مسجد میں جا کر خدا سے دعا کرتے ماں باپ کی دعا خدا جلد سنتا ہے۔ کرشمۂ قدرت نظر آیا اور مرزا علی جیت گئے اس وقت شہر بھر میں ان کی استادی کا ڈنکا بج رہا تھا موت نے ان کو بھی نہ چھوڑا اور بعد وفات محلہ کے قبرستان میں جو میدے والی گلی کے قریب ہے دفن کر دیئے گئے۔

عہد شمس العلما سید ناصر حسین صاحب مجتہد میں اس تکیہ کی قبروں پر سے گندا پانی بہانے کا راستہ نکالنے پر اہل محلہ نے احتجاج کیا تھا اور قبروں کی بے حرمتی سے اظہار بیزاری کیا اور اپیل شائع کی جس پر مشہور لوگوں کی دستخطیں ہیں۔

احاطہ کمال جمال

تاریخ میں کمال جمال کا ذکر نہیں ہے اور صوفیائے کرام کے تذکرے بھی ان کے ذکرے خالی ہیں مگر نوابی سے پہلے لکھنؤ میں ان کا وجود تھا اور حالات ضبط و تدوین میں نہیں آئے۔ اس وقت اس محلہ میں جو لوگ لکھنؤ کی بنیاد قائم ہونے سے پہلے نسلاً بعد نسل آباد ہیں ان میں محقق ہندی مولوی سید محمد حسین صاحب محدث مرحوم کا خاندان ہے ان کے والد علامہ سید حسین بن عاشق علی پردادا سلاطین مغلیہ کے زمانے میں رسالدار[3] تھے۔ آصف الدولہ کی فیاضیوں کا شہرہ سن کر اس طرف کا رخ کیا۔ اور فرمان شاہی لے کر لکھنؤ پہونچے اور اسی احاطے میں قیام کیا ۱۸ بیگہ پختہ آراضی کا معافی نامہ آپ کے پاس تھا مجتہد العصر والزماں کی خاندان سے اپنے علمی کمالات بہت بلند درجے پر حاصل کئے۔ آپ پہلے شخص ہیں کہ ساڑھے تین برس میں سفر کربلائے معلیٰ آمد و رفت میں طے کیا اور پردیس کی سختیاں برداشت کیں ۳۳ سال بڑھاپے کی کمزوری میں آپ مبتلا رہے اور ۸۰ برس کی عمر میں اس دنیا کو چھوڑا تکیہ باغ شیر جنگ میں آپ کی قبر چوبی ضریح کی تحت میں اندرون حجرہ موجود ہے آپ کی اولاد ہندوستان اور پاکستان میں موجود ہے فخر الحکما حکیم علی اظہر صاحب بانی رسالہ اصلاح کھجوہ اور بہتیرے بلند پایہ عالم علامہ کے شاگرد ہیں ممکن ہے کہ ٹیڑھے قبر کے شہید سید محمود رضوی جمال لقب کے نام پر محلہ آباد ہو۔

نادان محل روڈ کمال جمال کے احاطے کی سمت ٹیڑھی قبر کے راز نور المجالس منشی نور الحسن دھولپوری کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتے ہیں کہ محمود رضوی مستجاب الدعوات تقیہ میں بسر کرتے تھے ایک حضد نے مخالفین سے مناظرہ کرا دیا جس میں وہ کامیاب

---

[1] مفتاح الجعفر مولفہ سید محمد غلام حسن ابن میر محمد بخش پانی پتی ص۱۰۳ [2] گزشتہ لکھنؤ ص۱۰۱ [3] تذکرہ بے بہا ص۱۴۱

ہوئے اور راز زندگی فاش ہوا اس جرم میں وہ آگرہ میں بعہد شاہجہاں شہید ہوئے اور صرف سر ان کا یہاں دفن ہے۔ یا بقولے لاش۔ رکاب گنج کا پھاٹک اسی مقام پر تھا اور سنگ سرخ سنگ مزار تھا جس پر طلائی کام تھا اور آیۃ الکرسی کندہ تھی وارث آل رسول ۳۴ء۱۰ تاریخ ولادت اور جانشین حیدر کرار تاریخ وفات ہے اور کہا جاتا ہے کہ مشک گنج کے سادات اسی ۳۳ سالہ نوجوان مقتول کی نسل ہیں واللہ بعلم۔ سر راہ ہونے سے قبر پر چراغ اہل محلہ جلاتے ہیں۔ ۱۰۵۷

رکاب گنج

عہد آصفی کا محلہ ہے۔ جو غلہ کی بہت بڑی منڈی ہے امین آباد اور چار باغ کا راستہ ہوتے سے کبھی ویران نہیں ہوا یہ نام کیوں رکھا گیا تاریخ سے رہنمائی نہیں ہوتی۔ خیال ہوتا ہے کہ شاہی رکابدار یہاں رہتے ہوں جو مربہ، تر حلوہ بناتے تھے احاطہ خانساماں یہاں سے نزدیک ہے جو اس نکتہ میں مدد دیتا ہے۔ عبدالحلیم شرر نے اس احاطے کو ایک خانگی دار وغہ کے رہنے کی جگہ بتایا ہے مجلسوں کی پرانی فہرستوں کے دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں حسن خواص کی مسجد ہے جہاں ۴۰ سال پہلے ہر مہینے کی ۴ کو محمد آغا ماہوار مجلس کرتے تھے۔ اس محلہ میں نادان محل روڈ کے کنارے شاہراہ پر مسجد مرتضوی ہے جو قدیم عمارت سے جدید عمارت میں منتقل ہوئی ہے اس کے بانی کا علم اب نہیں ہے۔

کھجوہ کا باغ

ناظم آغا علی خاں کے باغات میں یہ باغ اور ایک قدیم عمارت موجود ہے جس میں مولانا سید حامد حسین صاحب عبقات الانوار کا کتب خانہ ہے جو آٹھ نو سو برس کی پرانی کتابوں کا یادگار ذخیرہ ہے اور کامل اہتمام اور حفاظت سے کتابوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہے اس کتب خانہ کے بانی ۱۸ صفر ۱۳۰۶ھ سے امامباڑہ غفرانمآب کی مقدس سرزمین پر محو خواب راحت ہیں۔

باغ میر عشق :۔ یہ محلہ چند مشہور شاعروں کے ادبی آستانوں سے آراستہ تھا اور جو ارباب کمال یہاں رہتے تھے ان میں ہر فرد چمن ادب کا عندلیب خوشنوا تھا۔

احمد مرزا صابر :۔ آپ میر انس کے منجھلے بیٹے اور انیس کے داماد تھے دربار واجدی کے مجرائیوں میں نام تھا نواب زہرہ محل نے اپنی ڈیوڑھی کا معتمد اور داروغہ بنا رکھا تھا لکھنؤ کے پیکر کمال شاعر پیارے صاحب رشید انھیں کے فرزند ارجمند تھے۔ جو عہد مؤلف کے سب سے بڑے غزل گو اور مرثیہ خواں ہمعصر جاوید دماہر تھے ان کے واقعات زندگی لکھنؤ کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ اور مختصر لائف آغا اشہر نے لکھی ہے۔

سید محمد مرزا انس :۔ یہ میر علی انس برادر میر انیس کے علاوہ ایک شاعر تھے جن کے مراثی تعشق کے مرثیوں کے ساتھ چھپے ہوئے موجود ہیں ان کو عہد واجدی میں سو روپیہ ماہوار خزانہ شاہی سے ملتا تھا مرثیہ خوب کہتے اور پڑھتے خط شفیعہ کے استاد تھے نواب ملکہ جہاں نے ایک بار ۲۰ ہزار روپے اور دوسری دفعہ ۲۵ ہزار روپے ان کو دئے حسن خدمات میں چار سو روپے ماہوار پر ملکہ جہاں نے ان کو ڈیوڑھی کے انتظامات کا عہدہ دیا تھا اور آخر میں بھائی کہنے لگی تھیں۔ پنچانوے برس کی عمر میں مر گئے

لہ قدیم ہنر ص۸

اور بقیہ میں دفن ہوئے۔

میر عشق :- مشہور شاعر تھے ان کے ادبی خدمات محتاج تعارف نہیں ہیں کلام زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے میری نوٹ بک پر ان کے کسی محل پر یہ اشعار قلمبند ہیں ؎

طاؤس داغ رنگ حنا آئینہ صفا — طوطی شکر سحاب شفق اہل دین وفا

بلبل جو لائی پھول تو گھبرائی فاختہ — دل شیر لائے طوق لیے آئی فاختہ

لایا سخی کی نذر کو جو جس کے پاس تھا — آنکھیں غزال اوج ہما بوئے گل ہوا

ہر وقت قعر بحر میں یا سامع الدعا — سنتا ہے مچھلیوں کے تنفس کی تو صدا

ممدوح کے سراپا میں یہ شعر ؎

زلفیں بڑھیں یہ پیچ اٹھانے کے واسطے — بھیگیں مسیں لہو میں نہانے کے واسطے

اتالیق ہند :- ۱۳ جولائی ۱۸۷۰ء کو رکاب گنج سے محمد علی خاں عرشی نے ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔[1]

دو گانواں

نواب صفدر جنگ بہادر نے اپنے دور میں شیخوں کو سات سو ایکڑ زمین دے کر یہاں بسایا اور بیچ محلے پر خود قبضہ کیا۔ یہ جگہ شہر کی حدوں کے باہر سمجھی جاتی تھی " دو گاؤں " یہاں سے شروع ہوتے تھے مدت تک ویران رہنے کے بعد اسٹیشن روڈ نے اس راہ کو بھی آباد کیا۔

مولوی گنج

یہ محلہ عہد نواب سعادت علی خاں میں کسی مولوی کے ہاتھ سے آباد ہوا اور امراء ورؤسا مشرقی صنعت و حرفت میں ہنرمند آباد رہے محلے کے سردار مرزا سلیمان قدر بہادر خاندان شاہی کے اعلیٰ رکن اور معزز شاہزادہ تھے ان کی عظمت اور اقتدار کے مطابق تو ان کی کوٹھی نہ تھی مگر۔

احاطہ سلیمان قدر :- لکھنؤ کا مٹیا برج معلوم ہوتا ہے اور شاہانہ دماغ سے نادار طبقے کو اپنے زیر سایہ رکھنے کے جذبے میں محلسرا کے گرد و نواح میں عام اجازت دے رکھی اور آسمان کے تاروں کی طرح بے ترتیب مکان بننا شروع ہوگئے چھپر کھپریل الکھوری اور گھے کے چھوٹے بڑے مکانات نظر باز کو بتاتے ہیں کہ شہزادہ صاحب کے دماغ میں ملوکانہ غریب پروری تھی اور اپنی بلندی سے پہلے وہ مفلس طبقے کو رعیت بنانا چاہتے تھے سلیمان قدر کا امامباڑہ بیٹھک تین درجوں کا اونچی کرسی دے کر نمایاں عزاخانہ ہے جو وقف کی صورت میں ہے اور لکڑی کے نیچے دیکر دھنیاں چھت میں خوبصورتی سے نصب کی گئی ہیں صحن میں گھنٹہ ہے جو موگری سے بجتا ہے۔ عہد واقف میں اس ڈیوڑھی کی شان و شوکت نہ پوچھو نہ عظمت خاندانی میں ان کا کوئی ہمعصر تھا نہ جو ہرات اور آن بان میں ان کی نظیر تھی شام کو ہوا خوری کو نکلتے وقت نوکر چاکر مصاحبین وابستگان دامن دولت ایک ہجوم ہوتا تھا اور آپ روزانہ امامباڑہ سبطین آباد اسلاف کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے جاتے تھے۔ ایک پان والا حضرت گنج میں اپنی دوکان سے

---

[1] نیا دور ۱۹۵۹ء [2] بیگمات اودھ ص۱۵

گاڑی گذرنے وقت گلوری پیش کرتا تھا۔ اس کو روزانہ ایک اشرفی معمولی بات سمجھ کر دیتے تھے۔ ان کی داد و دہش، جود و سخا خودداری کے واقعات ہیں جو آب زر سے لکھنے کے قابل تھے۔ افسوس ہے کہ حاشیہ نشینوں نے جلب منفعت کے سوا کبھی سیرت نگاری پر توجہ نہ کی اور نہ اولاد میں کسی کو توفیق ہوئی کہ لائف مرتب کرتا ان کے ذوق سلیم اور ادب نوازی کے چٹکلے بیان کرنے والے بھی زیر زمین پہنچ چکے۔ اگر شاہانہ عادات و اطوار کی نقشہ کشی ہوتی تو ایک دلچسپ کتاب تیار ہوتی اور نشست و برخاست کا ہر دن ایک ادبی کارنامہ ہوتا۔ ایک شخص کو زور سے پیشاب لگا تھا دربار میں پہونچنے کے پہلے ہی آفتابہ ہاتھ میں لے کر چوکی پر آ گیا آپ نے فرمایا یہ مرد مومن غایت درجہ بولایا ہوا ہے۔ شہزادہ صاحب کے زمانے میں بزم شعر و سخن کی یہ طرح نوحہ، ماتم، غزل ہزل میں ہر طرف مقبول ہو رہی تھی ؎

پچھے تھے جب شہ گلگوں قبا زمیں کے تلے
جناں سے آئے تھے شیر خدا زمیں کے تلے

سید محمد واثق ایک شاعر وابستگان دامن دولت سے مولوی گنج کے مکتب میں لڑکوں کو پڑھاتے تھے واثق کو شعر و سخن میں ید طولیٰ حاصل تھا جو غزل کہتے ستر اسی شعروں سے کم نہ ہوتی۔ ایک غزل کہی ؎

عدم کا جادہ ہے راہ ادق زمیں کے تلے
گمس کا خوف نہ ہے، ہم بقا زمیں کے تلے

حضور پر نور کو اشعار سنائے اور یہ دعویٰ کیا کہ کوئی قافیہ میں نے چھوڑا نہیں ہے ظریف کی جوانی تھی ہاتھ جوڑ کر عرض کیا سرکار بس ایک قافیہ چھوٹ گیا ہے ؎

فشار قبر ہوا جب کہ ایک مردک پر
پھٹا جو پیٹ صدا آئی پھق زمیں کے تلے

میر علی پھکیت اور رسالت خاں بکیت اور خلیفہ تیغے پھکیت مرزا سلیمان قدر بہادر کو لکڑی سکھلاتے تھے (قدیم لکھنؤ ص ۱۱۱) آغا مرزا عہد امجدی میں شہزادہ صاحب کو برچھیتی سکھاتے تھے (۱۲۴ ص)

شہزادہ صاحب نے ۲۴ رجب ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۰ جولائی کو فردوس بریں کا سفر کیا ایک عرصے کے بعد لاش کربلائے معلیٰ روانہ ہوئی۔

<u>مرزا ثریا قدر بہادر</u>:۔ آپ شہزادہ صاحب کے خلف اصغر تھے اور آبائی شان و شوکت، شاہانہ کر و فر، ملوکانہ تہذیب و معاشرت کے واحد حقدار تھے شعر و سخن میں آپ کا بلند درجہ تھا خوشنویس بھی تھے اور تحریر ایسی دلکش ہوتی تھی جیسے موتی پروئے ہوئے قدیم رفتار و گفتار میں ان کا کوئی نمونہ نہ تھا۔ سید عباس حسن فصاحت میاں امانت کے چشم و چراغ مصاحبین میں تھے رات کو دربار لگتا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں یہ شمع بھی صرصر فنا سے بجھ گئی۔

مولوی گنج میں گنگا سہائے مصور اپنے فن میں کامل تھے اور پھول پتی ان سے بہتر بنانے والا کوئی نہ تھا گنگا سہائے کے ٹائل کہیں کہیں اب بھی نظر آتے ہیں۔

<u>قاسم علی لبکاٹ والا</u>:۔ عہد شاہی کے کمالات کا نمونہ تھا بڑھاپے میں آنکھوں کی بصارت نے جواب دیدیا تھا لڑکے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر رؤسا کی ڈیوڑھیوں پر پہونچتا "قاسم علی بسکٹ والا حاضر ہے" اس کی صدا ہوتی نان خطائی بنانے میں اس سے بہتر کاریگر اب تک پیدا نہیں ہوا۔

گلزار اودھ مطبع:۔ یہ وہ پریس تھا جو خدا بخش خاں بنارسی کے زیر نگرانی حافظ محمد باقر چلا رہے تھے شوال ۱۲۸۳ھ تک اس پریس کے مطبوعات لائبریریوں میں ملتے ہیں اس پریس کے بعد مطبع تیغ بہادر قائم ہوا جو اب تک ہے ۔

دھنیا مہری کی مسجد:۔ مولوی گنج میں موجود ہے اور اس مسجد کے بارے میں ایک فرقہ وارانہ فساد ہو چکا ہے عدالت سے طے کیا تھا کہ یہاں ہر دو فریق سنی اور شیعہ نماز پڑھیں کچھ دنوں تک ایسا ہوا مگر اب صرف اہلسنت کا قبضہ ہے اور دھنو مہری کا امامباڑہ ہونے کے امکان اسی محلہ میں ہیں ۔

ہم حلقہ سعادت گنج دھنو مہری کے پل پر بحث کرتے ہوئے امامباڑہ کے جو حالات قلمبند کر چکے ہیں وہ اسی محلے کے معلوم ہوتے ہیں ۔

مولوی گنج میں سکندر شکوہ کی ایک کوٹھی کا بھی پتہ صفحات تاریخ سے لگتا ہے جس میں مرزا محمد عباس شکوہ متولی امامباڑہ سکندر شکوہ رہنے لگے تھے اور مذہب اہل تسنن ہونے سے وقف سے دلچسپی نہ تھی ۔

بوستان العاشقین:۔ ۲؍ دسمبر ۱۸۶۸ء کو منشی مادھو لال نے مولوی گنج سے یہ ہفتہ وار اخبار جاری کیا (نیا دور دسمبر ۱۹۵۹ء)

(نوٹ) امامباڑہ داراب علی خاں اس وقت مولوی گنج میں شمار کیا جاتا ہے مگر قدیم تاریخ نے اس کو احاطہ فقیر محمد خاں میں قرار دیا ہے اس لئے یہاں اس کا ذکر نہیں ہے ۔

رسّی بٹان

یہ محلہ بھی مولوی گنج سے ملا ہوا پرانی بستی ہے یہاں رسیاں بٹی جاتی تھیں ظریف کا شعر ہے ؎

اس محلہ میں رسائی ہو تو جا کر دیکھیو　　شام کو رسّی بٹوں زلف رسا آتی ہے

امامباڑہ امیر محل:۔ اوسط درجہ کی خوبصورت عمارت ہے امیر محل سلطان عالم واجد علی شاہ کی ملکہ تھیں موصوفہ نے یہ آراضی داروغہ کرامت حسین افسر نزول کے ذریعے خرید کر امامباڑہ بنوایا اور ۱۶؍ محرم ۱۲۶۹ھ کو جب سلطان عالم کلکتہ روانہ ہوئے تو مہر ادا کر کے چھ محلات کو طلاق دیدیا تھا امیر محل انہیں بیبیوں میں تھیں امیر محل اپنے زمانے کی بہترین خطاط تھیں اور نسخ میں ان کا جواب نہ تھا میرے پاس ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن مجید کے کچھ ورق ہیں جو حسن خط پختگی شان تحریر میں بہترین یادگار ہیں امیر محل کی جائداد بارہ بنکی میں بھی موجود ہے لکھپیڑا سرائے امیر گنج ان کی اولوالعزمی اور غریب پروری کی یادگار ہیں

بارہ بنکی میں بھی امیر محل نے امامباڑہ اور مسجد تعمیر کی جس کے نیچے دوکانات ہیں مسجد کا قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

گفت اختر سال تعمیرش چناں　　ذکر ایں مسجد ببام آسماں ۱۲۸۵ھ

امامباڑہ بارہ بنکی کا مسجد کو دیکھتے ہوئے چھوٹا ہے مولوی گنج کا امامباڑہ عہد شاہی کی عمارت ہے ۔ اس کی سقف نواب امجد علی خاں مرحوم فرزند امیر محل نے اپنے اہتمام سے تبدیل کی تھی ۔ اس امامباڑہ میں امیر محل نے جس شان و شوکت سے مجلسیں کیں اور تبرک تقسیم کیا اس کی نظیر عہد شاہی میں بھی نہ تھی کھیر کی تلفیاں یا پلاؤ کا طباق مجلس کے شریک ہونے والے مزدور کے سر پر لے جاتے تھے اور اتنا وزنی ہوتا تھا کہ خود اٹھا نہ سکتے تھے امیر محل نے ۲۴؍ رجب ۱۳۱۰ھ کو سفر آخرت کیا اور کربلائے تالکٹورہ میں زنجیری پھاٹک کے قریب صحنچی میں دفن ہوئیں ۔ امامباڑہ کے متولی ۱۳۲۵ھ تک میر محمد عابد خاں وقاسم علی خاں تھے ۔

حسان القوم علی نقی صفی نے اس علاقے میں علم و ادب کے نہ بجھنے والے چراغ روشن کئے اور ۲۶ جون ۱۹۵۹ء بعمر ۹۰ سال دنیا سے پردہ کرلیا اور امامباڑہ غفران مآب میں دفن ہوئے۔

ہاتھی خانہ :۔ رستی ٹولہ سے گذر کر یہ محلہ قدیم آبادی میں اب بھی شمار کیا جاتا ہے اس کے دو راستے ہیں پہلا مولوی گنج سے دوسرا امین آباد کے بجلی گھر کے پہلو سے یہاں کسی وقت میں راجہ صاحب بلرامپور کے ہاتھی باندھے جاتے تھے۔

عیش باغ

اس باغ کی بنیاد نواب آصف الدولہ کے ہاتھ سے ہوئی اور یہ موتی جھیل کے کنارے جانب شرق تھا اور چار طرف خوشنما اور بلند پھاٹک تھے۔ اس باغ کی شہرت کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ نواب کے زمانے میں ساون کا میلہ بڑی دھوم سے ہوتا تھا۔ اودھ کے کمالات اور فنون لطیفہ کے مظاہرے، مشرقی صنعت و حرفت کے منظر دیکھنے خلائق کھنچ کھنچ کر آتی تھی۔ تاریخ میں ہے[1] "موتی جھیل پانی کا چشمہ زندگانی کی آب و تاب دکھاتا ہے پیاسوں کا دل ہرا ہے۔" اس چشمے میں اتنی گہرائی اور گنجائش تھی کہ بڑے بڑے پیرنے والے اپنی پیراکی کے جوہر دکھلاتے تھے ؎

سنتے ہیں موتی جھیل میں بھی پانی آگیا   تیرا کیاں بھی ہونے لگیں پھر امتحاں

اس نہر کی تیاری کے بعد عیش باغ میں اور زیادہ چار چاند لگ گئے آصف الدولہ کے نے پالک وزیر علی خاں کی شادی کا جلسہ عیش باغ اور چار باغ میں ہوا۔ اس وقت تمام درخت سنہری اور روپہلی بادلے سے منڈھے ہوئے تھے نوابی ختم ہوتے پر شاہی کا آغاز ہوا اور ہر بادشاہ نے عیش باغ کو کچھ نہ کچھ ترقی دی۔ عہد اختری کے شاعر نے اسی باغ کی مدح میں کہا ہے ؎

رہتا ہو لکھنؤ میں جسے جائے عیش باغ   تکلیف سیر ہم کو نہ دیں یار و مہرباں

پھرتے ہیں عیش باغ میں دل باغ باغ ہے   ہر ایک سرو قد کے بغل میں ہے بوستاں

ایک شخص لکھنؤ سے کلکتہ چلا گیا اس کے دوست نے جدائی کا صدمہ لکھتے ہوئے تحریر کیا کہ لکھنؤ میری نظر میں بغیر تمہارے اجڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس نے جواب میں[2] لکھا۔ اگر حیات باقی ہے تو پھر وہی صحبت اور وہی باتیں اور وہی دن رات کی ملاقاتیں اور وہی شکارا اور وہی عیش باغ کی سیر ہے اور مر گئے تو خاتمہ بخیر ہے"

آتش کہتے ہیں ؎

کوچہ تیرا عیش باغ ملے یار ہے تاویل ہے   چشم اشک آلودِ عاشق اس میں موتی جھیل ہے

عیش باغ کے شروع حصے کو نواب گنج کہتے ہیں۔ نماز عید ۱۸۵۷ء سے عید گاہ کے میدان میں ہوتی ہے عید گاہ میں مسلمانوں کی نماز اور تہر کا میلہ عیش باغ کے وہ منظر تھے جو صفحۂ تاریخ پر باقی رہیں گے۔

کربلائے ملکہ جہاں :۔ اس کربلا کو حضرت محمد علی شاہ بادشاہ کے داروغہ عاشق علی نے بنوایا تھا ملکہ جہاں نے پونے دو لاکھ روپیہ معاوضہ دے کر چھوٹے حضرت کا روضہ بنوایا ان روضوں کے چاروں طرف چار عظیم الشان خشتی پھاٹک تھے جس کی محراب کے پہلوؤں پر مصالحے سے شگفتہ دار علم اور اوپر آیات قرآن لکھے تھے۔ ایک سمت دوکانوں کا پتہ بھی تاریخ سے ثابت ہے۔ خواجہ محمد وزیر نے اس

---

[1] فسانۂ عجائب مؤلفہ رجب علی سرور   [2] انشائے بہار بے خزاں ص۲

کربلا کا سن تعمیر "باغ کربلا" سے نکالا ہے اور عمارت کی تکمیل ۱۲۵۶ھ میں ہوئی۔ کربلا کے متعلق جو آراضی ملکہ جہاں نے لی تھی وہ چوالیس بیتالیس بیگھہ سے کم نہ تھی اور اس کا نام چک کربلائے حیدری رکھا تھا۔ کربلا کی تعمیر کے بعد عیش باغ میں تفریح کے سامان کے ساتھ مذہبی آثار بھی نظر آنے لگے مسجد خانہ، روضہ حضرت عباس اور روضہ حر بھی اس کربلا کی واحد خصوصیت ہے۔

غدر ۱۸۵۷ء اور عیش باغ:۔ عیش باغ کی مرکزیت کا تقاضہ تھا کہ اس آبادترین حصہ شہر کو تباہی کا بھی خطرہ ہو منڈیاؤں کی لڑائی کے بعد دوسرے دن صبح کو جنگ آزادی کے حامی عیش باغ میں پچاس[1] ہزار آدمیوں کی تعداد میں جمع ہوئے اور انگریزوں کے خلاف تقریریں ہوئیں بیباک شاہ نے تارہ والی کوٹھی سے اٹھ کر عیش باغ میں ڈیرہ ڈالا اور ۲۵ مارچ کو انتظام کی طرف سے پروانہ جاری ہوا کہ ان کو عیش باغ کے[2] باہر کردیا جائے۔

انگریزی لشکر جب بسواں اور باڑی کی سمت روانہ ہورہا تھا اور احمد اللہ شاہ اور فراز شاہ کو شکست دیکر پھر لکھنؤ واپس ہوا تو عیش باغ آٹھ مہینے فوجوں کی گذرگاہ بنا رہا اور احمد اللہ شاہ جنگ آزادی میں پوری بہادری کے ساتھ بمقام نیوائین کسی زمیندار کے ہاتھ سے[3] مارے گئے۔ عیش باغ ہی وہ جگہ تھی جہاں احمد اللہ شاہ انگریزی گورکھا فوج سے لڑے اور دست بدست جنگ میں گھوڑے پر سوار ہوکر عیش باغ کو رزم گاہ بنایا اور جس گروہ سے انگریزوں کا ٹکراؤ ہوتا تھا ان کو مدد پہونچائی یہاں تک کہ جنگ آزادی کے حامی اپنی کمزوری اور اقلیت سے ٹھہر نہ سکے۔ ۲ جولائی کو جب سر ہنری لارنس چیف کمشنر اودھ بیلی گارد کے قلعہ میں گولی سے مارا گیا تو دسویں ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ ۳ جولائی کو احمد اللہ شاہ نے لکھنؤ میں تھانہ بنائے اور حامیان آزادی کی طرف سے امن وامان کا اشتہار[4] دیا اور باشندگان شہر کو جتایا کہ سلف سے ہندو مسلم امن وامان میں بسر کرتے رہے تھوڑی مدت سے قوم انگریز اس مملکت پر قابض ہوکر ان دونوں گروہوں کے ایمان کی خواہاں ہے بدیں وجہ ان کو مملکت ہند سے خارج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اس کشت وخون اور مورچہ بندی میں عیش باغ ایسا تباہ ہوا کہ تمام دلفریب مناظر مٹ گئے عمارتیں ڈھا دی گئیں۔ کربلا کے کئی پھاٹک فنا ہوگئے اور صرف روضہ باقی رہ گیا۔ انگریزوں نے عیش باغ میں قلعہ اسی وجہ سے بنایا کہ وہ ان کے فتوحات کی یادگار رہو۔ انگریزی راج میں عیش باغ میں زمین پر سور اور بندر درختوں پر چمگادڑیں اور ہر طرف ویرانہ نظر آیا۔ اور بربادی کے موقع پر عیش باغ کی مثال دی جانے لگی۔ اس تباہی کے بعد شہر کے کچھ بے فکر لوگ عیش باغ میں میدان پاکر کنکوا لڑانے کے لئے ادھر کا رخ کرتے تھے۔ ظریف کا یہ شعر بتاتا ہے؎

رہیں میدان قلعہ میں دن بھر　　ڈور کے گولے چرخیاں لے کر

عیش باغ میں قلعہ اور واٹر ورکس انگریزوں نے بنایا اور قلعہ کی ضرورت نہ رہنے پر اس کو ۱۳۳۲ھ میں منہدم کرکے دوسری عمارتوں میں جگہ استعمال کی "پانی گھر" اب بھی موجود ہے۔

حکایت:۔ نواب مرزا صادق علی خاں بہادر خاندان شجاع الدولہ کے معزز رئیس مصاحب گنج میں رہتے تھے ان کا معمول تھا کہ ایک جھکاؤیں ہزار ڈنڈ پیلتے تھے اور کچھ سنکھیا برفی میں ملاکر ڈنڈ کے بعد نوش کرتے تھے۔ ایک بار عیش باغ کے میلے کی سیر دیکھنے گئے چار پہیہ کی گاڑی جس میں کوچ باکس بھی لگا تھا کوچ مین گاڑی ہانک رہا تھا اس کے پہلو میں نواب کا بٹیر باز بیٹھا تھا اور رفتار سامنے

۱؎ نیا دور اگست ۸۳ء ص ۳۳　۲؎ ص ۲۶　۳؎ احسن التواریخ ص ۱۰۱　۴؎ ص ۲۶

کی سیٹ پر تھے میلے کے شور سے گھوڑے نے بدلگامی کی اور گاڑی جھیل کے اندر چلی شہنشاہ دولہ بہادر جلدی سے گاڑی سے کود پڑے اور پہیئے کے اندر ہاتھ ڈال کر آرے کو پکڑ لیا لاکھ گھوڑا بھڑکا گاڑی ہل نہ سکی یہاں تک کہ سب آدمی نیچے اترے اور سائیس نے گاڑی سے گھوڑے کو کھول لیا۔ بٹیر باز نے کہا کہ حضور میری کابک کوچ بکس پر رہ گئی ہے۔ نواب نے فرمایا کابک بھی اتار لو۔ بٹیر باز گاڑی پر چڑھا اور کابک اتاری اس کے بعد نواب نے ہاتھ نکال لیا اور گاڑی جھیل کے اندر چلی[1] جا رہی۔

ہنڈولنے کا ناکہ

اردو میں ہنڈولنا بچوں کے پالنے اور جھولے کو کہتے ہیں۔ پاؤں پاؤں چلنے کے لئے جو مثلث لکڑی کے تین پہیوں کی ننھی گاڑی بنائی جاتی ہے۔ عیش باغ سے گذر کر یہ ناکہ ہے جہاں سے ایک راہ بڑے اسٹیشن چار باغ کی سمت اور دوسری امین آباد جاتی ہے۔ عیش باغ میں موتی نگر کی جدید آبادی جو کانگریس راج کی نئی بستی ہے اس کی بنیاد کے ساتھ ہنڈولنے کا ناکہ آباد ہونا شروع ہوا اور گذرگاہ عام ہونے سے ۲۰ برس پہلے جو ویرانہ تھا وہ دور ہو کر اس حد پر آبادی سے تبدیل ہوا کہ اب پولیس کے ذریعے سے گاڑیوں اور سواریوں کی نقل و حرکت ہوتی ہے ورنہ تصادم ہو جائے۔ اس چوراہے پر قدیم آثار میں اسٹیشن جاتے ہوئے داہنے ہاتھ پر

<u>نقی میاں کی مسجد</u>:- یہ عمارت اسٹیشن جاتے والے ہر شخص کو نظر آتی ہے اور بخلاف دوسری مسجدوں کے کئی گنبد اور خوبصورتی اپنی طرف نگاہ کو دعوت دیتی ہے بڑی کاوش اور عرق ریزی کے بعد مجھے اس مسجد کے بانی کا نام اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ نقی میاں عہد شاہی کے ایک شخص تھے ان کے پوتے پیر بخش نے گاؤں میں رہتے تھے۔ مسجد اوسط درجے کی بلندی پر ایک تنگ زینے کے بعد اچھی حالت میں ہے چبوترے پر صحن میں نیا سائبان پڑا ہوا ہے۔ محرابوں پر گلکاری اور چھت میں خوشنما گل بوتے دیکھنے کے قابل ہیں نمایاں گنبد تو تین ہی ہیں مگر ان کے گرد چھوٹے گنبد پوری سطح کو اس خوبصورتی سے گھیرے ہوئے ہیں کہ سقف پر چلنے والے کو پاؤں رکھنے کی جگہ مشکل سے ملے گی۔ مسجد کے گرداگرد پھر کر شمار کیا جائے تو ممکن ہے کہ گنبدوں کی تعداد بارہ ہو جائے گوشے میں مؤذن کا حجرہ اور اسی سمت ایک جدید درجہ خارج مسجد بھی ہے جو قدیم عمارت کے کسی حصے کی جگہ ہے۔ پورب کی طرف بیت الخلا اور پانی کا نل اور ایک چھوٹا کنواں ہے جو عہد قدیم کی یادگار ہے مسجد کے تین طرف دوکانات ہیں جن کا دور حاضر کی آبادی بڑھنے سے پہلے آٹھ آنہ ماہوار کرایہ تھا اور محمد چکوا اس کرایہ پر تینتیس[3] برس گوشت بیچتا رہا۔ اب اس کا بڑھاپا اور آخری وقت ہے اور اس کی دوکان مسجد سے کچھ دور واقع ہے۔ اس کا بیان ہے کہ مسجد کی موجودہ آمدنی ڈیڑھ سو روپے ماہوار ہے۔ عہد شاہی ختم ہونے پر اس مسجد میں مولوی ہدایت رسول صاحب مشہور مقرر اسلام کے خسر امامت کرتے تھے پھر مولوی صاحب امام مسجد رہے۔

امین آباد

اس محلہ کو پرانے لکھنؤ کا آخری حصہ کہنا کچھ بیجا نہیں ہے اس کے بعد نیا گاؤں شہریت کے اختتام کا ثبوت ہے۔ یہ آراضی دراصل سکندر شکوہ کی آباد کردہ ہے۔ اس وقت اس کا نام "مسرت[4] نگر" تھا اور بعض "سکندر آباد" کہتے تھے۔ سکندر شکوہ شاہ

۱؎ قدیم بزم ص۱۵ ۲؎ جریدہ سرفراز لکھنؤ مورخہ ۷ مئی ۱۹۵۵ء

عالم کے چشم و چراغ تھے ان کی موت کے بعد ان کی بیگم جائداد پر قابض رہیں اور انہوں نے ۲۸ ہزار کو نواب امداد حسین خاں امین الدولہ کے ہاتھ بیچ دیا۔ ان کا پورا خطاب امین الدولہ ذوالفقار جنگ تھا امین الدولہ نے لاکھوں روپیہ صرف کرکے بازار اور مسجدیں اور کوٹھیاں اور باغ بنوائے اور اپنے لقب پر نام "امین آباد" رکھا

نسانہ امین الدولہ میں امین آباد کا نقشہ یہ تھا کہ چاروں طرف چار پھاٹک اور ہر گیٹ پر ایک مسجد۔ پھاٹک نہ رہے مگر مسجدیں اب بھی غیر منظم صورتوں میں موجود ہیں بڑا دروازہ پچھم کی سمت تھا۔ اور اس طرف کی مسجد کو "کلاں پھاٹک کی مسجد" اس وقت بھی کہتے ہیں۔ پچاس برس پہلے اس مسجد کی ایک شائع شدہ رپورٹ میں یہ لفظیں ہیں: "نواب امین الدولہ کے مغربی پھاٹک کی مسجد" ہر مسجد میں باتنخواہ پیش نماز مقرر تھا مولوی سید علی حسن جائسی جو بڑے جید عالم تھے پیش نمازوں میں تھے آٹھویں دن جمعہ کو وعظ ہوتی تھی ہر مسجد کا امام دوسری مسجد کے امام کی اقتدا میں نماز پڑھتا تھا۔

امین الدولہ کے آغاز وزارت میں مرزا فصیح مرحوم مشہور شاعر کا آخری دورِ حیات تھا اور کلیاتِ فصیح میں مدح امین الدولہ میں جا بجا قطعات اور متفرق شعر[1] نظر آتے ہیں۔ وہ بڑے مخیر اور مذہبی آدمی تھے ان کی مدح میں یہ مشہور شعر ہے ؎

اے شان حیدری ز جبین تو آشکار   نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار

عہد شاہی کے واقعہ نگاران کو "عابد شب زندہ دار" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں مفتی میر عباس صاحب نے ان کی مدح میں اقرار کیا ہے ؎

برج حصن مملکت محکم از دست   دین و دولت در پناہ ہم از دست

وزارت کے عہدے سے جب دست کش ہوئے تو رعیت کے دل میں پھر ان کی وزارت کی تمنا تھی ؎

الٰہی بحق جناب امیر   وزیر رسول بشیر و نذیر

کہ بازش باوج وزارت رسان   ز عہدش بدلہا بشارت رسان

مہ رفعتش تا بہ یوم التناد   ببرج امارت درخشندہ باد

امین الدولہ نے جو علمی خدمات انجام دئے وہ اس لٹریچر سے واضح ہیں جو ان[2] کے اشارے پر چھپا اور جو کتابیں مختلف اہل علم نے ان کے نام پر معنون کیں۔ امین الدولہ کے خاص خدمت گاروں میں احمد علی تھے جو سلطان العلماء کی سفارش سے چار روپیہ ماہوار پر نوکر تھے۔ امین الدولہ بعض اوقات ان سے امین آباد کی مسجدوں کی وعظ کو پوچھتے تھے

گلاب باڑی :۔ اس حلقہ کے ایک خوبصورت باغیچے کا نام تھا اس کا پھاٹک نظیر آباد کے چوراہے پر تھا گھنٹہ گھر پارک اسی باغ کی آراضی پر ہے۔

امین الدولہ کا باغ :۔ یہ وہ پارک ہے جس میں ۱۹۱۶ء سے قومی اور سیاسی جلسے ہوتے ہیں اور صوبہ کی سیاسی جماعتوں کے جھنڈے لہراتے ہیں امین الدولہ کی بارہ دری اما مباڑہ سکندر شکوہ کی جانب غرب تھی اور یہ عمارت وزیر موصوف نے اپنی حیات ہی میں اپنی بی بی عباسی خانم کو ہبہ کر دی تھی اور وزیر منزل نامی عمارت بھی اسی جگہ تھی اور یہ امین الدولہ کا ملاقاتی قصر تھا اس کے بعد

---

[1] مراثی فصیح ج ۲ ص ۲۶۷   [2] نصر المومنین فی تفضیل الرسول الامین

دوسرے لوگ اس پر قابض ہوتے رہے اور آخر میں شیخ فرزند علی نے کیں نے خریدا اور سنہ ۱۹۰۹ء میں افسر جہاں زوجہ ممتاز حسین بیرسٹر نے دس ہزار روپے کو خریدا۔

<u>شاہی کوٹھی</u> :- امین الدولہ کے قبضے سے پہلے یہ دو منزلہ کوٹھی عہد امجد علی شاہ کی بنی ہوئی موجود تھی جس میں بقول[1] شیخ تصدق حسین ایڈوکیٹ لکھنؤ پہلے مئی سنہ ۱۸۶۴ء میں کیننگ کالج کھلا اور جب کالج کی عمارت قیصر باغ میں تیار ہو گئی تو سنہ ۱۸۷۸ء میں کالج اپنی ذاتی عمارت میں پہونچا دیا گیا اور اسکول سنہ ۱۸۹۰ء میں جوبلی میں شامل کر دیا گیا اور یونیورسٹی ہو جانے پر درسگاہ کو بادشاہ باغ میں لایا گیا یہ کوٹھی امین الدولہ کے بعد ان کے بیٹے شرف الدولہ ضیغم الملک احمد حسین خاں کے قبضے میں آئی کیننگ کالج میں مولوی سید علی نقی صاحب ایک باکمال شیعہ عالم اور دوسرے مولوی فضل اللہ صاحب فرنگی محلی عربی اور فارسی کورس پڑھاتے تھے۔

<u>بیڑائن کا باغ</u> :- اس باغ کا بھی پتہ نہیں ہے صرف بیڑائن کی زمین دوز بغیر زینے کی مسجد موجود ہے جس کے اونچے منارے لمبا چوڑا صحن خوبصورت اور بہترین نمونے کے دوسری مسجدوں سے علیحدہ وضع کے گنبد پہلو میں داہنے ہاتھ کی طرف ایک بڑا حوض اور کچھ آراضی جس پر ممکن ہے کہ عمارت ہو۔

بیڑائن کا باغ سنہ ۱۲۲۶ھ ڈیڑھ سو برس پہلے تک موجود تھا رقعہ[2] نمبر ۴۹ میں ہے " دیروز کہ شانزدہم ربیع الثانی سنہ ۱۲۲۶ھ روز چہارشنبہ بود دستگیر در باغ بیڑائن کہ از حضور میاں آفریں مرحمت شدہ" واقعہ یہ تھا کہ نواب برہان الملک نے جو شادی محمد تقی خاں صوبیدار اکبرآباد کی لڑکی سے کی تھی اس کے ساتھ ایک لونڈی خدیجہ خانم تھی۔ نواب کی بیاہتا بی بی کے مرنے پر یہ کنیزان کی رفیقۂ حیات بنی اور اس سے سنہ ۱۲۰۲ھ میں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام صدر النساء رکھا گیا خدیجہ خانم نے جو باغ لگایا تھا یہ اس کی مسجد ہے اس کے ساتھ ایک حمام بھی مسماۃ جے کنور کی معرفت بنا جس کا پتہ نہیں ہے جے کنور قوم کی پنڈتائن تھیں مگر اسلام لے آئی تھیں عوام نے اس لفظ کو بیڑائن کر دیا خدیجہ خانم جب قید زندگانی سے آزاد ہوئیں تو اپنی ہی زمین پر سپرد خاک ہوئیں۔ امین الدولہ پارک میں جو اس وقت ہشت پہل چبوترہ ہے وہ انھیں کی قبر ہے اور شہید مرد کا مزار سمجھنا غلط ہے قبر پر جو عمارت تھی وہ سنہ ۱۹۱۲ء میں گر گئی۔

<u>گونگے نواب کا باغ</u> :- آپ کا نام اور لقب شرف الدولہ ضیغم الملک احمد حسین خاں تھا گونگے تھے اور اشاروں سے بات کرتے تھے۔ ان کا عکس کربلائے امین الدولہ کے برآمدے میں فریم میں آویزاں ہے کلاں کوٹھی آپ کا آبائی ورثہ تھا۔

<u>امامباڑہ سکندر شکوہ</u> :- آپ شاہزادہ مرزا محمد اکبر شاہ دہلی کے حقیقی بھائی تھے باغ بیڑائن میں آپ نے امامباڑہ بنوایا۔ جس کی تعمیر عہد نواب سعادت علی خاں میں باہتمام جنرل میکلوڈ انجینئر ہوئی نواب اکثر صبح کو اس امامباڑہ کی تعمیر دیکھنے آتے تھے اور ان کے مناسب مشوروں سے اس کی تکمیل ہوئی۔ امامباڑہ کے سامنے کوٹھی اور محلسرا بھی بن کر تیار ہوئی امامباڑہ کے ساتھ زنانہ امامباڑہ لنگرخانہ درباری کوٹھی مسافر خانہ اور ۴۲ قطعہ محلسرائیں تھے اور سات سو دوکانیں اور کئی قطعہ حمام اور مساجد، اصطبل، فیلخانہ اور ایک باغ ترشاداتھا سنہ ۱۲۰۵ھ میں اس کی تکمیل ہوئی اس امامباڑہ کو یہ بھی خصوصیت حاصل ہے کہ بانی امامباڑہ نے اپنے بھتیجے بہادر شاہ ظفر کو بزمانہ ولیعہدی لکھنؤ دعوت نامہ بھیجکر قطعہ آراضی کی آرزو

---

[1] ملاحظہ ہو الواعظ بابتہ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۲۶ء [2] رقعات مرزا قتیل ص ۳۲

ظاہر کی اور جو پتھر نصب ہوا وہ نواب سعادت علی خاں اور بہادر شاہ نے نصب کیا تھا اس پر یہ عبارت کندہ تھی ——

"لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی ولی اللہ وصی رسول اللہ۔

چوں سکندر شکوہ کرد بنا — مقام تعزیہ شہ آں امام جن و بشر
بسینہ کوباں و چشم نم تاریخ — قلم گرفت رقم زد کہ روضۂ اطہر

انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اہل البیت و یطہرکم تطہیرا کتبہ ابو ظفر سراج الدین محمد و سعید محمد اکبر شاہ غازی دہلی ۱۲۶۲ھ۔ اس تاریخی پتھر کے نقش ہونے کے بعد ایک عظیم الشان مجلس منعقد ہوئی جس میں بہادر شاہ مع اپنے رفقا اعزا اور علمائے کرام، رؤوسائے شہر اور نواب سعادت علی خاں اور دیگر ارکان سلطنت شریک تھے بعد مجلس شرکائے مجلس کے سامنے کل جائداد وقف کی گئی جس کی آمدنی ۳۰ ہزار روپے سالانہ تھی اور مرزا محمد عباس شکوہ متولی ہوئے جو سنت جماعت تھے۔

دارو غہ مرزا قتیل ان کی طرف سے جائداد کا انتظام کرتے رہے وہ بھی شیعہ نہ تھے وہ ہر جمعرات کو اپنے والدین اور دیگر عزیزوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے جاتے تھے عباس شکوہ نے اپنے والد سکندر شکوہ کو مردانہ بڑے امام باڑے میں دفن کیا تھا اور ان کی ماں بھی اسی جگہ مدفون تھیں اور حسب وصیت سکندر شکوہ دارو غہ مرزا قتیل بھی دفن کئے گئے۔ سکندر شکوہ کی قبر پر سبز رنگ کا بیش قیمت پتھر نصب تھا اور دوسری قبروں پر بھی قیمتی پتھر لگے تھے یہ امام باڑہ جس کا اب کہیں نشان نہیں ہے چوہدری خلیق الزماں اور محمود علی بڈی والے کی ممبری کے دوران ممتاز حسین بیرسٹر کے قبضے میں آیا اور بحیثیت سکریٹری انجمن اصلاح المسلمین صرف تین ہزار روپے کو ۱۹۳۹ء میں میونسپل بورڈ سے خرید کر دار الیتامیٰ کھولا۔

کھجور والی کوٹھی:۔ پڑائن کی مسجد کے قریب تھی اس کا ایک حصہ اور کھجور کا درخت اب تک موجود ہے اس میں خاندان شاہی کے ایک معزز رکن پرنس مرزا ہمایوں قدر بہادر رہتے تھے ان کے بیٹے مرزا مسعود قدر حیدر آباد چلے گئے اور وہیں ان کی رحلت ہوئی۔ عبدالحلیم شرر نے بانک جاننے والوں کے سلسلے میں ہمایوں قدر کا ذکر کیا ہے بڑے خوش مزاج، خوش فکر جوشیلی طبیعت کے رئیس تھے ان کے گھر میں جو کوری ڈلی کتری ہوئی کھائی جاتی تھی اور اس ڈلی کے دیکھنے والے موجود ہیں جو بتاتے ہیں کہ ڈلی باریک ہونے کے ساتھ مربع صورت کی ہوتی تھی اور ہر دانہ اس صفت سے خالی نہ تھا۔

اس زمین پر جو عمارتیں بنی ہیں ان میں :——

مسجد خواص:۔ یہ مسجد امین آباد انٹر کالج کی سائڈ میں ہے حسن خواص، حسین خواص دو بھائی تھے سنی شیعہ یہ مسجد حسن خواص اور ۱۲۰۲ھ کی تعمیر ہے سقف مسجد سرتاسر بغیر گنبدوں کے تربتی قبر کا نمونہ ہے مسجد مسلمانوں کی توجہ سے اچھی حالت میں ہے۔ خواص کا امام باڑہ بھی تھا جو کھد گیا اور اب نہیں ہے۔

نیا گاؤں

لکھنؤ کی زمین جب باشندگان شہر کی کثرت سے تنگی کرنے لگی تو امین آباد کے پچھواڑے نیا گاؤں بسایا گیا اور یہاں کے معزز اور تجارت پیشہ باشندوں میں :——

نواب اصغر جان:۔ آپ مشکور الدولہ عہد شاہی کے فوٹوگرافر کے بیٹے تھے پرانے طرز کی تصویریں جو قدیم البموں اور میوزیم

میں نظر آتی ہیں یہ مشکور الدولہ اور اصغر جان ہی کی صنعت ہے تو تو نمائش میں سینئر ہونے کی وجہ سے انہوں نے بہت بڑی عزت اور دولت حاصل کی کوچہ میر جان امین آباد میں آج تک موجود ہے یہ بھی مشکور الدولہ کی نسل سے تھے اور قدیم شان و شوکت کی یادگار تھے نواب اصغر جان کی بہن کے بیٹے حسن بہادر تھے جو ڈپٹی صاحب کے نام سے مشہور تھے تعزیہ بنانا جانتے تھے اور ان کے ہاتھ کی ضریحیں، تابوت، تعزیہ لوگ بڑے شوق سے خرید تے تھے۔ کئی مرتبہ عراق اور ایران کا سفر کر چکے تھے اور آتشک کے علاج میں بڑی کامیاب دوا ان کو معلوم تھی جو مریض کو چلم میں رکھ کر پلاتے تھے اور سارا دکھ جاتا رہتا تھا محرم ۱۳۷ھ میں بہت بوڑھے ہو کر دنیا کو چھوڑا اور ملکہ جہاں کی کربلا میں روبرو مسجد دفن ہوئے نسخہ اپنے سینے میں ساتھ لے گئے۔

<u>مرزا حسین علی بیگ</u> :۔ آپ نئے گاؤں کے ایک امامباڑہ پر قابض تھے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس کا بنا کردہ تھا بابو ہری ناتھ بنرجی نے یہ امامباڑہ خرید کر منہدم کر دیا اور ایک عالیشان کوٹھی بنوائی۔ اس کوٹھی میں رہنے کے ساتھ ہی بنرجی مختلف مصیبتوں کا شکار ہونا شروع ہوئے اور ان کا ایم اے، ایل ایل بی لڑکا جوانی کے دنوں میں وکالت کی پریکٹس کر رہا تھا کہ پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا اور محنت کا پھل پانے سے پہلے دنیا چھوڑ دی ادھر دوسرے لڑکے پنچا نند بنرجی کا دماغ خراب ہو گیا۔ لڑکی نے کسی خانگی معاملے میں کوٹھے پر اپنے کپڑوں میں آگ لگا کر خودکشی کی اور کئی موتیں اس گھر میں ہوئیں۔ بابو ہری ناتھ بنرجی سوتے میں ایک سفید پوش شخص کو آتے جاتے دیکھتے تھے اور مرعوب ہو کر کوٹھی کے گوشے گوشے میں جمعرات کو اگربتی اور لوبان سلگاتے تھے یہاں تک کہ وہ بھی گذر گئے اور ان کا چھوٹا لڑکا واسو باپو جس کی امین آباد پارک میں کپڑے کی دوکان تھی اس کوٹھی کو چھوڑ کر گنگنی شو کل کے تالاب پر اٹھ گیا اور اس کوٹھی میں ہندی چھاپہ خانہ کھلا اور گنگا پستک مالا وغیرہ چھپتا رہا۔ کچھ دن کے بعد پریس بھی ختم ہو گیا اور ایک بنگالی نے ٹوڈر کس کھولا اور شیشیوں کے کاگ بنتے رہے۔

<u>ڈاکٹر سید علی عباس</u> :۔ آپ نئے گاؤں کے مشہور لوگوں میں تھے ۱۸۹ء میں آپ نے مرزا حسین علی بیگ مذکور سے کچھ جائداد اور دو احاطے خریدے یہ وہ وقت ہے کہ مرزا حسین علی بیگ جو کھلونے بنانے میں تاجرانہ فروغ حاصل کر کے صاحب جائداد ہوئے تھے مالی کشمکش میں مبتلا تھے اور ان کا کاروبار ختم ہو رہا تھا فروخت شدہ جائداد میں ایک اوسط درجے کی مسجد بھی شامل تھی اور مسجد کے پچھواڑے کھیت تھے احاطہ مسجد میں دوکاندار اور کرایہ داروں کے نام یہ تھے جان محمد، الہٰی، خدا بخش، دین محمد اشراتی، کریم۔ اس مسجد کی بنانے والی جیسا کہ تعمیری پتھر سے واضح ہوتا ہے عہد شاہی کی ایک خاتون تھیں جن کا نام محراب مسجد پر تحریر ہے مگر امتداد زمانہ سے بغیر صفائی پڑھا نہیں گیا مسجد اور وہ امامباڑہ جس کے انہدام کے واقعات گزشتہ صفحے میں نذر قرطاس ہوئے ایک شخص کی بنا ہے اس مسجد میں ڈاکٹر صاحب اور ان کے خاندان کے لوگ نماز پڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ لاٹوش روڈ نکلی اور پھر احاطہ مسجد سے دوسری چھوٹی سڑک نکل کر لاٹوش روڈ سے ملحق ہوئی اور اس انقلاب میں مسجد سڑک کے کنارے آگئی تو ڈاکٹر صاحب نے مسجد کے وقف عام ہونے کا اعلان کیا اور چونکہ نئے گاؤں میں کئی مسجدیں تھیں اس لئے امتیاز پیدا کرنے کے لئے یہ مسجد لوگوں میں ڈاکٹر صاحب کی مسجد مشہور ہو گئی اب مسجد کے روبرو ہری ناتھ بنرجی اسٹریٹ کا پتھر لگا ہے اور اہل محلہ نے مسجد کو بہت اچھی طرح اپنے انتظام میں لیا ہے ڈاکٹر صاحب کی اولاد جو اس مسجد کی آبادی کا سبب ہوئی پاکستان میں اچھے عہدوں پر سرفراز ہے۔

حکایت:۔ امین آباد سے کسی کا تعزیہ گذر رہا تھا اور ایک انگریز ٹمٹم پر سوار آرہا تھا کہ باجے کے شور وغل سے اس کا گھوڑا بے قابو ہوگیا اس نے ہزار روکا لیکن نہ رک سکا گھوڑے نے بھاگنا چاہا کہ نواب شہنشاہ دولہ نے جھپٹ کر گھوڑے کا اگلا پاؤں اپنے بغل میں دبالیا تین ٹانگیں زمین پر اور ایک نواب کی بغل میں لاکھ لاکھ تڑپا مگر گھوڑا بھاگ نہ سکا۔ جب تعزیہ بہت دور نکل گیا گھوڑے کی ٹانگ چھوڑ دی انگریز نے نواب کا شکریہ ادا کیا کہ اگر وہ اس طرح گھوڑے کو نہ پکڑ لیتے تو بہت سے آدمی کچل جاتے (قدیم ہنر ص۱۱۶)

امامباڑہ فرخندہ محل:۔ تاریخ میں صراحت نہیں ہے کہ یہ خاتون کس زمانے میں تھیں اور کس کی بی بی تھیں امامباڑہ کی اصل عمارت دوہرے درجے پہلو میں صحنچیاں انگنائی کتادہ پرانے طرز کی محرابیں صدر کا حصہ تو وہی ہے پہلوؤں کی عمارت اور دروازے میں زیادہ سے زیادہ تبدیلی ہوئی ہے اور نہیں معلوم کہ فرخندہ محل کے بعد یہاں کس نے سکونت اختیار کی نواب مظفر علیخاں درانی نے ۱۹۳۰ء میں مرمت کرکے اس کو نیا کر دیا۔ یہ عمارت "شکوہ پیلیس" اس وقت مشہور ہے اور رؤسائے نانپارہ کی ملکیت ہے۔

مسجد فرخندہ محل:۔ خانہ خدا کی کرسی بلند اور عمارت چھوٹی مگر خوشنما ہے نماز کے لئے کافی ہے، ربیع الاول کو یہاں سے معصوم علی خاں جوتے والے ایک تابوت اٹھاتے تھے جو بڑے مجمع سے گذرتا تھا اور تمام امراء، رؤسا، عوام وخواص مشایعت کرتے ہوئے امین آباد سے گذرتے تھے۔ مولوی سید علی داد مرحوم صدر الافاضل نے اسی تابوت میں چو لکھی کے نواب کی رعب دار صورت دیکھ کر ان پر "جمد ہر طوفیہ" کی پھبتی کہی تھی۔ نواب کا نام نور الدہر مرزا تھا سر پر بابل نوٹ کی گول پھولدار ٹوپی منہ پر جھکے ر گلمچھے، ٹھڈی سے داڑھی صاف قلمیں رخسار تک صورت سے بادشاہ معلوم ہوتے تھے بااخلاق ایسے تھے کہ ایک غریب شخص کے بلانے پر تابوت میں موجود۔

آغائی مرزا:۔ نئے گاؤں کے رہنے والوں میں آغائی مرزا کا نام نظر انداز نہیں ہوتا پستہ قد مگر تنومند ادھیڑ عمر کے شخص تھے۔ عشرہ اور چہلم کے دن حضرت عباس کے علم کی اتنی بڑی چھڑ اٹھاتے تھے جو گھروں کے اندر سے دکھائی دیتی تھی وہ اس چھڑ کو کبھی کاندھے پر کبھی ہتھیلی پر کبھی شانے پر اور کبھی دانتوں سے اٹھائے رہتے تھے اور اپنے کمالات دکھاتے ہوئے تالکٹورہ جاتے تھے ظریف نے

کہیں عشاق بھی ایسے الم برداشت کرتے ہیں　　　اٹھانا ختم ہے آغائی مرزا پر بڑی چھڑ کا

اب اس کمال کا مظاہرہ ان کے بیٹے کے ہاتھ سے ہوتا ہے ان کو سب چچا میاں کہتے ہیں اور کاظمین میں رہتے ہیں۔ وہ ظاہر کرتے ہیں کہ میں سو برس سے اونچا ہو چکا ہوں بصارت اور دانت باقی ہیں اور کافی طاقتور ہیں میں آثار قدیمہ کی سیر کے سلسلے میں ایک مرتبہ ان کے ساتھ دریا پار جانے اور آنے میں تھک کر لیستہ ہوگیا اور وہ ذرا بھی سست نہ ہوئے ایک مذہبی چھیڑ چھاڑ میں کئی شخصوں پر جھپٹ پڑے اگر بیچ بچاؤ نہ ہوتا تو فوجداری کی نوبت آتی۔

مؤلف قدیم ہنر نے آغائی مرزا کے حال میں بظاہر روزنامہ ہمدم لکھنؤ اخبار کا مضمون نقل کر دیا ہے اس لئے اس نوٹ کا نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے چھڑ اٹھانے میں تمام ہندوستان میں ان کی شہرت تھی اور جسم کے تمام حصوں حتی کہ ناخون گھالیوں پر بہت لمبی چھڑ کو اٹھانے اور سنبھالنے کے علاوہ تلوار دانتوں میں پکڑ کر اس کی دھار پر چھڑ کو اٹھاتے اور سنبھالتے

تھے ۸، ۹ اکتوبر ۱۹۲۵ء کی درمیانی شب میں فالج سے انتقال کیا (روزنامہ ہمدم لکھنؤ جمعہ ۲ اکتوبر ۱۹۲۵ء جلد ۱۳ نمبر ۲۳۶ صفحہ ۵ کالم ۳، اڈیٹر سید جالب دہلوی، قدیم ہمزد ۲۱۲)

مرزا جیون بیگ :- امین آباد میں نئے گاؤں کے مشہور لوگوں میں تھے جن کے کئی بیٹے تجارت میں کافی شہرت اور عزت کے مالک ہوئے ان میں حاجی نواب مرزا صاحب ایک خاص طرز کے نوحہ وماتم کے موجد تھے جو باقر مرزا صاحب حمید کے نظم کردہ نوحے پڑھتے تھے اور عزاداری میں ان کی وجہ سے رونق تھی۔ انسانی ہمدردی، سچائی قول وقرار کا پابند ہونا ان کی خاص صفتیں تھیں سفر زیارت میں کاظمین پہونچکر ان کی رحلت ہوئی لکھنؤ وکراچی میں ان کی اولاد مغربی تعلیم میں بلند ہو کر باعزت حیثیت میں موجود ہے۔

گھسیاری منڈی

گھوڑوں اور مویشیوں کے لئے گھاس چھیل کر بیچنے والے گھسیارے کہے جاتے ہیں اور یہ محلہ گھاس کی منڈی ہے احمد شاہ نے لکھنؤ پہونچکر پہلے آغامیر کی سرا میں پڑاؤ ڈالا تھا پھر گھسیاری منڈی پہونچے۔ پیر اور جمعرات کے دن ان کے پاس حاجتمندوں کا ہجوم نظر آتا تھا واقعہ نگاروں نے حال اور قال کے ساتھ ان کے دوسرے کرتب بھی دکھائے ہیں اس محلہ کے مشہور لوگوں میں۔

نواب آغا علی حسن خاں :- اس قدر موٹے اور لحیم وشحیم تھے کہ ان کے قد وقامت کا شہر میں دوسرا شخص نہ تھا ان کے نفاست مزاج اور تنومندی کی وجہ سے خود آب دست کرنا ممکن نہ تھا اور کہا جاتا ہے کہ ہاتھ نہیں پہونچ سکتا تھا۔ لونڈیوں کے ذریعے اس طرح طہارت ہوتی تھی کہ گاڑھے کی لنگیاں خادمہ لئے ہوئے ایک ادھر اور دوسری ادھر اور منہ پر اندھیری ڈالے ہوئے سقہ پانی ڈالتے ہوئے ازالہ نجاست کے بعد مشکوں سے پاک کر کے چوکی سے برآمد ہوتے۔ ان کی ڈیوڑھی پر نوکر چاکر، مصاحب، پیش خدمتیں، مغلانیاں، آتو، داروغہ، خواجہ سرا، باورچی، سواری سب کچھ تھا اور پھاٹک میں ایک بڑا قمقمہ فٹبال کے برابر لٹکتا تھا۔ موصوف کے دسترخوان سے بادشاہ کے لئے روغنی روٹی اور گھی جاتا تھا روغنی روٹی موٹے کاغذ سے زیادہ دبیز نہ ہوتی تھی اور ممکن نہ تھا کہ چتیاں پڑکے داغدار ہو جائے یا کچی رہ جائے ان کے نواسے سید شفیع علی خاں صاحب شیدا بڑی آن بان کے رئیس تھے اور لکھنؤ کے باقی ماندہ رؤسا میں ممتاز تھے ۱۹۳۰ء میں انتقال کیا۔

نانپاؤ :- غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہر سمت انگریز بہت پھیل جانے پر خورد ونوش میں بھی ولایتی مذاق کی چیزیں بازار میں آئیں اور ڈبل روٹی کی دکان گھسیاری منڈی میں صرف ایک تھی۔ انگریزوں سے نفرت رکھنے والی وہ پبلک جس نے فوج کو ابھار دیا تھا کہ کارتوسوں میں سور کی چربی ہے اس کو شبہ ہوا کہ ڈبل روٹی میں شراب ملی ہے اس بدظنی میں مولویوں سے فتوے حاصل کئے اور ممتاز العلما فخر المدرسین نے یقین نجاست نہ ہونے کی صورت میں استعمال کا حکم دیا۔

مسجد حمیدہ خانم :- یہ مسجد عہد شاہی ۱۲۶۱ھ میں بظاہر بیادگار دوازدہ صد سالہ واقعہ کربلا بنائی گئی روکار پر جو کتبہ ہے وہ پڑھا نہیں جاتا۔ آخری قطعہ تاریخ کی لفظ واسلام ہے مسجد سے متصل امامباڑہ تھا جو مصطفٰے منزل نام مکان کی صورت میں ہے مسجد کی خصوصیت اول یہ ہے کہ حوض ہشت پہل ہے دوم یہ کہ مینار کمرکی ہیں اور ہر رخ سے نئے انداز سے دکھائی دیتی ہے۔

ے اخبار طلسم مورخہ ۱۶ نومبر ۱۸۵۶ء

مینارے کا بالائی حصہ گرنے پر سنترہ کے برابر طلائی پتر کی گڑی نکلی اور مسجد کے حجروں سے کھدائی میں ہاتھی کی بیش قیمت جھول برآمد ہوئی عمارت اولاً کلے نواب کے قبضے میں پھر امیر مرزا نواب کی تولیت میں اور اب ان کے داماد پنے صاحب ستحر متولی کی نگرانی میں ہے۔

دوسرا بڑا امام باڑہ :۔ آگے بڑھ کے تھا جو راجہ نانپارہ کے قبضے میں اور اس کے روبرو گھاس بکتی ہے اس جگہ کو ارگڑھا کہتے ہیں تانگے والے یہاں رہتے ہیں ۔

خیالی گنج

یہ محلہ بھی نواب آصف الدولہ کا آباد کردہ ہے اور پرانی بستی ہے آخری تاجدار اودھ نے اس مقام کو دو ہزار تین سو زراع زمین اپنی بیگم سلطان محل کو دی تھی اور موصوفہ فرمان شاہی سے اس پر قابض تھیں دارو غہ میر واجد علی منتظم تھے خیالی گنج میں زیادہ ترنئے طرز کی کوٹھیاں، دوکانات اور بلڈنگیں ہیں آثار قدیمہ ختم ہوگئے ۔

نظیر آباد

میر نظیر علی ولد دارو غہ میر واجد علی کا آباد کردہ ہے اور یہ محلہ امین آباد کو قیصر باغ سے ملاتا ہے یہاں بعض مسجدیں پرانی ہیں جن کے بارے میں تاریخ خاموش اور ذریعہ تشریح مفقود ہے اس محلہ میں مرزا سلیمان قدر بہادر کا ایک مملوکہ امام باڑہ تھا جس میں نواب سردار علی خاں درانی رہتے تھے اور جہلم کے بعد مجلسیں کرتے تھے اب اس جگہ سینما ہے اور شیشے اور چینی کے برتنوں کا شاک ہے اور نظیر آباد میں جوتے کی بڑی بڑی دوکانیں ہیں آثار قدیمہ باقی نہیں ہیں ۔

باغ منّو

یہ جگہ جو کسی زمانے میں باغ منّو کے نام سے مشہور رہے نئے گاؤں اور گھسیاری منڈی کے بیچ میں تھی اور گرد و نواح کے مسلمانوں کی قبریں برابر بن جانے کے بعد پہلا نام طاق نسیاں تک پہونچا اور اس مقام کو

روشن علی کا تکیہ :۔ کہا جانے لگا۔ نہیں کہا جاسکتا کہ روشن علی وہی ہیں جن کی وزیر گنج میں مسجد ہے یا کوئی اور ۔ اس تکئے کی پختہ قبروں کے پاس ایک چھوٹی مسجد ہے۔ جو مسجد قدیم کا نقش ثانی ہے اور مسجد لال بیگی ماتمی لوگوں کے زیر انتظام ہے روشن علی کی قبر حدود مسجد اور انگنائی میں ہے مسجد آباد اور اچھی حالت میں ہے ۔

بوا قطبن :۔ اس محلہ میں ایک رقاصہ مذکورہ بالا نام کی تھی جس نے توبہ کرکے زیارتیں کیں اور ارادہ یہ تھا کہ جائداد وقف کردے ۔ عزاداری سے خاص شغف تھا۔ تعزیہ خانہ میں سونے اور چاندی کے علم تھے ایک دن تفنن طبع میں چنے بھنا کر پھانک رہی تھیں کہ ایک چنا حلق میں پھنس گیا اور فوراً موت واقع ہوئی ۔ تعزیہ داری کا سامان اہل محلہ نے کسی شیعہ عالم کے پاس بھیج دیا مکانات پر گورنمنٹ کا قبضہ ہوگیا سونے کی گھنیاں (اشرفیاں) ، اور زرومال پر جس کا قابو چلا وہ قابض ہوگیا ۔

شریمتی قطبن اگرچہ عہد شاہی کی نہ تھیں مگر فنی کمالات اس زمانہ میں فقط انھیں میں پائے جاتے تھے اور وہ اسلاف کے ہنر کا مجموعہ تھیں اس لئے ان کا ذکر مناسب معلوم ہوا ۔—

گنگنی شوکل کا تالاب

امین آباد کے آگے سمت مشرق واقع ہے تالاب کا نہ کہیں وجود ہے نہ یہ علم ہے کہ تالاب کہاں تھا خاندان شاہی کی دو ڈیوڑھیاں اس وقت یہاں تھیں (۱) پرنس مرزا محمد رضا علی خاں دارا سطوت جو لڑکپن میں یتیم ہوئے تھے چنانچہ واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے بعد جب بھائیوں کی نذریں گزرنے لگیں اور دارا سطوت حاضر ہوئے تو رحمدل شاہ بھائی کی کمسنی پر رو دیا اور صورت دیکھ کر دعائیں دیں۔ دارا سطوت بڑی شان و شوکت کے رئیس تھے ان کی کوٹھی پر بارہ یورپین گوروں کا پہرہ رہتا تھا شہر سے دور ہونے میں چوروں کو سرقہ کا اچھا موقع تھا اور کئی مرتبہ چوری ہونے پر یہ پہرہ مقرر کیا میر تقی میر نے اسی کی شکایت کی ہے۔

دس تلنگے ہیں در پہ یہ گہ و گاہ   جاؤ کرنے تلاش جس کے گھر + پہونچنا اس تلک بہت دوبھر

میرے سامنے ایک میموریل ہے جس پر ممدوح کی مہر کے ساتھ یہ الفاظ ہیں۔

رضا علی بہادر ۱۲۵۵ھ
دارا سطوت مرزا محمد

خلف جنت مکان امجد علی شاہ بادشاہ از بطن نواب ملکہ گیتی صاحبہ

(۱) دارا سطوت کی محلسرا میں ایک مسجد بھی ہے جس میں ان کے کنبے کے لوگ نماز پڑھتے تھے (۲) ڈیوڑھی قدیم نواب ممتاز الدولہ، اس عمارت کا پتہ واقعات غدر سے لگتا ہے بلوے کے زمانے میں نواب گنگنی شوکل کے تالاب پر تشریف لے گئے تھے اور امن قائم ہونے تک وہاں رہے تالاب پر نواب ممتاز الدولہ کی ایک مسجد بھی موجود ہے اما باڑہ مسجد سے قریب تھا جس کی بنیاد اب نہیں ہے۔ دارا سطوت جب مکان سے برآمد ہوتے تھے جیب میں مختلف رقوم کی پڑیاں ہوتی تھیں اور مصاحبین و متوسلین کو سلام کرنے پر یا کسی حاجت مند کو جو کچھ ہاتھ میں آتا وہی ملتا۔ (وضعداران لکھنؤ ص۳۲)

بانسی کی مسجد:- یہ مسجد عہد شجاع الدولہ کی تعمیر اور اس کے بانی نوابزادہ میر افضل علی رضوی تھے ان کے عزیزوں کی قبریں اٹاوہ میں ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ اٹاوہ سے کوئی تعلق وطنی تھا افضل علی کی قبر مال گودام چارباغ میں اب تک ہے بانی مسجد کے دو بیٹے تھے ایک کا نام نذیر علی خاں تھا جن کو معتمد الدولہ آغا میر کی دامادی کا فخر حاصل تھا اور پانچ سو باسٹھ روپیہ وثیقہ تھا اس مسجد میں ۲۷ ایکڑ زمین شامل تھی جس پر کوٹھیاں اور بنگلے بنے ہوئے نظر آرہے ہیں افضل علی پلٹن نجیب بانسی کے افسر تھے۔ اس کنبے کے کچھ معزز افراد کراچی میں موجود ہیں۔

احاطہ میر لندنی:- تاریخ سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ ایلچ خاں کی موت کے بعد جو لوگ پیش دستی پر مقرر ہوئے تھے ان میں مرزا ابو طالب خاں لندنی بھی تھے جو اس زمانے کے دشوار گذار سفر لندن سے زندہ واپس ہوئے تھے اور لوگوں کی زبان پر نام کے بجائے میر لندنی کی شہرت باقی رہی۔

تالاب پر نواب شہنشاہ دولہ جن کا اصل نام نواب صادق علی خاں تھا بہت بڑے طاقتور رہتے تھے ان کی تنومندی سے لوگ سفید دیو کہتے تھے ان کی طاقت کے حالات اس سے پہلے گذرے اور بعد کے صفحات میں آئیں گے۔

اس علاقے سے ۱۸۶۶ء میں بنگالی ہندو رکھنا نرنجن نے ایک آٹھ ورق کا ہفتہ وار اخبار "ہندوستانی" نکالا جو ہر جمعرات کو اردو میں شائع ہوتا تھا۔

حسین گنج

بہت بڑا اور آباد محلہ ہے اس کی پہلی تاسیس کا تاریخ میں ذکر نہیں ہے شتر خانہ اور آئینہ بی بی کا باغ اسی محلہ کے دو ٹکڑے ہیں شیخ ممتاز حسین[١] صاحب جونپوری معاصر کے بیان اور دیگر رجحانات سے ثابت ہوتا ہے کہ آغا ابو طالب کا امامباڑہ جو لکھنؤ کا پہلا عزاخانہ تھا آئینہ بی بی کے باغ میں دفتر نہر کے قریب تھا اور یہ عمارت عہد شجاع الدولہ بہادر مرحوم کی تھی دوسرا قول یہ ہے کہ یہ عمارت بہرہ میں تھی اور یہ رائے بھی کچھ کم دقیع نہیں ہے آئندہ اپنے محل پر ہم اس کا ثبوت پیش کریں گے۔

انگریز جب سکندر باغ پر قابض ہو گئے تو باغیوں نے محاصرہ کیا اور حسین گنج کے پل کو توڑ دیا اور بیلی گارد اور لشکر عالم باغ کی آمد و رفت رک گئی۔

گنیش گنج

اس محلہ کو نصیر الدین حیدر نے آباد کیا تاریخ میں[٢] صرف اسی قدر پتہ چلتا ہے۔

بشیرت گنج

اس محلہ پر آزادی کے حامی گروہ نے غدر سے پہلے قبضہ کر لیا تھا اور ١٩ ستمبر کے حملے میں انگریزوں نے ٢٠ میل تک دشمن کو پسپا کر کے بشیرت[٣] گنج پر قبضہ کیا جب گورے داخل ہوئے تو شرف الدولہ نے اپنے کارندہ امراؤ مرزا کو بھیج دیا اور خیر خواہی ثابت کرتے ہوئے پندرہ ہزار روپے کا غلہ خرید کر بھروا دیا جنرل اوٹرم کے آخری دھاوے کے وقت رسد کا پہونچنا بہت مشکل تھا کوئی حامی نہ بھرتا تھا۔ شرف الدولہ کا یہ حسن انتظام تھا کہ مسلمانوں کو خمیری روٹی اور ہندوؤں کو پوری کچوری مٹھائی تقسیم کی۔ اور رام سہائے تمنا کا بیان ہے کہ ١٠ ستمبر ١٨٥٧ء کو کمانڈر انچیف جب مع جنرل اوٹرم گنگا سے عبور کر کے باغیوں کو پسپا کرتے ہوئے بشیرت گنج[٤] میں آ پہونچے تو جسا سنگھ کے کمک پہونچانے سے سخت لڑائی اور گھمسان کی مار ہوئی اور انگریزوں کے جان اور مال کا بہت نقصان ہوا تیسرے حملے میں جسا سنگھ مارا گیا۔

فتح گنج

یہ محلہ بھی نواب آصف الدولہ کا آباد کردہ ہے اور امین آباد سے چار باغ کی راہ میں ہے مسلمانوں کی مسجدیں اور کہیں کہیں مندر پرانے دوکانات اور امین الدولہ کی پارک کی بنیاد سے پہلے جوتے کی دوکانیں اور بزازوں کی قدیم آبادی ہے۔ جس میں قابل ذکر ہے۔

<u>مسجد مرزا سودا</u>:۔ بھوسہ منڈی کے سامنے جو گلی پچھم کو جاتی ہے اور پھول والوں کی دوکانیں ہیں یہ سودا کی مسجد کا جز ہیں خانۂ خدا اوسط درجے کی عبادت گاہ ہے دوکانات کے پہلو سے مسجد پر جانے کا زینہ ہے۔ بارہ سیڑھیوں کے بعد صحن مسجد نظر آتا ہے۔ اور بڑی خوشنما نئی عمارت معلوم ہوتی ہے امام مسجد کے بیان اور بالغ نظر کے بعد فیصلہ ہوتا ہے کہ قدیم حدود میں پچھم کی دیوار تو اصلی ہے اور مسجد بانی مسجد کی تعمیر اول کے بعد دوبار مرمت کی گئی زینہ قدیم ہے اور دو درجے ہیں ایک چوکور چھت کی تحت میں ہے جس میں پیش امام کے سجادہ کو علیحدہ شمار کر کے چھ صفیں نمازیوں کی آسانی سے آسکتی ہیں موجودہ تعمیر میں گنبد اور

---

١ اخبار سرفراز لکھنؤ یکم محرم ١٣٥٠ھ   ٢ گزشتہ لکھنؤ   ٣ محاربہ عظیم ص ١٠٤   ٤ احسن التواریخ ص ٤٤

منارے نہیں ہیں قبلہ کی اندرونی دیوار میں پانچ محرابیں ہیں صحن مسجد میں داہنے ہاتھ کی طرف کچھ پرانی عمارت کے آثار ہیں جو ممکن ہے کہ سودا کے رہنے کا مکان ہو اہل محلہ اور عوام کی زبانوں پر ہے "مسجد شہدا،" اور یہ اردو کی بدنصیبی ہے کہ کچی زبان والے آتش کو "آتس" کہیں اور سودا کو شہدا۔ اگر یہ زبان کا قصور ہے تو خیر ورنہ یہ بھی شبہ ہے کہ کسی تعصب کی وجہ سے سودا کا نام چھپایا گیا ہو مسجد میں کتابوں کی ایک الماری پر یہ بورڈ بھی ہے۔

باب المسجد رحمانی و مدرسہ رحمانیہ ۱۳۶۹ھ
سابق مسجد مرزا سودا
جنگلی گنج   امین آباد

مسجد کے دروازے جدید اور چوبی ہیں اور اس بورڈ سے واضح ہوتا ہے کہ آخری تعمیر کو دس برس ہوئے ہیں مدرسے میں ۲۰ لڑکے قرآن شریف کی تعلیم اور حفظ کے لئے داخل ہیں قاری عبدالغفور قرآن حفظ کراتے ہیں اور محمد حسن مدرس اور امام جماعت ہیں اور عبدالمجید سلطانپوری چندہ وصول کرتے ہیں مؤذن کا حجرہ پشت پر اور اس کے سامنے آبدار خانہ اور پچھواڑے ایک عمارت افسر منزل ۱۳۶۶ھ کی بورڈ سے موجود ہے زیر مسجد کی دوکانیں مسجد کے قبضے میں نہیں ہیں پہلو کی دوکانوں پر قبضہ ہے مسجد میں بجلی کی روشنی اور پنکھا موجود ہے انتظامات اہل محلہ کے چندے سے ہوتے ہیں مرزا رفیع کا نمونۂ سخن ملاحظہ ہو۔

سودا کی شاعری میں ہجو بھی علم افروز اور حکمت زا ہوتی تھی ایک طبیب کی ہجو میں کہتے ہیں ؎

کہہ دیا مجنوں کو شیر شتر   کہہ دیا مستسقی سے جا فصد کر

طبی اصول علاج سے پاگل کے لئے فصد کھولکر ناقص اور جوش کھایا ہوا خون خارج کرنا اور جلندھر میں شیر شتر جو مخصوص ہے مقرر ہے زیرہ استسقے کے مریض کو فصد کھولکر اور کمزور کرنا اور پاگل کو سی کا دودھ پلانا علاج نہیں بلکہ مرض بڑھانا ہے اس نصیحت خیز گفتگو کے بعد مرثیہ کا مطلع ملاحظہ ہو ؎

یارو سنو تو خالق اکبر کے واسطے   انصاف سے جواب دو حیدر کے واسطے

وہ بوسہ گہ نبی تھی پیمبر کے واسطے   یا ظالموں کے برش خنجر کے واسطے

۱۱۹۵ھ میں اس تاجدار مملکت سخن نے دنیا کو خیرباد کہا۔ سودا کی قبر کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا۔ عصر حاضر کے تحقیقات سے واضح ہوتا ہے کہ سودا نعمت خوان عالی کی نسل سے تھے۔

(نوٹ) بورڈ مسجد کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ مسجد جنگلی گنج میں ہے اور اس تاریخ کی ترتیب کے وقت کوچہ مسجد کو پھول والی گلی کہتے ہیں۔ اور بعض کاغذات سے واضح ہوتا ہے کہ یہی محلہ

امانی گنج

بھی کہلاتا ہے مرزا امانی نواب آصف الدولہ بہادر کا نام تھا گزشتہ لکھنؤ میں بھی امانی گنج کا ذکر ہے۔ عہد سلطان عالم میں اس محلہ میں ایک رنگریز تھا جو کپڑے کا ایک رخ سرخ اور دوسرا سبز رنگتا تھا۔

دربجے سنگھ کی سرائے

لکھنؤ کا وہ قدیم مسافر خانہ جہاں مسافروں کا ہجوم رہا کرتا تھا اور پیشہ ور کاروباری تاجر، صاحبان ہنر سب اسی سرا میں ٹھہرتے تھے۔ اور ریلوے لائن سے پہلے اسی سرائے کے سامنے سے شکرم اور اونٹ گاڑی دیہاتوں اور چھوٹے شہروں کی طرف روانہ ہوتی تھی اصل

نام بانی سرا رکا مہاراجہ ڈرگ بجے سنگھ تھا جو بلرامپور کے فرمانروا تھے۔

شیدی فولاد کا اکھاڑا:- حبشی قوم کے مشہور پہلوان تھے اور ان کا اکھاڑا سرا سے ملا ہوا تھا ان کو عہد شاہی میں رسالداری کا عہدہ تفویض ہوا تھا شہر کا بچہ بچہ ان کو جانتا تھا ان کی کشتی میں خلائق کا ہجوم ہوتا تھا دوسرا اکھاڑہ شیدی غلام علی کا تھا وہ بھی نامور پہلوان تھے اور دونوں اکھاڑوں میں تھوڑا فاصلہ تھا یہاں "استاد سکندر" کی قبر ہے جو بہت بڑا طاقتور انسان اور فن میں شہرۂ آفاق تھا اس وقت ہر دو مقامات پر چکوے آباد ہیں۔

چارباغ

تاریخ کی سیر سے واضح ہوتا ہے کہ اس نام کے دو باغ دنیا میں گذرے ہیں ایک اصفہان میں اور دوسرا دہلی میں نواب اعتماد الدولہ نے تعمیر کیا تھا۔ مرزا صائب کا شعر ہے ؎

نسیم آسا بگرد سر بگردم چار باغش را　　　بہر باغیکہ بنشیند دل من آشیاں سازم

لکھنؤ کا چارباغ عہد آصفی کی تعمیر ہے ہاشم علی رضوی لکھتے ہیں

اما از جملہ باغات آں کریم الصفات محمد باغ امام باغ وزیر باغ چار باغ کہ بر چہار جانب ان شہر را مانند گلستان ارم ساختہ[1]

آصفی باغوں میں محمد باغ اور امام باغ کا تو وجود نہیں ہے چار باغ اور وزیر باغ باقی ہے۔ اس عبارت تاریخی سے واضح ہوتا ہے کہ حدود لکھنؤ آصف الدولہ کے مقرر کردہ ہیں اس سے ان کی سیاست مدن پر روشنی پڑتی ہے اور نیک نیتی کا حال کھلتا ہے کہ وہ اپنی مختصر عمر سلطنت میں لکھنؤ بھر کو آباد کر گئے مرقومہ الفاظ فارسیہ کا مفہوم میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ لکھنؤ کی چو حدی میں ہر طرف ایک باغ تھا وزیر باغ غربی حد میں اب بھی موجود ہے ممکن ہے کہ امام باغ اور محمد باغ پر بھی کچھ معلومات آئندہ فراہم ہوں اس باغ میں کیا تھا؟ اس کی تفصیل سے تاریخ قاصر ہے چار باغ کے ایک معانی تو یہ ہیں کہ شہر کے گرد تین باغ اور تھے اور یہ چوتھا باغ تھا اور یہ بھی معانی ہو سکتے ہیں کہ یہاں مسلسل چار باغ ہوں اگر یہ وجہ درست ہے تو عیش باغ اور چارباغ دونوں کا قریب قریب ہونا تو واضح ہے اس باغ میں

کوٹھی منور الدولہ:- چارباغ میں وزیر اعظم منور الدولہ کی کئی کوٹھیاں تھیں جس میں وہ اور ان کی اولاد مقیم تھی جب چارباغ اسٹیشن کی انگریزی عملداری میں بنیاد پڑی تو خاندان منور الدولہ کو شیش محل معاوضہ میں دیا گیا اور ان کی کوٹھیاں کھود کر بڑی لائن کی پٹری بچھی نواب منور الدولہ نے بصرہ[2] میں زائروں کے لئے بھی کچھ حجرے مسافر خانے کے طور پر بنوائے تھے۔ یہ ہیں امرائے اودھ کے پبلک خدمات وہ نہ رہے مگر ان کا نام باقی ہے۔

چارباغ اسٹیشن:- انگریزوں کے دور اول کا پہلا نقش کافی شاندار اور ہندوستان بھر کی گاڑیوں کی گذرگاہ تھا اور تیسرے درجے کے بکنگ آفس کے سامنے اونچی کرسی کی ایک مسجد تھی جس میں کبھی کبھی کسی مسافر کی متابعت میں ہم نے حضرت جاوید لکھنوی کے ساتھ نماز پڑھی اور ۱۹۰۸ء کے روزنامچے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال پندرہ شعبان کی صبح کو سید محمد عسکری متوطن پوری نے پختہ کنوئیں میں عریضہ دیا اس مسجد و چاہ عمیق کا بھی اب کہیں پتہ نہیں ہے اور اس حصہ اسٹیشن پر بے فصل

---

[1] مراۃ البلاد مخطوطات　　[2] سفرنامہ حاجی حسن علی مرحوم

کے فروٹ اور جو میوہ یا پھل کسی بازار میں نہ فروخت ہوتے تھے ڈیڑھ سو برس تک چوک سے چار باغ کا راستہ ویران رہا اور راستے میں کہیں آبادی نہ تھی درختوں پر چمگادڑیں، سڑک پر سور پہلوؤں میں کہیں کہیں کھیت اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہاں تک کہ موجودہ اسٹیشن ۱۹۲۶ء میں ۸۰ لاکھ روپے کے صرفے سے بن کر تیار ہوا جو اس وقت ہندوستان میں بہت بڑا اسٹیشن سمجھا جاتا ہے ۲ دسمبر کو اس کا افتتاح ہوا اور یہ عمارت اس قدر سر بلند ہے کہ مسجد تحسین کے کوٹھے سے نظر آتی ہے۔ یہ اسٹیشن شہر کی طرف ہٹ کر بنا اور پرانا مقام پلیٹ فارموں میں آگیا اب اسٹیشن کی عمارت ۲۲۵۰ فٹ لانبی ہے اور آبادی بڑھتے بڑھتے اسٹیشن سے ملحق ہوگئی۔ انگریزی حکومت ختم ہونے کے بعد کانگریس راج میں چار باغ مارکیٹ دس لاکھ روپے کے سرمائے سے بنا اور بازار کی چار ہزار روپے ماہوار آمدنی ہوگئی اس کے بعد چھوٹا اسٹیشن بن کر رونق اور زیادہ ہوگئی۔

تالاب فتح علی: ۔ یہ تالاب بہت بڑی تاریخی یادگار ہے جس کا اب نشان بھی نہیں پتہ کے لئے راہگیر کی زبان پر لفظیں جاری ہوتی ہوتی ہیں چار باغ سے گذر کر راہ بجنور سائڈ پر ہے۔ فتح علی وہی شخص ہیں جو کپتان کے لقب سے مشہور تھے اور جن کا کنواں چوک میں اور مقبرہ موہنی کے پڑوا میں ہے یہ مقام کسی زمانے میں تفریح گاہ تھا قدیم تاریخ میں ہے۔

"مولوی عبدالقادر خاں[1] در رفقاء ایشاں وارد ایں شہر شدند و بمن چسپاں شدند یک روز بتالاب میاں فتح علی رفتہ بودم و ایں ہمہ گردشہا یعنی بمیلہ ہنومان"[2]

مولوی عبدالقادر خاں اپنے دوستوں کے ہمراہ لکھنؤ پہونچے ہیں اور مجھ سے چپکے ہوئے ہیں کہ ایک دن فتح علی کا تالاب ان کو دکھاؤں ہنومان جی کے میلے کا ان کو شوق ہے۔

ـــــــــــــــــــ

[1] روزنامہ ہمت لکھنؤ ۲۲ مارچ ۱۹۳۰ء [2] رقعات مرزا قتیل رقعہ نمبر ۸۳ صفحہ ۵

ساتواں باب

پنجابی ٹولہ سے دلکشا و جھنڈے تک

پنجابی ٹولہ :- نہیں کہا جا سکتا کہ اس جگہ پنجابی کب آباد تھے موجودہ زمین مدن پارک کی تیاری اور امتداد زمانہ سے قدآدم اصل زمین سے پست ہے اور جو قبور ایک بلند چبوترے پر دکھائی دیتے ہیں وہی سطح زمین تھی یہاں اما مباڑہ آصف الدولہ کے اینٹوں کا ذخیرہ تیار رہتا تھا اس لئے زمین کے ضرورت مندوں نے کھود کھود کر رکھ استعمال کرنا شروع کی اور مزار شیر خاں فقیر کا کہا جاتا ہے جہاں لڑکے مریضوں کو لاکر عقیدت مند اچھا کرتے ہیں اور مزار کے برکات سے محلہ ہیضے سے ہمیشہ محفوظ رہتا ہے اور آسمانی بلائیں اس محلے سے دور رہتی ہیں۔

رستوگی ٹولہ

بہت پرانا محلہ اور مہاجنوں کا اڈہ ہے دو پھاٹکوں کے بیچ میں سارے مکانات آکر ایک قلعہ کی طرح محفوظ ہیں اور پرندہ پر نہیں مار سکتا اس محلہ میں۔

وقف فرخندہ بخت :- شاہزادہ فرخندہ بخت فدا علی مرزا حضرت محمد علی شاہ بادشاہ کے فرزند ارجمند تھے اور ان کی صاجزادی کا نام نامی پوتی بیگم (بادشاہ کی پوتی) تھا باپ اور بیٹی نے اپنی جائداد وقف کردی تھی جس میں ایک شاندار اما مباڑہ تھا جو ۱۹۲۵ء میں جج کی تجویز سے جگموہن داس کے قبضے میں آیا اور مرزا محمد سجاد علی خاں استاد ہائیکورٹ نے اپیل کی مگر سرمایہ نے ساتھ نہ دیا اور جائداد جدید عمارات کی صورت میں آئی۔

بازار راجہ

نواب آصف الدولہ بہادر نے شری ٹکیت رائے کایستھ سری باستم کو عہدہ دیوانی سپرد کیا تھا راجہ کی لائف بزبان اردو منشی لال جی نے ۱۹۱۰ء میں نولکشور پریس سے طبع کی تھی بازار اور تالاب ان کی یادگار اس وقت موجود ہے اور جہاں تک تاریخ اور مشاہدے سے مدد لی جاتی ہے اس بازار کی آبادی نوابی سے آج تک ایک حالت پر باقی ہے اور کبھی ہا دفنا کا ادھر سے گزر نہیں ہوا علاوہ ہر چیز کی دوکانوں کے صبح کو روزانہ پھل اور ترکاریوں کا بازار لگتا ہے اور رستوگیوں یا دوسرے اہل محلہ کو منڈی جانے

کی ضرورت نہیں پڑتی۔ سال بھر کے بعد عشرہ محرم سے پہلے اور کچھ روز چاند رات کے بعد تک یہاں تعزیہ اور ضریحیں بھرے پڑے ہوتے ہیں خصوصاً ۲۹ ذی الحجہ کو ۴ بجے دن سے تعزیوں کے سلسلے میں مسلمانوں کا وہ مجمع ہوتا ہے کہ راہیں بند ہو جاتی ہیں اور سواری گذر نہیں سکتی تعزیوں کا ہدیہ ہونا بھی اس بازار کے بہت پرانے خصوصیات میں ہے۔

شکر کے بتاشے جو شادی بیاہ کے موقع پر یا کبھی میلاد شریف میں تقسیم ہوتے ہیں راجہ کی بازار میں صرف ہندو بنانے والا شہر بھر تک پہونچاتا ہے اور یہ حلوائیوں کے یہاں نہ تھے بل دیہات اس کو بتاشہ کہتے جعفرز ٹلی کہتے ہیں ؎

دریں دور تازندہ رستم منم　　　بتاسہ بگرز گران بشکنم

اس نسے کے ؎ باشندگان اور خاندان شاہی کے ارکان میں ——————

(۱) مغل صاحب کی محلسرا بہت بڑی ڈیوڑھی تھی اس خاتون کے بعض حالات اور شخصیت کا تذکرہ ان کے امامباڑہ کے سلسلے میں اپنے مقام پر ہو چکا ہے شوہران کے نواب مجاہد الدولہ انقلاب سلطنت کے بعد صدمے میں آوارہ وطن ہو گئے اور عراق میں انہوں نے دوسرا نکاح کر لیا۔ مغل صاحبہ عورت ہو کر اپنی ساری جائداد کا انتظام خود کرتی تھیں۔ رات کو چوکیداروں کا پہرا رہتا تھا حاجی مہر علی بمبئی کے بوہرے مجاہد الدولہ کے مختار تھے وہی ڈیوڑھی کے حکم احکام کی تعمیل کرتے تھے اور مجاہد الدولہ کی ذاتی جائداد پر ان کی اولوالعزمی سے قابض بھی تھے ان کی محلسرا کے سامنے جب کیننگ اسٹریٹ نکلی تو ہزار ہا مکانات CANNING STREET میں کھد گئے ۳۵ سال پہلے تک ان کی محلسرا موجود تھی یہ وہی محلسرا ہے۔ جہاں سے مغل صاحب کے مرنے کے بعد ان کے وارث مرزا سلیمان قدر بہادر کے دولت کدہ مولوی گنج تک چوبیس فینسوں میں جواہرات اور مال و دولت بھر بھر کے بھیجا گیا ایک فینس سامان زیادہ بھر دینے سے چرچرا کے ٹوٹ گئی و.. روشنی نے اپنے گھر میں اتروالی اور دیدہ دلیری دیکھو کر حساب ہونے پر شاہزادہ عالم سے اقرار بھی کیا کہ چوبیسویں فینس کا سامان شامل نہیں ہے۔ وہ چپ ہو گئے اور یہ مالا مال ہو گئے۔

(۲) سیاں شہدے کی سبیل:۔ راجہ کے بازار میں وہ جگہ جہاں ہر مذہب و ملت کے لوگ ٹھنڈا پانی پیتے تھے یہ لکھنو کے ایک شہدے کی بلند پروازی کا نتیجہ اور رفاہ عام کا کام تھا سیاں کا اسی گروہ سے شہدوں کے تعلق تھا جو شادی بیاہ یا غمی میں رئیسوں امیروں کے در پر جا کر منظم ہو کر مبارکباد اور دعائیں دیتے ہیں۔ ایک دعا کرتا ہے اور سب بیک زبان آمین کہتے ہیں اور جب خوشامد اور حسن طلب سے کام نہیں نکلتا تو پھبتیاں کہہ کر اور برا بھلا کہہ کر بخشش کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ بیر بخارا ان کا پہلا مسکن تھا پھر کچھ شہدے حسین آباد میں بس گئے مگر چودھری راجہ کے بازار میں رہا اور چورا ہے پر سبیل رکھی ظریف کہتے ہیں ؎

خوب نقد دل عشاق کو لوٹا تو نے　　　شہدپن ہے یہ اسے کہتے ہیں سیاں ہونا

سیاں شہدے کا پوتا حسین بخش نامی سیہ فام محرمی رنگ کے کالے کپڑے پہنے ہوئے نویں محرم کی مجلس امامباڑہ ممتاز العلماء میں ہزار ہا آدمیوں کے مجمع میں اپنے علم کا خود اعلان کرتا تھا —— "اپنی سلامتی میں اپنے پروار کی سلامتی میں ۱۵ صفر نواب میر محمد حسین کا مکان نہ بھولئے گا جہاں تک ہو کالی اچکن ہو مگر آئیے گا ضرور —— علم ڈیوڑھی آغا میر سے اٹھ کر درگاہ حضرت

عباس جاتا تھا کوئی امیر اور رئیس ایسا نہ ہوتا جو شریک نہ ہو ہر گلی اور چوراہہ پر کچھ شہدے موجود رہیں جو شرکت کرنے والوں کو مجمع سے نہ کٹنے دیں اس کی خوشی یہ تھی کہ سارا مجمع سیہ پوش اول سے آخر تک شریک رہے سیاں شہدے کی بیل کے سامنے شکر کے بتاشے اور کھٹیاں بنتی ہیں اور دور دور کے گاہک آتے ہیں۔

(۳) مٹیا برج میں لکھنؤ کے صاحبان کمال کا ذکر ہو رہا تھا بعض حاضرین نے مجھ سے کہا کہ لکھنؤ کے آخری دور میں یہاں بنوٹ کے جاننے والے حسین بخش رہتے تھے جو اپنے کمال میں جواب نہ رکھتے تھے۔

راجہ ٹکیت رائے کا مکان :- بازار راجہ کا سب سے بڑا مکان جس کا ½ حصہ مدرسۃ الواعظین کی عمارت کی صورت میں موجود ہے پھاٹک بازار راجہ میں اور پچھواڑہ کیننگ اسٹریٹ نمبر ۱۶ ہے نہر، تہ خانہ، دیوان خانہ، اندارہ، پرانے نقش و نگار کے دیوار و در بغلی صحنچیاں غلام گردش نوکروں چاکروں کے کمرے لق و دق صحن زمین میں لکھوری اینٹوں کا فرش پہلے تو بعض گلیوں میں بھی تھا مگر اب صرف اس مکان میں باقی ہے کئی اشخاص کی ملکیت میں رہنے کے بعد مدت سے مدرسۃ الواعظین کے استعمال میں ہے اور زمانہ نوابی کی یہی ایک عمارت باقی ہے منشی کالی پرشاد نے بھی راجہ کی ایک مختصر لائف لکھ کر طبع کی تھی۔

مسجد ٹکیت رائے :- راجہ کی مسجدوں کا حال اس تاریخ کے اوراق میں بارہا آ چکا ہے بازار راجہ میں بھی ٹکیت رائے کی ایک مسجد اوسط درجے کی موجود ہے جو عمارتی تبدیلیاں ہونے میں رستوگی ٹولے کے ایک گوشے میں آ کر رہ گئی ہے یہ مسجد ۱۲۰۶ھ کی تعمیر ہے اور بڑے خوشنما حرفوں میں سفید پتھر محراب پر یہ آیت تحریر ہے۔ والیطوفوا بالبیت العتیق پ ۱ رکوع ۱۱۔ یہ مسجد نواب منّن صاحب کے سکونتی مکان میں پڑتی ہے اور اس مکان میں کچھ حجرے اور برج عہد نوابی کے موجود ہیں۔ آپ لکھنؤ کے خوش خوراک لوگوں میں آخری شخص ہیں: ایک سو بیس طرح کا قورمہ پکانے کی آوازیں آپ کے کان میں پڑی ہوئی ہیں اور آٹھ طرح سے گوشت بھونتے ہیں۔ ہندوستانی کھانے اور ان کی خوش ذائقگی کے راز معلوم ہیں اگر ان کی بتائی ہوئی ترکیبیں انسان لکھنے بیٹھے تو ایک کامیاب رسالہ پخت و پز ہو جائے۔

نواب چٹنی :- بازار راجہ میں نواب شجاع الدولہ کے خاندان کے چند علم دوست اور غریب پرور معززافراد کے مہمان ایک شخص نواب چٹنی تھے۔ جو بنارس سے آئے تھے اور تہذیب لکھنؤ کے فریفتہ تھے۔

پریس مکان سیف الدولہ :- بازار میں ایک عظیم الشان پھاٹک رہ گیا ہے جو مکان سیف الدولہ ہے یہاں ایک پریس تھا جس سے پادری فنڈر کی رد میں ارمغان یوسف کتاب طبع ہوئی۔

اس محلہ میں ایک اور چھاپہ خانہ تھا جس کے مطبوعات عہد شاہی کے خصوصیات کا عکس تھے اور ٹائٹل پر یہ عبارت دیکھی گئی [1] " در بہیت السلطنت لکھنؤ بمحلہ بازار راجہ ٹکیت رائے بمکان راجہ مذکور باہتمام کارپردازان مطبع مولائی طبع شد" اس مطبع کے بعد تصویر عالم پریس ۱۹۱۰ء میں شہرت پذیر ہوا جس کے منیجر سید مجتبیٰ حسین اور مالک داروغہ سید محمد عرف چھدن صاحب گراں گوش تھے مطبع علمی اور ادبی خدمتیں انجام دیتا رہا اور اب الواعظ صفدر پریس سے نشر و اشاعت معلوم ہوتی ہے۔

---

[1] منطق کی مشہور کتاب ایساغوجی اس مطبع کی میرے پاس موجود ہے۔

(نوٹ) رستوگی ٹولہ اور راجہ بازار کی موجودہ سڑک پر بھی بعض مساجد ہیں جن کے باب میں کوئی تحقیق نہیں ہے کہ وہ کس کی بنوائی ہوئی اور کس سنہ کی تعمیر ہیں۔ منشی عبدالستار سندیلوی عہد آصفی کے خوشنویسوں میں تھے اور ٹکیت رائے کے یہاں نوکر تھے کاکوری کے قریب پل پختہ جو راجہ نے بنوایا تھا اس پر ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تاریخ سنگ مرمر پر کندہ ہے۔ ٹکیت رائے نے اپنے باغ میں اجاگر طوائف کا جو مجرا کرایا تھا وہ تاریخی واقعہ ہے۔ (صفحہ ۲۷ قدیم ہنر)

فینس والی گلی:۔ اس نام کی دو گلیاں لکھنؤ میں ہیں جہاں پالکیوں کی مرمت، رنگ سازی، نئی اور پرانی فینسیں بکتی بھی تھیں اور جب فینس کا عام رواج تھا تو نئی فینس خریدنے کے بھی دو مقام تھے معالیخاں کی سرا میں فینس والی گلی اور بازار راجہ میں فینس والی گلی۔ فینس عموماً ہلکی اور رواں اچھی سمجھی جاتی ہے جو کبھی دوہری کھڑکیوں کی بھی فینس ہوتی ہے اور بہترین فینس گورکھپوری ہوتی ہے جو لکڑی میں بھی عمدہ اور اس کے ڈنڈے یا بانس علیحدہ ہو جاتے ہیں گورکھپوری فینس کا وہ لوہا جس میں ڈنڈے پھنسائے جاتے ہیں ایسا ہوتا ہے۔

عام پالکیوں میں سلاخوں کا آخری حصہ خط قوسی کے بجائے مستقیم اور سیدھا ہوتا ہے پالکی کے لئے چھت پر موم جامہ تاکہ بارش میں سواریاں بھیگنے سے بچیں پہلو کی روکار پر کار روپے کا جھولا جس میں کہاروں کے پینے کا ناریل اور چلم اور پینے کا تمباکو، اندر گدا یا فینس کی جو ٹان کے برابر قالین، پیچھے گاؤ تکیہ پہلوؤں میں تکیہ، کہاروں کے کاندھوں پر رکھنے کی فی نفر دو دو گدیاں کم از کم چار کہار اور پہلو میں خدمت گار مشعل یا فانوس لئے ہوئے اور دور جانا ہو یا شان دکھانا ہو تو چھ کہار یا آٹھ کہار بلکہ ۱۶، اور ۳۲ کہار تک امرار کی پالکی میں دیکھے گئے ہیں کہار عموماً بسم اللہ الرحمن الرحیم کہکر سواریاں اتاریں گے اور سبک خرامی کی جانچ اس طرح قرار دی تھی کہ کٹورے میں پانی بھر کر چلو اور ایک قطرہ گرنے نہ پائے ؎

چلو ہولے ہولے دھمک سے نبجتی گئی سب مسک میری چولی کہارو

کہاروں کی اصطلاحیں بھی مقرر تھیں اگر چھوٹا لڑکا الٹے ہاتھ کی طرف ہو اور اس کو جھڑپ سے بچانا ہو تو معصوم بائیں کو کتا بیٹھا ہو تو شکاری بائیں کو پھسلن میں کہیں گے پاؤں بھر کے " مجھے پالکی میں شہر میں بھی بیٹھنے کا بار بار اپنی نوجوانی میں اتفاق ہوا اور دو چار کوس پالکی میں سفر کی بھی نوبت آئی اور غور کرتا رہا کہ اس منزل پر دیہاتی کہاروں کے اشارات یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ ایک مرتبہ بھری برسات میں کئی کوس فینس میں گیا راستہ میں پانی ملتا تو کہار کہتے جلنیاری بائیں کو کسی مویشی کے پاس سے گزرتے تو کہتے ہرا اور کوئی گنوار راستہ تنگ میں مل جاتا تو کہتے "بوتا با تواں" یعنی الحیوان ناطق دست چپ پر ہے ؎

میرے منہ کے بس اٹاؤ نہ کپڑے ستاؤ نہ اپنی یہ بولی کہارو

سواری اترنے کے بعد فینس پر گرد پوش ڈال دیا جاتا اور اگر زنانی سواری ہوئی تو پالکی میں دو دو تین تین عورتیں بیٹھ جاتیں فینس پر چھٹکا پڑا ہوا اور کبھی صرف ایک کا ہار دوپٹہ پردے کے بیچوں بیچ میں جھانکنے کا ایک گوٹ دار چھید اور جن کو پردے کا زیادہ ذوق ہے وہاں فینس پر خوبصورتی کے ساتھ آڑی ترچھی ڈوریاں کسی ہوئی کہاروں کی یہ سوجھ بوجھ کہ دو عورتیں ڈولی میں بیٹھ جائیں تو صاف کہہ دیں کہ دوہری سواری ہے ایک لڑکی اور ایک عورت ہو تو کرایہ لیتے

وقت کہیں ڈیوڑھی سواری ہے دوست احباب کے گھروں کا فاصلہ کہاروں کے کرایہ ڈولی سے دریافت ہوتا ہے

ذرا گھر کو رنگین کے تحقیق کرلو — یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

"سواری منگوا دو" عورتوں کی زبان میں ڈولی کو کہا جاتا۔ جان صاحب کہتے ہیں ؎

ساس نندوں کی محبت کے میں قربان گئی — جاؤں میکے مجھے منگوا دو سواری مرزا

چاہنے والے مرد عموماً ڈولی کے ساتھ عورتوں کی چلتے تھے ؎

ساتھ رہتا پری خانم کے وہ سایہ کی طرح — عشق اگر ہوتا تو ڈولی کے برابر چلتا

ڈولی کے کرایہ کو لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں مرد عورتیں "کہاری کہتی" ؎

وہ آئے شام کو تو میں نادار چھپ رہا — مانگا کئے کہار کہاری تمام رات

مشہور ہے کہ کہار اور سپاہی کو جو کاندھے پر بندوق رکھ کر چلنے کا عادی ہو بوا سیر نہیں ہوتی اور کہار کو وردی اسی سرکار سے ملتی ہے جہاں وہ نوکر ہوتا۔

افغانستان میں کھدائی کرنے والی اطالوی ٹیم نے غزنی سے ۹ میل جنوب کی طرف ۴ ہزار سال پرانا ایک شہر دریافت کیا ہے جس میں ایک آہنی ڈولی دستیاب ہوئی ہے خیال ہے کہ اس وقت بھی ڈولی کا رواج تھا۔[1]

میر نواب صاحب:۔ عہد شاہی کا وہ خاندان جس کے ہاتھ میں خزانہ اودھ کی کنجیاں تھیں آپ کا ننہیال ہے آپ شیشے پر نقش و نگار آیات قرآن تصاویر، طغرے اور ہندسی کے کتبے بنانے میں ایسے کامل تھے کہ حکام ضلع نے آپ کو سرٹیفکٹ دئے اور گورنمنٹ سے معافی میں مواضعات پائے آخر وقت تک نظر کام کرتی رہی انڈے کے چھلکے پر آپ زردوزی بھی بناتے تھے اور اپنے فن میں آپ یکتا تھے جون ۱۹۵۹ء میں اس دنیا سے آپ کا کوچ ہوا۔

ڈیوڑھی آغا میر

سلطنت اودھ کے بہت بڑے مدبر نواب معتمد الدولہ سید آغا میر کا نام صفحۂ تاریخ پر باقی رہے گا ان کو شاہ جمجاہ نصیر الدین حیدر بہادر کی وزارت کا شرف حاصل تھا اور نہایت بیدار مغز مدبر تھے مگر واقعہ نگاروں کے خیالات ان کے بارے میں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ عدل و داد کی تفصیل کے ساتھ ظلم و استبداد پر توجہ دلانے والے قلم بھی ان کے خلاف زہر اگلتے ہیں اور ناظر حالات کو ایک مشکل کا سامنا ہے مخالف آوازوں کو کیونکر نظر انداز کیا جائے۔ وجہ یہ تھی کہ جس کا دامن گل امید سے بھرا وہ ثنا خواں اور جس کے مقاصد پورے نہ ہوئے وہ دشمن جان بن گیا۔ کتنے آدمی ان کی عمارتوں کے طویل سلسلے کو بے گھر ہو کر قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہیں کہنے میں بات آتی ہے کہ نادان محل روڈ کی سرا آغا میر سے جوبلی کالج تک ان کے مکانات کا سلسلہ تھا آغا میر کی ڈیوڑھی ہونے سے پہلے اس علاقے کو دولت پورہ کہتے تھے۔ جوبلی اسکول کی بلڈنگ آغا میر کا امام باڑہ تھا پہلا اور آخری نقطہ جو رفاہ عام کے لئے تھا وہ تو باقی رہ گیا اور ریچ کی املاک تہس نہس ہو گئی۔ آرام گاہ وزارت، پائیں باغ، کتب خانہ، باورچی خانہ خزانہ، جواہر خانہ، توشک خانہ، سلاح خانہ، چڑیا خانہ، دواخانہ، مہمان خانہ، دیوان خانہ، اصطبل، محلات کے قطعہ مکانات، عملہ

---

[1] روزنامہ جنگ کراچی ۲ جنوری ۱۹۶۱ء

زندگی کا ہر ضرورت کا شعبہ علیحدہ تھا آج اس بال کا پتہ دینے والا کوئی نہیں۔ جہاں نذر کے لئے سادات بلائے گئے تھے۔ جب پھاٹک کھلا تو آنے والوں کی بھیڑ یہ دیکھ کر نقش حیرت ہوگئی کہ راستے میں آگ بچھی ہوئی ہے اس امتحان انزا موقع پر مجمع پراگندہ ہوگیا اور دو شخص تو آغا میر کے ساتھ دسترخوان تک میانہ روی سے گذر گئے اور ایک آدھے راستے سے واپس ہوگئے یہ بات تھی کہ ان کا مقولہ تھا کہ لکھنؤ میں "ڈھائی سید ہیں" اس زمانے کی اعلیٰ تہذیب میں یہ تو عقل میں نہیں آتا کہ اعلان عام پر تمام سادات پہونچ گئے ہوں آج تہذیب مٹ جانے پر لکھنؤ کے خوددار ایسا نہیں کرتے اس کے معنی یہ ہیں کہ جیسے دعویداران سیادت جمع ہوئے تھے ویسی شکست کھائی۔

آغا میر ایرانی نسل کے سید تھے اور بعض واقعہ نگاروں کا یہ لکھنا کہ آغا میر از قوم کھتری بود صحیح نہیں ہے ان کی وزارت میں سبحان علی خاں کا ہاتھ تھا جب غازی الدین حیدر کی تاجپوشی کا دربار عام ہوا اور تمام امرا پر تکلف لباس پہنے ہوئے وزارت کی آرزو میں تھے آغا میر جو ایک سیدا اور دیندار ولیعہدی کے زمانے میں مصاحب ہوگئے تھے ہاتھ باندھے عقب میں کھڑے تھے رزیڈنٹ نے پوچھا کہ خلعت وزارت کس کو عطا ہوگا سبحان علی خاں نے کہا آغا میر دست بستہ مستحق کھڑا ہے۔ آغا میر وزیر ہوگئے جب سے آپ وزیر[1] گر مشہور ہوگئے۔ آغا میر کی سیاست اور زندگی کے واقعات کثرت سے ہیں جس کے احاطے کتاب طولانی ہوجائے گی وہ واقعہ بڑا دلچسپ ہے کہ چوروں کے ایک شاطر گروہ نے دن دہاڑے محلسرا کے ایک حصے میں ڈاکہ ڈالا اور چھکڑوں پر مال لے کر ایک بڑی بی کو سوانگ بنا کر باجا بجاتے ہوئے نکلے جب وہ راہگیروں سے مدد طلب کریں کہ میں معتمدالدولہ کی ساس ہوں یہ ڈھول بجا کر آواز کانوں میں پہونچنے نہ دیں وزرائے اودھ میں بڑی شاندار حکومت کی اور سلطنت کے آڑے وقتوں میں اپنی عقل اور دماغ سے بڑی مدد پہونچائی یہاں تک مخالف گروہ نے ۲۰ دسمبر ۱۸۲۶ء کو عہدہ سے معزول کرکے چھوڑا۔ اکتوبر ۱۸۳۰ء تک دولت پور امیں زیر حراست رہے اور اسی گروہ نے جو ان کے وقار کا دشمن تھا لکھنؤ سے کانپور خارج البلد ہونے پر یہ تاریخ کہی "آج اس گھر کا سنیچر اترا" ۱۲۴۳ھ نواب کا سامان آٹھ سو چھکڑوں اور بے شمار اونٹوں اور ہاتھیوں پر بار کرکے کانپور لایا گیا جس کی قیمت کا اندازہ پچپن کروڑ کیا گیا ہے۔

وزارت کی ابتدا پر یہ واقعہ بھی خاندان کے باخبر طبقے نے بیان کیا ہے کہ جب فکر معیشت میں لکھنؤ آئے تو مالی کمزوری نے بہت ستایا۔ باپ کی وصیت تھی کہ جس تاریخ وہ مجلس کرتے ہیں ناغہ نہ ہو مجلس کا دن جب آیا تو گھر میں کچھ نہ تھا۔ ماں باپ کی رائے سے پتیلا فروخت کرنے چلے راہ میں ایک سید نے سوال کیا اور اپنے فقر وفاقے میں مدد طلب کی آپ نے بلا تکلف پتیلا اس کے حوالے کردیا سید نے دعا دی کہ خداوندا اس فیاض کو وزارت کے عہدے تک پہونچا دوسرے ہی دن ولیعہدی کی مصاحبت کا منصب ملا اور رفتہ رفتہ وہ ترقی کی کہ وزیر ہوئے ایک مدت تک پبلک ان کو پتیلا والے نواب کہتی رہی۔

یہ بیان اس دوراندیشی کے خلاف ہے جو کافی شہرت رکھتا ہے کہ آغا میر نے خلعت وزارت کے ساتھ اپنے ذاتی جواہرات کی فہرست پر ذمہ داران حکومت کی دستخط حاصل کی تھی تاکہ اگر کبھی لکھنؤ چھوڑنا پڑے تو اپنی ملکیت مشتبہ نہ ہو۔

قصر وزارت میں جو تاریخی مشاعرے ہوئے ان میں آغا میر عام پبلک کے سامنے نہ بیٹھتے تھے بس پردہ رہتے تھے لیکن بعض

---

[1] تذکرہ بے بہا ص۱۱

شعراء آپ کو تعریف پر مجبور کر کے مجمع میں لے آتے تھے۔

یادگار مشاعرہ:۔ شعر و سخن میں معتمد الدولہ کو ناسخ سے تلمذ تھا اور جو مشاعرہ کرتے تھے وہ بڑی دھوم سے ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ جو مشاعرہ ہوا تمام شہر میں مصرعہ طرح تقسیم کیا آتش کو ایک روز پیشتر اطلاع کی۔ آپ نے فرمایا کہ شاید معتمد الدولہ کو میرا امتحان منظور ہے جو طرح عین وقت اطلاع پر بھیجی خیریوں تو ہم مشاعرے میں جاتے یا نہ جاتے۔ اب ضرور جائیں گے۔ غزل کہی۔ تلوار کمر سے لگائی ٹیکے دار ٹوپی زیب سر کی شاگردوں کے جم غفیر سے مشاعرے میں تشریف لے گئے دیکھا تو نواب صاحب نے نیا مکان جو تعمیر کرایا ہے اس مشاعرے کی صحبت گرم ہے آپ نے مکان کو دیکھ کر برجستہ یہ شعر کہا ؎

یہ کس رشک مسیحا کا مکاں ہے زمیں جس کی چہارم آسماں ہے

اور جب شمع آئی تو اسی مطلع کو شروع کیا شعر برمحل تھا مشاعرے میں ہلچل پڑ گئی۔ دوست تو دوست دشمن بھی تعریف میں بے چین ہو گئے اور معتمد الدولہ نے خلعت عطا کر کے رخصت کیا معتمد الدولہ کی مدح میں مرزا فصیح مرحوم کے بھی بکثرت اشعار ہیں جو ان کے کلیات میں موجود ہیں۔

لکھنؤ سے ہجرت کے بعد معتمد الدولہ نے کانپور میں شاہانہ زندگی بسر کی ان کے بیٹے نظام الدولہ اور خاندان کی دوسری فردوں نے بڑی بڑی علمی خدمتیں انجام دیں۔ گوالٹولی کا سارا محلہ اور نیز شہر کے حدود میں ان کے کنبے کے لوگ موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے صدف وار زندگی بسر کرتے رہے اور خاندانی کرو فر ایک داستان ہے جو دہرائی نہیں جا سکتی معتمد الدولہ نے، رمئی ۱۸۳۲ء کو رحلت کی ناسخ نے تاریخ کہی ؎

دلا نواب ضیغم جنگ امروز گزشت از دار فانی ناگہاں ہائے
نوشتم سال تاریخش وفاتش دو شنبہ پنجم ذی الحجہ ایوائے ۱۲۴۷ھ

نظام الدولہ کی علمی یادگار ایک عظیم لائبریری تھی جس کے بخط ولایت نسخے اور قدیم مخطوطات آب زر سے لکھی ہوئی کتابیں ورثہ نے تلف کیں جو باقی رہ گئیں وہ مدرسۃ الواعظین کی لائبریری لکھنؤ میں بعض روشن خیال نوابوں نے بھیج دیں اس کتبخانے سے بارہویں صدی کی وہ یادگار کتاب تالیف ہو کر منظر عام پر آئی جس کا نام اس سرکار کے عالم جلیل مفتی میر عباس صاحب نے روح القرآن قرار دیا تھا اور سید العلماء کی بارگاہ سے اس گرانقدر خدمت دین پر اجازہ عطا ہوا جب سلطان العلماء کے سامنے کتاب پیش ہوئی تو جبین مبارک پر شکن آ گئی۔ اور نام ناپسند کرتے ہوئے مولوی روم کا شعر پڑھا مقصد یہ تھا کہ کتاب رد نواصب میں ہے کوئی یہ نہ کہے ع من ز قرآں مغز را برداشتم۔ فرمایا رد یخ القرآن کردو۔ یہ وہ اصلاح تھی جس نے چار چاند لگا دیئے۔ اس کتاب میں وہ آیات قرآن یکجا ہیں جو شان آل محمد میں اسلامی طرق سے نازل ہوئے ہیں زبان عربی ہے۔ عبارت مقفع مسجع اور ہر صفحہ میں وہ اسلوب نگارش موجود ہے جس کے مفتی صاحب موجد تھے نظام الدولہ نے اس کتاب کو چھپوایا وہ مفتی صاحب کی یہ قدر کرتے تھے کہ جناب کی کانپور میں سڑک سے سواری گزرتی تھی تو گاڑی پر پہلو میں نہیں بیٹھتے تھے دوسری سیٹ پر کوچوان سے متصل ان کی جگہ تھی اور گرد گردی اپنے ہاتھ سے پیش کرتے تھے۔

بعض قدیم مطبوعات میں میں نے کانپور لکھے ہوئے دیکھا۔

بنگلہ کا بنور کی عمارت میں مکان مفتی صاحب کا درخت نیم مدت دراز تک باقی رہا جو قیامگاہ کی نشانی اور مفتی صاحب کی نیم کہلاتا تھا نظام الدولہ بھی باپ کی طرح قدآور انسان اور بڑے تن و توش کے مرد تھے مبالغہ آمیز ناقلوں نے کہا ہے کہ وہ ۴ گز کی ٹوپی پہنتے تھے اور بعد وفات بھی ان میں اتنی طاقت باقی تھی کہ جب قبر میں لاش اتاری گئی تو کسی اعصابی کشش سے وہ اٹھنے لگے اور قبر میں اتارنے والے لوگوں اور غسال نے سنبھالا اور پٹرے دینے میں جلدی کی ان کی نماز جنازہ کے لئے لکھنؤ سے جناب میر آغا صاحب قبلہ مجتہد بلائے گئے تھے دفن کا واقعہ مجھ سے گوال ٹولی کے مرد پیر سید محمد عرف منے صاحب مرحوم نے اپنی طفولیت کا چشم دید بیان کیا۔

حضرتِ تعشق :۔ آپ ڈیوڑھی آغا میر مکان نواب محمد حسن خاں مرحوم رئیس اعظم لکھنؤ میں رہتے تھے اور سید صاحب تعشق سے مشہور تھے۔ بڑھاپا تھا اور اولاد نرینہ نہ تھی مگر شعر و سخن میں ان کا شباب تھا وہ دنیائے شاعری میں محتاج تعارف نہیں ہیں متانت کلام جدت مضامین سلاست زبان مناظر غم کی تصویر کشی کی وجہ سے ان کا نام آج بھی زندہ ہے اور آئندہ بھی باقی رہے گا۔

رؤسائے شہر کی یہ قدردانی تھی کہ اس بلند پایہ شاعر کو لامکانی کی زحمت سے نجات دی اور ستارہ صبح کو اپنی ڈیوڑھی میں اتارا جو ۱۳۰۹ھ تک جھلملاتا رہا اب تک وہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے اس مجسمۂ ادب کی صحبت دیکھی تعشق کا بستہ اسی گھر میں رہا اور نواب صاحب کی اولاد ان کے کلام کو مجلسوں میں پڑھ کر داد حاصل کرتی ہے۔ ایک مرثیے میں آمد پر ان کی فکر ملاحظہ ہو۔

دیکھ کر تیغِ علم چرخ بھی کیا کیا سمٹا ۔۔۔ ہوئی بیتاب زمیں دامنِ صحرا سمٹا
مچھلیاں مرگئیں دب دب کے یہ دریا سمٹا ۔۔۔ بن گیا نجم سرِ شام دن اتنا سمٹا
مہرِ مغرب کو تو مشرق کی طرف چھاؤں چلی ۔۔۔ دن ڈھلا دھوپ بھی صحرا سے دبے پاؤں چلی

بنہرہ

اس محلہ کو تاریخی حیثیت حاصل ہے لکھنؤ کی قدیم آبادی میں شیوخ بنہرہ تھے اور ریزیڈنسی کے کھنڈر سے قریب ان کی آراضی تھی اس وقت عمارت سلطان المدارس کے گرد و نواح کو بنہرہ کہتے ہیں اس علاقے میں کبھی قصر وزارت تھا۔ اور عہد سعادت علی خاں مرحوم میں حکیم مہدی علی خاں کرسیٔ وزارت پر تھے ان کی املاک سے بنہرہ بھرا پڑا تھا موصوف کشمیری نسل سے تھے ان کی مدح و ثنا میں میر ضمیر کے یہ اشعار قابل ملاحظہ ہیں ؎

سحر کو میں گو بر سرِ جانماز ۔۔۔ وظیفہ میں مشغول با صد نیاز
کہ آیا بس اک پیکِ فرخندہ فال ۔۔۔ لگا مجھ سے کہنے کہ اے خوش مقال
طلب ہے تیری در حضورِ جناب ۔۔۔ جناب مولائے قدسی مآب
وزیر خردمند با عدل و داد ۔۔۔ وہ مہدی علی خاں والا نژاد
ہوا اس سے رونق فزا یہ دیار ۔۔۔ کیا حق نے آکر یہ مرکز قرار

دیا انتظام امورات شاہ ملک اور رعیت کا ہے خیر خواہ
ہوئیں گردنیں جو سرکشوں کی پست زہے حکم ناطق زہے بند و بست
ادھر گرگ ہے اور ادھر گوسفند اب اک گھاٹ ہوتے ہیں وہ بہرہ مند
حیا آنکھ میں اور مروت کمال و لیکن ہے ایک سے علی قدر حال
وہ خورشید تاباں یا ماہ منیر عجب شاہ ہے اور عجائب وزیر

میر ضمیر سے کسی ملاقات میں واقعات معراج نظم کرنے کی فرمائش ہوئی اور ضمیر نے ریحان معراج مثنوی نظم کی جو اس موضوع پر پہلی اور آخری مثنوی ہے کئی بار زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔

معتمدالدولہ کی طرح حکیم مہدی پر بھی اہل قلم کی متضاد نظریں پڑتی ہیں موافق اور مخالف رائیں ان کی سیاست کے نتائج ہیں حکیم مہدی نے جب سہ منزلہ عمارت بنوانا شروع کی تو بہرہ کے پردہ دار مکانوں میں عورتوں کا سامنا ہوتا تھا پبلک نے شکایت کی اور عادل نواب نے وزیر کا کچھ خیال نہ کیا اور دروازے زنانہ مکانات کی سمت کے بند کرا دیئے۔

حکایت :- حکیم مہدی انیسیئے تھے اور مرزا دبیر کے کلام سے دلچسپی نہ تھی کبھی کبھی ان کے دربار کے مسخرے مرزا صاحب کے پرخلوص پڑھنے کی نقل کرتے تھے اور محفل گرم ہوتی تھی ایک ضرورت مند میر صاحب ان کے آخری دور میں مرزا صاحب کے پاس آئے اور عرض کیا کہ لڑکی کی شادی کے لئے حکیم مہدی سے کچھ دلوا دیجئے۔ مرزا صاحب نے عذر کیا کہ مجھ سے رواسم نہیں ہیں۔ میر صاحب نے ایک نہ سنی مرزا صاحب فینس میں سوار ہوئے اور میر صاحب کو لے کر ٹھیک اس وقت پہونچے جب چند آوارہ مزاج مرزا صاحب کی نقل کر رہے تھے۔ اطلاع ہوئی اندر سے جواب آیا کہ مرزا صاحب یہاں نہ آئے ہوں گے تم غلط کہہ رہے ہو۔ خدمتگار نے عرض کیا کہ مرزا صاحب ہی تشریف لائے ہیں۔ خلاف معمول آمد سنکر صحبت میں بے چینی پھیل گئی اور ہر شخص دم بخود ہو گیا مرزا صاحب فینس سے اترے حکیم مہدی نے تپاک سے خیر مقدم کیا اور ساتھی کو سائلانہ صورت میں دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہی مرزا صاحب کو اپنی سفارش کے لئے مجبور کر کے لائے ہیں حکیم مہدی پر ان کی روحانیت کا وہ اثر ہوا کہ کچھ کہنے سے پہلے عرض کیا کہ میں تعمیل حکم کو حاضر ہوں اور میر صاحب کی اس قدر امداد کی کہ وہ مالا مال ہو گئے اس دن سے پھر حکیم مہدی کی صحبت میں مرزا صاحب کی نقل نہیں ہوئی اور ان کے خدمت خلق کے جذبے نے سخت دلوں کو نرم کر دیا۔

حکیم مہدی زمانے کے نشیب و فراز سے ۱۲۳۵ھ میں وزارت سے ہٹا دیئے گئے اور شاہجہانپور چلے گئے ناسخ نے آغا میر کی دوستی میں تاریخ کہی جو کا شو برائے پختن شلغم گریختہ" قبر حکیم مہدی کی ایک اینٹ بھی باقی نہیں ہے۔

مقبرہ حکیم مہدی :- یہ قبرستان بہت کافی زمین گھیرے ہوئے اب بھی موجود ہے اور گول دروازہ سے امین آباد جانے والے راستے سمت چپ پر واقع ہے کرسی بلند اور ساحاطہ وسیع عمارت درمیان میں ہے جس کے بیچ کا گنبد تقریباً ۲۰ برس ہوئے بارش میں گر گیا پہلو کے گنبد باقی ہیں۔ چار دیواری بھی کہیں کہیں سے گر گئی ہے امرائے شیش محل اور ان کے خاندان کی یہاں قبریں ہیں نواب سید یوشعت حسین خاں طباطبائی جد امجدی کے ایک کنکوا بنانے والے بھی اس عمارت میں دفن ہیں۔

لہ قدیم بزم ص۱۲

امامباڑہ عتیق اللہ:۔ تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ امامباڑہ عتیق اللہ نہرہ میں کہیں تھا مگر کوئی بتانے والا نہیں کہ کہاں تھا اور عتیق اللہ کون تھے یہاں مرزا کبابی کی مشہور دوکان تھی ایسے لذیذ اور خوشبودار کباب بناتا تھا کہ شاہی باورچی خانہ میں بھی اس کی نظیر نہ تھی پانچ سیر بکری کے گوشت کا قیمہ دن بھر میں درست کر کے شام کو ٹکیہ کے کباب بیچنا شروع کرتا تھا وزن ہر کباب کا ۵ تولہ اور قیمت ایک پیسہ تھی زعفران اور خالص گھی ڈالتا تھا مرزا کی دوکان پر خریداروں میں نمبر تھا جو پہلے آیا۔ اس کو پہلے کباب ملتے تھے۔

امامباڑہ بوٹا صاحب:۔ اس امامباڑہ کا پتہ ۱۸۵۸ء تک تھا یہاں نصیرالدین حیدر بہادر کی بیگم گنگے محل کی لاش سونپی گئی تھی جو ایک عرصے کے بعد عراق[۱] روانہ کی گئی۔

مطبع علوی:۔ عہد شاہی میں اس نام کے کئی پریس تھے اور نہرہ ڈیوڑھی نواب منورالدولہ مرحوم میں ایک چھاپہ خانہ تھا۔ جس کے مہتمم حبیب علی تھے اس پریس میں اسی شان و شوکت کی لکھائی چھپائی ہوتی تھی جو عہد[۲] قدیم کا طرۂ امتیاز تھا ربیع الاول ۱۲۶۱ھ تک یہ پریس علمی اور مذہبی اور تاریخی کتابیں زیادہ سے زیادہ صحت کے ساتھ چھاپتا تھا۔

کوٹھی میر جعفر:۔ نہرہ میں ایک ایرانی شخص نے فروغ حاصل کر کے کوٹھی بنوائی تھی۔ جو شوستر کے رہنے والے تھے ایران میں شوستر کا ریشمی کپڑا اور اطلس بہت مشہور ہے ممکن ہے کہ میر جعفر ریشمی کپڑے بیچتے ہوں ۱۲۶۱ھ تک ان کی کوٹھی موجود رہی اور مطبع علوی اسی کوٹھی میں تھا۔

امامباڑہ مرزا ابوطالب خاں:۔ عہد قدیم صفدر جنگ کے نامور آدمی جنھوں نے سب سے پہلے لکھنؤ میں امامباڑہ بنوایا ان کا ذکر ڈھائی سو روپے ماہوار پانے والے طبقے کے ذیل میں عہدنامہ[۳] میں موجود ہے ان کے والد کا نام حاجی محمد بیگ تھا اس امامباڑہ کے بارے میں شیخ ممتاز حسین جونپوری کی رائے ہے کہ محلہ شتر خانہ آئینہ[۴] بی بی کے باغ میں ہے دفتر نہر سے متصل مگر میرے سامنے اس سے بہتر اور مصدقہ بیان ہے۔ ان سے پہلے کے اہل قلم کا جو علمائے فیض آباد میں ملا محمد علی راست گو ہے تذکرہ میں کہتے ہیں۔

"شش پسر داشت کہ ایشاں ہم بزیور علم و حلم آراستہ بودند ملا احمد علی و ملا قاسم علی و ملا جواد کہ مدفن او در لکھنؤ در حسینیہ مرزا ابوطالب خاں قریب غسلخانہ حکیم مہدی علی خاں واقعت و ملا اکبر علی کہ در سن ہیجدہ سالگی فوت شد و محمد رضا و نصیر علی در فیض آباد در صغر سن وفات یافتہ احمد علی در فرزند داشت ملا محسن کہ در حسینیہ آقا ابوطالب[۵] خاں مدفون شد" اس نوٹ میں امامباڑہ آقا ابوطالب خاں میں ملا جواد اور ملا محسن کے دفن ہونے کا ذکر ہے اور امامباڑہ کو حکیم مہدی کے غسلخانے سے قریب بتایا ہے آئینہ بی بی کے باغ میں حکیم مہدی کی کوئی جائداد ثابت نہیں۔ غسلخانے کو مقبرہ حکیم مہدی کا جز ہونا چاہیئے غسلخانہ اصطلاح اہل لکھنؤ میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں مردے نہلائے جاتیں بنا بریں امامباڑہ ابوطالب خاں ہو نہ ہو حکیم مہدی کے مقبرے کے گرد و نواح میں اس ذمہ دارانہ بیان کو دفتر نہر سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۲۹۵ھ تک اس امامباڑہ کے آثار باقی تھے۔

حکومت اودھ میں جب گردوپیش کی سیاست میں ابوطالب خاں کو ملک چھوڑنے پر مجبور کیا تو کلکتہ گئے اور ۱۲۱۳ھ میں

---

۱ بیگمات اودھ ۲ امامت فاسق کے موضوع پر ممتازالعلما کا رسالہ اس پریس میں چھپا ہے ۳ مطبع نولکشور ص۱۵۱ ۴ سرفراز محرم نمبر ۱۳۸۵ھ ص
۵ نجوم السماء فی تراجم العلما مرتبہ مرزا محمد علی کشمیری ص۳۵۱ طبع مطبع جعفری لکھنؤ

یورپ اور افریقہ کا سفر کیا اور فارسی زبان میں سفرنامہ ترتیب دیا جس کا نام رکھا "سیر طالبی در بلاد فرنگی" اس قلمی خدمت کا اردو ترجمہ مرزا علی رضا مخزون ابن مرزا محمد تقی ابن مرزا عبدالہادی بن عبدالقادر نے کیا اور سفرنامہ دو[1] جلدوں میں ۱۹۰۴ء برلاس پریس مراد آباد سے طبع ہوا۔

اس وقت بنہرہ اجاڑ ہے ایک ٹوٹی ہوئی مسجد نواب سردار صاحب کی اور ان کا امام باڑہ شکستہ حالت میں موجود ہے اور آگے بڑھ کر روزنامہ حقیقت کا دفتر ہے اور اس کے بعد ہیوٹ انجینئرنگ اسکول کی عمارت اور مقابل میں چھوٹی لائن کی سڑک بلندی پر ہے بظاہر مرقومہ بالا عمارات شاہی انجینئرنگ اسکول سے ریل کی پٹری اور جامعہ سلطانیہ کی زمین پر بقیہ لکھنؤ کی قدیم آبادی میں شیوخ بنہرہ تھے جن کی زمین ریزیڈنسی[2] کے کھنڈر تک تھی۔

پیاز و طوائف:۔ یہ ایک خوبصورت عورت تھی اور نواب منتظم الدولہ حکیم مرزا مہدی علی خاں کی آشنا تھی اس لئے بہت کچھ روپیہ جمع کر رکھا تھا حکیم صاحب نے اس سے نکاح کر لیا تھا اور جب تک پیازو زندہ رہی خوش و خرم زندگی بسر کی حکیم صاحب کی ترقی کی بنیاد پیازو ہی سے پڑی جس نے دھڑوٹ[3] کی رقم اپنے پاس سے ادا کر کے حکیم صاحب کو ایک صوبہ کی نظامت کا عہدہ دلوا دیا پیازو عہد سعادت علی خاں کی عورت تھی حکیم صاحب کی صحبت میں حج کا ارادہ ہوا اور مکہ کی راہ میں سہاگن مر گئیں۔

بنہرہ میں میرے ہمعصر شفاء الملک[4] حکیم سید فضل علی عرف میرن صاحب اور شیخ یوسف حسین خاں صاحب بیرسٹر کے آبائی مکانات بھی تھے۔

ٹھٹیری ٹولہ

تانبے کے برتن بنانے والے کو ٹھٹیرا کہتے ہیں پرانے زمانے میں یہاں برتن بنتے تھے سرکاری کاغذات کے علاوہ اس محلہ کو ٹھٹیری ٹولہ کہنے والا اب کوئی نہیں ہے اس وقت محلہ کو باورچی ٹولہ کہتے ہیں اور عہد شاہی سے اس وقت یہاں کھانا پکانے والے باورچی رہتے ہیں اور گھر میں کھانا پکنے اور باورچی کے ہاتھ کی چیزوں میں اتنا ہی فرق ہے جیسے درزی کے ہاتھ کی سلائی گھریلو سینے پرونے سے بہتر اور صفائی کے ساتھ نظر افروز ہوتی ہے۔ باورچی کی اس وقت بہت بڑی قدر تھی اور اچھا کھانا پکانے والا بڑی بڑی تنخواہوں پر بھی نہ ملتا تھا۔ اس وقت کا لٹریچر[5] دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ نوابی میں باورچی کے لئے جو صفتیں ضروری تھیں اس وقت کا عصر حاضر میں تصور بھی نہیں کیا جاتا طرح طرح کے انگریزی اور ہندوستانی کھانے پکانا تو اس کو جاننا ہی چاہیئے مگر خوبصورتی، کمسنی، خوش پوشاک ہونا بھی شرط تھا اور یہ سب اوصاف مشکل سے ملتے تھے۔ شکیل نوجوان کو یہ عہدہ بڑی خوشی سے دیا جاتا تھا اور راز اس کا یہ تھا کہ دسترخوان پر اس کا ہونا لازم تھا تاکہ کھانے کی بدمزگی کا جواب دہ اور عمدگی کی داد دینے میں نفاست پسند طبیعت کو بدصورتی یا میلے کچیلے کپڑوں میں دیکھ کر نفرت نہ ہو۔ ڈیڑھ سو برس کے کچھ خطوط میرے سامنے ہیں ان کے ترجمے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ کھانا پکانے والا کیسا ہو (۱) کیا تم چاہتے ہو کہ میں سوکھے[6] ٹکڑے کھاؤں تم سے مجھے پوری توقع ہے کہ خوبصورت کھانا پکانے والا دس روپے مہینہ پر راضی کر کے بھیجو اور ایک حقہ بردار بھی آئے جو فقط چلم پر آگ رکھ دیا کرے گا۔ صورت

---

[1] دیکھو علم و عمل جلد دوم وقائع عبدالقادر خانی ترجمہ مولوی معین الدین افضل گڑھی طبع اکیڈمی پریس کراچی [2] گزشتہ لکھنؤ ص۱۵۱ [3] قدیم ہنر ص
[4] سوانح مختصر شفاء الملک حکیم میرن صاحب نظامی پریس او مئی ۱۹۳۳ء [5] رقعات مرزا قتیل [6] ص

کا اچھا ہو، جوان ہو، انگریزی اور ہندوستانی کھانے پکانا جانتا ہو (۲) اچھا باورچی لکھنؤ میں دس روپے ماہوار پر نہیں ملتا۔ چہ جائیکہ انگریزی اور ہندوستانی کھانے پکانے والا۔" اس رقعہ سے واضح ہوتا ہے کہ عہد آصف الدولہ میں دستر خوان شاہی پر مغربی چاشنی پہونچ چکی تھی (۳) تنخواہ بیس روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں دی جا سکتی بشرطیکہ خوبصورت ہو (۴) بتن آنکے انگریزی اور ہندوستانی کھانے اچھے پکائے گا (۵) پیر بخش کو بھیج رہا ہوں یہ پچیس برس سے زیادہ عمر کا نہیں ہے اور صورت بھی اچھی ہے (۶) محمد جمال باورچی عرض کرتا ہے کہ میں نواب ضابطہ خاں کی سرکار میں فقط مرغ پلاؤ پکاتا تھا اس کے سوا کوئی کھانا نہ پکاؤں گا دوسرے باورچی بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم جس قسم کا پلاؤ پکاتے ہیں وہی تیار کریں گے اور ڈیڑھ سیر چاول سے زیادہ تعداد میں نہ پکائیں گے (۷) رقعہ نمبر ۴۰ کی اصل عبارت ملاحظہ ہو۔" فردا کھچڑی باجرا کہ از اغذیہ فصلی ہندوستان است برائے صاحب خواہد رسید قدرے انتظار باید کشید البتہ یکپاس روز بر آمدہ فرستادہ خواہد شد[لہ]"

باجرا کی کھچڑی جو ہندوستان کی فصلی غذا ہے صبح کو پہونچے گی صاحب (انگریز) انتظار کریں دن چڑھتے پر حاضر کروں گا نورتن پلاؤ، موتی پلاؤ، انار دانہ پلاؤ کی ترکیبیں قدیم ہنر مند ۱۲۳۴ھ میں درج ہیں۔

میر مہر علی انس :۔ میر انیس کے بھائی اور خصوصیت سے مرثیہ پڑھنے اور طرز ادا میں ممتاز مداح ۱۲۳۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۵ محرم ۱۳۱۳ھ میں پیمانہ عمر لبریز ہوا پریس نے ان کے مرثیے چھاپے ۔ شعراء اور شوقین اصحاب کے سینہ بسینہ قلمی مراثی بھی نظر آتے ہیں ایک مرثیہ کا مطلع ہے ؎ جام جہاں نما سخن آبدار ہے ۔ اس مرثیہ میں شہادت علی اصغر پر ان کی یہ بیت یادگار ہے ؎

تھا ساجسم ہاتھوں پہ تھرا کے رہ گیا   جنت کا پھول سامنے مرجھا کے رہ گیا

اس مرثیہ میں وہ مشہور بیت بھی ہے ؎   انکار آسماں کو ہے راضی زمیں نہیں

میر وحید :۔ بڑے باکمال شاعر تھے ان کے مراثی اور منظر کشی مشہور ہے ۱۲۶۳ھ ولادت کا سال ہے اور ۲۳ محرم ۱۳۰۸ھ ۱۸۹۰ء سال وفات ہے عمر ۴۵ سال۔

مزار شاہ عبد الرحمن

آپ لکھنؤ کے نامی فقراء میں تھے پرانی کتابوں اور صوفیائے کرام کے حالات میں آپ کا نام برابر نظر آتا ہے کہا جاتا ہے[لہ] کہ آپ سندھ کے رہنے والے تھے آپ کی چھپی ہوئی کتابوں میں آپ کے نام پر" النوری اور حنفی" کی لفظیں ہیں عہد سعادت علی خاں میں آپ کا طوطی بول رہا تھا لکھنؤ پہونچنے پر آپ نے مزار شاہ مینا صاحب پر قیام کیا جیسا کہ آئندہ اپنے محل پر تفصیل آئے گی ۔ آخر عمر میں باورچی ٹولہ آئے لکھنؤ کی شیعہ پبلک ان کو اچھی طرح پہچانتی نہ تھی اور سب اہلسنت بھی ان کے دوست نہ تھے ۔ ایک عالم مذہب امامیہ کی تحریر ملاحظہ ہو۔

حکایت می کنند کہ عبد الرحمن صوفی در لکھنؤ بمسجدے نشستہ چراغے دراں افروختہ بود سگے آمد و چراغ را خاموش کرد صوفی مذکور خدا ناشناس گفت کہ خانہ خود را خود بے چراغ کرد[لہ]۔

"آپ مسجد میں تھے کہ کتا آیا اور چراغ بجھا گیا تو فرمایا کہ اپنے گھر کا چراغ آپ بجھا دیا" اللہ جانے کس مصلحت سے ایسا کہا اور

لہ رقعات مرزا قتیل ص۵۵ طبع شاہی لہ دیکھو وفیات الاخیار لہ ذکر الحافظ ص۲۲

کس جذبے میں یہ فقرات زبان تک آئے اس کو تو وہی جانے جس کی ماحول پر نظر ہو مجھے اس کا یقین ہے کہ وہ عزاداری کے حامی اور مجلسوں کے دلدادہ تھے اور یہ جذبات[1] محبت ان کی کتاب سے ظاہر ہیں مزار کی عمارت ایک لمبی چوڑی زمین کو گھیرے ہوئے ہے جس میں بلند دیواریں اونچا پھاٹک خوبصورت عمارت مزار اور بہت پرانی مسجد پہلو میں ہے قبر پر گنبد اس قدر خوشنما تعمیر ہوا ہے کہ حضرت محمد واجد علی شاہ جب زیارت کو آئے تو معمار کی صنعت پر تعریف فرمائی۔ گنبد کے نیچے شاہ صاحب اور ان کے چیلے فتح علیشاہ کی دو قبریں ہیں خالی کے چاند پہلی سے لے کر چھٹی تک عرس ہوتا ہے اور تاریخ وصال ۶ ذیقعدہ ۱۲۴۵ھ ہے پہلوئے مزار میں کچھ پرانی قبریں اور بھی ہیں جن میں ایک سنگ مرمر کی جالی جو لوح مزار کی جگہ کسی قبر پر زمین دوز نصب ہے دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

<u>مسجد</u> :۔ لکھنؤ کی تمام مسجدوں کے کتبے سامنے رکھنے پر ماننا پڑتا ہے کہ یہ مسجد بہت پرانی اور عہد ماضی کی یادگار ہے شاہ[2] صاحب نے اسی مسجد کا سہارا لے کر یہاں ڈیرہ ڈالا مسجد کی موجودہ جو حالت ہے اس میں گنبد اور منارہ نہیں ہے بانی عمارت "کوکب" نامی کوئی امیرزادہ گذرا ہے جیسا کہ اس قطعہ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے جو سنگ مرمر پر اب تک لکھا ہوا محراب کے اوپر خوشخط نصب ہے۔

چو گردید کوکب از صدق دل	ایں خانہ کہ فزودش فردوس واجبست
تاریخ او ز عالم علوی بدل رسید	ایں مسجد منور از بدر کوکب است ۱۱۸۷ھ

سو برس کے بعد مسجد گری اور دوسری تعمیر فرزند علی خاں کے ہاتھ سے ہوئی۔ دوسرے پتھر میں بنا اول کا ذکر ہے اور مندرجہ اشعار میں کہیں کہیں لفظیں پڑھی نہیں جاسکیں پھر بھی نظر آنے والے الفاظ کی نقل ملاحظہ ہو ؎

ایں خانہ حق کہ داشت بنیاد قدیم	بکشاد	تعمیرش بجشست است
از سال بنائے آں دلم بود بے فکر		فرمود سروش بیت معمور انیست ۱۲۹۰ھ

برآمدہ بہت بوسیدہ ہو چکا تھا اور گرنے کا ڈر تھا کہ شہر کے دل چالاک رئیس اور تاجر فقیر محمد نے مرمت کرائی جو اس شعر سے واضح ہے ؎

لکھی اس کی تاریخ یہ میر نے	مرمت نہیں اصل تجدید دیکھ ۱۳۷۶ھ

<u>احاطہ تلسی رام</u> :۔ یہ احاطہ باورچی ٹولہ میں افتادہ زمین کی صورت میں اب بھی ہے اس کو حکیم بندہ مہدی نے کشمیری حضرات کی قبروں کے لئے وقف کیا تھا اور کثرت سے صاحبان کمال یہاں سپرد خاک ہیں۔ میر محمد شاہ صاحب بڑے ذاکر لکھنؤ کے جن کی زبان آوری اور شیریں بیانی کے اب تک ڈنکے بج رہے ہیں ۱۳۰۵ھ میں دفن ہوئے پھر سید حسن علی شاہ اور حاجی مرزا جعفر علی کربلائی ۱۸۵۹ء میں مدفون ہوئے یہ مقبرہ گولہ گنج کے مشاہیر ہیں۔

<u>فیلخانہ</u> :۔ حلقہ باورچی ٹولہ میں ایک حصہ آبادی فیلخانہ کے نام سے مشہور ہے اور ایک عالیشان بلند مسجد ہے جس پر شمس آبادی امراء کا قبضہ ہے مسجد کے جانب غرب ایک بڑا کنواں ہے یہی فیلخانہ کا جز تھا اور شاہی ہاتھی یہاں رکھے جاتے تھے کنوئیں میں زیادہ سے زیادہ پانی تھا جس سے ہاتھی پیاس بجھاتے تھے ہاتھی پر تین آدمی مقرر ہوتے تھے فیلبان گردن پر اس کے بعد جہادت اور پیچھے چرکٹا ہوتا جس سے آب ودانہ کا تعلق تھا عہد غازی الدین حیدر میں ہاتھی کا ہودہ اس صورت کا تھا کہ شکاری جس طرف رخ کرے

---

[1] ارشاد الرحمن مطبوعہ لکھنؤ [2] شاہ صاحب کی کتاب ارشاد الرحمن اردو ترجمہ ہو کر چھپی ہے اس میں خاص تحقیق یہ ہے کہ یزید نے قتل امام پر دو سو عالموں کے فتوے حاصل کئے تھے۔

اسی سمت گھوم جائے۔ (قدیم لکھنؤ)

کئی فیل وہ فیل خانے میں ہیں ۔ کہ بے مثل وہ سارے زمانے میں ہیں

چاندی خانہ :۔ باورچی ٹولہ سے ملا ہوا جز آبادی ہے یہاں بادشاہ دوم اودھ نصیر الدین حیدر بہادر کی بیگم ممتاز الدہر کی بارہ دری تھی اس کو نقرئی سامان کی کثرت سے چاندی خانہ کہا جاتا تھا۔ بادشاہ جہاں بیگم بڑی کنجوس اور جندس تھیں۔ شاہ نے ان کی تنگ نظری سے "کنگلے محل" کا خطاب دیا تھا ان کے بھائی کا نام سراج الدولہ تھا بیگم نے غدر کے بیس برس کے بعد اسی مکان میں دنیا سے سفر عقبیٰ کیا۔

مسجد ممتاز محل :۔ محلہ میں نمایاں بلندی پر اوسط درجے کی جو مسجد ہے وہ چاندی خانہ کی مسجد کہی جاتی ہے اس کو ممتاز محل ثانی ملکہ شاہ زمن غازی الدین حیدر بادشاہ اول اودھ نے اپنے پیسے سے بنوایا تھا ممتاز محل کی علمی لیاقت اچھی تھی اور دینیات سے باخبر ہونا ذاتی "خصوصیت تھی ان کے استاد خواجہ تحسین علی خاں خورد تھے جن کی مسجد کا حال اسی سلسلہ میں آرہا ہے مسجد کے سامنے پھاٹک اور دوکانات کا حصہ منہدم ہو کر دوبارا بنا ہے مدتوں صحن مسجد کے بعد خلا رہا مسجد میں قطعہ تعمیر بھی ہے جو زیادہ تر مٹا ہوا ہے۔

عاشق فاطمہ ممتاز محل ۔ صاحب عفت

زوج اوشاہ غازی الدین حیدر ۔ خود خورشید

کرد تعمیر چو از بہر نماز ۔ اندر خاک

محلسرائے سراج الدولہ :۔ یہ عالیشان قصر بھی اسی محلہ کے آثار قدیمہ میں تھا شیخ تصدق حسین کا بیان ہے کہ اس کے آثار ابھی باقی ہیں واقعات غدر میں اسی محلسرا کا اس طرح ذکر آیا ہے کہ ان ہی ایام میں فیروز شاہ خاندان تیموریہ سے لکھنؤ میں آیا جس کا مختصر حال یہ ہے کہ فیروز شاہ پس از حصول زیارات اسی ایام بغاوت میں اپنے وطن یعنی دہلی کو واپس آتا تھا کسی گروہ باغی نے اس کو اپنا بادشاہ قرار دیا چونکہ فوج انگریزی تدارک باغیان اطراف دہلی میں مصروف تھی اس پر بھی حملہ آور ہوئی تب فیروز شاہ بمقام فرخ آباد بھاگا وہاں کی فوج نے پھر تنظیم کرکے اس کو مالک بنایا فوج انگریزی نے اس فوج کو بھی مار بھگایا۔ فیروز شاہ لکھنؤ میں جان بچا کر آپہونچا۔ اہالیان دربار برجیس قدر نے فیروز شاہ کو بعد ادب و تعظیم کے مکان سراج الدولہ بہادر میں ٹھہرایا اور واسطے آسائش و آرام کے جگہ دی۔

کنگلے محل کا امام باڑہ :۔ یہ امام باڑہ جگت نرائن روڈ پر ہے اور شیخ تصدق حسین کی رائے ہے کہ ہیوٹ انجینرنگ اسکول اسی عمارت میں ہے۔

ڈیوڑھی نواب مہدی علی خاں :۔ باورچی ٹولہ کی پشت پر واقع ہے ان کا نام نامی محتشم الدولہ معظم الملک نواب مرزا محمد مہدی علی خاں بہادر یار جنگ تھا۔ لکھنؤ کے امیر کبیر تھے شمس العلما سید محمد ابراہیم صاحب مجتہد سے دلی عقیدت تھی عید کے دن ہاتھی پر سوار ہو کے قبلہ کی فینس پر سے روپیہ لٹاتے ہوئے عید گاہ تک جاتے تھے یہ محلسرا ایک بلندی پر تعمیر ہوئی ہے وسیع صحن اور احاطے میں زمین کے ٹکڑے ہو کر سیمین اور ہنود کے بنگلے بن گئے۔ پھاٹک سے پہلے ایک مسجد خانہ بھی بہت خوشنما

ؔ بیگمات اودھ

اسی وقت کی تعمیر کردہ موجود ہے۔ اس عمارت میں شاندار اور بلند دروازہ بڑے بڑے ہال وسیع کمرے ہیں پیچھے گول دروازہ سے امین آباد جانے والی سڑک اور محاذ میں چھوٹی لائن کی پٹری اور ریل کا جوڑا پل ہے جس پر ڈالی گنج اسٹیشن کا راستہ ہے۔

نواب صاحب کے بعد اس ڈیوڑھی کے مالک ان کے فرزند فلک جاہ تھے جو اعلیٰ درجے کے مصور اور بلند پایہ شاعر اور خوش گلو تھے ان کے دسترخوان کا کھانا ہمیشہ کوئلہ پر پکتا تھا تاکہ دھوئیں کی بو نہ ہو۔

چھوٹے تحسین کی مسجد

باورچی ٹولہ کی یہ مسجد بڑی آباد مسجد ہے اس کو تحسین علی خاں خورد نے بنوایا بڑے تحسین عہد شجاع الدولہ بہادر کے خواجہ سرا اور چھوٹے عہد ناصر الدین حیدر میں محل خانہ میں داخل ہوئے۔ آپ افغانی نسل حضرت پور اور بید سرا کے رہنے والے تھے باپ کا نام دلیل خاں تھا۔ ان کو شمس العلما سید محمد ابراہیم مجتہد مرحوم نے اپنے وصیت نامے میں "میاں محمد تحسین علی خاں مرحوم" کے نام سے یاد کیا ہے باپ ان کے سپاہیوں میں نوکر تھے ایک مرتبہ ان کو قزاقوں نے راستے میں لوٹ کر قتل کر دیا اور تحسین علی بردہ فروش کے پالے پڑے۔ اس ظالم نے طمع زر میں ان کو خواجہ سرا بنایا اور ۱۲۴۳ھ نصیر الدین حیدر کی ولیعہدی میں محل شاہی میں پہونچے پانچ برس کا بچہ دیکھ کر ولیعہد بہادر نے بڑے ناز و نعم سے پالا نواب محسن الدولہ پرورش کے نگراں تھے موصوف نے خود قرآن مجید پڑھایا بعد حمد پڑھائی اردو چلنے پر وہ نوحہ مرثیہ پڑھنے لگے۔

نصیر الدین حیدر جب تخت نشین ہوئے تو ان کی ایمانداری اور نیکی دیکھ کر کے عہدے عطا فرمائے پہلے باورچی خانہ، پوشاک خانہ سپرد ہوا پھر پرگنہ سدھور کے چکلہ دار ہوئے اس عہدے پر پہونچکر تحسین کو فارسی میں کمال پیدا کرنے کا ذوق ہوا۔ گلستاں بوستاں پڑھنے پائے تھے کہ ان کے ہمعصر درشن سنگھ نے بادشاہ کے بڑھتے ہوئے ابر کرم کو غصہ کی گھٹاؤں سے تبدیل کر دیا۔ اور ۱۲۵۰ھ میں میاں تحسین قید کر لئے گئے۔ جیل پہونچ کر آپ نے فارسی میں کمال حاصل کیا اور دستور الصبیان، انشاء خلیفہ، مادھورام پہلا دفتر ابو الفضل انشاء مرزا طاہر وقائع نعمت خاں عالی سہ نثر ظہوری پنج رقعہ مینا بازار توقیعات کسریٰ رقعات مرزا قتیل، قصائد عرفی رسالہ عروض قید میں رہ کر پڑھے یا تو جیلر فارسی داں تھا یا اسیروں میں کوئی قیدی فارغ التحصیل ہو جس نے ان کو پڑھایا چھ برس کی قید میں شرح جامی تک پڑھکر زندان کے باہر آئے تو دیکھا کر جو جائداد کارندوں پر چھوڑ دی تھی وہ خرد برد کر دی گئی۔

مرزا ابو تراب کے قبضے میں محلسرا آئی اور اسی ہزار کے مکان پر مرزا صاحب کا قبضہ ہو گیا۔ جب بادشاہ نے انتقال فرمایا اور محمد علی شاہ بادشاہ تخت نشین ہوئے تو منور الدولہ کی سفارش سے ۷ ہزار روپے پیشکش کر کے قید سے چھوٹے علم فقہ پڑھنا شروع کیا سید العلما سید حسین مجتہد العصر اور شیخ تفضل حسین دوسرے عالم جلیل کے درس میں شرکت کی اور فضیلت کے درجے پر پہونچے تو امجد علی شاہ کا زمانہ آیا اور ایک چھوٹا قرآن شریف خوشخط اور بہترین لکھا ہوا نذر کر کے فغفور پلٹن کی سرداری حاصل کی اور گاؤخانہ کے منتظم قرار پائے۔ نیکی اور پاک طینتی سے محلات شاہی میں بلائے جاتے تھے اور بیگمات اور وہ مسئلہ مسائل پوچھکر ایک عالم کی حیثیت سے ان کی عزت کرتی تھیں۔

امجد علی شاہ بہادر نے کھٹری ٹولہ میں کچھ جائداد جو کسی مصلحت سے اپنے غلام قربان علی کے نام زد کی۔ قربان علی کو

باندہ کے قحط میں مول لے کر مسلمان کیا تھا اور آزاد کر دیا تھا۔ اس بدمعاش نے غدر ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں قیصر باغ کی جائداد پر قبضہ کر لیا اور کھیٹری ٹولہ کی جائداد تو کاغذات کی رو سے اس کی ملکیت تو تھی ہی۔ انگریزی دور میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ خاندان غفرانمآب کے شاگرد اور عقیدت کیش اور قابل اعتماد تھے اس لئے سلطان العلما مجتہد العصر و الزماں نے شہادت دی اور چند معزز گواہوں کی شہادت پر مقدمے میں کامیاب ہوئے مگر جوڈیشل کمشنر نے عدالت ماتحت کے فیصلے کو منسوخ کر دیا اور جائداد قبضے میں نہیں آئی قبلہ و کعبہ کی بیاہتا بیوی کے فرزند ارجمند سید عبداللہ صاحب نے اپنی ایک تالیف[۱] میں تحسین علی خاں کا نام اس طرح سپرد قلم فرمایا ہے "گل سرسبد گلستان مجد و نور حدیقہ حشمت و اجلال دو ستدار ائمہ ہدیٰ جاں نثاران اہلبیت رسول خدا صلوات اللہ علیہم اجمعین منبع جود و احسان خان عالیشان محمد تحسین علی خاں" شعر و سخن میں بھی کمال تھا اور بڑے زود گو تھے میر ضمیر اور ناسخ سے غزلوں پر اصلاح لیتے تھے امجد علی شاہ کے زمانے سے غزل کہنا چھوڑ دی تھی میر انیس سے اصلاح لیتے تھے ایک مناجات ان کی میری نظر سے گذری ہے حج کی تمنا بھی دل میں تھی دو مرتبہ حجاز کے سفر پر تیار ہوئے جدہ پہونچنے کے قریب تھے کہ ہوائے مخالف نے اسٹیمر کو پلٹا دیا۔ اس سفر میں ان کے رفیقوں نے طرح طرح سے دھوکا دے کر روپیہ، اشرفیاں، جواہرات، قیمتی انگوٹھیاں حتی کہ پروانہ راہداری تک غائب کر دیا اور دوسری مرتبہ بھی حج سے محروم رہے تیسری مرتبہ افتاں و خیزاں مکہ و مدینہ کی زیارت نصیب ہوئی۔ سفر عراق کا ان کے خود نوشتہ[۲] حالات میں ذکر نہیں ہے آخر عمر اور انگریزوں کی سلطنت میں پنشن نہ ہوتے سے بڑی تکلیف میں ان کی زندگی بسر ہوئی پھر بھی ان کا وقف محلہ ندکور میں باقی ہے اور امور خیر بند نہیں ہوئے جس کی تفصیل یہ ہے۔

مسجد:۔ عمارت بڑی نہیں ہے اس وقت یہ مسجد "علن کی مسجد" کہی جاتی ہے علن دور آخر کے مؤذن تھے جن کے حسن خدمات نے تحسین کا نام لینے کے بجائے عوام میں انھیں کے نام کو شہرت دی۔ طبقہ مسجد کا بلند اور چند زینہ کے بعد صحن مسجد کے سامنے پہونچنے سے تحسین کی قبر زیر سنگ مرمر نظر آتی ہے منارے گر چکے ہیں چھت قالب دار بغیر گنبد کی ہے اور صرف ایک درجہ ہے۔ صحن کے پہلو میں حوض اور دروازے سے قریب بیت الخلا ہے۔ پشت مسجد پر مؤذن کا مکان نیچے چند دوکانات ہیں مسجد کا ذکر میاں تحسین کے اپنے لکھے ہوئے حالات میں حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

"الف خاں قاری مؤذن مسجد تعمیر کردہ حقیر واقع محلہ کھیٹری ٹولہ متصل ڈیوڑھی معتمد الدولہ مرحوم عقب مکان مغصوبہ نوابی بیگم خوشدامن قربان علی عبد نمک حرام" ان لفظوں میں ان کے مصائب پر اشارہ ہے مسجد پر جو کتبہ ثبت ہے وہ بنفس خود تحسین علی خاں کا نظم کردہ ہے ؎

مسجدم پاک شد بنا واللہ	سال تاریخ خواستم دلخواہ
ناگہاں آمدہ ندا از غیب	کرد تحسین بنا بیت الہ ۱۲۶۳ھ

مسجد آباد ہے اور اہل محلہ کی طرف سے مجلیس نماز جماعت ہوتی رہتی ہیں۔ بانی مسجد کی طرف سے عشرہ محرم میں سہ پہر کو روزانہ مجلسیں اور ہر ماہ کی اٹھارہ کو ایک ماہوار مجلس مقرر کی گئی تھی جس میں پیش خوانی میں خاندان مرزا دبیر یا ان کے شاگردوں میں سے کسی کا مرثیہ پڑھنا ضروری تھا۔

---

[۱] خلاصۃ الاعمال ص۳ طبع مطبع سلطانی ۱۲۴۵ھ کی تالیف [۲] ذات الیقین مخطوطات۔

کوٹھی میاں تحسین :۔ مسجد کے پچھواڑے ایک خوشنما عمارت تھی جو شیشہ آلات اور قدیم فرنیچر سے آراستہ تھی اور دو قطعہ مکان اس کے علاوہ تھے جس کی قدیم صورت اور ہیئت پچاس سال پہلے تک باقی تھی۔ تحسین علی خاں نے اپنے وصیت نامے میں اس جائداد کو شمس العلما سید محمد ابراہیم صاحب کی تولیت میں دیا اور آٹھ ہزار روپے کے پرامیسری نوٹ محفوظ کئے یہ سرمایہ اس وقت بھی باقی اور وقف ممتاز العلما کا جزہے۔ تحسین علی خاں کا رہائشی مکان یہی جائداد ہے مسجد کے عقب میں دو قطعہ مکان بھی ہیں جو وقف کا جزو ہیں اور ٹرسٹ کا ان پر قبضہ ہے۔

شیر جنگ کا باغ

نواب برہان الملک فرمانروائے اودھ کی دختر ہما بیگم عرف بندی بیگم کی شادی اپنے چچیرے بھائی کے ساتھ ہوئی ان کا نام نثار محمد خاں ابن میر محمد باقر خاں تھا اور شاہ دہلی کی طرف سے شیر جنگ خطاب تھا یہ باغ انھیں کی طرف منسوب ہے اب باغ میں ایک درخت بھی نہیں ہے چھوٹی لائن اسٹیشن کا مال گودام تاڑی خانہ لکڑی کی ٹال اور قدیم قبرستان ہے جو ساری زمین کو گھیرے ہوئے ہے اور لکھنؤ کے کتنے صاحبان کمال شعرا، امرا، اہل علم زیر زمین دفن ہیں یہاں ٹھنڈے پانی کا ایک بڑا کنواں موجود ہے جو اب جدید پارک اور نئی مندر سے متصل ہوگیا ہے پہلے اس کنوئیں کا پانی دور دور سقے بھر کے لے جاتے تھے اس مقام کے تاریخی حالات میں وہ مجرا ہے جگا طوائف کا جو نصیر الدین حیدر نے اپنی ولیعہدی میں دیکھا تھا ہم اس کا ذکر نہیں کرتے (قدیم نمبر ۶۹)

بلند باغ

چھوٹے اسٹیشن سے گذر کر جو راہ دفتر وقف بورڈ اور ہیضہ اسپتال جاتی ہے یہی کبھی بلند باغ تھا اب زمین کی پستی اور بلندی کے سوا آثار قدیمہ میں کچھ باقی نہیں یہ باغ نواب معتمد الدولہ آغا میر کا تھا اور ضبطی جائداد کے بعد نواب ملکہ جہاں کے قبضہ میں آیا۔ ریل کا بڑا پل اور نواب مہدی علی خاں بہادر کی ڈیوڑھی جس کا ذکر باورچی ٹولہ کے ذیل میں ہوا انھیں حدود میں ہے ریلوے کے پل کے بعد ایک چھوٹی مسجد ہے اور آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی وقت قبرستان تھا کچھ قبریں اب بھی باقی ہیں اکثر دھوبی اس زمین پر کپڑے سکھاتے ہیں بقولے مسجد کے روبرو آفتاب دنیائے ادب میر تقی میر کی ابدی آرامگاہ ہے مگر میری رائے ہے کہ وہ اس سے آگے ہے اور لوہے کے پل کا قبرستان جس کا ذکر آگے آئے گا یہاں تک تھا اور یہ اس حصے کی آخری قبریں ہیں جس کے بعد ریلوے لائن ہے۔ اس وقت یہاں سلطنت منزل اور حامد پارک بلند باغ کی اراضی پر ہے جس کو بلند حیثیت حاصل ہے۔

وزیر گنج

نواب آصف الدولہ کے لے پالک نواب وزیر علی خاں کا آباد کیا ہوا ہے اور وہ اسی محلہ میں رہتے تھے آثار قدیمہ میں خاقان منزل :۔ وہ مشہور عمارت ہے جو اب تک موجود ہے حضرت محمد علی شاہ بادشاہ مرحوم کے ایک صاحبزادے ملکہ جہاں کے پیٹ سے تھے جن کا نام تھا ہمایوں بخت مرزا احمد علی خاں۔ ان کی شادی نواب نور بیگ خاں رئیس مدراس کی بیٹی سے ہوئی تھی اس خاتون کو سسرال سے خاقان بہو کا خطاب ملا تھا۔ خاقان منزل انھیں کی یادگار ہے جو سڑک سے بلند ٹیلے پر واقع ہے۔

شاندار پھاٹک وسیع میدان لق ودق صحن اور انگنائی میں نہر امام باڑہ نما دالان اور شاندار شہ نشین کونوں پر خوبصورت برجیاں، خوشنما محراب دور باقی کے عز وجاہ کا پتہ دے رہے ہیں۔ خاقان منزل کے رؤسا میں سید محمد مہدی صاحب نے ۱۰ رجب ۱۳۳۲ھ اور نواب سید سجاد حسین ولد حکیم میر صادق صاحب نے ۱۱ صفر ۱۳۲۰ھ کو انتقال کیا۔ اس خاندان کے افراد بھی کراچی میں موجود ہیں۔

محلسرائے ڈپٹی محمد عظیم خاں :۔ یہ عمارت جو بجنسہ اب تک موجود ہے رؤسا رخاقان منزل کا امام باڑہ تھا اور عزاخانہ کی سب سے بڑی علامت یہ تھی کہ عمارت کی کرسی بلند ہونے کے باوجود پھاٹک سے اوپر تک لکھوری اینٹوں کی ڈھال تھی جس پر سے دلدل آسانی سے گذرے اس عمارت میں ۴۵ کمرے ہیں اور مدت تک ذاتی استعمال میں رہنے کے بعد روشن خیال وارث عمارت نے وقف کرکے امام باڑہ عزائے حسین نام رکھا ہے اور اپنی جیب سے امام باڑہ کی آراستگی اور شیشہ آلات میں روپیہ صرف کرکے نمایاں حیثیت دی ہے ڈپٹی صاحب کی بہو ستن کی کھیر پکاتی تھیں جو ذائقہ اور نفاست کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر تھی۔

نواب خورشید زمانی بیگم :۔ بھی اس محلسرا میں مقیم تھیں رونق زمانی بیگم، قمر زمانی بیگم اس خاندان کی وہ بیگمات تھیں جو ملکہ زینت محل کے بھائی کا کنبہ تھا دہلی کے غدر میں یہ لوگ پراگندہ ہوکر رنگون، لکھنؤ اور خدا معلوم کہاں کہاں رہے بیگم صاحبہ موصوفہ کے پاس جواہرات اور زیور ومال کے علاوہ "سیار سینگی" ملک کا وہ عنقا تحفہ تھا جو صرف شہنشاہوں کے خزانے میں ملتا تھا ماہی سقنقور، اور عرب میں سفید پروں کا کوا اور سیار کے سر کا سینگ عنقا کی حیثیت رکھتا ہے لاکھوں سیاروں میں کوئی ایک سیار سینگ دار ہوتا ہے اس کے خواص یہ ہیں کہ جس کے پاس رہے اس پر تلوار گولی برچھا کوئی حربہ اثر نہیں کرتا۔ بچھو کی شکل کا یہ ایک سینگ تھا جو خزانے میں محفوظ رہتا تھا اس پر سفید رونگٹے پیدا ہوا کرتے تھے۔

بہادر شاہ ظفر کی نقرئی مہر اور ایک مونگے کی تسبیح بھی اس گھر میں تھی بیگم صاحبہ کی رحلت کو کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرا ہے ان کی تاریخ وفات "ہائے مغفورہ" ہے۔

قصر ملکہ جہاں :۔ سلطنت اودھ کی با اقتدار خاتون حضرت محمد علی شاہ بادشاہ کی بیگم جس عالیشان محل میں رہتی تھیں۔ وہ ڈپٹی صاحب کی محلسرا کے سامنے سڑک کے اس پار بلند سڑک کی جگہ تھی اور ایک دیوار اب تک باقی ہے اس عمارت کا سلسلہ جوبلی اسکول تک چلا گیا تھا اور سٹی اسٹیشن ملکہ جہاں کی آراضی پر بنا ہے "حامد ویل" ملکہ جہاں کی زنانی ڈیوڑھی کا کنواں ہے۔ جو اب تک اسٹیشن کے سامنے واقع ہے اور پیاسے سیراب ہوتے ہیں۔

ملکہ جہاں بیگم :۔ حضرت محمد علی شاہ بادشاہ کی با اقتدار بیگم مدتوں عراق میں رہیں اور وہیں ان کا پیمانۂ حیات لبریز ہوا۔ آغا محمد مرزا لکھنوی اپنے سفرنامہ عراق میں لکھتے ہیں "یہاں، عورتوں کے واسطے مثل ہندوستان کے ڈولی میانہ یا فینس نہیں ہے بلکہ امیر وغریب عورتیں سب پیدل چلتی پھرتی ہیں۔ عربن، عجمن اور ہندی کی چال میں بھی فرق ہے۔ متمول اور غریب چادر سے معلوم ہو جاتی ہے غریب عورتوں کی چادر معمولی سیاہ رنگ اور امیر کی ریشمی سیاہ رنگ ہوتی ہے ہندوستانی بڑی متمول اور معزز عورتیں بھی اسی طرح زیارت کو پیدل جاتی ہیں۔ سب سے بڑی اور متمول معزز ہندی معظمہ لکھنؤ کی نواب ملکہ جہاں تھیں جن کو بارہا میں نے اس طرح دیکھا کہ آگے آگے مسلح سپاہی ان کے بعد یہ ہیئت مذکورہ سیاہ ریشمی چادر پنجہ میں بوڑھی بیگم

صاحب ممدوح جن کے قدم بہ سبب خلاف عادت ضعیفی کے بہت آہستہ آہستہ اٹھتے تھے ان کے داہنے بائیں دو بڈھے لمبے خواجہ سرار بغلوں میں ہاتھ دیئے اور پیچھے پیچھے خواص و لونڈیاں سب کے بعد پھر چند سپاہی ہوتے تھے اثنار راہ میں رہگیر اکثر سر کے اشارے سے سلام کرتے جاتے اور خاص کر ہندی لوگ تو جھک جھک کر اپنے ملکی طریقے پر تسلیم بجا لاتے تھے۔

جان صاحب :۔ اسی سرکار کے متوسلین میں تھے سرکار کے عراق چلے جانے اور شہر کی ویرانی کے بعد ان کی زندگی رامپور میں بسر ہوئی۔ جان صاحب مرد سیہ فام یعنی کالے دھیونر تھے۔ ہاتھ میں لوہے کا کڑا پڑا ہوا غرارہ دار پیجامہ چڑھا ہوا جوتا جسم میں انگرکھا سر پر زلفیں جن کے سرے پر انگوٹھیاں اور چھلے بندھے ہوئے ہاتھ میں ڈنڈا۔ یہ وضع تو ہمہ وقت تھی مگر مشاعرہ میں ریختی کلام پڑھتے وقت جسم میں زنانہ جوڑا ہونا یا کم از کم بھاری دوپٹہ ضروری تھا رامپور میں جب پہلی دفعہ گئے اور مشاعرہ میں شرکت کی تو ملکہ جہاں کا بھاری جوڑا جسم میں تھا شہر میں پہونچنے کی اطلاع پر نواب نے مشاعرے کی خبر دی اور جان صاحب نے ناخواندہ مہمان ہونے کا عذر کرتے ہوئے سب سے پہلے خود ہی پڑھ کر مجمع کو درہم برہم کر دیا شعر کیا تھا؟ ایک چوٹ تھی، معاصرین پر شمع سامنے پہونچتے ہی کہا ؎

میں تو بوڑھی ہوئی اب میری ضرورت کیا ہے مری نوچیوں میں کیجئے سرکار پسند

ہاتھ کا اشارہ حاضرین کی طرف ہوا اور سامعین میں یہ انداز خواندگی ایسا پُر اثر ہوا کہ چھتیں پھٹ گئیں حاضرین کی رائے ہوئی کہ آج کا مشاعرہ انھیں پر ختم ہو پھر کوئی نہ پڑھا۔ ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

لیے پھری مجھے قسمت کہاں کہاں میری کسی نے قدر نہ کی زیر آسماں میری

پہاڑی کوے موئے کاؤں کاؤں کرتے ہیں نہ منہ دکھاؤں جو پیدا کرے زباں میری

جان صاحب نے ۱۲۹۵ھ رامپور میں قضا کی۔

ملکہ جہاں خط نسخ میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں سوانح عمری جناب فاطمہؑ دختر حضرت سرور کائناتؐ اپنے ہاتھ سے ۲۵۰ صفحات پر لکھی تھی جو ان کے پروتے پرنس عابد مرزا صاحب کے پاس موجود تھی اور ایک قرآن شریف اپنے ہاتھ سے لکھا جس کے پندرہ پارے کربلا اور پندرہ پارے نجف میں روضوں پر چڑھائے یا امام رضا کے مزار پر واقعہ نگار کو بیان میں شک ہے، ملکہ جہاں نے خوشنویسی جینا بیگم سے سیکھی تھی یہ محمد علی خوشنویس کی رفیقۂ حیات تھیں۔

ملکہ جہاں نے ۹ جولائی ۱۸۹۰ء کو وطن آکر انتقال کیا اور لاش کربلا بھیجی گئی۔

اماماڑہ میر مہدی حسین منجم :۔ رضوی سادات اور کھرے سیدوں میں تھے اس قدر دولت مند تھے کہ اپنی بی بی کا ڈیڑھ لاکھ کا مہر آسانی سے ادا کیا علم نجوم اور جفر میں ید طولیٰ حاصل تھا اور بہت بڑے عامل شمار کئے جاتے تھے غدر سے پہلے فوت ہوئے اور چہلم نہیں ہونے پایا تھا کہ بھگدڑ ہوئی۔ ان کے علم و عمل کے کارنامے بہت ہیں جن میں دو واقعے قابل ذکر ہیں (۱) ان کی رفیقۂ حیات کا ایک تقریب میں جو ان کے گھر ہی میں تھی جوتے کا بٹوا کسی مہمان عورت نے گھما دیا اس پر جاہر تھے وہ پریشان ہوئیں اور سید صاحب سے اصرار کیا کہ ابھی مل جائے کچھ ایسا کیجئے۔ سید صاحب تیار نہ تھے کہ مہمان کی ہمارے گھر میں فضیحت ہونا بدنامی کا باعث ہے مگر بی بی نے کہا کہ ایسی عورتوں کو بے عزت کرنا ہی آئندہ محفلوں میں چوری نہ ہونے کا انسداد ہے۔ آپ ضرور

۱ تذکرۂ کربلا چھاپہ نولکشور ۱۹۰۸ء ۲ نیا دور

تدارک کریں سید صاحب نے نقش لکھ کر آگ میں رکھا اسی وقت آنے والی عورتوں میں ایک خاتون سراسیمہ ہو کر بکسوا دے گئیں بیتابی میں ان کا یہی نعرہ تھا کہ "ہائے جلی"۔ (۲) ایران زیارت کے لئے گئے شاہ ایران کی بیٹی پر کچھ آسیب تھا اور کسی طرح اس کی حالت نہ سنبھلتی تھی ان کا کمال چھپا ہوا نہ تھا اہل قافلہ سے پبلک میں بھی خبر تھی کہ ایک سید عامل زائروں میں موجود ہے حکومت کے ادنیٰ سے اعلیٰ افراد نے ان کو قصر شاہی لے جانا چاہا مگر یہ انکار کرتے رہے کہ میں زیارت کو آیا ہوں بادشاہ کی ملاقات کو نہیں آیا علمائے سلطانی میں کسی سنجیدہ نے آپ کو توجہ دلائی کہ آپ سید ہیں اور آپ کے جد نے یہ نہیں کہا ہے کہ کسی کو مبتلائے مصیبت دیکھو اور مدد نہ کرو۔ اس بات پر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک پڑھی ہوئی لونگ پاؤں کے انگوٹھے کی گھائی میں دبا لی مریضہ کے قریب پہونچے اس نے اردو میں بات چیت کی کہ میں نے تمھاری ذات سے لکھنؤ چھوڑا تم یہاں بھی میری جان پر نازل ہوئے۔

روشن لال کا کنواں:۔ وزیر گنج میں یہ کنواں مشہور جگہ ہے روشن لال عہد امجد علی شاہ یا ان سے پہلے عہدۂ دیوان پر فائز تھے، ان کے بیٹے لالہ گنگا پرشاد اردو کے ادیب تھے قصۂ ہشت چمن ان کی نثر نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے جس کا افتتاح حمد و نعت سے ہے اور شاہ کی مدح کے بعد قصہ شروع ہوتا ہے۔

ڈیوڑھی ممتاز الدولہ:۔ نواب ممتاز الدولہ رؤسائے شہر میں بڑی آن بان کے رئیس تھے تاریخ اودھ میں ان کا نمایاں ذکر ہے۔ بڑی آباد سرکار تھی نواب کے فرزند مرزا غفنفر مرزا بہادر کے وقت تک دروازے پر ہاتھی بندھا رہتا تھا دہلی دربار میں شرکت کے بعد ان کا انتقال ہوا اور یہ جائداد ورثا نے مہاراجہ محمود آباد کے ہاتھ فروخت کر دی جس پر "اقبال منزل" کی عمارت تعمیر ہوئی اس ڈیوڑھی کے آخری کارپرداز ماسٹر ابو جعفر تھے اور یہ پہلا گھر ہے جہاں شہر میں چائے کے رواج سے پہلے چہلم تک کی مجلسوں میں روزانہ چائے تقسیم ہوتی تھی۔

نیاز فتحپوری لکھتے ہیں ـــ حسن باندی لکھنؤ کی مشہور خوش گلو طوائف تھی اور فیاض بھی۔ ایک بار جان صاحب کو قصیدہ لکھنے پر سو روپیہ انعام بھی دیا مگر تھی سیہ فام بدشکل فربہ اندام اور کاداک۔ ایک بار نواب ممتاز الدولہ کے جلسے میں مجرا کر رہی تھی مسی کی دھڑی ہونٹوں پر جمی ہوئی تھی مگر پان کا لکھوٹا نہ تھا اس لئے بہت بدنما نظر آ رہی تھی سید حسن لطافت بھی شریک جلسہ تھے انھوں نے نواب کو مخاطب کر کے کہا حضور ملاحظہ فرمایئے۔ آج تو بلغ کیچڑ کھا کر آئی ہے نواب یہ پھبتی سنکر بے ساختہ ہنس پڑے"۔

وزیر گنج کے صاحبان کمال میں شیخ فدا حسین کاتب منشی شمس الدین کے ہمعصر تھے آفتابی دائرے بنانے میں ان کا جواب نہ تھا ان کے علاوہ میر بنیاد حسین صاحب لکڑی کے استاد تھے شرافت اور نجابت میں بھی وہ قابل تعظیم سمجھے جاتے تھے شہر کے علماء، رؤسا، اطباء ان کے شاگرد تھے۔

اصغر حسین نامی ایک بزرگ بانس بریلی کے رہنے والے اکثر وزیر گنج میں ٹھہرتے تھے یہ بھی لکڑی میں استاد تھے اور ہاتھ کی یہ صفائی تھی کہ کوڑی پر ان کی تلوار چلتی تھی اور ریشم کاٹ دیتی تھی۔

مسجد روشن علی:۔ آپ علم رمل کے جاننے والے تھے ممکن ہے کہ اسی محلہ میں رہتے ہوں مسجد اوسط درجے کی ان کی یادگار باقی ہے فن کتابت میں بھی ان کو کمال تھا چنانچہ حاجی سید سخاوت حسین مرحوم کے تجارتی کتب خانہ میں ان کے ہاتھ کا شاہکار رضیاء الرمل مایۂ ناز نسخہ تھا روشن علی کے شاگردوں میں مولوی حفیظ اللہ صاحب تصنیف تھے ان کی شرح زبدۃ الرمل مشہور کتابوں میں ہے اس محلہ[۱] میں فراشخانہ جو

[۱] دیکھو تحفۃ السالکین بابت ماہ رمضان ۱۲۸۵ھ نشر کردہ میر عابد علی صاحب مالک مطبع

مشہور ہے وہ فراشخانہ میر روشن علی کے نام سے سو برس پہلے مشہور تھا۔

گھانسی کی بغیہ:۔ اس محلہ میں سلطنت اودھ ختم ہونے کے بعد ایک بزرگ حاجی حسن علی رہتے تھے جن کا سفرنامہ سبیل الحاج بزبان فارسی عہد قدیم میں مطبع حیدری میں طبع ہوا ان کی دوسری تالیف تحفۃ العوام ہے اور ۱۲۹۱ھ میں یہ ایک پریس کے مالک بھی تھے تحفۃ العوام اس قدر مقبول ہوئی کہ آج تک شیعہ پریس نے لکھنؤ، دہلی اور معلوم نہیں کہاں کہاں طبع کرکے لاکھوں روپے پیدا کئے اور کتاب کی مقبولیت[۱] پر سو برس کے قریب ہو رہے ہیں حرف نہیں آیا۔

حاجی حسن علی کی قبر مکان رجّن صاحب پسر حکیم شمس الحسن شاہ صاحب مرحوم کے پہلے ایک چھوٹے مکان کے دروازے کے روبرو زمین دوز مگر پختہ زمین کی صورت میں اب بھی ہے گھانسی کی بغیہ کو چہ غیر نافذ ہے اور کسی وقت میں گلی کے پہلے پھاٹک تھا جس کے بند کرنے سے محلہ محفوظ ہو جاتا تھا۔ گھانسی کی بغیہ کے آخری مکانات کسی قبرستان پر تعمیر ہوئے ہیں بعض مکانات کی مرمت میں یہاں سے قبریں نمودار ہوئی ہیں۔

نواب سید محمود علی خاں:۔ نسل وزیر اودھ کے ایک باکمال شخص تھے جو علوم مشرقیہ میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے دستکاری میں ان کا جواب نہ تھا کپڑے کے خاصدان اور کنجی قفل ایسا بناتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ بدر کا کام ہے پختگی مضبوطی نقش و نگار سنہرے اور روپہلے پھول دیکھنے کے قابل تھے جلد سازی میں بھی فرد فرید تھے اور ان کی صحافت کا اچھے اچھے دفتری مقابلہ نہ کر سکتے تھے علی گڑھ یونیورسٹی میں ان کے ایک شاگرد جلد سازی کے اعلیٰ عہدے پر اس وقت بھی کام کر رہے ہیں طبی معلومات بھی نواب صاحب کو تھی ریٹھے کی ایک کھیر پکاتے تھے جو ایک مرتبہ کھانے پر تا حیات قوت بصر میں کافی طاقت، چشمے کی ضرورت نہ رہتی تھی وہ مرتے دم تک عینک نہیں لگاتے تھے دوسرا نسخہ بواسیر کا ان کے پاس تھا جس میں مرغ کو سرخ بینگن کی بونڈی کھلا کر کچھ دیر کے بعد اس کو ذبح کرکے یہ بونڈی اس کے شکم سے نکالتے تھے مجھے دونوں نسخے دیدینے کا وعدہ تھا جو زبانی ممدوح کو یاد نہ تھے مگر ضعف پیری نے مہلت نہ دی اور حیات نے وفا نہ کی اور کمالات قبر میں لے گئے ایک کتب خانہ ممدوح نے چھوڑا جو میرے نام وقف کیا اور میں مدرسۃ الواعظین کے سپرد کر چکا۔ نواب صاحب نے ۲۰ شعبان ۱۳۶۶ھ میں قضا کی اور باغ شیر جنگ میں سپرد خاک ہوئے۔

اس حلقے کے مشہور لوگ

طومار میں ڈیوڑھی نواب معتمد الدولہ وزیر گنج و بازار راجہ و باورچی ٹولہ کی تحت میں حسب ذیل لوگوں کے نام درج ہیں نواب ممتاز الدولہ بہادر مع مرشد زادہ داروغہ دلدار خاں، داروغہ محمد خاں، سید حسن صاحب، لطافت میر مومن علی نواب سیف الدولہ نواب صادق علی خاں صاحب۔ نواب میر محمد حسین صاحب، نواب جعفر علی خاں صاحب، شیخ علی حسین صاحب، میر حیدر صاحب، وارث علی خاں فہم، سید محمد مہدی صاحب، حکیم میر صادق صاحب، حکیم میر کاظم صاحب، اچھے صاحب، میر علی سجاد صاحب، میر علی نقی صاحب۔ نواب ناظر اعتماد علی خاں صاحب، حاجی بشیر علی خاں صاحب، شیخ محمد تقی صاحب، حاجی عبد العلی صاحب، محمد سجاد حسین خاں صاحب، میر رضا حسین صاحب، نواب سراج الدولہ بہادر، میر محمد جان صاحب، سید محمد صاحب، تحسین علی خاں صاحب، نواب سرفراز الدولہ بہادر، آغا مہدی علی خاں، سید صادق حسین صاحب، سید مہدی حسین صاحب، میر صادق حسین صاحب، نواب نظر علی خاں صاحب، نواب ابو الحسن خاں صاحب، شیخ بندہ علی صاحب مع برادران منجھو صاحب، سید رضا علی خاں صاحب، حیدر مرزا صاحب، میر محمد رضا صاحب، میر مہر علی صاحب

---

[۱] حاجی حسن علی کی دوسری کتاب احکام الائمہ نولکشور پریس نے ۱۲۹۳ھ میں طبع کی۔

انس، میر احمد شاہ صاحب، حاج حسن علی صاحب، حاج حسین علی صاحب، میر عابد علی صاحب، مطبع مرزا علی حسن صاحب، نواب مرزا محمد زکی خاں صاحب نواب عابد حسین خاں صاحب، مرزا محمد باقر صاحب کشمیری، منشی عبد اللہ صاحب ملازم نواب صادق علی خاں صاحب۔

مشک گنج

چمڑے کی مشکیں بنائی جانے سے یہ محلہ مشک گنج مشہور ہوا اور اس محلہ کی بنیاد بھی عہد آصفی میں قائم ہوئی تھی مشکیں بہشتیوں کے کاندھے پر رکھ کر گھر گھر پانی پہونچاتا تھا کھاروے کی سرخ لنگیاں اور کمر پر مشک سقوں کا پرانا پہناوا ہے امیروں اور محلات میں بہشتی منہ پر اندھیری ڈال کر پکارنے کے بعد چلا جاتا اور اندر سے آنے کی اجازت کی ضرورت نہ محسوس ہوتی۔ اندھیری لنگی کے ایک حصہ کو چہرہ پر ڈال لینے کا نام ہے سی پی میں مشکیں بیل یا بھینسے پر رکھ کر بھی گھر گھر آب رسانی ہوتی ہے اور عراق میں گدھوں سے اس باربرداری کا کام لیا جاتا ہے اور بازار کے گشت کرنے والے کے ہاتھ میں کٹورے کا ہونا بھی ضروری تھا جو مشک سے کنوئیں کا ٹھنڈا پانی بھر بھر کر راہگیروں کو پلاتے تھے۔

مسجد آصف الدولہ :- اس محلہ میں جو مسجد وسیع چوکور موجود ہے یہ خانہ خدا عہد آصفی کی عمارت ہے جس کو ملا سید علی اصغر صاحب عربی پروفیسر کیننگ کالج لکھنؤ نے دوبارہ تعمیر کیا۔ آثار قدیم پر جدید عمارت ہے حوض اور کنواں پرانا اب تک ہے دوسری مسجد مولسری والی مسجد کہلاتی ہے اور بعض لوگ اسی مختصر مسجد کو مسجد آصفی سمجھتے ہیں جو غلط ہے یہ چھوٹی مسجد زمانہ شاہی میں کوئی گوہر بیگم تھیں ان کی تعمیر کردہ ہے۔

محلہ کے صاحبان کمال میں :- بہت سے افراد قابل ذکر ہیں جن کے علم و عمل کے نمونے بھی زیر زمین دفن ہو گئے کچھ کے نام اور آثار باقی ہیں (۱) وزیر خاں، لکڑی کے فن میں استاد تھے اور بڑے بڑے معزز لوگ ان کے شاگرد تھے فارسی کے مشہور ادیب منشی احمد حسن صاحب اور ملا علی اصغر صاحب مرحوم ان کے شاگرد تھے (۲) میر عابد علی صاحب مرحوم عہد شاہی کے بعد شیعہ پریس کی بنیاد میں سب سے پہلے اقدام کر کے مطبع اثنا عشری اور مطبع حسینی اور مطبع امامیہ مختلف ناموں سے چھپائی کا کام شروع کیا اور علمی ادبی لاتعداد کتابیں چھاپ کر نشر ہوئیں پریس کا لٹریچر زیادہ تر اس وقت کا کاغذ رف تھا جو پڑھتے پڑھتے چاک ہو جاتا تھا اور کتاب کی عمر ختم ہو جاتی تھی۔ میر صاحب کو مناظرے کی مشہور کتاب کنتاب چھاپنے کے جرم میں قید بھی ہونا پڑا۔ جیل سے رہا ہو کر وہ ہر کتاب کے ٹائٹل پر لکھتے تھے کہ "یہ کتاب واسطے مذہب شیعہ کے چھاپی گئی ہے حضرات اہلسنت و جماعت ملاحظہ نہ کریں"۔ لکھنؤ میں سب سے پہلے شیعہ پیپر "اخبار امامیہ" انھوں نے جاری کیا جس کے کالم پرانے چال کے مقالات اور مسئلے مسائل سے بھرتے تھے ۱۹۱۲ء میں اس اخبار کو سیاسی رنگ دے کر روزانہ کیا گیا اور جنگ عظیم کے موقع پر یہ اخبار زیر ادارت حکیم سید ذاکر حسین اختر بھرلیوی نکلتا رہا اور پریس ایکٹ کے شکنجے میں آ کر ختم ہو گیا۔

میر صاحب کے کئی بیٹے تھے اور سب یہی کاروبار اختیار کئے ہوئے تھے مطبوعات کی فہرستوں پر کہیں کہیں ان کا نام ملتا ہے سید سجاد علی کو دعا تعویذ کا شوق تھا اور افسانہ نگاری قدیم سے واقف تھے "مصیب نامہ ثابت نامہ" واقعہ کربلا کے مابعد پر ان کی انوکھی تصنیف ہے جو "مختار نامہ" کے ضمیمہ ہیں اسلوب نگارش میں ان کا زور قلم قاتلان حسین کی ہلاکت کے موقع پر بے دھڑک لکھتا تھا فی النار و السقر مع الجد و الپدر اور اس زمانے کے عربیت نواز ادبار کا ذریعہ تھا دعائے نور کبیر اور بڑی نادعلی بھی انھیں کی نشر کردہ ہے اردو ہو یا عربی ان کے تحریرات میں داستان امیر حمزہ کا رنگ ضرور ہے اور امیر خسرو ۶۲۵ھ کے مرنے والے کو یاد دلادیا یہ وہی دعا ر قور ہے جو عوام میں زیر کفن رہتی تھی میر عابد علی

صاحب نے عین عید کے دن مسجد آصفی کے مجمع میں بڑی عمر پاکر اچانک دنیا سے سفر آخرت کیا عباد علی بنیاد علی ان کے بیٹوں کے نام ہیں نسل ان کی موجود ہے وہ مشک گنج کے جزر فراشخانہ کے رہنے والے تھے (۳) اس محلہ میں سید ہدایت اللہ خاں المتخلص بہ بدا نبیرہ مخبر الدولہ سعید الممالک حکیم سید ماشاء اللہ خاں اسد جنگ نجفی الجعفری رہتے تھے ان کی تقویم نوروز ملک کے طول و عرض میں محتاج تعارف نہیں ہے یہ فن ان کا خاندانی تھا اور اس وقت ان کے نواسے سید فصیح اللہ خاں عرف سید محمد سعید اور ان کی بہن موروثی علم کی ماہر ہیں اور تقویم و زائچہ سالانہ نوروز کے موقع پر چھپتا ہے اور شیعہ علماء میں ان کے مقرر کردہ احکام قمر در عقرب مستند سمجھے جاتے ہیں (۴) تاج العلما سید علی محمد صاحب مرحوم۔ آپ قبلہ وکعبہ مجتہد العصر والزماں کے فرزند ارجمند تھے باپ کی اولاد میں سب سے زیادہ علم رکھنے کے باوجود دوسرے بھائیوں کی قائم مقامی پر راضی تھے اور گدی نشینی کا سودا دماغ میں نہ تھا مشرقی علوم میں یکتا تھے اور فلسفہ ومنطق فقہ واصول وعلم ہندسہ کے ساتھ عبرانی بھی جانتے تھے اور اس علم کو آپ نے ایک عیسائی پادری سے حاصل کیا تھا جس نے آپ سے عربی پڑھنے کی خواہش ظاہر کی وہ تو ماضی مضارع کے صیغوں میں الجھ کر رہ گیا اور آپ اس کے پڑھانے سے عبرانی کے زبردست عالم مانے گئے ان کے دور تک عبرانی لٹریچر دنیا کی لائبریریوں میں موجود تھا چنانچہ تاج العلماء کے اکثر تصانیف میں کہیں کہیں عبرانی عبارتیں نظر آتی ہیں تاج العلماء خطاب مرحوم شاہ اودھ کا عطیہ ہے جو خاندان غفرانمآب پر ان کی آخری مرحمت تھی۔ آپ کے تصانیف عظیم آباد جونپور وغیرہ میں طبع ہوئے اور کتنے تالیفات استداد زمانہ نے باقی نہ رکھے عربی شاعری میں ان کا کلام پختہ اور ٹھوس ہوتا تھا اردو کے شعر وسخن میں ان کا ذوق عنوان مزاج نمایاں ہے جو زبان نوازی کا قابل قدر جذبہ تھا ان کے کلام میں پچاس برس پہلے وہ چاشنی موجود ہے جو مولوی اسمٰعیل نے ۱؎ صدی کے بعد اشعار میں پیدا کی ملاحظہ ہو۔

مسلمانوں کو یارب اب نہ ترسا ۲؎ — جھما جھم مینھ کرم سے اپنے برسا
یہی تجھ سے ہے ہم سب کی گذارش — بھریں جل تھل یہ شدت کی ہو بارش
نہ برسیں ڈونگرے یارب نہ جھلے — بھڑی دل کی تمنائیں نکالے

ولہ

سب ہی فانی ہیں ماسوائے اگر — ایک فقط اس کی ذات باقی ہے
لی سکندر نے راہ ملک عدم — اور آب حیات باقی ہے
نہ سلیمان رہے نہ تخت ان کا — اور سب کائنات باقی ہے
حب آل نبیؐ بکار حسینؑ — بس یہی راہ راست باقی ہے
تشنہ لب قتل ہوئے امام حسینؑ — اور نہر فرات باقی ہے ۳؎

تاج العلماء نے سنہ ۱۳۱۲ھ میں آغوش لحد کو آباد کیا امام باڑہ غفرانمآب ان کی ابدی آرامگاہ ہے ہندوستان کے طول وعرض میں ستاروں کی طرح ان کے شاگرد بکھرے ہوئے تھے جن میں شیخ محمد ممتاز حسین عثمانی اڈیٹر اودھ پنچ عبرانی کے آخری ماہر تھے اور استاد کی ذات پر فخر کرتے تھے نیل پا علامہ کا پیام موت تھا جو مرتے مرتے نہ گیا۔

۱؎ چودھویں رات کا چاند ص ۱۲۵ ۲؎ مذ ص ۲۷۵ ۳؎ ذی الحجہ سنہ ۱۳۱۲ھ مطبع میر عابد علی لکھنؤ

گولہ گنج

وزیر گنج سے گذر کر دو محلے مشرقی سمت پڑتے ہیں جن کو بارود خانہ اور گولہ گنج کہتے ہیں دونوں کا تعلق شاہی توپ خانہ سے تھا یہ نہیں معلوم کہ محلہ کب آباد ہوا۔ قیصر باغ کی راجدھانی سے قریب ہوتے ہوئے ممکن ہے کہ عہد واجدی میں محلہ آباد ہوا ہو۔ یہاں بھی رؤسا، امرا، شعرا، صاحبان کمال آباد تھے اور محلہ کے بعض آثار قدیمہ باقی نہیں رہے بعض اپنی اعلیٰ شان وشوکت پر اب بھی گواہ ہیں۔

مطبع کارنامہ:۔ ابتدا انگریزی عہد نواب محسن الدولہ بہادر میں محمد یعقوب انصاری نے ایک پریس کھولا جو شاہی خصوصیات کا حامل تو نہ تھا میں نے اس کے قلم برداشتہ مطبوعات دیکھے ہیں اور ایک کتاب کا آخری نوٹ یہ ہے "در مطبع کارنامہ واقع امامباڑہ ملکہ زمانیاں رونق طبع یافت" امامباڑہ پر آگے چلکر بحث ہوگی۔

مطبع آئینہ حق نما:۔ یہ چھاپہ خانہ ۱۲۸۰ھ[1] میں چل رہا تھا لکھنؤ کی مختلف لائبریریوں میں اس کے نشریات نظر آتے ہیں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں تھا۔

مخبر صادق:۔ یکم اپریل ۱۸۵۶ء کو میر اصغر علی نے اس محلہ سے ہفتہ وار اخبار مخبر صادق زیر ادارت مرزا اثر محب[2] جاری کیا۔

اماباڑہ نواب امیر مرزا صاحب:۔ گولہ گنج کے اماباڑوں کا ذکر ہم عنقریب شروع کرتے ہیں اس اماباڑہ کا اب کوئی پتہ بتانے والا نہیں ہے تیس برس پہلے کا ایک مطبوعہ رقعہ اور اس اماباڑہ میں مجلس کا اعلان میرے سامنے ہے بظاہر یہ اماباڑہ محمد یوسف کاظمی کے مکان کے قریب تھا۔

حکیم صادق صاحب:۔ آپ عہد[3] شاہی کے ہر دلعزیز طبیب اور شاہی حکیم تھے نہایت خوش رو اور گورے شخص تھے مقیم الدولہ راجہ نواب علی خاں آف محمود آباد اور حکیم صاحب سے بہت رسم تھے رہنے والے نبہرہ کے تھے اور مطب گولہ گنج میں تھا گرمیوں میں ململ کا کرتا اور جوڑی گوٹ لگی ہوئی ٹخنوں کے نیچے تک پہنتے تھے گریبان اس کا بائیں جانب اور بہت سی کلیاں طرحداری کی وجہ سے اس میں پڑی رہتی تھیں شفاء الملک حکیم میرن صاحب آپ کے شاگرد رشید اور بھتیجے چچا کی یادگار تھے سلسلہ نسب ان کا یہ ہے۔

- حکیم صادق
  - حکیم سید فضل علی عرف میرن شفاء الملک
  - حکیم سید محمد قاسم عرف صاحب عالم و برادران جن کی اولاد کراچی اور خیرپور وغیرہ میں ہے
- حکیم مرتضیٰ
  - سید لطیف حسین عرف سید و وکیل حیدرآباد گراں گوش اور ثقل سماعت تھا آخر عمر میں لکھنؤ آئے اور پھاٹک اندرونی اماباڑہ غفرانمآب میں دفن ہوئے۔

حکیم فضل علی پہلے شخص ہیں جنھوں نے فارسی ترک کرکے اردو میں نسخہ لکھا صوبہ کے کل اطبا فارسی میں نسخے لکھتے تھے۔

مولوی انور علی:۔ گولہ گنج میں مشہور مولوی تھے خوشنویسوں میں نام تھا شاہ عبدالرحمٰن سے سلسلہ مریدی تھا اور ان کی کتاب

---

[1] نور الابصار در احوال مختار اور جوشن صغیر مطبوعہ ۱۲۸۲ھ اور کنز العلوم حاشیہ بر میبذی

[2] نیا دور دسمبر ۱۹۵۹ء

[3] مختصر سوانح عمری شفاء الملک حکیم میرن صاحب

تنویر الرحمن کا آپ نے اردو میں عام فہم ترجمہ کرکے ارشاد الرحمن ۱۲۹۹ھ میں مطبع شام اودھ سے چھاپ کر شائع کیا۔

جعلئے میرن :۔ چک منڈی گولہ گنج کے قریب کے رہنے والے تھے جنھوں نے نقلی دستخط، فرضی دستاویزات، جعلی تحریریں بنانے میں حیرتناک مہارت پیدا کی تھی ۱۹۰۸ء کے پہلے یا بعد کا ذکر ہے کہ فریب کاری کھل گئی اور مقدمہ چلنا شروع ہوا ہفتہ وار اخبار تفریح لکھنؤ میں عدالتی کارروائیاں چھپتی تھیں اور یہ اخبار ایک پیسہ کو نولکشور پریس سے چھپ کر بکتا تھا آخر میں سزا ہوئی اور سلسلہ مقدمات کچھ بڑی شخصیتوں کی طرف سے روک دیا گیا ورنہ معلوم نہیں کون کون اور ماخوذ ہوتا بعض نامور وکیل کہتے رہے ؏

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

حیدر خاں گوئیے :۔ سلطنت اودھ میں موسیقی کو بھی فروغ ہوا اور جو صاحبان کمال یہاں ہوئے وہ اپنے وقت کے تان سین تھے چنانچہ عہد غازی الدین حیدر بہادر میں حیدر خاں کا ایسا خوش گلو اور ماہر فن کوئی نہ تھا ان کے کمالات کے تذکرے مدتوں زبانوں[1] پر رہے۔

مرزا محمد ہادی رسوا :۔ تیرھویں صدی کے آخری صاحب کمال تھے شمس العلماء سید محمد ابراہیم مجتہد سے تلمذ تھا علوم مشرقیہ اور مغربیہ[2] میں یکتا تھے کیننگ کالج لکھنؤ نے ان کے علمی خدمات کو بفخر حاصل کیا۔ آزاد مزاج اور بے پرواہ طبیعت کے آدمی تھے کئی کئی دن کالج نہیں جاتے تھے اور جب جاتے تھے تو جس شعبے کا پروفیسر غیر حاضر یا رخصت پر ہوتا اس درجے کے طلبا کو آسانی سے پڑھاتے اردو ادب میں بھی ان کا نظیر نہ تھا نمونہ سخن ؎

چٹکیاں جلتی ہیں سوز عشق کی تاثیر سے　　چارہ گر چھالا بدلتا ہے تو آتش گیر سے

(ولہ) کربلا جنت میں جا پہونچے تو میرا کیا قصور　　خود زمیں اٹھی نہ اٹھائیں درِ شبیر سے

(ولہ) دست قدرت نے جو زینب کی ردا تیار کی　　کتنے ہی رشتے نکالے چادرِ تطہیر سے

(ولہ) کھنچ گیا گنج شہیداں کا مرقع بے مثال　　پھوٹ نکلے ہیں بہتّر رنگ اک تصویر سے

آپ نے ۱۹۳۱ء میں اس دنیا ناقدر شناس کو چھوڑا ۱۳۲۲ھ میں آپ نے امامیہ مشن کھولا تھا اور ایک پرچہ الحکم لکھنؤ سے جاری کیا جو علمی جریدہ تھا وہ اور تالیفات یادگار ہیں وہ بہترین ناولسٹ بھی تھے ان کے ناولوں میں خونی عاشق، خونی مصور، شریف زادہ ذات شریف، امراؤ جان، خونی شہزادہ۔

رسوا کے تصانیف میں تحفہ اثنا عشریہ شاہ عبدالعزیز دہلوی کی رد میں کئی جلدیں بڑی تقطیع پر تحفہ سنیہ شیعہ کانفرنس کے اسٹیج رفاہ عام لکھنؤ میں مزدور ٹوکرے میں رکھ کر لایا تھا اور قوم نے اس عظیم تصنیف کی زیارت کی ان کے فاضل ورثہ نے یہ کتاب مکتبہ مدرستہ الواعظین لکھنؤ میں داخل کردی۔ رسوا کے حالات ان کا عکس ادبی جرائد میں وقتاً فوقتاً چھپتا رہتا ہے اور ملک کے طول و عرض میں ان کے شاگرد بھی لاتعداد ہیں منجملہ ان کے مولوی محمد حبیب[3] اللہ رشدی دکھن کے عظیم صحافی تھے جنھوں نے حیدرآباد یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور نظام گزٹ جاری کیا آخر میں ہفت روزہ ابلاغ کی ادارت کی اور ۱۹۶۵ء میں رحلت کی۔ ان کی ناول امراؤ جان[4] ادا کا روسی زبان (تاجکستان) میں ترجمہ ہوا ہے۔

---

[1] گوشۂ لکھنؤ ص ۱۰۱　[2] دیکھو کتاب کریم فی ترجمۂ ابراہیم　[3] روزنامہ جنگ کراچی صفحہ ۱۲ فروری ۱۹۶۶ء　[4] جنگ ۱۲ فروری ۱۹۶۶ء

مکان فیروز الدولہ :۔ گولہ گنج میں ان کا بھی مکان تھا یہ شاہی خواجہ سرا بڑے مالدار آدمی تھے مرزا دبیر ان کی مجلس میں پڑھا کرتے تھے اور بڑی معرکہ آرا خوانندگی ہوتی تھی۔ دبیر کی وفات کا ان پر گہرا اثر تھا والد کے بعد جب مرزا اوج صاحب کسی تقریب میں ان کے یہاں گئے تو دلی تمنا ظاہر کی کہ وہ مرحوم کا پختہ مقبرہ بنوانا چاہتے ہیں اوج نے انکار کیا کہ ان کی وصیت ہے کہ غیر کے روپیہ سے عمارت نہ بنے۔ فیروز نے اوج کو رخصت کرتے وقت ہزار روپے کا توڑا فینس میں رکھ دیا کہ اگر یہ خدمت قبول نہ کی تو میں خودکشی کرلوں گا۔ مرزا اوج نے بعد چند دن کے ان کا جوش کم ہونے پر یہ رقم واپس کردی (حیات دبیر)

اختر اودھ[1] :۔ ۱۸۸۳ء میں عاشق علی عاشق نے گولہ گنج سے یہ ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔

قاری یعقوب علی خاں نصرت :۔ گولہ گنج کے باشندوں میں مشہور شخص علم قرأت اور شعر و سخن میں ممتاز فن شاعری کے ماہر مشرقی تہذیب کے نمونہ تھے۔ قوم کے معمار تھے ممتاز العلماء فخر المدرسین کی صحبت میں مقدر نے پہونچایا مجھ سے خود کہتے تھے کہ میں نے تقرب کی صورت یہ پیدا کی کہ جب بازار سودا لینے جاؤں تو جو چیز دو پیسے کی ڈیوڑھی سے منگائی جائے وہ میں تین پیسے کی لاؤں اور اندر سے باہر تک تعریفیں ہوں کہ بڑا ایماندار شخص ہے اسی طرح سودا سلف لاکر عزت حاصل کی۔ ادھر فیض صحبت نے دینیات کا ماہر بنانا شروع کیا۔ شاعری لکھنؤ کے یکہ والے تک جانتے تھے اور کم ہوں گے ایسے۔ جو موزوں طبیعت نہ ہوں اساتذہ سے فن حاصل کرکے شاعر ہوئے۔ کسی قاری نے قرأت سکھا کر قاری بنا دیا یہ سب صدقہ تھا ممتاز العلماء کی کفش برداری کا۔ ورنہ اس وقت کے اساتذہ شاگردوں سے نجابت اور شرافت کا پہلے سوال کرتے تھے اور پست طبقے کو شاگرد نہیں بناتے تھے رفتہ رفتہ صاحب جائداد ہوگئے مگر بڑھاپے میں آخر عمر تک "کنی بسولی" کو یادگار سمجھ کر گھر میں رکھا اور ہر حلقے میں عزت کی زندگی بسر کی آخر وقت ۱۹۱۹ء میں جو مقدمہ اولاد ممتاز العلماء کے خلاف دفعہ ۱۹۲ کی تحت میں دائر ہوا اس میں مدعی کی طرف سے گواہی دی اور ۱۳۴۶ھ میں بغیر اولاد نرینہ چھوڑے ہوئے دنیا سے گذر گئے بیٹیوں کی اولاد موجود ہے نمونہ سخن ملاحظہ ہو ؎

اے جنوں جب ضعف میں قصد بیاباں ہوگیا — دست وحشی میں عصا چاک گریباں ہوگیا
کوشش انساں سے کیا ہوتا ہے ہوتا ہے وہی — لکھ دیا تقدیر میں جو کاتب تقدیر نے

نصرت کے انتقال پر اخبارات نے نوٹ لکھے اور ان کی رحلت نے قدیم تہذیب میں خلا واقع ہوا۔

مسجد آتو جی :۔ یہ مسجد بہت کشادہ اور بلند خوبصورت عمارت ہے اگرچہ بہت زور و شور سے بہتے ہوئے نالہ پر بنائی گئی ہے مگر داہنے بائیں آباد دو سڑکیں ہونے سے پُر رونق ہے مینار زیادہ اونچے نہیں ہیں اور چھت پر بخلاف دوسری مسجدوں کے پانچ گنبد ہیں بڑا پھاٹک وزیر گنج سے گذرنے والی سڑک پر اور چور دروازہ جگت نرائن روڈ کی سمت تھا جو اب بند ہے۔ صحن میں املی کے بڑے درخت پانی کا حوض چبوترے کے پہلو میں حجرے ہیں مسجد دور سے دکھائی دیتی ہے۔ رئیسوں کے محل میں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت اور اخلاق کی دیکھ بھال جس عورت سے متعلق ہوتی ہے وہ آتو کہلاتی ہے آتش کہتے ہیں ؎

جھانکا تو نہ کر عبث فضیحت ہوگی — آتو یہ سنیں گی تو قیامت ہوگی

عبدالغنی نے ان کے چال چلن پر تاریخ اودھ میں متضاد بیان سپرد قلم کیا ہے اور یہ نہ سوچا کہ جس عورت کا کردار مشتبہ

---

[1] نیا دور دسمبر ۱۹۵۹ء

ہو وہ آتو کے عہدے پر نہیں آسکتی دو کایستھوں سے ان کی محبت اور راجہ جھاؤلال کی منظور نظر عورت کی خدمت میں عہدہ خواص حاصل کرنا صحیح نہیں ہے۔ آتو جی کا تلاش معاش میں روشن الدولہ کے گھر آنا اور حکیم مہدی کا ان کو قدسیہ بیگم کے محل میں پہونچانا قصہ گوئی اور بادشاہ کی سرکار میں تقرب اور یہ فروغ کہ بادشاہ بغیر ان کے نہ کھانا کھاتے نہ سوتے نہ جاگتے اور پھر آتو جی کا نان وشبینہ کو محتاج ہونا وہ بیانات ہیں جو ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ آتو جی عمر کے کسی حصے میں تنگدست نہیں ہوئیں ان کا قدسیہ بیگم کی طرف سے پانچ ہزار روپے روز محتاجوں کو بانٹنا تاریخی واقعہ ہے ان کے بیٹے کا نام قادر علی خاں تھا اور مسجد انھیں کی تعمیر کردہ ہے ماں کے نام پر پبلک نے مسجد کا نام مشہور کیا تیرہویں صدی میں مسجد کے آخری متولی قاری یعقوب علی خاں تھے اور اب ان کی نسل مہتمم ہے۔

<u>امامباڑہ داروغہ میر واجد علی</u>:- میر واجد علی پسر میر عباس ڈیوڑھی سلطان محل کے داروغہ تھے شاہ اودھ نے مثنوی میں خود ان کا ذکر کیا ہے ؎

میرا ایک ہمنام داروغہ تھا وطن سے یہ خط اس نے مجھ کو لکھا
جو واجد علی کی پڑھی عرضداشت وہ حاصل ہوئی تھی مجھے وقت چاشت[1]

سلطان محل کے پاندان کا خرچ دو ہزار روپے ماہوار تھا۔ انقلاب سلطنت کے بعد وہ کلکتہ نہیں گئیں اور غدر میں میر واجد علی کے مشورے پر دو یورپین خواتین کو اپنی محلسرا میں چھپایا۔ اس رحمدلی کے صلے میں ان کی جاگیر برقرار رہی نوٹ قبضے میں رہے۔ میر واجد علی کے سیاسی کارنامہ اور اس پرآشوب دور میں ملکہ کو بچانا اپنی جان کو خطرے سے دور رکھنا حد درجہ قابل تعریف ہے امامباڑہ محلہ کی ایک قدیم مسجد کے قریب میر واجد علی کے اہتمام سے بنا اور عام دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ مسجد بھی میر واجد علی کی تعمیر اور جزو امامباڑہ ہے مسجد میں دوسری عمارتوں کے برخلاف پتھروں کی جڑائی بتاتی ہے کہ اس کا امامباڑہ سے تعلق نہیں اور یہ عہد قدیم کی یادگار ہے۔ مسجد کا ایک حجرہ سنگی فرش سے کسی زیر زمین دفینہ یا قبر کا پتہ دیتا ہے۔ امامباڑہ میں معمولی درجے کا پھاٹک کشادہ صحن پہلوؤں میں کمرے مع شہ نشین تین درجے اور صحنچیاں ایک منزلہ عمارت ہے غربی صحنچیوں میں بالائے بام کچھ کمرے ہیں۔

امامباڑہ میں عشرہ اور شبوں میں معمولاً مجلسیں ہوتی ہیں اور وہ مہندی شہرۂ آفاق ہے جو ساتویں محرم کو وکٹوریا سٹریٹ سے اٹھ کر گولہ گنج آتی ہے ۱۹ رشعبان ۱۲۸۵ھ کو سلطان محل نے پچاس ہزار روپے کے پرامیسری نوٹ اور دو ہزار روپے ماہوار کی جاگیر اور دس ہزار روپے کے جواہرات اور سات ہزار روپے مالیت کے باغ جلوس مہندی کے لئے وقف کئے مہندی اب تک داروغہ صاحب کی اولاد کے زیر اہتمام اٹھتی ہے۔

میر واجد علی کے آثار باقیہ میں امامباڑہ غفرانمآب کی وہ امداد ہے جو انھوں نے ایک دروازے کی صورت میں قائم کی۔ اور امامباڑہ کی مرمت میں بھی حصہ لیا۔ اس دروازہ کا سنہ تعمیر اس قطعہ سے ظاہر ہے ؎

ایں تعزیت سرا کہ زغفرانمآب ہست مانند کعبہ قبلۂ حاجات مرد و زن
ایں جا ہزار مرتبہ مجلس بنا شدہ از قطرہائے اشک فتادہ در عدن

---

[1] مثنوی حزن اختر صفحہ ۱۲۵

ہر صفہ و رواق وے دہر حظیرہ اش — پاکیزہ منزل برکاتست بے سخن
ایں خوابگاہ مجتہد العصر والزماں — سید محمد است وحسین است وہم حسن
در ہر مقام وے کہ ستونے ستادہ است — سرویست از حدیقۂ شمعیت درلگن
چوں از جفائے دہر دراں رخنہ فتاد — بشکست خانہ دل ما از غم وحزن
والا نژاد سید واجد علی بنام — توفیق یافتہ زخدا وند ذوالمنن
یکجا سعادت دو جہاں در سرہ روح اوست — در چار عنصر است تولائے پنجتن
از حب اہلبیت کہ دارد بآب و گل — گردید در بنا حسینیہ قطرہ زن
تعمیرِ تمام شد از اہتمام او — مانند نظم بیت بہ کلک زبانِ من
دروازہ جدید بنا کرد یک طرف — چوں باب صبر پیش روی خانۂ محن
دو شینہ التماس زمن کرد عالمے — تاریخ ایں بنا کہ پسندید اہل فن
چوں مجدم زخامہ من بر بخت رشحہا — بادِ صبا کشود دو صد نافۂ ختن
گل کرد سال ایں ہمہ تعمیر از قلم — شد نو بنو بنائے عزا خانۂ کہن ۱۲۹۰ھ

یہ دروازہ میڈیکل کالج کی سمت ہے جو اب تک میر واجد علی کی یادگار ہے۔

میر واجد علی کو شعر و سخن سے بھی ذوق تھا اور تسخیرؔ تخلص تھا امیر حسن فروغؔ ان کے بیٹے اور خورشید حسن مہرؔ نواسے تھے۔ میر واجد علی نے ۴ دسمبر ۱۸۶۸ء کو داغ مفارقت دیا وہ اور سلطان محل دونوں امامباڑہ میں دفن ہیں اور ان کے خاندان کے دوسرے لوگوں کی قبروں سے امامباڑہ لبریز ہے۔

اس امامباڑہ کے قدیم ذاکر میر تقی شاہ تھے جو مقبرہ جناب عالیہ میں رہتے تھے اور امامباڑہ کے مجالس کے لئے مخصوص تھے

علی بخش :- باورچی عہد نصیر الدین کا کھانا پکانے والا غدر کے بعد داروغہ میر واجد علی کا نوکر ہوا اس سے پوچھا گیا تھا تو اس نے کہا کہ سال بھر تک دونوں وقت ارویاں نئی طرح پکا سکتا ہوں یکم اکتوبر ۱۹۰۲ء کو لکھنؤ میں اس کا جام عمر لبریز ہوا۔

چھوٹے صاحب :- گولہ گنج میں عہد امجدی میں اس نام کی ایک طوائف رہتی تھی جو گانے اور ناچنے میں جواب نہ رکھتی تھی اس کی ہمعصر چینی جان، فیروز جان، امراؤ جان وغیرہ تھیں۔

ممتاز محل کی ڈیوڑھی :- آپ شاہ غازی الدین حیدر کی ملکہ تھیں اور اشرف الدولہ بانی کاظمین ان کے رشتہ دار تھے شاہ نصیر الدین حیدر انھیں بیگم کے پیٹ سے تھے اور وثیقہ گیارہ سو روپے ماہوار تھا وہ نجف کے قریب قصر شاہی میں رہتی تھیں وہاں سے گولہ گنج آئیں اور عالیشان قصر بنوایا جو زمانہ گزرنے سے گر چکا بیرونی پھاٹک اور مسجد باقی ہے اس مسجد سے چک منڈی کو راستہ جاتا ہے۔

امامباڑہ ملکہ زمانی :- یہ امامباڑہ محلہ گولہ گنج تکیہ پیر جلیل کے سامنے شاندار عمارت کی صورت میں موجود ہے محترمہ بانی امامباڑہ حضرت نصیر الدین حیدر بادشاہ دوم اودھ کی ملکہ تھیں امامباڑہ کا نقشہ شہر کے دوسرے عزا خانوں سے بالکل الگ ہے۔ پھاٹک عظیم الشان بلندی پر پہرہ والوں کے کھڑے ہونے کی جگہ اور دیدہ بان کا مقام بڑی خوبصورتی سے بنایا گیا ہے بڑی لمبی چوڑی

انگنائی جس میں لق و دق نہر کے بعد عمارت شروع ہوتی ہے پہلو میں دو منزلہ صحنچیاں اور عمائدین کے شریک مجلس ہونے کا ٹھکانا چوڑے دالان بلند شہ نشین حق کہ یہ کہنا صحیح ہے کہ امامباڑہ اپنی وسعت کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر ہے۔ امامباڑہ آصفی، امامباڑہ جھاؤلال، امامباڑہ ملکہ زمانی بزرگ ترین عمارتیں ہیں ممکن ہے کہ امامباڑہ جھاؤلال کو اس سے تسادی کی نسبت حاصل ہو پیمائش پر رائے کا صحیح حال معلوم ہو سکتا ہے۔

امامباڑہ کی تیاری محمد احسن خاں کے زیر اہتمام ہوئی اس امامباڑہ کے علم اتنے وزنی تھے کہ ایک آدمی مشکل سے ایک علم اٹھا سکتا تھا امامباڑہ کا سال بنا اس قطعہ تاریخ سے واضح ہے ؎

جناب ثانی مریم معظمہ ملکہ	کہ در زمان ندارد نظیر خویش اصلا
امامباڑہ بنا کرد بے بدل بے مثل	عیاں بر روئے زمیں شد بنا عرش علا
باہتمام جناب محمد احسن خاں	بطرز نو شدہ تیار ایں خجستہ بنا
بنا ر خلد بگویم اگر روا باشد	چرا کہ ہست مزار امام راہنما
امام آنکہ فدا سر نمود برامم	قتیل تیغ جفا و ذبیح راہِ خدا
کلیم فکر رسا گفت سال تاریخش	امامباڑہ[1] بے مثل سید الشہدا ۱۲۵۶ھ م ۱۸۳۷ء

ملکہ زمانیہ کے باورچی خانے کا تین سو روپیہ[2] روزانہ کا خرچ تھا اور سیکڑوں فقیر غریب دسترخوان سے پرورش پاتے تھے سو برس سے زیادہ گذر جانے پر عمارت کی حالت قابل رحم ہے منقولہ سامان کب تلف ہوا اس کا کوئی پتہ تاریخ میں نہیں ہے اب جامہ اصلی بھی اتر رہا ہے پھاٹک کا کچھ حصہ گر گیا۔ حصار کی دیواریں نہ رہیں استرکاری نے ساتھ چھوڑ دیا لکھوری اینٹیں دکھائی دے رہی ہیں نہر جس سے صحن کے دو ٹکڑے ہوتے تھے خود پاش پاش ہے یہ وہ رانی تھیں جن کے آٹھویں دن درگاہ حضرت عباسؑ جانے میں دس ہزار روپے خیر و خیرات اور نذر و نیاز میں صرف ہوتے تھے آج ان کے عزاخانہ میں ایک چراغ بھی نہیں ہے وہ بتاریخ ۲۲ دسمبر ۱۸۴۳ء اس دنیا سے کوچ کر گئیں اور امامباڑہ میں سات برس عزاداری کرنے پائی تھیں عہد امجد علی شاہ بہادر میں اسی امامباڑے میں سپرد خاک ہوئیں۔

امامباڑہ کے سامنے سڑک کا ایک حادثہ عبرتناک

تاریخ اودھ میں نجم الغنی نے اس امامباڑہ کے سامنے نواب امداد حسین خاں پر دشمن کا اچانک حملہ ہو جانے کو اس قدر مکروہ انداز میں بیان کیا ہے[3] جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وزیر کا کوئی وقار عوام میں نہ تھا اور بدنظمی اس حد پر پہونچی تھی کہ نواب کو گاڑی سے کھینچ کر پیٹ دیا اور یہی بے عزتی ان کے عہدۂ وزارت سے سبکدوش ہونے کا سبب ہوئی۔ دوسری تاریخوں کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ اس حملے میں طرفین سے تلوار چلی تھی اور وزیر اودھ[4] کے ساتھ دشمن بھی زخمی ہوا اور اس سفاک کا حملہ انگریز حکام پر بھی ہو چکا تھا واقعہ یہ تھا کہ شیخ فضل علی ملزم جیل سے بھاگ کر شہر میں لوٹ مار کر رہا تھا اور ایک دن ڈپٹی کمشنر گونڈہ لے بائیو صاحب پر بھی چار سواروں کے ساتھ حملہ کر چکا تھا وزیر اودھ پر حملے میں بھی وہ کامیاب

---

[1] دیوان برق [2] گذشتہ لکھنؤ ص۳۱۳ [3] تاریخ اودھ ص۱۲۶ ج ۵ وغیرہ
[4] وضعداران لکھنؤ ص۲۹

ہوا۔ آخر میں لفٹیننٹ کلارک[۱] نے نیپال کی حد میں دلاوری سے مقابلہ کر کے فضل علی اور ساتھیوں کو قتل کیا فلاہر یہ کہ امین الدولہ پر حملہ ویسا تھا جیسے ۲۲ دسمبر ۱۹۱۲ء کو دہلی میں لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکا گیا۔

اماباڑہ کے ساتھ پچھم کی طرف بہت بلند ایک مسجد بھی ہے جو اپنے حدود اور خوشنمائی میں دوسری مسجدوں سے کسی طرح کم نہیں ہے اور پشت کا دروازہ مقبرہ جناب عالیہ کے محاذ میں واقع ہے اس مسجد کو اہل محلہ نے کسی قدر اچھی حالت میں رکھا ہے اس مسجد کے منارہ برخلاف دوسری مسجدوں کے پہلوؤں کے بیچ میں ہیں اور اس مسجد کا خطی نقشہ ایک یورپین عورت نے کئی دن میں قلم کار تیار کیا تھا۔

<u>مقبرہ جناب عالیہ:</u>۔ سربلند اور پرشکوہ عمارت ہے یہاں نواب سعادت علی خاں بہادر کی والدہ دفن ہیں زینوں کے بعد مدفن ہے گرد قبہ کے وسیع آراضی پر چہار طرف رہائشی مکانات اور بہت اونچا پھاٹک ہے جس میں کبھی ضرور دروازے تھے عرصہ دراز سے یہ آراضی اہل کشامرہ کے قبضے میں ہے۔ ان کے اودھ میں داخلے کی مختلف حکایتیں ہیں اور شہرت اس بات کو ہے کہ وزیر علیخاں آصف الدولہ کے لے پالک کی جب شادی ہوئی تو لکھنؤ دولہن کی طرح سجایا گیا دور دور سے لوگ آئے مہاراجہ کشمیر نے شرکت کی اور شالی خیمے میں مع خدم وحشم رونق افروز ہوئے عملے کے علاوہ وابستگان دامن دولت بھی ساتھ ہو گئے تھے جب براتی رخصت ہوئے تو نو وارد مہمانوں میں اکثر عارضی طور پر رک گئے اور مہاراجہ کے ساتھ نہ جا سکے اور شہری دلچسپیوں میں ایسا فریفتہ ہوئے کہ نواب کو عرضی دی کہ ہم کو وطنی قرار دیدیجئے۔ حکم ہوا کہ اگر مہاراجہ بھی پسند کریں تو کیا مضائقہ ہے ان رہ جانے والوں میں زیادہ تر شال بنانے والے کاریگر تھے اور کچھ اور ادنیٰ و اعلیٰ طبقے کے تھے اجازت وطن ملنے پر کچھ لوگ کٹرہ ابوتراب خاں میں سکونت پذیر ہوئے اور داروغہ رمضان علی کی نسل وہاں رہی۔ شال بنانے والے دریا پار چلے گئے اور وہاں کشمیری محلہ سب سے پہلے آباد ہوا۔ کچھ غیر مسلمین نے رستم نگر کے پہلے محلہ بسایا چنانچہ جو ہندو کشمیری محلہ میں اب تک ہیں وہی نسل ہے ان میں بھی ادیب، شاعر، قانون داں اور معزز طبقہ اور اعلیٰ تعلیم کے اصحاب موجود ہیں ایک گروہ کوئی ہنر نہ جانتا تھا۔ اس کو کھیل تماشے کی سوجھی اور شادی بیاہ میں ناچ گا کر زنانہ لباس پہن کر چوٹیاں سر میں رکھ کے پیٹ پالا۔ لکھنؤ کی مردم خیز اور علم زا زمین نے کشمیریوں کو بڑے بڑے درجوں تک پہونچایا وہ عقل وفہم اور خوبصورتی وطن سے لے کر آئے تھے۔ مقدر راستہ سے ملا۔ لکھنؤ پہونچکر تدبیر نے تقدیر میں جوہر پیدا کئے اور اپنے عقل ودماغ کی مدد سے بڑے بڑے عہدوں تک پہونچے۔ پار ویران ہوا اور ان کی آخری قیامگاہ جس میں حسن خدمات کا صلہ بھی کارفرما تھا مقبرہ جناب عالیہ قرار پائی جس پر وہ آج تک قابض ہیں۔

بعض کو دعا تعویذ کا شوق ہوا شیخ محمد جان شاد کہتے ہیں ؎

کیا محتسب شہر کے نائب کا لکھوں حال
نخاس کا دلال ہے کشمیر کا رمال

اگر کسی گھر میں غمی ہو جاتی تو اس طبقے میں ایسے بھی تھے جو غسل وکفن کے لئے خود آمادہ ہو جاتے میت کے گرد قرآن خوانی ہوتی ہے تمام رات تلاوت کلام اللہ میں بسر ہوئی۔ غرض وہ طبقہ ان کی پر خلوص خدمت کی جزا بھی دینے پر تیار رہتا جو دوشالہ میت پر اڑھا دیا جائے وہ ان کا۔ جس چھپر کھٹ یا مسہری پر وقت آخر دم نکلے وہ انھیں کو دیدیا جائے وہ جس کو چاہے دیدیں اسی طرح جسم میت کے کپڑے

---

[۱] اخبار طلسم مورخہ یکم مئی ۱۸۵۶ء و ۶ مارچ ۱۸۵۷ء از نیا دور لکھنؤ صفحہ ۲۵، ۲۷ بابت اگست ۱۹۵۶ء

اس کے علاوہ عاقبتی جوڑا غرض ہر طرح خدمت کی جاتی تھی اور دم نکلنے کے وقت کی سورۂ یٰسین سے آخری تلقین تک تمام خدمتیں یہ انجام دیتے گویا خداشناس اور احکام میت سے باخبر یہی طبقہ تھا زنانی میت کی تجہیز و تکفین شروع ہونے سے پہلے میت کے قریبی ورثہ پہلے سنار کے یہاں آدمی بھیجکر "بتانا" بنواتے اور تولہ بھر یا دو تولہ سونے کی ایک جوڑی جلد سے جلد سادی موڑ کر میت کے ہاتھ میں ڈال دی جاتی یہ غسل دینے والے کا ایک پر تکلف حق خدمت تھا جس کو صلہ سمجھتے ہوئے وہ میت کو آرام سے نہلائے اور یہ نہ ہو کہ بعد غسل اجرت سمجھ کر کچھ دیں جو مذہبی لحاظ سے خالی از اشکال نہیں۔ بتانا گھٹ کر اب ایک چھلے کی صورت میں یہ رسم رہ گئی۔ ابتدا میں تو ان حضرات نے یہ خدمت قربۃً الی اللہ انجام دینا شروع کی تھی جب روایتی ثروت نہ رہی تو رفتہ رفتہ اس خدمت کو بعض نے پیشہ قرار دیا اور اقتدار دولت اودھ ختم ہونے پر جعفر علی غسال اور پھر نواب علی غسال رئیسوں کے مردے نہلاتے تھے۔ اول الذکر بڑے مالدار اور صاحب ثروت تھے نواب علی کی نسل نے کام چھوڑ دیا اور امیری اور غریبی کا فرق اٹھ جانے کے بعد اب ہر مرنے والے کو وہی غسال غسل دیتے ہیں جو ہمیشہ عام اموات کو نہلاتے رہے۔ اس وقت امرا فخر سے بیان کرتے تھے فلاں مرنے والے کو ابل کشا مرنے غسل دیا۔

کشمیریوں میں قابل فخر ہستی پنڈت جگت نرائن وکیل اور ڈاکٹر ہری ہر ناتھ ہکو وہ مشہور اور باکمال لوگ گذرے ہیں جن پر لکھنؤ کو بجا طور پر ناز تھا اور ان کے قانونی و طبی خدمات زمانہ صدیوں فراموش نہ کرے گا۔

علم جفر کے جاننے والے مقبرہ میں میر مہدی صاحب مرحوم کے بیٹے مولوی سید ابوالحسن تھے جنھوں نے الواح الجواہر کا اردو ترجمہ کیا۔ یہ کتاب عربی میں افلاطون کی طرف منسوب ہے ۱۳۰۳ھ میں اعجاز محمدی میں طبع ہوئی قواعد تسخیرات و اصول و فنون میں بہترین ذخیرہ ہیں۔ موصوف کی کسی اور تصنیف کا اور سنہ وفات کا علم نہیں یہ مؤلف جفر قاطع کے علاوہ کوئی بزرگ تھے

کشمیریوں کے قبروں کے لئے ان کے دوررس اسلاف نے ادھر تو مقبرہ حکیم مہدی ادھر تلسی رام کا احاطہ مخصوص قرار دیا۔ چا کشمیری تمدن میں اسی گھر سے رائج ہوئی مگر شال کا کام بہت تھوڑے زمانے کے بعد ختم ہوگیا۔ کشمیری مجلسیں بھی اپنے رنگ کی مخصوص عزاداری تھی جو عہد داروغہ رضا حسین صاحب تک مقبرہ میں ہوتی تھی صبح سے شام تک فرش عزا پر نوحہ خوانی، ذکر اہلبیت حلقے کا ماتم ہوتا تھا ذاکر اپنی وطنی زبان کو سو برس نہیں بھولے۔ اب میرے خیال میں کوئی کشمیر زبان کا ماہر نہیں محمد صادق نامی کوئی بزرگ کشمیری زبان میں پڑھتے تھے جو ۶۰ برس کی عمر میں پٹنہ میں انتقال کرگئے مولوی شاہ محمد مرزا ذاکر تھے۔ مرزا عباس صاحب، میر تقی شاہ، مرزا محمد علی، سید تقی شاہ، حسن علی شاہ، حسین شاہ صاحبان منبر تھے مولوی سید احمد گوہر مرزا عرب بو صاحب قدیم روضہ خوانوں میں اور سید مرتضیٰ اور سید رضا میرے دور میں نامی ذاکر گذرے ہیں اور سرآمد ذاکرین میر محمد شاہ صاحب کی ہستی تھی جو اسی خاندان کے فرد کامل تھے ان کا حال اپنے محل پر گذرا۔ جو گروہ عہد آصفی میں وارد لکھنؤ ہو چکا تھا اس کے بعد بھی کشمیر کے اعلیٰ خاندان لکھنؤ کی طرف ہجرت کرتے رہے۔ لطف علی میر مشہدی ایک بزرگ سرینگر کے رہنے والے پونچھ میں منڈی جو شہر سے ۱۲ میل ہے آ کر رہے۔ اس نسل کے رمضان علی نے شہر سے سفر عتبات عالیات کیا۔ بیل گاڑی اور کشتیوں پر منزل پہونچے۔ جانا آنا تین برس کی لمبی مدت میں ہوا بجائے وطن آنے کے عہد محمد علی شاہ میں لکھنؤ آ گئے اور وزارت کی حیثیت میں بڑی قدر و منزلت ہوئی ان کی نسل یوں بڑھی۔

کرم علی — فتح علی — عبداللہ علی

رمضان علی

آخوند مرزا قاسم علی ولادتش در لکھنو بود — جعفر علی ولادتش در لکھنو بود

فتح علی کے پوتے محمد ذکی کلکتہ میں ہیں اور بنگالی ماحول میں علم سے بے بہرہ ہیں مرزا قاسم نہر المصائب شرعتہ المصائب کے مؤلف جن کو کاتب اوراق نے اپنی طفولیت میں دیکھا تھا ان کے بیٹے مولوی مرزا علی حسن معاصر فی الحال کراچی میں ہیں اور ان کی اولاد پشاور میں بحیثیت وطن مقیم ہے۔

خدمت خلق :۔ اہل کشامرہ دینی لحاظ سے پبلک میں قابل احترام تھے اور عوام کو ان کی ضرورت سخت اوقات میں پڑتی تھی کوئی بیمار ہوا اس وقت دعا پڑھنے کے لئے مقبرہ سے کسی ملاّ کو طلب کر لیا۔ خدانا کردہ کسی کے ہاں غمی ہوئی یہ لوگ بلائے گئے تجہیز و تکفین ان کی نگرانی میں ہوئی بعض قربۃ الی اللہ خدمت انجام دیتے تھے۔

مسجد :۔ مقبرہ میں داخل ہوتے وقت بائیں ہاتھ پر جو مسجد واقع ہے یہ عہد شاہی کے کسی شخص کی بنوائی ہوئی ہے عمارت پرانی تھی نیچے تہ خانہ تھا۔ زمانہ دراز سے مسجد منہدم ہو گئی تھی۔ نقی شاہ مرحوم نے جو بڑے عبادت گذار تھے اس مسجد کو نئے سرے سے خود بنوایا اور سرداب بند کر دیا اس کا سنہ تعمیر تو باقی نہیں رہا۔ دوسری تعمیر کا سال اس قطعہ سے واضح ہے ؎

رئیس ذاکریں عابد یگانہ — فرید دہر یکتائے زمانہ
عیاں سب پر ہے یوں نام حق آگاہ — نقی کے قبل میر اور بعد شاہ
ہوئے جب طالب سال اہل انصاف — کہا دل نے عبادت خانہ صاف

بانی مسجد نے بڑھاپے میں سنہ ۱۳ھ (۱۳۰۴ھ) میں وفات پائی اور احاطہ تلسی رام میں دفن ہوئے۔

احاطہ فقیر محمد خاں

فقیر محمد خاں شجاع الدولہ کے غلام تھے اور اپنی سیاست سے نواب حسن رضا خاں کے بعد وزارت کے عہدے پر پہونچے۔ حسام الدولہ کا خطاب پایا۔ لکھنؤ اس وقت علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ شعر و سخن میں بھی ناسخ کی شاگردی سے فیضیاب ہوئے ناسخ و آتش میں جو رقابت تھی ایک دوسرے پر چوٹ کرتا تھا اس وقت فقیر محمد خاں جن کا گویا تخلص تھا استاد کا پاٹ لیتے تھے ان کے سیہ فام ہونے پر جو کچھ پھبتیاں ہوئیں دم کٹا بھینسا وغیرہ اس کے جواب میں کہتے ہیں ؎

ہے یقیں گل ہو جو دیکھے گیسوئے دلبر چراغ — آگے کالے کے بھلا روشن رہے کیونکر چراغ

دیوان گویا ۱۰۸ صفحات پر نولکشور پریس میں طبع ہو چکا ہے اور ان کے تصانیف سے بستان حکمت ترجمہ انوار سہیلی بھی ہے۔ جو پانچ سو صفحے کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ وزارت معتمد الدولہ میں فقیر محمد خاں نے کچھ دن تک ان پر بھی قابو پایا تھا اور حسن تدبیر سے فوائد اٹھائے وہ نصیر آباد کے جلوس عزاداری کو بند کرنا چاہتے تھے۔ تین سو روہیلے سپاہیوں کو ساتھ لے کر سلطان العلماء کے پاس گئے۔ ان کو

فقیر محمد خاں کی ذہنی کروٹ کا اچھی طرح علم تھا ایسی گفتگو کی جس سے آنے والے لاجواب ہوئے۔ درگاہ حضرت عباس میں فقیر محمد خاں کا تبدیل مذہب کرنا اور حاضری کھانے میں یہ سیاست تھی کہ زمانہ نظامت میں فقیر محمد خاں پر کچھ اعتراضات ہوئے جس کو وہ تبدیلی مذہب سے خطرات سے محفوظ رہے ان کے ادب نواز ہونے میں شبہ نہیں ہے آتش کی امداد میں ایک وقت تھا کہ ان کی جیب سے زیادہ سے زیادہ روپیہ صرف ہوا۔ زمانہ تشیع میں مدح اہلبیت میں انھوں نے جو حصہ لیا منجملہ اس کے ایک مطلع یہ ہے ؎

چلے جو بہر صفت ہائے بوترابؑ قلم تو رکھے کعبۂ ایماں میں پا ترابِ قلم

یہ قصیدہ تقریباً ۱۲۰ اشعار کا میں نے دیکھا ہے فقیر محمد خاں ۱۲۶۷ھ میں موت کی نیند سو گئے احاطہ فقیر محمد خاں سے ان کا نام باقی ہے اور وہ عالیشان عمارت بھی موجود ہے جس میں فقیر محمد خاں رہتے تھے۔ کئی انتقالات کے بعد یہ مکان پرنس نواب حیدر مرزا کے ورثے میں آیا تھا پھاٹک کی صورت بالکل تبدیل کر دی گئی اور اب اس عالیشان محل میں آریہ یتیم خانہ ہے نواب حیدر مرزا ملکہ جہاں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور وقف حسین آباد کے شاندار ٹرسٹی تھے۔

فقیر محمد خاں فطرتاً ایسے عالی دماغ اور ذی ادراک تھے کہ درخت آم کا پتا سونگھ کر بتلاتے تھے کہ آم میٹھا ہے یا کھٹا۔

(قدیم ہنر صـ۲۰۲)

امام باڑہ داراب علی خاں:۔ عہد آصفی میں نواب ناظر محمد داراب علی خاں خواجہ سرا ولد عبداللہ جوہر علی خاں کی جگہ پر مقرر ہوئے اپنی ہوشیاری، وفا، دیانتداری سے ترقی کی۔ سرکار نواب ملکہ عہد زوجہ امجد علی شاہ مرحوم میں بھی کافی رسوخ تھا اور ان کی کوٹھی کے نگراں تھے ان پر بہت اعتماد تھا چنانچہ اگست ۱۸۶۶ء کے وصیت نامہ میں اپنے چشم و چراغ مرزا سلیمان قدر بہادر کو مامور کیا کہ ناظر موصوف کو سو روپے ماہوار ملتے رہیں اس وقت اس امامباڑہ کو مولوی گنج میں شمار کیا جاتا ہے مگر قدیم کاغذات احاطہ فقیر محمد خاں میں قرار دے چکے ہیں اس لئے مؤلف نے قدیم رائے پر عمل کیا امامباڑہ اچھی حالت میں ہے محرم چہلم اور دوسرے مواقع پر مجلسیں ہوتی ہیں۔ وقف کا دفتر پہلو کی صحنچیوں پر ہے ۲۹ راپریل ۱۸۹۱ء کے وصیت نامے میں امور خیر کے لئے ۵۲ ہزار روپے کی جائداد وقف کی ہے۔ مرض تنفس میں مبتلا ہو کر میاں داراب نے ۱۸۹۱ء میں انتقال کیا اور لاش کربلائے معلیٰ گئی۔ امامباڑہ لکھنؤ کے ایک معزز طبقے کی کمیٹی کے زیر نگرانی ہے۔

ثابت لکھنوی لکھتے ہیں کہ جواہر علی خاں خواجہ سرا ملکہ کشور مرحومہ کے یہاں گولہ گنج میں ہر مہینے کی ۲۲ کو اور نواب ناظر فیروز الدولہ خواجہ سرا شاہی کے یہاں ہر مہینے کی ۱۲ کو مرزا دبیر صاحب مرثیہ پڑھتے تھے فیروز الدولہ کا مکان گولہ گنج میں اس تراہے پر تھا جہاں سے اب ایک سڑک شفاخانہ دربھے سنگھ کو جاتی ہے مجلسیں بھی عہد سلطنت واجد علی شاہ مرحوم میں ہوا کرتی تھیں اب نہ مکینوں کا نام و نشان ہے نہ کوئی مکان ہے لمؤلفہ

فلک نے ہیں کر برباد کر دئے وہ محل اجل یہ کس کی نظر کھا گئی مکینوں کو

(حیات دبیر صـ۹) دربھے سنگھ سے مراد بلرام پور اسپتال ہے۔

؎ ذکر لکھنؤ از مولوی محمد رضا جائسی صـ۳۶ ؎ مجموعہ نادرہ ادھارت علی صـ۶۵ چھاپہ میرٹھ

غافل لکھنوی :۔ منور خاں غافل احاطہ فقیر محمد خاں میں رہتے تھے مصحفی کے شاگرد تھے ان کے کلام میں سوز ساز، وصل، فراق سب ہی کچھ ہوتا تھا مصحفی کا نام روشن کرنے میں ان کا شاگرد ہونا برسوں استاد کو یاد دلاتا رہا نمونہ سخن ملاحظہ ہو ؎

نگاہ یار رحم سے آج بے تقصیر پھرتی ہے کسی کی کچھ نہیں چلتی ہے جب تقدیر پھرتی ہے

مرقع ہے میری آنکھوں میں کیا یاران رفتہ کا جو نظروں کے تلے ہر ایک کی تصویر پھرتی ہے

ترا دیوانہ جب سے اٹھ گیا صحرائے وحشت سے بگولے کی طرح سے ڈھونڈتی زنجیر پھرتی ہے

۱۲۶۹ھ میں ان کا دیوان چھپا۔

مزار حاجی میر خادم علی شاہ :۔ حاجی میر خادم علی[1] شاہ اپنے وقت کے معزز فقیر اور آزاد منش صوفی تھے ان کو دیوان شریعت کے مشہور فقیر حاجی وارث علی شاہ کی سگی بہن بیاہی تھیں انہوں نے حاجی وارث علی شاہ کو پڑھایا لکھایا اور خرقہ ولایت دیا۔ کرسچین کالج کا وہ حصہ جہاں پرنسپل کالج رہتے ہیں آپ کی قبر شریف ہے جو نظر مردم سے پوشیدہ ہے۔

تکیہ پیر جلیل

شہر میں مسلمانوں کے آثار قدیمہ کا سب سے پہلا مرکز ہے اور صوفیائے کرام کے حالات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبدالجلیل نے ۱۹ ربیع الآخر ۱۰۱۲ھ میں اس سرزمین[2] پر وفات پائی۔ یہ بھی روایت ہے کہ پیر جلیل چار بھائی تھے دوسرے بھائی پیر بخارا، تیسرے بدرالدین مرعشی چوتھے سید حسن۔

جھاؤلال کا پل

جھاؤلال وہی شخص ہیں جن کا حال امامباڑہ ٹھاکر گنج کے ذیل میں گذرا مقبرہ جناب عالیہ اور امین آباد کے درمیان میں ان کا بنوایا ہوا پل ہے جس پر سے گول دروازہ کی آنے والی سواریاں گزرتی ہیں اور پہلوؤں میں لوگ آباد ہیں محلے کے پرانے رہنے والوں میں کالکا کتھک اور بندادین دو بھائی تھے جو ناچنے گانے میں یکتا تھے۔ اردو ادب میں ان کا ذکر ہے ؎

جان لیجے روح بندادین کی ہے وجد میں جب تبسم کو لب جاناں پہ رقصاں دیکھئے

بندادین کو اپنی مشق پر اتنا قابو تھا کہ جب وہ پیروں میں گھنگرو باندھ کر ناچتا تھا تو جس گھنگرو کی چاہتا آواز نکلتی اور باقی جگہ سے نہ ہلتے بھاؤ بتانے میں بھی بندادین فرد تھا۔

مولا بخش طبلئے کے یہاں ایک کوتاہ قامت آیا کرتا تھا اور خوب طبلہ بجاتا تھا۔ لوگ اسے سڑک کوٹنے کا درمٹ کہنے لگے اور یہی اس کا نام پڑ گیا۔

اودھ گزٹ :۔ اودھ اخبار کے بعد لکھنؤ سے اودھ گزٹ ۱۸۶۲ء میں مسٹر جیکب[3] نے جاری کیا اڈیٹر منشی گنگا پرشاد تھے۔ دفتر جھاؤلال کے پل پر تھا۔

زرد مسجد

چوک سے مقبرہ جناب عالیہ کو چھوڑتے ہوئے بشیشر ناتھ روڈ پر جو زرد رنگ کی مسجد بائیں ہاتھ پڑتی ہے یہ داروغہ غلام حسین خاں

---

[1] روزنامہ قومی آواز لکھنؤ میلہ نمبر آخر اکتوبر ۱۹۵۹ء خاص ایڈیشن [2] وفیات الاخیار [3] نیا دور بابتہ دسمبر ۱۹۵۹ء

کی تعمیر کردہ عہد غازی الدین حیدر کی عمارت ہے اور بہت اچھی حالت میں ہے۔ مسجد بغیر زینہ کی زمین دوز اور دو درجوں پر مشتمل ہے صحن سے رو کار پر نظر کرنے میں نمونے کے پھول بیل نازک پتیاں اور پتھر پر یہ اشعار نظر آتے ہیں ؎

غازی الدین حیدر شہ بندبانی صد ہزار مسجد	ساخت داروغہ غلام حسین چوں بعہدش بدیں صفا مسجد
ثانی کعبۂ خلیل آمد بہر ایجاب ہر دعا مسجد	گفت ہاتف ز سال تعمیرش باادب ساختہ بنا مسجد ۱۲۳۶ھ

پہلے دالان میں نمازیوں کی دو صفیں اور صدر دالان میں تین صفوں کی جگہ ہے۔ پہلوؤں میں کانپ چونا کی کٹاؤ دار جالی جو لکھنؤ کا خاص ہنر تھا ساتھ خوبصورت دروں سے مسجد میں نمازی آتے جاتے ہیں عمارت زیر اہتمام شاہد علی ایڈوکیٹ ہے اور امام جماعت محمد ادریس بہاری متوطن چھپرہ ہیں مٹکے نمازوں کا فرش بچھا ہے صحن کے پہلو میں کھجور کا درخت ہے اور کچھ مکانات ہیں مجموعی آمدنی ڈیڑھ سو روپے ماہوار ہے۔

اس مسجد کے سامنے ۱۸۵۷ء کے غدر میں آزادی کے حامی یکجا ہو کر دشمن کا مقابلہ کر رہے تھے اور زمین پر بے گناہوں کا خون بہہ رہا تھا دلیری کے ساتھ لڑنے والوں میں ریاستی فوج اور بہٹوا مئو کے چند شیر تھے۔ گوروں کا جب رخ گم کردہ راہ اور پردیسی ہونے سے عیش باغ کی سمت ہو گیا تو لڑنے والے غلام حسین کی مسجد پہونچ کر دوسروں سے بھڑ گئے نبی بخش خاں وغیرہ سے قابل ذکر مقابلہ ہوا۔ اس وقت اس جانب بہٹوا مئو کے تینوں بھائی اور ان کے برادر نسبتی شیخ احمد حسین فتحپوری اور میر حسین علی تیر گاؤں کے رہنے والے علی بخش خاں مرحوم کے حقیقی ماموں زاد بھائی و چند دیگر مصاحبین و خاص برادر جن میں حاجی اکبر علی محمود آبادی بھی تھے ان کے سوا باقی کل سپاہ ہنوز اس راہ کی تحقیقات سے نہیں پلٹی کہ یہاں طرفین سے بندوق چلنے لگی اولاً تجمل حسین خاں زخمی ہوئے داہنے ہاتھ پر گولی لگی حاجی اکبر علی نے بڑھ کر نبی بخش خاں کو اطلاع دی بعدہٗ کاظم حسین خاں زخمی ہوئے بائیں پیر میں گولی لگی پھر حاجی اکبر علی نے نبی بخش خاں سے کہا کہ دیکھئے چھوٹے صاحب بھی زخمی ہوئے نبی بخش خاں نے جھلا کر ان کو قریب سے ہٹا دیا اور کہا کہ تم جوان بھائی کا خون دکھا کر میرا دل بودا کرتے ہو۔ اسی واسطے یہاں آئے ہو مرتے دو لڈو پیڑے یہاں نہیں بٹتے۔ نبی بخش خاں کی نسبت جیسا کہ بیان ہو چکا وہ جنگ میں نہایت کہنہ کار تھے مگر تجمل حسین خاں اور کاظم حسین خاں کو یہ پہلا سابقہ ایسی باقاعدہ فوج سے مقابلے کا تھا مگر واہ رے حواس کہ حالت جنگ میں کاظم حسین خاں کی پتھر دار بندوق کا پتھر ضائع ہو گیا خاص بردار قریب کھڑا تھا اس سے دوسرا پتھر لے کر نہایت اطمینان سے بدلا پھر بندوق بھری نشانہ لگایا۔ اس مدت میں مخالف کی جانب سے مینہ گولیوں کا برس رہا تھا نبی بخش خاں گوشۂ چشم سے دیکھ رہے تھے احمد حسین بھی زخمی ہو کر گرے نبی بخش خاں کی کنپٹی پر گولی لگی فوراً تیوراکے گرے اور شہید ہوئے میر حسین علی بھی کام آئے خدا کو بات رکھنا تھی۔ گورے رخ پھیر کر پلٹ گئے۔ مارٹین کی کوٹھی کی جانب سے جو سڑک شہر میں آتی ہے اس طرف سے داخل ہوئے بیگم صاحبہ کو عزت و آبرو کے ساتھ شہر سے نکل جانے کا موقع ملا قریب ظہر یہ لڑائی ختم ہوئی۔ نبی بخش خاں میں ہنوز جان باقی تھی کاظم حسین خاں نے اپنے کو جس طرح بنا ان تک پہونچایا چہرے پر آزردگی پائی سمجھ گئے کہ ایک ہندو کی لاش ان کے ہم پہلو ہے اس کا خون ابل کر ان کے قریب آرہا ہے اس سے کراہت ہے فوراً اس لاش کو ہٹا دیا ادھر نبی بخش خاں کی روح نے مفارقت کی انھوں نے دو فرزند چھوڑے بادشاہ حسین خاں مرحوم و سردار حسین خاں جو حی القائم ہیں اس لڑائی میں ۹۔ ادھر کے مجروح و مقتول ہوئے اور ۲۱

اس طرف کے کام آئے وہ ہمراہی جو راستے کی تحقیق میں گئے تھے پلٹ کر آئے کہار و پینس مہیا کی اپنے مجروحین و مقتولین کو لے کر فرودگاہ پر آئے یہاں دیکھا تو گوروں نے قبضہ کرکے کل مال و اسباب لوٹ لیا تھا دوسرے روز صبح ہوتے بھٹوا مئو پہونچے تینوں بھائیوں کی پینس زنانہ مکان میں رکھی گئی نبی بخش کی والدہ نے آکر تین جوان بیٹوں کا یہ حال دیکھا اور غش میں جاں بلب اور ایک کا کام تمام ہو چکا ہے۔ کہا خداوندا شکر ہے تیرا، یہ لوگ لڑ بھڑ کر اس طرح میرے سامنے آئے ہیں خاندان کا نام رکھ لیا میں راضی اور دو وہ بخشی ہوں مقتولین دفن اور مجروحین کا علاج ہوا۔ بیگم صاحبہ مع مرزا برجیس قدر شہر خالی کرکے گھاگھرا پار اتر گئیں لکھنؤ میں سرکاری عملداری ہوئی مگر باہر قتل و قمع لوٹ مار انگریزی فوج کرتی رہی (آثار یادگار ص ۱۲۲، ۱۲۳)

روشن الدولہ کی کوٹھی

یہ کوٹھی بادشاہ جمجاہ نصیر الدین حیدر بہادر کے وزیر پر تدبیر کی تعمیر ہے اور شاہی نظر انتخاب کے بعد کچھ زمانہ گذر کر اس کا نام قیصر پسند ہو کوٹھی اب بھی موجود ہے روشن الدولہ کے ابتدائی دور میں مرزا فصیح شعر و سخن کے تاجور تھے اور وہ بار بار اپنے اشعار میں روشن الدولہ کی مدح میں رطب اللسان رہے غالب نے ان کی ثنا میں یہ شعر نظم کیا ؎

روشن الدولہ بہادر کہ بایثار و عطا حاتمش گفتم و شرمندہ نقصاں رفتم

روشن الدولہ کی کوٹھی شہر میں بہت مشہور اور بچہ بچہ جانتا ہے قیصر باغ سے پہلے واقع ہے اور روکار پر بالائے بام ½ دائرہ اور ایک تلنگے کی پہرہ دار کی صورت میں مجسمہ پہلوؤں میں دو خوشنما مسجدیں ایک سمت قبلہ سے رو بہ پشت جو سرکاری دفاتر کے استعمال میں ہے جوابی عمارت کی صورت میں ہے دوسری مسجد انتہائی برمحل اور خوشنما نیچے مجرموں کے لئے وقتی حوالات اور اوپر ڈپٹی کمشنر کا دفتر، پاسپورٹ سے متعلق آفس بعض دوسرے محکمے مجسٹریٹی ہے اس سربفلک عمارت کا پھاٹک چونکہ اسی طرف تھا وزیر موصوف جب عہدے سے معزول ہوئے اور جائداد ضبط ہوئی تو یہ کوٹھی آخر میں واجد علی شاہ بادشاہ نے معشوق السلطان خاص محل کو عطا فرمائی۔ حکومت کے استعمال میں ہوتے سے اس کوٹھی کے کمرے اور ہال تہ خانہ پر تفصیلی نگاہ نہیں کی جا سکتی۔ ایک مسجد مجسٹریٹ کے اجلاس کے سامنے واقع ہے جو اسی سلسلہ عمارت کا جز معلوم ہوتی ہے۔ انگریزوں کے وقت سے تا حال کوٹھی کے سامنے وکیلوں کے کثرت سے تخت بچھے ہوئے ہیں جن پر محرر منشی عرائض نویس اپنے کاغذات کے بستے لئے ہوئے سامنے صندوقچے قلم دوات لکھا پڑھی کرتے ہیں موکلوں اور مقدمات کی پیروی کرنے والوں کا ۱۰ بجے سے ۴ بجے تک اژدہام رہتا ہے۔

۲ر فروری ۱۹۶۵ء کو میں نے الہ آباد دراتی منڈی میں حسین جان صاحب مرحوم کے نوادر میں روشن الدولہ کی قلمی تصویر دیکھی پہلو میں نواب مظفر حسین خاں خلف اکبر نواب سبحان علی خاں ہیں اور گلے میں روشن الدولہ کے جواہرات کا ایک ہار ہے۔ اور لاکٹ میں جو چنے کی دال کے برابر ہے واجد علی شاہ کی تصویر فوٹو کا جاذب نظر اور دلفریب ہونا احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ اس کے بعد ۹ر اگست ۱۹۶۵ء کو میں نے سلطان مرزا دفتری ساکن وزیر گنج لکھنؤ المتوفی ۱۳۷۶ھ کے ہاتھ میں اٹھارہ بائیس سائز کی ایک قلمی کتاب دیکھی جس کا نام تھا "خلاصۃ العیش" اور آخر کتاب میں یہ عبارت درج تھی "قدمت بذہ

النسخۃ النادرۃ الباھیہ مسمی بخلاصۃ العیش (کیڑا لگنے سے پڑھا نہیں جاتا) بعون اللہ جل و علا من تصنیف اضعف خلق اللہ محمد مظہر بن روشن الدولہ رستم جنگ ظفرخاں عفی عن جرائمھا" کتاب فارسی زبان میں تھی اور اس کے باب یہ تھے۔ قوت باہ کے نسخے، طرب انگیز حکایتیں، ایک کنیز شاہی کے بیانات، رقص و سرود پر تبصرہ مؤلف جامع محمد مظہر پسر روشن الدولہ تھے۔

روشن الدولہ کی کوٹھی کے سامنے ۱۶ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو کلکٹری کے لئے نئی عمارت کا سنگ بنیاد وزیر اعلیٰ سمپورنانند نے رکھا ہے اور ۲۲ لاکھ روپے کے سرمائے سے عمارت بن رہی ہے۔

روشن الدولہ کے چابک سواران فتح خاں اور دلاور خاں دریابادی تھے ان کی سرکار میں بڑی قدر و منزلت تھی۔

روشن الدولہ کا باورچی کچے بھٹوں کے لچھے اس نفاست سے کاٹتا تھا کہ کہیں سے ٹوٹنے نہ پاتے تھے اور ان کا رائتہ ایسی اچھی طرح بناتا کہ جو چکھتا عش عش کرجاتا (قدیم ہنر صفحہ ۱۴۶ و ۱۷۸)

<u>امیرالدولہ لائبریری</u> :۔ ریاست محمود آباد کے بے شمار علمی و ادبی خدمات کی غیرفانی یادگار جہاں مفاد عامہ پر کتابوں کا بے بہا ذخیرہ موجود ہے۔

سرائے مینڈو خاں

مرزا مینڈو خاں گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے اور باہر سے جو گھوڑے آتے تھے وہ اسی سرائے میں ٹھہرتے تھے۔ سرائے کا پھاٹک قدیم وضع کا موجود ہے چھت اور پلاسٹر باقی نہیں رہا۔ پھاٹک کا ایک پٹ بھی باقی ہے اور پہلو میں پن چکی ہے۔ دروازے کی ہر محراب میں گلائی کے بعد لکڑی کی نوکیں رہ گئی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم طرز کاریگری کا یہ بھی تھا۔ آج کل کی طرح لوہے کے بجائے لکڑی لگائی جاتی۔ سرائے کی جو حدیں ہیں پچھواڑے کی دیوار گر چکی ہے اور اسلامیہ کالج کی طرف عام راستہ ہوگیا ہے ۱۹۱۰ء تک سرائے میں مظہر خاں یکہ والا گھسیٹے بھٹیارا رہتا تھا ۱۹۱۵ء کے سیلاب میں دروازہ گرا اور یہاں ایک ہاتھی ڈباؤ پانی تھا جدید عمارتی اسکیم کے تحت میں عنقریب یہ جگہ پیمائش ہوکر کسی عالیشان عمارت کی صورت میں آنے والی ہے احاطے کے آخر میں مینڈو خاں کا مکان اور اس کے سامنے تکیہ ہے جہاں پرانی قبریں ہیں۔

<u>مسجد</u> :۔ دوہرے درجے کی قدیم دیواروں پر جدید چھتیں پہلا درجہ وسیع آگے برآمدہ چوبی محراب کے پہلو میں منبر شمالی رُخ پر دیوار مسجد سے ملحق حجرہ اور کنواں دست چپ پہلو کی دیوار میں دروازے کے اندر ہی اندر دوسری مسجد کا راستہ اس مسجد کی اندرونی محراب پر ایک پتھر تھا جس پر یا علی کندہ تھا اس پتھر کو تعمیر جدید میں علیحدہ کردیا ہے۔ موجودہ منتظم عبدالوہاب بیر بتلاتے ہیں کہ یہ مدرسہ ہے مسجد نہیں ہے مسجد کے پیش امام حافظ معین الدین جونپوری ہیں۔

(نوٹ، سبطین آباد کا ذکر حضرت گنج کے ذیل میں آئے گا چھاونی مینڈو خاں بھی اسی علاقے میں تھی جس کے نہ نشانات ہیں نہ کوئی تاریخی واقعہ زیر نظر ہے۔

لال باغ

امین آباد اور حضرت گنج کے بیچ میں عصر حاضر کا آباد ترین محلہ۔ اس باغ کے نام کی وجہ تاریخ اودھ میں کہیں نظر نہ آئی۔ مسٹر برل نے طے کیا تھا کہ بیگم وزیر کے دفینے اس مقام پر تھے اس رعایت سے لال باغ نام رکھا گیا اور صاحب موصوف کی میم نے

بعض روؤسا شہر سے ظاہر کیا کہ میں ۲۰ سال سے لال باغ کی اصلی حدود کے معلوم کرنے کی فکر میں ہوں پرانے نقشے، قلمی تصاویر کہنہ یادداشت سے باغ کی (جہاں خزانہ اودھ تھا) حدبندی نہیں ہوسکی اور جہاں سونے کے ڈھیر ہیں وہ تہ خانہ غائب ہے لال باغ میں ہے

مدرسہ اسلامیہ:- ملاذ العلماء سید نجمن صاحب قبلہ مرحوم کی تحریک سے امیرالدولہ بہادر نے یہاں بھی ایک درسگاہ قائم کی جس میں فقہ جعفری کی تعلیم مدت دراز تک ہوتی رہی۔

رام داس کا احاطہ:- اس جگہ کچھ عمارتیں زرد رنگ کی قدیم شان وشوکت کو ظاہر کرتی ہوئی نظر آتی ہیں جو قیصر باغ کے ڈزائن کی ہیں اور ہندو مسلم لوگوں کا قبضہ ہے۔

نور منزل:- عہد شاہی کی وہ عمارت ہے جو بعد میں بیوہ خانہ کے نام سے مشہور ہوئی اور اب اس کوٹھی میں پاگلوں کا علاج ہوتا ہے اور ڈاکٹر ہاک (HOCK) رہتے ہیں اسی عمارت کے پچھواڑے امریکن چرچ ہے اور مہا بھانے یہاں سے ایجی ٹیشن شروع کیا تھا انگریزی حکومت میں اس سڑک کا نام رٹیج روڈ تھا اور اب اس کو والمیکی مارگ کہتے ہیں۔

لال باغ اسکول:- یہ عمارت بھی شاہی ہے اس کے نیچے ایک سرنگ ہے جو دور تک پھیلی ہوئی ہے۔

نرھیؔ

حضرت گنج سے آگے بڑھ کر جو آبادی ہے اس کو نرھیؔ کہتے ہیں کبھی دیہات سمجھا جاتا تھا اور بہت آباد ہے نواب اصغر حسین فاخر کا ایک مکان پاٹانالہ پر تھا اور کوٹھی نرھیؔ پر تھی مکان تو قابل ذکر نہیں مگر مکین کا نام نظرانداز نہیں ہوسکتا اور وہ بیشمار خصوصیات کے حامل تھے مرزا سلیماں قدر بہادر کے ہمعصر تھے اور تاج محل کے سرمائے سے دولت پائی تھی ان کی داد ودہش فیاضیاں زبان زد ہیں۔ مصاحبین کے علاوہ شعراء اور صاحبان حاجت ان کو ہر وقت گھیرے رہتے تھے خوشامدخوروں اور مسخروں کا بھی ان کے در پر ہجوم تھا ان کے نوکر کا تخلص اس طبقے نے قیتا رکھا تھا جس کا نام تقی تھا یہ دو بھائی تھے نجف علی وغیرہ۔ دربان کتب خانہ ممتاز العلماء اور تقی ـــــــ یہ پچھلا اس لئے نام کے ساتھ تھا کہ وہ بات بات پر وغیرہ کہتے تھے اس لئے یہ سخن تکیہ جزو نام ہوگیا قیتا بھی موزوں طبیعت تھے اور گلستان فاخر میں بلبل کی طرح چہکتے تھے۔ دونوں بھائی بے پڑھے لکھے مگر غضب کے ذہین تھے فاخر کا قیام آخر میں نرھیؔ پر رہا اور دولت ختم ہونے پر شہر (پاٹانالہ) چھوٹا وہاں بھی جشن ہوئے۔ ایک مرتبہ کسگھر سے ایک ہزار قندیلوں کا آرڈر دیدیا۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ اس قدر قندیلیں کیا ہونگی کچھ دن کے بعد معلوم ہوا کہ مرزا سلیمان قدر کی دعوت ہے۔ حضرت گنج سے نرھیؔ تک چراغاں ہوا چھٹی محرم کو فاخر علم اٹھاتے تھے جو مکمل جلوس اور اعلیٰ شان وشوکت کے ساتھ شہر آتا تھا۔ فاخر کی اولوالعزمی کی ایک حکایت بڑی دلچسپ یہ ہے کہ وہ کٹرہ ابوتراب کی مسجد میں ماہ رمضان کی وعظ میں آئے حکیم محمد رضا خاں رئیس اتفاق سے کرتہ پہنے ہوئے شریک وعظ تھے اور فاخر کی شان نہ دیکھ سکے اٹھ کر گھر آئے اور اچکن پہن کر مسجد میں دوبارہ آئے۔ بات گذر گئی دوسرے دن فاخر کے جسم میں وہ پوشاک نہ تھی جو پہلے روز پہن کر آئے تھے۔ آج پھر حکیم محمد رضا خاں گھر آئے اور دوسری اچکن پہنی اس وقت سے روزانہ فاخر کے جسم میں بدلا ہوا لباس اور حکیم صاحب نے بھی کوشش کی کہ نئی اچکن روز زیب جسم کریں فاخر کے یہاں کپڑوں کی کمی نہ تھی حکیم صاحب کے گھر پر درزی بٹھادیا گیا اور آن بان میں روز کپڑے سلنے لگے

فاخر کی دولتمندی دیکھو ان کے خدمت گاروں کی وردی، گاڑی کے گھوڑے ساتھ کا پورا سامان مراد آبادی لٹیا، پنکھا، خاصدان سب تبدیل کیا ہوا ر۔ حکیم صاحب لٹنے کے قریب پہونچ گئے یہاں تک کہ ۲۹ کا چاند ہو گیا اور عید کے دن سے خود بخود یہ صحبت درہم برہم ہو گئی۔ اس مقابلے پر وعظ کا مجمع بڑھ گیا کتنے لوگ دیکھنے آتے تھے کہ نواب احمز حسین کے جسم میں آج کیسے کپڑے ہوتے ہیں اور حکیم صاحب زحمت اٹھا کر کیسی اچکن بنواتے ہیں۔

<u>کربلا معتمد الدولہ</u>:۔ یہ کربلا حضرت گنج اور سارسی باغ کے بیچ میں محلہ نرھی پر ہے عہد نصیر الدین حیدر بہادر ۱۸۱۵ء / ۱۲۳۴ھ امام موسیٰ کاظم اور امام محمد تقی علیہم السلام کی قبر کی نقل نواب آغا میر نے بنوائی۔ عمارت کے چار گوشوں میں چار گلدستے ہیں جن میں چکر دار زینے بنے ہوئے ہیں اور بالائی جانب تین گول قبہ اصلے نانذکی وضع کے دو دونوں اماموں کے گنبد اور تیسرا مسجد بالین سر کی نقل روضہ میں اندرونی جانب صرف ایک درجہ تھا جو اب تک بدستور قائم ہے روکار اور پشت کی طرف چھ چھ کھڑکیوں دار جوڑیاں ہیں تین تین ویسی ہی جوڑیاں بغلی دروازوں میں ہیں پھاٹک اور چار دیواری گر چکی ہے ایک چھوٹی مسجد بھی کربلا کے پیچھوں بیچ میں تھی جو ٹوٹی پھوٹی اب تک موجود ہے یہ عمارت ۱۲ بیگہ دس بسوہ زمین پر تعمیر ہوئی تھی اور تعزیہ دفن ہونے کی جگہ بیٹھا اور ریتاور کی آمدنی سے تین چار سو روپے ٹھیکہ پر سالانہ آمدنی تھی۔ اس کی تعمیر میں نواب نے ایک کروڑ روپیہ صرف کیا تھا۔ ۲۹ برس تک عہد سلطان عالم میں مراسم عزا بدستور انجام پاتے رہے فروری ۱۸۵۶ء میں سلطنت اودھ کے ساتھ کربلا بھی ایسٹ انڈیا کے قبضے میں آگئی ۱۶ اگست ۱۸۵۹ء کو کربلا اور دوسری عمارتوں کے ساتھ واگذار ہوئی اور صحت الدولہ حکیم مرزا مہدی کے زیر انتظام لی گئی مرزا صاحب جنرل سکندر حشمت کے استاد تھے اس کے بعد ۲۹ اکتوبر ۱۸۵۹ء کی رپورٹ مرتبہ منشی کرامت حسین داروغہ نزول ۱۶ اپریل ۱۸۶۰ء کو پھر نزول ہو گئی اور نزول ہے نہیں کہا جا سکتا کہ تکمہ CSATTISH MASAN LODGE کا کب قبضہ ہوا اب تک وہاں جادو گھر فراموش لاج ہے۔ کرامت حسین داروغہ نے اپنی رپورٹ نزول میں اس کربلا پر حسب ذیل تبصرہ کیا ہے کربلائے نرھی بموجب پروانہ ۲۷ جون ۱۸۵۹ء صدور ڈاکٹ کمشنر بہادر نمبری ۶۵۲ مورخہ ۱۱ جون ۱۸۵۹ء نزول قرار دیا گیا اور ٹھیکہ اس کا ۲۰۷ ر سرکار سے بنام ہیننگن کے ہے کیفیت یہ تھی جو گذارش کی گئی۔ کمترین کرامت حسین داروغہ نزول مورخہ ۴ اگست ۱۸۵۹ء

دلکشا

جنرل مارٹین عہد آصفی کے ان سربر آوردہ لوگوں میں تھے جنھوں نے حکومت اودھ میں خاص اعزاز پیدا کیا تھا اور سب سے پہلے غیر ملکی ہوتے ہوئے شہر میں عمارت بنوانے کی اجازت حاصل کی پہلی بلڈنگ جو ۵۰ ہزار روپیہ صرف کرکے بنوائی وہ سعادت علی خاں نے ۵۰ ہزار کو خریدلی اور اپنی عمارتوں میں شامل کی اس کوٹھی میں نواب سیر و شکار کے موقع پر ٹھہرتے تھے۔ پہلو کے جنگل کٹوا کر چراگاہ بنوائی اور شکاری جانوروں کا انتظام کیا نیل گائیں، ہرن، چکارے، بارہ سنگھے چھوڑے۔ آبادی کا نام دلکشا سعادت علی کا رکھا ہوا ہے۔

دوسری کوٹھی وہ اونچی عمارت ہے جس کا کالا مینار الہ آباد سے لکھنؤ آنے والی گاڑی سے لکھنؤ کے پہلے سے دور سے دکھائی دیتا ہے اس کوٹھی کا نام کانسٹنٹیا (قسطنطنیہ) رکھا تھا اور جو مدرسہ یہاں کھولا تھا اس میں اسکیم تو تھی کہ ہر مذہب و ملت کے طلبا

---

[1] تاریخ اودھ ج ۴ ص ۸۵ [2] گزشتہ لکھنؤ [3] منہ

پڑھیں گے مگر صرف عیسائی تعلیم پاتے تھے یہ عمارت بڑی سربلند اور خوبصورت اور وسیع حالت میں اب تک موجود اور انگریزوں کے اقتدار کی پہلی یادگار ہے لامارٹینیر کالج اسی عمارت میں ہے عہد نصیر الدین حیدر میں اسی جگہ سے ایک فرانسیسی غبارہ میں بیٹھ کر اڑا تھا اور بادلوں میں غائب ہوا پھر کبوتروں کی چھتری پر جو شہر سے پانچ چھ کوس کے فاصلے پر تھی اترا اور چودہ ہزار روپے انعام پائے معتمد الدولہ کی معزولی کے بعد دوبارہ ان کا عروج ہوا اور آفرین علی خاں معتوب ہوئے اور محاسبہ میں ان کے کارندہ میر خدا بخش قید ہو کر دلکشا آئے بے نمک کی کھچڑی ان کو غذا میں ملتی تھی حقہ پان تمباکو کہاں بہزار خرابی رزیڈنٹ کی سفارش سے رہا ہوئے۔

لامارٹینیر کالج میں لکھنؤ کے بلند پایہ رئیس شمشیر قدر نواب سید امجد علی خاں صاحب قیصر نے ایک قلمی تصویر (گروپ) مرحمت کیا جس میں نواب آصف الدولہ، شجاع الدولہ، نواب سعادت علی خاں اور جنرل مارٹین رئیسانہ ٹھاٹھ سے جلوہ افروز ہیں۔

عہد امجد علی شاہ بادشاہ میں اس محل میں گاؤ خانہ تھا اور منور الدولہ کی سفارش سے اس کے داروغہ تحسین علی خاں خورد قرار پائے تھے اور اس خدمت پر ڈیڑھ سو روپے ماہوار پاتے تھے۔

کوٹھی بی بی پور

یہ دو منزلہ ہوا دار کوٹھی قصر دلکشا کے مشرق جانب تخمیناً میل بھر کے فاصلے پر واقع ہے اس کو نواب آصف الدولہ نے زیر نگرانی جنرل کلاڈ مارٹین CLAUD MARTIN اپنے دیہی قیامگاہ کے طور پر تعمیر کرایا تھا اس کی ساخت بالکل سادی ہے۔ برخلاف اور عمارتوں کے منبت کاری یا گلکاری سے کہیں پر اس کی زیب و زینت نہیں کی گئی ہے سادگی ہی اس عمارت کا بڑا جوہر ہے نواب اس میں کبھی کبھی قیام کرتے تھے اس کا خاص مصرف یہ تھا کہ جب نیا ریزیڈنٹ مقرر ہو کر آتا تو وہ شہر کے باہر اسی کوٹھی میں ٹھہرایا جاتا۔ دوسرے دن فرمانروائے اودھ بڑے طمطراق سے فوج اور جلوس کے ساتھ لکھنؤ لے جا کر ریذیڈنسی میں پہونچا دیتے ۱۷۹۷ء میں سرجان شور گورنر جنرل نے اسی کوٹھی میں آصف الدولہ کے لے پالک بیٹے نواب وزیر علی خاں کو مسند حکومت سے محروم کر کے معزولی کا حکم سنایا تھا اور زیر حراست کر کے بنارس روانہ کر دیا تھا بعدہٗ اسی کوٹھی میں دربار منعقد کر کے نواب سعادت علی خاں کو بڑے تجمل اور شکوہ سے لکھنؤ لے گئے تھے جہاں ان کی مسند نشینی بڑی شان و شوکت سے ہوئی۔ یہ بلڈنگ بہت دن سے حسب ایکٹ نمبر ۷ سنہ ۱۹۰۴ء زیر تحفظ آثار قدیمہ آ چکی ہے اور اس کے چوڑے چکلے صحن میں ۱۸۹۹ء سے گورنمنٹ ڈیری فارم (مکھن کا کارخانہ) قائم ہے۔

بتاریخ ۵ ستمبر ۱۸۵۶ء جنرل اوٹرم ریزیڈنٹ ہو کر آئے تو ان کے داخلہ لکھنؤ کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک آدمی آنکھوں سے دیکھا ہوا حال بیان کرتا ہے۔

سورج کے نکلنے کے پہلے ہی سے سڑک اور ہر در و بام پر جہاں جہاں سے جلوس سواری کی سیر ہو سکتی تھی ہزارہا انسانوں کا مجمع ہو گیا صاحب ریزیڈنٹ کی سواری کے لئے اودھ کی دوسری انیسویں پلٹن اور چونتیسویں رجمنٹ کے دستے مع پرچموں کے صبح سویرے سے پارک میں قطار در قطار کھڑے ہو گئے یورپین فوجی افسران بھی زیر کمان میجر ٹروپ TROUP مع انیسویں رجمنٹ کے شاندار بینڈ باجے کے موجود تھے۔ جلوس میں تین سو سے اوپر ہاتھی اور اونٹ تھے جن پر نہایت نفیس چمک دار جھولیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ دیگر ساز و سامان تھا سب شاہزادے اور امیر زرق برق پوشاک میں جواہرات مرصع سے جگمگا رہے تھے پیدل اور سوار شاندار

ا۔ یادگار ٹیمر ۲۔ ماخوذ از مقالہ شیخ تصدق حسین صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ شائع شدہ نیا دور لکھنؤ بت، مئی ۱۹۵۵ء

وردیاں پہنے ہر طرف کثرت سے نظر آتے تھے بیرقیں اور جھنڈے ہوا میں لہرا رہے تھے اور بے شمار نقرئی اور طلائی عصا بردار اور نیزہ بردار جلوس کے ہمراہ تھے یہ شاہی جلوس خراماں خراماں ریذیڈنٹ کی قیامگاہ کی طرف روانہ ہوا ادھر سے ریذیڈنٹ کی چوسیہ گاڑی بھی بڑی شان اور دبدبے سے شاہی جلوس کی طرف روانہ ہوئی جب بادشاہ سلامت اور ریذیڈنٹ کے دوران راہ میں ملاقات ہوئی تو سلامی کی توپیں سر کی گئیں ریذیڈنٹ بادشاہ کے پہلو میں آ بیٹھے اور سارا جلوس لکھنؤ کی طرف روانہ ہوا۔

ولیعہد نے حسب دستور بارہ سو روپے کی تھیلی ریذیڈنٹ کو پیش کی کہ وہ ان غربا اور مساکین کو تقسیم کر دیں جو گلے پھاڑ پھاڑ کے بخشش اور خیرات کے لئے چلا رہے ہیں ۱۸۵۶ء میں انھیں جنرل اوٹرم نے لارڈ ڈلہوزی وائسرائے ہند کی ہدایت پر آخری شاہ اودھ سے ایک معاہدے کی تکمیل کے لئے سلسلہ جنبانی کی جس کی رو سے ان کا خطاب شاہ اودھ قائم تھا اور وہ کوٹھی بی بی پور اور دلکشا جیسی سنسان اور غیر آباد مقامات اور اپنی لکھنؤ قیامگاہ میں بالکل آزاد اور خود مختار رہے مگر باقیماندہ ملک مقبوضات انگریزی میں شامل ہو جاتا لیکن بادشاہ نے اس عہدنامے کے شرائط منظور نہ کئے اور کلکتہ جا کر اپنی والدہ نواب ملکہ کشور صاحبہ اور چھوٹے بھائی مرزا اسکندر حشمت جواد علی معروف بہ جرنیل صاحب اور ولیعہد پرنس حامد علی کو لندن روانہ کیا تاکہ وہاں کے ارباب اقتدار سے دادخواہ ہو کر واپسی سلطنت کی کوشش کریں امید کی کچھ جھلک نمودار بھی ہوئی تھی کہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں آزادی حاصل کرنے کی ایک لہر دوڑ گئی اور بغاوت کا ایک طوفان امنڈ پڑا جس سے اہل انگلستان کو اس شاہی قافلے سے ایک پرخاش سی ہو گئی اور ساری کوششوں پر اوس پڑ گئی اور گوہر مقصود حاصل نہ ہوا۔

میری رائے یہ ہے کہ کوٹھی بی بی پور کے بانی آصف الدولہ نہ تھے بلکہ یہ کوٹھی نواب سعادت علی خاں کی بنوائی ہوئی ہے اور تاریخ کی اصل عبارت یہ ہے۔ کوٹھی سوئم کہ مابین راہ بی بی پور واقع شدہ قابل دیدن است اتفاق سیاحان بر نیست کہ کوٹھی برازیں ندیدہ ام کوٹھی نیست مرقعیت تماشاگری صاحب موصوف مردے بود حکیم (عماد السعادت ص ۱۳۶)

یمین الدولہ نواب سعادت علی خاں کی بنوائی ہوئی تیسری کوٹھی جو بی بی پور کے راستے میں واقع ہے دیکھنے کے قابل ہے اور سیر کرنے والوں کا اتفاق ہے کہ ہم نے اس سے بہتر بلڈنگ نہیں دیکھی یہ کوٹھی نہیں ایک مرقع ہے دل بہلانے کا اور کیوں نہ ہو بانی عمارت بہت ہی عقلمند شخص تھے۔

<u>ولایتی باغ</u>:۔ اس باغ کو شاہ نصیر الدین حیدر نے بنوایا تھا اور اس کے چمن میں وہ پھول تھے جو دیسی نہ تھے واجد علی شاہ نے اس کی چار دیواری کو بیگمات کے پردے کے لحاظ سے بلند کیا تھا یہ کوٹھی دلکشا کے آگے کنار دریا بی بی پور کی کوٹھی جاتے ہوئے بائیں جانب تھا (تاریخ اودھ نجم الغنی ج ۴ ص ۳۴۹)

چنہٹ

لکھنؤ سے آٹھ میل پورب کی طرف ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں چکر والی کوٹھی مشہور تاریخی عمارت تھی نہ عمارت کا نقشہ سامنے ہے نہ یہ پتہ ہے کہ نام کس لئے رکھا گیا بادشاہ دوم نصیر الدین حیدر بہادر کو جب خبر ہوئی کہ ان کی ملکہ قدسیہ بیگم نے سنکھیا کھائی اور ۲۱ اگست ۱۸۳۲ء ۲۴ برس کی عمر میں قضا کر گئیں تو بادشاہ گھبرا کر روتے ہوئے اسی کوٹھی میں آئے اور کالے کپڑے پہنے سیہ پوشی کا عام حکم دیا اس پیکر خاکی لاش نو تعمیر کربلا میں سپرد خاک ہوئی "حیف بلقیسے ز پہلوئے سلیمان جاہ رفت" اس مرگ جذبات کش کی تاریخ

بے بیگم کی جائداد مورانواں. بجنور[1] سرسینڈی کاکوری آٹھ پرگنوں میں تھی۔

زمانہ غدر میں یہاں اودھ کے مشرقی اضلاع کے ۴ ہزار ہندوستانی سپاہی جمع تھے اور انگریزوں کی اصطلاح میں باغی سپاہیوں کا یہ اجتماع لکھنؤ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا اس اثنا میں خبر آئی کہ انگریزی فوجیں شہر سے باہر نکل کر ان پر حملہ کرنے آ رہی ہیں اس اطلاع پر ہندوستانی افواج نے طے کیا کہ انگریزوں کا جم کے مقابلہ چنہٹ میں کیا جائے۔ فوج نے اس جنگ کے لئے برکات احمد کو سپہ سالار مقرر کیا اور میدان میں فوج دشمن صف آرا ہوئی اور ۳۰ر جون کی صبح کو اس جوانمردی سے مقابلہ کیا کہ آدھے انگریز کام آگئے بچے کھچے عیسائیوں نے بھاگنے میں مصلحت سمجھی[2] اور دوسری تاریخ کے اصل الفاظ میں چنہٹ کا اس طرح پر ذکر آیا ہے۔ ۹ر جون کو کچھ فوج چنہٹ جو پانچ چھ کوس پر ہے آ پہونچی، اور مشہور ہوا کہ وہ کل ۳۰ر جون کو منگل کے دن پہلے مہابیر کے مندر علی گنج میں درشن کریں گے پھر لکھنؤ میں در آئیں گے۔

ککرال

یہ مقام شہر سے چار میل کے فاصلے پر ہے کوکر ہندی میں کتے (سگ) کو کہتے ہیں یہاں جو ندی ہے اس کے پانی کا یہ اثر ہے کہ جس کے کتے نے کاٹا ہو وہ اس پانی سے نہلا دیا جائے تو زخمی کو پھر کوئی نقصان آئندہ نہیں پہونچے گا اور عوام کہتے ہیں کہ یہاں کے کنوئیں جھانکنے سے سگ گزیدہ کو اطمینان ہو جاتا ہے پاگل کتے کی پہچان یہ ہے کہ زخم پر آٹے کی ایک ٹکیہ رکھ کر مرغ کے آگے ڈال دے اگر مرغ وہ آٹا کھا جائے تو اندیشہ نہیں ہے اور اگر نہ کھائے تو زخم میں زہر موجود ہے علاج کرنا چاہئے

مرزا غالب کے ایک شعر سے واضح ہوتا ہے کہ جس کو کتا کاٹے اسے ابر و باران سے خطرہ محسوس ہوتا ہے ؎

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں

ککرال میں جنگ آزادی کے کئی مورچے قابل ذکر ہیں ۴ر مارچ ۱۸۵۸ء کو بخت خاں سردار فوج نے ایک مورچہ تو چکر والی کوٹھی کی طرف لگایا۔ غلام رضا خاں کو رسد رسانی کا عہدہ ملا تھا خوانچے والے، ماکولات، مشروبات تر و خشک لیکر جا پہونچے طرفین سے لڑائی ہو رہی تھی۔ اس عرصے میں انگریزی فوج جو سلطان پور سے آئی تھی وہ بھی شریک معرکہ ہوئی —— شرف الدولہ جو عہد برجیسی میں وزیر اعظم قرار پاتے تھے ہاتھی پر سوار ہو کر مع فوج دھاوے کو چلے ککرال پر مقابلہ ہوا۔ ایک بم کا گولہ نواب کے ہاتھی کے پاس سے گزر کر اس رسالدار پر پڑا جو ہمراہ رکاب تھا وہیں ختم ہو گیا۔ نواب یہ سانحہ دیکھ کر گھر واپس آئے اور فوج نے اپنی راہ پکڑی۔

۳۰ر جون کو چنہٹ کی لڑائی میں جب انگریزوں نے ہندوستانیوں سے شکست اٹھائی تو ککرال ندی کے پل پر انگریز تھوڑی دیر کے لئے رک گئے تھے تاکہ وہ اپنی فوج کی بھگدڑ کو روکیں مگر فوج نے بیل گارد پہونچکر دم لیا[3]۔

---

[1] بیگمات اودھ صفحہ ۱۶۰ [2] نیا دور ماہ اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۳۴ [3] نیا دور ماہ اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۳۴

آٹھواں باب

شاہ پیر محمد کے ٹیلے سے قیصر باغ اور گردو نواح تک

پچھلے سات بابوں میں حتی الامکان اس بات کا لحاظ کیا گیا تھا کہ آثار قدیمہ کو سلسلہ وار بیان کیا اور ہر عمارت کو اس کے محل پر نذر قرطاس کیا اس باب میں اگر ترتیب بگڑ جائے تو مؤلف معذور ہے اور کتنی عمارتیں ایسی ہیں جن کے نشان باقی نہیں اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کو محلہ وار کیونکر درج کیا جائے یہ باب آخری باب اور ان عمارات پر حاوی ہے جو عہد رفتہ کی پہلی بنیاد اور لکھنؤ کی جان تھا اس باب کو سب کے آخر میں اس لئے سپرد قلم کیا گیا کہ دوران تالیف میں زیادہ سے زیادہ معلومات یکجا کر دئے جائیں اور تاریخ تشنۂ تکمیل نہ رہے اس تاخیر کو ناظرین معاف فرمائیں نوابی اور شاہی عمارات یہی ہیں (مؤلف)

دائرہ شاہ پیر محمد

لکھنؤ کی آبادی میں شہر کی تقسیم اور محلوں کے نام کٹرہ، نگر، تولہ، گنج وغیرہ الفاظ کو بانیان محلہ کے ساتھ انتساب کے بعد استعمال کیا اور دائرہ کی لفظ کہیں صرف نہیں ہوئی دوسرے شہروں میں اس طرح کے محلے موجود ہیں الہ آباد میں دائرہ اجمل شاہ ہے اور دائرہ احاطہ کے معنوں میں ہے قدیم اصطلاحات کی بنا پر لکھنؤ میں یہ لفظ استعمال ہوئی اور دریائے گومتی کے کنارے آج جس کو "شاہ پیر محمد کا ٹیلہ" کہتے ہیں وہ پرانے کاغذات میں دائرہ شاہ پیر محمد تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہریت کی نیو بڑھ جانے کے بعد یہ لفظ دفن ہو گئی اور پھر استعمال نہیں ہوئی جبکہ اکبری دروازہ کو شہنشاہ اکبر کی طرف منسوب اور شہریت کا پہلا نقش مان لیا گیا تو شاہ پیر محمد کے نام پر دائرہ کی بنیاد دوسرا شہری نقش ہے عہد اکبر[1] و جلوس اورنگ زیب میں کم و بیش پچاس ترپن برس کا فاصلہ تھا اور تاریخ سے ثابت ہے کہ شاہ پیر محمد عہد اورنگ زیب میں لکھنؤ آئے ان کے پہونچنے پر محلہ آباد ہوا خواہ چند گھر ہی کیوں نہ ہوں شاہ پیر محمد صوفی خیال اور سلجھی ہوئی طبیعت کے ایک جید عالم تھے ان کا تاریخوں[2] میں بھی ذکر ہے اور ان کے تالیفات بھی میں نے پڑھے ہیں وہ بہت بڑے عامل اور ریاضت میں شہرۂ آفاق تھے ان کی روحانیت اور کمالات نے مسجد اور ٹیلہ کو انھیں کی طرف نسبت دیکر اپنایا اور شہرت دی اور "شاہ پیر محمد کا ٹیلہ" بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔

مزار شاہ پیر محمد: ۔ گومتی کے کنارے بلندی پر ایک بلند قبہ کی صورت میں اب بھی ہے اور دیکھنے والا مسجد کا جز سمجھتا ہے حالانکہ مسجد اس سے پہلے کی عمارت ہے اس گنبد کے نیچے شاہ صاحب کی قبر شریف ہے اور کہا جاتا ہے کہ صدو رصد کا ایک نقش ہے۔ جو وہاں سے نقل کرنے پر توصحیح نکلتا ہے اور باہر پہونچکر غلط نکلتا ہے میرے خیال میں یہ شاہ صاحب کی کرامت نہیں ہے۔ بلکہ نقل نویسی میں اعداد غلط ہو ہی جاتے ہیں اگر اس نظریئے میں شک ہو تو کسی کتاب سے صدو رصد کا نقش لکھنا شروع کرو اور تحریر کو ختم کرنے کے بعد اصل سے مقابلہ کرو نقش پہلی کتابت میں ہرگز صحیح نہ ہوگا اور چار بار کی جانچ پرتال میں صحت ہو سکتی ہے شاہ صاحب نے ۱۳ جمادی الآخر سنہ ۱۰۸۰ھ میں ارض وطن کو ہمیشہ کے لئے چھوڑا اور جہاں آئے تھے وہیں پیوند خاک ہو گئے۔

---

[1] جلوس اکبر سنہ ۹۶۳ھ جلوس اورنگ زیب سنہ ۱۰۶۸ھ [2] دیکھو سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان [3] مصلح الطالبین عملیات میں خطی نسخہ میں نے دیکھا ہے۔

پیر محمد کا ٹیلہ :- لکھنؤ کی بنیاد قائم ہونے سے پہلے شاہ پیر محمد کا ٹیلہ زبان زد ہے تاریخ اور پرانے حالات کی روشنی میں تحقیق کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں یہاں رامچندر[1] جی کے بھائی لچھمن جی یہاں آکر ٹکے تھے اور اس دور کی پبلک نے لچھنا پور یا لچھنا مو نام رکھا تھا اور دریائے گومتی کی یہ جگہ نہانے دھونے کے استعمال میں تھی مسجد کی بلندی بھی بتاتی ہے کہ اس جگہ کی رفعت زیادہ سے زیادہ قدیم ہے شاہ پیر محمد کے قیام نے اس زمین کو ان کی طرف منسوب کردیا اور ٹیلہ کی توسیع میں وہ ملبہ بھی شامل ہو گیا جو انگریزوں نے رومی دروازے کی جوابی عمارت کھدوا کر پھینکوایا عہد آصفی کے اس دروازے کی مٹی نے زمین کو اور زیادہ دور تک بلند کیا شاہی عمارات کا ڈزائن عموماً ایسا رکھا جاتا تھا کہ ہر گوشے کے محاذ میں دوسرا جوابی گوشہ، ہر کمرے کے سامنے دوسرا ویسا ہی روم چنانچہ امامباڑہ حسین آباد میں داخلے کے دو پھاٹک۔ ایک وہ دروازہ جس پر عظیم اللہ خاں کا نام دوسرا مفتی گنج کا گیٹ یا اصل امامباڑہ کے زنجیری پھاٹک کے سامنے نوبت خانہ کی ویسی ہی جوابی عمارت اور خود امامباڑہ آصفی میں داخلے کے پہلے دروازوں میں جہاں آثار قدیمہ کا نیلا بورڈ ہے جواب پر نوبت خانہ ہونا جز عمارت تھا۔ اسی طرح رومی دروازے کے مقابل کا دوسرا پھاٹک تھا جس کو انگریزوں نے دکھاوے کے لئے مسمار کیا اور یہ تمام ملبہ دریا کنارے قریبی جگہ ہوتے پر ڈالا گیا اور ٹیلہ اونچا ہوتا رہا۔

مسجد شاہ پیر محمد :- ٹیلے پر جو اونچی مسجد اور بڑا شاندار خانۂ خدا نظر آتا ہے وہ اگلے زمانے کی ایک پرانی اور پہلی یادگار ہونے کے ساتھ ساتھ خوشنما عمارت اور مضبوط بلڈنگ ہے جس کے بنوانے والے کا نام شہرت نہیں پا سکا اور ٹیلے کی مسجد ہی سے پہچانی جاتی ہے ہم نے صدر کتاب[2] میں اس تاریخ کے جن مصادر کا جہاں ذکر کیا ہے ان تمام کتابوں میں اس مسجد کے بنوانے والے کا نام مؤلفین سے نظر انداز ہوا اور یہ رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ مسجد نواب فدائی خاں نے بنوائی جو بیٹے تھے نواب ابراہیم خاں پسر نواب علی مراد خاں کے۔ یہ افراد گنج علی خاں کے خاندان سے متعلق تھے نواب فدائی خاں نے اپنی نظامت کے زمانے میں ٹھیک ہندوؤں کی تیرتھ گاہ کے مقابل میں مسجد بنوائی جس کی بلندی اور منارے کئی میل سے دکھائی دیتے ہیں اور چھت پر سے پورے شہر کا نظارہ کیا جا سکتا ہے گاؤں اور کھیت بھی گرد و نواح کے اوپر سے نظر آتے ہیں خاندان علی مراد خاں کا یہ فعل یا تو اس وقت کے تعصب پر مبنی تھا یا وہ مندر اور مسجد پاس پاس قرار دے کر دونوں فرقوں کو شیر و شکر کر رہے تھے کہ منافرت باہمی دور ہو ہندوؤں کو اپنی اکثریت کے باوجود مندر باقی رکھنے میں کوئی ضد نہیں ہوئی زمانہ گذرتا تھا مندر نہ رہا مسجد آج بھی موجود ہے اس سے معلوم ہوا کہ لچھمن جی کی طرف انتساب محض خیال تھا

مسجد کے گنبد چوڑے چکلے دالان وسیع منارے ٹھوس یعنی نہ تو اندر راستہ نہ اوپر کے بالائی حصے میں طائروں کے آشیانہ بنانے کا موقع۔ محراب مسجد پر کوئی پتھر نہیں ہے اس لئے سن تعمیر کا صحیح فیصلہ دشوار ہے مسجد اس وقت بنی جب لکھنؤ کی بزم شعر و

---

[1] مراۃ البلاد راز مخطوطات کتب خانہ ممتاز العلماء، بیرون از جملہ عمارات قدیمہ آنجا دائرہ شاہ پیر محمد است و آں تلہ ایست بلند بر لب دریائے گومتی جائے لچھمن برادر رامچندر او دیہی نمودہ آنجا را لچھنا مو و لچھنا پور نامند پرستشگاہ شمارند [2] ملاحظہ ہو صفحہ ۲۳ کتاب ہذا [3] نواب فدائی خاں ناظم صوبہ اودھ پسر نواب ابراہیم خاں بن نواب علی مراد خاں ابن گنج علی خاں در عہد نظامت خویش جائیکہ معبد ہنود اں بود مسجد عالی بغایت مرتفع رفیع ساختہ کہ منارہائش از فرسخ نمایاں و از بالائے پشتہ اں مسجد جہانے منظر از انجا نواح و اطراف شہر و بسیارے باغات و مزارع عالم مرقع جلوہ گر است۔ مراۃ البلاد قلمی۔

سے آراستہ نہیں ہوئی تھی اور کندہ کرنے والے صاحبان ہنر کا کہیں پتہ تھا امامباڑہ آصفی کے ساتھ اس مسجد پر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کا قبضہ ہوا ماتم کدہ کو قلعہ اور خانۂ خدا کو ڈسپنسری بنایا اور ایک مدت کے بعد امامباڑہ کے ساتھ واگذار ہوئی اگرچہ صحیح فیصلہ نہیں ہے کہ مزار پہلے ہے یا مسجد لیکن مسجد کی اولیت میں قوت نظر آتی ہے اور مسجد ہی نے شاہ پیر محمد کو یہاں ٹھہرایا مسجد راجہ جہانگیر آباد کے زیر انتظام تھی اور حال میں فقیر محمد خاں تاجر تمباکو خوردنی نے اپنے سرمائے سے حدود دار لعبہ کو محدود کر دیا اور مزار احاطہ مسجد میں ہے پیچھے گومتی بہہ رہی ہے۔

موسیٰ باغ میں کارتوسوں کے استعمال پر جب جھگڑا ہوا اور بغاوت کی صورت پیدا ہوئی انگریزی فوج نے شبخون مارا جو کچھ قتل کئے گئے ان کی جانیں لینے کے بعد قیدیوں کو ٹیلہ کی مسجد کے سامنے پھانسیاں دینا شروع ہوئیں اور عام مجمع نے انگریزوں[1] کا یہ ظلم آفریں منظر دیکھا۔

کوٹھی سرفراز الدولہ:۔ مسجد کے قریب نواب سرفراز الدولہ کی ایک کوٹھی کا بھی ذکر صفحہ تاریخ پر موجود ہے اس عمارت میں عرصے تک سینٹری کمشنر آف سول ہاسپٹل کا دفتر رہا اور یہ کوٹھی ۱۹۰۹ء میں کھد گئی۔

تکیہ شاہ پیر محمد:۔ یہاں مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا قبرستان بھی تھا جو پنچ محلہ کے آمنے سامنے واقع تھا محرم علی خاں کی حویلی اور منشی فضل حسین خاں کے رہنے کا مکان غدر کے پہلے یہاں تھا جھگڑے میں اس کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔

پنچ محلہ یا مچھی بھون

شیخوں کی عمارت اور ان کی اس بلڈنگ کا نام جو بطور قلعہ انھوں نے بنا رکھی تھی مچھی بھون یا پنچ محلہ تھا "یا" کی لفظ اس لئے استعمال نہیں ہوئی ہے کہ واقعہ نگار حالات کی ترجمانی میں سہو اور نسیان کا شکار ہو گئے ہیں بلکہ "یا" کا مطلب یہ ہے کہ پنچ محلہ باعتبار پانچ عظیم الشان سربلند قطعات ہونے کے اور "مچھی بھون" اس لئے کہ عمارت کے دروازوں میں جو مچھلیاں شگون نیک سمجھ کر بنائی گئی تھیں ان کی تعداد باون تھی کثرت استعمال نے مچھلی بھون نام رکھا مچھلی کو بنگالی مچھی اور عمارت کو ہندی میں "بھون" کہتے ہیں اس لحاظ سے بھی یہ ترکیب صحیح تھی عبداللہ خاں اوج کہتے ہیں ؎

الٹی ہے بہتی گنگا مچھی بھون کے اندر ۔۔۔ ہیں مچھلیاں بھونوں کی جیسی پرشکن کے اندر

اس سے واضح ہوتا ہے کہ دہلی میں بھی کوئی عمارت مچھی بھون تھی اوج دہلی کے شاعر تھے۔

اس کے بانی کون لوگ تھے؟ سید سالار مسعود غازی کے ساتھ ۴۲۱ھ میں جو فوج تھی لکھنؤ کے شیخ اسی نسل سے تھے اور شیخوں نے گومتی کے کنارے جو عمارت تعمیر کی تھی وہ بھی یہی بلڈنگ تھی اور اس گردہ کے ایک سپاہی کا نام شیخ عبدالرحیم تھا عبدالرحیم روہیلکھنڈ کے رہنے والے تھے جب اکبر کی حکومت میں پرگنہ لکھنؤ کے منتظم قرار پائے تو اپنی بیبیوں کے رہنے کے لئے پانچ مکان بنوائے اور پنچ محلہ کے جانب شمال قلعہ تھا جس میں ۲۶ دروازے تھے ہر دروازے پر کاریگر نے گچ سے دو دو مچھلیاں بنائی تھیں جو تعداد میں باون تھیں۔

تاریخ میں مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ فتحپور سیکری میں بھی ایک عمارت پنچ محلہ مشہور تھی مگر اس کی ساخت تلے اوپر[2] پنچ

---

[1] نیا دور اگست ۱۹۵۶ء صہ ۳۲ [2] تاریخ فتحپور سیکری صہ ۱۰۳

منزلہ عمارت کی صورت میں تھی پہلا بہت لانبا اور چوڑا دوسرا طول و عرض میں اس سے کم وقس علیٰ ہذا۔ پانچویں منزل سب سے چھوٹی مگر انتہائی شاندار۔ یہ عمارت اس ڈھنگ سے بنی تھی کہ جس کا اس پہ قبضہ ہو وہ سارے شہر کا حاکم مان لیا گیا شیخ عبدالرحیم کی دلیری اور نڈر ہونے کے ثبوت میں روزنامہ قومی آواز لکھنؤ کا نامہ نگار صلاح الدین عثمانی[1] رقمطراز ہے " جوتشیوں نے اکبر سے کہا کہ آئندہ دن کی دو ساعتیں شہنشاہ کے جلو میں تخت کے لئے اچھی نہیں ہیں اور صاحب تخت کے لئے جان کا خطرہ ہے۔ اس بچنے کے لئے صلاح دی گئی کہ کسی اور شخص کو اگلے دن تخت نشین کر دیا جائے تاکہ شہنشاہ ہند خطرے سے دوچار نہ ہوں اکبر نے عبدالرحیم کی طرف دیکھا یہ محسوس کرتے ہوئے کہ شہنشاہ اس دن کے لئے اس کو اپنا جانشین بنانا چاہتا ہے وہ نادیدہ خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور دوسرے دن جلوس تخت کے وقت شیخ عبدالرحیم حاضر دربار ہوئے۔ بادشاہ نے پوشاک شاہی شیخ عبدالرحیم کو پہنانے کے لئے طلب کی خواجہ سرا خلعت شاہی اور تاج لایا۔ اتفاق دیکھئے ایک سانپ تاج شاہی میں آکر بیٹھ گیا تھا اس لئے خواجہ سرا کی انگلی میں کاٹ لیا اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑا تڑپ کر جان دی جوتشیوں نے کہا یہی آنے والی آفت تھی جو اس پر گذر گئی اب خطرہ نہیں ہے حضرت جلوس فرما ہوں شیخ عبدالرحیم تخت شاہی سے اتر آئے اور شہنشاہ نے اپنی جگہ براگر اس خدمت کے صلے میں شیخ عبدالرحیم کو پرگنہائے لکھنؤ اور کو پا جاگیر میں عطا کئے یہ علاقہ اس وقت نظامت بہرائچ میں شامل تھا لفٹیننٹ جنرل ایس L.T. GEN MACLCODINNS مچھی بھون کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مچھی بھون کئی عمارتوں پر مشتمل قلعہ کی شکل کی عمارت ہے جو ایک سطح بلند پر قائم ہے اس کو پتھروں اور اینٹوں سے مضبوط کیا گیا ہے اور پھر اس پر مضبوط دیواریں اٹھائی گئی ہیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مشرقی طرز کی گول برجیاں بنی ہوئی ہیں شہر کی طرف یعنی عمارت کے مغربی رخ پر ایک بلند دروازہ ہے دروازوں کے دونوں جانب برجیاں ہیں جہاں سپاہیوں کا پہرہ رہتا ہے مشرق کی طرف دو نیچے ٹیلوں پر بڑے۔ بڑے صحن ہیں جو چاروں طرف کمرے اور دالانوں سے گھرے ہوئے ہیں دریائے گومتی کے رخ پر بلند اور ہوادار محراب دار ہال تھا۔

نواب صفدر جنگ نے جن کا نام محمد مقیم تھا اور خطاب نواب ابوالمنصور خاں صفدر جنگ تھا شیخوں کو شکست دیکر اس مقام پر سب سے پہلے قبضہ کیا ان واقعات کی تفصیل اس سے پہلے اور بعض آئندہ صفحات سے ناظرین کے سامنے آ چکی ہیں مسٹر این، آر گبینس N.R. GUBBINES اپنی کتاب بغاوت اودھ میں لکھتے ہیں کہ ریذیڈنسی (بیلی گارڈ) حسین آباد کے راستے میں مچھی بھون کی پُر عظمت عمارت ہے یہ تین ٹیلوں پر بنائی گئی ہے جو ایک دوسرے پر قائم ہے سب سے بلند ٹیلے پر شیوخ لکھنؤ کی بنوائی ہوئی بھون ہے جس کی حالت خستہ ہو چکی ہے پہلے ٹیلے سے اتر کر دوسرے ٹیلے پر سنگ مرمر کی ایک خوبصورت بارہ دری ہے اور کچھ دوسری چھوٹی چھوٹی عمارتیں ہیں اس سے اتر کر تیسرے ٹیلے پر ایک بڑا صحن اور بلند چار دیواری ہے دیواریں سڑک سے شروع ہو کر سب سے اونچے ٹیلے کی بلند عمارتوں تک پہونچتی ہیں۔ مچھی بھون شیخوں کے قبضے سے نکلنے کے بعد سے سلطنت اودھ کے آخری سلطان کے قبضے میں رہی اور نواب واجد علی شاہ بہادر کے آخری زمانے تک مچھی بھون کے دروازے پر نقارہ بجتا تھا۔

بادشاہ کے بھائی کا قیام:- انگریز مذکور کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے زمانے تک شاہ اودھ کے بھائی نواب یحییٰ خاں کی

---

[1] قومی آواز جلد ۱۱ نمبر ۲۶ مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۵۶ء

وہاں سکونت تھی نواب یحییٰ علی خاں وہی با اقتدار شخص ہیں جن کی سرکار میں عالم علی باورچی ماہی مسلم پکانے میں شہرۂ آفاق تھا۔ اس سے بہتر مچھلی پکانے والا کسی رئیس کے دسترخوان پر کوئی خانساماں[1] نہ تھا۔

فروری ۱۸۵۶ء میں ضبطی اودھ کے بعد مچھی بھون کو انگریزوں نے فوج کے سپرد کر دیا اور اس سے بہتر قلعہ انگریزوں کے لئے دوسرا نہ تھا گبنس کے بیان کے مطابق[2] ۱۸۵۷ء کی ابتدا میں تقریباً دو سو بڑی اور چھوٹی توپیں نصب تھیں اور انگریز اور سکھ فوج کا دستہ تعینات تھا بارود اور گولوں کا بھی اسٹاک قرار دیا تھا اور اس موقع پر قلعہ بندی انگریزوں کے بہت کام آئی۔ قلعہ کی توپیں ایک طرف شہر پر گولہ باری کر سکتی تھیں تو دوسری طرف پتھر والے پل کو جو اب ہارڈنگ برج کہلاتا ہے اپنی زد میں لئے ہوئی تھیں اس زمانے میں بھی ایک پل تھا جو شہر کو گومتی کے شمالی علاقے سے ملاتا تھا۔ سر ہنری لارنس چیف کمشنر اودھ اور اودھ میں انگریزی فوجوں کے افسر اعلیٰ نے اس بات کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا کہ مچھی بھون کے ذریعے ایک طرف تو شہر کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف منڈیاؤں میں پڑی ہوئی ہندوستانی فوج کو شہر میں داخل ہونے سے روکا جا سکتا ہے اس قلعہ سے اہل شہر کو خطرے کے وقت ریزیڈنسی کی طرف بڑھنے سے روکا جا سکتا تھا چنانچہ گبنس کا خیال ہے کہ شہر میں ہنگامہ نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ قلعہ مچھی بھون کے انتظامات تھے۔

۳۰ مئی کی شب کو منڈیاؤں میں مقیم ہندوستانی افواج نے چڑھائی کر دی مگر چونکہ توپ خانہ ان سے پہلے ہی لیا جا چکا تھا۔ انھیں کامیابی نہیں ہو سکی اہل شہر نے بغاوت کا حال سن کر پل سے گذر کر منڈیاؤں جانا چاہا لیکن چونکہ پل قلعہ کی توپوں کی زد میں تھا اس لئے نہ جا سکے لڑائی دو دن میں ختم ہو گئی اور اس کے بعد نئے حاکموں کے انتقام کا مہیب مسئلہ شروع ہوا مچھی بھون کے مغربی پھاٹک کے سامنے گذرنے والی شاہراہ پر پھانسیوں کی ایک لمبی قطار لگا دی گئی جس پر مشتبہ آدمیوں کو پھانسیاں دی جاتی تھیں مشہور ہے کہ ایک دن میں ۳۰۔۴۰ آدمیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ان شہیدان وطن کی لاشوں کو پھانسیوں پر اس وقت تک لٹکا رہنے دیا جاتا تھا جب تک کہ اسیروں کا دوسرا جتھہ پھانسی کے لئے نہ آ جاتا اس لرزہ خیز منظر کو بعض برطانوی مصنفین نے بہت لطف لے کر بیان کیا ہے۔ ۳۰ مئی کو ناکام بغاوت کے بعد قلعہ مچھی بھون شہر کے سربرآوردہ لوگوں کا قید خانہ بن گیا ان اسیران فرنگ میں خاص خاص حضرات میں نواب مصطفےٰ علی خاں نواب ہمایوں خاں مرزا محمد شکوہ رکن الدولہ اور راجہ تلسی پور تھے رکن الدولہ قید ہی میں راہی ملک عدم ہوئے ان کی قبر بیلی گارد میں اب بھی ہے۔

۳۰ جون کو جب معرکہ چنہٹ میں انگریزوں کو مولوی احمد اللہ شاہ کی راہنمائی میں لڑنے والی فوجوں کے ہاتھ سے شکست فاش اٹھانا پڑی تو انگریز ریزیڈنسی اور قلعہ مچھی بھون میں پناہ گزین ہوئے ہنری لارنس نے محسوس کیا کہ وہ قلعہ اور ریزیڈنسی والوں کی حفاظت نہ کر سکیں گے چنانچہ لارنس کے احکام کے مطابق یکم جولائی کی شب کو رات کی تاریکی میں انگریز سپاہی مع اپنے اسیروں کے مچھی بھون سے نکل کر ریزیڈنسی پہونچ گئے۔ مچھی بھون میں اس وقت ہزاروں من بارود جمع تھا جب انگریز سپاہی بحفاظت بیلی گارد کے حصار میں داخل ہو گئے تو فیتہ میں آگ لگا دی گئی۔ بارود میں آگ پہونچتے ہی ایک زبردست دھماکہ ہوا جس سے پورا شہر لرز اٹھا اور مچھی بھون سے شعلے بلند ہوئے۔ چنگاریاں آسمان سے اڑتی ہوئی نظر آئیں دھوئیں اور گرد و غبار کا ایک ستون آسمان تک بلند ہوتا چلا گیا تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد دھواں اور گرد و غبار صاف ہوا تو اس تاریخی عمارت کی جگہ ملبے کے علاوہ کچھ نہ تھا اس طرح لکھنؤ کی یہ

---

[1] گزشتہ لکھنؤ ص ۲۱۳
[2] قومی آواز

عمارت صفحۂ ہستی سے مٹ گئی مچھی بھون کے کھنڈروں پر پچاس سال بعد ایک نئی عمارت تعمیر کی گئی اور وہ میڈیکل کالج کا کنوکیشن ہال کہلاتا ہے[1]۔

مجاہدین آزادی کی شکست کے بعد شہر لکھنؤ تقریباً پندرہ دن تک لٹتا رہا ہزاروں بے گناہ قتل کردیئے گئے سیکڑوں باعصمت خواتین نے حفظ ناموس کی خاطر خودکشی کرلی دولت مند نان وشبینہ کو محتاج ہوگئے مگر سامراج کا غیظ و غضب اس پر بھی کم نہ ہوا۔ اور یہ حکم ہوا کہ جہاں جہاں باغیوں نے قیام کیا ہو اور جہاں کے باشندوں نے ان کی مدد کی ہو ان سب محلوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے چنانچہ حسین آباد سے کرلا مارٹینیر تک دریائے گومتی کے کنارے جتنے بھی مکانات تھے یا تو نذرِ آتش کردیئے گئے یا بارود لگا کر اڑا دیئے گئے شہر کے کتنے محلے اور بازار تھے جن کا آج نام و نشان بھی نہیں ہے غدر کی تاریخ "لکھنؤ شد خراب واویلا" ۱۲۷۴ ہے مچھی بھون کے اڑانے کی آواز دور دور تک گئی اور کمزور دلوں کے ہارٹ فیل ہوئے حاملہ عورتوں کے پیٹ گرے اس وقت کی دنیا میں اس سے بلند دھماکے کا کسی کو تصور بھی نہ تھا۔

شیخن دروازہ

مسلمانوں میں مغل، پٹھان، سید، شیخ چند ذاتیں وہ ہیں جن کو دوسرے طبقے سے ممتاز سمجھا جاتا ہے عربی زبان میں شیخ بوڑھے کو کہتے ہیں اور تعظیم کے لحاظ سے کہیں کہیں سید کو بھی اس لفظ سے یاد کیا جاتا ہے شیخ کی جمع شیوخ اور اردو زبان میں اس قوم کی عورت کو شیخانی کہتے ہیں نوابی سے پہلے اس سرزمین پر شیخوں کا جو اقتدار تھا اس کا نمونہ مچھی بھون اور شیخن دروازہ تھا۔ یہ پھاٹک حسین آباد گورنمنٹ ہائی اسکول کے دروازے کے سامنے چڑھائی پر سرخ رنگ کا تھا اور عمارت کا صدر مقام سمجھا جاتا تھا شیخوں کی ساری طاقت اس دروازے پر صرف ہوئی تھی سعادت خاں برہان الملک (وفات ۱۱۵۱ھ) جب شیخوں سے مقابلے کے لئے گؤگھاٹ عبور کرکے دروازے میں آئے نواب ہاتھی پر سوار تھے دیکھا کہ دروازے میں شگون کے طور پر ایک تلوار لٹک رہی ہے آپ نے پسند نہ کیا کہ اس تلوار کے نیچے سے نکلیں شمشیر آبدار ہاتھ میں تھی پہلا حملہ تلوار پر کیا اور وہ تیغ استبداد گر پڑی جاہل شیخوں کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ جس نے اس دلیری سے قلعہ میں پہونچکر تلوار کاٹ دی وہی غالب آیا نواب کا خیمہ دروازے کے قریب نصب ہوگیا اور شیخ آنے والے مرد دلیر کی بہادری اور ہیبت کے قائل ہوگئے یہ دروازہ بھی کنگ میڈیکل کالج میں کھود کر گرادیا گیا اور صفحۂ تاریخ پر صرف یاد باقی ہے شیخوں کی نسل میں علامہ فدا حسین قریشی ایک عربی داں عالم میرے ہمعصر گذرے ہیں جن کا لامیۃ الہند قصیدہ لکھنؤ میں مشہور ہے۔

وضعداران لکھنؤ کے مؤلف نے شیخن دروازہ پر حسب ذیل الفاظ میں اظہار افسوس کیا ہے۔ "شیخ احمد بخش اور بھی شیخوں میں ہیں جن کی یادگار شیخن دروازہ کل تک کھڑا اپنی وضعداری کا ثبوت دے رہا تھا مگر آہ جس طرح زمانے نے ان وضعداروں کی قبروں کے نشان تک مٹادیئے اسی طرح اس باوضع یادگار کو بھی میڈیکل کالج کے بننے کے بہانے سے ملیا میٹ کردیا"

اڑا دو خاک میری ٹھوکروں سے — اگر منظور ہو برباد کرنا

گلزاری مل خزانچی جس کی تحویل میں فوج کے لئے دو کروڑ روپیہ موجود رہتا تھا اس کی املاک بھی شیخن دروازہ کے قریب تھی

[1] قومی آواز ج ۱۱ نمبر ۲۶۰ مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۵۶ء

یہ قوم کا بنیا تھا اس کے مکان کا عالی شان دروازہ حیدر باغ کے صحن اور سنگین محل[۱] کے سامنے تھا۔

دولت خانہ

یہ نام ہے نواب آصف الدولہ مرزا یحییٰ علی خاں بہادر عرف مرزا امانی ہزبر جنگ صوبیدار اودھ کی دولت سرا کا۔ رومی دروازے سے پچھم کی طرف آؤ تو دولت خانہ کی عمارت تھی یہاں عہد آصفی کا عملہ رہتا تھا اور "محل قدیم" یا "آصفی کوٹھی" بھی یہیں تھی جب نواب سعادت علی خاں مسند نشین ہوئے تو فرح بخش کو دار السلطنت بنایا اور یہ عمارتیں خالی پڑی رہیں اور گر گئیں یہ واقعہ دریا کنارے کوٹھی کا ہے۔ سردی کا زمانہ تھا رات کا وقت سناٹے کا عالم، سیاروں کے شور سے نواب کی آنکھ کھل گئی۔ فرمایا خدا کی پناہ کتنا شور و غل ہے۔ کان پڑی آواز نہیں آتی ذرا دیکھنا تو کیا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا حضور گیدڑ سردی کے مارے ٹھٹھرے جاتے ہیں روتے ہیں اور فریاد کرتے ہیں۔ پوچھا کتنے سیار ہوں گے۔ عرض کیا بچے کچے ملا کر چھ سات سو ہوں گے۔ کہا اچھا سب کو دوشالے بانٹ دو حکم کی دیر تھی سات سو دوشالے سیاروں کے نام سے عطا ہوئے اور سب کے سب ہر بچہ بوڑھے مرد و عورت پر تقسیم ہو کر مال دوستوں کا ہوا دوسرے دن پھر وہی صدائیں آئیں تو ذرا جبین پر شکن کے ساتھ کہا کیوں جی کل تم لوگوں نے کہا کہ سیار سردی سے روتے ہیں ہم نے ان کے اوڑھنے کو دوشالے دلوا دیئے یہ اب کیوں آواز آتی ہے عرض کی حضور یہ آپ کی جان و مال کو دعائیں دے رہے ہیں مسکرا کے چپ ہو گئے سوجھ بوجھ کا امتحان کر لیا اور فرمایا کہ امیر خسرو، ملا دوپیازہ نعمت خاں عالی جو اپنے فن میں طاق تھے تو ہمارے دربار میں بھی کمی نہیں ہے۔

نواب کے اخلاق و عادت و اطوار کا اس سے پہلے کے صفحات میں بھی ذکر آ چکا ہے چونکہ مکان سے مکین کی زینت ہوتی ہے اس لئے دولت خانہ کے ذیل میں نواب کا مختصر ذکر ضروری ہے۔ تاریخ اودھ کے ماہر خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھتے ہیں[۲] نواب دو گھڑی رات سے بیدار ہوتے تھے اور نہایت خوش الحانی سے قرآن شریف کے دو رکوع ملا محمد استاد سے سماعت فرماتے تھے بعد فراغت نماز سحر صحن میں خاک پر بیٹھ کر نہایت عاجزی سے مالک حقیقی کا سجدہ شکر ادا کرتے تھے اور قصر حکومت سے برآمد ہو کر جھالر دار بوچہ پر بیٹھ کر چار باغ ہوا خوری کو جاتے تھے۔ نواب اور ان کی بیگم دونوں شعر و سخن میں بڑے ماہر تھے۔ ان کا ایک شعر یہ ہے ؎

تو اپنے شیوۂ جور و جفا سے مت گذر
تری بلا سے مرا دم رہے رہے نہ رہے

آصف الدولہ کے جانور خانہ کا ذکر جنت العالیہ ج ۲ فارسی ص۵۹ میں ہے۔

نواب کے اشاف میں زیادہ تر ایرانی لوگ تھے اور وہی تمدن و تہذیب ہندوستان کی آب و ہوا کی آمیزش کے بعد تہذیب اودھ قرار پایا مرزا محمد علی[۳] بیگ خراسانی نواب کے منہ چڑھے ملازم تھے۔ آغا محمد ندیم[۴] شاہی مجلسیں پڑھتے تھے اور نجم الدین مورخ اودھ نے اقرار کیا ہے کہ وہ روضہ خوانی، مرثیہ گوئی اور خوش بیانی میں کمال رکھتے تھے۔

فیل خانہ میں دو ہزار[۵] ہاتھی تھے نواب اس قدر فیاض تھے کہ لکھنؤ میں دو سو برس تک ہندو مسلمان دوکاندار اپنا کاروبار

---

[۱] تاریخ اودھ نجم الغنی ج ۴ ص۱۳۵ [۲] بحر انکار آپ کی مشہور کتاب حدیث خوانی پر ہے [۳] ہسٹریکل البم آف اودھ [۴] عماد السعادت

شروع کرتے وقت اور دوکان کھول کر کہتے تھے جس کو نہ دے مولا اس کو دے آصف الدولہ۔ ایسا ہر دلعزیز اور رعایا پرور تاجدار ملک میں پیدا نہیں ہوا۔ آپ کے زمانہ حکومت میں کوتوالی مکھو خاں[۱] کے سپرد تھی۔

نواب نے مرض استسقا میں جان دی حکیم شفائی کا علاج تھا سنبھل کر حالت بگڑی ۵۱ برس کی عمر میں عدل وانصاف کے جھنڈے گاڑ دیئے ۲۳ سال چند ماہ صوبہ داری کو ایسا بلند کیا کہ منصب نے شاہی کا لباس پہنا۔

روح نکلنے سے پہلے زندگی کی آخری رات کچھ لوگوں نے "نواب بھائی نواب بھائی" کی ہولناک صدا سنی اور شہر خوفزدہ تھا جمعرات کے دن ۳ بجے ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ ملک عدم کی طرف پہونچ گئے فوجدار خاں[۳] نے غسل دیا رات کا تھوڑا حصہ گذرنے پر امامباڑہ ہی میں دفن ہوئے تحسین علی خاں[۴] پر یہ اثر ہوا کہ جسم سے خلعت اعزازی اتار دیا قبر پر بیٹھ گئے اور ارادہ کر لیا تھا کہ ایسے مشفق کے بعد اب مجاورت قبر کے سوا کوئی کام نہ کروں گا بڑی مشکل سے دوست احباب نے ان کو مزار نواب سے اٹھایا۔

نواب کی وفات حسرت آیات پر اردو، فارسی، عربی، ہندی شعرا نے اچھی اچھی تاریخیں کہیں ایک عربی تاریخ کا آخری مصرعہ یہ ہے

ع "ھنھنا روح و ریحان وجنات النعیم" اردو میں یہ[۵] مادہ تاریخ ہے ؎

پوچھا آصف سے نکیرین نے کتنے ہیں امام — کہا جرار نے ہر ایک سے بارہ بارہ

ایضاً ؎ — سوئے جنت رفت آصف نامدار — گشت تاریخش غریب از اتفاق ۱۲۱۲ھ

آصف الدولہ بفردوس بریں منزل کرد

نواب کے ایک وفادار غلام کا ذکر اس محل پر ہے جب مرزا قتیل کو معلوم ہوا کہ خیرات علی کے بارے میں لکھا گیا کہ اس نے بعد وفات نواب امیر الدولہ کی نوکری کی گفتگو پر انکار کر دیا۔ مرزا نے اس خبر کی رد اس طرح کی ہے کہ امیر الدولہ تو آصف الدولہ سے آٹھ برس پہلے مر چکے تھے۔ ہاں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ امیر الدولہ سے مراد حسن رضا خاں تھے تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ امیر الدولہ خطاب حیدر بیگ خاں کا تھا اور حسن رضا سرفراز الدولہ[۶] کہے جاتے تھے آصف الدولہ کے باورچی خانہ کا صرف ۲۲ سو روپیہ روز کا تھا۔ اور بارہ[۷] سو روپیہ ماہوار باورچی خانہ کے ملازمین کو ملتا تھا جو کھانے کو مقوی اور نئے شکل وصورت میں لانے پر ہمہ وقت تحقیق کرتے رہتے تھے نعمت خاں عالی نے دسترخوان کو وہ فروغ نہیں دیا جو شایان اودھ نے دیا۔

آصف الدولہ کا دیوان کہا جاتا ہے کہ کتب خانہ آصفیہ دکھن میں موجود ہے آصف الدولہ کے جانورخانہ[۸] کا ذکر بعض کتابوں میں ہے مگر تفصیل معلوم نہ ہونے سے عنوان قائم نہیں ہوسکا۔

مکھو خاں کوتوال نے آصف الدولہ کی حیات میں رحلت کی ان کے بھائی میر عزت علی اقتدار کے مالک ہوئے۔ یہ لکڑی باز رستم خاں کے شاگرد تھے ان کی نخوت اور غرور کو عماد السعادت نے حد سے فزوں قرار دیا ہے۔

---

[۱] ہسٹریکل البم آف اودھ [۲] عماد السعادت میں ہے کہ مکھو خاں حیات نواب میں مر گئے ان کے بھائی کا نام رستم خاں تھا فن شمشیر زنی میں "رستم خانی" انھیں کے تعلیمات اور فن کا نام ہے ان کے شاگرد میر عزت علی بھکیت تھے

[۳] عماد السعادت ص۱۵۸ [۴] ایضاً [۵] گل صد برگ ص۲۳ [۶] رقعات مرزا قتیل ص۳۳ طبع قدیم عہد شاہی

[۷] قدیم ہنر ص۱۲ [۸] جنت العالیہ جلد دوئم فارسی ص۵۸

پکا پل

لکھنؤ میں پختہ پل کی دریائے گومتی پر سختی سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی دریا پار کے کتنے گاؤں اور پڑوسے ندی بیچ میں ہونے سے مرکز سے جدا تھے اور درآمد و برآمد میں کشتیاں کام میں لائی جاتی تھیں نواب اودھ نے دریا پر پل اپنے سرمایے سے بنوایا۔ اور یہ راہ یہاں سے سیدھی بارہ بنکی سیتا پور پہونچ گئی نجم الغنی نے اس پل کی تاریخ ۱۸۰۰ء[1] ظاہر کی ہے اور یہ قطعہ درج کیا ہے ؎

پلِ نو بنا گشت بر گومتی — بتدبیر نیک و بعقل زریں
چو از فہم خود سال او خواستم — بگفتا پل استوار و متیں ۱۲۰۶ھ

اس پل کو انگریزوں نے اپنے زمانے میں خطرہ پیدا ہو جانے سے کھدوا دیا اور ۱۹۱۴ء[2] میں وہ پل بن کر تیار ہوا جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے اور دونوں طرف سفید پتھروں میں یوربین انجینئروں اور سال تعمیر کا ذکر ہے یہ پل اصل جگہ سے ہٹ کر بنایا گیا ہے۔

پکے پل پر دونوں طرف دھوبی کپڑے دھوتے ہیں جو شہر اور اپنے اپنے گھر سے گدھے یا بیل یا ٹھیلے پر کپڑے رکھ کر لے جاتے ہیں مسلمان دھوبی ہمیشہ بیل پر سامان لاتے ہیں ہندوؤں کے یہاں گدھے پر لانے کا رواج ہے وقتی طور پر غربا یا جلدی پسند اصحاب یا مسافروں کے لئے کچھ دھوبی گاہک کا انتظار کرتے ہیں اور اسی وقت کپڑے دھو کر دیدیتے ہیں اس کو کھڑے گھاٹ کے کپڑے کہتے ہیں ؎

گھڑی بھر رو کے کوئے یار میں یوں زنگ دل کھویا ٭ کہ کپڑا جیسے مفلس نے کھڑے گھاٹ آکے کلپایا (آتش)

دشمن کے مار ڈالنے کا ایک ٹوٹکا وقت ضرورت اگلے زمانے کے لوگ اختیار کرتے جس کو پاٹا الٹوانا کہتے جس چوبی تختے پر دھوبی گیلے کپڑے مار مار کر دریا میں اتر کر صاف کرتا وہ دشمن کا نام لے کر الٹ دیا جاتا اور وہ مر جاتا اس کی تفصیل میرے سامنے نہیں ہے مگر یہ معلوم ہے کہ دھوبی اس عمل کا ذر مشکل سے تیار ہوتے اور جو تحریک کرتا اس سے انکار کرتے۔

منشی رام سہائے تمنا کی تحریر ہے کہ نواب سعادت علی خاں نے دریائے گومتی کے گرد دیواریں اٹھوا دی تھیں اور ندی کو نہر کی طرح سکونتی مکان تک میں پہونچا دیا تھا اس دیوار کے آثار ندی کے کنارے کہیں کہیں نظر آتے ہیں اور گذرے ہوئے زمانے کے چار مہلک سیلاب بنیاد کو مٹا نہیں سکے۔

مسجد اشرف النسا بیگم

پل پختہ سے کچھ دور جا کر دست راست کی طرف جو سڑک میڈیکل کالج ہوسٹل کی سمت مڑتی ہے ایک فرلانگ کے فاصلے پر بغیر پلاسٹر کی ایک شکستہ حال مسجد ہے اور اینٹیں بوڑھے کے دانت کی طرح ہل رہی ہیں۔ مشہور ہے کہ یہ آصف الدولہ کی بہن نے بنوائی شہر کی تمام مسجدیں دیکھ جائیے ہمیشہ دو دالانوں میں اندر کے درجہ پر گنبد ہوتے ہیں اس مسجد میں اگلے دالان کی سقف پر گنبد ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب پہلا دالان نمازیوں کے لئے کافی نہ ہوا تو پیچھے دالان کا اضافہ کیا گیا محلات شاہی میں یہ اضافہ منحوس بھی سمجھا جاتا ہے مگر درحقیقت مسجد و امام باڑوں کی تعمیر میں عالموں کی بات چلتی تھی اور عوام اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے تھے۔

---

[1] ۱۲۰۶ھ میں ۱۷۹۱ء ہوتے ہیں نجم الغنی کی رائے صحیح نہیں ہے [2] امن التواریخ ص۱۵۱

تینوں گنبدوں میں سونے کی کلسیاں تھیں جو اب نہیں ہیں اور میناروں کے طلائی کلس اب تک باقی ہیں پہلے درجے سے زیادہ چوڑا دوسرا درجہ ہے اور نقشہ انتہائی حسین اور دیدہ زیب ہے مسجد کے متعلق لق و دق زمین تھی جو اب باقی نہیں رہی صحن مسجد کی آغوش میں ایک چھوٹی مسجد اور ہے جو بظاہر جدید اور بے ربط و بے محل ہے رو کار پر پتھر ہے جو پرانا ہونے اور دوری کے لحاظ سے مکمل پڑھا نہیں جاتا جو مصرعہ صاف ہیں وہ یہ ہیں ؎

باشرف اشرف النساء بیگم	ناز پروردہ پاک دامانی
نور چشم وزیر ابن وزیر	شرف دودمان سلطانی
بانی مسجد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	جبکہ بر رضائے سبحانی
فکر تاریخ تھی مرے دل میں	پے سن بہ لطف یزدانی
ہاتف غیب سے ندا آئی	ہے وہ بیت المعمور ۔ ۔ ۔ ۔

آخری لفظ جس سے مصرعہ ختم ہوتا ہے پڑھی نہیں جاتی ممکن ہے کہ "عرفانی" ہو اور سن تعمیر ۱۲۱۰ھ ہو

میر تقی کا کنواں:۔ مسجد کی سمت چپ ایک چھوٹا کنواں ہے جو تقی کا کنواں کہلاتا ہے ممکن ہے کہ میر تقی ہوں بعض قدیم مکاتیب[1] سے میر صاحب کے برادر نسبتی اور ان کی زوجہ کا تو ذکر ملتا ہے مگر یہ خبر نہیں کہ وہ کس محلہ کے رہنے والے تھے کنواں پٹا ہوا ہے پانی کا کہیں پتہ نہیں مگر اس چاہ میں خاص بات یہ ہے کہ جدید منڈیر سے کچھ نیچے دو سوراخ دار پتھر لگے ہیں جس میں زنجیر پہنا کر کبھی تو اجال دار سطح آب پر پہونچایا گیا تھا تا کہ کنوئیں میں جو گر جائے وہ ان زنجیروں کی مدد سے اوپر کھینچنے سے بلا تکلف نکل آئے اور ڈوبنے نہ پائے تو اکھٹولے کی طرح زنجیروں سے کھینچنے میں ڈوبنے والے کی جان بچ سکتی ہے خاندان نواب شجاع الدولہ بہادر کے ایک محترم فرد نے مجھ سے یہ راز بیان کیا جس کے قبول کرنے میں عقل سلیم کو عذر نہیں ہے۔

برج طلائی

سونے کا برج وہ مکان تھا جہاں بہو بیگم صاحبہ مادر نواب فیض آباد سے آکر ٹھہرتی تھیں عمارت شاندار کرسی بلند اور کئی زینے طے کرنے کے بعد پہونچ ہوتی تھی۔ اس سے زیادہ تاریخ میں راہنمائی نہیں ہے دریا کے کنارے اس قصر کا بھی وجود تھا۔ اب کہیں پتہ نہیں ہے۔ امام باڑہ داروغہ حیدر بخش گومتی پار کا عزا خانہ تھا جس کے بارے میں معلومات نہیں۔

پیچ پلیہ

نوابی کے تذکرہ میں اس قصر عالیشان کا بھی ذکر ہے نواب سعادت علی خاں کے وقت میں جب دریا بڑھا ہے تو برج طلائی اور پیچ پلیہ کو نقصان پہونچنے کا ڈر تھا مگر انجینئری کے مشرقی ماہروں نے اپنے حسن تدابیر سے تدارک کر دیا۔

باولی امامباڑہ آصف الدولہ

گزشتہ صفحات سے معلوم ہوا کہ معمول سے زیادہ بڑے کنوئیں کو شہر میں باؤلی کہتے ہیں "باولی حیدر بیگ" چاہ کشمیری محلہ پر بحث ہو چکی نواب آصف الدولہ کی باولی شہر کے تمام بڑے کنوؤں اندازوں سے ممتاز ہے۔

---

[1] رقعات مرزا قتیل ص۲۵ طبع قدیم عہد شاہی

باولی کا ذکر عماد السعادت میں بھی ہے اور ہم باولی کو امامباڑہ کے پہلی قرار دیتے ہیں یہ کنواں حسین آباد گورنمنٹ ہائی اسکول جاتے وقت آہنی کٹہرہ میں جدید منڈیروں کے ساتھ ہے اور ہشت پہل ساخت میں موجودہ سطح اب تک پانچ درجے یا منزلیں ختم کرنے کے بعد پانی نظر آتا ہے دیکھنے میں آب چاہ سیاہ ہے اور اندر سے صحن امامباڑہ تک سہ منزلہ کشادہ زینہ دار راستہ بتاتا ہے کہ تعمیر عمارت میں تحصیل آب کی سہولتوں میں ایسا ہوا تھا امامباڑہ کے مزدور یا راج ہر آنے والا اپنے ہاتھ سے اندر ہی اندر بغیر ڈول اور رسی کے پانی بھر سکتا تھا اس وقت تیسرے درجے سے ملا ہوا پانی ہے باولی کا راستہ صحن امامباڑہ کے وسط میں نہیں بلکہ عظیم الشان درجوں سے قریب ہے اور یہی فاصلہ باولی کے مقام میں ہونا چاہیے جس کی مدد سے آسانی سے پانی پہونچے امامباڑہ سے اندر پہونچنے میں ۳۸ زینوں کے بعد پانی ہاتھ سے بھر لیا جاتا ہے

باولی کے گرد جو عمارت ہے اس میں نہانے والے ٹھہر کر غوطہ زنی بھی کرسکتے ہیں اور کنویں کی عمیق نیو کے ساتھ ساتھ جو عمارت ہے وہ بھی پانی کے گھٹنے اور بڑھنے پر نہانے والوں کے کام آتی ہے۔

رومی دروازہ

رومی دروازہ بڑے امامباڑہ کے پھاٹک کا نام ہے جو اپنی جگہ خود ایک مستقل عمارت اور سربفلک بلڈنگ ہے اس کی بلندی نجم الغنی نے پچاس گز سے زیادہ تجویز کی ہے۔ بمبئی میں سمندر کے کنارے انڈین گیٹ اور شہر حیدرآباد کے پھاٹک اس کو دیکھتے ہوئے نظروں میں نہیں سماتے۔ دکھن میں پھاٹک کو کمان کہتے ہیں جو اس سے بلند نہیں ہیں۔ رومی دروازہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ تھوئی یا نقشہ مرتب کرنے والا رومی تھا شہر والوں نے اس کے کام کو فراموش نہیں کیا حکومت اودھ میں یورپین کاریگر اور غیر ملکی انجینئر کثرت سے تھے زیادہ امکان ہے کہ نام میں صناع کی وطنیت باقی رہے۔

سابق کے صفحات میں گذرا کہ جوابی عمارت رومی دروازہ کی جو اس سے چھوٹی تھی پورب کی طرف تھی اور انگریزوں نے اس کو باقی نہیں رکھا۔ رومی دروازہ ایک عالیشان محراب دار پھاٹک ہے جس کی وضع مسجد کی اس محراب سے مشابہ ہے جس میں پیش امام نماز پڑھاتا ہے رفیع الشان محراب پر ایک خوشنما برجی ہے اور گلائی پر سرتاسر کٹاؤدار کنگرے ہیں اس محراب کو نیچے کی طرف سے تین دروازوں میں تقسیم کیا گیا ہے جس سے پبلک اور گاڑیوں کی آمد و رفت ہوتی ہے چوڑان میں دونوں طرف پہرہ داروں کے بیٹھنے کے لئے مونڈھے ہیں جن کو بیل پایہ بھی کہتے ہیں نیچے اوپر سنگی قبضہ ہیں جس میں کسی وقت یقیناً جوڑیاں تھیں یا اب چوبی وآہنی دروازہ لگائے جاسکتے ہیں۔

رومی دروازہ کے پاس میاں الماس نے ایک مسجد کسی ضرورت سے بنوادی تھی اور رنڈیوں نے کچھ کمرے بنا رکھے تھے سلطان العلما مجتہد العصر والزماں نے اپنے مراسلہ مورخہ ۲۳ شعبان ۱۲۶۷ھ میں شاہ اودھ سے اپیل کی کہ مسجد کی مرمت کردی جائے اور پیشہ ور عورتیں ہٹادی جائیں۔ بادشاہ نے مسجد کی مرمت اور طوائفوں کو ہٹوانے کا حکم دیا اور حیدر حسین خاں کے ذریعے سے تعمیل ہوئی

(تاریخ اودھ ص۲۱۰/۲۸)

پہلوئے رومی دروازہ میں اس قدر وسعت اور سہ منزلہ نیچے سے اوپر تک اتنے کمرے ہیں کہ مدت تک یہاں شیعہ اسکول قائم رہا۔ اور ہر مذہب و ملت کے لوگ (طلبا) انگریزی تعلیم حاصل کرکے نکلے۔

رومی گیٹ میں اندر ہی اندر اوپر جانے کا راستہ بھی ہے اور سب سے اونچی برجی میں سیاح پہونچ جاتے ہیں اور تمام شہر کا نظارہ آسانی سے ہو سکتا ہے اس پھاٹک میں عموماً شہد کی مکھیاں چھتہ لگاتی ہیں اور اس سے اونچی جگہ ان کو شہر بھر میں نہیں ملتی ایک بوند شہد جمع کرنے کے لئے شہد کی مکھی کو چار سو پھولوں کے پاس جانا پڑتا ہے اور ایک بوند شہد کے لئے پچاس ہزار میل کی مسافت طے کرنی ہوتی ہے یہ فاصلہ زمین کے محیط سے دو چند ہے ذیابیطس کے مرض میں ہر قسم کی شیرینی نقصان کرتی ہے مگر شہد اس کے لئے بہترین دوا ہے شہد کے استعمال سے ہاضمہ، کان، دانت، آنکھ، خون، کھانسی وغیرہ کے صدہا امراض کو فائدہ ہوتا ہے اور یہ فطرت کی ایک بخشش ہے۔

نجابت حسین خاں سیاح عظیم آبادی نے سوانح لکھنؤ میں رومی دروازے کے حال میں لکھا ہے کہ اس نام کے دو دروازہ ہیں ایک قدیم تعمیر اور دوسرا نو تعمیر یہ دروازہ بہت بلند اور اس پر طلائی برجیاں ہیں۔ خاں صاحب کا دو دروازے لکھنا رومی دروازے کی جوابی عمارت پر دلیل ہے جو انگریزوں نے منہدم کی مگر نو تعمیر کہنا ان کی اطلاع کی غلطی ہے۔

باغ آصف الدولہ

رومی دروازے سے نکل کر داہنے ہاتھ کی طرف ایک اور پھاٹک ہے جو باغیچہ کہا جاتا ہے یہ درحقیقت مسجد آصفی کے ایک پہلو کا نشیبی حصہ ہے جس کو باکار بنانے کے لئے درخت لگائے ہیں امامباڑہ کی سطح سے مسجد کا طبقہ بلند ہے اور زمین مسجد سے باغ کی آراضی بہت پست ہے زمین باغ اور رومی دروازے سے گذرنے والی سڑک متوازی ہے۔

محمد علی شاہ کا محل :- ایک سیاح نے اپنی تفریح کے سلسلے میں رومی دروازہ کے سامنے شاہی محل کا پتہ دیا ہے جس دروازے سے بادشاہ داخل ہوتے تھے اس کا نام فرح بخش تجویز کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس پر سونے کے شیر بنے ہوئے تھے۔

مسجد آصفی

رومی دروازے سے گذر کر باغ آصف الدولہ کو داہنے ہاتھ پر چھوڑتے ہوئے نوبت خانہ اور امامباڑہ کا دروازہ ایک دوسرے کے سامنے نظر آتا ہے جو نزد دکھن ہے تین دروں میں سے امامباڑہ دیکھنے والے گذرتے ہیں اور اندر پہونچ کر عمارت کا صحن کو چک اور گول دائرہ بیضاوی کی شکل میں سبزہ اور گرد سڑک جس پر پہلی محرم کو حسین آباد کی ضریح کا جلوس سلسلہ وار مرتب کیا جاتا ہے اور چکر ختم ہوتے پر پھاٹک سے ضریح نکلتی ہے اس جلوس عزا کا فوٹو تم نے رومی دروازہ میں دیکھا۔ اسی گھاس پر دس بارہ سال سے ہر محرم کو آگ کا ماتم ہوتا ہے اور ہزارہا لوگوں کا ہجوم آدھی رات تک رہتا ہے اس گراؤنڈ اور صحن کو چک ختم ہوتے پر سنگی سیڑھیاں اور ۹ زینے کے بعد صحن امامباڑہ میں داخل ہونے کا ایک در پھاٹک ہے اس دروازے کے بغلی کمروں میں چپراسی اور پہرہ دار اور آثار قدیمہ اودھ کے عکس فروخت ہوتے ہیں داخلے کے قوانین بورڈ پر لکھے ہیں یہاں سے گذر کر لق و دق صحن اور پہلو میں مسجد کی عمارت ہے پہلے اس پر تبصرہ ضروری ہے۔

مسجد لمبان چوڑان کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر اور مسجد جامع احاطہ مرزا علی خاں کے بعد سب مسجدوں میں بڑی ہے۔ صحن مسجد تک پہونچنے میں پتھر کے خوشنما اور دیدہ زیب ۲۸ سیڑھیاں ہیں بیچ بیچ میں کچھ سیڑھیاں زیادہ چوڑی ہیں۔ جن پر

گذرنے والوں کو رفتار میں آسانی ہوتی ہے آخری زینے کے بعد کنواں ہے جو نواب آصف الدولہ کی موت کے بعد کسی دوسرے شخص نے بنایا ہے کنویں میں دونوں طرف جالدار سنگی ستون اور جگت کے روبرو زمین پر سفید پتھر میں چار پانچ شعر تلے اوپر بخط نستعلیق لکھے ہیں جو رنگ اڑ جانے سے صاف پڑھے نہیں جاتے پہلی سطر کی ناتمام صورت یہ ہے "پیش مسجد شاہ زمن چاہ ...... آخری سطر میں بمسجد بکند آغا خاں ...... ۱۲۴۹ سنہ بہت صاف پڑھا جاتا ہے اور یہ کتبہ حافظ نور اللہ مشہور کاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

کنویں کا بنوانے والا کوئی غیر متعلق شخص ہے کنویں سے قریب چوکور حوض ہے جس میں بیچ ایک دیوار اٹھا کر دو حصے کر دیئے ہیں اور پانی بھرنے پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حوض کافی گہرا ہے یہ وضو کرنے کے لئے تعمیر اول کا جز ہے صحن مسجد چبوترہ کی صورت میں تا زانو بلند ہے اور گرد آہنی جدید کٹہرا لگا دیا ہے انگنائی کتنی لانبی ہے اس کو فرش صحن کے سرتاسر پتھروں میں ایک پتھر کی پیمائش اور تمام پتھروں کو شمار کرنے سے تخمینہ ہوتا ہے کہ چبوترہ ۱۸۰ فٹ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

مسجد:۔ عمارت میں آگے پیچھے دو درجے ہیں اور روکار کو اس طرح تقسیم کیا ہے کہ درمیانی محراب سب سے بلند اور نمایاں اور پہلوؤں میں پانچ پانچ در کے داہنے اور بائیں دروازے چھت بلند اندر زیادہ سے زیادہ جگہ گنبد عالی شان منارے طویل کلسیاں طلائی بالائے محراب سنگ مرمر پر قطعہ تاریخ ہے جو پڑھا نہیں جا رہا ہے فرقہ شیعہ کی نماز عیدین اور جمعہ مدت دراز سے اسی مسجد میں ہو رہا ہے۔ مدرسہ سلطان المدارس کی عمارت تیار ہونے سے پہلے جامعہ سلطانیہ کے عربی طلبا صدر الافاضل اور سند الافاضل کی تعلیم مسجد کی انھیں صحنچیوں میں حاصل کرتے تھے اور جو طلبا اس وقت فارغ ہو کر یہاں سے نکلے وہ منتخب روزگار تھے۔

فرقہ امامیہ میں عیدگاہ اسی مسجد کے راستے میں رومی گیٹ کی سڑک پر لگی جاتی ہے اور کھلونے اور دوسری دلچسپی کی چیزیں بچے نماز عید کے بعد مول لیتے ہیں اور ہنسی خوشی اپنے گھر واپس ہوتے ہیں۔

مسجد حسین آباد ٹرسٹ کے زیر انتظام ہے اور مؤذن و پیش نماز باتنخواہ اپنے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں سب سے بڑا اجتماع اس مسجد میں جمعۃ الوداع کے دن ہوتا ہے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے اس مسجد پر انگریزی فوج کا قبضہ تھا اور نئی گورنمنٹ نے قلعہ بنا رکھا تھا آگے کے بیان سے واضح ہو گا کہ مجتہد العصر والزماں کے چشم و چراغ نے اپنے ذاتی اثر سے حکام سے احتجاج کر کے مسجد کو واگزار کیا اور جمعہ و عیدین بدستور پھر اسی مسجد میں ہونے لگا۔ مسجد اور امامباڑہ پر قبضہ ہونے کے بعد قبلہ و کعبہ کے نوکر چاکر امیر علی جو فینس کے ساتھ فانوس لے کر دوڑتے ہوئے چلتے تھے اور بھورے منصب علی اور نجف علی وغیرہ کتب خانہ در باغ ممتاز العلماء کے دربان وقتی طور پر نگرانی کرتے رہے اور نوکروں چاکروں کو امامباڑہ کے راستے میں "ساہی" سے کانٹے کا خطرہ محسوس ہوتا رہا عہد شاہی کی آبادی ختم ہونے پر جنگلی جانوروں نے راہ مخدوش کر دی تھی

نواب آصف الدولہ نے مسجد پر جو اشعار خود نظم کئے وہ ان کے کلیات میں موجود ہیں اور نصیر الدین ہاشمی نے نواب سالار جنگ بہادر کی خطی لائبریری واقع میوزیم حیدرآباد دکن سے نقل کئے ہیں ملاحظہ ہوں [1]

---

[1] قدیم ہنر ص۱۹

مسجد کا گرچہ سب سے بڑا احترام ہے — لیکن امامباڑہ بھی عالی مقام ہے
وہ آستانِ حق ہے یہ مکانِ امام ہے — بندے جو ہیں سو رات دن ان کا کام ہے
سجدہ اگر ادھر ہے تو اُدھر سلام ہے

دونوں مکان عرش سے رکھتے ہیں ہمسری — جنت میں قصرِ جنت اعلیٰ سے برتری
اوجِ بیان سے ان کی صفت ہی بہت بڑی — کہتے ہیں دیکھ حور و ملک آدم و پری
سجدہ اگر ادھر ہے تو اُدھر سلام ہے

بڑا امامباڑہ

پیغمبرِ اسلام کے وہ نواسہ جو ان کی امت کے ہاتھ سے کربلا میں بڑی بیدردی کے ساتھ تین دن کے بھوکے پیاسے مع اپنے عزیز اور دوستوں کے قتل ہو گئے ان کا نام ساری دنیا میں "حسین" مشہور ہے اور ایسا ہی کوئی بدنصیب ہوگا جو ان سے ہمدردی نہ رکھتا اور ان کے کردار کو پسند نہ کرتا ہو۔ دنیا کی بہتیری بستیوں میں خواہ وہ شہر ہوں یا دیہات ان کے نام پر کچھ عمارتیں بطور یادگار بنائی گئیں جن کی صورت حیثیت شکل کی کوئی حدبندی نہیں ہوئی اگر سر پر تعزیہ رکھ دیا گیا تو اس کے نیچے ایک چبوترہ اور نام اس کا چوک اگر کسی نے تعزیہ داری اپنے گھر میں شروع کی تو ایک چوکی کرسی کے درجے کا نام "شہ نشین" یا تعزیہ خانہ رکھا۔ اس سے زیادہ کسی دوستدارِ حسین کے سرمایہ میں گنجائش ہوئی تو اس نے خود عمارت مزار شریف کی نقل بنوا کر "کربلا" کہا دکھن میں اس حسینی یادگار کو عاشور خانہ اور اطراف ہند میں آستانہ اپنی ذہنیت اور تجویز سے عقیدتمند کہتے رہے عراق کے باشندوں نے حسینیہ کہا اور یہ بہت پرانی رسم تھی کہ غمزدہ اپنے تاثرات میں قوم سے علیحدہ ہو کر بچھڑے ہوئے محبوب کو یاد کرے خود حافظ شیرازی ؎

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور — بیت الحزن شود روزے گلستاں غم مخور

فردوسی نے کہا ہے ؎

یکے خانہ پرداخت بر دور دست — دراں خانہ در شہ تنہا نشست
دراں بیت الاحزاں نہادند نام — کہ بد خانہ حزن و اندوہ مدام
دراں خانہ یعقوب مدام حزیں — فشانندہ از دیدہ خوں بر زمیں

(لکھنؤ نے اس عمارت کا نام "امامباڑہ" رکھا) اور اس نام میں حسینیت کے آثار بدرجہ اتم اور جذبہ شہادت کی پوری تصویر ہے اس لئے لکھنؤ میں قدم قدم پر امامباڑے نظر آئیں گے۔ اور جس انسان کی عمارت پر نظر پڑے گی امامت کا اعلان ہوگا۔

(نواب نے اودھ میں کال پڑنے کے زمانے میں یہ امامباڑہ بنوایا اور جی کھول کر روپیہ لگایا اور یہ یادگار ان کی عجائبات دنیا میں شمار کی جانے لگی اس عمارت کی بنیاد کا خیال پہلے دریا کے اس پار تھا) ایک شخص تھے آصف حسین جو افضل الدولہ مظفر الملک افضل علی عرف چھوٹے بھیا خلعت منشی اسیر کی صحبت میں رہتے تھے اور ان کی آخر عمر پرنس نواب باقر مرزا مرسی حسین آباد مبارک کی

؎ نیا دور ۱۵ مئی ۱۹۶۰ء

سرکاریں گزری اور مقدمہ بلافصل کے ملازمین میں بھی میں نے ان کا نام دیکھا یہ شخص پچاس برس پہلے مجھے کھدرے میں امامباڑہ کے پہلے آثار دکھاتے تھے۔ دریا کے اُدھر عمارت بننے والی تھی گومتی کے بہاؤ نے روکا اور نیو جب زیرآب آگئی تو دانشمندوں نے دریا سے اتنی دور اس پہلو پر سنگ بنیاد رکھا کہ گومتی کا پہلا سیلاب ۱۸۹۶ء میں دوسری باڑھ ۱۹۱۵ء میں تیسری طغیانی ۱۹۲۳ء میں آئی پانی بڑے زور و شور سے بڑھا اور آخری بار اس کتاب کے دوران تالیف سیلاب آیا لیکن دریا امامباڑہ کی چوکھٹ کو چوم کر ہٹ گیا فقط ۱۹۲۳ء میں پہلے صحن میں ناؤ چلتی تھی (قحط سالی میں نواب نے شریفوں اور سادات کو مزدوری کا درس دیا۔ وہ رات بھر پردۂ شب میں الٹا سیدھا کام کرکے مزدوریاں لے جاتے اور صبح کو کاریگر نئے سرے سے بناتے)

گزشتہ صفحات میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ (اندھیری رات میں سادات جو نیو بھرتے تھے صبح کو وہ مصالحہ اٹھوا کر تحسین علی چوک لے آتے اور مسجد تحسین کی تیاری ہوتی) "یک کرشمہ دو کار" نواب کی اولوالعزمی کا یہ بھی ایک باقی ثبوت ہے۔

امامباڑہ کی بنیاد کا دوسرا واقعہ یہ بھی ہے کہ جب نواب آصف الدولہ تفریح کرتے ہوئے مانک پور پہونچ گئے اور سید حامد شاہ درویش سے ملاقات کی وہ فقیر نواز تھے ہی تارک الدنیا دیکھ کر ان کو ایک علاقہ دیدیا وہاں ایک امامباڑہ بھی آپ نامکمل دیکھ آئے تھے اس کے بنوانے کا وعدہ کرلیا اور لکھنؤ سے عمارتی سامان بھیجنا شروع کیا۔ اس عرصے میں شاہ صاحب کا وصال ہوگیا اور بیٹے نے تعمیر امامباڑہ پر کوئی توجہ نہ کی۔ نواب کو رنج ہوا اور اپنا سامان وہاں سے اٹھوالیا۔ اور لکھنؤ میں امامباڑہ کی اسکیم شروع کی حامد شاہ کا مقبرہ مانک پور میں اب تک موجود ہے اور نواب کا دیا ہوا علاقہ ان کی نسل راجہ اقبال حسین کے قبضے میں اس وقت بھی ہے اور خطاب راجہ انگریزوں کا دیا ہوا ان کی گزشتہ عزت کا ثبوت دے رہا ہے۔

(امامباڑہ کفایت اللہ ایرانی کاریگر کے مشورے اور نقشے کی تحت میں بنا بہتیرے نقشے نامنظور کردئے گئے اور خدا کو کفایت اللہ کا نام رکھنا منظور تھا)۔ کفایت اللہ کی قبر کا پتہ ہم گزشتہ صفحات میں دے چکے ہیں (نواب نشۂ ثروت میں طے کر چکے تھے کہ ایسا امامباڑہ بنے جیسا کبھی نہیں بنا۔ ویسا ہی ہوا اور ایسی عمارت بن کر تیار ہوئی جو کبھی نہیں بنی تھی)

(صحن امامباڑہ (جس میں کہا جاتا ہے کہ نہر بھی تھی) طے کرکے امامباڑہ کی سیڑھیاں ہیں اور ۱۸ خوبصورت پتھر کے زینوں کے بعد عظیم الشان چبوترہ ہے اور روکار پر صحنچیوں کے دروازے شامل کرنے پر سب تیرہ دروازے ہیں جن میں جال دار چوبی دروازے انگریزی حکومت کے وقت کے لگے ہیں اور پرندوں کی آمد و رفت سے روکا ہے۔ نجم الغنی نے دالان کی لمبائی ۶۰ گز اور چوڑائی ۲۰ گز لکھی ہے اور بعض اہل قلم نے یوں لکھا ہے کہ اس کی وسعت ۱۶۷ فٹ سے ۵۲ فٹ تک ہے۔ نجم الغنی نے امامباڑہ کی دس لاکھ میں تیاری پر تعجب کیا ہے اور اس رقم کو مبالغہ سمجھا ہے۔ حالانکہ مستند بیانات میں پچاس لاکھ سے ایک کروڑ تک تخمینہ صحیح سمجھا جاتا ہے یہ عمارت دس سال میں بن کر تیار ہوئی اور مسجد کو امامباڑہ سے اس خوبصورتی سے ملایا ہے کہ آج کل کے انجینئر بھی اس سے بہتر صورت اختیار نہیں کرسکتے اور میڈیکل کالج کی عمارت میں ایک کو دوسرے سے ملحق کرنے میں وہی طرز اختیار کیا ہے جو بڑے امامباڑے میں موجود ہے۔

تعمیر امامباڑہ کا ایک ادب افروز واقعہ:۔ آصف الدولہ بڑے نظرباز اور مردم شناس تھے صاحبان کمال کو پہلی فرصت میں پہچانتے تھے پھر بھی بشر تھے کثرت کار میں کبھی مسامحہ ہو جاتا تھا میر مہر علی جو دہلی کے ارباب ذوق میں نہ صرف ممتاز بلکہ ان کی ہجرت سے دہلی کو

(علمی نقصان پہونچا جب لکھنؤ آئے اور اپنا تعارف خود نہ کر سکے احتیاج دیکھ کر نواب نے کہا امامباڑہ بن رہا ہے آپ مزدوروں کو چھٹا بانٹا کیجیے عرض کیا مجھے روپے کے پیسے شمار کرنا نہیں آتے نواب نے کہا بہتر پھر آپ ایسا کیجیے کہ جب مزدور کام شروع کریں تو پردے کو پکار دیجیے۔ لکھنؤ میں آج تک یہ رواج ہے کہ جس کے گھر میں مدد لگے تو مزدور کوٹھے پر چڑھتے وقت بلند آواز سے پکاریں پردے والو پردہ کر لو کوٹھے پر مزدور چڑھتا ہے کبھی محلے کے شریر لڑکے ان کی نقل کرتے اور کہتے پردہ والو پردہ کر لو مزدور پر کوٹھا چڑھتا ہے سننے والے ہنس پڑتے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امامباڑہ، در مسجد کی تعمیر کے زمانے میں نواب کو بجز اس فکر کے کوئی خیال نہ تھا کہ کسی طرح عمارت تیار ہو پھر مزدوری بانٹنے سے انکار کر چکے تھے یہ کام اس سے بھی سخت تھا اگر نہیں کرتے تو شاید حاضر ہونے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ نواب کی تجویز کو منظور کیا۔ سیڑھی پر کبھی کاہے کو چڑھے تھے ڈرتے ڈرتے لیٹے چڑھے اور پکار کر کہا۔

عرش بریں کے رہنے والو؟ حوروں سے کہہ دو پردہ کر لو مہر چڑھتا ہے بام فلک پردہ والو پردہ کر لو

نواب آواز سنتے ہی پھڑک گئے۔ ناواقفیت پر معذرت کی۔ مناسب عہدے پر سرفراز کیا معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے میں اس وقت اس قدر گنجان آبادی تھی کہ مزدور بغیر پکارے بالائے بام نہ آسکتے تھے۔)

(عمارت میں تین درجے ہیں پہلا درجہ شہ نشین کا جس کی پشت پر وہی تیرہ دروازے نظر آتے ہیں دوسرا صحن کا دالان ہے جہاں درمیان میں نواب کی قبر ہے اس سے بڑا ہال ملک میں کہیں نہیں ہے اور نہ یہ درجہ کبھی شرکا مجلس سے بھر سکتا ہے نواب کی قبر کے پہلو میں ان کی بیگم شمس النساء کی آرامگاہ ہے دونوں پر کٹہرے لگے ہیں اور مزار پر کامدار چادریں رو برو رحل پر کھلے ہوئے قرآن شریف انگیٹھی اور کشتی کے ساتھ روشنی کا خصوصی سامان کنول، مردنگی، شمعدان، لیمپ رکھا ہے؟

خواجہ عبدالرؤف عشرت کا بیان ہے کہ جب امامباڑہ بن رہا تھا تو کسی بڑھیا کا مکان پڑتا تھا اس کو کافی لالچ دی گئی کہ اپنا گھر بیچ دے اور عمارت میں کجی پیدا نہ ہو وہ کسی قیمت پر اپنا قبضہ اٹھانا پسند نہ کرتی تھی آخر اس شرط پر اس نے مکان دیا کہ میرے نام کا بھی امامباڑہ میں ہمیشہ ایک تعزیہ رکھا جائے اس کی شرط منظور ہوئی اور آج تک امامباڑہ میں بڑھیا کا تعزیہ رکھا جاتا ہے اس امامباڑہ کی تعمیر میں جو قطعات تاریخ شعراء نے نظم کئے ان میں ایک ملاحظہ ہو ؎

وزیر ہند سلیمان جناب آصف جاہ ہزبر جنگ خدیو جہاں کلاہ کبار

رفیق گشت چو توفیق حق بنا کردش امامباڑہ گردوں اساس بہشت آثار

بگوشش اہل جہاں گفت عقل تاریخش رواق عرش جناب ائمہ اطہار

اس سے بہتر مادۂ تاریخ "آستان شہید ابن شہید" ہے ۱۲۰۳ (عمارت تیار ہونے پر لاکھوں کا سامان قیمتی خرید کر امامباڑہ میں سجایا گیا اور کانچ کا قیمتی سامان لاکھ روپیہ کا ڈاکٹر فلش کی معرفت جو منگایا گیا تھا اور جو نواب کی وفات کے بعد پہونچا روشنی میں خوشبودار تیل استعمال ہوتا تھا اور علم امامباڑہ میں اس کثرت سے تھے کہ شمار کرنے والے گنتے گنتے بھول جاتے تھے جھاڑ فانوس قمقمہ ہانڈیاں دیوارگیریاں قندیلیں بھی لاتعداد تھیں اور امامباڑہ کا سالانہ صرفہ ۲۵ لاکھ روپے تھا)

اس عمارت کے خصوصیات یہ ہیں — (۱) اتنی بڑی قالب دار چھت جو بغیر کھمبوں کے دیواروں پر رکھی گئی ہے۔ یورپ امریکہ مصر کہیں نہیں ہے اور دنیا کے آثار قدیمہ میں اس کی واحد حیثیت ہے (۲) امامباڑہ جتنا بلند ہے اگر اتنا نہ سہی تو اتنا زیادہ

سے زیادہ نیو میں چھپے ہوئے ہیں اور ہر دیوار و در اور ستون میں اترنے اور چڑھنے کے راستے ہیں جس کو بھول بھلیاں کہتے ہیں بالائی حصے کے پیچیدہ راستے تو وہ ہیں جہاں سیر گاہ عام ہے مگر اندرونی حصے میں کوئی گذر نہیں سکتا۔ بعض انگریزوں کے پلٹ کر نہ آنے سے مسدود کر دیا ہے انجنیری کی اس سے بہتر مثال دنیا کے پردے پر نہیں ہے اور نہ کسی نقشہ نویس نے آج تک اس عمارت کا اندرونی اور بیرونی نقشہ کھینچا بھول بھلیاں بنا کر معماروں کے نکلنے کے بعد پھر کوئی اندر نہیں گیا (۳) لکڑی یا لوہا کہیں استعمال نہیں ہوا ہے صرف پتھر اور مصالحے پر یہ عمارت دو سو برس ہونے والے ہیں اور آج تک قائم ہے (۴) اتنی بڑی چھت اور وسیع دالانوں کے کوٹھے کا پانی گرنے کے لئے صرف ایک پرنالہ ہے جو پچھم رخ پر ہے اس سے تمام پانی گر کر نیچے آجاتا ہے عوام کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ لکھنؤ کے بیشتر امام باڑہ نالے پر بنائے گئے ہیں بلکہ اس امام باڑہ کی چھتوں کا پانی اس قدر زائد ہوا کرتا تھا جو نالے کے بغیر نکل نہیں سکتا اور نالہ اس کے پرنالے کا نام ہے۔ لکھنؤ کے نامور شاعر رشید نے کاظم حسین محشر کو پرنالے کے معنی سمجھائے اور لفظ کو یہ کہہ کر غلط کہا کہ اس معنی پر نہیں لگتے ہیں لفظ پر نالہ ہے اور مادہ پانی ہے مراد یہ ہے کہ پانی نکلنے کی جگہ۔

(نواب کو اس امام باڑہ میں مجلسیں کرنے کی بڑی بے چینی تھی اور مشہور ہے کہ انہوں نے جلدی کی اور چھت میں سقف کے قائم رکھنے کے لئے جو بھراؤ دیا گیا تھا اس کو محرم نزدیک آنے سے قبل اندوقت کھلوا دیا مزدور اور کفایت اللہ سب خطرہ محسوس کر رہے تھے اور جان پر کھیل کے بھراؤ کو علیحدہ کر دیا گیا مجلسوں میں شرکت کے لئے شاہی مہمان اور بڑے طبقے کے لوگ ہاتھی پر بٹھا کے لائے جاتے تھے۔ آنے والوں میں خواجہ حاجی عبداللہ میر عبداللہ ایک ہاتھی پر ہوتے تھے اور دوسرے پر خواجہ صالح خواجہ رحمت اللہ خاں اور میر تقی میر لائے جاتے تھے یہ چونکہ نازک مزاج تھے بسا اوقات ان کے لئے چوپہلہ بھیجا جاتا تھا)

کچھ لوگوں نے غلط فہمی پھیلا دی تھی کہ امام باڑہ میں تبرا ہوتا ہے لہذا ہم شریک مجلس نہ ہوں گے نواب نے بڑی رواداری اور عدل پروری کے ساتھ صفائی پیش کی۔ اس سرگذشت کا ذکر مل جانے پر مجھے لذت محسوس ہو رہی ہے فارسی سے اردو ترجمہ ملاحظہ کیجئے ۔ کل حضور پرنور[۱] میں مجلس عزا امام ہے صبح کو مجھ سے فرمایا تھا کہ مرزا امامی سے کہہ دینا کہ وہ اپنے دونوں بھائیوں کو لیکر چار گھڑی دن چڑھے پہونچ جائیں۔ میں نے عرض کیا کہ خواجہ امامی ان مجلسوں میں بہت کم جاتے ہیں فرمایا اس کے کیا معنی ہیں کہ آدمی حضرت سید الشہداء کی مجلس تعزیت میں نہ آئے ہمارے گھر کا قاعدہ نہیں ہے کہ کوئی صحابہ کو گالیاں دے۔ میں نے عرض کیا خواجہ امامی منصب تو نہیں ہیں اور اگر کوئی برا کہے تو اس کے برا کہنے سے وہ برا نہ ہو جائے گا وہ امام انام سے تعلق رکھتے ہیں اور اگر کوئی برا کہے گا تو اس کی سزا خود بھگت لے گا کوئی لیاقت دار آدمی تو ایسا نہ کرے گا کہ مجمع عام میں تبرا کہے اور بھی اگر کوئی کمینہ کہہ گزرے تو اس کا شکوہ نہیں بہر صورت یہ سب حاضر ہوں گے اب آپ سن رکھیں کہ کل دونوں خاصہ کے ہاتھی اور سواریاں مرثیہ خوانوں اور کتاب خوانوں کے لئے رک جائیں گی اور کوئی سواری خالی نہ ہوگی جو آپ کے پاس روانہ کی جائے بہتر ہو گا کہ آپ اور خواجہ عبداللہ میانہ میں بیٹھ کر اور خواجہ اسمٰعیل خاں کو چچا صاحب کے گھوڑے پر سوار کر کے وقت مقررہ پر لے آئے بعد مجلس یہاں سے آپ تینوں بھائی واپس کئے جائیں گے بہر صورت شرکت ضروری ہے اس لئے[۲] کہ حضرت نے خود فرمایا ہے کہ نہ آنے میں تعصب ثابت ہو گا اور بہت ہی مکروہ بات ہے کہ وہ ناچ رنگ کی صحبت میں تو شریک ہوتے ہیں اور تعزیت فرزند رسولؐ سے کنارہ کش ہیں۔"

۱؎ رقعات مرزا قتیل ص۲۳ طبع قدیم ۲؎ ص۲۵ ایضاً

(ترجمہ رقعات مرزا قتیل ص ۵۲)

لکھنؤ میں صدر اوّل کے حدیث خوانوں میں حاجی ابو طالب اور شاہ حسین تھے ان کے شاگردوں میں صرف محمد علی بن حاجی محمد بیگ ابن آقا علی نقی کھماچی کا نام صفحہ قرطاس پر باقی ہے یہ قوم ترک سے تھے اور تبریز سے ۳ میل پر آردیہہ دیہات کے رہنے والے تھے آذربائیجان سے گجرات آئے اور پھر دہلی و لکھنؤ دیکھا ان کے بیٹے محمد حسین روضہ خواں تھے جن کی بہت ہی ضخیم کتاب اخبار ماتم ۱۲۸۵ھ میں طبع ہوئی ہے اس کتاب کے بڑے سائز پر ۲۲۴ صفحے ہیں اس وقت کی مجلس ختم ہونے پر — پہلے ظہور امام زماں کی مخصوص الفاظ میں دعا پھر بادشاہ اور شاہزادہ دوزہرکے بے باری باری دعا پھر علماء کے لئے دعا کی جاتی تھی اور آخر میں حاضرین مجلس کے لئے دعا پر مجمع پراگندہ ہوتا اور تبرک تقسیم ہوتا تھا اور لوگ اپنے اپنے گھر جاتے اس دعا میں بھی آدھا گھنٹہ گذر جاتا۔ اس وقت چونکہ علما صوبہ پر حکومت کر رہے تھے اس لئے بادشاہ کے نام کے ساتھ ان کا نام بھی زبانوں پر آتا تھا کتابوں کے دیباچے اور مثنویوں کے ابتدائی اوراق کی یہی نشانی تھی اور اس آئین کی ابتدا عہد آصفی سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ دعائیہ کلمات طولانی ہیں جو کھماچی روضہ خواں نے نذر قرطاس کئے ہیں دعا علماء کے تحت میں ان کی یہ لفظیں ایک یادگار رہیں۔

سیما پیشوایان زمرۂ مسلمین و پیش روان کافہ مومنین مجمع الفاس قدسیہ مرجع اقتباس ملکیہ جامع معقول و منقول حاوی فروع و اصول سید العلماء و سند الفقہا دام اللہ ظلہ و ابقاہ موئد فضلہ" حاضرین کے دعا کے بعد ذاکر کہتا ہے ؎

الٰہی چناں کن سر انجام کار تو خوشنود باشی و ما رستگاہ

بحق الحق و نبی المطلق رحم اللہ من قرا سورۃ الفاتحہ

(غدر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے مسجد اور امامباڑہ کو قلعہ بنایا ٹیلہ کی مسجد ڈسپنسری قرار دی ۳ مارچ ۱۸۵۹ء تک فوج باغیوں کی مدافعت میں مصروف رہی ۵ کو آبادی شہر کا اشتہار جاری کیا گیا اور تحفظ جان و مال رعایا کا اعلان ہوا۔ سڑکوں کی تیاری کے لئے انجینئر مقرر ہوئے کرنیل بیرو ڈپٹی کمشنر پر شدے پورتے بواسطہ عہدی اسپیشل کمشنری واسطے حاضری و قبولیت مالگذاروں کے علیحدہ دفتر کھولا اور کلاں امامباڑہ میں عدالت فوجداری قائم ہوئی۔ نئی حکومت کے قبضے پر مدت تک پبلک خاموش رہی یہاں تک کہ شمس العلما سید محمد ابراہیم مجتہد نے اعلیٰ افسران حکومت سے احتجاج کرکے ملٹری کو ہٹایا اور ۲۰ جون ۱۸۸۶ء کو فوج انگریزی ہٹی اور یہ مقامات واگذار ہوئے ٹیلہ کی مسجد مسلمانوں کو دے دی اور مسجد آصفی میں فرقہ شیعہ کی جماعت شروع ہوئی جو آج تک جاری ہے۔)

۱۵ شوال ۱۳۳۳ھ کو جب لکھنؤ میں مسلسل بارش سے طوفان بادوباراں آیا اور ساتھ ہی اس کے گومتی بڑھی مکانات گرے اس وقت امامباڑہ نے پبلک کو پناہ دی یہ ۱۹۱۵ء کا سیلاب تھا جس پر شعرا نے مستقل مثنویاں تیار کیں۔ افسوس ہے کہ حکیم سید محمد نواب صاحب مرحوم کی مثنوی عالم آب میرے سامنے نہیں ہے۔ ایک دوسرے شاعر ہاشم انصاری کے تاثرات ملاحظہ ہوں ؎

نوح کے طوفاں سے کچھ کم نہ تھا طغیان آب لکھنؤ سا بہہ گیا جس سے کہ شہر لاجواب

ابر طوفاں زا کا وہ اللہ رے جوش و خروش دامن دریا ہوئی تھی شہر کی سطح تراب

---

۱ صفحہ ۱۱۶، اخبار ماتم ملحقات ۲ احسن التواریخ ص۱ ۳ اس تاریخ کے مصنف کے پرداداکے والد ۴ مصنف کے دادا

بعض سڑکوں پر گذر ممکن نہ تھا کشتی بغیر — موجزن تھی ہر طرف یوں گومتی کی جوئے آب
مسجدوں اور تعزیہ خانوں میں دی ان کو پناہ — جب ہوئیں بے خانماں پردہ نشیں عفت مآب
کلک ہاشم نے لکھی تاریخ طوفاں خوب ہے — آب باراں سے مٹی اب لکھنؤ کی آب و تاب

اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں دریا بڑھا اور ۱۹۱۵ء کے نشان کو بھی مات کر دیا اور اس ہلاکت آفریں موقع پر بھی جن لوگوں کے گھر اجڑے وہ امام باڑہ میں بھر آئے اور مہینوں ٹھہرے رہے ان مواقع پر لوگ سمجھتے تھے کہ آصف الدولہ نے امام باڑہ اسی مقصد کے لئے بنوایا تھا کہ بے گھر پناہ لیں۔

کانگریس گورنمنٹ کی مخالفت میں محاذ حسینی کی تحریک نے اسی امام باڑہ سے فروغ حاصل کیا اور ہزارہا شیعہ جیل گئے۔ گولی چلنے پر بھی ایجی ٹیشن بند نہ ہوا اور سڑک کا نام تبرا نگر ہو گیا یہاں تک کہ مدح صحابہؓ کی تحریک ختم ہوئی۔ امام باڑہ قومی تحریکوں میں کام آتا رہا اور اس عمارت پر مشہور اہل قلم چکبست کے شعر ملاحظہ ہوں ؎

جگمگاتا ہے شعاعوں میں یہ ایوانِ بلند — جس کی صنعت کا ہے دنیا میں نرالا انداز
پارہ چوب کے احساں کی ضرورت نہ رہی — خاک اور خشت نے ملکر یہ دکھایا اعجاز۔
اس کی تعمیر کو آئے نہیں معمار فرنگ — ہے یہ تہذیب اودھ کے لئے سرمایۂ ناز
جس کے فیضان حکومت کا کرشمہ ہے یہ — اس کے سایہ میں ہے سویا ہوا وہ خلق نواز
اس کی ہمت کی بلندی ہے بلندی اس کی — اس کے اخلاق کی وسعت کا ہے اس میں انداز
جب زیارت کو محرم میں بشر آتے ہیں — چاندنی رات میں آتی ہے فلک سے آواز
بے ادب پا منہ اینجا کہ عجب درگاہیست — سجدہ گاہ ملک و روضۂ شاہنشاہیست

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد نواب محسن الدولہ ٹرسٹی حسین آباد نے امام باڑہ کی اس سامان کی فہرست جب انگریزوں کے سامنے پیش کی جو انگریز لوٹ کر لے گئے تھے اس سامان کی قیمت شاید ۳۶ لاکھ روپے قرار پائی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ امام باڑے کے در و دیوار قد آدم آئینوں سے ڈھکے ہوئے تھے سونے چاندی کی گھڑیاں اور جواہرات جڑا ہوا سونے کا آرائشی سامان کثرت سے لگا ہوا ہے چار پانچ سو بلوری جھاڑ چھتوں میں لٹکے ہوئے تھے اور دو ہزار فرشی جھاڑ زمین پر رکھے ہوئے تھے ان میں بے شمار کافوری شمعیں روشن ہوتی تھیں ان کی روشنی میں طلائی مرصع سامان آرائش کا عکس آئینوں میں پڑتا تھا تو ایک نور کا دریا لہریں لیتا ہوا نظر آتا تھا (قومی آواز ۲۳ نومبر ۱۹۵۹ء)

(امام باڑہ میں عشرہ محرم اور دیسوں کی تاریخوں میں وقف کی طرف سے شاندار مجلسیں ہوتی ہیں عمدہ تبرک تقسیم ہوتا ہے۔ سیکڑوں غربا، فقرا، محتاج مسافر اب بھی حصہ سے شکم سیر ہوتے ہیں امام باڑہ میں ذاکرین کے سلسلے میں مرثیہ خواں سوز خواں حدیث خواں تنخواہ پاتے ہیں اور نواب کی قبر پر روزانہ قرآن خوانی ہوتی ہے کتاب خواں اور نثر خواں اب باقی نہیں ہیں دور اول میں ہر صنف ذاکری کو اعلیٰ مشاہرہ ملتا تھا علاوہ شاہی مجلسوں کے پبلک کی طرف سے کسی قومی یا مذہبی تحریک کے موقع پر اگر ایسا مجمع ہوتا

۱؎ صبح وطن از چکبست لکھنوی ص ۹۵ انڈین پریس الہ آباد ۱۹۲۶ء چکبست کی رحلت ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو ہوئی۔

جس کی سمائی لکھنؤ کے کسی اماباڑہ میں نہ تھی اس موقع پر اماباڑہ آصفی اجتماع کے لئے منتخب ہوتا (مجتہد العصر والزماں سلطان العلماء رضواں مآب کی نماز جنازہ ۱۲۸۴ھ کو ممتاز العلماء کی اقتدا میں اسی اماباڑہ میں ہوئی) اگر میری یاد مساعدت کرتی ہے تو میری ہوشمندی سے پہلے اماباڑہ میں پہلی مجلس نواب آغا ابّو صاحب مرحوم کی طرف سے ہوئی جس میں مولوی عنایت علی ساماں کئی گھنٹہ پڑھے وہ بہار پور کے متوطن اور ۱۳۲۶ھ تک زندہ تھے دوسری تقریب ۱۹۰۶ء میں فرقہ وارانہ کشمکش دور ہونے پر برابر دو دن ہوئی۔ شیعوں کی طرف سے مولود اور اہلسنت کی طرف سے مجلس عزا ہوئی جس میں مولوی سبط حسن صاحب نے اپنے آغاز کمال میں فصاحت کے دریا بہائے اور مولوی محمد حسین محقق ہندی نے جن کی نادر الکلامی کا آخر دور تھا آیہ مجمع البحرین آب شور و شیریں کی یکجائی پر سحر آفریں تقریر کی تیسرا موقع مرزا محمد تقی شیرازی مجتہد اعلم فرقہ شیعہ کی فاتحہ خوانی کا اجتماع عظیم اور مولوی سبط حسن کا خطیب اعظم ہو کر منبر پر آنا چوتھی بار خان بہادر سید ابو محمد صاحب ریٹائرڈ ممبر پبلک سروس کمیشن یوپی نے مجلس کی اور چشم و چراغ میر انیس سید خورشید حسن عرف دولہا صاحب (مرثیہ خواں) المتخلص بہ عروج پڑھے۔ اس کے بعد تبرا ایجی ٹیشن کے اجتماع مسلسل اور متواتر ایسے نمایاں ہوئے جو گولی چلنے پر بھی درہم برہم نہ ہوئے۔ حافظ اکرام کا بیان اماباڑہ پر قیصر باغ کے حال میں آئے گا۔

اماباڑہ نواب حسن رضا خاں

سرفراز الدولہ نواب مرزا حسن رضا خاں کے باپ کا نام مرزا علی رضا اور دادا جان سپار خاں شاہجہاں بادشاہ کے معتمد خاص تھے اگرچہ بے پڑھے لکھے تھے مگر فارسی بول چال میں مہارت تھی دس ہزار آدمی ان کی سرکار سے فیض پاتے تھے اور پرورش ہوتی تھی شعر و سخن میں بھی بلند رتبہ تھے رضا تخلص تھا شعراء کے بڑے قدر دان تھے۔ مرزا فدا علی خنجر نے ایک قدیم بیاض سے ان کے چند شعر نقل کئے تھے ؎

ٹپک رہی ہے ہواؤں سے کچھ عجیب مستی چمن میں آج مقرر کوئی شرابی ہے
وہ کل کی طرح نہ آئیں گے آج بھی ہمدم کہ آپ ہی آپ مرے دل کو اضطرابی ہے
رضا کی لاش خبردار اے زمین لحد اسے فشار نہ ہو خاک بو ترابی ہے

قدرت نے ان کو قیامت کا دماغ دیا تھا اس زمانے کی خطرناک سازشیں جو آن واحد میں امیر کو فقیر کر دیتی تھیں ان کی سیاست کے سامنے تار تار ہو جاتی تھیں۔ آصف الدولہ بہت عزیز رکھتے تھے نواب وزیر یا نواب بھائی کہہ کر بات کرتے تھے۔

آپ نے دو اماباڑہ اور مسجدیں بنوائیں۔ ایک اماباڑے کا ذکر کتاب کے پہلے باب کمپنی باغ کے ذیل میں ہوا اور مرکزی اماباڑہ ان کا آصفی اماباڑہ کے نزدیک نقار خانہ کی سائٹ پر تھا جہاں گوئن گارڈن اس وقت ہے یہ اماباڑہ کالا اماباڑہ کہلاتا تھا۔ اور مسجد بھی حسن رضا خاں کی اسی جگہ تھی سنہ ۱۲۱۱ھ میں جب راجہ ٹکیت رائے نائب سرفراز الدولہ کے پیش کردہ حسابات راجہ جھاؤلال کی جانچ سے مشکوک ثابت ہوئے اور مرزا حسن رضا خاں کی بھی امور سلطنت سے غفلت ثابت ہوئی تو نواب کا ارادہ ہو گیا کہ ٹکیت رائے کو معزول کر دیں۔ ٹکیت رائے نے جب دیکھا کہ میری آبرو پر بن جائے گی تو مرزا صاحب کے پاس اپنا قصور معاف کرنے چلے گئے اور نماز سے فراغت کرکے اماباڑہ میں روبرو ضریح مبارک زیارت پڑھ رہے تھے ٹکیت رائے قدموں پر گر پڑے اور عرض کی اب میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ مرزا صاحب نے رحمدلی سے کام لیا اور ضریح کے سامنے ہاتھ اٹھا کر کہا کہ اگر میں منیب رہوں گا تو تم

بدستور میرے نائب رہو گے اطمینان رکھو تمہارے علاوہ کسی اور کی نیابت قبول نہ کروں گا حسن رضا خاں کی معزولی تکیت رائے کی محبت میں ہوئی اور سرفراز الدولہ عہدے سے ہٹ گئے نواب کی بارہ دری کا ذکر پار کی عمارتوں میں آئے گا۔

شیخ عابد علی :- شیخ عابد علی عہد شاہی کے نامور پیراک تھے اور حاجی احمد علی عرف ننھے مرزا کے شاگرد تھے حاجی صاحب ان کو ایسا صاحب کمال سمجھتے تھے کہ اپنے بیٹوں کی موجودگی میں شیخ ہی کو اپنا جانشین بنایا سچ ہے زمانہ شاہی کے پیراکوں کا شیخ عابد علی پر خاتمہ ہوا شیخ ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو مرگئے اور موضع بری براؤن کے باغ میں دفن کئے گئے سو برس کے قریب عمر پائی۔ شیخ عابد علی شیر کی پیرائی بے مثل پیرتے تھے اور ڈیوٹ کی پیرائی بھی نہایت اچھی پیرتے تھے۔ صفت یہ تھی کہ پانی سے بھرا ہوا کٹورہ پیروں کے تلووں پر رکھ دیا اور یہ پیرتے چلے جاتے ہیں مجال کیا کہ پانی کٹورے سے چھلک تو جائے اپنے جسم کو بے حد قائم رکھتے تھے۔ ایک خاص صفت عابد علی میں یہ تھی کہ کنارے پر بیٹھے ہیں اور کسی کو ڈوبتے دیکھا بس پلک جھپکتے اس کے پاس پہونچ گئے اور پھول کی طرح اٹھا لیا۔ عابد علی دریائی کشتی یعنی جلیا نک بھی خوب جانتے تھے۔ بہت سے پیچ درپیچ جانتے تھے کھڑی لگانے کے بھی استاد تھے برسات کے موسم میں جبکہ دریا خوب پر طغیانی پر ہوتا تھا یہ موضع کانکڑا باد سے دریا میں اترے اور اپنے سینے پر ایک لکیر بنالی اور کھڑی لگاتے چلے یہ معلوم ہوتا تھا کہ پانی پر کھڑے ہیں مطلق جسم کو حرکت نہ ہوتی تھی اور نہ وہ لکیر بھیگنے پاتی تھی غرض یہ کہ اسی طرح کلیا گھاٹ تک آتے تھے۔ (قدیم ہنر ص ۱۳۵)

زنانہ گھاٹ

اس گھاٹ کو خواجہ عشرت نے رومی دروازے کے داہنی طرف بنایا ہے اور میرا گمان ہے کہ اس گھاٹ کا نام بعد میں کلیا گھاٹ ہوا ہے اب کلیا گھاٹ بھی اصلی حالت پر نہیں رہا۔ ۴۰ سال پہلے کا ذکر ہے جو سڑک رومی دروازے سے داہنے ہاتھ پر جاتی ہے وہاں دریا کی طرف ایک تنگ و تاریک اونچی سڑک گئی تھی جس کے کنارے بورڈ پر لکھا تھا " یہ صرف ہندوؤں کا گھاٹ ہے یہاں پانچ برس کے بچے کو بھی جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس راستے میں دور و یہ پردہ کے لئے ببول کے درخت تھے۔ حکم مذکور کے باوجود مسلمان اس راستے سے گذرتے تھے مگر ساحل تک پہونچ کر بائیں سمت ان کا جانا ممنوع تھا زمانے کے گزرنے سے دریا کے کنارے کے زمین مٹی پڑ پڑ کے بلند ہوئی اور یہ خسٹ پاتھ برابر ہو کر درخت گرے انگریزوں کے وقت کا بورڈ پتھر ہونے کے باوجود عرخم کر کے پھٹ پڑا ہندو و مسلم عورتوں میں بے پردگی کا عام رواج ہوا وہ گول دروازہ، سوندھی ٹولہ، چوڑی والی گلی کے معزز طبقے کی ہندو عورتیں جو گوماجی اندھیرے منہ جاتی تھیں مرگئیں یا کرامت حسین گرلز اسکول کی تعلیم سے ذہنیت تبدیل ہوتے سے ان کے راستے اور اوقات بدلے اور ۴۰ سال پہلے کا کلیا گھاٹ کف دست میدان ہوا۔ خواجہ صاحب نے اپنے ایک مقالے میں زنانہ گھاٹ کا حال لکھتے ہوئے اس حقیقت کو بے نقاب کیا تھا کہ یہاں راجہ مہرا کا مکان تھا اور وہ عمارت مکان بے کیس کی صورت میں ان کے وقت تک موجود تھی مجھے اس علاقے میں راجہ مہرا کا مکان ہونے کی تصدیق میں کوئی عذر نہیں ہے۔ جب نواب آصف الدولہ نے اپنے مراہم خسروانہ سے راجہ مہرا سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ تم پیر خاں کی گڑھی سے اٹھ کر ہمارے قریب آجاؤ اور کسی آباد جگہ کو پسند کرو تو تمہارے لئے ایک عمارت بنوا دی جائے۔ راجہ مہرا نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ حضور میں یہ نہیں چاہتا کہ کسی شریف آدمی کا مکان خرید کر میرے لئے عمارت بنوائی جائے افتادہ زمین جہاں ہو اگر اس پر عمارت بنے گی تو میں خوشی سے رہوں گا اس واسطے ان کی عمارت

آبادی سے دور دریا کے کنارے بنوائی گئی اور بیکار زمین آباد ہوئی[1]۔

مخدوم شاہ مینا

لکھنؤ کی پہلی مسلم بستی یہی علاقہ ہے جس پر اس وقت شاہ مینا روڈ کا سنگی بورڈ لگا ہے یہاں سب سے پہلے کون آیا؟ اس سوال کے جواب میں شیخ عبدالحق دہلوی کی رائے سے کچھ مدد ملتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ تغلق کا زمانہ حکومت ۱۳۵۱ء سے ۱۳۸۸ء یعنی ۷۵۲ھ سے ۷۹۰ھ تک تھا اس عہد سے پہلے یہاں "حاج الحرمین" آئے حاج الحرمین نام نہیں ہے بلکہ جو شخص مکہ و مدینہ جا چکا ہو اس کو حاج حرمین کہتے ہیں چونکہ اس زمانے میں پیادہ حج ہوتا تھا اس لئے لقب کی بڑی اہمیت تھی اور شہر میں حاجی دو ایک نکلتے تھے نام آپ کا قوام الدین تھا اور رہنے والے یہ بھی دہلی کے تھے چھیاسٹھ مرتبہ حج کر چکے تھے اس لئے نام پر صفت غالب تھی سلسلۂ نسب میں عباسی تھے اور ان کے پیر و مرشد شیخ نصیر الدین اودھی (وفات ۷۵۷ھ) تھے جو مخدوم جہانیاں سید جلال الدین حسین بخاری (وفات ۷۸۵ھ) کے قائم مقام تھے سلسلۂ خلافت میں اوپر کی کڑیاں بھی کتابوں میں تلاش کرنے سے ملتی ہیں جن کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے آپ نے اسی میدان میں چھپر ڈالا اور ایک عرصے کے بعد پختہ خانقاہ بن گئی جس کے آثار ۱۹۰۳ء تک اس مقام پر دیکھے گئے ہیں جہاں میڈیکل کالج کے پروفیسروں کے بنگلے ہیں یہی پہلا نقطۂ آبادی ہے جو پھیل کر شہر ہوا۔

مخدوم قوام الدین کو شعر و سخن سے بھی ذوق تھا اور صوفیت میں ڈوبے ہوئے ان کے اشعار تذکروں میں ملتے ہیں ؎

میران سمند وحدت پامال کن دو کون
اے شہسوار قرب چہ زیبا است صفدری

"توحید کے گھوڑے کو دونوں کونین کو پامال کر دے اے قرب الٰہی کے شہسوار یہ کس قدر اعلیٰ دلیری ہے" شاید یہ ایک حدیث نبوی کی طرف اشارہ ہے جو بہتیرے علماء کی کتابوں[2] میں نقل کردہ ہے دوسرا شعر ان کا یہ ہے ؎

نادیدہ رخ دوست مزن لاف تجلی
زیں بر تو عیاں است تو ایں فکر نگہدار

بے نور رخش حسن و جمالش نتواں دید
بے تابش خورمی نتواں دید رخ یار

یہ لاف گزاف صحیح نہیں ہے کہ جمال یار کی تجلی ہو چکی ہے کیونکہ یہ چیز بالکل ظاہر ہے اور اس کو خوب یاد رکھو کہ خود اس کے نور رخ روشن کے بغیر اس کا حسن و جمال نہیں دیکھا جا سکتا کیونکہ سورج کی روشنی کے بغیر رخ یار نظر نہیں آ سکتا۔

فقیرانہ زندگی میں بال بچے انوکھی بات ہے مگر حالات زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلامی شرع میں ترمیم کرنے نہیں آئے تھے ان کی گھریلو زندگی کی کچھ کرامتیں گڑھ کا واقعہ بی بی موجود ہونے پر گواہ ہے غرض انھیں کا ایک بیٹا تھا جس کا نام شیخ مینا تھا اور صاحبان تحقیق کے نزدیک یہ نام نہ تھا بلکہ چھ سو برس پہلے میاں کی لفظ مینا کہی جاتی تھی مثلاً آج جس کو قطب میاں کہا جائے تو اس وقت "قطب مینا" کہتے تھے۔ بیٹا باپ کے اقتدار روحانی سے فائدہ اٹھا کر فوج میں ملازم ہوا باپ دنیاوی ترقی پر خوش نہ تھے فقیرانہ زندگی کے خلاف دنیا پرستی تھی۔ لوگوں نے بیٹے کو باپ کی ناراضگی کی خبر دی اور یہ جواب پایا کہ میں قبلہ گاہی کو گھر پہنچ کر راضی کر لوں گا کچھ ڈر نہیں۔

حاج الحرمین نے جب یہ ارادہ سنا تو فرمایا کہ میں نہیں چاہتا کہ وہ کمبخت یہاں آئے اس واقعہ کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ

---

[1] روح ادب ص۲۳ [2] قال الشیرازی چہارم علی شاہ دلدل سوار۔ اور حدیث یہ ہے جعل فی النبوۃ والرسالہ وجعل فی علی الغزو سبترا رنج المطالب ص۲۴۰

ہونہار لڑکا گھر سے دور قضاء الٰہی سے مرگیا اور فقیر نے جو کہا تھا وہی ہوا گھر آنے کی نوبت نہ آئی سنائی آئی مگر شیخ کے تیور پر بل نہ آیا لوگوں نے پرسا دیا وہ خاموش تھے اور بزم عزا کی مہر سکوت یوں توڑی گئی کہ شیخ نے اپنے ایک چیلے قطب الدین کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ان کے لڑکا ہونے والا ہے وہ مرنے والے کا نعم البدل ہوگا اسی سال شیخ قطب الدین کو خدا نے اولاد کا پھل دیا اور بیٹے کا نام محمد رکھا حاج الحرمین اس بچے کو "شیخ مینا" کہتے رہے ۔ یہ بھی روایت ہے کہ اس بچے نے آپ کی بیوی کا دودھ پیا مگر یہ صراحت نہیں ہے کہ کس بچے کا دودھ پیا اور وہ بچہ کیا ہوا اس کا کیا نام تھا یا کرامت سے دودھ اترا غرض نومولود کی پیدائش کے مژدہ کے ساتھ کہیں ذکر نہیں ہے کہ حاج الحرمین نے عملاً اس کو اپنا قائم مقام کیا بلکہ اس بات کی صراحت ہے کہ صحبت کے ایک مرید

شیخ سارنگ :- کی طرف توجہ مبذول رہتی تھی۔ اور انھیں کو گدی نشین کرنے کا ارادہ تھا جب حاجی صاحب کا آخر وقت ہوا تو شیخ سارنگ سامنے نہ تھے کہا افسوس سارنگ موجود نہیں ہے خرقہ کس کو دوں ۔ بہتر ہے کہ قبر میں لیتا جاؤں اور ایسا ہی کیا ۔ اور ایک کفنی بے آستین کی دے کر پاس والوں سے کہا کہ جب سارنگ آئیں تو ان کو دیدینا سارنگ نے اس خرقہ کو بوسیلہ حاصل کر کے زندگی بھر اپنے پاس رکھا حاج الحرمین کی قبر میڈیکل کالج کے کمپاؤنڈ اسپتال کے پوربی دروازے سے نزدیک بس اسٹینڈ کے آمنے سامنے ہے یہ حادثہ آٹھویں صدی ہجری کے شروع کا ہے شیخ سارنگ رہنے والے اس بستی کے تھے جو بھوپال تال کے قریب سادات کا وطن اب بھی ہے اور شیخ سارنگ کا مطلب یہ ہے کہ شیخ بھوپال مثلاً اور بعض اہل تحقیق کہتے ہیں کہ وہ سیاہ فام شخص تھے اور اس وقت کے لب ولہجے میں سیہ رنگ ان کی پہچان تھی جو کثرت استعمال میں سارنگ ہوگئی ۔ آپ کو حاج الحرمین کی خدمت میں مدتوں رہنے کی توفیق حاصل ہوئی تھی آخر عمر میں آپ اس گدی کو چھوڑ کر مجگواں چلے گئے اور وہیں ۱۰ر شوال ۸۵۵ھ کو آپ کا وصال ہوگیا یہ مقام اس وقت مضافات لکھنؤ میں تھا اور آج کل کے جغرافیہ سے دیوہ ضلع بارہ بنکی سے چار میل پر واقع ہے لکھنؤ سے دیوہ تک پختہ سڑک اور وہاں سے مجگواں تک کچی راہ ہے ان کی قبر پر عرس ہوتا ہے علمی جنتری ۱۹۳۶ء کانپور میں عبداللہ علم صوفی نے ان کا عرس ۱۲ر شوال اور سنہ وفات ۸۶۵ھ لکھا ہے جو ذمہ دارانہ بیان نہیں ہے اور کتابت کے اغلاط کو بھی اختلاف میں مدخلیت ہے۔

شیخ سارنگ کی بہن فیروز شاہ تغلق کو بیاہی تھیں اور یہ لاکھ کے گھر کو خاک سمجھ کر حاج الحرمین کی صحبت میں اپنے راحت و آرام منحصر سمجھتے تھے شیخ سارنگ کو راجو قتال سے بھی خرقہ ولایت حاصل تھا اور ان کو قتال اس وجہ سے کہتے تھے کہ ان کی نظر کے سامنے جو مشرک آیا کلمہ پڑھنے لگا۔ نام ان کا صدر الدین تھا شیخ سلسلہ کے لحاظ سے اور سید حسب کے لحاظ سے تھے۔ حالات میں تضاد نہیں ہے۔

شاہ مینا :- گزشتہ صفحات سے معلوم ہوا کہ حاج الحرمین کے بیٹے شاہ مینا جب پردیس میں مرگئے تو شیخ کی صحبت کے ایک مرید نے بایمائے پیر اپنے فرزند کا نام شاہ مینا رکھا اور اس طرح غریب الوطن فرزند کی یاد کو باقی رکھ گیا اور ان ہی حاج الحرمین کے وقت رحلت جانشین ہونے کی صلاحیت نہ تھی قائم مقامی شیخ سارنگ نے کی ۔ مگر وہ عزم وارادہ کہ باپ کا قائم مقام مرجانے سے بیٹا نہ ہو سکا تو لے پالک اسی کا قائم مقام ہو کر گدی پر کئے بلا فاصلہ تو پورا نہ ہوا شیخ سارنگ کے وسیلے سے اس طرح پورا ہوا کہ انہوں نے ۱۲۰

لہ آپ ۲۰ر جمادی الآخر ۷۸۶ھ کو ملتان میں ملک بقا کے راہی ہوئے ان کی لحد زیارت گاہ خلق ہے اور مادہ تاریخ اس طرح مصرعہ میں ہے ع ولی خدا از جہان رفتہ ہائے

برس کے سن میں قضا کی اس عرصے میں بڑھاپے کے سبب سے بھلا روزہ کہاں رکھ سکتے تھے دن کو بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور مہینہ رمضان شریف کا تھا شاہ مینا حاضر خدمت تھے اور روزہ تھا استاد کو کھانے پر دیکھ کر دل میں آیا کہ اس وقت ان کا اُلش کھانے کا اچھا موقع ہے ساٹھ روپے دم پے رکھ کر کفارہ دیدوں گا شیخ قیافے سے سمجھ گئے اور ترش ہو کر کہا کہ مجھے تو شرع نے اجازت دی ہے مگر تم کو روزہ توڑنا سخت گناہ ہے اگر یہی آرزو ہے تو رات کو میرے ساتھ کھانا کھا لینا شاہ مینا افطار کے وقت آئے اور اُلش کھایا ہم طعام ہونے سے ان کی خلافت ثابت ہے اور کہا جاتا ہے کہ شیخ سارنگ کے دو خلیفہ تھے۔ حسام الدین صوفی اور شاہ مینا۔

(نوٹ) فوائد سعدیہ میں شاہ منظر علی نے حالات شاہ مینا لکھے ہیں۔

میاں قطب الدین اور ان کی بی بی کی قبریں جلالمست کے اکھاڑے کی زمین پر ہیں اور مکان ان کا بتر بمنڈی (چوبباری محلہ) میں تھا یہ ساری سرگزشت اہلسنت وجماعت کے کئی تذکروں اور سوانح حیات سے ماخوذ ہے جس کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں ہے چونکہ بڑی شخصیتوں میں صحیح حالات کی تلاش بڑا اہم کام ہے خصوصاً اس کی زندگی پر بحث جس کے زمانے کو پانچ سو برس گذر چکے ہوں اس لئے ہیں اس سلسلے میں دو رائیں اور نذر قرطاس کرتا ہوں جس میں ایک رائے "قیل" کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی اگرچہ کتاب عربی میں بہر قلم ہوتی تو میں قیل کے بعد لکھتا کہ بعض کہتے ہیں کہ شاہ مینا کشمیر کے رہنے والے تھے ان کے باپ کا نام محمد مختار تھا چونکہ شعر و سخن سے شوق اور مینا تخلص تھا اس لئے وہ شاہ مینا مشہور ہو گئے کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ مخطوطات میں ملفوظات شاہ مینا ایک کتاب پائی جاتی ہے جو ان کی یادگار ہے آخری رائے یہ ہے کہ نام ان کا تاج الدین تھا اور وہ مشہدی کہے جاتے تھے چنانچہ حافظ عبدالسلام صاحب رئیس پنجابی ٹولہ لکھنؤ کی میزبانی میں ان کی نسل کے سید منتظم حسین اناؤ سے آتے تھے اور فخر کرتے تھے کہ ہم شاہ مینا کے خاندان سے ہیں اور ہماری اناؤ کی زمینداری جس پر کورٹ کے فیصلے اور حکام کے تجاویز گواہ ہیں۔ دعوے کی دلیل ہیں۔

شاہ مینا کا مزار کئی سو برس سے آباد اور میڈیکل کالج کی زمین پر ایک نو تعمیر بڑی مسجد کے قریب واقع ہے ۲۳ صفر ۸۸۴ھ ان کی تاریخ وصال ہے میرے نزدیک اس موقع پر آزاد[1] بلگرامی کی رائے ۸۷۰ھ صحیح ہے اور مزید سہولت کے لئے اس سلسلے کے اسماء اس شجرے سے واضح ہو سکتے ہیں جو سلسلہ بیعت ہے۔

نہ سلسلہ نسب ———— جلال الدین حسین بخاری
|
نصر اللہ اودھی
|
حاج الحرمین قوام الدین دہلوی
|
شیخ سارنگ
|
شاہ مینا

---

[1] سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان عربی

نوابی میں شاہ مینا روڈ زیادہ سے زیادہ آباد تھی بعض خبروں سے واضح ہوتا ہے کہ مینا بازار[1] بھی اسی ایریا میں تھا اور محلہ کوئن میری اسپتال تک پھیلا ہوا تھا۔ داروغہ عاشق علی کے بھائی قمرالدولہ خواجہ محمد سلیم عرف علی جان جو مصاحب خاص امجد علی شاہ تھے اور رات کو بادشاہ کے کمرے کے پاس سوتے تھے ان کا سکونتی مکان کوئن میری اسپتال کی جگہ تھا۔ مچھی بھون بارود سے اڑانے کے سلسلے میں یہ سب مکانات منہدم ہوئے۔

شاہ عبدالرحمن کا مزار شاہ مینا پر ٹھہرنا

باورچی ٹولہ کے حال میں ہم لکھ چکے ہیں کہ شاہ عبدالرحمن مزار شاہ مینا صاحب میں ٹھہرے اور عہد سعادت علی خاں تک ان کا قیام اسی جگہ تھا ثبوت میں مولوی انور علی صاحب کا بیان اور پون سو برس کی اردو ملاحظہ ہو:۔

زمانہ سعادت علی خاں میں حضرت بیچ[2] مسجد مخدوم شاہ مینا کے تشریف رکھتے تھے اس زمانے میں مولوی ذوالفقار علی رہنے والے قصبہ دیوہ کے مولانا کی تکفیر کے فتوے لے کر سعادت علی خاں سے استدعا کی کہ لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں ان کو شہر سے خارج کر دیجئے نواب نے اس عرض کو مولوی مدن خاں استاد اپنے کو ملاحظہ کرایا۔ مولوی صاحب نے کہا کہ ایسا عالم نادر زمانہ کا حسن اتفاق سے تمہارے شہر میں وارد ہوا ہے جو لوگ فتویٰ تکفیر کا دیتے ہیں انھیں کو حکم ہو کر ان کے پاس جا کر تحقیق ایمان کریں۔ وزیر نے کہا کہ اگر ایسے عالم ہیں تو ان کو ہمارے پاس لاؤ عرض کیا گیا کہ بادشاہ و وزیر سے کلام نہیں کرتے روز و شب اپنی مسجد میں مشغول رہتے ہیں[3]۔ تعارف کے بعد نواب کو ملاقات کا شوق ہوا اور پہلے شاہ عبدالرحمن سے " ادخیو اندا خت بر روی علی علیہ افتخار ہر نبی و ہر ولی " کے معانی پوچھے ممدوح نے عقیدت میں ڈوبی ہوئی ایسی تقریر کی کہ خود قصر حکومت سے ———:

<u>مکان بھوانی مہرا</u>:۔ دیکھنے کے حیلے سے جو مخدوم شاہ مینا کے قریب رہتا تھا آئے اور قریب پہونچ کر پوچھا کہ مولانا کہاں ہیں۔؟ ہرکارے نے جا کر دیکھا تو آپ غائب تھے نواب مایوس چلے گئے۔

شاہ صاحب موصوف نے اپنے مقام سے ایک ضرورت مند کو رقعہ لکھ کر دیا تھا کہ سبحان علی خاں کو دیدو وہ تمہاری مالی امداد کریں گے سبحان علی خاں نے رقعہ دیکھ کر جواب دیا کہ ہم عبدالرحمن بن ملجم قاتل جناب امیر کا کہا نہیں مانتے رقعہ کو پھینک دیا اور شاہ صاحب کی شان میں کچھ سخت کلمات بھی کہے۔ جانے والے نے واپس ہو کر ماجرا بیان کیا اور شاہ صاحب نے دوسرا رقعہ لکھا سبحان علی خاں تو ہم کو خوب سمجھا مگر تجھے بخوبی معلوم ہے کہ آقا جناب امیر نے اپنے قاتل کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا کہ جو شربت اس حالت میں آپ کے لئے آیا تھا وہ پلایا تجھ کو پیروی اپنے امام کی کرنا چاہیے سبحان علی خاں نے کہا واللہ مولانا نفس نہیں[4] رکھتے۔

راج گھاٹ

مسلمانوں کے نہانے دھونے کے لئے یہ پختہ گھاٹ بنایا گیا تھا اور بعض واقعہ نگار لکھتے ہیں کہ اس کی تعمیر میں راجہ مہرا کا ہاتھ تھا۔ اس گھاٹ کے آثار اور ایک برجی اب بھی باقی ہے لکھنؤ میں اموات علماء اور رؤسا معزز طبقے کو یہاں غسل دیا جاتا ہے۔ مقبرہ سید <u>مصطفےٰ</u> طباطبائی بھی اسی علاقے میں کہیں تھا۔ سید صاحب عہد صفدر جنگ میں حاکم نگینہ تھے برہان الملک کے ساتھ ادھر آئے اور بعد

---

[1] آ ریخ اودھ ۵ ۔ نجم الغنی ص۱۳۲ [2] اس جملے سے واضح ہو کہ مزار کی مسجد قدیم عمارت کا نقش ثانی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ پہلی مسجد کتنی بڑی اور کس شان کی تھی [3] ارشاد الرحمن اقتباس تنویر الرحمن مطبع گنگا پرشاد ورما امین آباد ۱۳۱۸ء ص۱۴ [4] ارشاد الرحمن ص۱

چندے پیام مرگ ملا دریائے گومتی کے ساحل سے قریب دفن ہوئے اور عالیشان مقبرہ تعمیر ہوا اس مقبرے کا بھی کوئی جز باقی نہیں ہے

سیدؔ احمد طبا طبائی :۔ خط نسخ لکھنے والوں میں بہت باکمال شخص تھے ہر شخص ان کی قدر و منزلت کرتا تھا قرآن شریف ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے لوگ آنکھوں سے لگاتے تھے مؤلف قدیم ہنر[1] لکھتے ہیں کہ مقبرہ ان کا راج گھاٹ میں دریائے گومتی پر تعمیر ہوا اور وہ مزار پاک مرجع ارباب حاجت تھا لوگ پھول اور چراغ لاکر روشن کرتے تھے۔ یہ بیان طلسم ہند سے ماخوذ ہے اور میری رائے یہ ہے کہ ہر دو مؤلفین میں نام لکھنے کا اختلاف ہے مقبرہ ایک تھا سید مصطفےٰ طبا طبائی اور احمد طبا طبائی کے دو مقبرے اس علاقے میں محتاج ثبوت ہیں۔

طبا طبائی وہ خاندان سادات ہے جس کے مورث اعلیٰ اسمٰعیل بن ابراہیم بن حسن بن علی تو تلے تھے درزی جب ان کی قبا سی کر لایا تو وہ بجائے قبا کے تبا کہتے رہے جو طبا طبائی نسل قرار پا گئی۔

راج گھاٹ کا بھی کلام شعرا میں ذکر ہے ریختی میں ہدایت لکھنوی کا ایک شعر میرے سامنے ہے جس کا پہلا مصرعہ نامناسب ہے۔ آخری مصرعہ ملاحظہ ہو ع سنتی ہوں راج گھاٹ پہ لاکھوں اتر گئے۔

احاطہ رمضان علی خاں

پکے پل سے لوہے والے پل تک نواب سعادت علی خاں کے سالے نواب رمضان علی خاں کی کوٹھیاں، باغات، اصطبل تھے اور احاطہ رمضان علی خاں مشہور تھا بعض اہل تحقیق کہتے ہیں کہ سنہرا برج بھی اسی طرف تھا اب یہاں ایک مسجد صرف باقی ہے اس مسجد کا نام اس وقت خانۂ خدا تھا آج اس کے دونوں طرف دو سڑکیں چلتی ہیں عوام اس کو جنوں کی مسجد کہتے ہیں مسجد زمین دوز اور اوسط درجے کی مسجدوں میں شمار ہے اس مسجد سے بعض اہل ہنود کو فوائد پہونچے اور ان کی مرادیں پوری ہوئیں اس لئے مسجد کی سفیدی اور انتظام کے چند وسیع الخیال غیر مسلم ذمہ دار ہیں نواب نے اس علاقے کی واپسی کے سلسلے میں جو ریذیڈنٹ کو تقرری سلطنت کی خبر دینے سے پہلے اس کے اخفاء حقیقت اور مکر پر بنارس میں وعدہ کر لیا تھا کہ اگر حکومت اودھ مل جائے تو علاقہ مذکور دیدوں گا ریذیڈنٹ نے اس وعدے کے بعد پروانہ تقرری دکھایا اور اس فریب پر مدتوں غور کرتے رہے آخر میں انگریزوں نے طے کیا تھا کہ اگر ...... روپیہ دیدیا جائے تو صوبہ واپس مل سکتا ہے اسی وقت سے روپیہ جمع کرنا شروع کیا جس میں درختوں کے پتوں کی قیمت تک تھی جس دن خزانچی نے اطلاع دی کہ رقم پوری ہو گئی اس دن دربار میں منہ سے نکل گیا کہ کل ریذیڈنٹ کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے دیکھوں گا یہ ارادہ وہاں تک پہونچا اور اس نے رمضان علی خاں کو زہر دینے پر تیار کیا۔ ان کے ہاتھ میں باورچی خانہ تھا یہ کسی طرح آمادہ نہ ہوتے تھے جب یہ اقرار لیا کہ کل تخت پر رمضان علی ہوں گے اس وقت رمضان علی خاں نے یخنی میں زہر دیدیا اور نواب کو احساس ہوا کہ مجھے ارادے سے پہلے ختم کر دیا۔ وہ ملک عدم کے راہی ہوئے مگر رمضان علی خاں وارث تخت نہ ہوئے۔

محلہ سوٹّا

یہ بستی اسی گرد و نواح میں تھی اور یہاں ناخدائے دنیائے ادب میر ببر علی انیس رہتے تھے اور ان کا قدیم مکان اور امامباڑہ تھا میر صاحب کے ہر دلعزیز ہونے کا یہ ایک نمونہ ہے کہ جس ایریا میں خاندان شاہی کے مکانات اور عمائد شہر کی کوٹھیاں ہوں وہیں کاشانہ

---

[1] قدیم ہنر صلا؟

انیس بنا یہ عمارت میر انیس کے ابتدائی قیامگاہ کی یادگار تھی جو غدر ۱۸۵۷ء میں مسمار ہوئی اور وہ حلقہ چوک میں نقل مکان پر مجبور ہوئے خاندان انیس کے باکمال فرد سید ظفر حسین عرف بابو صاحب فائق کے بیان سے واضح اور آشکار ہوتا ہے کہ راج گھاٹ سے آہنی پل ٹھنڈی سڑک ہوتے ہوئے جاؤ تو بائیں ہاتھ کی طرف ان کی املاک تھی اور بیلی گارد کے نزدیک جو پرانا تکیہ مسلمانوں کی قبروں کا تھا اس سے محلے کے حدود اربعہ میں ایک حد ملحق ہوتی تھی یہ وہ زمانہ ہے کہ میر انیس غزل گوئی میں بھی پیش پیش ہیں مگر افسوس ہے کہ جس دن سے وہ مرثیہ گوئی پر متوجہ ہوئے پھر غزل نہیں کہی اور کلام ابتدائی بھی محفوظ نہیں رکھا جن لوگوں کو ان کی غزلیں یاد تھیں وہ بھی صفحۂ ہستی سے رفتہ رفتہ اٹھ گئے جن یادداشتوں پر اس وقت کے ادبا نے ان کے اشعار لکھے تھے وہ بھی ناقدرشناس ہاتھوں میں باقی نہیں رہے مجھے برسہا برس کی تلاش میں انیس کی غزلوں کے چند شعر دستیاب ہوئے ملاحظہ ہو ؎

قطعہ۔ چن کے افشاں نظر اُس مہ نے کی جو تاروں پر — آسماں رشک سے لوٹا گیا انگاروں پر
رکھ کے منہ سو گیا ان آتشیں رخساروں پر — دل کو چین آیا تو نیند آگئی انگاروں پر

حکایت ہے کہ ایک شخص ملنے آئے ملاقات ہوئی اثنائے گفتگو میں کسی ضرورت سے زنان خانہ میں گئے انھوں نے سامنے جو بیاض رکھی تھی اٹھا کر دیکھی تو ان کا یہ شعر صفحۂ دل پر نقش ہو گیا ؎

یہی باعث ہے اُس بے رحم کے آنسو نکلنے کا — دھواں آنکھوں میں لگتا ہے کسی کے دل کے جلنے کا

ولہ

دل لیا ہے یار نے مٹھی میں بند ہے — کھلتا نہیں پسند ہے یا ناپسند ہے

ولہ

لکھ کر زمیں پر نام ہمارا مٹا دیا — ان کا ہے کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

میر مونس بھی غزل میں دوسرے شعرا سے کچھ کم نہ تھے ان کے مراثی میں کیا کچھ تغزل نہیں ہے بظاہر ایسا ہے کہ حضرت خلیق نے جس وقت سے بیٹوں کو غزل کہنے سے منع کیا پھر غزل نہیں کی۔ مونس کی غزلیں اس قدر زبان زد ہو چکی تھیں کہ ہر طرف رقص و سرود میں گائی جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ دونوں بھائی کسی راستے سے گزر رہے تھے ایک شعر سنائی دیا۔ لطف زبان نے بے قصد و ارادہ روکا اور کہا کہ یہ زبان تو ہمارے گھرانے کی ہے جب پورا شعر سنا تو مونس کا نتیجہ فکر یہ تھا ؎

مونس کی گلستاں میں ابھی آنکھ لگی ہے — اے بلبلو یہ شور مچانا نہیں اچھا

ایک مرتبہ کا اور واقعہ ہے کہ مونس سوار ہو رہے تھے پالکی میں بیٹھتے ہوئے ایک عورت نے آکر کہا کہ اس مصرعہ پر مصرعہ لگا دیجیے ؏ اتنی سی بلا میں مبتلا ہوں۔ فرمایا کہ دو ؏ خالِ رخ یار پہ فدا ہوں۔

اماباڑہ میر انیس :۔ میر انیس نے مرقومہ بالا محلہ میں ایک عالیشان اماباڑہ بھی بنوایا جو شیشہ آلات اور بہترین تبرکات اور ساز و سامان سے آراستہ تھا یہ اماباڑہ جب بن کر تیار ہوا تو جناب مفتی میر عباس نے تاریخ کہی۔ اس قطعہ تاریخ میں میر انیس کے کمالات اور مدح بھی موجود ہے ؎

یکتائے عصر ببر علی آنکہ مثل او — نے چشم چرخ دیدہ نہ گوش جہاں شنید

آن سید انیس لقب عندلیب ہند   کاوصاف او تواں ززمین وزماں شنید
آں ذاکرے کہ گفت سر منبر آشکار   کز رازکہ جبریل بگردوں نہاں شنید
آں نغمہ کہ سرنزد از طائران قدس   در حیرتم کہ بلبل گلشن چساں شنید
ہر جا کہ خواند مرثیہ از بام و در تمام   گر سنگ خارا بود از آں ہم فغاں شنید
غیر از زباں دل نتواند ثنا کند   آنکس کہ نظم پاک وے از گوش جاں شنید
نازک دلے کہ ہرچہ بگفتند گوش کرد   آیا نہ حال زار من ناتواں شنید
نشنیدیم حرف ہم از سرگذشت من   از دیگراں اگرچہ دو صد داستاں شنید
آوازہ بنا ر عزا خانہ کہ ساخت   از شش جہت فتادہ و ہفت آسماں شنید
معمار وقت صنعت ایں خانۂ عزا   شاید کہ بیتے از لب آں نکتہ داں شنید
ہر کس سر نیاز برایں آستاں گذاشت   آواز خیر مقدم کر دبیاں شنید
ہر ذرہ کہ بار دریں بارگاہ یافت   آیات نور خود زشہ خاوراں شنید
سید بایں مقام رسید بچشم دید   کیفیتیکہ از ارم واز جناں شنید
چوں بر ضریح پاک نگاہ من افتاد   آہے زدم کہ گوشش کز آسماں شنید
سال بنایش گشت رقم از سر الم   اینجا مدام[1] نالہ زہرا تواں شنید ۱۲۷۱ھ

اس تاریخ میں اس چشمک کی طرف بھی اشارہ ہے جو انیسؔ اور مفتی میر عباس صاحب کے درمیان میں ہو گئی ہے۔
انیسؔ اس عزاخانہ میں دو تین برس سے زیادہ مجلسیں نہیں کر سکتے تھے کہ دست بردِ زمانہ نے متوکل عباسی کا کام کیا اور یہ یادگار حسینی بھی کھد گئی۔
امامباڑہ انیسؔ سے قریب ہی میر خلیقؔ کی قبر ہے اور یہ ایک عام تکیہ تھا جہاں وہ سنہ ۱۲۶۰ھ میں سپرد خاک ہوئے نمونہ سخن ملاحظہ ہو

ایسا[2] زخمی ہوا مجرائی بدن دولہا کا   ہو گیا بیاہ کا خلعت بھی کفن دولہا کا
شرم سے جلنے کو تو منع نہ کر سکتی تھی   تھی مگر چھوڑتی دامن نہ دولہن دولہا کا
رن کو جاتے ہیں تو کچھ تو بول لو ہم سے ہائے   کبھی دولہن کو نہ بھولا یہ سخن دولہا کا
شام کو لے چلے سر ننگے دولہن کو ظالم   بن میں لاشہ رہا بے گور و کفن دولہا کا
کہتا تھا کون تھے یہ دولہا دولہن کہتے حرم   باپ دولہن کا حسین اور حسن دولہا کا
شاہ روتے ہوئے میدان سے آئے جو خلیقؔ   مر نابس دل پہ دولہن کے گیا غم دولہا کا

حکایت:۔ میر ضمیرؔ اور خلیقؔ ہمعصر تھے ضمیرؔ علمی کمالات میں ممتاز اور خلیقؔ جادۂ شریعت کے راہرو، لطف زبان کے بادشاہ درد کے خالق۔ ان کا کلام بہ نسبت سبحان اللہ واہ واہ کے نالۂ و آہ کا زیادہ طلب گار تھا مگر دونوں صاحبان کمال کبھی ایک جلسے میں جمع نہ ہوتے تھے

---

[1] تاریخ عباس ص ۳۴۷ حصۂ اول   [2] عبار الانوار جلد ۲

آزاد لکھتے ہیں۔

آخر ایک شوقین[1] نیک نیت نے روپیہ کے زور اور حکمت عملی کی مدد سے قانون کو توڑا وہ بھی فقط ایک دفعہ، صورت یہ کہ نواب شرف الدولہ مرحوم نے اپنے مکان پر مجلس قرار دے کر سب خاص و عام کو اطلاع دی اور مجلس سے ایک دن پہلے میر ضمیر مرحوم کے مکان پر گئے گفتگوئے معمولی کے بعد پانچ سو روپے کا توڑا سامنے رکھ دیا اور کہا کہ کل مجلس ہے مرثیہ آپ پڑھئے گا بعد اس کے میر خلیق کے یہاں گئے ان سے بھی وہی مضمون ادا کیا اور ایک کو دوسرے کے حال سے آگاہ نہ کیا لکھنؤ شہر روز میں ہزار در ہزار آدمی جمع ہوئے ایک بجے گے بعد میر ضمیر منبر پر تشریف لے گئے اور مرثیہ پڑھنا شروع کیا ان کا پڑھنا سبحان اللہ مرثیہ نظم اور اس پر نثر کے حاشئے کبھی رلاتے تھے اور کبھی تحسین و آفریں کے غل مچواتے تھے کہ میر خلیق بھی پہونچے اور حالت موجودہ کو دیکھکر حیران رہ گئے اور دل میں کہا کہ آج کی شرم بھی خدا کے ہاتھ ہے میر ضمیر نے جب انھیں دیکھا تو زیادہ پھیلے اور مرثیہ کو اتنا طول دیا کہ آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر تحسین بلکہ وقت میں گنجائش بھی نہ چھوڑی آفتاب یوں ہی سا جھلکتا رہ گیا وہ ابھی منبر سے اترے ہی تھے کہ چوبدار ان کے پاس آیا اور کہا کہ نواب صاحب فرماتے ہیں آپ بھی سامعین کو داخل حسنات فرمائیں۔ اس وقت ان کے طرفداروں کی بالکل صلاح نہ تھی مگر یہ بتوکل خدا اٹھ کھڑے ہوئے اور منبر پر جا کر بیٹھے چند ساعت توقف کیا آنکھیں بند خاموش بیٹھے رہے ان کی گوری رنگت جسم نحیف و ناتواں نہیں معلوم ہوتا تھا کہ بدن میں لہو کی بوند ہے یا نہیں جب انہوں نے رباعی پڑھی تو اہل مجلس کو پوری آواز بھی سنائی نہ دی چند مرثیہ کے بند بھی اسی حالت میں گذر گئے دفعتاً باکمال نے رنگ بدلا اور اس کے ساتھ ہی محفل نے بھی رنگ بدلا آہوں کا دھواں ابر کی طرح چھا گیا اور نالہ و زاری نے آنسو برسانے شروع کئے۔ پندرہ بیس بند پڑھے تھے کہ ایک کو دوسرے کا ہوش نہ رہا ۲۵ یا ۳۰ بند پڑھ کر اتر آئے۔ اہل مجلس اکثر ایسی حالت میں تھے کہ جب آنکھ اٹھا کر دیکھا تو منبر خالی تھا نہ معلوم ہوا کہ میر خلیق صاحب کس وقت منبر سے اتر آئے دونوں کے کمالات پر صاد ہوا اور طرفین کے طرفدار سرخرو گھروں کو پھرے۔

اس بیان کے بعد آزاد نے اپنی احتیاط نوازی سے واقعہ مذکور کو دوسرے پہلو سے ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دوسری روایت ہے کہ یہ موقع ایک غریب مگر پُرخلوص عزادار کے گھر کا ہے جس کی نیک نیتی سے ذاکرین و سامعین کو ہمدردی تھی۔ آزاد کی لفظیں یہ ہیں ——— "یہ معرکہ اس خوش اعتقاد کے مکان پر ہوا تھا اور میر ضمیر کے اشارے سے ہوا تھا"[2] آزاد اگر یہ لکھتے کہ میر خلیق کے اشارے سے ہوا تھا تو اگر ان کی بدنیتی سے قطع نظر کی جاتی تو ایک حد تک صحیح تھا کہ انہوں نے آخر میں خود پڑھ کر میر ضمیر کو پیش خواں بنایا یہ لکھنا کہ میر ضمیر کا ایما تھا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ ایک صاحب کمال اور سینئر دوسرے صاحب کمال کی پیش خوانی پر خود اپنے لیے سامان فراہم کرے اس کے علاوہ ایک نادار شخص کی مجلس میں ہرگز یہ صلاحیت نہ تھی کہ دو نگر کے پڑھنے والے جمع ہوں اور وہ دونوں کو یکے بعد دیگرے پڑھوا بھی سکے اگر بانی مجلس کی نیک نیتی سے ہمدرد بن کر انفرادی صورت میں ضمیر و خلیق دونوں آ گئے تھے تو ضمیر کے بعد خلیق ہرگز بالائے منبر نہ جاتے۔ یہ شرف الدولہ کا اختیار کردہ عنوان و ان کی دولت کا کرشمہ تھا جو کامیاب ہوئے۔

مولوی حیدر علی:۔ آزاد کی تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ مولوی حیدر علی مشہور عالم جنھوں نے مذہب امامیہ کے خلاف کتاب لکھی میر انیس کے

---

[1] آب حیات صفحہ ۳۸
[2] آب حیات

ہم محلہ تھے اور انیس نے ان سے ابتدائی کتابیں بھی پڑھی تھیں میاں مشیر کے کلام میں برابر مولوی حیدر علی کا ذکر ہے۔

حکایت: میر مونس چوک سے گذر رہے تھے وہ بڑے خوبصورت تھے اور پھبتی کہنے میں بھی ان کو کمال تھا بالاخانہ سے ایک زن بازاری نے ان کو دیکھ کر اپنی نوچی سے کہا ارے سامنے سے ہٹ جا مونس دیکھ لیں گے اور پھبتی کہیں گے تو دھوئے دھوئے نہ چھوٹے گی اس نے کمرے کا ایک دروازہ بند کر کے دوپٹہ کی آڑ سے مونس کو دیکھا حسن اتفاق سے ان کی نظر اٹھ گئی اور فوراً کہا ؎

عاشق کو دیکھتے ہو دوپٹہ کو تان کے
دیتے ہو ہم کو شربت دیدار چھان کے

سورج کنڈ کا تالاب

یہ جگہ لوہے کے پل سے قریب پھونچ کر دست راست کی طرف اب بھی ہے اور کسی زمانے میں لکھنؤ کی بہترین سیرگاہ تھی قدیم تاریخ میں[1] اس تالاب کا کئی مقام پر ذکر ہے خواجہ امامی کو مرزا قتیل نے جو خطوط لکھے ہیں پہلے خط میں ہے کہ سال بھر سے انشاء اللہ خاں کے چھوٹے داماد مجھے تنگ کر رہے ہیں کہ ایک دفعہ میں ان کو سورج کنڈ کے میلے میں اپنے ساتھ لے جاؤں میں نے وعدہ کر لیا ہے اب کی ضرور خدا نے چاہا تو تم کو لے جاؤں گا اس لیے تم سے کہا تھا کہ قبلہ گاہی سے کہہ دو کہ ایک اور ہاتھی کی ضرورت ہے ورنہ میرے لیے میانہ اور ایک ہاتھی کافی تھا۔ دوسرے رقعہ میں ہے کہ میں جس دن سے لکھنؤ آیا ہوں تمہارے سر کی قسم اور حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی قسم میلوں کی جگہ تک نہیں دیکھی۔ ایک بار عصر کے وقت دو گھڑی کے لئے آٹھوں کے میلے میں چلا گیا تھا اب ہنومان جی کے میلے اور سورج کنڈ کے میلے میں گومتی کے کنارے شرکت ہوگی۔ تیسرے رقعہ میں ہے کہ آج کل حضور پر نور کے دسترخوان پر پارچہ اور تیتر اور بیل ودج جناب عالیہ کی طرف سے آتا ہے۔ کباب اور قورمہ اور بریت کا پانی پیتے وقت یاد تازہ ہوتی ہے چلنے کے دن جو مسافت طے کرنا پڑتی ہے وہ تمہارے گھر سے سورج کنڈ کی آمد و رفت یا زیادہ سے زیادہ تمہارے گھر سے ہنومان تک کی ادائی جوائی کے برابر ہوگی۔ ریختی کا یہ شعر وہاں کے مجمع پر گواہ ہے ؎

گئی تھی دیکھنے باجی میں سورج کنڈ کا میلہ
بچی ہوں پستے پستے مردوں کا یہ ہوا ریلا

لوہے کا پُل

دریائے گومتی پر نواب آصف الدولہ بہادر کے تعمیر کردہ پل کے بعد بھی دوسرے پل کی ضرورت تھی اور شہر کے غربی حصہ کا دریا سے قریب ہو جانا مستلزم تھا شرقی حصہ شہر کو بھی ندی سے کٹا ہوا نہ رکھا جائے۔ غازی الدین حیدر بہادر نے اس ضرورت کا احساس کیا اور انگلستان سے نمونہ حاصل کر کے پل بنوانا چاہا سامان آنے سے پہلے جام عمر لبریز ہو گیا۔ ان کے بعد نصیر الدین حیدر بہادر نے سنگر صاحب کو ٹھیکہ دیدیا مگر پل تیار نہ ہوا اور امجد علی شاہ کے زمانہ حکومت میں پل تیار ہوا[2] منشی اسیر نے تاریخ کہی ؎

آں بادشاہ عادل کز حکم محکم او
گردید آہنی پل بر گومتی نمودار
فرمود حکم سلطاں تاریخ نظم کردم
چوں حکم شاہ محکم چوں عدل شاہ ہموار

دوسری تاریخ کسی عربی داں شاعر کی یہ ہے ؎ استوی العرش علی الماء بود سال بنا" ایک لاکھ اسی ہزار روپیہ اس کی بنوائی میں علاوہ قیمت پل صرف ہوئے عبدالحلیم شرر کی رائے ہے کہ موجودہ آہنی پل انگریزوں کا بنایا ہوا ہے جو پل عہد شاہی میں تھا وہ جا رہا ہے

---

[1] رقعات مرزا قتیل صفحہ ۵۰ و ۶۴ طبع قدیم عہد شاہی میں اصل الفاظ ہیں ترجمہ درج کیا گیا ہے [2] تاریخ اودھ حصہ ۳ صفحہ ۵

اطلاع اصل کتاب میں میر انیس کا شجرہ اور اولاد کی تفصیل بے طول ہو جانے سے مجبوراً ترک کیا۔ آہ من قلۃ الزاد۔ مصحح

کے کھمبوں پر لٹک رہا تھا جب زنگ آلود ہوگیا تو بدل کر موجودہ صورت میں آیا اس پل پر رات بھر پندرہویں شعبان کا جلسہ عام اور صبح ہوتے دریا میں عریضہ دینے والوں کا ہجوم رہتا ہے اور نماز صبح کا وقت آنے پر میدان میں لکھنؤ بھر کے بڑے آوازے اذان دیتے ہیں۔ صبح کے وقت خوش الحانی کا مظاہرہ عجب منظر ہوتا ہے کوئی پل کی ڈھال پر پہونچکر اللہ اکبر کہتا ہے کسی نے اس سے نیچے کچھ فاصلے پر تکبیر کہی کوئی سطح آب سے نزدیک کوئی فرش محفل پر۔ یہ ذکر ہے ۵۰ برس پہلے کا اور قصیدہ خوانی اور فضائل ختم ہونے کے بعد کا اب اس خالص یا دالہی کے مرکز کو پٹاخوں کی نامہذب رفتار سے مخرب اخلاق بنا دیا ہے آتشبازی پہلے بھی چھوٹتی تھی مگر مجمع سے دور دور صرف تفریح طبع کے لئے۔ مگر اب وہ حال ہے جو آنکھوں کے سامنے ہے یہ محفل اور صبح کی نماز جماعت۔ میر عابد علی مالک مطبع کی طرف سے عہد شاہی میں قائم ہوئی تھی اور اب تک ہوتی رہتی ہے۔

لوہے کے پل کے سامنے غدر ۱۸۵۷ء میں دست بدست جنگ بھی ہوئی اور پھانسیاں دی گئیں چنانچہ خاندان میر کاظم علی برچھیت کے میر قاسم علی کمیدان کو جو فوج شاہی میں ملازم تھے ممو خاں صاحب امیٹھی کے ساتھ اس جرم میں کہ انہوں نے برجیس قدر کو ان کی ماں کے ساتھ نیپال پہونچا یا تھا لوہے کے پل کے روبرو پھانسی دی گئی۔

<u>قبرستان :-</u> لوہے کے پل کی واپسی میں جو ریل کا پہلا پل پڑتا ہے پتلا اس پل کے جانے میں کم و بیش ۵۰ قدم جب رہ جائیں تو بائیں جانب وہ قبرستان ہے جس میں لکھنؤ کے چیدہ لوگ شرفا ادبار دفن ہیں میر خلیق مورث اعلیٰ خاندان انیس اور مولوی سید علی شاہ ابن صفدر شاہ کشمیری مجتہد اور میر تقی میر یہاں دفن ہیں پندرہ شعبان کو عریضہ دینے کی واپسی میں لوگوں نے سید محمد باقر صاحب مجتہد مرحوم کو اسی زمین پر پہونچکر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھتے دیکھا اور نشان دہی کی کہ میرے جد کی یہاں قبر ہے اور حضرت عارف نے اپنی اولاد کو بتایا کہ خلیق یہاں سپرد خاک ہوئے ہیں اس جگہ ــــــــــــ

<u>بھیم کا اکھاڑہ کبھی تھا</u> اور میر خلیق کی قبر کا پتہ دینے میں بعض علمی بیاضوں میں اس کا ذکر ہے باقر العلوم نے تصدیق کی ہے کہ یہاں معززین شہر سپرد خاک ہیں نشان قبر ممدوح کو بھی یاد نہ تھا صاحب تذکرہ یہ بہاتے ــــــــــــ

<u>قبر علامہ سید علی شاہ :-</u> کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ مقبرہ منتظم الدولہ میں دفن ہوئے منتظم الدولہ خطاب تھا حکیم مہدی کا اور مقبرہ حکیم مہدی اس وقت روزنامہ حقیقت اخبار کے دفتر کے سامنے ہے اس مقبرے میں ان کے مدفون ہونے کی تصدیق نہ واقعات سے ہوتی ہے نہ خاندان باقر العلوم سے تائید ہوتی ہے لہذا یہ بیان صاحب تذکرہ کا صحیح نہیں ہے مگر یہ کہ اس زمانے میں خاندان منتظم الدولہ کے اموات عام یہاں دفن ہوتے ہوں اور اس وقت اس کو مقبرہ منتظم الدولہ کہا جا رہا ہو اس کے بعد منتظم الدولہ نے اپنے لئے خصوصی عمارت مقبرہ اس صورت میں بنوائی جو کہ موجود ہے سید علی شاہ وہی بزرگ ہیں جن کے سفر لکھنؤ میں راہ میں شیر سد راہ ہوا سب اہل قافلہ درختوں پر چڑھ گئے ان کا سجادہ بچھا رہا اور مصروف نماز رہے وہ آپ کو دیکھ کر کچھ دیر ٹھہر کر خود چلا گیا ساتھیوں نے آپ کے کپڑے تقدس کی بدولت تبرک سمجھ کر پھاڑ کر تعویذ بنائے یہ سرگذشت تاریخ علماء میں موجود ہے۔

<u>قبر میر تقی میر :-</u> اسی قبرستان میں میر تقی میر کی بھی ابدی آرام گاہ ہے آپ ۱۱۹۷ھ میں لکھنؤ آئے اور ۲۸ برس شہر میں رہکر شمع حیات کو خاموش کر گئے ۱۲۲۵ھ میں یہ قبرستان محدود اور پھاٹک سے گذر کر داخلہ ہوتا تھا اب سب قبریں زیر فلک ہیں اور آسمان کے سایہ کے سوا کچھ نہیں ہے اور کوئی کہنے والا نہیں ہے ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے

کلیات میر زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے ان کے اشعار لکھنؤ یونیورسٹی بی اے کے نصاب ۱۹۵۲ء میں طبع ہوئے تھے جسٹس ڈاکٹر سر شاہ سلیمان جج فیڈرل کورٹ اور سو برس میں معلوم نہیں کہ کتنے مفکرین نے ان پر تبصرہ کیا ہے۔

اس علاقے میں ایک اوسط درجے کی مسجد بھی تھی جس کا اب نام و نشان نہیں ہے۔

دریا پار کی عمارتیں

اب ہم گومتی کے پار جن عمارتوں کا پتہ چلتا ہے ان کو تفصیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں اگرچہ مسجد شمس النساء بیگم پر پل پختہ کا ہمسایہ ہونے سے گزشتہ صفحہ میں ضمنی تبصرہ ہو چکا ہے مستقل حالات اس پار کے حسب ذیل ہیں ان عمارات کو ذکر کرکے پھر لوہے کے پل سے پلٹتے ہوئے شہر کی بقیہ عمارتوں پر سیر حاصل بحث کرکے کتاب ختم کی جائے گی۔

مکہ گنج

مکہ درزی خیرآباد ضلع سیتاپور کا رہنے والا تھا نصیر الدین حیدر بہادر کی شروع حکمرانی میں درزیوں میں نوکر ہوا نہایت چالاک اور دستکار اعلیٰ درجے کا تھا کام کی اچھائی سے درزیوں کا بیڑھ ہو گیا اور چلتا پرزہ ہونے سے مصاحبت کی آخری عزت بھی حاصل کی کٹرہ ابو تراب سے متصل مکہ کا باغ اسی کی یادگار ہے جس کا حال نذر قرطاس ہو چکا مکہ گنج اسی درزی نے بسایا اور مکہ کی سرا بھی آباد سرا تھی یہاں طوائفوں کے ڈیرے ایک وقت میں[۱] تھے عید کی چوتھی سنہ ۱۲۵۲ھ اس کے لیے نحس دن تھا کہ عتاب شاہی سے علیحدہ ہوا اور افسری[۲] کلو درزی کے بیٹے کو عطا ہوئی۔ ایک وقت وہ تھا کہ چاندی کے ہودے میں بیٹھ کر ہاتھی پر سواری نکلتی تھی اور جدھر جاتا تھا لوگ آنکھیں بچھاتے تھے۔ مکہ درزی کا امامباڑہ خیرآباد میں مشہور ماتم کدہ ہے۔ سلائی کی مشین ۱۸۴۶ء[۳] میں ایجاد ہوئی۔

کربلائے نواب ملکہ آفاق

پل پختہ سے دو فرلانگ پر بائیں ہاتھ کی طرف نشیب سے اس زیارت گاہ کا راستہ ہے جس کو کربلائے ملکہ آفاق اور عسکریین کہتے ہیں یہ عمارت مکہ گنج میں ہے اور بانی کربلا حضرت محمد علی شاہ بادشاہ کی بیگم تھیں گنبد اور میناروں کی سنہری کلسیاں دور سے جگمگاتی ہیں کربلا میں داخلہ ایک بلند اور عظیم الشان پھاٹک سے ہوتا ہے کچھ دور جاکر داہنی طرف دوسرا خوشنما پھاٹک ہے۔ جو شکستہ حالی سے نوحہ خواں ہے دروازے پر نیچے دھات کی ٹھپہ کی ہوئی تختیاں اور بالائی حصے پر گوشوں میں پنجہ دار علم بنے ہیں اس سے گذر کر ایک لانبا حوض ہے جس کے سامنے پہلے امامباڑہ کی عمارت نظر پڑتی ہے آگے جستہ کی چادروں کا سائبان اور دونوں جانب مچھیاں علام گردش چھت پر دو بڑے گنبد ہیں جن پر مختلف رنگ کے دیسی چوکے لگے ہوئے ہیں۔ امامباڑے کے اندر شہ نشین پر تعزیہ اور پشت پر علم کھڑے ہیں دیواروں کو قطعات اور مرقعوں سے آراستہ کیا ہے فرش زمین انتہائی خوبصورت اور دیسی ساخت کی زرد و سرخ اور مختلف وضع و قطع کی روغنی چمکدار چوکوں کے سازسے شطرنجی فرش تیار کیا گیا ہے جو چمک دمک میں جاپانی چینی کے چوکوں سے ٹکر کھاتا ہے امامباڑہ کے بائیں جانب دوسرے ملحقہ احاطے میں ایک دوسری عمارت ہے۔ جس میں حضرت امام حسن عسکری و امام علی نقی علیہما السلام کے مزارات واقع شہر سامرہ کی نقل ہے اس روضہ کی گلکاری اور رنگ آمیزی

---

۱ تاریخ اودھ ج ۴ ص ۳۳۲ مؤلفہ نجم الغنی رامپوری ۲ مذ ص ۳۳۴ ۳ وقائع نصیر خانی

بھی قابل غور ہے بالائی حصہ میں ایک قبہ اور دو گلدستے بنے ہیں جن کی سنہری کلسیاں نہایت ہی جاذب نظر ہیں اس روضے کے صحن میں اندر سی سرخ بجی ہوئی ایک مسجد ہے جس کے نیچے بہت دور تک تاریکی میں پیچ دار زینے چلے گئے ہیں جو ایک سرداب پر جا کر ختم ہوتے ہیں یہ اس مقام کی نقل ہے جہاں سے بارھویں امام غائب ہوئے تھے اس جگہ کا فرش بھی رنگین چوکوں سے بنایا گیا ہے

یہ کربلا عہد محمد علی شاہ میں زیر نگرانی حاجی مرزا محمد علی بنائی گئی تھی ملکہ آفاق نے ۳۰ اکتوبر ۱۸۵۱ء قریب شام اپنے سکونتی حسن باغ میں ہیضہ وبائی سے قضا کی اور دوسرے روز اپنے ہی امامباڑہ میں دفن ہوئیں قبر پر پتھر میں جو تاریخ نصب ہے اس کا آخری شعر یہ ہے ؎

کن دعا صائبؔ چنیں ہر دم برائے مغفرت حق بہ فردوس منزل ملکہ آفاق را ۱۲۶۷ھ

ملکہ آفاق راتیں عبادت خدا میں بسر کرتی تھیں اور اس قدر دور اندیش تھیں کہ سترہ لاکھ روپے سے اپنے ورثہ اور کربلا کے اخراجات پر وقف نامہ لکھا اور حسین آباد ٹرسٹ حسب قواعد مندرجہ انتظامات کرتا ہے عہد شاہی میں ملکہ گنج بہت آباد محلہ تھا۔ اور کربلا میں روز عاشور و شب عاشور زیارت کرنے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔

غدر ۱۸۵۷ء کے پر آشوب زمانے میں اس کربلا کو کئی مرتبہ کشت و خون کی آماجگاہ بنایا جا رہا تھا اور ہر طبقے کی نگاہ عمارت پر تھی ۱۹ ستمبر ۱۹۵۶ء کو اخبار میں ایک نوٹ نکلا جس سے واضح ہوا کہ پندرہ محرم ۱۲۷۳ھ کو سراغرسانوں نے شہرت دی کہ محسن الدولہ کی کربلا میں تین سو آدمی نوکر ہوئے ہیں اور ہتھیاروں سمیت اس گرد و نواح میں رہتے ہیں اور قادر علی شاہ فقیر کے پاس بھی جگمگھٹا رہتا ہے وہی بانی فساد ہے اور اس کی تحریک سے یہ فوج نوکر رکھی گئی ہے اور ملکہ جہاں کے فیلخانہ میں چار شخص کریم بخش اور شبراتی اس کام پر مقرر ہیں دو دو روپیہ چھٹا دے کر کہا جاتا ہے کہ وقت ضرورت تمھاری طلب ہوگی پہلے آنا جو کام پڑے عذر نہ کرنا جان تک لڑانا۔ ۷ دسمبر کو نواب محسن الدولہ سے واشنگٹن بہادر نے فوج بھرتی ہونے کی تصدیق چاہی اور شب عاشور کربلا میں خلاف قانون مجمع اور پھاٹک بند کرنے کی وجہ پوچھی کربلا کے دروازہ بند ہونے کی خبر بلوہ اور فتنہ انگیزی کی دلیل ہے۔" نواب نے جواب میں فرمایا کہ دروازہ بند کرنا میرے حکم سے نہ تھا وہاں کے کارپردازوں نے مجھ سے بیان کیا کہ ہم نے بھی شورش سن کر دروازوں کو بند کر لیا تھا کہ وہاں ہزاروں روپے کا اسباب عزاداری تھا۔ اس کے لٹ جانے کا خوف طاری تھا۔[1]

اس کربلا میں حدیث خواں قرآن خواں ملازم ہیں اور پندرہ شعبان کی صبح کو زائروں کی مخصوص میں چہل پہل رہتی ہے۔

حسن باغ

پکے پل کے شرقی حد میں واقع تھا اور یہاں ایک عالیشان بارہ دری تھی شاہ نصیر الدین حیدر کی شادی میں محفل سرور اس بارہ دری میں ہوئی تھی غدر میں جو عمارتیں انگریزوں نے قلعہ کا میدان صاف رکھنے کے لئے کھدوائیں حسن باغ اور بارہ دری منہدم کر دی گئی۔ بارہ دری کے کھنڈرات پر میڈیکل کالج کے طلبا کے لئے دار الاقامہ بنا ہے۔ اس عمارت کی بعض دیواروں کے نشان ۱۹۵۰ء تک اردگرد تھے شیخ غلام حیدر صغیر مصاحب خاص جان عالم نے اپنی مثنوی میں اس باغ کی بربادی پر افسوس کیا ہے[2] غدر کے واقعات بھی اس اقتباس سے واضح ہوں گے اور جو تباہ کاری ظالم انگریزوں کے ہاتھ سے ہوئی منظوم اس کی تصویر ہے ؎

---

[1] اخبار طلسم سے نیا دور بابتہ ماہ اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۰ تک اس مفہوم کو دیکھو   [2] نیا دور ۱۹۵۶ء بابتہ اگست صفحہ ۱۲

ہوا دوسرا روز نکلی کرن — فرنگی گئے سوئے مچھی بھون
لگائے رہے دیر تک دوربیں — بلندی سے دیکھا نشیب زمیں
میاں حصار ایک شہزادہ تھا — اٹھایا اسے دوسرا گھر دیا
کیا انگریزوں نے اس میں مقام — بنائے لب بام رندے تمام
جہاں تک تھی عمارت گرد حصار — وہ کھودی گئی گھر بے شمار
غرض کھود ڈالے ہزاروں مکان — حسن[۱] باغ کو کردیا بے نشان

شاہزادہ سے اشارہ اس نظم میں مرزا یحییٰ علی خاں خلف حضرت محمد علی شاہ کی طرف ہے۔

سیدوں کا احاطہ:۔ حسن باغ کے متصل سیدوں کا احاطہ تھا یہاں مختار الدولہ کی جو آصف الدولہ کی پیشی میں کام کرتے تھے چند اور کوٹھیاں تھیں اور جو آسمان سے باتیں کرتی تھیں مختار الدولہ کی املاک نے وہ ترقی کی کہ محلہ کا نام بدل گیا اور لوگ مختار الدولہ کا احاطہ کہنے لگے۔ مگر افسوس ہے کہ ان کی مٹی لکھنؤ کی نہ تھی اور پردیس میں قتل ہوئے اٹاوہ سے دو کوس پران کی قبر اور مقبرہ ہے۔

بارہ دری نواب حسن رضا خاں

کئی جگہ نواب کا نام اس تاریخ میں آچکا ہے اوراق پارینہ سے واضح ہوتا ہے کہ نواب کی ایک بارہ دری یار[۲]ؔ میں بھی تھی میر تقی میر کو نواب حسن رضا خاں سے خاص محبت و عقیدت تھی چنانچہ جب وہ موصوف کی نیابت کے زمانے میں آصف الدولہ کے طلبیدہ لکھنؤ پہونچے تو اس طرح مدح کی "ایں سردار است باتمکین متواضع منصف بحسن خلق صفت کرم صفت ہائے نمیدہ اش غالب الطاف عمیمش صاحب اکثرے را درمی آید" میر کا پہلا قیام نواب سالار جنگ کے مکان میں تھا۔

منشی گنج

یہ محلہ نواب مظفر علی خاں اسیر کا آباد کردہ دریا کے پار واقع ہے بانی محترم کا پورا نام یہ تھا تدبیر الدولہ مدبر الملک منشی سید مظفر علی خاں بہادر جنگ اسیر آپ عہد واجد علی شاہ بہادر کے مجسمہ کمال شاعر تھے نمونہ تو حیدان کی قادر الکلام زبان کا ملاحظہ ہو ؎

ہمہ آفاق نقش صنعت اوست — ہمہ عالم گواہ قدرت اوست
بشبنم قطرہ از ساغر اوست — ورق ہر برگ گل از دفتر اوست
بذکرش چرخ چوں شب زندہ داراں — ز انجم تا سحر تسبیح گرداں

غدر کے بعد آپ نواب کلب علی خاں صاحب کے یہاں رامپور تشریف لے گئے اور بڑی قدر افزائی ہوئی۔

منشی اسیر نے جو علمی اور ادبی خدمات انجام دئے ان میں معارج الفضائل، درۃ التاج، ریاض السلاطین، زر کامل عیار ترجمہ اردو شرح معیار الاشعار ۳۱۲ صفحات گلدستۂ امامت، چراغ اعجاز، شجرۃ العروض، رموز القوافی، کربلا نامہ[۳] منظوم وغیرہ وہ قلمی جہاد ہے جو کسی شاعر نے نہیں کیا کئی دیوان ان کے تھے اور بعض زیور طبع سے آراستہ ہوئے ایک دیوان دس روپے کو کسی نے خریدا اور وہ شاعر بن گئے۔ فارسی دیوان کا نام گلشن تعشق ہے جو ۲۲۲ صفحات پر طبع ہوا ہے ۱۲۹۹ھ میں یہ خورشید خاور مغرب قبر میں ڈوب

[۱] مثنوی آئین اختر [۲] تاریخ اودھ، نجم الغنی ج ۴ ص ۱۰۹ [۳] کربلا نامہ منظوم ص ۳۳۵ طبع نولکشور ۱۲۹۶ھ

گیا اور دو بیٹے چھوڑے جو بڑے بھیا اور چھوٹے بھیا کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے ہزاروں شاگرد تھے میر مہدی حسین ماہر صاحب دیوان، منشی ظہور حسن ظہور، تفضل حسین مانوس، واجد حسین واقف، بہادر حسین خاں انجم، مرزا حسین بیگ جرار فیض آبادی، نواب احمد حسن خاں عزت اچھے صاحب دیوان چمنستان جوش مشہور تلامذہ ہیں۔

منشی اسیر کے شاگردوں میں نواب یوسف حسین خاں ضلع جگت اور پھبتی میں کمال رکھتے تھے نیاز فتحپوری ناقل ہیں کہ ایک بار ان کے دوست شبیر حسین خاں رسا جو دراز قامت گورا رنگ کرنجہ دبلے پتلے انسان تھے ان سے ملنے آرہے تھے دور سے دیکھتے ہی اپنے احباب سے کہنے لگے دیکھئے سیپ لگا بگلا آرہا ہے۔

میر غضنفر علی حکیم :۔ باپ کے بعد اسیر کے جانشین ہوئے اور بڑے بھیا کے نتائج افکار میں ایک واسوخت اور ایک مثنوی جس کی تاریخ جاوید نے یہ کہی تھی ؎

مثنوی میں عجب ہیں شعر بلیغ — کیوں بدل جائے نہ اب صورتِ قلب
ہر رگ و پے میں اب لہو دوڑ گیا — بڑھ گئی پڑھ کے ایسی طاقتِ قلب
طبع کا سال یہ جاوید لکھو — مثنوی ہے سبب قوتِ قلب
۱۳۲۳ھ

حکیم تخلص ہونے کی رعایت سے شاعر نے فائدہ اٹھایا ہے بڑے بھیا حکیم نے ۱۳۲۱ھ میں قضا کی ان کا نام اور لقب یہ تھا رحمت الدولہ بہار الملک سید محمد غضنفر علی خاں صولت جنگ۔ حکیم نے بھی کثرت سے شاگرد چھوڑے جن میں صادق حسین صداقت مہدی حسین مہدی فارسی میں ان سے اصلاح لیتے تھے اور ۱۸۹۴ء تک زندہ تھے۔

چھوٹے بھیا :۔ آپ بڑے بھائی کے انتقال کے بعد مدتوں زندہ رہے اور مسند اسیر پر رونق رہی آپ کا نام افضل الدولہ مظفر الملک سید محمد افضل علی خاں بہادر شوکت جنگ المتخلص بہ افضل تھا پرانی تہذیب کے مجسم تھے اور لکھنؤ میں اس لفظ سے کسی کو اختلاف نہ تھا کہ جس کو مشرقی تہذیب سیکھنا ہو وہ ان کے گھرانے کو دیکھے اور ان کی صحبت میں بیٹھے۔ افضل کو میں نے عنفوان شباب میں دیکھا اور ان کی صحبت میں گھنٹوں رہا ان کی محلسرا پر کئی مرتبہ جانے کی نوبت آئی نظم کے ساتھ نثر میں بھی وہ بند نہ تھے۔ ایک کتاب کا دیباچہ ملاحظہ ہو۔ "تر و تازگی شاخ قلم بنگارش توصیف سلطانیست کہ تاجداران گلستان را بہ چتر سحاب سرافراز گردانیدہ و رنگینی گل بن رقم بارائش تعریف جہا بانیست کہ تخت نشینان بوستان را باقلیم تازگی دست تصرف رسانیدہ وحش وطیر از بیت المال عنایتش روزینہ دار و جن و انس از خوان مرحمتش وظیفہ خوار پرتو ذاتش در ظلمات عالم ہویدا و نور معاشش وزیر کی کشش جہت پیدا" نظم میں نمونے کے طور پر مطلع ملاحظہ ہو ؎

کوئی تھا راز اس میں خلق کے مشکلکشا ہوکر — علی نے ہاتھ جو بند ہوائے دستِ خدا ہوکر

ولہ ؎

راہ حق گر نہ دکھانے کی ضرورت ہوتی — یا علی آپ ہی پر ختم امامت ہوتی
ایک ہی نور سے دونوں کی ہوئی تھی خلقت — کیوں امامت میں نہ پھر شان نبوت ہوتی
لعل و گوہر کی زر و سیم کی خواہش کرتے — پاس اپنے نہ اگر دین کی دولت ہوتی

افضل نے ۱۳۴۶ھ م ۱۹۲۶ء اپنے ہی باپ دادا کے مکان میں اس دنیا کو ہمیشہ کے لئے لاولد چھوڑ دیا ان کی عزیز ترین عمر مقدمہ بازی اور زمینداری کے تحفظ میں گذری اور آخر تک روز راحت نصیب نہ ہوا افضل اور ان کی صحبت کے بعض رفیقوں کا گروپ (عکس) میرے پاس موجود ہے۔

عسکری بیگم :- آپ منشی اسیر کی بیٹی تھیں اور غدر کے بعد انگریزوں کی گولی کا نشانہ بناکر قتل ہوئیں ان کی وفات پر ایک خواب بھی تاریخ میں پایا جاتا ہے جو بخوف طول درج نہیں کیا۔

اسیر کے مشہور اشعار میں یہ ابیات زبان زد ہیں اور دنیا کے نقش برآب ہونے کی تصویر ہیں ؎

آہ از نیرنگیٔ عالم کہ ہست اندر جہاں — ہر کمالے را زوال و ہر بہارے را خزاں
بے ثباتے ہا بنا، قصر چار ارکان بود — بے نشانے ہا مآل صاحب فوج و نشاں
راہی انداز شہر ہستی ہر سحر سوئے عدم — ساکنان شہر ہستی کاروان در کارواں
ہر کہ وارد گشتہ است امروز فردا دیگر است — رہرو آنجا قطع منزل می کند شب درمیاں
حشمت اسکندر سلطانی دارا نماند — شد شکار پنجہ گرگ اجل نوشیرواں
مایہ داران متمول تاجداران شکوہ — جملہ زیر خاک گردیدند گنج آسمانیاں

محمد علی خاں آزاد :- منشی افضل کے نواسے اور خاندان کے آخری فرد تھے[لہ] ان کے بعد یہ گھرانا ختم ہوگیا تیس بتیس برس اس طرف تک ان کا دیوان خانہ اور زنانہ مکان باقی تھا۔ اس قدر مشہور تھے کہ اس دیہات نما بستی میں جب کسی شریف بھلے مانس نے قدم رکھا تو گیہوں اور غلہ کے آڑھتیے صورت دیکھتے ہی گھر کا پتہ بتاتے تھے اور راہگیر اناج سے بچتا ہوا سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا مکان تک پہونچتا تھا گنج اب تک آباد ہے اور صرف مسجد باقی ہے جو مکان کے زنانے حصے کی طرف تھی اور امیٹھی کے راستے میں ایک کربلا ہے جو میں نے نہیں دیکھی شہرت ہے کہ یہ منشی اسیر کی بنوائی ہوئی ہے وہ امیٹھی کے رہنے والے تھے۔

حسن گنج

پار کا محلہ جس کو حسن رضا خاں نے اپنے نام پر آباد کیا اس محلے میں ——

بادشاہ باغ :- وہ مشہور باغیچہ ہے جس کی کمرکیں ایک زمانے میں پکار پکار کر بکتی تھیں یہاں کی منظر کشی شیخ تصدق حسین ایڈوکیٹ کے قلم سے ملاحظہ ہو۔

تاجدار اودھ نصیر الدین حیدر نے اپنے زمانہ شہریاری میں گومتی کے کنارے پر محلہ حسن گنج میں یہ باغ باہتمام راجہ بختاور سنگھ ۳۵ لاکھ روپے میں تیار کرایا باغ کے وسط میں بارہ دری تھی جس میں سنگ مرمر کے خوشنما ستون تھے اس عمارت میں امراء سلطنت مرغوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھتے تھے اور دیگر تقریبات کے موقع پر شرکت کے لئے آتے تھے فینی پارکس FANNY PARKES ایک معزز فرانسیسی خاتون نے ۱۸۳۱ء میں اس باغ کی سیر کی تھی وہ اس پُر بہار کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں ★

اس باغ میں تین قطعہ عمارتیں اور دو پھاٹک ہیں پہلی عمارت نہایت خوشنما اور دلکش ہے اس کی ہر شے نادر اور عجوبہ

لہ ۱۹۴۶ء سے پہلے آپ نے دنیا چھوڑی۔

روز گار ہے کمروں کی چھتیں قالب دار اور فرش مختلف رنگ کے چوکوں سے شطرنجی کے مثل بنائے گئے ہیں دوسری عمارت باغ کے بیچ میں سنگ مرمر کے دلفریب ستون پر قائم ہے اس کی آرائش اور زیبائش سرخ رنگ کے پردوں سے کی گئی ہے جس میں سنہری جھالر ہے جو زنانخانہ کا کام دیتی ہے اس میں سنگ مرمر کی ایسی سفید اور چمکدار استر کاری کی گئی ہے اور جابجا گلکاری کرکے ابرک اور سفیدہ سے پوتا گیا ہے باغ میں ایک دخانی انجن بھی ہے جو حوض میں پانی پہونچاتا ہے باغ کے زنانخانے میں جو چاروں طرف پردے کی اونچی اونچی دیواروں سے محصور تھا بادشاہ کی محبوب بی بی قدسیہ بیگم رونق افروز تھیں ان کے زمانہ قیام میں باغ کی صفائی اور ستھرے پن کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف دربار اودھ رقمطراز ہیں۔ باغ میں جابجا نقرئی لالٹینیں نصب تھیں جن کے ستونوں پر رنگ کیا ہوا تھا پانچ سو نوجوان اور حسین مالنیں باغ میں کام کرتی تھیں ان مالنوں کو ہفتہ میں ایک رنگ کے دو جوڑے ملا کرتے تھے اور باغ میں۔ جو مالن پرانا جوڑا پہن کر آتی تھی تو چشم نمائی کے سوا اس پر کچھ جرمانہ بھی ہوتا قدسیہ بیگم انتہا کی مخیر اور سیر چشم تھیں بیلچہ اور کھرپیوں کے دستے نقرئی بنوا دیئے تھے جو مالن ہیڈ تھی اس کے کھرپوں میں علاوہ امتیاز کے کھرپے اور بیلچے کا دستہ جڑاؤ تھا۔ باغ کی صفائی آئینہ کو مات کرتی تھی مجال کیا کہ جو کوئی پتہ کسی وقت درخت سے نیچے پڑا ہوا مل جائے۔ ۱۲؍اگست ۱۸۳۴ء کو قدسیہ بیگم نے بادشاہ سے رنجش کے باعث زہر کھا کر اپنی کشتی حیات بحر فنا میں غرق کردی بادشاہ نے اس سبب سے باغ کی سکونت ترک کردی ان کا ترک قیام باغ کی بے رونقی کا باعث ہوا۔

غدر کے بعد مہاراجہ رندھیر سنگھ والی کپورتھلہ نے باغ کو ۳۵ ہزار میں خرید کر اپنے طور پر درست کیا اور مہاراجہ پٹیالہ ہر سال مع خدم وحشم گھوڑ دوڑ میں شرکت کے لئے لکھنؤ آتے تو اسی باغ میں ٹھہرتے ۱۹۰۵ء میں مہاراجہ کپورتھلہ نے باغ کی ۹۰ ایکڑ زمین بطور پٹہ استمراری صرف تین روپے سال کرایہ پر کیننگ کالج کے ارباب بست وکشاد کے حوالے کردی SIR JOHN PRESCOTT HEWETT سرجان پرسکاٹ ہیوٹ حاکم اعلیٰ صوبہ متحدہ نے ۲ مارچ ۱۹۰۲ء کو اس کا سنگ بنیاد رکھا اور ۲۷ فروری ۱۹۱۱ء کو رسم افتتاح عمل میں آئی جو ۱۹۲۲ء میں یونیورسٹی سے تبدیل ہوئی اور کیننگ کالج کا جو رشتہ الہ آباد یونیورسٹی سے قائم تھا توڑ دیا گیا۔ کئی شاندار عمارتیں تعلیم گاہ کے لئے تعمیر ہوئیں۔ قدیم شاہی عمارتوں میں صرف لال بارہ دری کا کچھ حصہ محل اور شمال مشرق جانب کے پھاٹک اس کی عظمت اور شان کی یاد دلانے کو باقی رہ گیا ہے۔[1]

کیننگ کالج میں تعلقہ داران اودھ کا چندہ اور تعاون تھا اور کالج کی تحریک انجمن تعلقہ داران اودھ کی طرف سے ہوئی تھی اور انجمن نے لارڈ کیننگ کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے طے کیا تھا کہ ایک روپیہ فی صدی مالگزاری پر جو وقتاً فوقتاً مشخص ہو۔ تعلقہ داروں کے چندے سے لیا جائے ۸ آنہ مصارف انجمن کے لئے اور ۸ آنہ کالج کے لئے رجسٹری شدہ قرارداد سے کام شروع ہوا اور تعلقہ بھنوا مئو کی طرف سے راجہ تجمل حسین نے وقف نامہ کی تکمیل کی اور کالج کی تعمیر ختم ہونے پر اس کے درمیانی ہال میں منجملہ دیگر تعلقہ داران کالج تجمل حسین خاں کا نام بھی کندہ ہے۔[2]

کیننگ کالج میں ۱۸۶۳ء میں درجہ اول کے عربی شیعہ مدرس مولوی سید علی نقی صاحب اور حنفی عالم درس وتدریس سنی طلبا کے لئے مولوی محمد فضل اللہ فرنگی محلی تھے۔

---

[1] نیا دور لکھنؤ بابت مئی ۱۹۵۵ء　[2] آثار یادگار ص ۱۴۱

ڈالی گنج :۔ منشی گنج کو ڈالی گنج بھی کہتے ہیں اور نام رکھنے کا سبب یہ ہے کہ یہاں ہندوؤں کی آبادی ہے جو بندروں کو کھانا کھلانا اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں اور عورتیں بندر کو ڈالی والا کہتی ہیں میرے ہمعصر محشرؔ جو تھے ان سے بہت پہلے دور نوبؔ کے محشرؔ کہتے ہیں ؎

ذرا دیکھا ؟ گلوری کیا اچک کرلے گیا　　اچکّے کا ہے دادا یہ چچا ہے ڈالیؔ والے کا

لفظ نے وہ شہرت حاصل کی کہ اسٹیشن کا نام ڈالی گنج ہوا۔

مسجد عظیم اللہ :۔ یہ ایک مرد غریب تھے ڈالی گنج میں رہتے تھے بڑے خلوص سے مسجد بنوائی جس کا تاریخ میں ذکر ہے قومی خدمتوں میں ان کی زندگی بسر ہوئی اور دنیا سے اٹھ گئے اور محلہ کھدرا عقب چوکی پولیس شیعہ قبرستان میں دفن ہوئے۔

ارادت نگر

کربلا شاہ نصیر الدین حیدر

سٹی اسٹیشن ڈیوڑھی آغا میر سے ریل پر جانب شمال بارہ بنکی یا سیتاپور جاؤ تو اگلے اسٹیشن کا نام ہے ڈالی گنج اس اسٹیشن کی پشت پر ایک بغیر پلاسٹر کی عالیشان عمارت نظر آئے گی جس پر دو بڑے گول سر کے گنبد اور دو نامکمل مینار ہوں گے۔ یہی نصیر الدین حیدر کی کربلا ہے جس کا نام انہوں نے تشبیہ کربلا رکھا تھا پھاٹک کا کہیں پتہ نہیں روضہ کے چاروں طرف غلام گردش ہے دیوار حصار کہیں کہیں باقی ہے روضہ کے بیچ میں دو درجے ہیں پہلے درجے میں ایک خوشنما چوبی ضریح رکھی ہے دوسرے میں بادشاہ کی قبر ہے جس پر سنگ مرمر لگا ہے اور چوبی حظیرہ ہے چھتیں سب کربلاؤں سے زیادہ اونچی ہیں اندرونی حصہ میں کہیں کہیں تو استرکاری ہو چکی تھی جو خراب خستہ حالت میں اب تک موجود ہے مگر بیرونی حصہ بالکل عریاں ہے اس پر استرکاری کہیں نام کو نہیں ہے روضہ کے صدر دروازہ کے بائیں جانب اس نشیب کی نقل ہے جہاں شمر ملعون نے سر مظلوم کربلا جسم سے جدا کیا کربلا کی چار دیواری کے باہر افتادہ زمین پر تعزیے دفن ہوتے ہیں کربلا بن رہی تھی کہ ۲۰ر اکتوبر ۲۳۶ھ کو بادشاہ زہر دئے جانے سے رخصت ہو گئے دوسرے روز اپنی ہی بنائی ہوئی کربلا میں آغوش لحد میں سوئے۔ کربلا کے لئے کوئی وقف بھی نہ کر پائے تھے قبر پر یہ قطعہ تاریخ نصب ہے

یادشاہ نامدار و زیب تخت و چتر و تاج　　رفت از دنیا سوئے گلزار عقبیٰ آہ آہ

آفتاب عالم آرا شد نہاں زیر زمیں　　تیرہ و تاریک دنیا شد زمرگش در نگاہ

مسکن خود ساخت جنت دفن شد در کربلا　　حامی دیں عدل گستر دادرس ظل الٰہ

از سر افسوس گفتہ سال تاریخش سریرؔ　　مردلے وائے نصیر الدین حیدر بادشاہ　　۱۲۵۳ھ

پہلے امامباڑہ شاہ نجف میں دفن کی رائے تھی مگر کچھ لوگوں نے کہا کہ جب ولیعہدی میں موافقت مزاج نہ تھی تو اب تو وہاں جگہ دینا مناسب نہیں ہے راجہ بختاور سنگھ نے چاہا تھا کہ عین ضریح اقدس کے نیچے جگہ ملے مگر مرزا محمد علی داروغہ تعمیر کربلا نے عذر کیا۔ کہا کہ پہلے میرا سر کاٹ لو پھر قبر کھودنا محمد علی شاہ مرحوم کی طرف سے مجاورت کے لئے مقرر ہوئے تھے۔

لہ بہار ہند

سید کمال الدین حیدر نے اس جگہ کے لئے بھی عذر کیا تھا یہ کہتے ہوئے کہ مسجد ہے آخر میں یہ طے کیا گیا کہ یہ تو نقل روضہ ہے اور شبیہ مسجد بالین سر ہے مسجد نہیں ہے اور غرض بانی تعمیر ایوان ہے نہ مسجد۔ فتح الدولہ مرزا محمد رضا برق نے یہ تاریخ کہی ع

دہ سال و پنج روز حکومت نمود شاہ ١٢٥٣ھ

<u>زندگانی شاہ مرحوم</u> :- نصیر الدین حیدر اس قدر ہر دلعزیز اور رعایا پرور روشن خیال تاجدار تھے سلاطین اودھ میں ان کی نظیر نہ تھی خدمت خلق کا جذبہ ان کی رگ و پے میں تھا ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو وہ ایک نظر سے دیکھتے تھے۔ راجپوتوں میں دودھ پیتی لڑکیوں کو قتل کر دیتے تھے ستی ہونے کی عام رسم ہند وعورتوں میں تھی بردہ فروشی کا بازار گرم تھا ١ مئی <u>١٨٣٣ء</u> سے شاہ موصوف نے ان ظالمانہ رواسم کو جرم قرار دیا خواجہ سرا بنانے کو بھی شاہ موصوف سے خلاف قانون قرار دیا تھا علم پروری اور فقراء نوازی میں وہ بہت مشہور تھے شاہ قطب اعظم صفی کی اس قدر عزت کی کہ لوگ سمجھے کہ وہ بیعت کر رہے ہیں ان کے ایک مصاحب نے اس طرح ان کا حلیہ بیان کیا تھا ——— چہرے کی رنگت بھی سیب کی ایسی تھی اس کے ساتھ سر کے بالوں بھکوں اور مونچھوں کی سیاہی رخساروں پر بھلی معلوم ہوتی تھی آنکھیں چھوٹی اور چمکدار تھیں۔

شیرمال باقرخانی انھیں کی شہریاری میں میاں ممدوح باورچی نے سب سے پہلے تیار کی۔ ڈھیلے پائچوں کا پیجامہ اور پنج گوشیہ ٹوپی خود بادشاہ کی ایجاد ہے میر ضمیرؔ ان کی مدح میں کہتے ہیں ؎

زہے بادشاہ رعیت نواز — زہے عادل و با دل و کارساز
سعید اس کے طالع اور بیدار بخت — وہ زینت دہ انس و چتر و تخت
سخن اس طرح کا کہیں ہے شنا — کہ شاعر کو پیش از سخن دیں صلا
رفاہ رعیت کا خواہاں ہے وہ — کہ اس عہد میں فخر شاہاں ہے وہ
محرم کے عشرہ میں کیا کیا نا رزار — یہ روتا ہے مانند ابر بہار
غم آل احمدؐ میں ہے دل حزیں — سیہ پوش رہتا ہے تا اربعین
زہے دبدبہ و زہے رعب و نام — کہ تھراتے ہیں پڑے روم و شام
جو تیغ اس کی پڑتی سر کوہ قاف — تو گاؤ زمیں کی بریدہ ہو ناف
شب و روز ہے اس دعا میں ضمیرؔ — سلامت رہیں بس شاہ و وزیر

کرامت حسین داروغہ نزول کی ایک رپورٹ کی لفظیں یہ ہیں ——— کربلائے نصیر الدین حیدر بموجب حکم پروانہ مورخہ ١٧ رجون <u>١٨٥٦ء</u> بموجب روبکاری صاحب کمشنر بہادر مندرج نزول رجسٹر ہے اور ٹھیکہ اس کا چالیس روپے بر صرف سرکار بنام چپڑی کے ہے۔

کربلا مذکور کو تاریخ نے محلہ ارادت نگر کی تعمیر بتایا ہے اس لئے قدیم بندوبست کا لحاظ رکھنا ضروری تھا شیعہ ڈگری کالج کی عمارت اس کربلا سے متصل ہے اور طلباء شیعہ کالج کی عمارت کی کچھ خبر لیتے رہتے ہیں۔

<u>امامباڑہ سلطان صاحب صفوی</u> :- یہ امامباڑہ بھی ارادت نگر میں اب تک باقی ہے عمارت صفوی خاندان کی پرانی یادگار اور اوسط درجے کا عزاخانہ ہے صحن میں بعض قبریں بھی ہیں صفوی کیلنڈر میں اس امامباڑہ کا تذکرہ اور مقبرہ شاہ صفی کا کچھ ذکر ہے تفصیل

کوئی بتانے والا نہیں عمارت زیر تولیت نواب جان عالم صاحب تھی جنھوں نے سفر حج کی واپسی میں بصرہ پہونچکر سفر آخرت کیا۔

چاند گنج

یہ محلہ دریا پار شاہ نصیر الدین حیدر بہادر نے آباد کیا تھا جو اس وقت بھی آباد ہے کسی یادگار قدیم کا پتہ نہیں ملتا بجز ایک کنوئیں کے جو راجہ میوہ رام افتخار الدولہ کی اولوالعزی کا نقش باقی ہے ۱۸۳۲ء کی بنیاد ہے اور آئی ٹی لڑکیوں کے کالج سے ملحق ہے اس کے سامنے کی زمین مہاراجہ محمود آباد کی ملکیت بتائی جاتی ہے۔

اسرار حسین خاں لکھتے ہیں کہ چاند گنج کے ہاتے میں ایک عظیم الشان مویشی خانہ تھا جسے ــــــــ زندہ جانوروں کا عجائب خانہ کہنا چاہئے[۱] اس کے بانی نصیر الدین حیدر تھے اس میں اس قدر کثیر اور عجیب اور مختلف اقسام کے جانور تھے جس کا اندازہ کرنا غیر ممکن تھا بادشاہ کے پاس ایک شیر تھا جس کا نام بھوریا تھا یہ شیر کوہ ہمالیہ کے دامن کے ایک دیہات بھوریا سے پکڑ کر آیا تھا اور اس وجہ سے اس کا یہ نام ہوا بادشاہ کے یہاں ایک چیتا لنگرا نامی گراں ڈیل تھا۔ بہت سی لڑائیاں جیتے ہوئے تھا اس کی کھال پر دھاریاں نہایت خوشنما تھیں۔ ایک ہاتھی صرف ایک دانت کا ایسا زور آور اور کوہ پیکر تھا کہ تنہا اس نے سو مرتبہ لڑائی میں فتح حاصل کی تھی اس کا نام بلیر تھا۔ ایک گھوڑا مردم خور کے نام سے مشہور تھا کیونکہ وہ بہت سے لوگوں کو ہلاک کر چکا تھا جس کو شیر اور ارنے بھینسے تک نہ مار سکے بلکہ خود زخمی ہو گئے "بھوریا" کے بارے میں مجھے عہد شاہی کے نجف علی جن کا عرف "وغیرہ" تھا کا بیان بھی یاد ہے۔ ایک مرتبہ یہ پنجرے سے باہر ہو گیا اور ہلچل پڑ گئی بادشاہ خود منظر دیکھنے لگے اور ڈانٹ کر کہا "بھوریئے یہ کیا" "شاہی اقبال تھا کہ وہ خود کٹہرے میں گردن نیچی کرکے چلا گیا۔

علی گنج

اس محلہ کو نواب سعادت علی خاں بہادر نے پار میں آباد کیا اور ٹھیک اسی دن ان کی ماں نے نگریاں بسائی جیٹھ کے پہلے منگل کو یہاں مہابیر کے مندر میں ہندوؤں کا بڑا میلہ ہوتا ہے گرد و نواح سے ہزار ہا شر کار پیکریاں کرتے ہوئے اپنے قد سے زمین ناپ کر وہاں پہونچتے ہیں موتی چور کے لڈو اور ہار پھول یہاں چڑھائے جاتے ہیں ہر طبقے کے ہنود درشن میں مصروف رہتے اور بعض مسلمان بھی پرشاد کرتے ہیں ؎

مہابیروں کا میلہ چاروں میں آنے والا ہے   تماشہ دیکھنا دریا دلی کے جوش طوفاں کا

آزادی کے حامی اپنی فوج سے کر مندر کا درشن کرتے ہوئے ۳ر جون کو چنہٹ سے منڈیاؤں چلے اور ایک حصۂ فوج کلکرایل کیمپ گاہ میں انگریزوں کی گھات[۲] میں بیٹھ رہا۔ علی گنج میلہ کے میدان میں ایک سربلند اور شاندار مسجد ہے جس کے بانی کا نام نہیں معلوم۔

مکارم نگر

یہ محلہ پار کی آبادی میں بہت پرانا اور شیخ ابوالمکرم خاں صوبیدار کا بسایا ہوا ہے۔ مکرم نگر کو عوام نے مکارم نگر میں تبدیل کیا اودھ کے آخری دور میں یہاں زنانہ اور ہجڑوں کی بستی ہوئی۔ خواجہ سرا کا عہدہ حکومت شام معاویہ[۳] کے دماغ کا نتیجہ تھا اور وہ محلات میں ایسے مردوں کو رکھنا چاہتا تھا جن سے حرم سرا کی عورتوں کو گزند نہ پہونچے اور ہجڑوں کی تعداد اس جذبے میں بڑھی کر

۱؎ قدیم ہنر ص۳۰۲   ۲؎ احسن التواریخ ص۵۹   ۳؎ مولیٰ و معاویہ

جو مرد عورت بن کر ناچنے کی آرزو کریں ان کو زنانہ ہو کر ناچنے کا موقع ملے شادی بیاہ میں بھانڈوں اور کشمیریوں کے ساتھ ان کی آمدنی کا بھی ایک قبیح ذریعہ پیدا ہو نجم الغنی نے تاریخ اودھ میں لکھا ہے کہ مجتہد العصر کے حکم سے مکارم نگر سے ہجڑے نکالے گئے اور اس سلسلے میں اس نے سید العلماء کا ایک خط نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں پبلک کی ذاتی اور اخلاق اصلاح کا عالموں نے بیڑا اٹھا لیا تھا اور حکومت انھیں کی تھی۔

انار دانہ :- اس غول کا ایک زنانہ انار دانہ نامی تھا عہد شاہی کے مسخروں میں یہ اور مرزا مچھو شہرۂ آفاق تھے دونوں کی پرورش اسی علم خیز لکھنؤ کے ذرّوں میں کھیل کر ہوئی تھی کسی رئیس کی ظرافت طبع تھی کہ اس کو ابھار دیا وہ سلطان العلما کی دعوت کرے۔ اس نے سواری روک کر بہت ادب سے عرض کیا کہ خانہ زاد قبلہ و کعبہ کی دعوت کرنا چاہتا ہے رد دعوت حضور کا شیوہ نہیں ہے جناب نے فوراً یہ جواب دیا کہ اپنی وضع قطع بدل دے تو مجھے آنے میں کوئی عذر نہیں (مرد مرد کا مہمان ہوتا ہے) نہ وہ کرتی اور لہنگا اتار سکتا تھا اور نہ جناب جا سکتے تھے تھر کتا ہوا بڑھا تھا اور عرق ندامت میں ڈوب کر پلٹا۔

یہ واقعہ صحیح ہے کہ ہجڑے کا جنازہ اٹھتے کسی نے کبھی نہیں دیکھا یہ ہمیشہ اندھیری رات میں میت اٹھاتے ہیں۔

محسن باغ

پار کے باغات میں یہ گلستان میر مہدی حسین ماہر نے خریدا تھا اور نہ اپنے نام پر نام رکھا نہ بیٹوں کے نام پر بلکہ آثار قدیمہ کی محبت میں وہی نام رہنے دیا جو باغ لگانے والے نے رکھا تھا پھر اس باغ کا نام دوسرے مالک نے شہنشاہ باغ اپنے نام پر رکھا۔ میں نے یہ باغ تقریباً ۵۰ سال پہلے دیکھا تھا اور ماہر کے بیٹے نواب سید عابد حسین عرف چھوٹے صاحب بیمار ہو کر پاٹا نالہ سے تبدیل آب و ہوا کے لئے کچھ دن کے لئے گئے تھے میں اپنے والد کے ساتھ بگھی میں بیٹھ کر مزاج پرسی کو گیا تھا پر فضا جگہ تازہ آب و ہوا میں ایک خوبصورت اور کشادہ عمارت تھی۔

کوٹھی دل آرام :- یہ کوٹھی چھتر منزل کے پچھواڑے ہے دو منزلہ عمارت ہے کہا جاتا ہے کہ رمنہ کے حدود میں ہے۔[۲] ۴۰ سال ہوئے کہ اس عمارت کو گرا دیا گیا۔ بعض فارسی تاریخوں[۳] میں آصف الدولہ کے عجائب خانہ کا ذکر ہے جو طول کے لحاظ سے دوہرایا نہیں گیا

عہد نصیری میں ایک شخص تھے جو دو پٹھے لے کر ایک کا داہنا بازو اور دوسرے کا بایاں بازو کاٹ دیتے تھے اور کٹے ہوئے بازوؤں کی جگہ دونوں کو ملا کر ٹانکے دیتے اور ایک دوہرا کبوتر بنا لیتے تھے ان کو بڑی داشت سے پالتے تھے اور وہ دونوں ایک ساتھ اڑتے تھے۔ اکثر معمول تھا کہ جب بادشاہ بجرے پر سوار ہو کے چھتر منزل سے دریا پار[۴] جاتے اور کوٹھی دل آرام میں بیٹھ کر دریا کی سیر دیکھتے تو یہ اس پار سے اپنے عجیب الخلقت دوہرا کبوتروں کو اڑا دیتے تھے جو بادشاہ کے قریب جا کر بیٹھ جاتے بادشاہ انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور انعام پاتے۔

ہزاری باغ :- یہ باغ دریا کے پار تھا اور میلوں سبزہ زار پر مست ہاتھی اور کبھی گینڈے لڑائے جاتے تھے نزہت بخش فضا کا ذکر تاریخ لکھنؤ کے صفحہ پر باقی ہے عبدالحلیم شرر کی تحقیق ہے کہ یہ باغ رمنہ میں تھا اور رمنہ[۵] دریا پار تھا رمنہ کے تاریخی خصوصیات پر ہم مستقل بحث کریں گے

۱ے تاریخ اودھ ج ۵ صـ ۲۵ ۲ے رسالہ آج کل دہلی بابتہ جنوری ۱۹۵۶ء ۳ے جنت العالیہ ج ۲ صـ ۸۵

۴ے قدیم ہنر صـ ۲۰ ۵ے گزشتہ لکھنؤ صـ ۳۹

رمنہ

یہ لق و دق زمین چھتر منزل کے عقب دریا کے اس پار تھی ندوۃ العلما[1] اور گورنمنٹ آرٹ اسکول کی عمارتیں رمنہ کی زمین پر تعمیر ہوئی ہیں نصیر الدین حیدر کے وقت میں یہاں ہاتھی گینڈے اور بارہ سنگھے لڑائے جاتے تھے خلائق کا ہجوم ہو جاتا تھا ہاتھیوں کی لڑائی اور ۱۸۵۱ء کا منظر ۱۹۵۱ء کے ٹکٹ ڈاک میں چھپا ہے۔

ہاتھیوں کی لڑائی کا بڑا مہیب منظر ہوتا ہے کمزور دل کا آدمی نہ اس کی چنگھاڑ برداشت کر سکتا ہے نہ ٹکر کی آواز اس ڈرونے جنگ کے لئے ایک لمبی چوڑی زمین پر مضبوط دیواروں کا احاطہ تماشائیوں کے لئے مناسب نشست اور حسب مراتب جگہیں مقرر کرنے کے بعد چار دیواری کے نزدیک تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تنومند اونٹ باندھے جاتے ہیں ہاتھی اونٹ سے ڈرتا ہے جب ہوشیار فیلبان کے ذریعے اولا مست کر کے ہاتھی لائے جاتے ہیں تو ہاتھیوں کو چھوڑنے والے بھی جان پر کھیل کر ہمت کرتے ہیں اور دو مختلف سمتوں سے جب یہ کوہ پیکر لا کر چھوڑے جاتے ہیں تو ہر ایک دوسرے کی طرف جھپٹتا ہے سونڈ بازی سے کبھی پہل ہوتی ہے کبھی زلزلہ افگن ٹکر کے دھماکے سے ایک کو دوسرا پیچھے ہٹاتا ہے اور پچھڑ جانے والا جوش انتقام میں اگر اس سے بڑھ کر حملہ کرتا تو دونوں طرف سے غصے کی آگ بھڑک اٹھتی اور ہر ایک دوسرے کو شکست دینے کی کوشش کرتا کبھی دانت پر دانت پڑتے کبھی گھٹنے ٹیکنے کی نوبت آتی۔ اور عروج و زوال کا نقشہ کبھی گرنے کا دھماکہ اور فتحمند ہاتھی پیچھا کرنے پر تلا ہوا۔ ہار جیت کا معیار یہی تھا کہ جو محاذ سے بھاگ کھڑا ہو۔ اونٹ سے ہاتھی ڈرتا ہے اونٹ نہ ہوتے تو وہ دیوار پر ٹکر مار کر کب کا نکل جاتا۔ خوف شتر راہ فرار سے روکتا ہے اور دنیا کے عالم اسباب ہونے کا ثبوت بہم پہونچتا ہے۔

نوابی میں تمام لکھنؤ گلیوں اور تنگ راستوں سے بھرا پڑا تھا صرف ایک سڑک رمنہ میں تھی جہاں راجہ جھرا آصف الدولہ کے کہار اور ریذیڈنٹ کی گھوڑا گاڑی کا مقابلہ ہوا تھا۔ ادھر صاحب اپنی بگھی پر بیٹھا ادھر پیر کے دن ۹ بجے صبح کو نواب کا بوجھ کہاروں کے کاندھے پر چلا آدھ کوس تک گاڑی اور بوجھ برابر رہا اور جب کندھا بدلا تو سرجی آگے بڑھ گیا اور آٹھ کہاروں نے جو اس کی مدد کو ساتھ تھے امتحان کی حد نا لگھ کر بسم اللہ کہہ کر سواری رکھ دی تماشائیوں[2] میں واہ واہ کا غل مچ گیا نواب نے سرجی کو اس صلہ میں راجہ کا خطاب دیا اور سرجی کہار کا نام راجہ سورج نرائن ہوا اس قصہ کو گھانسی رام ایم اے نے بڑی تفصیل اور لطف سے کتاب مذکور میں نقل کیا ہے" رمنہ کی زمین میں وسعت نواب حسن رضا خاں کی ایک کوٹھی کھود کر کی گئی تھی جو رمنہ میں تھی۔ لوہے کے پل کا سامان جو نواب سعادت علی خاں نے برمنگھم سے ۳ لاکھ روپے میں منگوایا تھا اور نواب نے اس سامان کے پہونچنے سے پہلے قضا کی یہ سامان مدت تک رمنہ میں غیر مرتب پڑا رہا منشی علاء الدین احمد اکبر آبادی سلطان عالم کے حال میں رقمطراز ہیں" تعلیم فوج کا شاہ کو اس قدر خیال تھا کہ بنفس نفیس رمنہ میں چار گھڑی رات سے گھوڑے پر سوار ہو کر جاتے تھے اور گھنٹوں دھوپ میں کھڑے رہ کر فوج کی قواعد[3] اور فنون جنگ کی مشاقی دیکھتے اور باکمال سپاہیوں کو انعام سے سرفراز فرماتے۔

روپ پور کھدرا

اس موضع میں شیخ اکرام علی ولد شیخ محمد واصل سہارنپوری رہتے تھے واصل عہد آصفی میں لکھنؤ آئے بچوں کو پڑھاتے تھے عطیہ

---

[1] آجکل دہلی بابتہ جنوری ۱۹۵۶ء [2] روح ادب حصہ سوم ص ۴۲ مؤلفہ گھانسی رام ایم اے ایل ایل بی [3] اخبار اسناد آگرہ مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۳۲ء

نواب سے روپیہ پور میں پرانی بانسمنڈی کے قریب ان کو زمین دی گئی۔ شیخ فاضل نے اپنے بیٹے شیخ اکرام علی کو رکابداری کا پیشہ عہد نواب یمین الدولہ میں سکھوایا ان کے استاد شیخ شہابو شیخ کلن دلدار خاں تھے جو اس فن میں جواب نہ رکھتے تھے۔ اکرام علی نے عہد واجدی تک وابستہ رہنے کا فخر حاصل کیا ایک مرتبہ غازی الدین حیدر کی فرمائش سے مصری کی روٹی پکائی اور نام نان مصری رکھا نان بادام بھی ان کی ایجاد تھی اکرام علی اشرفی اور روپیہ کا مربہ بناتے تھے اور تیار ہونے پر نقش اور حروف مٹتے نہ تھے جس عہد اور جس سنہ کا سکہ ہوتا صاف پڑھا جاتا کھاتے میں کسی قسم کی گرانی معلوم نہ ہوتی اور نہ کشتہ کی صورت اور اثر تھا۔ نمائش کلکتہ ۱۸۸۱ء میں جو تمغے ملے تھے وہ ان کے پوتے شیخ اعظم علی کے پاس اب تک موجود ہیں۔ کلکتہ کی نمائش میں اکرام علی نے انڈے کی زردی کو ابال کر دونوں کے ذریعے سہاند کو دور کیا اور زردوزی پر کارچوب بنایا اور اچاری میں مع شیرہ رکھ کر بھیجا دوسرا مربہ آم کی پھانکوں کا تیار کر کے حاضر کیا ایک پھانک پر سونے سے مصرعہ لکھا اور دوسری پھانک پر چاندی سے دوسرا شعر لکھا

زباں شیریں ہے حکام ملک کیش — لیا تدبیر سے سارا جہاں ہے

ان کے ہاتھ کی قاش کو ایک ڈز میں انگریز دیکھ کر پھڑک اٹھے ۱۸۹۶ء میں اکرام علی مر گئے۔

تکیہ تارہ شاہ: یہیں دفن ہوئے شیخ اکرام علی ایک ایسی روٹی پکاتے تھے کہ جس میں کئی مزے ہوتے تھے ایک طرف سے کھائیے تو میٹھی دوسری طرف سے کھائیے تو نمکین تیسری طرف سے معمولی روکھی روٹی کا ذائقہ چوتھی طرف سے سلونی۔ یہ بالائی کی گلوری ایسی بناتا تھا کہ اصل اور نقل میں کچھ بھی فرق نہ ہوتا تھا اندر میوہ بھرا ہوتا اور بالائی کے اوپر کی پرت کی گلوری پستہ کی کیل اور رنگ ایسا سبز دیتا کہ بالکل پان[۱] معلوم ہوتا۔

حضور باغ

یہ بغیہ بھی دریا پار نواب سعادت علی خاں نے بنوائی تھی یہاں ہاتھی اور گینڈے لڑائے جاتے تھے ان دو جانوروں کی لڑائی کے لئے بہت بڑی جگہ کی ضرورت تھی اس کو باغ کی آرامی پورا کرتی تھی نواب اور ارکان سلطنت یہاں سے اس ہیبت ناک لڑائی کا منظر دیکھتے تھے ۱۲۵۶ھ کے بعد باغ کا مالک نہ رہنے سے خصوصیات بھی دفن ہو گئے اور نہیں معلوم کہ یہ باغ کہاں تھا اس باغ میں ۴۰ گز لانبا اور ۵ گز چوڑا حوض تھا جس میں فوارے لگے تھے پانی موتی کی طرح چمکتا تھا کیاریاں روشیں چمن بندی میں باغ بے نظیر تھا۔

محلسرا سلیمان شکوہ

دریا کے ساحل پر جو عمارتیں تھیں ان میں سلیمان شکوہ کے قصر کا بھی پتہ ہے اس بلڈنگ میں چشم و چراغ دہلی ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور انشاء اللہ خاں کے بہروپیا بننے کا منظر دیکھا تھا کسی اشنان کا میلہ تھا اور سید انشاء اللہ خاں رنگت کے گورے بدن کے فربہ صورت کے جامہ زیب تھے ان کو مزاج میں یہ سوجھی کہ کشمیری پنڈتوں کے کپڑے پہن کر پوجا پاٹ کا سامان تیار کیا صبح کو سب سے پہلے دریا کے کنارے جنت دھرم مورت بن کر بیٹھ گئے اور خوب زور سے اشلوک پڑھنا شروع کئے اور منتر جپتے رہے لوگ اشنان کے لئے آئے۔ عورت مرد بچے بوڑھا جو آتا الغرض خواہ مخواہ مرد آدمی دیکھ کر انھیں کی طرف جھکتا یہ انھیں پوجا کرواتے تھے تلک لگاتے تھے جن دوستوں سے راز کہہ رکھا تھا انہوں نے مرزا سلیمان شکوہ کو خبر کی وہ مع جلسہ اسی وقت لب بام آئے دیکھیں تو فی الحقیقت اناج، آٹا، پیسے

---

[۱] قدیم ہنر مند ص ۱۵۳ و ۱۵۴

کوڑیوں کے ڈھیر لگے ہیں وہ بھی اس قدر کہ اور سب سے زیادہ اس میں آفرینِ طبع یا لیاقتِ فنی کے ساتھ نکتہ یہ تھا کہ حضور خانہ زاد کو وبال دوش نہ سمجھیں نہ اس شاعری کا پابند جانیں جس کوچے میں جائے گا اوروں سے کچھ اچھائی لے نکلے گا۔

کبوتر والی کوٹھی

یہ کوٹھی موتی محل کے بغل میں بادشاہ باغ کی جانب اب تک بھی موجود ہے اس کوٹھی کو آخری تاجدار اودھ نے اپنے کبوتر خانہ کے لئے بنوایا تھا PIGEON HOUSE جہاں جہاں نادر کبوتر تھے ان سب کو جمع کیا چھوٹے خاں رئیس الدولہ کبوتر خانہ کے داروغہ تھے اور شیخ محمد ان کی پیش دستی میں کام کرتے تھے نجف علی عرف وغیرہ عہد شاہی کے مرد ضعیف کا بیان ہے کہ سیاہ بکرے کی مسلم کھال کی چھپیاں بنائی گئی تھیں اور جس وقت یہ کبوتر اڑتے ہیں تو درحقیقت کچھ دیر کے لئے دھوپ جاتی رہی اور زمین پر سایہ نظر آنے لگا شاہی کبوتروں کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے پیروں میں پین جھنیاں سونے چاندی کی تھیں کبوتر عموماً وہی تھے جو شہر بھر کے کبوتربازوں سے خرید کر آج ہی کے دن کے لئے رکھے گئے تھے زیادہ تر کبوتر اپنے مالکوں تک پہونچے اور وہ دوہرے فائدے میں رہے کبوتر کی اعلیٰ قیمت بھی پائی اور کبوتر کچھ سونا چاندی لے کر گھر آ بھی گیا یہ بھی فائدے میں رہے اور جو کبوتر غیر متعلق لوگوں کے گھروں پر گرے وہ بھی نفع میں ہیں ایسے کبوتر ان کو کہاں ملتے ۱۹۲۲ء میں جب لکھنؤ یونیورسٹی قائم ہوئی تو یہ کوٹھی وائس چانسلروں کی قیامگاہ رہی آج کل طلبا کا ہوسٹل ہے۔

کبوتر کی قسمیں بہت ہیں جو مختلف قد و قامت اور مختلف رنگ کے ہوتے ہیں گرہ باز، خوردنو کا، چوا چندن، جنگلی، لقا، لکھی، شیرازی، لوٹن، عنبری، علیر، گولہ، طرقہ، رنگ کے لحاظ سے بھی ہر رنگ کے کبوتر کا علیحدہ نام ہے مینا، زاغ، جوگیا، کابرا، عنبر سرا، تیلیہا، آلیچہ، دا، گرہ باز بے داغ، ہرا، چھوٹا کبوتر فاختہ کے برابر اور شیرازی بڑا ہوتا ہے نگار شیرازی کبوتر کی اعلیٰ قسم کا نام ہے کبوتر سے دانشمندوں نے طرح طرح کے کام لئے ہیں عشاق نامہ بری کی خدمت لیتے ہیں ؎

خط کبوتر کس طرح لے جائے بام یار تک
پر کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار میں

ایضاً

بھیجوں اس صیاد کو نامہ تو مارے خوف کے
مثل مرجان جسم میں خون کبوتر خشک ہو

اطبا فالج کے مریضوں کو اس کا آب گوشت یخنی کرکے پلاتے ہیں لاولد جن کے بچے نہیں جیتے کبوتروں کے پر کی ہوا گھر کی بیماریوں کا دفیعہ سمجھتے ہیں اہل علم عمل کبوتر سے بیماروں کو اچھا کرتے ہیں جراح اس کی بیٹ کو زخموں کے بھرنے میں بھی کام میں لاتے ہیں کبوتر بین الاقوامی جانور ہیں عرب کا بلند ذوق ہے کہ جنگلی کبوتر کو یمام کہتے ہیں اور شعرا نے لفظ حمام جو ان کی زبان میں کبوتر کے معانی میں ہے کثرت سے استعمال کیا ہے خطبات میں کبوتر کا تمثیلاً ذکر ہے مرعشی اور راعبی کبوتر اس طرف بڑے مبارک اور اچھے سمجھے جاتے ہیں کبوتر کی کنیت اپنے محاورات کے مطابق ابو عکرمہ قرار دی ہے میدان جنگ میں کبوتروں سے فوجوں نے کام نکالا اور طوفان نوح کے عام سیلاب میں سفینۂ نوح پر سے کبوتر کے ذریعے دریافت حال میں تعاون حاصل کیا ہے ارباب ادب لال چیزوں کو خون کبوتر سے مثال دیتے ہیں۔

شریک رنج غیر اس طرح سے ہونا مناسب ہے
مری آنکھوں میں سرخی رہ گئی خون کبوتر کی (جاوید لکھنوی)

خون کبوتر کا شراب سے بھی کنایہ ہے ؎

۱؎ آب حیات ص ۲۹۳ ۔ ۲؎ آجکل دہلی بابت جنوری ۱۹۵۶ء ۔ ۳؎ نیا دور بابت مئی ۱۹۵۵ء

زگلشن چمن گشتہ طاؤس دُم   بروں آر خون کبوتر ز خُم   (جامع اللغات)

کبھ شریعت میں کبوتر کا شکار بہت بڑا جرم اور گناہ سمجھا جاتا ہے[1] گھروں میں کبوتر پالنے کا رواج بہت پرانا ہے کعبہ میں جو کبوتر اس وقت موجود ہیں وہ اس نسل کے ہیں جو اسمٰعیل نبی کے پالے ہوئے کبوتروں کی تھے کنعان میں خدا رسیدہ لوگوں کے یہاں کبوتر تھے اور یوسف باپ کے پاس اپنی یادگار چھوڑ گئے۔

کبوتر امن کی نشانی مانا جاتا ہے اور بھارت کے معزز تاجور نہرو جی کی چونسٹھویں سالگرہ کے مبارک سلسلے میں ۶۴ کبوتر اڑائے گئے تھے کبوتروں کی نگہداشت اس قدر قدیم شوق ہے کہ اس سبجکٹ پر بہتیں کے رسالے لائبریریوں میں ملتے ہیں ان کے مطالعے سے حسب دلخواہ رنگ اور قطع کے بچے پیدا کئے جا سکتے ہیں اور کبوتروں کی بیماریوں کے علاج مفردات اور مرکبات سے ایک علیحدہ بحث ہے واجد علیشاہ نے اس کوٹھی میں فن کے اعلیٰ ماہروں کو وابستہ کر رکھا تھا۔

مکتبہ ممتاز العلما میں کبوتر بازی پر ایک خطی رسالہ موجود ہے جو بہت پرانا تو نہیں ہے پھر بھی دو سو برس سے کم کتابت کو نہ ہوئے ہوں گے زبان فارسی ہے اور سوا سو سے زیادہ صفحات ہیں نہ مصنف نے اپنا نام لکھا ہے نہ کاتب نے۔ آخر میں شنگرف سے تحریر ہے ـــــ

تمت بعون الملک الوہاب بموجب حکم عظمت وحشمت دستگاہ بندگان والا مکان علی محمد خاں دام اقبالہٗ۔ ممکن ہے کہ مصنف کے ہاتھ کا نسخہ ہو کتاب پر کہنگی کے زیادہ سے زیادہ آثار ہیں اور کیڑا لگنے سے کتاب چھلنی ہو رہی ہے۔ کاتب بڑا ملا ہے پیاز کو مِن سے مثال کو س سے جا بجا لکھا ہے اس کتاب میں زیادہ تر کبوتروں کی حفظ صحت پر ادویہ اور تدابیر ہیں اور آخر میں چرند و پرند کو مست کرنے کے نسخے بھی درج ہیں۔ افزائش نسل پیل و شتر و اسپ و گاؤ کتاب کا خاص باب ہے اس کتاب کو علم الحیوان کی ایک نادر کتاب سمجھنا چاہیے۔

کبوتر باز

عہد غازی الدین حیدر میں اس فن کے کامل میر عباس تھے وہ کبوتروں کو اس طرح سکھاتے تھے کہ جہاں سے چاہتے تھے ان کو اڑاتے تھے اور جب سیٹی بجاتے تھے کبوتر آکر پنجرے پر بیٹھ جاتے تھے۔

نصیری عہد میں ایک استاد تھے جو دو پٹھے لے کر ایک کا داہنا بازو اور دوسرے کا بایاں بازو کاٹ دیتے تھے اور کٹے ہوئے بازوؤں کی جگہ دونوں کو ملا کر ٹانکے دیتے تھے اور ایک دوہرا کبوتر بنا لیتے تھے ان کو بڑی داشت سے پالتے تھے اور دونوں ایک ساتھ اڑتے تھے۔

میر امان علی کبوتر کو رنگ کر جیسا چاہتے بنا دیتے تھے اکثر پر اکھاڑ کر دوسرے رنگ کا پر اس کی جگہ رکھ کر اس طرح جما دیتے کہ وہ اصلی پروں کی طرح جم جاتا اور بہت سے مقامات پر رنگ سے کام لیتے مگر ایسا مضبوط اور پختہ رنگ ہوتا کہ مجال کیا جو ذرا بھی پھیکا پڑ جائے سال بھر تک یہ رنگ قائم رہتا بعد سال بھر کے کریز میں جب پر گر پڑتے تو پھر اصلی رنگ نکل آتا تھا وہ ایسے کبوتر امراء کے ہاتھ پندرہ بیس روپے میں فروخت کر ڈالتے میر صاحب[2] ایک مشہور کبوتر باز کا نام قلی علی تھا۔

بھانڈوں کا باغ

پار کا مشہور مقام ہے اور عہد رفتہ کی اس یادگار کا نام ۱۹۲۰ء میں بیگم باغ رکھا گیا تیس برس پہلے اس باغ پر فضل حق قابض تھے

---

[1] قدیم لکھنؤ   [2] نسیم اللغات ص۲

ان سے حکیم مرزا محمد نقی صاحب طبیب گھسیاری منڈی نے مول لیا اور زمینداری ختم ہونے تک حکیم صاحب کی، بیگھ زمین پر ملکیت باقی رہی اس باغ میں دو مسجدیں تھیں ایک گر کے ختم ہو گئی دوسری مسجد موجود ہے جس کو عوام جناتی مسجد کہتے ہیں اور مرد و عورت منت مراد کے سلسلے میں آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ باغ محلہ ارادت نگر میں شامل ہے اس لمبی چوڑی زمین میں دو معمولی پختہ کنویں اور تیسرا اندارا اتنا بڑا کنواں ہے جو لکھنؤ بھر کے اندارون اور باؤلیوں سے بڑا ہے کنویں سے قریب ڈھال ہونے سے واضح ہوتا ہے کہ "چرس" کھینچا جاتا تھا باغ کے آخری مالک نے کنویں سے آب رسانی کے لئے رہٹ کا انتظام کیا اب بیل و پہیہ کے ذریعے پانی کھینچتا ہے۔ اور اس قدر بڑی مقدار میں پانی ہے کہ کبھی کمی محسوس نہیں ہوتی پانی اس کا ہلکا اور ہاضم اور پیشاب کھول کر لانے والا بتایا جاتا ہے مرزا محمد اصغر صاحب حدیث خواں و رئیس جوہری محلہ لکھنؤ نے اس کنویں کو دیکھ کر اپنے بزرگوں کا قول نقل کیا ہے کہ زیر چاہ بہت بڑا جال دار توا لوہے کا دیا ہوا ہے اور پانی چھن کر اوپر پہونچتا ہے۔ باغ میں حکیم صاحب کے لگائے ہوئے درختوں میں دسہری آم اور فالسہ اور دوسری قسم کے درخت ہیں۔

سادھوجی کا مٹھ

کھویا منڈی اور علی گنج کے رستے میں یہ جگہ بڑے پرانے آثار کا پتہ دیتی ہے اور ایک چوکور چبوترہ ہے جس پر گنبد نظر آتا ہے۔ اسی جگہ پرانے زمانے کے ایک سادھو ایسا بیٹھا کہ پھر نہ اٹھا اور وہیں پیام موت آپہونچا اور اسی سمادھی پر سپرد خاک ہوا یہاں سے کچھ فاصلے پر مسلمانوں کا ایک تکیہ ہے جہاں بہت سی قبریں ہیں

عہد شاہی کی چار دیواری

مذکورہ بالا مقام میں وہ پختہ لکھوری اینٹوں کا احاطہ بھی ہے جس کے بارے میں کچھ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ دیواریں کس عمارت کا جز تھیں مجھے شبہ ہوتا ہے کہ یہ فقیر کا باغ تھا جو جنگ آزادی کے سلسلے میں اپنی پوری جمعیت لے کر پامردی سے لڑا تھا اور انگریزوں کے استیصال میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اس مورچے کی لڑائی کا حال میرے پردادا کی پالکی کا جہرا بھولو کہار جو نگینہ کا رہنے والا نوابی کی یادگار تھا جوش میں بیان کرتا تھا اس سے بڑھ کر لکھنؤ کی گلیوں کا جاننے والا دوسرا شخص شہر میں نہ تھا۔

کندھئی کا مندر

یہ وہ اونچا اور بہت بڑا مندر ہے جو شہر بھر میں اپنی نظیر نہیں رکھتا مندر سے قریب اس کے بانی کی املاک تھی بادشاہ کو شبہ ہوا کہ اس نے ایک قیمتی ہیرا خزانہ شاہی کا چرا لیا ہے اس شبہ پر مندر چھوڑ کر پورا گھر اور املاک کھدوا دی۔ اس مندر میں اس قدر وسعت ہے کہ قدیم طرز تعمیر اور سہ دروں میں مورتیاں رکھی گئی ہیں اندر سے لمبا دالان اور اوپر سے مندر معلوم ہوتا ہے پجاری کو شاہی عطیہ زمین اور ماہوار وثیقہ ملتا ہے۔

چھاؤنی دھنے خاں

شہر کا ناکہ ہونے سے یہاں چھاؤنی پر دھنے خاں میواتی تعینات تھا اور مسلمانوں کی اچھی خاصی بستی تھی کچھ شیعہ بھی آباد تھے اور عشرہ محرم میں ایک فرقہ وارانہ فساد ہوا تو ریں اور بندوقیں دونوں طبقے کی طرف سے استعمال ہوئیں کچھ آدمیوں کی جانیں گئیں۔ مرزا مستا بیگ کوتوال سے جب فساد نہ رکا تو مظفر علی خاں بندوقچیوں کی پلٹن لے کر توپ خانہ سمیت پہونچے اور میواتی پسپا ہوئے ان کا

مال و اسباب لٹا ہاتھی اور گھوڑے ضبط ہوئے۔

بانس منڈی

دریائے گومتی کے شمال میں واقع ہے بلّی اور بانس کے تاجر یہاں زمانہ دراز سے رہتے ہیں اور بہت سے گھر کشمیریوں کے ہیں جو مقبرہ جناب عالیہ آباد ہوتے سے پہلے سب کے سب اسی جگہ بسے ہوئے تھے ۹ مارچ ۱۸۸۹ء کو ایک مسجد میں جس سے تھانہ حسن گنج میل بھر ہوگا شیعوں کی اذان کے وقت ایک فرقہ وارانہ فساد ہوا سرفراز علی عرف حافظ جی تھانیدار اور بشیرالدین سب انسپکٹر ۵ بجکر ۱۰ منٹ پر موقع واردات پر پہونچے گرفتاریاں ہوئیں ضابطہ کی کاروائی قائم مقام سٹی مجسٹریٹ کے سامنے زیر دفعہ ۱۴۷ استغاثہ دائر ہوا اور اس آگ کے شعلے عرصہ تک بھڑکتے رہے پہلا فساد اس علاقے میں عہد شاہی میں ہوا تھا اور یہ اختلافات کی وبا عہد ملکہ وکٹوریہ میں پھیلی مدت تک فریقین نقص امن کا شکار ہوتے رہے اس فساد میں ایک ہندو بنیئے نے اقلیت کی نمایاں مدد کی اس مظلوم نواز کے پاس صرف لوٹیا بیتل کی اور رومال تھا جس نے مجمع پراگندہ کیا۔

مزار شاہ عبداللطیف:۔ دریا کے کنارے اس طرف شاہ عبداللطیف دہلوی کا مزار ہے اور شاہ صفا کی قبر بھی بتائی جاتی ہے یہ دونوں باپ بیٹے اپنے زمانے میں صاحب کشف و کرامات تھے شاہ عبداللطیف کو لوگ بادشاہ گر کہتے تھے جو قبریں اس وقت موجود ہیں ان پر سنگی برآمدے اور کچھ اور آثار نمایاں طور پر باقی ہیں۔

پار:۔ نبی بخش رکاب دار عہد شاہی میں آم کی کچی قاشیں گودتا تھا کہ یہ بننے پر قاش مسلّم رہتی تھی داروغہ امام بخش عہد غازی الدین حیدر میں باورچی خانہ کے منتظم تھے۔ ان کا سب سے چھوٹا بیٹا منشی لطف علی لکھنؤ میں موم کے کام کا پہلا شخص گذرا ہے عہد محمد علی شاہ میں مومی فرنیچر اسی نے بنائی۔ واجد علی شاہ نے لطف علی کو منشیوں میں جگہ دی اور انقلاب اودھ کے بعد پھر کسی کی نوکری نہیں کی اور ۱۹۰۶ء میں مرگئے ان کے بعد سے منشی مختار احمد اسی محلہ پار کی مومی فرنیچر تیار کرتے ہیں یہ فرنیچر امام باڑہ حسین آباد مبارک کے لئے بہت بلند بنتی ہے طرح طرح کے نقش و نگار اور دریچے بنائے جاتے ہیں۔ پار میں ایک عرب کی شعبدہ بازی کا واقعہ بھی تاریخی ہے جس کو قدیم ہنر نے نقل کیا ہے۔ اور میں بخوف طول کیفیت نقل نہیں کر رہا ہوں۔

ثابت لکھنوی نے میر انیس صاحب مرحوم کا مقولہ درج کیا ہے۔ جب ہم نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا شروع کیا تو اس وقت دو شخص اس فن کے لکھنؤ میں نامی وگرامی تھے ایک میر مداری جو پار میں رہتے تھے دوسرے مرزا سلامت علی دبیر۔ میر مداری اگر وہی بزرگ ہیں جن کا اشرف تخلص تھا تو ان کا حال اس کتاب میں آچکا ورنہ آج کوئی بتانے والا نہیں کہ ان کا کیا تخلص تھا (حیات دبیر ۴۷)

ختم دریا کنارے پار کا باب

وہ کوٹھیاں جن کی خبر نہیں کہ کہاں تھیں

اس تاریخ میں اپنے امکان بھر ناظرین کو بتایا گیا ہے کہ عمارتیں شاہی کہاں تھیں اس سلسلے میں ان عمارتوں کا ذکر ہو رہا ہے جن کا ٹھکانہ مجھے نہیں معلوم۔

لہ تاریخ اودھ جلد ۴ ص۶۱، از نجم الغنی   سلہ کتاب ابراہیم فی ترجمۃ ابراہیم مخطوطات

مینڈھے والی کوٹھی:۔ اس کوٹھی کو مصاحب الدولہ نے عمارات شاہی کے گرد و نواح میں بنوایا یہاں مینڈھے لڑائے جاتے تھے۔ مصاحب الدولہ کے حالات محلہ مصاحب گنج میں گذر چکے ہیں۔

حیات بخش:۔ اس کوٹھی کو نواب سعادت علی خاں بہادر نے تعمیر کیا تھا مگر نواب کے استعمال میں نہیں آئی میجر بینک اس میں رہا کئے پھر چیف کمشنر اودھ نے یہاں قیام کیا منور بخش خورشید منزل چھپر ڈ کا اصطبل ماہ منزل[1] بھی نواب نے بنوائے مگر نہیں معلوم کہ کہاں تھے خورشید منزل کے حال میں صرف اس قدر ملتا ہے کہ سعادت علی خاں[2] نے بنوانا شروع کی اور غازی الدین حیدر نے عمارت کو مکمل کیا۔

کاٹھ کا پُل

اس مقام پر شاہ نصیر الدین بہادر نے سپیدی کے آزار اور کوڑھ کا اسپتال کھولا تھا جس کو بعد کی حکومتوں نے بھی باقی رکھا یہ عمارت اس قدر وسیع ہے کہ آدھے میں نارمل ٹریننگ اسکول اور آدھے میں اسپتال مذکور ہے جس کا یکم اپریل ۱۹۲۹ء سے کنگ جارج میڈیکل کالج سے الحاق ہو گیا ہے۔

بیلی گارد RESIDENCY

اس عمارت کو بیلی گارد کہتے ہیں جہاں انگریزوں کی طرف سے رزیڈنٹ رہتا تھا اور وہ منافرت جو عہد شجاع الدولہ سے ہندوستانیوں کو انگریزوں سے تھی رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی تھی اور مٹھی بھر غیر ملکی جماعت سمجھتی تھی کہ ہم کو ہندوستان سے خطرہ ہے ضبطی اودھ انگریزوں کا آخری کرتوت تھا جس کو برداشت نہ کر کے چپے چپے میں بے چینی بدامنی قتل و غارت کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا اور جس طرح سانپ کو دیکھ کر ایک ممیّز بچہ بھی پتھر سے اس کی سر کوبی کر دیتا ہے وہی حال انگریزوں کی مسلسل ریشہ دوانی کا تھا کہ پورا ملک ان کا دشمن جان ہو رہا تھا اور اودھ پر قبضہ ان کے لئے لقمۂ شیریں ہونے کے بجائے وہ کڑوا گھونٹ بن گیا کہ جدھر انگریز نظر آتا تھا تہ تیغ ہوتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ملک کو ان سے اصولی اور بنیادی اختلافات تھے اور منافرت کی تخم ریزی مدت دراز سے ہو رہی تھی۔ خوددار طبیعتیں غیر ملکی کو حکومت کا اہل نہیں سمجھتی تھیں یہاں تک کہ "چربیلے کارتوس" کے مسئلے نے جذبات نفرت کو مذہبی جامہ پہنا کر فوج میں اختلاف کی ہوا دی اور خود افسران حکومت کو اپنی زندگی کے لالے پڑ گئے۔ صوبہ بھر میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا انگریز اپنی اقلیت محسوس کرتے ہوئے امامباڑہ آصفی کو قلعہ بنا کر بڑے امامباڑے مچھی بھون بیلی گارد کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کر چکے تھے اور تدبیروں پر ان کو ناز تھا مگر نہ بڑا امامباڑہ اس یلغار میں ان کو بچا سکا نہ مچھی بھون میں وہ آغوش مادر کی طرح بے خطر رہے یہ پبلک مقامات اور فی الحقیقت آزادی کے حامیوں کی جاگیریں تھیں ان سے فائدہ اٹھانے کا غیر کو کیا حق تھا۔ انگریزوں پر ہر سہ محاذ سے حملہ ہوا وہ افسوس ہے کہ اجتماعی نہ تھا نہ اصول جنگ کی تحت میں تھا۔ نہ سب کے سب نیک نیت تھے کچھ صرف لوٹ مار کے لئے امن کو برباد کر رہے تھے جو سچے محب وطن تھے بھی وہ اصول جنگ سے ناواقف تھے منظم نہ تھے ان کی طاقتیں ہر چہار طرف پراگندہ تھیں وہ بیک وقت مچھی بھون اور بیلی گارد دونوں پر حملہ کر رہے تھے اور مستقبل کی ان کو خبر نہ تھی رہ رہے ہے انگریز ان کی یہ

---

[1] تاریخ اودھ نجم الغنی ج ۴ ص ۸۴ [2] ص ۷۵ ء

تمام کمزوریاں جانتے تھے مگر ہندو مسلم اتحاد سے مرعوب تھے ۔

پہلا حملہ قلعہ مچھی بھون پر :- وہ انگریز جو اپنے تدابیر سے اودھ میں قدم جما کر مستقبل میں شہنشاہیت کے خواب دیکھ رہے تھے اور ان کو اس کی تعبیر مل جانے کا یقین تھا ان پر پہلی یلغار نہتے شہدوں کی طرف سے ہوئی یہ بھی کوئی جنگ تھی ان کی بالکل لومڑیوں کی حیثیت تھی شیروں کے بیشہ میں ایک مورخ لکھتا ہے ۔

لکھنؤ میں شہدوں کی جماعت دو فرقوں میں تھی ایک فرقہ عرصہ دراز سے ملازم کوتوالی عہد شاہی چلا آتا تھا اور بجائے آلات (حرب) ایک لٹھ ان کے ہاتھ میں رہتا دوسرا غول بازاری تھا جس کی روٹی اس انعام واکرام میں محدود تھی جو سواری امرا میں پھینکا اور لٹایا جاتا تھا ۔ یہ دونوں فرقہ دارانہ طور سے حوالی رومی دروازے میں جو قلعہ مچھی بھون کا بڑا پھاٹک مقرر کیا گیا تھا رہا کرتے تھے جب فوج نے حکام انگریزی کو حصار میں کر دیا ان دونوں گروہ شہدوں نے محاذی رومی دروازے پر اپنا مورچہ قائم کر لیا ۳ر جولائی کو وقت شب مردمان روندگشت شہدوں کے مورچہ پر پہونچے شہدے کمال استقلال کے ساتھ اپنی آوازوں کا آوازہ کھینچ کھینچ کر مار مار کا شور و غل مچا رہے تھے جب مردمان روند نے دیکھا اپنے مقام سے قدم آگے بڑھایا ترہی و قرنا نوازوں نے اس حال کو دیکھ کر ترھی اور قرنا سے کڑکھا مار مار کا آوازہ خوب بلند کیا جس کے سبب سے محافظان قلعہ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ ہنگامہ اور حملہ اس تھوڑی جماعت موجودہ سے رک نہیں سکتا لہٰذا انھوں نے اس سرنگ کو جو ایسے وقت کے واسطے راستے پر تیار کر رکھی تھی آگ لگا دی جس کی آواز اور دھمک سے تمام شہر میں زلزلہ پڑ گیا اور خود مع ضروریات حرب و ضرب وغیرہ جو اس وقت ممکن تھا اپنے ساتھ لے کر بیلی گارد میں صحیح و سلامت جا پہونچے اور یوں بھی سنا گیا ہے کہ صاحب چیف کمشنر بیلی گارد میں محصور ہوئے تھے محافظان قلعہ کو چھوڑ دینے کا حکم ہوا جس کی تعمیل میں قلعہ چھوڑا گیا ۔ ہم پیپے بارود اور سات لاکھ کارتوس جنگی میں آگ دے دی ۔" دوسری تاریخ میں مچھی بھون اڑانے اور بیلی گارد پہونچنے کا حسب ذیل الفاظ میں ذکر ہے ۔

لارنس نے مقیمان مچھی بھون کو حکم بھیجا کہ بوقت شب مقام مذکور کو خالی کر کے اڑا دو اور مقام رزیڈنسی میں داخل ہو ۔ آدھی رات کو فوج مچھی بھون سے تمام اسباب و خزانہ اور سامان جنگ اور توپ لے کر بغیر اتلاف نفوس رزیڈنسی میں داخل ہوئے اور ۲۰۰ ہم پیپے بارود کے اور سات لاکھ کارتوس چھوڑ دئے تھے ان میں آگ دیدی تاکہ دشمن کے ہاتھ نہ آئے یکم جولائی ایک سیل کا گولہ ۸ انچ کا اس مقام میں آیا جہاں لارنس صاحب بیٹھے تھے ان کے اور کوپر صاحب کے بیچ میں پھٹا مگر کسی کو ضرب نہ آئی ۔ دوسرے دن اسی مقام پر دوسرا گولہ پھٹا مسٹر ہنری لارنس ہلاک ہوئے اس کے بعد میجر بنگ بھی ہلاک ہوئے ۔ دوسری تاریخ نے میجر بنگس کی ہلاکت کو اس طرح نذر قرطاس کیا ہے ۔

۲۰ر اگست کو محاصرین نے محصورین پر حملہ کیا اور ایک بڑی سرنگ اڑائی اور گولہ سیل و بم سے ایک آفت ڈھائی احاطہ قلعہ کے اندر پہونچ گئے ۱۷ر جولائی کو میجر بنگس صاحب کمشنر لکھنؤ جو بعد وفات سر ہنری لارنس کے چیف کمشنر کے حصار بیلی گارد میں کام کر رہے تھے گولی بندوق سے جاں بحق ہوئے ۔ تیسرا بیان ان الفاظ میں ہے بیلی گارد میں جو ہندوستانی فوج محصور تھی اس کی بہادری اور محنت و شجاعت کی داستانوں کو انگریزوں نے بہت شہرت دی ہے لیکن شاید ہم لوگ جانتے ہیں کہ برطانوی محصورین

---

۱ احسن التواریخ ص۱۰۰ ۲ محاربہ عظیم ص۹۹ ۳ احسن التواریخ ص۱۰۱

سے مقابلہ کرنے والوں کے پاس بقول انگریز مصنفین کے نہ توپیں تھیں اور نہ توپوں کے لئے شیل اور گولہ برخلاف بیلی گارد کے حصار کے کونے کونے کی حفاظت کے لئے سیکڑوں کی تعداد میں ہر قسم کی توپیں موجود تھیں چاروں طرف اونچے اونچے دمدمے اور گھاٹیاں بنا کر اس کو ایک مضبوط قلعہ کی شکل میں منتقل کر دیا تھا سامان خورد و نوش یہاں تک کہ شراب کے قرابے اس کثرت سے تھے کہ ساڑھے چار ماہ بعد جب انگریزوں نے بیلی گارد خالی کر دیا تو بہت کثیر سامان چھوڑ دینا پڑا اس استحکام کے باوجود ہندوستانی سپاہیوں نے بیلی گارد کے دیوار و در کو چھلنی کر دیا انگریز کمانڈر جزل انگلش نے آواز بلند کی کہ ہم کو کمک نہ پہونچی تو ہم ختم ہو جائیں گے[1]۔

باغیوں نے علاوہ حملہ متفرقہ کے ایک حملہ دسویں ماہ اگست کو کیا یہ بڑی جماعت تھی اس حملے میں ایک سرنگ اڑائی جس کے صدمہ سے بیلی گارد میں سوراخ ہو گیا اور اس سوراخ سے اندر پہونچ کر حملہ کیا دیوار قلعہ پر سیڑھیاں لگا دیں اور فصیلوں پر چڑھ کے ایک قیامت برپا کی اور قریب تھا کہ اندر پہونچ جائیں مگر محصورین نے اوّل تو خوب دلیری کی اور دوسرے باغیوں کو مدد نہ ملی اور لاچار باغی بسبب نقصان اپنے مورچے پر بھاگ گئے اور ۱۸ ار اگست کو پھر ایک سرنگ اڑا کر حملہ آور ہوئے اور محصورین تک پہونچ کر دیر تک[2] بازار کارزار گرم رکھا۔

رزیڈنسی کی عمارت کو انگریزوں نے لکھنؤ کی پبلک کا دست تعدی اور بغاوت ظاہر کرنے کے لئے شق شدہ دیواروں کو تار سے باندھ کر رو کا جو محرابیں پھٹ گئی تھیں ان کو سہارے دے کر تاخت و تاراج کی صورت میں باقی رکھا انگریزوں کے دل کا بخار اس وقت نکلا جب لندن سے فوج آئی اور "برن" بولا گیا اور خون کی ندیاں بہتی رہیں اس رستخیز کا ناقل ایک چوتھا مولف ہے جن کا نام ہے آغا محمد مرزا نائب ریاست گوالیار بندیلکھنڈ و اسسٹنٹ مینجر ریاست تکوئی ملک اودھ آپ بھگدڑ کے ان اشخاص میں تھے جن کے بزرگوں نے عراق کی طرف ہجرت کی۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ اس مضغۂ گوشت کا کیا حال لکھا جائے جس کے نہ زبان گویا ہو نہ چشم بینا ہو تھوڑے روز پیدا ہونے کے بعد مشہور عالم ۱۸۵۷ء کی خوفناک اور مہیب غدر ہندوستان میں پڑ جائے اور گھمسان لڑائی کا غل توپوں کی گرج، گولوں کے پھٹنے، مکانوں کے دھما دھم گرنے سے دہل دہل کر گودیوں میں دبکتا پھرے اور اپنے دلی تلاطم کو ظاہر نہ کر سکے۔ وہ شریف عورتیں جنھوں نے اپنے دروازے پر کبھی قدم نہ رکھا تھا جن کی تمام وسعت دنیا گھر کی انگنائی پر محدود تھی۔ پیدل بھاگتا جس کے وہم و خیال میں بھی نہ آتا تھا اس کو تمام مال و متاع پر ترجیح دے کر اپنے گلے کا ہار بنائے با چشم پر آب و دل بیتاب گرتی پڑتی جل تو جلال تو کمال تو آئی بلا کو ٹال تو کہنا لکھنؤ کا کوری وغیرہ مواضعات کی طرف لے بھاگیں۔ پھر خدا جانے کتنی مصیبتیں جھیل کر کراچی بندر سے بغلہ (دریائی جہاز) پر بیٹھ کر سمندر کی جان جوکھوں طوفان سے گذرتی مسقط بصرہ وغیرہ ہوتی ہوئی نجف اشرف اور وہاں سے کربلائے معلی پہونچا دیں[3]۔

بیلی گارد میں ایک خوبصورت مسجد اور شاندار امامباڑہ بھی ہے جو نیم منہدم صورت میں رہا اور پہلو میں قبرستان ہے اور ان افسران فوج کی قبریں ہیں جن کی قربانی انگریزوں کے نزدیک اہم تھی پتھروں پر ان کی بہادری کے کارنامے بھی کندہ ہیں۔

لوہے کا پل اسی عمارت کے محاذ میں دریائی حصے پر بننے والا تھا مگر یہاں کی زمین ریتیلی تھی انجینئر نے اس مقام پر کام شروع کیا جہاں کہ اس وقت ہے بیلی گارد کے مغربی پھاٹک کے سامنے ایک گول پایہ پل پر نصب کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا جو اب تک وہاں

---

[1] نیا دور اگست ۱۹۵۶ء ص۳۵ [2] احسن التواریخ ص۳۰ [3] تذکرہ کربلا چھاپ منشی نولکشور

موجود ہے۔

تکیہ بھیم سُر

نصیر الدین حیدر بہادر کا زمانہ ولیعہدی میں نکاح سلیمان شکوہ کی لڑکی کے ساتھ ہوا تھا اور شفیق باپ نے بیلی گارد سے قریب قبرستان سے ملحق کئی لاکھ روپے صرف کر کے ایک عالیشان قصر بنوا دیا تھا جس میں آپ نو عروس کے ساتھ رہتے تھے۔

مبارک منزل:۔ یہ زرد کوٹھی کا نام ہے جہاں منّا جان کو ٹھہرایا گیا تھا یہ عمارت بھی سفارت خانہ سے قریب تھی شاہ غازی الدین حیدر نے اس کوٹھی کو تیار کرایا۔

عنایت باغ

عہد شاہی کا خوبصورت باغ جو بیلی گارد سے قریب تھا تاریخوں میں اس باغ کا بار بار ذکر آتا ہے اور صراحت نہیں ہے کہ مالک کون تھا بعض مورخین نے پتہ دیا ہے کہ میاں آفرین علی خاں عہد خاص نواب آصف الدولہ نے ایک باغ لگوایا جو احاطہ ملکہ زمانی سے بیلی گارد تک چلا گیا تھا اور آفرین علی خاں کا سکونتی مکان بھی اسی باغ میں تھا اس باغ میں نواب ممتاز الدولہ بہادر نے بھی عرصے تک سکونت اختیار کی اور جب شہر میں فوج داخل ہوئی تو آپ گنگنی شوکل کے تالاب پر نقل مکان کر کے تشریف لے گئے۔ عنایت باغ کے داروغہ کا نام قاسم بیگ تھا شیخ تصدق حسین حنفی کی رائے ہے کہ عنایت باغ میں ڈاکٹر رام لال چکرورتی کی کوٹھی تھی جہاں اب بھاٹیہ صحت گاہ ہے باغ کے بانی یعنی آفرین علی خاں اور معتمد الدولہ سے رنجش رہا کرتی تھی جس تاریخ میر فضل علی ان کو نائب بنانے والے تھے اسی شب کو آفرین علی خاں مرگئے ان کا قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

چو محمد آفریں رحلت از ایں عالم نمود — مدفن او شد بخاک آستان شاہ دیں
چو نمودم فکر بہر سال تاریخ وفات — ہاتفے گفتا کہ ہے ہے کرد رحلت آفریں ۱۲۳۳ھ

کربلائے تالکٹورہ پہلوئے میر خدا بخش میں مرنے کے بعد ان کو جگہ ملی۔

چو لکّھی

لکھنؤ کی وہ مشہور عمارت جس کا نام بچہ بچہ جانتا ہے اس قصر معلیٰ کو نواب عظیم اللہ خاں باربر خاندان شاہی نے بنوایا اور مشہور ہے کہ کانپ چونا میں عطر ملایا گیا ہے ایک تاجر بیش بہا عطر لے کر آیا تھا جس کی دربار اودھ میں شنوائی نہ ہوئی مایوس ہو کر جا رہا تھا عظیم اللہ خاں کا سامنا ہو گیا انھوں نے کنٹروں کو مصالحے کے تغار میں انڈلوا دیا اور حوصلے کے مطابق قیمت دی لوگوں نے کہا کہ عظیم اللہ خاں تم نے گستاخی کی شاہی سرکار سے جو عطر ساز پلٹا تھا اس کو خریدنا اچھا نہ تھا جواب دیا کہ میں نے یہ اقدام بالکل عقیدتمندانہ کیا وہ اپنے گھر جا کر یہ کہے گا کہ بادشاہ تک تو رسائی نہ ہوئی ان کے نائی نے عطر خرید لیا اور میری ہمت سے زیادہ انعام دیا یہ بات ظل اللہ کے یہاں سودا ہو جانے میں نہ تھی۔

کوٹھی بن کر تیار ہوئی واجد علی شاہ کا گذر ہوا عمارت دیکھ کر سواری روکی عظیم اللہ خاں گھبرائے ہوئے رومال پر نذر دینے کے لئے سامنے آئے اور آداب کورنش بجالائے ظل اللہ نے پوچھا یہ کوٹھی مجھے پسند ہے کتنا صرف ہوا ہے عرض کیا چار لاکھ، خزانچی کو حکم

ؔلہ تاریخ نجم الغنی ص۱۵۰ ج ۴

ہوا اور قیمت ادا کرکے خدام دولت نے چاہا کہ بڑے بڑے آئینے یا جو کچھ سامان آرائش ہے وہ بھی لے لیا جائے۔ بادشاہ کو جب علم ہوا تو سارا سامان جو ڈیڑھ لاکھ کا تھا واپس کر دیا اور فرمایا میں نے قیمت عمارت کی ادا کی نہ کہ آراستگی کی بادشاہ نے نام اس بلڈنگ کا "معشوق منزل" رکھا تھا۔ مگر چار لاکھ کے وزن نے نام مشہور نہ ہونے دیا اور شہرت اسی چولکھی کو رہی۔ اس عمارت کے پھاٹک اور دروازے اس قدر چوڑے اور چکلے تھے کہ ہاتھی مع ہودے کے اندر آجاتا تھا اس عمارت میں خاص محل یعنی والدہ برجیس قدر بہادر رونق افروز تھیں گو یا عمارت باقی نہیں ہے تعزیہ خانہ کا کچھ حصّہ موجود ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ فرنچ اسٹائل کے کھمبے تھے حضرت محل لکھنؤ چھوڑتے وقت اس عمارت سے برآمد ہوئیں۔

عظیم اللہ خاں نے اپنی رسائی بخت سے جو عزتیں حاصل کی تھیں[له] اس میں یہ بھی شرط تھا کہ پنشن داروں کو ان کے ہاتھ سے روپیہ تقسیم ہوتا تھا عہدنامہ میں ان کے اختیارات کا ذکر ہے فقرہ جلشن اور امامن ان کی دو بیبیاں تھیں جن کو وہ پچاس پچاس روپے ماہوار دیتے تھے۔

غدر کے بعد یہ کوٹھی بارہ ہزار روپے کو فروخت ہوئی اور انگریزوں کے زمانے میں پرنس مرزا والا قدر مرحوم نے خریدی۔ انگریزی حکومت میں اس علاقے میں والا قدر روڈ کا پتھر اب تک لگا ہوا تھا آپ چشم و چراغ تھے مرزا کیواں جاہ ولیعہد حضرت نصیر الدین حیدر بہادر کے جو علوم مشرقیہ کے ماہر اور ہندی کے استاد تھے۔

(نوٹ) عصر شاہی کے کاغذات میں ہندی کی لفظ اردو کے معانی میں استعمال ہوئی ہے چنانچہ بچوں کی دینی تعلیم کے سلسلے میں اس وقت بعد حمد فارسی کے مقابل میں جو نام آتا تھا "بعد حمد ہندی" اس کا مطلب یہ تھا کہ بعد حمد اردو اور اس کتاب کا پہلا مصرعہ یہ تھا "اوّلا تو کہہ زباں سے نام خدا" ہم نے جو کیواں جاہ کے لئے دعویٰ کیا ہے کہ وہ ہندی کے ماہر تھے اس کا مطلب یہ ہے کہ عصر حاضر کی ہندی وہ سو برس پہلے جانتے تھے ان کا کلام جو ایک دوہے کی صورتوں میں ہے ملاحظہ ہو ؎

تم کا دیکھ چاند چھپ جات ہے لے کدر سائیں ۔۔۔ ماس ماس لیت ہے جنم پر ہو وت تم سا ناہیں

حمد و نعت میں ان کا نمونۂ سخن دیکھئے ؎

کریم رحیم اور داتا تجھ کو سب ہی کا رب جانا ۔۔۔ چاہئے تھا جاننا جو وہ نہیں پہچانا
داتا تو کرتار تو اور ہے سرجن ہار ۔۔۔ کوئی تجھ کو رب جپے اور کوئی پالن ہار
بدیا نہ ہاتھ بل کام کرے نہ کوئی ۔۔۔ کرم کئے بن ترے بدھنا کچھو بھلا نہ ہوئے
ایک دھیان سے منو بنایا کرنے کو یہ دھیان ۔۔۔ ایک آدم سے لاکھوں دم ہیں اسی طرح سے جان
ایک آنکھ سے ایک دکھایا دونوں سے بھی ایک ۔۔۔ ہر ایک کو سمجھایا الگ کر تم جا تو ہر ایک
پربت آوے جنگل آوے نینوں بیچ سمائے ۔۔۔ تل دھرنے کی جگہ میں اپنی قدرت یوں دکھلائے
گنی دھنی اور گیانی چاتر کہنے کو ہیں نام ۔۔۔ گھٹتی گھام بڑھا سکیں نا بڑھتی کو لیں تھام
سوچ سے سب کے بڑھ کر تجھ میں او بہت سے بل ۔۔۔ پل کو چاہے جگ کر دے اور جگ کو چاہے پل

له عہدنامہ ص۱ طبع نولکشور

دوست خدا کے چودہ معصوم ان بڑے سہارے   وہ سب ہیں گے آقا ہمارے داتا کے ہیں پیارے

اشعار طولانی ہیں میں نے سلسلہ تو ڑ کر کچھ شعر لکھے ہیں قدر تخلص تھا جس کو اوپر کے شعر میں "کدر" نظم کیا ہے معنوی لحاظ سے "کدر" میں فروتنی اور خاکساری کا بھی پہلو ہے۔

نواب والا قدر کے زمانے میں چولکھی میں بارہ سو ملازم باہر اور آٹھ سو عورتیں اندر نوکر تھیں مدار المہام کا عہدہ مولوی مرزا رضا علی صاحب مرحوم مناظر کو عہد نواب وزیر مرزا تک سپرد رہا اور عالم پر کوئی حاکم نہ تھا۔

حکایت:۔ چولکھی کی امیر زادیوں اور رؤسا کو مرزا دبیر صاحب سے بڑا اخلوص تھا اور مرزا صاحب بہت ہی غریب پرور فیاض واقع ہوئے تھے جو کچھ خود کماتے تھے نادار طبقے پر بانٹ دیتے تھے اور جب کچھ نہ ہوتا تھا تو رئیسوں کو سفارشی رقعہ لکھتے تھے خود ان کی ڈیوڑھیوں پر جاکر زبانی مدد کراتے تھے ایک میر صاحب نے مجبور کیا کہ ان کی لڑکی کی شادی میں چولکھی میں چلکر سفارش کردیں کنیا کا معاملہ اٹھ کھڑے ہوئے پالکی میں بیٹھے نخاس سے قیصر باغ تک سواری گئی کہاروں نے حسب عادت چیخ کر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا جنھیں نہ بھی معلوم تھا وہ تاڑ گئے کہ کوئی مہمان آرہا ہے مرزا صاحب پالکی سے اترے بیگمات بیشتر اوقات میں بزرگان دین اور عالم و فاضل سے خود بات کرتی تھیں خواجہ سرا یا کنیزیں درمیان میں نہ ہوتیں اُوٹ رکھا گیا۔ صاحب سلامت مخلصانہ کے بعد مرزا صاحب خاموش تھے بیگم نے خود پوچھا۔

پردہ سے:۔ کہاں تکلیف کی؟

مرزا صاحب:۔ مجھے یہ سید صاحب لائے ہیں ان کی لڑکی کی شادی ہونے والی ہے بہت نادار ہیں۔

بیگم صاحب:۔ جو کچھ فرمایئے حاضر ہے۔

مرزا صاحب:۔ آپ خود ہی جو مناسب ہو عطا کریں یہ سید قابل احترام ہیں اگر آپ زیادہ مرحمت کریں اور میں کم عرض کردوں تو اولاد رسولؐ کا نقصان ہوگا اصرار کی پرانی عادت اور سرشت مزاج ہے کہ جو کہہ دیں وہی ہو۔ علیا مکرمہ نے وہی فرمایا جو پہلی مرتبہ کہہ چکی تھیں اور مرزا صاحب نے احترام میں سادگی سے کہہ دیا کہ جو کچھ آپ پہنے ہوں وہی اتار دیجئے۔ مرزا صاحب سمجھے تھے کہ گھر کی میلی پوشاک میں نہ بیگم کو کچھ عذر ہوگا نہ میں نقصان رساں ثابت ہوں گا ان کے جسم کے کپڑے وہ ہوں گے جس سے سید کا صرفہ نکل آئے گا وہاں لڑکی کی قسمت چمک رہی تھی علیا مکرمہ کہیں سوار ہو رہی تھیں پوشاک بدل چکی تھیں مرزا دبیر کو پردے کی آڑ میں اس کی کیا خبر تھی خادمہ کو اشارہ کیا وہ چادر لائی اور اپنے تمام کپڑے اتار دیئے اور زیور اتار دیا اور آخر میں مرزا صاحب سے معذرت کرتی ہوئی اجازت چاہی کہ کہیئے تو ناک میں کیل رہنے دوں یہ سہاگ کی شئے ہے مرزا صاحب نے دل و جان سے قبول کیا خادمہ جو دست بقچہ لائی تو وہ جوڑا تھا جو چشم مردمے نہ دیکھا تھا قسمت کے قائل ہوگئے یہ خبر بجلی کی طرح شہر میں دوڑ گئی ایک دوسرے رئیس نے دس ہزار روپیہ بھیج کر وہ گہنا پاتا اور پوشاک خریدلی بہت دنوں کے بعد ان رئیس کو روپے کی ضرورت پڑی اور زیر جامہ کا کمر بند ۲۶ ہزار روپے پر رہن ہوا۔

افسر بہو کا چولکھی میں قیام:۔ محافظ خانہ لکھنؤ میں داروغہ نزول کی ایک رپورٹ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصر عالیشان میں افسر بہو صاحبہ زوجہ سرفراز الدولہ ہمشیرہ واجد علی شاہ ٹھہری تھیں داروغہ لکھتا ہے۔

افسر بہو ایام بلوہ میں ہمراہ بیگم باغیہ (حضرت محل) چوکھی میں رہیں اور داروغہ بیگم مسمات شیریں ان کے ساتھ تھی اور جب بیگم باغیہ شہر سے فرار ہوئیں تو یہ بھی ان کے ساتھ تھیں یہ شنیدہ نہ دیدہ بلکہ مثل دیدہ ہے کہ اوّلاً بیگم کے ساتھ رہیں بعدہٗ ڈپٹی بخش کے گھر میں رہیں اور اس کی ماں نے بہت مدارات کی جب لشکر لاٹ صاحب بہادر کا واسطے قتل باغیوں کے ادھر آیا تو افسر بہو ساتھ ڈپٹی بخش کا چھوڑ کر داخل شہر ہوئیں یہ نہیں معلوم کہ کس کے پروانہ کے سبب سے یہاں داخل ہوئیں رپورٹ ۲۰ ۱۸۵۸ء کی ہے۔

نواب والا قدر کو موسیقی میں بھی کمال تھا اور ٹھمری اس خوبی سے کہتے تھے کہ سلطان عالم کے بعد انھیں کے شعر درجۂ شہرت تک پہونچے۔ بندادین ایک دن مجرا کر رہا تھا معراج پر جانا اور قرآن شریف کھولنے کو بتایا اور طالب داد ہوا۔ نواب نے فرمایا غلط بندادین نے دوبارہ موجود دا کیا پھر حضور نے کہا غلط، مر بارہ نئے انداز سے واقعہ کی ترجمانی ہوئی شاہزادہ بلند اقتدار نے پھر غلطی پر ٹوکا اس نے کہا اب حضور سمجھا دیں۔ نواب نے کہا قرآن شریف داہنے ہاتھ سے کھولا جاتا ہے اور داہنے صفحے سے سطروں کی تلاوت کرتے ہوئے نظر بائیں جانب پہونچتی ہے تم غلطی یہ کرتے ہو کہ بائیں ہاتھ سے کھولتے ہو بندادین قائل ہو گیا۔

تارہ والی کوٹھی

یہ کوٹھی قیصر باغ کے دروازہ شمال و مشرق پر بڑی عالیشان صورت میں موجود ہے اس کو شاہ نصیر الدین حیدر نے اپنے شہرۂ آفاق رصد خانہ کے لئے بنوایا کپتان ہربرٹ سترہ سو روپے ماہوار پر نوکر ہو کر انجینیری کے فرائض ادا کرتا تھا ہربرٹ کے مرجانے کے بعد کرنیل ولکاکس نے یہ خدمت انجام دی اور ساڑھے چار لاکھ روپے میں عمارت بن کر تیار ہوئی شاہ نے چودہ پارچہ کا خلعت دیا اس رصد خانہ میں مولوی اسمٰعیل شہید طالب علمی کے زمانے میں داخل ہوئے اور دس سال میں کواکب و سیارگان کا معائنہ کرکے رپورٹ تیار کی اور بادشاہ کی طرف سے سات ہزار روپے مرحمت ہوئے طباعت کے لئے مگر ۱۸۴۷ء میں مولوی صاحب مرگئے اور نئے بادشاہ نے اس اسکیم کو ختم کر دیا اس کوٹھی میں اس وقت اسٹیٹ بنک ہے اونچی اونچی دیواریں، وسیع ہال، خوبصورت اور کشادہ کمرے نئی طرح کی کھڑکیاں بلند سقف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اور جو آلات ریاضی بادشاہ نے فراہم کئے تھے جس کی بنا پر نام تارہ والی کوٹھی ہوا اب نہیں ہیں وہ دوربین جو تارے دکھاتی تھی تلف ہو چکی۔[1]

اس کوٹھی کو غدر ۱۸۵۷ء کے حملہ اور جنگ آزادی سے گہرا تعلق ہے حضرت بیگم والدہ برجیس قدر بہادر نے جب شاہزادہ کی سلطنت کا اعلان ہونے پر تعلقہ داران اودھ کو طلب کیا تھا تو یہ معزز مہمان اسی کوٹھی میں ٹھہرائے گئے تھے اور اتحاد عمل پر ایک عہد نامہ مرتب ہوا تھا جو بخیال طول نہیں لکھا جاتا۔ اس عہد نامہ[2] پر مقیم الدولہ راجہ نواب علی خاں قیام جنگ راجہ جوت سنگھ چردہ راجہ گور بخش سنگھ رام نگر، تجمل حسین خاں بھٹوامئو، راجہ عباد علی خاں تعلقہ دار بہرہ ڈپٹی کاظم حسین خاں بھٹوامئو، مادھو بخش سنگھ لاپور، ٹھاکر گمان سنگھ کی دستخطیں تھیں۔ دوسری نومبر ۱۸۵۷ء کو اس کی تکمیل ہوئی اور بیگم نے کل تعلقہ داروں کو انگریزوں سے مقابلے پر آمادہ کیا اور سب کے سب محصورین بیلی گارد سے لڑنے پر تیار ہوئے اور ہر ایک نے مورچے باندھے نبی بخش خاں کا مورچہ آہنی دروازے کے برابر تھا مہینوں شب و روز مورچوں پر سے توپ اور بندوق چلا کی نبی بخش خاں وغیرہ تینوں بھائی کئی مہینے

---

[1] قدیم جنتر ص٦٦ [2] آ یادگار ص۱۹۱

لکھنؤ میں رہے۔

جب داخلۂ[1] فوج انگریزی کی دھوم شہر میں ہوئی عالم باغ سے لڑائی شروع ہوئی ۲۶ صفر روز جمعہ مطابق ۲۵ ستمبر ۱۸۵۷ء دس بجے دن کا وقت تھا کہ بیگم صاحب کے یہاں سے چوبدار تارہ والی کوٹھی میں واسطے طلبی تجمل حسین خاں وغیرہ کے پہونچا۔ یہاں دسترخوان بچھا ہوا تھا سب ہاتھ دھو کے لقمہ اٹھایا چاہتے تھے کہ دوسرا آدمی پہونچا تار بندھ گیا بیگم صاحب کا پیام آیا کہ جب میرے جھوٹے گوروں کے ہاتھ میں ہوں گے تب وہاں سے چلوگے سنتے ہی اس کام کے تینوں بھائی دسترخوان سے اٹھ کھڑے ہوئے ہتھیار لگا گھوڑوں پر سوار ہو ہمراہیوں میں سے کچھ آدمی فرودگاہ پر چھوڑے کچھ بیلی گارد کے مورچے پر باقی قریب دو سو نفر ساتھ لے کر در دولت پر آئے۔ ممو خاں نے بیگم صاحبہ کی جانب سے حکم فوج انگریزی سے مقابلے کا دیا اور دس ہزار روپیہ بغرض مصارف جنگ پیش کیا بنی بخش خاں وغیرہ نے روپیہ لینے سے انکار کر دیا اور وہیں سے جانب ناکہ ہنڈولا روانہ ہوئے۔

مولوی احمد اللہ شاہ:۔ جنگ آزادی کے مجاہدوں میں تارہ والی کوٹھی کے قریب ذکر ہے (۱) مولوی احمد علی چنیا پٹن مدراس کے رہنے والے تھے جن کی عمر ۱۲۷۰ھ کی پیدائش کے حساب سے ستر برس تھی احمد اللہ شاہ لقب تھا مزاج میں صوفیت تھی سلطنت پر غیر مسلم تسلط سے جہاد واجب ہونے کا فتویٰ دیا اور اس دلیری سے کہتے لوگ ان کو دلاور جنگ کہنے لگے فیض آباد، لکھنؤ، شاہجہاں پور جب دورہ پر نکلے تو نقارے کی آواز پر لوگ جنگ کے لئے جمع ہوتے تھے تقریر میں غضب کا اثر تھا اپنا نشان جنگ انہوں نے چپاتی بنایا تھا ۲۲ ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق ۵ جون ۱۸۵۸ء کو پوایاں ضلع شاہجہاں پور[2] میں لڑ کر مر گئے، موضع جہان گنج میں ان کا مرقد ہے۔

(۲) عبد الحلیم شرر لکھتے ہیں کہ جب ڈنکا شاہ[3] نے لکھنؤ پر دھاوا کیا تو ان کا قیام اسی کوٹھی میں تھا کچھ تعجب نہیں اگر ڈنکا شاہ سے مراد احمد اللہ شاہ ہوں۔

(۳) بیباک شاہ کا بھی تارہ والی کوٹھی کے سامنے ڈیرا تھا اس فقیر کامل کے بارے میں اس زمانے کا یہ نوٹ ملاحظہ ہو۔ بظاہر خرقہ اور جبہ نہیں عریانی لباس ہے کسی شخص نے جاڑے کی گزند ان پر نہ پسند کی اپنا لبادہ اوڑھنے کو دیا وہ خادم کے حوالے کیا ہر دم وہاں مجمع ہوتا ہے خلق کی کثرت سے میلہ رہتا ہے مشہور ہے کہ کریم شاہ ایسولی میں جو تھے ان کے یہ دیکھنے والے ہیں ان کا یہ قول ہے کہ بے استرداد سلطنت یہاں سے[4] نہ جاؤں گا بادشاہ کو تخت پر بٹھاؤں گا۔

انگریزی فوجیں جب ۲۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو چار باغ پہونچ گئیں یہاں ایک بار پھر ہندوستانیوں نے دشمن کو شہر میں داخل ہونے سے روکا سیکڑوں ہندوستانی سورماؤں کے کام میں آنے کے بعد پل غازی الدین حیدر کی نہر کو عبور کیا اور بنارسی باغ پہونچکر حضرت گنج اور سکندر باغ ہوتے ہوئے تارہ والی[5] کوٹھی کے سامنے انگریز پہونچ گئے۔

انگریزوں کے تسلط پر غلام رضا خاں شرف الدولہ گیارہ دن تک اسی کوٹھی میں قید رہے اور ان کو لپنے پھانسی دئے جانے کا یقین تھا مگر کاربنگی صاحب کی توجہ سے رہا ہوئے اور یا وری قسمت سے پھر مستاجری اور کارفرمائی پر منجانب انگلش معتمد ہوئے۔

---

[1] آثار یادگار ص۱۳ و ۱۲۱
[2] نیا دور بابت اگست ۱۹۵۶ء
[3] گزشتہ لکھنؤ ص۲۴
[4] اخبار طلسم ۵ دسمبر ۱۸۵۶ء
[5] نیا دور اگست ۱۹۵۶ء ص۳۶

چھتر منزل

یہ عمارت نصیر الدین حیدر بہادر نے محلات کے لئے تعمیر کی تھی جو دریا کے کنارے ابھی تک اپنی شان و شوکت کے ساتھ موجود ہے اصل عمارت اور جوابی قصر دونوں پر سنہری چھتر نصب ہے اور یہی وجہ اس عمارت کے چھتر منزل نام قرار پانے کی ہے یہ بلڈنگ سہ منزلہ ہے اور چوتھی منزل پر اونچی اور وسیع برجیاں ہیں اندرونی کمرے بہت چوڑے چکلے نئے انداز کی ساخت بالائے بام سے دریا اور شہر کا منظر، اساس عمارت میں تہ خانہ اور سرنگ عمارت کے خاص اجزاء ہیں انگریزوں کے زمانے میں یونائٹیڈ سروس کلب مدت تک رہا۔ سلطان عالم کے کلکتہ جانے کے بعد چھتر منزل میں مقیم شہزادے اور شاہزادیوں کو انگریزوں نے بڑی بے دردی اور بے عزتی کے ساتھ ۲۴ گھنٹے میں تخلیہ کر دینے کا حکم دے کر نکالا گورے زنانخانے میں در آئے ایک ایک کو پکڑ کے باہر کیا سامان سڑک پر پھینک دیا[1] اس ظالم برتاؤ کے بعد گزشتہ دور سے اس وقت تک عمارت مذکور میں مختلف دفاتر اور کلب رہنے کے بعد اس وقت CENTRE DRUG RESEARCH INSTITUTE ہے حکومت کے استعمال میں رہنے سے پبلک کو اس عمارت کی سیر کا موقع نہیں ہے مجھے ایک بار عمارت مذکورہ میں جانے کا موقع ملا اور میں نے وہ نو ایجاد مشینیں فوٹوگرافی کی دیکھیں جو اندھیرے اور بند کمروں میں تصویر کھینچنے کے لئے گھڑی دیکھ کر کام میں لائی جاتی ہیں اور برخلاف عمومی کمرے کے تصویر اترنے میں تاخیر ہنر سمجھی جاتی ہے۔

موتی محل

یہ عمارت موتی محل اس لئے کہی جاتی ہے کہ یہاں ایک برج تھا جو موتی کی شکل کا تھا غدر میں کھد گیا اس عمارت کو نواب سعادت علی خاں صاحب مرحوم نے بسایا اور شاہ غازی الدین حیدر کی آخری قیامگاہ یہی عمارت تھی آپ اس محلسرا میں اپنی حیات کے آخری لمحات میں رہے دستوں کی شکایت میں آپ کی موت ہوئی خاص محل سے ناموافقت تھی بیگم حالت نازک سنکر مع اپنی نواسیوں کے تشریف لائیں مگر ظل اللہ نے بات نہ کی دوشالہ منہ پر کھینچ لیا ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ ۶۵ برس کی عمر میں جام حیات لبریز ہوا دیوالی کے دن کا یہ حادثہ ہے۔ جنازہ دھوم سے اٹھا افواج اور ارکان سلطنت ساتھ تھے وقت عمر شاہ نجف میں دفن ہوئے ناسخ کے تاثرات وفات شاہ پر ملاحظہ ہوں ؎

از وفات جناب شاہِ زمن — گویا عالمے ہلاک شدہ
دہر گردید ہمرہ دوزخ — بہ بہشت آں جناب پاک شدہ
دیدہ باشد بماتمش نمناک — سینہا آہ دردناک شدہ
رفت داماں صبر از دستم — جیبِ صبر و شکیب چاک شدہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ موتی محل سے فیض آباد تک سرنگ ہے جس میں روشنی ہوا تمام سہولتیں بہم کی گئی ہیں شیعہ کالج کی تحریک میں پہلا جلسہ موتی محل ہی کی عمارت میں ہوا اور یہ شعر موتی محل کی تاریخی خصوصیت کا مظہر ہے ؎

شیعہ کالج کی ذرا تاریخ پر کیجے نظر — جلسۂ موتی محل کچھ یاد ہے المختصر۔

---

[1] نیا دور بابت اگست ۱۹۵۶ء صفحہ ۳

امامباڑہ قدسیہ بیگم :۔ شاہ نصیر الدین حیدر بہادر کی بیگم نے چھتر منزل کے قریب ایک امامباڑہ بنوایا تھا جو غدر ۱۸۵۶ء میں انگریزوں کے ہاتھ سے برباد ہو گیا۔

(نوٹ، شاہ منزل اور مبارک منزل موتی محل کے جانب شمال تھی ۔

سکندر باغ

سلطان عالم نے ولیعہدی کے زمانے میں سکندر بیگم کے ساتھ عقد کر کے ان کے لئے جو باغ بنوایا تھا اس کا نام سکندر باغ ہے تاریخ نے باغ کی اہمیت اور غدر ۱۸۵۷ء کا مورچہ ہونے سے بار بار اس گارڈن کا نام قلمبند کیا ہے مگر یہ نہیں واضح ہو سکا کہ باغ کی کیا خصوصیت تھی ۔

واجد علی شاہ نے تخت سلطنت پر بیٹھنے کے بعد حبیبۃ السلطان مکرمت الزمانی کا خطاب دیا اس محبوب محل کے لئے جو کچھ بھی باغ میں اہتمام نہ ہوا ہو وہ تھوڑا ہے باغ پانچ لاکھ روپے کی لاگت کا تھا اور تیاری کا خلعت غلام رضا خاں اور معتمد علی خاں دیانت الدولہ ثابت علی خاں اور کاشی رام مصور کو دیا۔ باغ کا ایک ایک پہلو ہر شخص نے اپنے اپنے اقدام سے تیار کرایا اس لئے سال بھر میں تیار ہو گیا اس میں ایک مسجد بھی تعمیر ہو گئی جو باغ کے بیچ میں تھی مسجد اور باغ کا عالیشان پھاٹک موجود ہے ۔ جس میں نہایت خوبصورت منبت بنی ہوئی ہے باغ سے دریا تک ایک نئی سڑک بھی بنوائی گئی تھی جس کی دونوں جانب پھل دار درخت نصب کئے گئے تھے یہ سڑک اتنی چوڑی تھی کہ تین بگھیاں بلا تکلف گذر سکتی تھیں اور پھر بھی سڑک کے دونوں پہلوؤں میں ایک ایک گز جگہ خالی رہتی تھی سکندر بیگم نے دق میں مبتلا ہو کر اس دنیا کو چھوڑا بادشاہ سے ان کے کوئی اولاد نہیں ہوئی ۔ سکندر محل کی حیات تک تو سکندر باغ ان کے قبضے اور تصرف میں رہا چونکہ ان کا کوئی وارث نہ تھا اس لئے ان کے مرنے کے بعد باغ پھر ملکیت شاہ ہو گیا اور ضبطی سلطنت کے ساتھ یہ باغ بھی ضبطی میں آگیا ۔ انگریزوں کے آخری دور میں اس باغ میں سرکاری درختوں کا ذخیرہ پودے اور گملے فروخت ہونا شروع ہوئے پرانی عمارت میں صرف مسجد اور پھاٹک رہ گیا ہے اب اس باغ کا نام نوبانیکل گارڈن رکھا گیا ہے اور لکھنؤ کے ممتاز مقامات میں سمجھا جاتا ہے پچپن کرے یہاں ہیں۔

قدم رسولؐ :۔ سکندر باغ کی ایک پرانی یادگار ہے جو عہد غازی الدین حیدر بہادر میں بنائی گئی تھی اور اس کی بنیاد کا سبب یہ تھا کہ ایک عرب سنگپارہ لایا جس پر قدم مبارک حضرت رسولؐ کا نشان تھا بڑی قدر و منزلت سے اس کا ہدیہ قبول ہوا اور ایک بلندی پر شاہ نے خوشنما عمارت بنوا کر زیارت گاہ عام قرار دیا شاہ موصوف کا زمانہ ۱۸۳۶ء تک رہا عمارت مذکور اس سے پہلے کی بنیاد ہے اور اس قدر مضبوط ہے کہ گولیوں کی بارش ہونے پر بھی منہدم نہ ہو سکی غدر کے ہنگامے میں قدم رسولؐ کا سنگ محترم تو باقی نہ رہا مگر عمارت اب تک گولہ باری کا پتہ دے رہی ہے آزادی کے حامی اور دیسی فوجوں نے اس عمارت کو بارود کا گودام بنا رکھا تھا حامیان وطن بیلی گارد کی مسجدوں میں جمع ہو کر بیلی گارد کو نقصان پہونچاتے تھے یہ راز تھا کہ انگریز انجینیروں نے ایسی تمام مسجدوں کو ٹھنڈا کر دیا حالانکہ سر ہنری کی رائے تھی کہ معبد کو باقی رکھنا چاہئے اس لئے لشکر کو یقین تھا کہ ان کی بارود کا راز افشا نہ ہوگا ۱۰ اگست کے حملے میں جب جنرل ہولاک نے حسام الدولہ اور راجہ مان سنگھ کا

۱؎ بیگمات اودھ ۲؎ بیگمات اودھ ص ۲۵۵

مقابلہ کرتے ہوئے حسین گنج میں لڑکر کوٹھیوں پر قبضہ کیا تارہ والی کوٹھی چھتر منزل قبضے میں آئی اور محصورین قلعہ سے آملے اس وقت سکندر باغ میں سکھوں کا پڑاؤ تھا اور قریب سو آدمیوں کے کھانا پکا رہے تھے اچانک لشکر آگیا اور وہ تلوار اور سنگینوں سے ایسا لڑے کہ کوئی دقیقہ شجاعت کا اٹھا نہ رکھا کمک پہونچنے پر دوبارہ ۱۶ نومبر ۱۸۵۷ء کو گھمسان کی لڑائی یہاں ہوئی۔ پورا باغ خون سے رنگین اور لالہ زار ہوا انگریز اپنی اکثریت سے کامیاب ہوئے اور بیلی گارد کی طرف پلٹے۔ قدم رسولؐ کے مٹھی بھر سپاہیوں نے بے جگری اور دلیری سے مقابلہ کیا مگر آخر میں پسپا ہوئے اور سکندر باغ پنجاب کی پیدل فوج کے قبضے میں آگیا۔

عبدالحلیم شررؔ نے عمارت کو ولایتی باغ کا جزء قرار دیا ہے قدم رسولؐ کا اس علم افروز عہد میں جو ارباب دانش سے چھلک رہا تھا نصب ہونا علماء فریقین کے ایما بغیر نہ تھا اور یہی مقبولیت کا راز تھا مگر ۱۸۵۷ء کی لوٹ میں یہ مقدس یادگار غائب ہوئی۔

حیدر آباد

اس محلہ کو غازی الدین حیدر بہادر نے آباد کیا اور تاجپوشی کے سلسلے میں بسایا گیا ناسخ نے ممدوح کی تاریخ تاجپوشی کہی ہے

شاہ اسکندر وزیر ارسطا طالیس ”کہی ہے کچھ تعجب نہیں اگر

ولایتی باغ :۔ بھی اسی علاقے میں ہو جہاں سب ولایتی پھول اور پودے تھے خوشبو عموماً ہندوستان کی قسمت میں تھی اور قسام ازل نے غیر ملکی پودوں کو صرف خوبصورتی اور خوشنمائی عطا کی شمیم سے وہ محروم رہے بیرونی چیزیں عموماً وقیع نظروں سے دیکھی جاتی ہیں اس لئے ولایتی پودوں کی وقعت تھی۔

محلسرا ممتاز محل :۔ شاہ موصوف کی بیگم ممتاز محل کی محلسرا بھی حیدر آباد میں تھی جو دریا اور نجف کے بیچ میں تھی ۱۹۱۳ء میں جب بٹلر روڈ دریا کے کنارے نکالا گیا تو یہ قصر کھد گیا اور ایک دیوار کنار دریا ۱۹۴۶ء تک باقی رہی۔

روضہ حضرت قاسم :۔ شیخ تصدق حسین اپنے مقالات میں لکھتے ہیں کہ بارہ بنکی روڈ پر جس عمارت کو عہد غازی الدین حیدر بہادر کی جنت البقیع ظاہر کیا ہے اور پولیس اسپتال اس کے سامنے ہے یہ جنت البقیع نہیں ہے اس درگاہ کی چھت تو بالکل گر گئی ہے۔ اور پچھم کی دیوار کا کچھ حصہ بھی نہیں رہا خودرو درخت اُگ آئے ہیں سرخ پلاسٹر باقی ہے جو شاید لال درگاہ نام ہونے کا سبب قرار پایا۔

اس عمارت کا جنت البقیع ہونا صحیح نہیں ہے اور یہ روضہ حضرت قاسمؑ ہے جن کی مہندی ایام عزا میں اٹھتی ہے۔

لال درگاہ :۔ روضہ کے روبرو دھنیوں سے پٹا ہوا سائبان تھا جس کے نشان دیوار میں اب تک ہیں اندر جانے کے لئے چھوٹا دروازہ ہے جو تارے بندھا ہوا ہے اور ایک چھوٹا چبوترہ اندرون حجرہ ہے جس کے گرد جالیاں لگی ہیں اور نشان مزار ہے۔ دروازوں کی جوڑیاں نکال لی گئی ہیں اور در بند ہیں اوپر گول گنبد ہے جس کی حالت ابھی تک خراب نہیں ہے پولیس اسپتال نے زیارت گاہ کے حصے کو چھوڑ کر وہیں اپنے کوارٹر بنائے ہیں اور یہ دونوں مقام ایک بلند زمین پر ہیں آج سے پہلے رقبہ وسیع ہوگا ایک واقف کار نے بتایا ہے کہ کنواں جو تخمیناً ۲۰ گز کے فاصلے پر ہے عمارت کا جزء تھا۔ ۴۰ سال پہلے اس پر قابض جھنڈے والے شاہ تھے جب وہ نہ رہے تو حسینی شاہ قائم مقام ہوئے اور آخر میں گھورو سپاہی جو بارہ بنکی کا رہنے والا تھا اس نے اس زمین پر مکان بنوالیا تھا

اور تعزیہ درگاہ میں رکھتا تھا اس کی طرف سے چہلم میں مجلسیں بھی ہوتی تھیں اور ۲۸ صفر کو تعزیہ اٹھتا تھا گڑھے اب بھی موجود ہیں جس میں کبھی اس طرف کے تعزیے دفن ہوتے تھے۔ کربلا کی تناتی دیوار کے ٹکڑے چاروں طرف پڑے ہیں اور شمالی رخ باقی ہے کچھ گھر مسلمانوں کے ہیں ایک قول یہ ہے کہ یہ درگاہ منشی اسیر مرحوم کی تیار کردہ ہے۔

شاہ نجف

رفعت الدولہ رفیع الملک غازی الدین حیدر بہادر شہامت جنگ نے ۱۲۳۲ھ موتی محل سے کچھ فاصلے پر سکندر باغ کی بغل میں شبیہ روضہ حضرت امیر المومنین بنوائی عہد نامہ ص ۱۶۴ میں امامباڑہ جدید یعنی نجف اشرف کی لفظ سے یاد کیا ہے داخلہ ایک عظیم الشان پھاٹک سے ہوتا ہے جس پر پورے قد کے دو شیر بنے ہوئے ہیں پختہ راستہ طے کرکے دوسرا پھاٹک ہے پہلوؤں میں سبزہ لگا ہے دوسرے پھاٹک میں داخل ہونے سے روضہ کی پشت جانب جنوب ملتی ہے اس دروازے میں اوقات دریافت کرنے کا گھنٹہ ہے جو باندازہ آواز سے دن رات وقت بتاتا ہے روضہ کے چاروں طرف غلام گردش ہے اور اوپر کے حصے میں بڑے قد کا خوبصورت گنبد ہے جس پر سنہری کلس لگا ہے امامباڑہ میں داخلہ شمالی جانب سے ہوتا ہے جس کے برساتی سے ایک پختہ راستہ سامنے کی طرف چلا گیا ہے آخر میں پھر ایک پھاٹک ہے پھاٹک کے باہری جانب چند ہی قدم پر دریائے گومتی لہریں لے رہا ہے اندر سنگ مرمر کا فرش ہے جس میں سفید و سیاہ چوکوں سے شطرنجی بنائی گئی ہے۔ دیواروں پر نسخ و نستعلیق کے بخط عرب و عجم طغرے کتبے قطعات فریم میں آویزاں ہیں جس سے فن خطاطی کی قدیم شان یاد رہتی ہے داخلے کے دروازوں میں صوبہ برما کی بنی ہوئی خوشنما نقشی جوڑیاں ہیں جن کے بغلی پاکھوں میں بانی امامباڑہ اور نواب سر محسن الدولہ اور نواب ممتاز الدولہ کی تصویریں فریم میں آویزاں ہیں عمارت کا سنگ بنیاد اس قطعہ سے واضح ہو رہا ہے ؎

باحسن عقیدت نجف اشرف را	فرمود بنا بہند نواب وزیر
تاریخ مبارکش چو جستم از نقل	ہاتف گفت عجب نجف شد تعمیر

دیواریں بکثرت خوشنما شیشہ آلات اور آئینوں سے مزین ہیں اور ہر قسم کے سو سو بتی والے عالیشان جھاڑوں کے درمیان زرد و نیلی و سبز رنگ کی ہانڈیاں روشنی کی تڑپ کو حد اعتدال پر قائم رکھتی ہیں امامباڑے میں داخل ہوتے ہی بادشاہ کا مرقد سامنے نظر آتا ہے جس پر چاندی کا کٹہرہ لگا ہے داہنی جانب مبارک محل کی آخری آرامگاہ ہے جس پر گنگا جمنی کام ہے اور تمام قبروں سے اس کا ساز و سامان زیادہ ہے بادشاہ کی قبر کے بائیں جانب نواب ممتاز محل بادشاہ کی دوسری نومسلم بیگم کی قبر ہے اس پر چاندی کا حظیرہ ہے اور بائیں جانب کے گوشے میں بادشاہ کی تیسری ملکہ سرفراز محل کا مدفن ہے جس پر لکڑی کا کٹہرہ ہے مبارک محل کے باپ یوروپین اور ماں انڈین تھیں۔

بادشاہ کا ایک کروڑ روپیہ جس میں سے گیارہ سو ستیس روپیہ دس آنہ آٹھ پائی ماہوار خرچ کے لئے جمع ہے مبارک محل کا قطعہ تاریخ وفات یہ ہے ؎

افسوس مبارک محل این مریم عصر	رو کرد سوئے گلشن رضوان لے ہائے
تاریخ وفات خامہ رشک نوشت	ہشتم بودہ زماہ شعبان اے ہائے

۳؍جون ۱۸۲۷ء بعہد جان عالم موصوفہ نے موت کی چاشنی چکھی شاد کی قبر پر یہ تاریخ ہے ؎

چوں رفت شہ زمن ز دنیا ماتم دل خاص و عام بگرفت
از روئے بکا و آہ گفتم حیدر بہ نجف مقام بگرفت ۱۲۴۳ھ

۱۸۵۷ء کے بلوہ عظیم میں سپاہ وطنی نے سکندر باغ اور شاہ نجف میں بھی مورچہ لگایا اور ۱۷ نومبر کو انگریزی فوج زیر کمان SIR COLIN COMPBILLY محصورین بیلی گارد کی کمک کے لئے شاہ نجف سے گذری دونوں مقاموں پر گھمسان کی لڑائی ہوئی اس ہنگامے میں شاہ نجف کا بہت سا سامان تہس نہس ہوگیا اور بلور کا ولایتی تعزیہ ٹھنڈا ہوگیا۔

شاہ نجف میں چند تبرکات قابل تذکرہ ہیں (۱) چندن کی کل مکمل ضریح (۲) آئینہ جس میں آدمی منہ دیکھنے پر سبک سلائی دبلا معلوم ہوتا ہے اس کو کیوں آویزاں کیوں کیا گیا ہے کوئی بتانے والا نہیں ہے (۳) بھدی صورت والا دوسرا آئینہ آتشی شیشے کا اس میں نظر تو آتا ہے مگر بھیانک صورت سے مشہور ہے کہ بیمار کو اس آئینہ میں منہ دیکھنے سے صحت ہوتی ہے۔

غازی الدین حیدر[۱] پہلے شخص ہیں جنھوں نے جُغرات کا نام دہی اور بالائی کا نام بالائی رکھا شب دیگ نان آفتاب اور نان[۲] کلاں جس کا وزن دو من ہوتا تھا میوہ اور قند سے تیار کی جاتی تھی ان کی ایجاد تھی۔

بنارسی باغ

اس نام کا تاریخ اودھ میں کہیں ذکر نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کے دور حکومت میں یہ نام قرار پایا پہلے اس جگہ کا نام حضرت باغ تھا۔

نگینہ والی بارہ دری :- اس وقت بنارسی باغ کا خوبصورت ترین حصہ ہے اور سنگ مرمر کی جو ایک دالان نما مختصر عمارت ہے اس میں نگینہ جڑے ہونے کے اب بھی نشانات ہیں یہ جواہر پارہ غدر میں بلوہ کرنے والوں نے لوٹے اور دیوار و در کو چیچک رو آدمی کی طرح داغدار بنا دیا اس باغ کا سال تعمیر اس قطعہ تاریخ سے واضح ہوتا ہے ؎

زہے قصر مرصع شد بحضرت باغ تعمیر انامکاں می نماید تا زبر خلد بریں ہند
پے سالش چو چشم کلک شمشیر ازیں رقم کرد شہ از بارہ دری رنگین ذیر نگین ہند ۱۲۲۹ھ

نجم الغنی نے اس عمارت کو قیصر باغ کی عمارتوں میں شمار کیا ہے مگر ہم نے اصل الفاظ تاریخ سے تمسک کر کے حضرت باغ کی عمارت تسلیم کیا ہے حضرت گنج کے باغ کا حصہ حضرت باغ تھا۔ اوپر کے بیانات میں گذرا کہ غلام رضا خاں شرف الدولہ کو فوج آزادی میں رسد پہونچانے کا عہدہ ملا تھا چنانچہ دس ہزار روپے کا غلہ نگینہ والی بارہ دری کے پیچھے بھر دادیا تھا وہ کسی کو کھانا نصیب نہ ہوا بعد فتح اسے گوروں اور سکھوں نے نوش جان کیا۔

مسجد نور محل :- شاہ نصیر الدین حیدر مرحوم کی ایک بیگم کا نام نور محل تھا شیخ تصدق حسین لکھتے ہیں کہ ان کی عالیشان مسجد بنارسی باغ میں جانب شمال واقع ہے۔

۱؎ قدیم ہنر ص۲۶ ۲؎ قدیم لکھنؤ ص۱۴۱

شیر دروازہ

قیصر باغ کے قریب وہ دیوار ہے جس کے دروازے پر دو شیر آمنے سامنے بیٹھے ہیں اس کے قریب ٹیلیفون ایکسچینج آفس ہے تاریخ میں صراحت نہیں ہے کہ بنوانے والا کون ہے؟ بے زبان اور بے روح شیروں پر وہی ہیبت ہے جو ایک بڑی ڈیوڑھی پر ہونی چاہیے دروازے کے سامنے قیصر باغ کا راستہ گرد و پیش اس وقت کوئی عمارت نہیں ہے۔

درگاہ دوازدہ امام:- نصیر الدین حیدر بادشاہ نے شیر دروازے میں فرح بخش کے قریب یہ عمارت بنوائی تھی جس میں بارہ وسیع کمرے تھے کمروں میں زربفت کے پُر کیف شامیانے آبدار موتیوں کی جھالریں لگی ہوئی چوبیں گنگا جمنی نصب تھے زمین پر رکھے ہوئے خوشنما جھاڑ جس میں ۸۰ شمعیں روشن ہوتی تھیں قیمتی اور قد آدم آئینے ہر کمرے میں نصب تھے اور طلائی و نقرئی ضریحیں عمارت مذکورہ کی تاریخی یادگار ہیں ہر امام کی تاریخ ولادت و وفات کے موقع پر اسی کمرے میں محفل و مجلس ہوتی تھی جو اس امام سے نامزد تھا فسانۂ عجائب نے اس درگاہ کے بارے میں لکھا ہے:-

"دوازدہ امام کی درگاہ ایسی بنائی کہ چرخ گردوں کو خواب میں نظر نہ آئی روز تولد ہر امام و وفات جگر بند ان خیر الانام لاکھ روپے کا صرفہ تھا۔"

ان بابرکت مقامات پر پھولوں کی بارگاہ بھی تیار کی جاتی شاہی باغوں کے پھولوں کے علاوہ پانچ ہزار روپے روز کے پھول عشرہ محرم تک بازار سے مول آتے اس زمانے میں خوشبودار پھول دولت مندوں کو بڑی مشکل سے ملتے بارگاہ کا طول اندازاً سو قدم اور عرض ۱۵، ۲۰ قدم سے زیادہ ہوتا تھا اور کبھی پھولوں کے بجائے سنہری اور روپہلی مقیشی اور بادلے اور ستاروں کی جھالر لگائی جاتی تھی عطریات سے بھی وہ مکان بسایا جاتا تھا۔ ہر امام کی تاریخ ولادت میں چھ دن تک اور تاریخ وفات میں کئی روز تک اور سید الشہداء کی شہادت کے زمانے میں چہلم تک بادشاہ نفس نفیس وہاں کی خدمت بصدق دل انجام دیتے تھے۔ اماموں کی پیدائش کی تاریخوں میں پُر تکلف اور لذیذ کھانے، مٹھائیاں اور میوے تقسیم ہوتے تھے اور نفیس کپڑوں کے جوڑے وابستگان دولت کو پہنائے جاتے تھے وفات اور شہادت کے دنوں میں مرثیہ خوانی ہوتی تھی شربت اور مٹھائی بٹتی تھی۔

تاریخ عباس کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اس عمارت کی بانی بادشاہ بیگم زوجہ غازی الدین حیدر بہادر تھیں لیکن پہلا بیان صحیح ہے۔

مسجد مکہ مسجد مدینہ:- یہ دو مقدس عمارتیں حرم خدا اور حرم رسولؐ کی شبیہ بھی اسی علاقہ اور درگاہ دوازدہ امام کا جز تھیں منشی صاحب کے پروگرام کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مؤلف لکھتا ہے۔ نماز ظہر کی جماعت میں شرکت کے بعد آپ وزارت کی کچہری کا عزم کرتے تھے کہار پہلے سے فینس لگائے رہتے تھے وہ خاص بردار دست بقبضہ شمشیر دونوں جانب فینس کے ہوتے تھے کسی مقدمے یا روبکاری میں اگر طول ہو گیا اور وزیر اعظم جلوہ افروز وزارت رہے تو خیر ورنہ مسجد مکہ مسجد مدینہ متعلقہ درگاہ بارہ امام میں نماز پڑھ کے مکان آتے تھے اور سر شام غروب کی توپ سر ہوتی تھی ادھر نقار خانہ شاہی میں نوبت سلامی

۱ مقالہ تصدق حسین ایڈوکیٹ مندرجہ الواعظ اپریل ۱۹۳۶ء ۲ تجلیات باب دوم ص۱۰

ایوان شاہی میں بجتی تھی ہائے وہ زمانہ ہائے وہ لوگ ؎

پردہ داری میکند بر طاق کسریٰ عنکبوت　　بوم نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

فرح بخش :۔ یہ کوٹھی عہد آصفی کی تعمیر ہے اپنی خوبصورتی اور شان و شوکت کے لحاظ سے ممتاز عمارت تھی پانی کی نہر کاٹ کر تہ خانے میں پہونچائی گئی تھی ۔ نواب نے جب اپنے پالک وزیر علی خاں کی شادی رچائی تو اسی عمارت کے سامنے دو خیمے تمر ملک اور قیصر فلک نصب کئے تھے اور پانچ سو چوگھڑے چاندی کے اس تقسیم میں رکھے گئے تھے شیخ ممتاز حسین جونپوری[1] کا یہ لکھنا کہ "نواب سعادت علی خاں عشرے کے دن کوٹھی فرح بخش سے فرش زمین پر بیٹھ کر دوز: نو امام باڑہ آصفی کے جلوس ضریح کی زیارت کرتے تھے جو پلکے پل پہ ہو کر جاتی تھی اور روتے جاتے تھے"۔ یہ تذکرہ افسانہ ہے۔ فرح بخش شیر دروازے سے امام باڑہ آصفی کا جلوس دیکھنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ نواب سعادت علی خاں نے اس کوٹھی کے چار چاند لگانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ۔ تاریخ کی عین لفظیں ملاحظہ ہوں ۔

عمارتیکہ بندگان عالی گرد کوٹھی مذکور تعمیر فرمودہ اند نگارستان مانی است و کوٹھی ہم بر صورت اول نماندہ است اگرچہ بیشتر ہم خوب بود لکن حالات خوب تر شد[2] ۔

یمین الدولہ نے فرح بخش کے گرد جو عمارت بنوائی ہے وہ ایک باغ ہے قلم کار اور نقش و نگار کی مدح نہیں ہو سکتی کوٹھی اگلی شکل پر نہیں باقی رہی اگر پہلے کوٹھی بہترین تھی تو اچھی سے اچھی ہے ۔

پنجشنبہ ۱۸ جمادی الاول ۱۲۲۶ھ[3] نواب سعادت علی خاں کی سالگرہ کا جشن فرح بخش میں منایا گیا۔ جناب عالی نے حاضرین کی چار پانی سے مدارات کی شاعروں نے تہنیت کے قطعے اور قصیدے پڑھے انشاؔ نے وہ قطعہ پیش کیا جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

جب تک عقد ثریا رہے انشاء اللہ　　یوں ہی پڑتی رہے یہ تا صدی سالگرہ

عہد نصیر الدین حیدر میں شاہی محلات چھتر منزل میں اور آپ خود فرح بخش میں تشریف رکھتے تھے شاہ جب کوٹھی دولت خانہ سے سرطان میں مبتلا ہو کے یہاں آئے تو صحتیاب ہوئے اور موذی مرض سے نجات حاصل کرنے پر اس کوٹھی کا نام فرح بخش ہوا۔

جنرل[4] مارٹن کی موت ۱۳ ستمبر ۱۸۰۰ء کو اسی کوٹھی میں ہوئی ۔

مکتبۂ سلطانی :۔ غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے فرح بخش میں کتب خانہ LIBRARY شاہی تھا کتب خانہ پر صلاح الدین عثمانی اپنے مقالے میں لکھتے ہیں :۔

اودھ کا شاہی کتب خانہ اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا کتب خانہ تھا جس میں دو لاکھ سے زائد کتابیں تھیں زیادہ تر مخطوطات تھے قلمی نسخے ایشیا کے ہر گوشے سے خرید کر جمع کئے گئے تھے اور دو سو آدمی نگہداشت کے لئے نوکر تھے جس پر شاہ کو لٹا تھا میجر کارنیگی کے ہاتھوں یہ اہل ذخیرہ الماریوں سے نکال کر سڑک پر پھینک دیا گیا اور اسی کے ساتھ مشرقی دستکاری مصوری اور نقاشی کے وہ نادر نمونے بھی تھے جن کا ثانی ملک میں[5] نہ تھا۔

کتب خانہ شاہی کی ایک کتاب زاد المعاد دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا اس کتاب پر سیاہی اور شنگرف کی دو مہریں تھیں عبارت

---

[1] سرفراز محرم نمبر ۱۳۵۶ھ ص ۳۷　[2] عمادت السعادت فارسی ص ۱۳۱　[3] قدیم ہنر ص ۲۰۶　[4] نیا دور بابۃ اگست ۱۹۵۶ء

مشکل سے پڑھی گئی۔

خاتم واجد علی سلطان عالم برکتا ۱۲۶۳ھ ثابت و پر نور بادتا فروغ آفتا	ایں نسخہ زعنایت سلطان عالم ۱۲۶۳ھ ثابت وتابندہ بر جملہ عالم

آصف الدولہ کے دور میں راجہ مہرا بھی اس کتب خانہ کے داروغہ قرار پاچکے تھے مہرا کی ابتدائی فارسی کتابیں ختم ہو کر عربی اور سنسکرت کی تحصیل میں بھی قدم رکھا تھا اور لائبریری کے خدمات میں اس کا تقرر ناموزوں نہ تھا۔ پہلی مہر کی عبارت یہ ہے "خاتم راجہ علی سلطان برکتاب ثابت و پر نور یاد تا فروغ آفتاب" دوسری مہر میں یہ کندہ تھا" ایں نسخہ زعنایت سلطان عالم ثابت وتابندہ بر جملہ عالمہ[۱]
مجھے خیال ہوتا ہے کہ عالم کی جگہ آدم ہو مہر اچھی طرح نہیں اُبھری ہے۔

<u>قرآن شریف</u>:۔ یہ مصحف پاک ایک ریاست میں یو۔ پی کی اس وقت موجود ہے اور اس کی وصولیابی اس طرح ہوئی کہ جب قیصر باغ لٹا تو کلام اللہ اس خدمتگار کے ہاتھ آیا جو اسی تعلقہ کا باشندہ تھا اس نے قرآن شریف تعلقہ دار صاحب کو دیا پہلی جلد میں پندرہ پارے تھے جلد اوّل ہاتھ آنے کے بعد بہت عرصہ گزر کر دوسری جلد بھی اسی علاقے میں ہدیہ ہوتے لائی گئی اور اس طرح پورا قرآن ایک مرکز سے جدا ہو کر دوسرے قدر داں کے پاس پہونچا یہ قرآن بحفاظت موجود ہے اور پہلی جلد بہتر حالت میں ہے ۔ دوسری جلد اوراق کے پراگندہ ہونے سے اچھی حالت میں نہیں سائز اس قرآن کا ۲۰ انچ طول ۱۱ انچ عرض، کاغذ دبیز حروف خوشخط اور ہر صفحہ میں چوکیاں بنا کر کتابت شطرنجی کی صورت میں کی گئی ہے حاشیے پر تفسیر شیعہ بزبان فارسی باڈر میں ہر طرف سونا چڑھا ہوا۔ رکوع پر تاج اور بیل بوٹے انتہائی دیدہ زیب اور حسین زرد سرخ نیلا رنگ جہاں جہاں دیا گیا ہے نیلم اور یاقوت زرد محلول روشنائی میں صرف ہوا ہے ہر سطر میں چار چوکیاں ہیں۔

داروغہ کتب نے مختلف اوقات میں فہرست سے مطابق کرتے وقت جو یادداشت سپرد قلم کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت داروغہ کا نام فضل الٰہی تھا اس طرح کی کئی تحریریں شوخ رنگ کی روشنائی سے ثبت ہیں۔

(۱) باہتمام فضل الٰہی ۷ ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ بجائزہ رسید (۲) ۲۹ ربیع الاول ۱۲۶۱ھ بجائزہ رسید۔ یہ تطابق پانچ برس کے بعد ہوا (۳) بتاریخ شہر صفر یوم پنجشنبہ ۱۲۶۲ھ بجائزہ رسید۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

جلد ایرانی وضع کی گلکاری میں اعلیٰ نمونہ اور سرورق کی لوح دیکھنے کے قابل ہے صفحہ اوّل پر قرآن کے بعض سرکاری نشانات اور علامات پانی سے مٹا دئے ہیں جس سے ایک سیاہ داغ بنا ہوا ہے اس قرآن کے خصوصیات میں اس سے زیادہ نقل کرتا مگر قدر داں مالک کی طرف سے بہت تھوڑی دیر کے لئے میرے دیکھنے کے واسطے قرآن مذکور لایا گیا اور واپس ہو گیا۔ کتب خانے کے ذمہ دار نگراں ۱۲۶۱ھ میں[۲] ذوالفقار خاں اور ۱۲۶۳ھ میں مصطفےٰ خاں تھے۔

۱؎ روح ادب حصہ سوم ص ۔ ۲؎ نیا دور مئی ۱۹۶۰ء

سنگی محل

عہد نوابی کی عمارت جس میں پتھر زیادہ صرف ہوا اس قصر کا تذکرہ ۱۱۹۶ھ کے واقعات میں ہے کہ جب امیر الدولہ کی تنخواہ میں ترپ سواروں نے تنخواہ کی تقسیم کے سلسلے میں جھگڑا کیا اور پنج محلہ پر یورش کا ارادہ ہوا تو نواب سعادت علی خاں بہادر نے ردن کے دن ریزیڈنسی کی فوج کو مسلح ہونے کا حکم دیا اور خان بھی مسلح ہو گئے ایک توپ توپخانے کی سمت اور دوسری سنگی محل کے دروازے پر اور تیسری حسن باغ میں اور چوتھی پل پختہ کے مقام پر نصب کر دی گئی۔ مورخ لکھتے ہیں "آں روز جناب عالی خود بنفس نفیس شمشیر حمائل و سپر تکیہ فرمودہ بودند ولیکن بخیر مرگذشت[۱]" اس دن نواب نے بھی تلوار لگائی اور سپرلے کر تیار ہو گئے تھے کہ معاملات خوبی سے سلجھ گئے۔

ٹیڑھی کوٹھی

یہ کوٹھی نواب سعادت علی خاں بہادر نے ریزیڈنٹ کے لیے تعمیر کرائی تھی اور اس کوٹھی میں نواب پرنس جہاں[۲] بخت کے ٹھہرنے کا بھی تاریخ میں پتہ ہے (علی اختلاف الاقوال) اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس کوٹھی میں امور مملکت[۳] پر غور ہوتا تھا۔

کنکروالی کوٹھی: نہ کوئی خصوصیت اس عمارت کی معلوم ہے نہ جگہ۔

مقبرہ سعادت علی خاں بہادر

یہ عالیشان[۴] اور پُرشکوہ مقبرہ قیصر باغ کے جانب شمال واقع ہے۔ نواب سعادت علی خاں نواب شجاع الدولہ کے فرزند اور نواب آصف الدولہ کے منجھلے بھائی تھے جو نواب وزیر علی خاں لے پالک آصف الدولہ کی معزولی کے بعد شروع جنوری ۱۷۹۸ء میں مسند ریاست پر جلوہ گر ہوئے اور سولہ برس تک نہایت تندہی دانشمندی اور تدبر سے حکومت کی اور اپنی سیاسی چالوں اور دور اندیشی سے مسٹر بیلی BAILLY ریزیڈنٹ اودھ کے نتھنوں میں تیر دیدیے جس سے وہ تلملا اٹھے آخر کار صاحب سلامت میں بھی فرق آگیا مگر ۱۱ر جولائی ۱۸۱۴ء کو ان کے بدخواہوں نے یخنی میں زہر دے کر ان کے رشتۂ حیات کو منقطع کر دیا بوقت رحلت ان کے بڑے بیٹے نواب غازی الدین حیدر خاص بازار سے متصل ایک بنگلے میں مقیم تھے جس کے چاروں طرف وسیع احاطہ تھا نواب کے بعد غازی الدین حیدر ان کے جانشین ہوئے تو انھوں نے فرمایا کہ چونکہ اب میں مسند اور محل پر قابض ہوا ہوں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنی قیامگاہ ان کے حوالے کردوں۔ اس خیال کے تابع حکم دے دیا کہ میرا بنگلہ منہدم کر کے اسی مقام پر نواب مرحوم کو سپرد خاک کر دیا جائے چنانچہ بنگلے کو فوراً ہی کھود کر اس کی آراضی پر نواب مرحوم کو آغوش لحد میں سلا دیا گیا اس کے بعد مدتوں پر کئی لاکھ روپے کے صرف سے ایک عظیم الشان اور خوشنما مقبرہ بھی تعمیر کرا دیا جس کے بالائی حصے کی، ایک شاندار طلائی کلس بھی نصب کر دیا گیا۔ مقبرے کے اندر اور باہر مناسب مقاموں پر قابل دید منبت کاری ہے فرش سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ کے چوکوں سے شطرنجی وضع کا بنایا گیا ہے مقبرے کے باہری جانب منبتی کام کو سفیدی سے اور باقی ماندہ حصوں کو چھوئی مٹی کے ہلکے رنگ سے پوتا گیا ہے۔

نواب کی قبر تہ خانے میں خام ہے جس کے دونوں جانب ان کے دو بھائیوں، تین بیبیوں اور تین بیٹوں کی قبریں بھی ہیں۔

---

[۱] عماد السعادت ص۱۴۴ [۲] تاریخ اودھ نجم الغنی ص۲۹۳ ج ۳ [۳] تاریخ اودھ ج ۴ ص۸۸

[۴] مقالہ شیخ تصدق حسین مندرجہ نیا دور لکھنو دسمبر ۱۹۵۶ء ص۸

ابتدا میں مقبرے کے چاروں طرف بلند دیواریں تھیں اور اس کی جنوبی دیوار قیصر باغ کی شمالی دیوار سے بالکل سمت چسپ تھی۔ مقبرے میں داخلے کے لئے ایک شاندار پھاٹک بھی جانب غرب تعمیر کیا گیا تھا جو تاحال بگڑی ہوئی صورت میں موجود ہے جس کا طرز تعمیر بھی مقبرے سے بالکل ملتا ہوا ہے یہ پھاٹک اتنا بلند ہے کہ عماری دار ہاتھی بھی اس کے نیچے سے بآسانی گذر سکتا ہے پھاٹک کی رو کار بطرز قوسین تھی جسے لکھنؤ کے کونسل چیمبر کی بہت عرصے بعد ۱۹۲۶ء میں تعمیر کی گئی پھاٹک کے شمالی بازو کی عمارت منہدم کر کے ایک مکان میں شامل کر لی گئی ہے لیکن جنوبی سمت کی کل عمارت مع برجی اب تک موجود ہے جس سے شمالی جانب کی کل عمارت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے مقبرے کے چاروں طرف غلام گردش بھی تھی جس میں حضرت امجد علی شاہ پسر حضرت محمد علی شاہ نے اپنے زمانہ شہریاری میں جس کا سلسلہ ۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۷ء تک رہا امامیہ فرقہ کے طلباء کے لئے ایک تعلیم گاہ بنام مدرسہ سلطانیہ قائم کی تھی جو مقبرے کی غلام گردش میں تھا مدرسے کے متعلق سید محمد کاظم ملازم مدرسہ مذکور اپنی خود نوشت سوانح عمری ——————

—————— میں لکھتے ہیں (ترجمہ ملاحظہ ہو) جناب قبلہ و کعبہ کے زیر اہتمام مدرسہ سلطانیہ کی بنیاد پڑی جو جنت آرام گاہ نواب سعادت علی خاں کے مقبرے میں قائم ہوا تھا اس مقبرے کی عمارت نہایت وسیع ہے جس کے چاروں طرف دالان اور حجرے بنے ہیں مدرسے میں تخمیناً ۳۰ مدرس تھے ان میں سے بعض مثل مولوی میر احمد علی و مفتی سید محمد عباس و شیخ اظہر علی و مولوی میر محمد علی صاحب و مولوی سید حامد حسین صاحبان بہت سر برآوردہ اور عالم متبحر تھے یہ جملہ حضرات معقول و منقول کے مجسمہ اور اصول و فروع پر حاوی تھے مگر دوسرے معلم ان کے مرتبہ کمال کو نہ پہونچتے تھے لیکن قبلہ و کعبہ کی عنایت و نوازش سے عہدہ مدرسی پر فائز ہو گئے تھے انھیں صف اوّل کے مدرسین کی تنخواہ ایک سو یا ستر روپے ماہوار ملتی تھی مگر دوسرے درجے کے معلموں کو صرف تیس یا چالیس یا بیس روپے ماہوار ملتے تھے لیکن تنخواہ ماہ بماہ فوراً وصول ہو جاتی تھی۔ مدرسے کے طالب علموں کو بھی وظیفے عطا ہوتے تھے نیچے درجے والوں کو چار روپے، درمیانی درجے والوں کو چھ روپے اور بڑے درجے والوں کو نو روپے ماہوار ملتے تھے مدرسے کے کل افراد پر جہاں پناہ کی ہمیشہ نظر لطف و کرم رہتی تھی۔ کبھی کبھی وہ ہوادار میں سوار ہو کر خود بھی مدرسے تشریف لاتے اور ہر طرف گھوم پھر کر معائنہ کرتے سیکڑوں خوان طرح طرح کے کھانوں، مٹھائیوں اور میووں کے جو امراء اور سرمایہ دار اپنے یہاں کی تقریبوں کے موقع پر بادشاہ کے لئے بھیجتے تھے ان کے لئے حکم دیدیا تھا کہ اہل مدرسہ کو تقسیم کر دی جایا کریں اس دور میں ہر شخص کو درس و تدریس اور تحصیل علم کا بے حد شوق تھا چنانچہ مدرسے میں بہت سے طالب علم ایسے بھی تھے جن کو کوئی وظیفہ نہیں دیا جاتا تھا مدرسے کے افتتاح کی تاریخ نجم الغنی نے ۲ جمادی الاولیٰ ۱۲۵۹ھ تحریر کی ہے اور بتایا ہے کہ مجتہد العصر والزماں اور ان کے بھائی کی تحریک پر نواب امداد حسین خاں نے ہاتھ بٹایا۔ افتتاح کے دن قصیدہ خوانی ہوئی اس دینی درسگاہ کی تاریخ یہ ہے ؎

بیت معمور ہدیٰ مدرسہ سلطانی ۱۲۵۹ھ	زہے کار کملا مدرسہ خاقانی ۱۲۵۹ھ

مدرسے میں تعلیم کے فرائض[1] اور بورڈنگ کی نگرانی جس میں دس حجرے تھے مفتی میر عباس صاحب کے سپرد تھی چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

دمبدم قافلہ تازہ دریں کہنہ سراست	از ثریٰ تا بہ ثریا ہمگی ملک خداست
زیر نہ پنجرہ چرخ در پنجاہ و سہ روز	تا بدہ حجرہ ویک خانہ تعلق ما است

---

[1] تجلیات ج ۲ ص ۱۰۱۸

پہلے داخل ہونے والے طلبا کے نام یہ تھے سید علی اکبر، میر علی نقی، میر محمد، میر باقر، عطا حسین، میر حسین اصغر، میر باقر شاہ۔ تذکرہ گل
رعنا میں ہے کہ اس مدرسے میں ہزار لڑکے داخل ہونے پر بیس لڑکوں پر ایک ٹیچر مقرر ہوا۔ طلبا کا وظیفہ اس کی تحقیق کی بنا پر پانچ روپے
ماہوار تھا یہ اس ایوان میں تھا جو اب انگریزوں نے کھود دیا مدرسے کے بورڈنگ میں جو لوگ رہتے تھے ان کے نام یہ ہیں۔ سید محمد مفتی
صاحب کے سگے بھائی کم سن و سال میں ان سے چھوٹے اور چار سوتیلے بھائی علی نقی، محمد ہادی، محمد باقر سید بندہ مستقل طور پر مدرسے میں
رہتے تھے مدرسہ تین برس اسی عمارت میں رہا اور ۱۲۶۲ھ جلوس واجد علی شاہ میں امامباڑہ آصفی چلا گیا۔ غفران مآب کے پوتے
ممتاز العلما، فخر المدرسین سید محمد تقی جن کا بعد وفات جنت مآب لقب ہوا۔ مدرس اعلیٰ پرنسپل تھے۔

مدرسہ ایمانیہ کی بنیاد تو علامہ سید غلام حسنین کنتوری نے حسینیہ ممتاز العلما میں قائم کی تھی مگر کچھ تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ جب
مدرسین کی تشکیل ہوئی اور کام آگے بڑھا تو ممکن ہے کہ یہ مدرسہ بھی نئے مٹے شاہی علاقے میں منتقل ہوا۔ ثابت لکھنوی حیات دبیر
میں لکھتے ہیں کہ علامہ ۱۸۶۳ء کے قریب مدرسہ ایمانیہ کے یہ بزرگوار منتظم اعلیٰ تھے اور از بسکہ اس زمانے میں دبیر و انیس زندہ تھے۔
ان کے کلام اور فضیلت کی بحث ہر جلسے اور ہر طبقے میں ہوتی تھی۔ مدرسہ ایمانیہ کیوں اس سے مستثنیٰ رہتا ہر چند شاعر کہا کریں کہ یاران
شعرا بمدرسہ کے برد اور مدرس لاکھ کوشش کریں کہ شعر و شاعری کا چرچا مدرسے میں نہ ہو کہ اس سے لڑکوں کے سبق یاد کرنے میں
حرج ہوتا ہے مگر لڑکے کب مانتے ہیں وہ یہی زمانہ تھا کہ میاں مشیر نے کہا

جھگڑا ابکر کا ہے نہ جناب امیر کا   اب قصہ رہ گیا ہے انیس و دبیر کا

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں وطنی سرفروشوں نے مقبرے میں توپیں وغیرہ لگا کر خوب قلعہ بندی کی تھی جس سے انگریزوں کی
پہلی امدادی فوج کو جو ۲۵ ستمبر ۱۸۵۷ء کو زیر کمان جنرل اوٹرم OUTRAM و جنرل ہیولاک HAVELOCK بیلی گارد کے
محصورین کو نجات دلانے آئی تھی بے پناہ نقصان پہونچا تھا مگر ۱۳ مارچ ۱۸۵۸ء کو انگریزی فوج کا ایک دستہ مقبرے کے صحن تک
پہونچنے میں کامیاب ہوا اور وہاں سے انھوں نے قیصر باغ پر یک دم دھاوا بول دیا اور اس کے اندر داخل بھی ہو گیا شروع
میں مقبرے کے چاروں طرف دیدہ زیب چمن بھی تھے جن کی آرائش و زیبائش خوشبودار پھولوں اور طرح طرح کے خوش رنگ
اور دلفریب پودوں سے کی گئی تھی ان کے علاوہ جا بجا سنگ مرمر کے جاذب نظر فوارے بھی نصب تھے جنھوں نے اس پر فضا
مقام کی دلکشی اور رعنائی میں چار چاند لگا دیے تھے ۱۸۵۸ء میں جب انگریزوں کا لکھنؤ پر دوبارہ تسلط ہوا تو انھوں نے پہلے تو
اس مقبرے میں فوجی ساز و سامان جمع کیا پھر فوج کے پادریوں کے حوالے کر دیا جو چند سال تک اس کو بطور کلیسا (گرجا گھر) کے
استعمال کرتے رہے مقبرے کی چار دیواری منہدم کرا کے خاص بازار کی کل دوکانیں و عمارتیں بھی بڑھا دیں اور فوارہ وغیرہ کھود کر
زمین برابر کر دی۔

ہمشیرہ شاہ معزول یعنی زوجہ نواب سرفراز الدولہ اشرف النساء خانم مخاطب بہ افسر بہو صاحبہ نے حکومت کے ارباب بست و
کشاد کو مقبرے کی واگذاری کے لیے درخواست بھی دی مگر حکام نے ان کی درخواست پر کوئی توجہ نہ دی آخر کار جب فوج نے از خود
مقبرے کا تخلیہ کر دیا تو موصوفہ کو مقبرے کی نگہداشت اور انعقاد مجالس کا حق حاصل ہوا۔ ان کی رحلت پر مقبرہ ان کی بیٹی بادشاہ

۱؎ تجلیات ص ۱۰۱۸

ہو۔ بیگم صاحبہ کے قبضے میں آیا جنھوں نے اپنی وفات کے بعد کے لئے انتظام اور انصرام اپنے چند عزیزوں کے سپرد کر دیا اسی آخری دور میں مقبرہ اور پھاٹک کے درمیان جو وسیع تختہ آراضی تھا اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے فروخت کر دیا گیا جس سے اس مقام پر مختلف اشخاص کی عمارتیں بن کر ایک نئی بستی قائم ہو گئی اور مقبرے سے متصل جانب غرب ایک شارع عام بھی قائم کر کے مقبرے کو آہنی کٹہرے سے محصور کر دیا گیا جس کی وجہ سے مقبرہ اور پھاٹک میں کوئی رشتہ اور لگاؤ باقی نہیں رہا اور مقبرے کی شان و شوکت میں بھی فرق آ گیا گبنس صاحب GUBBINS چیف کمشنر کی کتاب بغاوت اودھ MUTINIES IN OUDH میں مقبرے کی تصویر ہے جس میں غلام گردش، چمن، فوارے وغیرہ مع پھاٹک سب موجود ہیں[1]۔

سڑک مقبرے کا ایک واقعہ اور عمارت مقبرے کا تذکرہ تاریخ بھٹوا مئو میں

فاضل واقعہ نگار تاریخ مذکور میں رقمطراز ہے[2]۔ راجہ تجمل حسین خاں کا واقعہ وفات یہ ہے کہ ۶ رجون ۱۸۷۲ء کو لکھنؤ سے بارہ بنکی اپنے بھانجے شیخ حیدر حسین فتحپوری کی ایک ضرورت سے آئے تھے گرمی کے سبب خود شکرم کی چھت پر بیٹھے اور گاڑی کے اندر ملازمین وغیرہ تھے۔ قیصر باغ سے نکلتے وقت نواب سعادت علی خاں بہادر کے مقبرے سے متصل سڑک کی موڑ پر گاڑی الٹ گئی گرنے سے داہنے ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ابروپربل نہ تھا ڈاکٹر دشا سول سرجن کا علاج ہوا قیصر باغ پلنگ پر لائے گئے پاؤں جوڑ گیا ایک روز امتحان کے لئے پاؤں اٹھایا پھر اکھڑ گیا۔ راجہ نواب علی خاں تعلقہ دار سلیم پور عیادت کے لئے آئے۔ چہرے کا رنگ بہت متغیر پایا کہا معلوم ہوتا ہے اس وقت درد کی شدت ہے اور آپ ضبط کر رہے ہیں کراہ لیجئے تو تسکین ہو جائے فرمایا ہاں بھائی اگر اس علاج سے فائدہ ہو تو مجھے عذر نہیں ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ مجھے کراہنا نہیں آتا تم کراہ کے سکھا دو تو کیا مضائقہ ہے

مقبرے کا ایک پھاٹک باقی ہے جس کے بند کرنے سے آثار قدیمہ سے محبت رکھنے والوں نے قومی آواز لکھنؤ مورخہ ۱۱ نومبر ۱۹۵۷ء میں احتجاج کیا ہے۔

مقبرہ سعادت علی خاں پر افسران نزول کی رپورٹیں:۔ اس عنوان کے خاتمے پر ہم چند رپورٹیں حکام وقت کی درج کرتے ہیں جس سے حالات پر روشنی پڑتی ہے اسسٹنٹ کمشنر کے اجلاس کی پہلی تحریر۔ شرافت پناہ سید کرامت حسین داروغہ نزول بعافیت باشند چٹھی صاحب کمشنر بہادر نمبری ۱۵۳ مورخہ ۱۳ راگست سنہ حال ترسیل چٹھی سکریٹری چیف کمشنر بہادر نمبری ۱۶۳۵ مورخہ ۸ راگست ۱۸۵۹ء اس مضمون سے کہ صحت الدولہ نے عرض گزرایا بابت قبضہ پانے مقبرہ مفصلہ ذیل کے اس کا حال دریافت کر کے کیفیت لکھو کہ اب وہ کس کے قبضے میں ہے اور اس کے واگذار کرنے میں کچھ تکلیف تو کسی کو یا حرج سرکار ہوگا یا نہیں نمبر ۱ کربلا نواہی کربلائے حسینی یعنی مقبرہ نصیر الدین حیدر، مقبرہ سعادت علی خاں، مقبرہ جناب عالیہ، مقبرہ جنت مکان، امجد علی شاہ صادر ہو کر تم کو لکھا جاتا ہے کہ ان مکانات میں کون کون لوگ رہتے ہیں اور کیا حال ہے اور نزول میں درج ہیں یا نہ اگر نزول میں ہوں تو بحکم صاحب کمشنر بہادر نزول ہو چکے ہیں حال مفصل اس کا دریافت کر کے لکھو تحریر تاریخ ۲۰ راگست ۵۹ء اس درخواست پر جو جواب لکھا گیا وہ حسب ذیل ہے گذارش ہے کہ مقبرہ نواب سعادت علی خاں حسب الحکم پروانہ مورخہ ۱۵ رمارچ ۵۹ء بصورت ڈاکٹ صاحب کمشنر بہادر نمبر ۱۸۵ مورخہ ۱۰ رمارچ سنہ حال نزول ہوا اور سابق میں اس میں گرجا گھر تھا۔ اب وہ

---

[1] اقتباس مضمون نیا دور بابت دسمبر ۱۹۵۵ء کماتر

[2] آثار یادگار ص ۱۵۶

گرجا مقبرہ امجد علی شاہ میں گیا۔ بالفصل انتھونی صاحب اس میں فروکش ہیں ۲؎ مقبرہ جناب عالیہ درج رجسٹر نزول نہیں ہے جس طرح سے عہد شاہی میں کشمیری لوگ رہتے تھے اسی طرح اب بھی رہتے ہیں ۳؎ مقبرہ امجد علی شاہ حسب الحکم پروانہ ۲۸ فروری ۱۸۶۹ء بعدور چٹھی سکریٹری چیف کمشنر نمبر ۹۹ وڈپٹی کمشنر صاحب کمشنر بہادر نمبری ۴۷، نزول قرار پایا اور اس میں گرجا گھر سے اگر واگذار ہو جائے گا تو حرج گرجا گھر کا ہو گا ۴؎ کربلائے نصیر الدین حیدر بموجب حکم پروانہ مورخہ ۱۷ ار جون ۱۸۵۹ء بموجب روبکار صاحب کمشنر بہادر مندرج رجسٹر نزول ہے اور ٹھیکہ اس کا ۴۰ روپیہ پر صرف سرکار بنام چھتری کے ہے ۵؎ کربلائے نزہی بموجب پروانہ ۲۷ ر جون ۱۸۵۹ء بعدور ڈپٹی کمشنر بہادر نمبر ۶۵۲ مورخہ ۲۱ ر جون ۱۸۵۹ء نزول قرار پایا اور ٹھیکہ اس کا ۳۰ روپے پر بے طرف سرکار سے بنام بھگن کے ہے۔ کیفیت یہ تھی :۔ گذارش ہے کمترین کرامت حسین داروغہ نزول کی آخری رپورٹ مورخہ ۱۹ راکتوبر ۱۸۵۹ء سے واضح ہوتا ہے کہ مقبرے کی زمین مع مقبرہ مرشد زادی دس بیگھہ بھی مقبرہ سعادت علی خاں حسین آباد ٹرسٹ سے متعلق ہے اور عشرہ محرم میں روزانہ مجلسیں ہو کر عمدہ حصّہ تقسیم ہوتا ہے۔ غریبوں کا بھلا ہوتا ہے نواب کی رحلت کے وقت سترہ کروڑ روپیہ خزانہ اودھ میں جمع تھا کوس پہیہ نواب کی ایجاد تھا جو سواریوں میں لگانے سے اندازہ ہوتا تھا کہ کتنی راہ طے کی۔

مقبرہ مرشد زادی :۔ مقبرہ نواب سعادت علی خاں کے پہلو میں جانب مشرق نواب موصوف کی شریک حیات خورشید زادی کا مقبرہ ہے جو نواب کے مقبرے سے تاؤ بھاؤ میں چھوٹا ہے مگر وضع قطع میں اس سے بہت مشابہ ہے مقبرہ سعادت علی خاں پر جو یلغار زمانے کے ہاتھوں ہوئی اس میں ان کی رفیقہ حیات کا مقبرہ بھی برابر سے شریک رہا اس عمارت کو سرکاری کاغذات میں مرقومہ بالا لفظ سے یاد کیا ہے غازی الدین حیدر بہادر انھیں خورشید زادی سے بتاریخ ۴ راگست ۱۷۶۹ء بنیاد منزل میں روز چہارشنبہ پیدا ہوئے تھے اس خاتون کی قبر بھی تہ خانہ میں ہے۔

خاص بازار

قیصر باغ کے پھاٹک سے پہلے جو بازار تھا اس میں بلند طبقے کے امراء و روٴسا اور ارکان سلطنت کے لئے خریداری تھی عام لوگ اس مارکیٹ سے اپنی ضرورت کی چیزیں خرید نہیں سکتے تھے مقبرہ سعادت علی خاں خاص بازار ہی میں تعمیر ہوا اور غازی الدین حیدر بہادر کی رہائش زمانہ ولیعہدی میں اسی بازار میں تھی۔

طاہر پیر کا میلہ :۔ خاص بازار میں طاہر پیرؒ کا میلہ بڑی چہل پہل اور اژدہام سے ساون میں ہوتا تھا۔

جعفری پریس :۔ خاص بازار میں یہ چھاپہ خانہ باہتمام محمد جعفر اعلیٰ کتابت و طباعت کے نشریات میں ہر طرف سے خراج تحسین و آفرین حاصل کر رہا تھا ۱۲۶۱ھ کی چھپی ہوئی کتابیں لائبریریوں میں موجود ہیں ایک کتاب کا ٹائٹل پیج ملاحظہ ہو جو

افوض امری الی اللہ

للہ الحمد والمنۃ کہ از تصانیف ملا محمد باقر مجلسی علیہ الرحمہ

رسالہ حدود

در ۱۲۶۲ ہجری نبوی مطبع جعفری واقع خاص بازار

باہتمام محمد جعفر حلیہ طبع پوشید

۱؎ رسالہ نیا دور بابتہ جولائی ۱۹۵۶ء ۲؎ رسالہ حدود مجلسی اس مطبع کا اعلیٰ شاہکار میرے پاس ہے۔

۲۲×۲۹ ½ سائز سفید کاغذ پر با جدول میرے سامنے ہے۔ پورے صفحے پر جو باڈر اور اعلیٰ قسم کے گل بوٹے نازک بیل ہے اس کی خوبصورتی کا اندازہ دیکھنے ہی ہو سکتا ہے کتاب ۱۴۴ صفحے کی ہے۔

مصاحب منزل:۔ مقبرہ سعادت علی خاں کی دس بیگمہ آراضی پر تعمیرات کا پہلا اثر غازی الدین حیدر کے مکان کی جگہ باپ کا مقبرہ بنوا دینا ہوا اور داروغہ نزول کی رپورٹ سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں کی کچھ دوکانیں کھدیں اور بعض مکانات عہد واجدی میں نئے تعمیر ہوئے محلسرا قدیم کا کچھ حصہ باقی تھا جو عمارتیں بن کر تیار ہوئیں ان کے نام رئیس منزل وغیرہ قرار پائے اور سلطان عالم نے کل علاقہ کا نام مصاحب منزل رکھا تھا مکانات صحن مقبرہ کے Rs 6/8 اور آمدنی ۷ قطعہ دوکانات متعلق دروازہ مقبرہ Rs 6/6 ماہوار تھی۔

محلسرا مصاحب الدولہ:۔ یہ عمارت قیصر باغ کے پچھم کی طرف تھی کمشنری کچہری کے قریب یہاں ایک مسجد بھی تھی اور اس سے ملا ہوا امام باڑہ بھی ہے اس میں تحصیل کا دفتر ہے اور نائب تحصیلدار اجلاس پر بیٹھتے ہیں بعض لوگ اس کو امام باڑہ انیس الدولہ کہتے ہیں۔

چینی بازار

یہ وہ بازار ہے جس میں صرف سچی چینی کے ظروف (برتن) اور دوسرا سامان فروخت ہوتا تھا جو اسی حلقے کے ارباب سلطنت کے ذوق اور ان کی اعلیٰ نفاست کے مطابق عام پبلک کے مان کی بات نہ تھی جو اس بازار سے کچھ مول لے سکیں انگریزی تعلیم پھیلنے پر تعلیم یافتہ طبقے کی زبان پر اس بازار کا نام CHINA BAZAR چائنا بازار ہوا جس سے سننے والے کو یہ تصور ہوتا ہے کہ کوئی چینی باشندہ بازار کا انچارج تھا اصل حقیقت یہی ہے جو زمانے کے گزرنے سے مسخ ہوتی جا رہی ہے۔ یاد رہے کہ چینی کے برتن میں کھانا پینا فقط مسلمان تمدن کا چلن ہے ورنہ اہل ہنود پتروں میں پھول اور پیتل کی تھالیوں کو کھانے کے برتنوں میں استعمال کرتے ہیں اور بچی چینی بلند طبقے کے دسترخوان پر اس لئے بھی آتی تھی کہ وہ اثر زہر قبول نہیں کر سکتی برتن ٹوٹ جاتا ہے۔

چینی باغ:۔ تاریخ میں اس کا بھی ذکر ہے اور تارہ والی کوٹھی سے گزر کر چینی باغ کا پتہ دیا ہے اور چینی باغ نام قرار پانے کی یہی وجہ ہے تمام سامان آسائش چینی کا تھا بعض واقعہ نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ باغ کے داہنی طرف چاندی والی بارہ دری تھی۔

امام باڑہ بشیر الدولہ:۔ یہ امام باڑہ باغ مذکور کے پھاٹک پر جانب شرق تھا اور امام باڑہ سے ملا ہوا محمد بشیر بشیر الدولہ کا رہائشی مکان تھا غدر کے بعد یہ عمارت راجہ نوشاد علی خاں کے قبضے میں آئی انھوں نے کچھ ردوبدل کی اور عمارتوں کو اپنی کوٹھی بنا دیا۔ بشیر الدولہ کے یہاں ایک مجلس میں سلطان عالم تشریف لائے تھے جس خاص پھاٹک سے وہ داخل ہوتے تھے وہ بدستور عرصے تک قائم رہا راجہ نوشاد علی خاں کے مرنے پر یہ کوٹھی راجہ جہانگیر آباد کے قبضے میں آئی اور پرانی عمارتوں کو کھود کر جدید وضع کی کوٹھی بنی اور جہانگیر آباد پیلس کے نام سے تبدیل ہوئی اور جب پھاٹک کا تاریخی یادگار ہونا زیر بحث آیا تو اس کی مرمت ہو گئی اور منہدم ہونے سے بچا بشیر الدولہ عہد غازی الدین حیدر میں خواجہ سرا تھے اس کے بعد نصیر الدین حیدر کے وقت میں ولایتی محل کے ناظر ہوئے۔ ان کے مرنے کے بعد زمانہ محمد علی شاہ میں نواب ملکہ جہاں کی سرکار میں خدمتگاروں میں ملازم ہوئے امجد علی شاہ بہادر نے ان کو واجد علی شاہ کی ولیعہدی کے زمانے میں واجد علی شاہ کے اشاف میں بھی رکھا اور اس وقت یہ ناظر محلات ہوئے اور بشیر الدولہ کے حسن خدمات میں یہ تاریخی واقعہ ہے کہ انھوں نے پریوں کے جلسے کو درہم برہم کیا اور داروغہ نجم النساء کے پھندے سے چھڑایا۔

حضرت امجد علی شاہ کی وفات پر جب واجد علی شاہ ۱۸۴۷ء میں سریر آرائے سلطنت ہوئے تو اس وقت بشیر الدولہ مشیر الملک کا خطاب حاصل ہوا اور محلات کی نظارت سپرد ہوئی اور کام کی کثرت میں بشیر الدولہ نے میر حیدر کو میر منشی کیا ہنومان گڑھی میں فیض آباد کی مسجد کا انہدام مولوی امیر علی جو "بندگی میاں" کے نواسے تھے امیٹھی سے خروج کر کے نکلے اور انقلاب کا آغاز ہوا اور سلطنت کے زوال کی بنیاد پڑی میر حیدر مولوی کے عزیز تھے بشیر الدولہ نے میر حیدر کو روانہ کیا کہ اس آگ کو بجھائیں میر حیدر مولوی صاحب کو لکھنؤ لے آئے بشیر الدولہ نے استقبال کیا اور مسلمانان شہر جوق جوق ان سے ملنے جانا شروع ہوئے۔ اس واقعہ کا بقیہ حصہ سبطین آباد کے ذیل میں ملاحظہ کیجئے ۱۸۵۷ء میں جب فتنہ و فساد کی آندھیاں چل رہی تھیں تو بشیر الدولہ کے مکان کے سامنے بھی رن پڑا۔ ۲۵ ستمبر کو جنرل اوٹرم نے کہا کہ ہم آج بیلی گارد میں جا کر کھانا کھائینگے کئی گھنٹے موتی محل پر رہ کر پھر وہاں سے دھاوا کیا کچھ گورے چھتر منزل میں داخل ہوئے وہاں بھی نجیبوں کی پلٹن موجود تھی وہ بھاگ کھڑی ہوئی کچھ سپاہی دریا میں ڈوب گئے کچھ جا بجا چھپ گئے قیصر باغ سے گولے پڑ رہے تھے سب سپاہی بھاگ گئے مگر بشیر الدولہ کے دروازے پر ایک لڑکا دھاڑی کا خدا بخش نامی اور ایک نیا سپاہی نوکر ایک توپ خانہ کھینچ کر لے آئے اور ایک خلاصی کی مدد سے گولے مارنا شروع کئے جب چینا بازار سے گولے آتے تھے اسی طرف کو مارتے تھے جو چوپڑ کے اسپتال سے آتا تھا اسے بھی لت ڈر کرتے تھے یہاں تک گولہ باری کی کہ گوروں کو آنے نہ دیا پھر گوروں نے پشت سے آ کر توپ لے لی اور دردولت پر جو توپیں تھیں ان کے رسالوں پر کیلیں ٹھونک دیں وہ لڑکا بھاگ گیا غدر کے بعد بشیر الدولہ کیا ہوئے کب مرے لاش کہاں لگی کچھ پتہ نہیں۔

امامباڑہ مفتاح الدولہ

یہ امامباڑہ مفتاح الدولہ نے اسی علاقے میں بنوایا تھا ان کا نام مرزا محمد علی خاں کپتان تھا عہد سلطان عالم میں امامباڑہ کی بنیاد پڑی عمارت جہانگیر آباد پیلس اسی سے متصل بنی ہوئی ہے اس سے زیادہ حالات تاریخ میں نہیں ملتے۔

امامباڑہ اعتماد الدولہ

اعتماد الدولہ کا نام جعفر علی خاں تھا اور وہ نواب سعادت علی خاں کے بیٹے تھے ۱۸۱۵ء میں امامباڑہ بنوایا اور اسی امامباڑہ میں دفن ہوئے مقبرہ اعتماد الدولہ بھی اسی عمارت کو کہا گیا ہے ۱۹۳۲ء میں یہ بھی کھد گیا۔

مہتاب بخش

وہ کوٹھی ہے جس میں عہد برٹش سے ڈپٹی کمشنر رہتا ہے عمارت عالیشان ہے حکومت کے زیر استعمال ہونے سے اس کے نقش و نگار اور طول و عرض پر کسی نے بحث نہیں کی ہے آخری بادشاہ اودھ کا قیام بھی اس کوٹھی میں رہا ہے اور کسی جلوس کے گذرنے پر سلطان عالم اس کے برآمدے تک تشریف لے گئے تھے۔

کوٹھی دار الشفا

یہ کوٹھی جوزف کیوراس JOSCPH QUIRAS نامی ایک یورپین نے موجودہ کونسل ہاؤس کے مقابل عہد شاہی میں بنوائی

۱؎ نیا دور مئی ۱۹۵۹ء لکھنؤ ص ۱۸

تھی جس نے ۱۸۲۲ء میں بعہد دولت شاہ زمن غازی الدین حیدر انتقال کیا ان کے بعد کوٹھی کو ورثا نے شاہ نصیر الدین حیدر کے ہاتھ فروخت کر دیا اور شاہ موصوف نے آسائش خلق کے لئے اس میں ایک اسپتال قائم کر دیا تاکہ جو لوگ مغربی طریقۂ علاج کے دلدادہ ہوں وہ اس اسپتال سے مستفید ہوا کریں اسپتال کے سب سے پہلے معالج ڈاکٹر اسٹیونسن STEVENSON مقرر ہوئے ۱۸۴۷ء میں امجد علی شاہ نے عمارت مذکور اپنی بیگم ملکہ عہد کو دیدی اور انگریزوں کی عملداری میں اس کوٹھی میں گورنمنٹ کے سکریٹری ٹھہرتے رہے اب یہ کوٹھی اتر پردیش کی مجلس قانون ساز کے ممبروں کے ٹھہرنے کے لئے مخصوص کر دی گئی ہے اور "ودھایک نواس" کے نام سے موسوم کی گئی ہے ۱۸۶۲ء میں اسپتال کی نئی عمارت محلہ حیدر گنج میں تھی اور دار الشفا وہاں سے اٹھکر خصوصی عمارت پہونچا مگر پہلی شہرت اس حد پر تھی کہ اب تک یکہ اور تانگہ سے دار الشفا کہنے پر سواریاں یہاں پہنچ جاتی ہیں کوٹھی دار الشفا میں بہت لمبی چوڑی زمین باقی تھی جس پر پہلے پنجسالہ منصوبے کے تحت میں جمہوری حکومت اتر پردیش نے سہ منزلہ عمارت بنوائی ہے جو شروع اور آخر میں ½ دائرہ کی شکل سے مدور بنائی گئی ہے دونوں طرف کی نصف گولائی پر خوشنما عمارت ہے درمیان میں چمن اور گھاس اور مہمانوں کی تفریح کے لئے زیادہ سے زیادہ صحن ہے۔

حضرت گنج

انگریزی دور کی سول لائن اور عہد شاہی کا وہ محلہ جو حضرت بیگم کے نام پر آباد ہوا - اس علاقے میں پہلے سے اونچی اونچی کوٹھیاں اور عالیشان قصر تھے قیصر باغ اور چھتر منزل سے قریب ہونے کے لحاظ سے اس کی آبادی کو نہ پوچھو اس وقت بھی گلزار تھا اور برٹش راج میں بھی جنت نظیر رہا انگریزی تاجروں کی بڑی بڑی دوکانیں سی مل ڈی مول فوٹو گرافر ویٹ وے جنرل مرچنٹ تمام گورے چمڑے کے دوکاندار سب سے زیادہ چوڑی سڑک امرا و رؤسا کی سہ پہر کو گذر گاہ منہ مانگے دام — سرمایہ داروں کے سوا کوئی ان دوکانوں پر سودا نہیں کر سکتا راجے مہاراجے شاہزادگان اور حکام کے دوکانوں پر جلوے نظر آتے۔

<u>کوٹھی ملکہ عہد</u>:- اس محلہ میں ایک عالیشان کوٹھی امجد علی شاہ نے ملکہ عہد کے لئے تیار کرادی تھی ۱۸۴۵ء میں جب غدر کی ہنگامہ آرائیاں پورے شباب پر تھیں تو پچاس گورے حضرت گنج کے مشرقی پھاٹک سے داخل ہوئے اور خاص برداروں نے میاں داراب علی خاں کے حکم سے دونوں طرف کوٹھیوں پر چڑھ کر گولیوں کا مینہ برسایا گورے وہاں سے پلٹ آئے اور خوب مار پڑی یہ کوٹھی بھی اپنے مکیں کے ساتھ فنا ہو چکی۔

<u>سبطین آباد</u>:- سرائے مینڈھو خاں کا حال سابق کے صفحات میں گذرا رسالدار موصوف ہی کی چھاؤنی میں حضرت امجد علی شاہ کے دفن ہونے پر یہ امامباڑہ واجد علی شاہ نے دس لاکھ روپے میں تیار کیا اور اپنے باپ کی بہترین یادگار بنا کر والدین کے حقوق پر روشنی ڈالی اس عمارت کی تاریخ "آرام گاہ ظل اللہ ہے" (۱۲۶۳ھ) امامباڑہ مذکور کے دوہرے پھاٹک خوبصورت درجے حسین ترین ساز و سامان در و دیوار صحنچیاں نقش و نگار کی خوبیاں یاد کر کے کلیجہ منہ کو آتا ہے اور دنیا کے عبرت کدہ ہونے کا گواہ ہے۔ غدر کی رستخیز میں تو امامباڑہ حملے کے باوجود جس کا ذکر ہم عنقریب کرتے ہیں محفوظ رہا۔ انگریزوں کے دور میں آرامی ظالم متولیان اور اولاد کے ہاتھ سے رہن اور بیع ہونا شروع ہوئی۔ گرد و پیش کے قطعات زمین پر انگریزوں کی کوٹھیاں بننا شروع ہوئیں۔

یورپین آوارہ عورتوں کا اڈہ بنا ورثا کی بھوک زیادہ سے زیادہ شکم سیر ہونے پر بھی کم نہ ہوئی پہلوؤں پر تصرف کے بعد اصل عمارت میں تغیرات پیدا ہوئے سول لائن ہونے سے ایک بالشت زمین بھی یہاں کی ایک گز قیمت کے برابر تھی اور وہ پھاٹک جو حضرت گنج سے سیر و تفریح کرنے والوں کو داہنے ہاتھ پر نظر آتا تھا وہ بھی بگڑنا شروع ہوا اور نواب سلطان بہادر کے زمانے سے جو تباہی شروع ہوئی تھی اس کا ان کے بیٹے کے دور میں خاتمہ ہوگیا جو وقت سے پہلے نابینا ہو کر گوشۂ گمنامی میں ہیں سلطان بہادر لین کا حلقہ کاظمین میں ذکر آچکا ہے۔ اس امامباڑہ میں ۴۵ برس پہلے ۱۰ صفر کو سلطان بہادر کی طرف سے ۳ بجے دن کو ایک مجلس ہوتی تھی مرزا ثریا قدر بہادر جب تک زندہ رہے سہ پہر کو ہوا خوری میں ادھر سے گزرتے اور قبر پر فاتحہ پڑھتے تھے۔

غدر ۱۸۵۷ء میں ملکہ عہد کے قصر واقع حضرت گنج سے جب گورے پٹ کر نکلے تو سبطین آباد کو قصر شاہی سمجھ کر حملہ کر دیا گول انداز ڈر کے مارے توپ چھوڑ کر بھاگا مفتاح الدولہ کے اردلی ان کے حکم سے توپ پر کیل لگا کر پینی کو گھسیٹ کر لے گئے جب گورے مقبرہ میں آئے تو کسی نے کہا کہ یہ قبرستان ہے یہاں مردے دفن ہیں ایوان شاہی آگے ہے گورے وہاں سے نکل آئے توپ کا کچھ خیال نہ کیا۔ سبطین آباد آج بڑی کسمپرسی میں اپنے مٹانے والوں پر صدائے نفریں بلند کر رہا ہے اور آخری تاجدار اودھ کے پدر بزرگوار کی آرامگاہ ویران ہے۔

اس مقبرے میں سونے والے کی مدح میں غالب نے کہا تھا ؎

شاہیکہ نخل دولت او را ابلاغ دین سرسبز آبجوے بقا کرد روزگار

شمس الاخبار:۔ ۱۸۶۹ء میں[1] حضرت گنج سے امریکن مشن نے ایک جز پر جاری کیا کرتا دھرتا پادری مسمور اور ڈی کریون تھے ۸ برس کے بعد نام کوکب ہند رکھا گیا۔

مسجد حضرت گنج:۔ اس حلقہ میں ایک وسیع اور سربلند مسجد ہے جس کے مینار اور خوشنما گنبد داہنے ہاتھ پر دور سے دکھائی دیتے ہیں اس وقت مسجد کی آراضی اور ایک پہلو میں پھاٹک سے قریب انگریزی ڈسپنسری اور ایک اسپتال ہے جہاں بیماروں کو دوا بٹتی ہے صحن مسجد میں حوض پمپ دست چپ پر کچھ عمارت اور پشت پر بھی بالائی حصے کے عقب میں آثار قدیمہ ہیں اور مسجد میں خاص بات یہ ہے کہ امام جماعت کے آنے کی جگہ اندرونی محراب اور عقب سے ہے یہ بات صرف اسی مسجد میں ہے متعلقہ آراضی پر دوسرے لوگ قابض اور عمارت وقف حسین آباد کے زیر انتظام ہے مسجد کا مؤذن با تنخواہ ٹرسٹ کی طرف سے اذان دیتا ہے۔

میر حیدر کی تحریک پر جب مولوی امیر علی جنگ آزادی کے پہلے حامی لکھنؤ پہونچے تو مسجد حضرت گنج میں مع پچاس ساٹھ جانبازوں کے ٹھہرے اور بشیر الدولہ کی طرف سے خاطر و تواضع ہوئی نواب علی نقی خاں سے ملوایا اور بروقت ملاقات پہلے آپ نے سلطان العلماء مجتہد العصر والزماں کا فتویٰ نواب کے ہاتھ میں دیا جس کا مضمون یہ تھا "حکام عصر را بمناسبت حکم شرع دفع شر کفار از اہل ایمان و اسلام واجب خود و بر محاربین مشرکین و قصاص خون مسلمانان واجب است" نواب نے بقول فسانۂ عبرت فتویٰ پڑھ کر عرض کیا کہ ہم مجتہد العصر کی تحریر پر عمل کریں گے مسجد بنوا دیں گے اور انتقام بھی لیں گے۔

خدا بخش کا گرجا:۔ ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی کے روبرو خدا بخش کا گرجا انگریزوں کے قدیم آثار میں۔

---

[1] نیا دور دسمبر ۱۹۵۹ء

پیکالن PEAKEALLEN :۔ حضرت گنج میں ایک انگریز مرقومہ بالا نام کا نیلام کنندہ گذرا ہے جو جملہ اشیاء اور گھوڑوں تک کا بہ اتوار کو نیلام کرتا تھا اور شہر کے بڑے لوگ اس نیلام سے اپنی ضرورت کی اعلیٰ چیزیں سستے داموں پر خریدتے تھے اس کمیشن ایجنٹ کا تذکرہ نہ کرنا "تیرہویں صدی کے لکھنؤ میں" ناقابل تلافی تھا

منشی نولکشور پریس

عہد شاہی کے پریس ختم ہوتے ہوتے انگریزی حکومت میں بمقام حضرت گنج ایک چھوٹا پریس تھا جس کے انتظامات بانی مطبع کسی وجہ سے باقی نہ رکھ سکے اور نولکشور کو جو کوہ نور لاہور سے علیحدہ ہو گئے تھے سپرد کر دیا۔ نولکشور نے پیسہ لگا کر چھاپہ خانہ کو نومبر ۱۸۵۸ء میں اپنایا اور مضبوط بنا دیا اور رفتہ رفتہ مطبع نے فروغ حاصل کیا عہد برٹش کا یہی پہلا پریس ہے جس میں کام کی اچھائی مذہبی اسلامی کتابوں کی طباعت میں احتیاط پریس کی مقبولیت کا اساس ہوئی اور سرمائے نے اس پریس کی موجودگی میں عہد شاہی کے مطابع کو ٹھپ کرنا شروع کیا ان مطابع کا زوال اور جدید مطبع کا عروج شروع ہو کر علمی حلقوں میں ہر طرف نولکشور کا نام آگیا۔ اور انصاف پسند طبقہ آج یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہے کہ نولکشور کا مسلمانوں پر خصوصی احسان ہے کہ انہوں نے سنی شیعہ لٹریچر اس وقت چھاپنا شروع کیا جب عیسائیت اسلام کو کچلنے کے سامان کر رہی تھی اور نولکشور کی تجارت کے فروغ میں مسلم امراء و روساء کے سرمائے نے جڑوں کو ایسا مستحکم کیا کہ وہ سرکاری خطابات اور اعلیٰ عزت کے مستحق قرار پائے ۱۸۵۹ء میں روزانہ اودھ اخبار جاری کیا پھر "تفریح" ایک پیسے کا ہفتہ وار اخبار نکالا ۱۹۱۲ء کے بعد "تفریح" بند ہوا اور ۱۹۴۳ء میں اودھ اخبار بھی ختم ہو گیا۔

نولکشور کے کارکنان پریس میں اشرف علی نسخ و نستعلیق کے بہترین ماہر تھے نور خاں طغرا نویسی میں استاد تھے احمد علی عکوس نویس تھے اور یہ ہنرمند ۱۹۳۱ء تک زندہ تھے۔ پریس میں ابتدائی زمانے میں امیر بیگ اور نواب علی تھے جو آخر میں گورکھپور چلے گئے تھے اور حکیم برہم مدیر مشرق گورکھپور نے ان کو نوکر رکھا تھا مصحح ۱۸۶۸ء میں سید عنایت علی زیدی بارہوی تھے ان کے بعد مولوی سید تصدق حسین صاحب کنتوری اور آخر میں مولوی سید مظفر حسین صاحب مرحوم معاصر تصحیح کرتے تھے نولکشور کو سی آئی اے کا خطاب تھا اور مسلمانوں کی کتابیں زیادہ سے زیادہ احتیاط کے ساتھ چھپتی تھیں سنی کارکن اہلسنت کی اور شیعہ مذہب امامیہ کی کتابیں کافی احتیاط سے چھاپتے تھے۔ انیسؔ و دبیرؔ مرثیہ گو شعراء کے کلام کی نشر و اشاعت میں نولکشور نے وہ خدمت ادب انجام دی جو بے نظیر ہے واقعہ کربلا کی ایک کتاب میں وہ خود اپنے کارکنوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

کاربردازان مطبع نے چاہا کہ اب کی مرتبہ اس کتاب لاجواب کی طبع میں ایسا اہتمام ہو کہ یادگار زمانہ ہو خیالات چند کر کے کاتب اور مصحح اور مصلح سنگ اور چھاپنے والے سب کے سب اثنا عشری ہوں تاکہ ایک نقطہ کی بھی تحریف و تصحیف ہونے نہ پائے۔ (خلاصۃ المصائب ص ۴۳۵) اس کتاب کے ساتھ روضہ امام حسینؑ کا ایک نقشہ بھی طبع کیا جو حاجی محمد علی کربلائے ۱۲۶۳ھ کے سفر عراق میں تیار کر کے لائے اور فہرست کتب خانہ میں اس ایڈیشن کی خصوصی تعریف سے خریداروں کو رغبت دلائی اور مطبع کے اہتمام پر قوم کو متوجہ کیا۔ نولکشور کی موت ۱۸۹۵ء میں ہوئی۔ ان کے بیٹے کا نام جگل کشور تھا۔ آخر میں پریس سیٹھ کیسری داس سپرنٹنڈنٹ اور بابو پراگ نرائن کی زیر نگرانی چلتا رہا اور آخر میں وارثوں نے بٹوارہ کرا لیا مطبع کی شاخ کانپور سرسیا گھاٹ میں بھی تھی۔

شکرم

شہر میں ریل نکلنے سے پہلے قریبی دیہاتوں میں یکہ اور دور کے قصبات میں شکرم (گھوڑا گاڑی) چلتی تھی نولکشور نے قریبی مقامات پر شکرم[1] چلانے کا کاروبار بھی اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور شکرم اسی پالکی گاڑی (بگھی) کو کہتے تھے جس کا فوٹو گاڑی اڈا کے عنوان میں گزرا شکرم لکھنؤ سے رائے بریلی ۴۹ میل کا راستہ ۶ گھنٹے میں طے کرتی تھی اور فی نفر ایک روپیہ آٹھ آنے کرایہ تھا - چھ آدمی گاڑی میں بیٹھتے تھے اور چھ جگہ گھوڑے بدلے جاتے تھے (۱) کٹھوارہ (۲) ہرچند پور (۳) نگوہاں (۴) بچھراواں (۵) موہن لال گنج - اس تاریخ کی ترتیب کے وقت بعض بوڑھے زندہ ہیں شکرم پر سفر کر چکے ہیں گھوڑے پانچ کوس پر بدلے جاتے تھے - ۱۸۹۶ء تک شکرم چلتی تھی -

اونٹ گاڑی

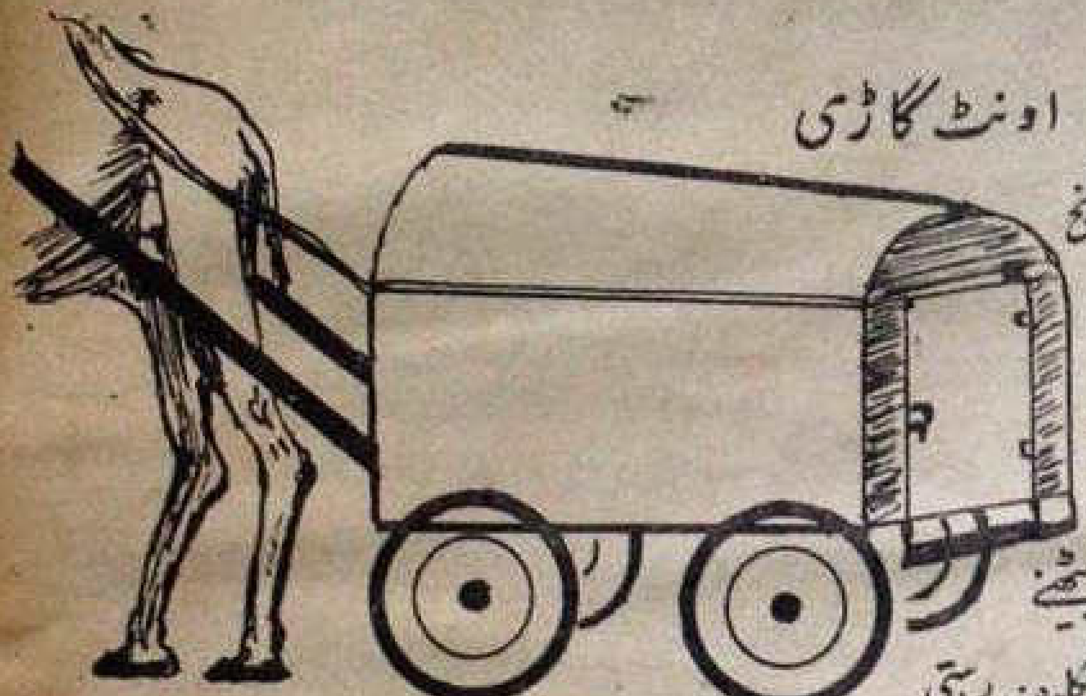

کہا جاتا ہے کہ اونٹ گاڑی کا مرکز بھی حضرت گنج تھا لیکن صحیح یہ ہے کہ مدد بیگ سنگھ کی سرائے اونٹ گاڑی پر مسافر بیٹھتے تھے اونٹ گاڑی ۴ بجے دن کو لکھنؤ سے چھوٹ کر دوسرے دن شام کو ۴ بجے رائے بریلی پہونچتی تھی چھ آدمی نیچے اور چھ آدمی اوپر بیٹھتے تھے اوپر بیٹھنے والوں کو اونٹ کی پشت سے قریب ہونے میں بدبو سے تکلیف رہتی تھی ظریف کے کلام میں بھی اونٹ گاڑی کا ذکر ہے۔ اونٹ گاڑی کی تصویر یہ ہے۔

امامباڑہ انیس الدولہ :- یہ امامباڑہ چھوٹے خاں دھاڑی نے دہلی سے آکر بنوایا تعمیر سلطان عالم کے زمانے میں ہوئی اور بانی امامباڑہ کا فروغ بھی اپنے کمال فن میں ہوا یہاں اس وقت صدر تحصیل کا دفتر ہے۔

امامباڑہ غلام حسین خاں سائیس :- غلام حسین کا تعلق شاہی اصطبل سے تھا اور اس نے وہ فروغ حاصل کیا تھا جو اس کے ہمجنسوں کو نصیب نہیں ہوا[2] - اس عمارت کے عقب میں چھوٹے تحسین کی جائیداد تھی جس کا ذکر گزرا -

قیصر باغ

روم کے ہر بادشاہ کو قیصر کہتے ہیں حالانکہ رومی زبان میں قیصر صرف اس طفل کو کہتے ہیں جس کی ماں اس کے پیدا ہونے[3] سے پہلے مر جائے اور پیٹ چیر کر اس کو نکالیں چونکہ شاہان روم کا پہلا تاجدار اغسطوس اسی طرح پیدا ہوا تھا اس لئے اس کو قیصر کہا گیا اور اس کے بچ جانے اور طولعمرہ ہونے اور سلطنت کے تعجب خیز کمال کو دیکھ کر اس دن سے ہر بادشاہ کو قیصر کہنے لگے -

رفتہ رفتہ لفظ نے غیر ملکی ارتقا حاصل کیا اور لقب ہندوستان تک پہونچکر گلی گلی پہونچا اور آخری تاجدار اودھ ابو المنصور ناصر الدین سکندر جاہ، بادشاہ عادل قیصر زماں سلطان عالم محمد واجد علی شاہ بادشاہ غازی نے اپنی آخری یادگار کا نام قیصر باغ

---

[1] نصیر الدین ہاشمی دکھنی نے اپنے ایک مقالے میں شکرام لکھا ہے اور میرے خیال میں یہ تصرف اسی طرح ہے جیسے دہاں فیاکرڈی کیا پر مرچنٹ بجائے کیپ اور نیکر ڈی کہا جاتا ہے (قومی آواز ۳ نومبر ۱۹۵۹ء)، [2] ذات یقین مخطوطات [3] نصیر اللغات

رکھا آدمی کے جسم و جان میں. جو نسبت ہے وہ پورے شہر کو قیصر باغ سے حاصل ہے یوں تو نوابی کی عمارتیں الگ الگ درجہ رکھتی تھیں اور دار السلطنت کہے جانے کے لائق ایک یہی بلڈنگ نہ تھی قیصر باغ نے مکمل ہو کر راجدھانی کی شان قائم کردی۔ اس رشک بہشت عمارت کو ۱۸۴۸ء میں شاہ نے بنوانا شروع کیا اور صرف دو سال ۱۸۵۰ء میں بن کر تیار ہوئی سنگ بنیاد سے آرائش کے سامان تک اسی لاکھ روپے صرف ہوئے پھاٹکوں پر حبشی سواروں کا پہرہ تھا یہ قوم بڑی وفادار اور نمک حلال مانی گئی تھی کبھی کسی حبشی نے مالک کے ساتھ غداری نہیں کی سلطان عالم جس دروازے سے برآمد ہوتے تھے اور جہاں دھونی رما کے بیٹھتے تھے اس گیٹ کی تیاری میں ایک لاکھ روپے صرف ہوئے تھے جان عالم کا سب سے بڑا تعمیری کارنامہ قیصر باغ تھا مگر اس کا بہترین اور حسین ترین حصہ جو چینی بازار گیٹ کے اندر تھا ۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں کا دوبارہ تسلط ہوا تو نفرت کے ہاتھ سے لٹا اور منہدم ہوا۔ جن عمارتوں میں بادشاہ بنفس نفیس رہتے تھے ان کا اب پتہ بھی نہیں ہے ان سربلند قصروں کو دیکھنے کا ہر شخص کو اشتیاق رہتا تھا اب صرف وہ حصہ باقی ہے جس میں بیگمات اور ممنوعات رہتی تھیں اس وقت سے انگریزوں کے راج تک بھی طرح طرح تغیرات و تبدیلی ہوئی چنانچہ لارڈ

HIS EXCELLENCY THE EARL OF DUFFERIN VICEROY AND GOVERNOR

GENERAL OF INDIA ——————————— لارڈ ڈفرن گورنر جنرل ہند کے

وقت کا البم قیصر باغ کے جو مناظر دکھاتا ہے اس کی اب جھلک بھی موجودہ قیصر باغ میں نہیں ہے بیشتر تصاویر میں نمایاں فرق ہے اور فوٹو نمبر ۱۵۰ جس میں قیصر باغ میں ناریل کا درخت دکھایا گیا ہے اس کا اس وقت کہیں پتہ نہیں ہے یہ بظاہر وہی درخت ہے جس کے سائے میں شاہ گیروے کپڑے پہن کر فقیرانہ بھیس میں بیٹھتے۔ عمارت کے پھاٹک پر دو جل پریاں اور تاج شاہی مارکہ اب تک نظر آتا ہے۔ لکھنؤ میں ایک سادہ کار حافظ اکرام تھے جن کے باپ کا نام اسمٰعیل تھا وہ ساد کاریں ممتاز کاریگر تھے مغل قوم سے ان کا تعلق تھا سو برس سے زیادہ کی عمر میں ان کی موت واقع ہوئی غدر کے بعد گوشہ نشین ہی تھے بلکہ حکومت جانے کے صدمے میں گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا اس وقت کے لوگ کھانے پینے میں استغنا کی نعمت سے مالامال تھے آج کل کی ایسی قدم قدم پر زحمتیں، بیماریاں اور مصائب نہ تھے گھر سے نکلنے کی ضرورت ہی نہ تھی پھر بھی زندہ جان ہوتے ہوئے دو دفعہ گھر سے باہر نکلے ان کے دادا سلطان عالم کے خاص ملازم تھے اور یہ تمام مناظر عیش و طرب اپنی آنکھ سے دیکھ چکے تھے پہلی دفعہ امامباڑہ آصف الدولہ پر نظر کی اور دوسری دفعہ قیصر باغ کو دیکھا تو صدمے سے تین دن بے آب و دانہ رہے اور اس کی سینری یاد کر کے صدمہ اٹھایا۔ قیصر باغ کی بنیاد سے پہلے عہد نواب سعادت علی خاں میں یہاں جو عمارتیں تھیں پہلے ان کا حال ملاحظہ ہو۔

بادشاہ منزل :۔ اپنے زمانے میں مشہور عمارت تھی جس میں مختلف قسم کے جانور لڑائے جاتے تھے شیروں کی لڑائی کا مقام لوہے کے کٹہروں اور پنجروں کی جگہیں تماشائیوں کے ٹھہرنے کے مقام لیے سلیقے اور بہترین نقشے کے تحت میں تیار کیا تھا جو فقید المثال تھا۔ اس کوٹھی کی عمدگی اور ساخت کے اعلیٰ پیمانے پر ہونے نے بادشاہ کو مجبور کیا کہ وہ قیصر باغ کے نقشے میں اس کو اپنالیں لفظوں میں اثر اور قلم میں طاقت نہیں جو یہاں کی تصویر کشی کی جائے۔

خاص باغ :۔ بادشاہ منزل سے قریب تھا زیب و زین مستغنی عن البیان خصوصیات اہم محاسن کے ذمہ دار۔

چاندی والی بارہ دری :۔ اس بارہ دری کی چھت میں چاندی کے پتر اور وہ نقش و نگار تھا جو نہ دیکھا نہ سنا۔

حضور باغ :- اس گلستاں کی خصوصیت یہ تھی کہ چالیس گز لانبا اور پندرہ گز چوڑا پانی کا حوض تھا جس میں فوارے لگے تھے اور کیاریاں روشیں اس خوبصورتی سے بنائی گئی تھیں۔ جس کا نمونہ کسی باغ میں نہ تھا پانی موتی کی طرح چمکتا تھا۔

شہنشاہ منزل :- جاڑوں میں شاہ کے رہنے کے لئے دھوپ کے رُخ پر بنائی گئی تھی اور انگنائی کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا حوض تھا جو انتہائی حسین تھا۔

مکان خاص :- گرمی کے دن سیر کرنے کے لئے شہنشاہ منزل کے سامنے اس عمارت کی تعمیر ہوئی یہاں کا فرش سنگ مرمر کا تھا۔

فلک سیر :- برسات میں شاہ کا قیام رہتا تھا صحن میں خوبصورت بنگلہ تھا درختوں کا حسین منظر انتہائی بصر افروز تھا۔

سفید بارہ دری :- اپنے انتہائی شکوہ اور عظمت کے ساتھ آج بھی موجود ہے گورنروں کی پارٹیاں سرکاری دربار اور آخر میں یادگار حسینی کے اجلاس ۱۳۶۶ھ میں یہاں ہوئے یہ برمحل تصرف تھا اس لئے کہ بادشاہ نے اس کا نام قصر بکا رکھا تھا۔ اس عمارت کو پتھر والی بارہ دری بھی کہتے ہیں تعلقہ داران اودھ کی بعض شادی بیاہ کی تقریبیں بھی یہاں ہوا کرتی ہیں مگر اندرونی نظارے سے واضح ہوتا ہے کہ فی الحقیقت امام باڑہ شاہی تھا میر انیس اس کوٹھی میں مجلس پڑھ چکے ہیں اور حکومت کی خاص بلڈنگ ہونے سے سیاح عام طور پر دیکھ نہیں سکتے جو ہم تفصیلی نقشہ کشی کریں۔

لال بارہ دری :- یہ سرخ رنگ پھری ہوئی بہت ہی عالیشان عمارت ہے جو میوزیم (مردہ عجائب خانہ) کے نام سے آج بھی موجود ہے تہ خانہ میں مگر مچھ گھڑیال بڑے جانوروں کے مجسمے اور اوپر جملہ عجائبات عالم چرند و پرند و مصنوعات و تصاویر و آثار قدیمہ کے برتن، نقارے، چھریاں وغیرہ وغیرہ سب ہی کچھ ہے۔ پھاٹک کے زینے ختم ہوتے پر دفتر ہے جس میں آثار قدیمہ کی لائبریری اور نگران و منیجر رہتے ہیں تصاویر کے فریم میں ۳۰ برس پہلے شیعہ علما کے تصاویر بھی تھے جو اب تغیر و تبدل میں جگہیں تبدیل ہونے سے مشکل سے نظر آتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ عمارت[1] عہد سعادت علی خاں کی تعمیر ہے اور قصر السلطان اس کا نام تھا اور صحیح یہ ہے کہ یہ بارہ دری غازی الدین حیدر کی تیار کردہ[2] ہے اور تاج و تخت سلطنت اسی میں تھا۔

سنگی بارہ دری :- اس عمارت کو بادشاہ نے کربلائے معلی سے آنے والے زائروں کے ٹھہرنے کے لئے بنوایا تھا اور ان کی تجویز سے زوار عام مہمان خانے میں نہیں روکے جاتے تھے بلکہ ان کے لئے خاص عمارت تھی اس بلڈنگ کا قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

فرمود ایں بارہ دری سنگیں بعد خوبی بنا — از بہر تشریف آوری و مقدم شاہ امم
از حسن نیت چونکہ نذر چہاردہ معصوم شد — نظارہ عتبات عالیات گردیدہ بہم
آید چو کس بہر زیارت اندراں رضواں دہد — آواز طبتم فادخلوھا خالدین در ہر قدم
شمشیر چو تاریخ آں پرسید از روح الامین — گفتہ مکرر از ادب قصر ارم قصر ارم
۱۲۶۵ھ

ایک شاہ پسند درخت :- قیصر باغ میں وہ درخت یادگار ہے جس کے نیچے سنگ مرمر کا فرش تھا اور اس کے تلے شاہ جوگئے کپڑے پہن کر میلے میں بیٹھتے تھے نہ ایسا درخت کسی نے دیکھا نہ وہ منظر دیکھنے والوں کو مدتوں بھولا اس درخت کا فوٹو لارڈ ڈفرن گورنر جنرل کے البم میں تھا جو میرے پاس اصل کاپی موجود ہے جوگیوں کا میلہ ۱۲ ذیقعدہ ۱۲۲۹ھ سے شروع ہوا۔

---

[1] گذشتہ لکھنؤ [2] احسن التواریخ صفحہ ۱۹

خزانہ اودھ تلاش کرنے والی جماعت نے قدیم کاغذات سے دریافت کیا ہے کہ اودھ کا دفینہ حرفہ ریوڑی کے درخت سے قریب ہے مجھے نہیں معلوم کہ یہ چانڈو خانہ کی گپ ہے یا کچھ اصلیت ہے میرا کام واقعات کو یکجا کرنا ہے ناظر اور بالغ نگاہ میں بھی جانچ پڑتال کی قوت ہے گزشتہ لکھنؤ میں ہے کہ اعلیٰ حضرت جہاں فقیر بن کر بیٹھتے تھے وہاں جو پھاٹک تھا اس کو لکھی پھاٹک کہتے تھے

چوک :۔ شاہی پیڑ کے آگے چوک خاص شروع ہوتا تھا یہاں شاہی حرمین رہتی تھیں اگست کے میلے میں عام پبلک کو بغیر پاس کے قیصر باغ دیکھنے کی اجازت تھی۔

چشمۂ حسن :۔ یہ نہر پتھر کے فرش سے تیار ہوئی تھی اور کوثر و تسنیم کی غلامی کا دم بھرتی تھی اس کی بنیاد اس قطعہ تاریخ سے واضح ہے۔

حضرت سلطان عالم ابر جود و بحر عدل ساحل دریائے رحمت قلزم حسن صفات
نہر سنگ ابیض از حکمش بنا شد باب و تاب صورت عین کرم شد چشمہ بہر التفات
سال تاریخش سروش غیب از شمشیر گفت چشمۂ حسن و آبروئے منبع آب حیات ۱۲۶۹ھ

مینا بازار و کپتان بازار :۔ قیصر باغ میں[1] جہاں وکٹوریہ پارک ہے مینا بازار اور کپتان بازار تھا۔

باورچی خانہ :۔ جن زمینداروں اور علاقہ جات سے روپیہ وصول نہیں ہوتا تھا اس کی آخری تدبیر یہ تھی کہ بادشاہ اس آمدنی کو باورچی خانہ کا صرف لکھوا دیتے تھے اور وہ زمیندار ہرگز یہ گوارا نہ کرتے تھے اب قانون شکنی کریں اور باورچی خانہ کا صرف بند ہو چنانچہ راجہ بانسی کا وہ علاقہ جو آصف الدولہ نے ضلع بستی میں اس کو اس بات پر دیا تھا کہ اس نے لاٹھی سے ہرن کا شکار کیا تھا یہ علاقہ باورچی خانے کے صرف میں مختص تھا باورچی خانہ میں اس کثرت سے کھانا پکتا تھا کہ نوکر چاکر اور ادنیٰ طبقے کے ملازمین خوان میں کھانا رکھ کر صرف دو موٹے پیسے کو ایک خوان بیچتے تھے اور لوگ فیضیاب ہوتے تھے اس وقت کی ضیافتوں میں بے تکلف دوست احباب مذاق میں طنزیہ کہتے تھے کہ یہ کھانا گھر کا نہیں ہے قیصر باغ کا خوان ہے۔

واجد علی شاہ کی سیرت پر ہم نے ایک مکمل مقالہ نظامی جنتری ۱۹۵۶ء اور رسالہ الواعظ بابت ماہ مئی ۱۹۵۵ء میں سپرد قلم کیا ہے اس کی تکرار کی یہاں ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ ہم نے کسی نواب یا بادشاہ کا پورا حال قلمبند کرنا اس کتاب کا موضوع نہیں قرار دیا ہے ورنہ بہت زیادہ طول ہو جاتا پھر بھی قیصر باغ کا حال لکھتے ہوئے اس قدر عرض کرنا ضروری ہے کہ بادشاہ نے اس عمارت میں رہ کر جو اردو ادب کی خدمت کی اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ لاتعداد نام انسانوں، عمارتوں اور ضروریات زندگی کے اشیاء کے تجویز کئے اور وہ اپنے وقت کے آدم تھے جن کو علم اسماء تعلیم ہوا تھا وہ تکیہ کو آرام سر، تکیتی کو آرام پہلو، شراب کو آب حرام اور اعضاء تناسل کو عضو مخصوص، رضائی کو شب خوابی، جوتا کو آرام پائی، حقہ کو لب معشوق، تمباکوئی خوردنی کو خوشش طلب کہتے تھے اور جس چیز کا جو نام رکھ دیا ممکن نہ تھا کہ بھول جائیں۔ اس کو اسی نام سے پکارتے تھے قیصر باغ نہ تھا ایک بہشت کا نمونہ تھا جو بہت تھوڑے دن آراستہ اور بہار پر رہا عہدہ وزارت[2] پہلے اعتماد الدولہ دانش الملک سید حامد علی خاں بہادر جنگ کے ہاتھ میں تھا۔ انقلاب سلطنت میں خزاں آئی اس قیامت خیز منظر پر روشنی ڈالنا میرا تو کام نہیں ہے محمد رضا[3] عاشق ایک نمونہ تلاطم کا پیش کر سکے ہیں ؎

کہوں کیا جو اس دم تھا ماتم بپا بلاشک وہ دن تو محرم کا تھا

---

۱ قومی آواز ۲ ستمبر ۱۹۵۶ء ۲ خلاصۃ المصائب ۳ مثنوی محمد رضا عاشق

کوئی کہتا ہے کدھر جائیں گے — کہاں عیش و عشرت یہ اب پائیں گے
کوئی کہتی گویاں ہوا کیا ستم — بُوا مجھ کو سونے نہ دے گا یہ غم
کوئی کہتی بھیّا ادھر آؤ تو — کدھر ہیں کنھیا خبر لاؤ تو
کوئی لے کے ہاتھوں پہ سنبل سے بال — یہ کہتی تھی رو رو کے اے ذوالجلال
مرا شاہ ہووے جو غم سے رہا — میں چومک چڑھاؤں گی مسجد میں جا
کسی نے کہا میں کروں رت جگا — موئے اودھم کا جو ہووے برا
کوئی کہتی چھاتی کو یہ کوٹ کر — کہ جھاڑو پھرے اودھم کے بھی گھر
یہ کہتی تھی کوئی کہ شاہِ نجف — بچھے گھر میں اودھم کے ماتم کی صف
کوئی انگلی لب پر دھرے تھی کھڑی — کوئی غش سے بستر کے اوپر پڑی

بادشاہ نظر بند ہو کر کلکتہ گئے برجیس قدر کی ہوئی غدر ہوا یہ سب حالات جہاں تک آثار قدیمہ سے تعلق تھا اپنی اپنی جگہ آچکے۔ قیصر باغ سے نکلتے وقت شاہ کی زبان پر تھا ـــ

شہر پر کیا اداسی چھائی ہے — بخدا رنج میں خدائی ہے
یاحسین آیئے دہائی ہے

۱۱ مارچ ۱۸۵۸ء کو انگریز محاصرہ قیصر باغ میں کامیاب ہوئے اور لوہے کے پل سے باغیوں کو ہٹا کر شہر پر قبضہ کیا۔
۱۸۶۷ء میں انگریزوں کے وقت میں قیصر باغ میں ایک نمائش ہوئی جس کا عکس میرے قدیم البم میں موجود ہے۔ اچھا اب میں رخصت بڑی تکلیف ہوئی آپ کو اس تاریخ کے پڑھنے میں۔ معاف کیجئے گا۔

آغا مہدی الرضوی

۲۷ر جمادی الاوّل ۱۳۷۹ھ مطابق ۲۹ر نومبر ۱۹۵۹ء
(اضافات و کتابت بعد اختتام رسید ۲۰ر ستمبر ۱۹۷۶ء)

؎ مثنوی محمد رضا عاشق

کربلا تال کٹورہ

روضہ کاظمین کے سامنے
چپ تعزیہ کا جلوس

۹ محرم سنہ ۱۳۰۲ھ امام باڑہ ممتاز العلماء عشرہ کی
آخری مجلس سید المحدثین کی ذاکری

انگریزوں کے ابتدائی عہد کے پیسے (تین مختلف سکے)
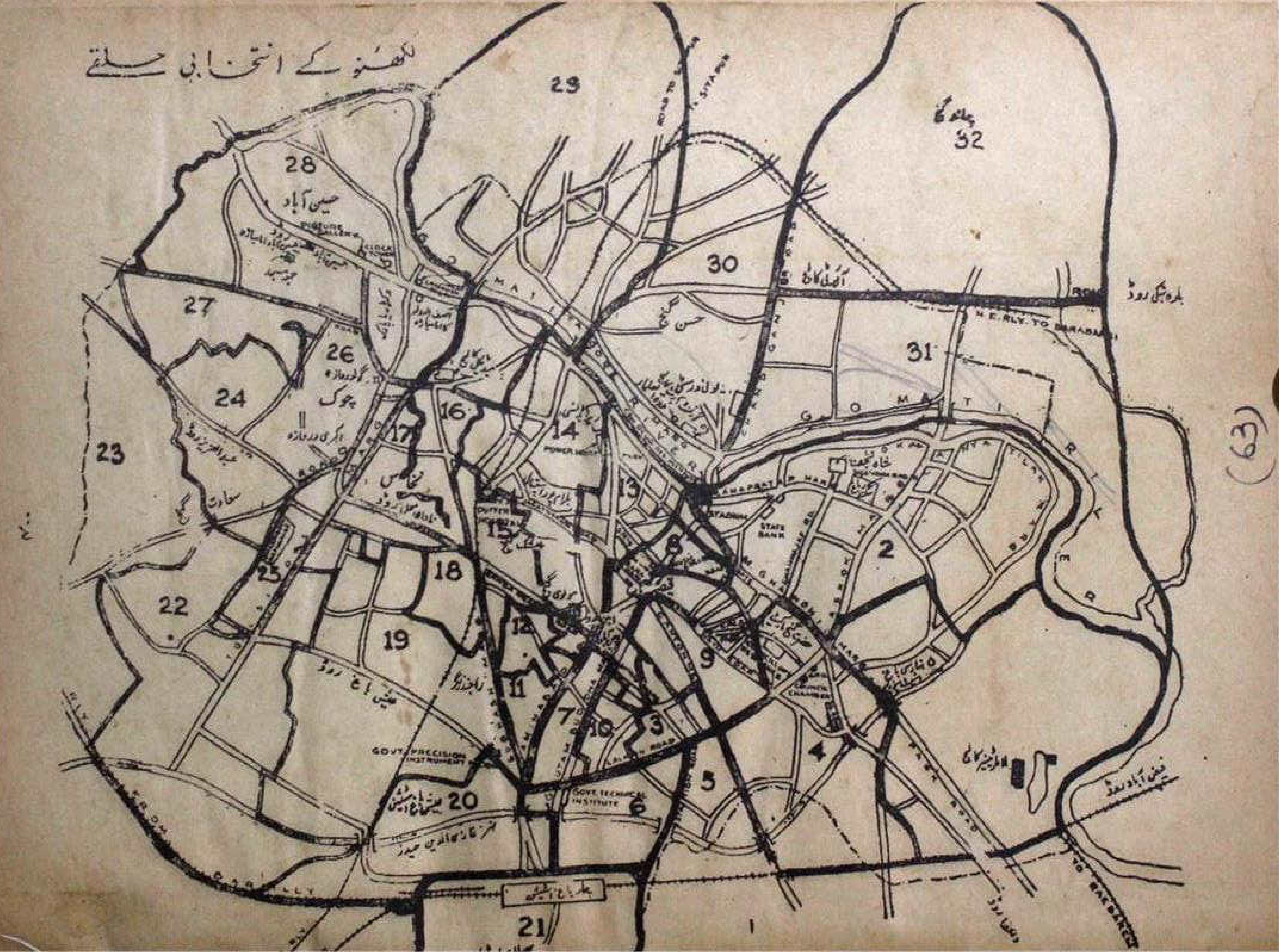
لکھنؤ کے انتخابی حلقے